اِسلام، مسلمان اور دورِ حاضِر

سعید ملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

پیش لفظ

تعارف ۱۷

پہلا باب پس منظر ۳۶

بعثت اسلام کے وقت ادیان عالم کی حالت ۳۶

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی عمومی حالت ۳۶

ادیان قبل از اسلام ۴۲

عرب ۴۴

اہل کتاب ۵۳

یہود و نصاریٰ کی ایک ہی طرح کی گمراہیاں ۵۳

یہودیت ۵۹

عیسائیت ۶۷

دین زرتشت ۷۴

ہندومت ۸۹

بدھ مت ۱۰۳

چینی مذاہب ۱۳۴

کنفیوشزم ۱۳۷

تاؤازم ۱۴۵

موازم ۱۴۷

بدھ مت ۱۴۹

نتیجہ مباحث ۱۵۲

دوسرا باب اسلامی تفکر: توضیحات ـــــ ابتدائیہ ۱۵۳

دنیا میں انسان کا مقام ۱۵۳

دین اسلام کی فکری اساسات کے ماخذ ۱۶۳

بنیادی اصولوں کی ضرورت ۱۶۵

انسان کے اندر حق و باطل کی کشمکش اور اس کی ذمہ داری ۱۶۸

اسلام عقل و دانش کو اس کو صحیح مقام دیتا ہے ۱۷۶

ضابطہ حیات انسان کی نوعی ضرورت ۱۸۲

خالق حیات ہی ضابطہ حیات دے سکتا ہے ۱۸۴

یہ ہدایت حیات انسانی کے لیے مکمل ضابطہ فراہم کرتی ہے ۱۸۸

اسلام خیالی نہیں بلکہ قابل عمل نظام ہے ۱۹۹

بے مثل فطری نظام ۲۰۴

انسان راہ ہدایت کی طلب رکھتا ہے ۲۰۷

ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۰۸

انفرادی اصول اور دین کا مجموعی تصور ۲۲۲

مسلمان اسلام کی مجموعی تعلیمات کا عکس ہوتا ہے ۲۲۶

نظم کے ماخذ اور اسلام ۲۲۸

اسلام میں فرد اور جماعت کا تعلق ۲۳۰

اسلام کی راہ اعتدال اور رہبانیت ۲۳۴

اسلام دین ہے، معروف معنوں میں مذہب نہیں ۲۴۳

اسلامی انقلاب کا مفہوم ۲۵۲

اسلام کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے ۲۵۷

اسلام انسان کو فکر و عمل کے لیے اساسی رہنمائی دیتا ہے ۲۶۲

نظریہ ارتقاء اور اثبات وجود باری تعالی ۲۶۸

آباپرستی اور دین اسلام ۲۹۶

اسلام میں کوئی مذہبی مراعات یافتہ طبقہ نہیں ۳۰۲

اسلام میں توبہ کا تصور ۳۰۸

اسلام کے ساتھ کسی خارجی نظریے کو نہیں جوڑا جاسکتا ۳۱۲

انسان کے لیے اسلام کی رہنمائی کی نوعیت ۳۱۶

تیسرا باب وحی ۳۲۹

انسانی بے چارگی ۳۲۹

دو عالمی نظریات ۳۳۴

بے تدبیر انسانی جذبات ۳۳۵

مادہ پرستانہ نظریے کی تباہ کاریاں ۳۳۵

انسان زندگی کے ہر مرحلے پر رہنمائی حاصل کرتا ہے ۳۳۷

کائناتی وسعت اور انسانی فہم کی بے بضاعتی ۳۴۰

معرفت حقیقت کے سلسلے میں سائنس اور فلسفہ کی ناکامی ۳۴۲

وحی واحد ذریعہ ہدایت ۳۵۵

اسلام میں نظریہ وحی	۳۵۸
وحی کی اہمیت اور اس کے نزول کی صورتیں	۳۶۱
چوتھا باب منصب رسالت	**۳۶۶**
محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل ہر قوم کی طرف رسول	۳۶۶
رسول ہمیشہ بشر ہی ہوتا ہے	۳۶۸
رسولوں کی امتیازی خصوصیات	۳۷۵
رسول کی زندگی قبل از بعثت	۳۷۶
رسالت وہبی منصب ہے نہ کہ اکتسابی	۳۸۱
رسول خود بھی دین کا متبع ہوتا ہے	۳۸۲
رسول ہی تبیین وحی کرتا ہے	۳۸۵
رسول کی مربیانہ حیثیت	۳۸۷
رسول اور قائم شدہ نظام فکر و عمل	۳۹۵
رسولوں نے کفر کو ہمیشہ چیلنج دیا ہے	۳۹۸
رسول کبھی اصولوں پر غیر اسلام سے مصالحت نہیں کرتا	۴۰۱
رسول کا انداز دعوت	۴۰۳
رسول دعوتی کام کا معاوضہ نہیں چاہتا	۴۰۷
تمام رسول ایک ہی دین لائے	۴۱۰
رسول اور زخارف دنیا	۴۱۲
وحی و رسالت کے تصور پر عالمی اتفاق	۴۱۶
انسان کی ذمہ داری	۴۱۷

پانچواں باب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۴۲۰

پیدائش، خاندان اور بچپن ۴۲۰

شباب سے بعثت نبوت تک ۴۲۲

آثار وحی ورسالت ۴۲۸

بعثت رسالت ۴۳۱

آغاز دعوت ۴۳۶

حضور کی حیات طیبہ کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب ہیں ۴۳۷

حضور مرد کامل اور جامع شخصیت کے مالک تھے ۴۴۰

کاملیت کے اعتبار سے تاریخ عالم میں حضور کی منفرد حیثیت ۴۴۵

حضور نے دین اسلام کسی مروجہ فکر کے تسلسل میں پیش نہیں کیا ۴۵۳

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نوع انسانی کے لیے آخری پیغام ہدایت لے کر آئے ۴۵۶

لہذا حضور خاتم النبیین ہیں ۴۵۸

حضور کی مربیانہ حیثیت ۴۵۹

حضور کے فرائض منصبی ۴۶۱

حضور قانون اسباب ومسببات کے تحت منفرد انقلاب لائے ۴۶۶

اعدائے اسلام نے سب سے زیادہ حضور کی ذات کو ہدف مخالفت بنایا ۴۷۰

حضور کا صبر وعزم ۴۷۳

آپ کے اسوہ حسنہ کی ایک نمایاں خصوصیت ۴۷۹

حضور کی بصیرت وتدبر ۴۸۱

دین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ۴۸۷

ہر معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ردعمل دینی حکمت کے مطابق ہوتا ہے ۵۰۳
حضور کے اوصاف حمیدہ اور کارناموں کا مجموعی تصور قائم کیا جائے ۵۰۵

چھٹا باب قرآن ۵۰۸

چند معلومات ۵۰۸
قرآن کی زبان ۵۰۹
قرآن کی جامعیت ۵۱۲
فہم قرآن کے لیے سنت وحیات طیبہ رسول ﷺ کا مطالعہ ضروری ہے ۵۱۴
قرآن فہمی کے لیے علمی استعداد کی ضرورت ۵۲۲
قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کی تین قسمیں ۵۲۵
قرآن کے ہر اصول پر اس کی مجموعی تعلیمات کے پس منظر میں غور کرنا چاہیے ۵۲۷
قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت ۵۳۱
قرآن میں تکرار کا مسئلہ اور اس کے متعلق غلط فہمی ۵۳۴
قرآن کو حضور کی تصنیف قرار دینے والوں کی تردید ۵۴۲
امیت رسول صلعم ۵۴۹
قرآن میں محکمات ومتشبہات ۵۵۴
قرآن فہمی کے راستے کی رکاوٹیں ۵۶۱
حفاظت قرآن ۵۷۳
حضور کی طرف سے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی تلقین ۵۹۱

ساتواں باب حدیث وسنت ۵۹۵

سنت اور حدیث کا فرق ۵۹۵

عہد نبوی کا تحریری سرمایہ ۶۰۹

وضع حدیث کا فتنہ اور اس کا سد باب ۶۲۳

امہات احادیث اور ان کے مرتب ہونے تک کے ارتقائی مراحل ۶۳۴

دوسری صدی کے بعد کے مشہور محدثین کے اسمائے گرامی ۶۴۲

تیسری صدی ہجری کے مشہور ترین محدثین ۶۴۲

چوتھی صدی ہجری کے محدثین ۶۴۳

پانچویں صدی ہجری کے محدثین ۶۴۳

چھٹی صدی ہجری کے محدثین ۶۴۴

ساتویں صدی ہجری کے محدثین ۶۴۴

آٹھویں صدی ہجری کے محدثین ۶۴۵

نویں صدی ہجری کے محدثین ۶۴۵

دسویں صدی ہجری کے محدثین ۶۴۶

اقسام حدیث ۶۴۷

آٹھواں باب توحید **۶۵۲**

دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی پہلی شرط ۶۵۲

تمام انبیاء نے دعوت کا آغاز عقیدہ توحید پیش کرنے کے ساتھ کیا ۶۵۵

توحید کے حق میں قرآنی انداز استدلال ۶۵۹

انفسی طرز استدلال ۶۵۹

آفاقی استدلال ۶۸۱

اللہ کے وجود کے متعلق مغرب کا فکری الجھاؤ ۶۹۱

خدا کی ہستی کا تصور بشر اول سے چلا آ رہا ہے فکری ارتقا سے اس کا کوئی تعلق نہیں	۷۰۱
سقراط اور تصور توحید	۷۰۳
توحید، معاد اور وحی (والہام) کا اعتقاد	۷۰۶
یونانی دیوتاؤں کے وجود کا انکار	۷۰۸
مروجہ جمہوریت کی مخالفت	۷۰۹
نوجوانوں کی ذہنی تربیت کی کوشش	۷۰۹
فقر اور سخت جانی	۷۱۰
اللہ کی طرف سے بعثت کا دعوی	۷۱۱
کیفیات بے خودی	۷۱۲
مقدمہ اور سزائے موت	۷۱۳
اخناتوں اور توحید	۷۱۹
اسلام کا تصور توحید	۷۲۳
انسان اللہ کی ذات کو اپنے تصور کی گرفت میں نہیں لا سکتا	۷۲۴
قرآن میں صفات باری تعالیٰ کے بیان کی نوعیت کے متعلق اصولی وضاحت	۷۲۶
اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور احدیت	۷۲۸
اللہ ہی الہ اور عبادت کا مستحق ہے	۷۳۰
اسلام میں خواص و عوام کے لیے توحید کا ایک ہی تصور	۷۳۱
خالق و مدبر کائنات اللہ تعالیٰ ہی ہے	۷۳۳
الوہیت باری تعالیٰ کا تقاضا ہے کہ انسان اس کے نازل کردہ دین پر عمل پیرا ہو	۷۳۵
تصور توحید کے اقرار و انکار کے نتائج کا تقابلی مطالعہ	۷۳۷

تصور توحید شرک کی ہر شکل کی جڑ کاٹ دیتا ہے ۷۴۱

بتوں کی پرستش ۷۴۵

کسی کا اللہ سے تناسلی تعلق قرار دینا ۷۴۷

جنات پرستی ۷۴۸

ملائیکہ کی پرستش ۷۴۹

اجرام فلکی کی پرستش ۷۵۰

غیر اللہ کو حق تشریعی قرار دینا بھی شرک ہے ۷۵۱

نواں باب عالم آخرت **۷۵۳**

بعثت اسلامی کے وقت جواب دہی کے تصور کی تکذیب ۷۵۳

اسلام میں انسان کے جواب دہ ہونے کا تصور ۷۵۴

انسانی بے بسی کا ایک نمایاں پہلو ۷۵۵

اس دنیا میں مکافات عمل کا قانون کلیتاً نافذ نہیں ہو سکتا ۷۵۷

اللہ تعالی کی علمی ہمہ گیری ۷۵۹

عمل کے مطابق اخروی جزا و سزا ۷۶۱

وسیلہ اور شفاعت کے متعلق غلط فہمیاں اور قرآن و حدیث کا موقف ۷۶۵

شفاعت ۷۶۸

آخرت میں حضور کی شفاعت کی نوعیت ۷۷۶

معاد اور انسانی قوت ادراک ۷۸۲

موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی پر عالمی اتفاق ۷۸۴

معاد اور انسان کا روحانی بقاء ارتقاء ۷۸۶

قیام قیامت	۸۰۰
ظہور قیامت کے قرآنی اشارات اور دور جدید کے فلکیاتی مشاہدات	۸۰۲
قرآنی موقف	۸۰۳
کائنات کے متعلق سائنس کا موقف اور اس میں پائے جانے والے تضادات	۸۰۹
علم فلکیات کے سلسلے میں مسلمانوں کی سرگرمیاں	۸۱۳
علم کائنات کے متعلق مغرب کی سرگرمیاں	۸۲۲
کائنات اور انسان کے انجام کے متعلق سائنسی تصورات	۸۲۶
علامہ اقبال کی رائے	۸۳۸
کائناتی سائنس اور قرآن	۸۴۲
قیامت کے روز انسانی اعمال کی جزا و سزا کے فیصلے کا طریق	۸۵۸
عالم آخرت میں تین مقامات	۸۶۲
جنت	۸۶۷
جہنم	۸۷۴
اعراف	۸۸۰
جنت میں خواتین	۸۸۲
حرف آخر	۸۸۸

پیش لفظ

قوموں کی عالمی برادری میں امت مسلمہ کی حیثیت اس اعتبار سے سب سے برتر اور نمایاں ہے کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب۔۔۔۔قرآن مجید۔۔۔۔اس کے حوالے کر کے اس کو ذمہ دار بنایا ہے کہ وہ اس کے پیش کردہ حق کی شہادت اکناف عالم کی تمام اقوام کے سامنے دے تاکہ وہ اس کتاب سے رہنمائی حاصل کریں، اپنے مالک کو پہچانیں اور اس کے احکام کی روشنی میں اپنے معاملات کی اصلاح کریں۔

دنیا کبھی جامد نہیں رہی۔ یہ برابر ترقی کر رہی ہے۔ انسان کی معلومات اور تجربہ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ زندگی گزارنے کے انداز بدل بدل جاتے ہیں۔ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جو خود انسان کو جامد نہیں رہنے دیتے بلکہ اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ زمانے کا ساتھ دے اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرے۔ گزشتہ چند صدیوں میں یورپ کو اقوام عالم پر اس اعتبار سے برتری حاصل ہو گئی کہ سائنسی ترقیوں نے اس کی قوت میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ اس نے دوسری قوموں کو زیر کر لیا۔ البتہ اس کے ساتھ حادثہ یہ پیش آیا کہ سائنس کی چکا چوند میں اس نے دین و اخلاق کو غیر ضروری بوجھ قرار دے کر ان کا جوا اتار پھینکا۔ مادی قوت کی افزونی اور روحانی و اخلاقی بے مائیگی کے ساتھ جب یورپ نے دنیا پر غلبہ حاصل کیا تو وہ تمام فلسفہ اور اخلاقی اقدار معرض بحث میں آ گئیں جن پر اقوام عالم کو ناز تھا۔ مسلمانوں کے علاقے پوری طرح یورپ کے شکنجے میں تھے اس لیے ان علاقوں میں اس نے اپنی تہذیب و ثقافت کو خاص اہتمام سے رائج کیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمان اپنے دین سے ناواقف و بیزار اور تہذیب مغرب کے رسیا ہیں۔ اس صورت حال میں ہر صحیح الفکر مسلمان پریشان ہے کہ وہ حق کی شہادت کا فریضہ کس طور پر ادا کرے کہ آج کا انسان تہذیب مغرب کے گرداب سے نکلے۔

جناب سعید ملک مرحوم ایک وسیع المطالعہ اور درد دل رکھنے والے مسلمان تھے۔ وہ شہادت حق کی ذمہ داری سے آگاہ اور اسے ادا کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام سے متعارف کرانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں -----عقائد، عبادات، اخلاقیات، معیشت و معاشرت، سیاسی نظام وغیرہ-----پر الگ الگ تو نہایت قابل قدر تصانیف موجود ہیں لیکن کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جو مجموعی طور پر تمام عنوانات کو زیر بحث لاتی ہو اور اسلام کا جامع تعارف کرانے کے لیے کفایت کر سکے۔ انہوں نے اس کمی

کو پورا کرنے کا عزم کیا اور ایک طویل عرصہ کی محنت کے بعد اپنے نتائے فکر قلم بند کرنے کے قابل ہوئے جن کو کتابی شکل میں وہ اپنی زندگی میں نہ دیکھ سکے۔

اس کتاب میں سعید ملک صاحب نے اسلام کا تعارف کرایا ہے لیکن اس انداز میں جس کا تقاضا دور حاضر کا انداز تحقیق کرتا ہے۔ ان کے پیش نظر تہذیب مغرب کی پیدا کردہ تشکیک بھی ہے اور الحاد بھی، اس لیے انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ ان تمام موضوعات پر، جو کتاب میں شامل ہیں، سیر حاصل بحث کریں تاکہ ہر مسئلہ کے ضروری اطراف کتاب کے قاری کی گرفت میں آجائیں اور کوئی اہم پہلو تشنہ نہ رہے۔ اس کتاب میں انہوں نے دوسرے ادیان کے بارے میں ایسی معلومات جمع کر دی ہیں جن سے واضح ہو سکے کہ اب وہ انسان کی ہدایت کی ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسلام واحد دین ہے جو انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا اور انسان کو زندگی کے ہر دائرے میں رہنمائی دیتا ہے۔ اس کتاب میں اسلامی فکر، وحی اور منصب رسالت، توحید، آخرت اور قرآن و حدیث کے عنوانات زیر بحث آئے ہیں۔ فاضل مصنف نے ان میں سے ہر ایک پر نہایت جامع بحث کی ہے۔ قرآن مجید کو بنیاد مان کر انہوں نے مسلم و غیر مسلم محققین کے نتائج فکر سے استفادہ اور علوم جدیدہ کی معلومات سے استشہاد کیا ہے۔ انداز بحث عصری اسلوب کے مطابق ہے۔ حوالے نقل کرنے بلکہ طویل اقتباسات دینے میں بھی انہوں نے بخالت سے کام نہیں لیا۔ اس طرح ہر موضوع پر قاری کو عہد حاضر کے پیدا کردہ اعتراضات کے مدلل جوابات مل جاتے ہیں۔ فاضل مصنف نے جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے کہ مسلمان معاشروں میں کوئی غلط سوچ یا غلط عمل راہ پا گیا ہے تو انہوں نے اس پر تنقید کر کے حق نصیحت ادا کیا ہے۔ چونکہ کتاب دور حاضر کے مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اس لیے اس میں خدا ناشناس مغربی تہذیب کے افکار پر تنقید بالعموم شامل ہے۔

ان شاءاللہ یہ کتاب مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے مفید ثابت ہو گی اور شہادت بالحق کی یہ دستاویز مصنف کے لیے آخرت میں اجر اور ترقی درجات کا باعث ہو گی۔ اللہ تعالی ان کی محنت کو شرف قبول عطا فرمائے۔

خالد مسعود

ناظم ادارہ تدبر قرآن و حدیث لاہور

تعارف

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امابعد مسلمان دین اسلام کے متعلق بہت بڑا علمی سرمایہ رکھتے ہیں اور یہ ان تمام تخلیقات پر مشتمل ہے، جو قرون اولی سے آج تک وجود میں آیا۔ اسلامی تاریخ کا کوئی دور علمی سرگرمی سے خالی نہیں رہا۔ زمانہ عروج میں تو مسلمانوں نے مشینی ذرائع طباعت نہ ہونے کے باوجود یہ کام بہت بڑے پیا نے اور اونچے معیار کے مطابق کیا۔ لیکن جب جمود و تقلید اور سیاسی انحطاط نے مسلمانوں کے قوائے فکر و عمل کو شل کر دیا وہ غیروں کے غلبہ واستیلاء کے تحت آ گئے تب بھی ایسے علما حق پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اسلام کے اصولوں کی وضاحت اور دین کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کرنے کے سلسلے میں لٹریچر کی کثیر مقدار پیدا کی اور اس طرح یہ دین کئی صدیوں پر پھیلے ہوئے حالات کے نشیب و فراز کے باوجود اس دنیا میں اپنی اصلی تعلیمات و نظریات کے ساتھ موجود ہے۔

آج بھی مسلمانوں میں اسلام کے متعلق بہت سی کتابیں گردش کر رہی ہیں اور ان میں ایسے مسلمانوں کے لیے، جو مقاصد دین پر آبائی طور پر ایمان رکھتے ہیں، دین کے اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے علم برداروں نے اپنی سیاسی و اقتصادی برتری اور تیکنیکی مہارت کے بل پر بہت وسیع وسائل نشر واشاعت حاصل کر لیے ہیں اور وہ اپنے فکر کو پھیلانے میں بھی بہت مستعد ہیں۔ ان کے نظریات واقدار نے سارے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مسلمان ممالک کی سیاست و معیشت کے علاوہ ان کے نظام ہائے تعلیم کی بنیاد بھی مغربی فکر ہی فراہم کر رہا ہے اور عام طور پر زندگی کے مختلف شعبوں کے سلسلے میں جو بھی علمی مواد دستیاب ہے، وہ مغربی فکر کی روشنی میں ہی مرتب کیا گیا ہے۔ جو کوئی بھی دور حاضر کے پس منظر میں کسی شعبہ زندگی کا مطالعہ کرنا چاہے، اسے ناگزیر طور پر اس علمی مواد سے رجوع کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایسے افراد کی

کثیر تعداد پائی جاتی ہے جو مغربی فکر سے متاثر ہی نہیں، بلکہ بری طرح مرعوب ہیں۔ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مستشرقین (Orientalists) کے ذریعے سے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کی ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو مغرب کی مادی ترقی کی بناپر ان کے فکر کے برسرحق اور قابل تقلید ہونے پر دلیلیں قائم کرتے ہیں۔ یہ تاثر بہت عام ہو گیا ہے کہ قوموں کی ترقی کے لیے مغربی انداز فکر و عمل کو اپنانا لازمی و لابدی ہے اور اس بات سے صرف نظر کیا جارہا ہے کہ یہ تہذیب دنیا کو بحیثیت مجموعی فلاح و بہبود کی طرف لے جارہی ہے یا بربادی کی عمیق غار میں دھکیل رہی ہے۔

ان حالات میں ایسے لٹریچر کی تخلیق کی اشد ضرورت ہے جو مغربی فکری یلغار سے متاثر ذہنوں کو دین اسلام کے معاملے میں صحیح سوچ فراہم کر سکے اور یہ بات واضح کرے کہ فلاح نوع انسانی کے لیے مغربی تہذیب و تمدن کس قدر منفی کردار ادا کر رہا ہے اور اسلام جو نظام فکر و عمل پیش کرتا ہے اس کی دور رواں کے حالات کے تناظر میں وضاحت کی جائے۔ اس کام کی، مسلمانوں کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے بھی ضرورت ہے اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے بھی یہ کام ضروری ہے۔ مسلمان خود اندرونی طور پر مفاد پرست اور خود ساختہ مذہبی رہنماؤں اور بیرونی ذرائع سے خدا ناشناس اور مادہ پرست نظریات زندگی کے علم برداروں کی زد میں ہیں۔ فکری تطہیر کے لیے دونوں محاذوں پر جدوجہد کی ضرورت ہے۔

یہ ایک بہت محنت طلب کام ہے جو بہترین صلاحیتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے دور حاضر کے غالب نظریات، مسلمانوں کے فکر و عمل میں در آنے والے فتنوں کے عمیق مطالعے، دین اسلام کے ساتھ گہری وابستگی، ان اصولوں کا واضح شعور اور انہیں زندگی کے معاملات پر منطبق کرنے کے ڈھنگ کا حقیقت پسندانہ تصور ضروری ہے۔ اسلام کے خلاف اس وقت بہت سا فکری مواد گردش کر رہا ہے۔ اس دور کا فکری ماحول اسلامی قدروں کی نفی کرتا ہے۔ اسلام کی دعوت کا کام کرنے کا جو فرد یا گروہ عزم کرے گا اس کے لیے یہ صورت حال ایک بڑا چیلنج ہے جس کا مقابلہ منتشر قسم کی انفرادی کوششوں، جذباتی نعروں اور خوش فہمی پر مبنی انداز تکلم سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے وسیع پیمانے پر منظّم قسم کی مساعی کی ضرورت ہو گی۔ جن کے ذریعے سے مروجہ غیر اسلامی فکر کے ایک ایک پہلو کا تجزیہ کر کے اس کی خامیوں اور خرابیوں کی نشان دہی کی جا سکے اور اس کے مقابلے میں واضح طور پر بنی نوع انسان کو درپیش مسائل کا اسلام کے اصولوں کی روشنی میں حل پیش کیا جائے۔

انسانی زندگی کو کلی طور پر نظریات کے کسی متعین نظام کے مطابق ڈھالنے کی مستند اور تحریر شدہ (Recorded) تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔اس کی ابتدا اسلام سے ہوئی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن اور اپنی سنت کے ذریعے سے دنیا کو سب سے پہلے اس تصور سے آشنا کرایا کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت، چاہے وہ فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا عمل اور مادی زندگی سے، ایک نظام کے تحت ڈھالا جاسکتا ہے۔ کئی صدیوں تک اس تصور پر صرف مسلمانوں کی اجارہ داری رہی، لیکن اب گزشتہ چند صدیوں پر پھیلی ہوئی محنت سے ماضی قریب میں مغرب نے اس خیال کو اپنایا ہے کہ انسان کی زندگی کے صرف مادی پہلو کو کسی متعین نظام فکر کے تحت منظم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مغربی دنیا میں مادہ پرستانہ تصور حیات کے بنیادی نظریے کے تحت مختلف نظام ابھرے ہیں جن کی پشت پر وسیع علمی و فکری سرمایہ وجود میں آگیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تیکنیکی شعبے میں مغرب کی ترقی کے نتیجے میں انداز کار میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے کہ جس طرح پیداداری کام افراد کے ہاتھوں سے نکل کر بڑے بڑے کارخانوں نے سنبھال لیا ہے اسی طرح فکری شعبے کا کام بھی بڑے اداروں کے ذریعے ہونے لگا ہے اور بہت سے افراد کے تعاون سے یونیورسٹیاں اور دوسرے ادارے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور بین الاقوامی رجحانات کے سلسلے میں تحقیق و مطالعہ کے کام میں مصروف ہیں اور انہی کے نتائج فکر و تحقیق کی بنا پر ان کی قومی پالیسیاں بنتی ہیں۔ ہم وضاحت سے بیان کریں گے کہ یہی کام ان کے نظریات کے ایضاح و اشاعت کا باعث بنتا ہے۔ اور تو اور ان کی متعدد یونیورسٹیوں نے اسلام کے لیے شعبے (Chairs) قائم کر دیے ہیں، جہاں مسلمانان عالم کے رجحانات پر تحقیق ہوتی ہے اور وہ مسلمان ممالک کے متعلق اسی بنیاد پر ریشہ دوانیوں کے منصوبے بناتے اور اپنے استعماری اور استحصالی عزائم کو آگے بڑھاتے ہیں۔

ہم آئندہ صفحات میں عرض کریں گے کہ علمی و فکری کام میں مسلمانوں کے دور عروج کے دوران تعاون و اشتراک کیا کیا صورتیں تھیں اور اس کے نتیجے میں کس طرح وہ بھی متعلقہ دورہ وسائل کے مطابق اداروں کی کوئی نہ کوئی شکل رکھتے تھے اور عالم اسلام میں بہت بڑے بڑے مراکز علم و ادب پائے جاتے تھے۔ لہذا مسلمانوں کے لیے ان اداروں کا قیام کوئی نئی بات نہیں ہے۔ صرف انداز اور طرز تنظیم میں وقت کی سہولتوں کی بنا پر فرق ہے لیکن یہاں ہمیں اس بات کے تذکرے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ فی الوقت مسلمان ایسے علمی اداروں اور سیاسی و سماجی تنظیموں سے محروم ہیں اور جو ادارے قائم بھی ہیں ان میں وہ علمی افادیت کا پہلو موجود نہیں جس کی اسلام کو اس کی اصلی شکل و صورت اور روح کے ساتھ پیش کرنے کی بھی

ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کس کام کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے اور جس کا ہم تفصیلاً اس کتاب میں تذکرہ کریں گے اس کی لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان بھی ایسے ادارے وجود میں لائیں جو معیاری تحقیقی کام کریں اور اسلام کے اصولوں کو منضبط طور پر (Systematically) پیش کریں۔

لیکن اس کام کے لیے سب سے پہلے اپنے گھر کی خبر لینا ہو گی۔ ابتدائی مرحلے کے دوران یہی سب سے مشکل کام ہے جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں عرض کریں گے۔ مسلمان خود اسلام کے راستے کا سب سے بڑا پتھر ہیں۔ لیکن دقت یہ ہے کہ ایک ارب نفوس پر مشتمل کثیر آبادی کو اسلام سے کلیتاً جدا کیا جا سکتا ہے اور نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہم ان شاءاللہ اپنی گزارشات کے دوران ان عناصر کی نشان دہی کریں گے اور ان کے کردار پر تبصرہ کریں گے جو اسلام کے ضابطہ زندگی کے طور پر عملاً برپا ہونے کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اور ایک طرف مسلمانوں کے اندر فکری طور پر افتراق و انشقاق کے بیج بو کر ان کی توجہات کو اسلام کے اصل مقصد سے ہٹا رہے ہیں اور دوسری طرف ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے ان کو مختلف گروہوں اور سیاسی و مقامی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں میں اس وقت چھوٹے پیمانے پر بعض ادارے پائے جاتے ہیں جو قومی اور ملی سطوں پر اسلام کی خدمت کرنے کا دعوی کرتے ہیں، لیکن اگر ان کے کام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے اکثر کی سرپرستی بعض عناصر اپنے سیاسی اور حکومتی خود غرضانہ مفادات (Vested Interests) کو ذہن میں رکھ کر کر رہے ہیں اور ان اداروں کے کارکن مقصد کے ساتھ اس عشق اور لگن سے محروم ہیں جو اسلام کو برپا کرنے کی سعی وجہد کے لیے لازمی شرط ہے۔ اداروں کا قیام مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ یہ اعلی تر مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اگر ان میں کام کرنے والوں کا مقصد کسب رزق اور درپردہ کسی مقتدر ہئیت یا شخصیت کے مفاد کو آگے بڑھانا اور محض ظاہری طور پر خدمت اسلام ہو تو ایسے ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تاریخ میں اصولوں کے لیے کام کرنے والے اپنے مقصد کی خاطر زندگیاں وقف کرتے رہے ہیں تب جا کر کچھ بات بنتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے اندر پیش نظر مقصد کے حصول کے لیے کام کرنے کی اہلیت و استعداد بھی پائی جائے اور وہ اس کے لیے علمی و ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے لیس ہوں۔ اور ان میں اس معیار کا

تقوی اور وہ سیرت پائی جائے، جس کی شارع علیہ السلام نے تعلیم دی تھی اور جس کے مطابق اسلامی ضابطہ زندگی قائم کرنے کے لیے حضورؐ نے کارکن تیار کئے تھے۔

اس کتاب کو لکھنے کا اصلی محرک یہی ہے کہ ہم اپنی بساط کے مطابق، جس کی محدودیت اور بے بضاعتی کا ہمیں پوری طرح احساس ہے، ایک مکمل دین یا عام فہم الفاظ میں انسانی زندگی کے لیے ایک ہمہ جہتی دستور فکر و عمل کی حیثیت سے اسلام کا ایک مجموعی تصور اور تاریخ کے پس منظر میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ پیش کریں۔ اس قسم کی کوشش کی صورت واضح بھی ہے اور اس کے لیے بہت سے دلائل بھی دیے جا سکتے ہیں، لیکن ہم صرف ایک واقعہ بیان کریں گے جس سے اس کام کو سرانجام دینے کی اہمیت کی نشان دہی ہو گی۔

۱۹۷۹ء میں افغانستان پر روس کے حملے کے بعد اسلام آباد میں مسلمان ممالک کے وزراء خارجہ کی کانفرنس کے موقع پر فلپائن میں ایک مسلمان ریاست قائم کرنے کی جدوجہد کرنے والے عناصر کے ایک لیڈر آئے ہوئے تھے جن سے ہماری اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ ان کے ساتھ ہم نے اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں باتیں کرتے ہوئے مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی کوششوں کا تذکرہ کیا اور ائمہ سلف اور ان کے بعد بعض نامور مسلمان شخصیتوں، مثلاً امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، علامہ سید جمال الدین افغانی، جناب مہدی سوڈانی، علامہ شبلی اور بعض دوسرے حضرات کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ انہیں اسلامی نظام کے ان اصولوں اور اس کے لیے جدوجہد کے ان واقعات اور ایسی شخصیات کے کارناموں کا کوئی علم نہیں اور ہمیں کہا کہ ہم ان کو ایسی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب بتائیں جس کے مطالعے سے ان معاملات و حالات کا انہیں علم ہو سکے۔ ہم نے ان سے کہا کہ اس کے لیے آپ کو بہت سی کتب اپنی کوششوں سے فراہم کر کے ان کا مطالعہ کرنا ہو گا، کسی ایک کتاب میں آپ کو یہ سب معلومات یکجا نہ مل سکیں گی۔

چنانچہ ہم نے ارادہ کیا کہ اپنی علمی کم مائیگی اور متاع عمل و تقویٰ سے تہی دامنی کے شدید احساس کے باوجود ایک ایسی کتاب تصنیف کی جائے، جس میں موجودہ ذہن کے لیے اسلامی اصولوں کو بے کم و کاست اور بغیر کسی تحریف و مصالحت اور حذف و اضافے کے پیش کیا جائے اور واضح کیا جائے کہ شارع علیہ السلام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے ان اصولوں کی کس طرح اشاعت کی، انہیں کیسے نافذ کیا اور نتیجے کے

طور پر کس قسم کا معاشرہ وجود میں آیا۔ نیز مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ میں علما حق کے کردار کی ایک جھلک بھی دکھائی جائے اور دور حاضر کے مسلمانوں کی حالت پر بھی مختصراً تبصرہ کیا جائے۔

اس بحث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لیکن ہم نے اس سے ایک کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کو ایک معمولی سی کوشش سمجھتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ چونکہ افادۂ عام کے لیے ہے اس لیے اس کتاب میں عام فہم انداز سے گفتگو کی گئی ہے اور منطقی جھمیلوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے اجتناب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس کام کی عظمت کے پیش نظر اسے منظم طور پر وسیع پیمانے پر انجام دینے کی ضرورت ہے۔ ٹھوس نتائج پیدا کرنے کے لیے ہم سے زیادہ باصلاحیت اور صاحب علم حضرات اگر آگے بڑھیں تو اسی صورت میں اس کام کو کماحقہ انجام دیا جا سکتا ہے۔

کوئی ایک یا چند کتابیں اسلام کو پیش کرنے اور دور رواں کے غالب نظریات کی اصل حقیقت اور ان کے مضر اثرات کو واشگاف کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتیں۔ یہ معاملہ بنی نوع انسان کی کلی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جس میں انسانی فکر و عمل سے متعلق تمام مسائل کے متعلق رہنمائی موجود ہے۔ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے زمان و مکان کی تبدیلی کے مطابق اجتہاد و اجماع اور قیاس و مصالح مرسلہ کے ہتھیاروں کا استعمال البتہ لازمی ہے۔

قرآن و سنت کا مطالعہ اگر بغور کیا جائے تو انسان یہ فیصلہ کرنے کے سلسلے میں اپنے آپ کو عاجز پاتا ہے کہ اسلام کو پیش کرنے کے لیے کون سی آیت یا حدیث کو اپنی تحریر میں شامل کیا جائے اور کس کو نہ لیا جائے۔ قرآن میں کوئی آیت فالتو نہیں ہے اور حضور کے فرمودات کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک شوشہ قابل غور و اتباع ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے قرآن و حدیث کا براہ راست مطالعہ اور ان کی تعلیمات پر غور و تدبر از بس ضروری ہے۔ کسی کتاب کا کوئی مصنف تو یہی کر سکتا ہے کہ محدود صوابدید کے مطابق کسی مسئلے پر قرآن سے کچھ آیات اور ذخیرۂ احادیث سے کچھ احادیث انتخاب کر لے اور اس مسئلے کی وضاحت کرنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا جن موضوعات پر آیات قرآنی یا احادیث درج کی گئی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن و حدیث میں ان کے متعلق اتنا ہی مواد موجود ہے۔ ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے قرآن و حدیث سے کم سے کم ایسے حوالے دیے ہیں جو مدعا کو واضح کرنے میں مدد دے سکیں۔ ورنہ ایک کتاب میں اسلام کی پوری کی پوری تعلیمات کو سمیٹنا ممکن ہے۔ اس کام کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے

کہ بہت اونچی سطح کی صلاحیت رکھنے والے علما نے اپنی ساری ساری عمریں اسلامی فکر سے متعلق ایک ایک موضوع پر خصوصی تحقیق و مطالعہ میں صرف کر دیں لیکن انہیں یہ احساس رہا کہ انہوں نے اس سلسلے میں پورا حق ادا نہیں کیا۔ اپنے دور عروج میں مسلمانوں نے اسلام کے مختلف گوشوں پر اتنا لٹریچر تخلیق کیا ہے کہ ان میں سے ہر موضوع کی حیثیت، جیسا کہ ہم متعلقہ بحث کے دوران عرض کریں گے، ایک بحر بے کنار کی ہے۔ دور حاضر میں اسلام کو ایک انقلابی ضابطہ زندگی کے طور پر پیش کرنے کے لیے اس دور کے علمی و تحقیقی کام سے پوری طرح استفادہ کرنا پڑے گا اور پیش کرنے (Presentation) کا انداز بھی زمانہ رواں کے تقاضوں کے مطابق ہو گا اور کام کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہو گا جتنا انسانی فکر اور زندگی اور اس زندگی کے مسائل پیچیدہ اور وسیع ہیں۔

ہم اس کتاب میں جہاں اسلام کے مابعد الطبیعاتی اصول پیش کریں گے، جو اس دنیا میں اسلامی نظام کی بنیاد فراہم کرتے ہیں اور افراد کی سیرت و کردار اور معاشرے کی اجتماعی صورت گری کرتے ہیں وہیں ہم کتاب و سنت کی روشنی میں اس نظم حیات کے اصول بھی واضح کریں گے جن کے نفاذ کا اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے اور جن کے بغیر زندگی کو اسلام کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔

قرآن سے حوالے دے کر یہ بھی واضح کریں گے کہ یہ اصول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین ہی نے پیش نہیں کئے، بلکہ تمام سابقہ منزل من اللہ ادیان، جن کے اصولوں میں تحریف کر دی گئی ہے، میں بھی اساسی طور پر یہی اصول پیش کئے گئے اگرچہ وقت کے حالات کے مطابق وہ تکمیل کے اس درجے تک نہ پہنچ سکے جو ختم المرسلین حضرت محمد صلعم کے دین کو حاصل ہے۔ اس طرح واضح ہو گا کہ اسلام ان سابقہ ادیان کی توثیق کرتا ہے جو من جانب اللہ ہیں اور ان کے پیروؤں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں پر غور و تدبر کریں اور اس پر ایمان لے آئیں۔

فی الوقت رائج شدہ اور غالب نظریات مقابلے اور ان کے تذکرے کے ساتھ اسلام کے اصولوں کی وضاحت کرنے سے قاری کو ہماری تفصیلی گزارشات کا مطالعہ کرنے سے قبل کسی ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ ہمارا مقصد اسلام کے اصولوں میں کسی قسم کی مصالحت، یا ترمیم یا نرمی پیدا کرنا ہے۔ قرآن میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ :۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴۵:۲)

ترجمہ: اور اگر تم اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کروگے تو بلاشبہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

ہم ایسی تجویز پیش کرنے کی جسارت کیسے کر سکتے ہیں۔ دور حاضر کے مروجہ نظریات کے حوالے سے بات کرنے سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں مختلف محدود جغرافیائی خطوں میں کچھ نظریات کا بے ربط مجموعہ رائج رہا ہے اور دور حاضر میں چونکہ سائنسی ایجادات کی وجہ سے سارا کرۂ ارض سمٹ گیا ہے اور مغرب کے مادہ پرستانہ افکار سے متاثر ہو گیا ہے، لہٰذا زندگی کے متعلق خدا کے شناس نظریات نے لوگوں کے ذہنوں میں۔۔۔ بعض صورتوں میں شعوری طور پر اور بعض میں غیر شعوری طور پر۔۔۔ مضبوط جڑیں قائم کر لی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نظریات کا بھی جائزہ لیا جائے اور ان کے غیر متوازن ہونے اور قرآن کے الفاظ میں ان کے فساد فی الارض پھیلانے کے ذمہ دار ہونے کی وضاحت کی جائے، اور بتایا جائے کہ اس وقت بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی جن پیچیدگیوں اور مشکلات میں مبتلا ہے وہ اس مادہ پرستانہ مغربی نظام فکر کی پیداوار ہے۔ اور بنی نوع انسان کو عالمی سطح پر متحد کرنے اور انسانی فلاح کے لیے دنیا اس وقت جس توازن اور مبنی بر انصاف نظام کے لیے سرگرداں ہے اس کے اصول اساسی اسلام کے پاس موجود ہیں۔

ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جس نے صرف مغربی فکر ہی سے ذہنی غذا حاصل کی ہے۔ دنیا کے حالات کو بھی مغربی معیارات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اسلام کو بھی مستشرقین کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طبقے کا فلسفہ یہ ہے کہ دور حاضر کا ساتھ دینے کے لیے اسلام کے اصولوں میں کچھ ترمیم، کچھ لچک اور دور حاضر کے مروجہ نظریات سے کچھ مصالحت کرنا پڑے گی ورنہ اسلام زندہ نہ رہ سکے گا اور اس کو بھی عملی زندگی اور اس کے متعلقہ نظریات سے اسی طرح خارج ہونا پڑے گا جیسے عیسائیت اور دوسرے مذاہب کو ہونا پڑا۔ ہم اس مغالطے کو بھی دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی کے دوران مغربی استیلاء کے ذریعے سے عالمی سطح پر جس نظام تعلیم کی بنیاد رکھی گئی وہ ارتقا کی کئی منازل طے کر چکا ہے۔ ہم آئندہ عرض کریں گے کہ اس نے کیسے ذہن تیار کئے اور چونکہ اس کتاب میں ہمارے پیش نظر اسلام کو ایک دین (Ideology) کی حیثیت سے پیش کرنے، اس کے برپا

ہونے اور منتشر مسلمانوں کے ملت اسلامیہ کی شکل میں احیااور نشاۃ ثانیہ کے امکانات اور شرائط کا جائزہ لیناہی ہے، لہٰذا ہم اس موضوع پر روشنی ڈالیں گے کہ مسلمانوں کی فکر پر اس نظام تعلیم کے کیااثرات ہوئے ہیں جس کے ایک ایک شعبے پر مغرب کے بارے میں فلسفے کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ تعلیم کے اس نظام کی بھٹی سے گزر کر ایک مخصوص قسم کے ذہن ہی پرورش پاسکتے اور تعمیر ہو سکتے ہیں۔ احیاءاسلام کے نکتہ نظر سے اب یہ ایک پیچیدہ عالمی مسئلہ ہے، کیونکہ مسلمانوں کے سوا کلیتاً ساری بقیہ دنیانے مغربی فلسفہ زندگی کے آگے ہتھیار رکھ دیے ہیں۔ یہ صرف مسلمان ہی ہیں جن کے سینوں میں مغربی فکر کے تفوق کے علی الرغم، اس کے خلاف ابھی چنگاری سلگ رہی ہے۔ ہم اس نکتے کی وضاحت کریں گے کہ اس اسلامی فکر کا شعلہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں چنگاری کی حیثیت کیوں اختیار کر گیا ہے۔

کتاب میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو پیش کیا گیا ہے۔ توحید، وحی ورسالت، قرآن، معاد اور اسلامی زندگی کے دستور العمل اور نظام کی وضاحت کی گئی ہے۔ مقصد دعوتی ہے اسلام کا دفاع کرنا مطلوب نہیں۔ ہمارے نزدیک اسلامی اصولوں کو پیش کرتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، جیسا کہ بعض مغرب سے مرعوب لوگوں کا شیوہ ہے اور یہ مرعوبیت مستشرقین کے اس نفسیاتی حربے کی پیدا کردہ ہے جس کے ذریعے سے وہ اسلام کے اس دعوے کی کہ یہ دین کا ایک مکمل لائحہ عمل ہے تغلیط کرنا چاہتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کا دفاع کیا جارہا ہے اور معذرتیں پیش کی جارہی ہیں۔ اس سے وہ دعوتی تحریروں کو بے اثر اور بے وزن بنانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے ان پر اسلام کی گرفت میں تخفیف کرنا اور مسلمانوں میں فکری سطح پر اسلام کے دور حاضر میں ناقابل عمل ہونے کا رجحان پیدا کرنا ان کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقے نے اس سوچ کو اپنالیا ہے۔

ہر دین اور زندگی کا دستور العمل کوئی نہ کوئی مرکزی اصول رکھتا ہے۔ جو اس کے سارے مجوزہ نظام میں بمنزل روح سرایت کیا اور چھایا ہوا ہوتا ہے۔ اس چیز کو اسلام میں الٰہ کہا گیا ہے۔ کوئی دین خدا پرستانہ نظریے کے تحت قائم ہوتا ہے اور کوئی مادہ پرستانہ فکر کے تحت، کوئی قوم پرستی کو اپنے نظریہ حیات کا محور بناتا ہے اور کوئی کسی ملک کی خاک کو، کوئی اپنی نسلی برتری کے زعم میں مبتلا ہو کر اس کا پجاری بن جاتا ہے اور کوئی اپنی خونی خصوصیت کو وجہ امتیاز و فوقیت قرار دیتا ہے۔ اسی مرکزی تصور سے نظام زندگی کے سارے سوتے پھوٹتے، بہتے اور معنوی غذا حاصل کرتے ہیں۔ کسی نظام کے مزاج کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اس کے اسی الہ کے تصور کو

سمجھنا از بس ضروری ہے۔ ہر نظام کے تحت زندگی کے جتنے شعبے اور ادارے بھی تشکیل پاتے ہیں، ان کی تنظیم اور تفصیلات کے متعلق اس مرکزی اصول کے حوالے سے ہی غور کرنا چاہیے ورنہ ان کی تنظیمی ہیئت کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس قاعدہ کلیہ کو نظر انداز کر دینے سے اسلام کے نظام فکر و عمل کے مختلف شعبوں کے متعلق غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعض لوگ مستشرقین کی تحریروں کے زیر اثر اسلام کے اصولوں میں پیوند کاری کرنے کی تجاویز پیش کر رہے ہیں۔

ہمارا یہ پختہ موقف ہے کہ اسلام کسی ترمیم و تحریف کا محتاج نہیں۔ یہ فکر و عمل کا ایک مربوط خاکہ پیش کرتا ہے جو اپنی ابدی افادیت کا حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے کسی شعبے میں ایسی تبدیلی کی جائے گی جو اس کے مرکزی اصولوں اور مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو گی تو یہ ایک بے جوڑ اور متضاد نظریات کا ملغوبہ بن جائے گا اور دین عدم توازن کا شکار ہو جائے گا۔ کسی نظام کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کے مختلف پہلو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں اگر یہ صورت نہ ہو تو کسی ہئیت اجتماعیہ کی گاڑی روانی سے نہیں چل سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسلام کے سیاسی شعبے میں تبدیلی کر دی گئی اور منتخب امیر کی جگہ وراثتی بادشاہت نے اور شورائیت کی جگہ مطلق العنانی نے لے لی تو دوسرے شعبوں پر بھی اس کے مخالف اسلام اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

ہم واضح کریں گے کہ اسلام کے اصولوں پر، چاہے فرداً فرداً بر اصول پر اور چاہے بحیثیت مجموعی پورے دین پر ہر غور کرنے والے کو، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان کہلاتا ہو یا غیر مسلم ہو، تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی فکر کی ابتدا بھی نظریہ توحید سے ہوتی ہے اور بات وہیں جا کر ختم بھی ہوتی ہے۔ اس نظریے کی روشنی میں ہی اس کائنات کا ایک تصور قائم ہوتا اور اس میں انسان کا مقام متعین ہوتا ہے۔ نتیجتاً انسان کے اندر ایک مزاج پرورش پاتا اور پھر اسی سے ذہنی و فکری طرز عمل (Mental Attitude) اور دین اسلام کی مخصوص اخلاقی اقدار وجود میں آتی ہیں۔ یہ صورت حال زندگی کے تمام شعبوں کو، چاہے وہ فرد کی ذات سے تعلق رکھتے ہوں یا اجتماعی زندگی سے متعلق ہوں، ایک مخصوص ڈھب پر مرتب کرتی ہے اور مسلمان سوسائٹی کے اندر ایک ملکہ راسخ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک ہی روح پوری زندگی کے رگ وریشے میں سرایت کر جاتی ہے۔ اسی سے وہ ہم جہتی توازن پیدا ہوتا ہے جو اجتماعی ترقی و ارتقا کے لیے ضروری اور اس کے تواتر کا ضامن ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں یہ ہمہ جہتی یک رنگی (Homogeneity) انسانی معاشرے کی ترقی و تعمیر کے لیے

عالمگیر قاعدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کافرانہ نظام بھی اسی اصول کے تحت ترقی و قوت اور برتری کے مراحل طے کرتے ہیں اور اسلامی نظام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ چونکہ عالم اسباب ہے اس لیے خدا نے شعبہ اجتماعات کے سلسلے میں یہ قانون بنا کر انسانوں، قوموں اور ملتوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (۱۳:۱۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی روش خود نہ بدلے۔

جو کوئی اس قانون قدرت پر عمل پیرا ہو گا، آگے بڑھے گا اور جو اس کو ترک کر دے گا، انتشار کی نذر ہو جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کو اپنائے بغیر اس قانون پر عمل پیرا ہو کر ترقی کرنے والا اور برتری و بالادستی کا مقام حاصل کرنے والا نظام منصفانہ، اپنی قوم اور دنیا کے لیے فائدہ مند اور دور رس نتائج کے اعتبار سے انفرادی و اجتماعی فلاح کا ضامن نہ ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو وہ مذکورہ بالا یک رنگی کا عارضی فائدہ حاصل کر کے اپنے غلط اصولوں، اندرونی تضادات اور عملی بے اعتدالیوں کی وجہ سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ ایسے نظام کا دائرۂ اثر جتنا پھیلے گا، وہ اسی قدر بنی نوع انسان کے لیے مہلک ثابت ہو گا اور فساد فی الارض کا باعث بنے گا۔

ہم اس کتاب میں تقابلی مطالعہ کے لیے ایسے نظاموں اور ان کے نقصان دہ ثمرات کا بھی تذکرہ کریں گے اور اسلام کے متوازن اصولوں پر مبنی نظام کی وضاحت بھی کریں گے۔

ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب کیا ہیں، وہ اس وقت علمی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی طور پر کیوں پس ماندہ، دوسروں کے دست نگر اور ان سے ہر معاملے میں رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔

اس بات کی بھی حقائق اور اعداد و شمار کی بنیاد پر وضاحت کی جائے گی کہ بالقوہ (Potentially) مسلمانوں کے اندر ترقی کرنے اور دنیا میں ایک باوقار مقام حاصل کرنے کے سارے مادی لوازم موجود ہیں۔ بعض معنوی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو ٹھوس اور صالح خطوط پر اجتماعی ترقی کے مراحل طے کرنے کی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہی کے فقدان کی وجہ سے مسلمانان عالم اس وقت ابتری اور

انتشار کا شکار اور انہی کے ساتھ عدم وابستگی کی وجہ سے وہ حاصل شدہ بلندیوں سے گر کر پستیوں میں جا گرے۔ لیکن تمام سابقہ تہذیبوں اور تمدنی ہیئتوں کے برعکس اسلامی دین کے اصول صفحہ ارض سے محو ہوئے نہ ان کی افادیت کے متعلق مسلمانوں کا اعتماد مجروح ہوا۔

ان معاملات کی وضاحت کے لیے ہمیں دور حاضر کے بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینا ہوگا تاکہ واضح ہو سکے کہ اس وقت مسلمانان عالم کو کن حالات سے سابقہ ہے، ہم کس طرح اور کس پیمانے پر استحصال کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور جب تک یہ صورت حال قائم رہے گی ہمارے مسلمان ممالک کے حکمرانوں کے دعاوی بھی عملی جامہ نہ پہن سکیں گے اور جو بے حقیقت خواب یہ حضرات اپنے اپنے اقتدار کو سہارا دینے کے لیے عوام کو دکھا رہے ہیں وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔ جن جن معاملات کے سلسلے میں ضرورت ہو گی ہم اعداد و شمار اور حقائق کے ذریعے سے اپنی آراء کی حقانیت ثابت کر دیں گے۔

ہم عصر حاضر کے حالات سے مثالیں دے کر یہ ثابت کریں گے کہ کچھ اصول ایسے ہیں جن کو اپنا کر ہر قوم مادی ترقی کر سکتی ہے۔ ہمارا قطعاً یہ دعویٰ نہیں کہ صرف اسلام ہی مادی سطح پر آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے۔ ہم نے اس کتاب میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ دین اسلام کے پیش کیے ہوئے مابعد الطبیعیاتی نظریات اور نظام اخلاق کو نظر انداز کر کے نری عارضی طور پر مادی ترقی کے لیے سعی و جہد قوموں اور تمدنی و تہذیبی اکائیوں (Societies) کو چنگیزیت کی سمت میں دھکیل دیتی ہے اور ان اقوام کے لیے بھی جو اباً وہی ترقی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور ایسی اقوام کے لیے بھی جو عارضی طور پر ان کی استیلاء کی وجہ سے ان کے دست نگر ہو کر ان سے تعاون کرتی اور تعلقات استوار کر کے ان کے اثرات قبول کرتی ہیں۔ یہ ترقی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے۔

دور حاضر میں مذہب کا ایک خاص تصور رواج پا گیا ہے اور اسے عملی و اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ہم بتائیں گے کہ اس معنی میں اسلام مذہب ہے ہی نہیں۔ آج کل حرکت (Dynamism)، ترقی (Progress) اور ارتقا (Evolution) قسم کی اصطلاحات استعمال کر کے یہ ثابت کرنے اور باور کرانے کے لیے ذہنی غذا مہیا کی جا رہی ہے کہ یہ خصوصیات و علامات ہر قوم کی بقا اور نوع انسانی کی مجموعی پیش رفت کے لیے ضروری ہیں، لیکن مذہب ان مقاصد کے حصول کے سلسلے میں سنگ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک اس نظریے کا تعلق ہے، ہم بتائیں گے اسلام اس زمرے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ہم اس ضمن میں

موجودہ دور کے دو اہم ترین اور غالب دساتیر عمل یعنی مغربی جمہوری سرمایہ داری اور اشتمالیت (Communism) کے متعلق بھی اپنی گزارشات پیش کریں گے اور ان کے اندر پائے جانے والے عدم توازن نے انسانیت کے لیے جو پیچیدہ اور مہلک امکانات سے بھرپور مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کا اجمالی تجزیہ بھی کریں گے۔ ان مباحث کے ذریعے سے یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ ان نظاموں نے اندرونی طور پر کس نوعیت کے معاشروں کو جنم دیا اور ذرائع نشر واشاعت اور وسائل نقل وحمل کی ترقی کی وجہ سے کرۂ ارض کے تمام خطوں، ممالک اور معاشروں میں جو ربط پیدا ہو گیا ہے اور ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی جو سہولتیں وجود میں آگئی ہیں ان کی بنا پر انہوں نے تکنیکی ترقی کے ذریعے سے حاصل شدہ تفوق کو ظالمانہ انداز سے استعمال کر کے بنی نوع انسان کی عظیم اکثریت کو اپنا غلام بنا لیا۔ دنیا کی اس ستم رسیدہ حصہ آبادی میں مسلمانان عالم بھی شامل ہیں۔ اس لیے ہمیں مسلمانوں کی حالت زار واضح کرنے کے لیے ان نظاموں اور دنیا میں اس وقت جو سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی صورت حال پیدا ہو چکی ہے اس پر ضروری حد تک بحث کرنا ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعض ناظرین یہ رائے رکھتے ہوں کہ اب جبکہ کمیونزم روس اور مشرقی یورپ کے ممالک میں زمین بوس اور اس کی خامیاں تشت از بام ہو چکی ہیں تو اس کو زیر بحث لانا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن ہم اس کے اصولوں کا تجزیہ اور اس کے انہدام کی وجوہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس مسلک نے گزشتہ ایک صدی کے دوران بہت اہمیت حاصل کر لی تھی اور کثیر لٹریچر نے اس کی پشت پناہی کی ہے جو دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ممالک عالم کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ اگرچہ یہ نظام کبھی بھی قائم نہ ہو سکا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے نام پر ایک دور میں تقریباً دو ارب باشندوں کی آبادی پر مشتمل ملک میں نظم حکومت چلایا گیا ہے۔ اگرچہ اس کو اب قصہ پارینہ کی حیثیت ہی اختیار کرنا ہے، لیکن یہ بات خام خیالی کے ہم معنی ہو گی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اسے تاریخ کے صفحات سے محو کیا جا سکتا ہے۔

ہم بین الاقوامی حالات پر حقائق کی روشنی میں اس پہلو سے بھی گفتگو کریں گے کہ جب سے زندگی کا مادہ پرستانہ اور میکانکی تصور (Materialistic and Mechanistic Conception of life) اپنایا گیا ہے اور ایک صنعتی تہذیب نے جنم لیا ہے دنیائے مغرب کی حالت چنگیزیت سے بڑھ کر بربریت کے دائرہ میں داخل ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک انسان کی زندگی کے دو مقاصد رہ گئے ہیں۔ ایک شکم سیری جس کو علمی اور فلسفیانہ بنیادوں پر حیات آدم کا مرکز و محور قرار دیا گیا ہے اور اس کے حق میں نظریاتی مواد کا طومار لگا دیا گیا ہے۔ دوسرے درندوں کی طرح ایک دوسرے کو اقتصادی برتری حاصل کرنے کے لیے پھاڑ

کھانا۔ درندے اس لحاظ سے پھر بھی بہتر طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ لڑنے بھڑنے کے لیے منصوبہ بندی نہیں کرتے بلکہ ہنگامی اور وقتی رجحان و ہیجان کے تحت ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی کے مادہ پرستانہ تصور نے انسان کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ مختلف اقوام ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ تباہ کرنے کی رات دن تدابیر سوچتے رہتے ہیں اور اختیار و ارادہ، علمی تحقیق و مشاہدہ اور جزئیات سے کلیات اخذ کرنے کی صلاحیت اور فکر و شعور کی جو نعمتیں عطا ہوئی ہیں ان کو اعلیٰ اور بلند اقدار کی نشو و نما کے لیے صرف کرنے کے بجائے کلی طور پر باہمی کشت و خون کے لیے مہلک سے مہلک ترین ہتھیار تیار کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ یہ کوئی عارضی یا ہنگامی طرز عمل نہیں بلکہ یہ اخلاق ناشناس اور مادہ پرستانہ زندگی کا ثمر اور فطری و منطقی نتیجہ ہے۔

ہم مغربی دنیا کے چند اونچی سطح کے مفکرین کو مغربی فکر کے نمائندوں اور ترجمانوں کے طور پر لیں گے اور ان کے خیالات کے بعض نکات پیش کریں گے تاکہ عالمی سیاست و اجتماعات کے متعلق مغربی اقوام کے طرز فکر کا اندازہ ہو سکے۔ اس پس منظر میں تیسری دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی پالیسیوں کے اثر سے متعلق بھی رائے قائم کی جا سکے گی اور ان کے غلبہ و استیلاء کے پیش نظر ان پس ماندہ ممالک کے مستقبل کے سلسلے میں غالب اقوام کے عزائم کی نشان دہی بھی ہو جائے گی۔ اس ضمن میں ہمیں یہ بھی عرض کرنا ہو گا کہ مسلمانوں کے ممالک جو سارے کے سارے تیسری دنیا میں شامل ہیں، کس طرح غالب اقوام کی گرفت میں ہیں اور اس لحاظ سے مجبور محض اور ان کے دست نگر ہیں کہ وہ جب تک اپنے اندر صلاحیت فکر و عمل پیدا نہیں کریں گے، مسکینی و نامرادی، ذلت و نکبت اور پس ماندگی و درماندگی کے قصر عمیق سے نہ نکل سکیں گے۔

اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ مسلمانان عالم کے پاس جہاں دین اسلام کی شکل میں ایک مکمل ضابطہ فکر و عمل موجود ہے وہیں ان کے پاس خود کفیل ہونے کے لیے وافر قدرتی وسائل بھی موجود ہیں۔ چنانچہ وہ ایک بلاک کی شکل میں مالی سیاست میں ایک طاقت ور اور موثر قوت کی حیثیت سے ابھر سکتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں چوٹی کے مفکرین اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ اس کرۂ ارض کی آبادی کو پیش آمدہ الجھنوں کے مہیب اثرات و نتائج سے کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی سوچ کا انداز یہ ہے کہ دنیا کی بقا کا انحصار مغربی تہذیب کی حفاظت و غلبہ پر ہے۔ عالمی امن و انصاف کے نام پر جو بھی بین الاقوامی تنظیم قائم ہوتی ہے، ان میں چند بڑی طاقتوں کے تفوق کی ضمانت مہیا کی جاتی ہے اور اسے ان کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ نہ ہی ان طاقتوں کے پاس جو اس وقت عالمی سطح پر قوت و اثر رکھتے ہیں کوئی ایسا فلسفہ

موجود ہے جس میں فلاح بنی نوع انسان کے لیے عدل وانصاف پر مبنی ضابطہ مہیا کرنے کے اصول پائے جاتے ہوں۔اس کے برعکس دنیامیں اس وقت اتنی کثیر تعداد میں متصادم عصبیتیں پائی جاتی ہیں کہ تکریم آدم کا تصور ناپید ہو گیا ہے۔ دکھی انسانیت کے علاج کے طور پر بعض حلقوں میں عالمی ریاست کے قیام کی ایک خیالی (Utopian)اور غیر واضح سی آرزو کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اپنے عظیم کام کو اسی کے مطابق عظیم و موزوں فلسفہ زندگی اپنائے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ ہم اس موضوع کا حقائق کی روشنی میں تجزیہ کریں گے اور واضح کریں گے کہ اتحاد بنی نوع انسان کے لیے اسلام نے آج سے چودہ سو سال قبل ایک جامع فلسفہ پیش کیا تھا۔اس سلسلے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقع پر جو چارٹر پیش کیا تھا ہم اس کا تقابل اقوام متحدہ کے چارٹر سے کر کے اول الذکر کی برتری ثابت کریں گے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب کسی قوم یا تمدنی اکائی کا پڑھا لکھا طبقہ کسی خارجی اور اجنبی فکر کو اپنا لیتا ہے تو اگرچہ پھر وہ اقلیت میں ہی ہو،اس کے نظریات کا رنگ متعلقہ قوم اور تمدنی اکائی غیر شعوری طور پر اپناتی اور اپنے افکار و نظریات اور تمدن سے بیگانہ اور ان کے سلسلے میں احساس کمتری کا شکار ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ دوغلا پن اسے قوت فکر و عمل کے دائرے میں جدت پسندی سے محروم کر دیتا ہے۔اس کیفیت کا تجزیہ اور حقیقت حال کی نشان دہی لازم و ملزوم ہیں۔

اس لحاظ سے ہم نے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل پر حتی المقدور بحث کی ہے۔ ہم نے یہ بھی ضروری سمجھا ہے کہ ظہور اسلام سے قبل دنیا میں جن نمایاں مذاہب کا ظہور ہوا اور مختلف ذرائع سے ان کے متعلق جو معلومات دستیاب ہیں ان کی بنیاد پر جائزہ لیا جائے کہ وہ کس حد تک اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں قائم رہے۔ ہم نے کسی مذہب پر مخالفانہ تنقید کرنے یا ان کی تعلیمات کا جائزہ لینے سے اجتناب کیا ہے۔اس کی دو وجہیں ہیں۔ایک یہ کہ ہم ان مذاہب کے پیروان کی دل آزاری سے گریز کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے، جیسا کہ ہم بیان کریں گے،اسلام کا یہ موقف ہے کہ اللہ تعالی نے ادوار قبل از اسلام میں ہر قوم کی طرف پیغمبروں کی حیثیت سے ہادی بھیجے ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمات کو تحریف کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران مستشرقین کی تحقیقی سرگرمیوں اور علم الآثار کے ذریعے سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ تحریف کے علاوہ ایک عرصے تک اکثر مذاہب کے نظریات مستور و ناپید ہے۔ البتہ انیسویں صدی کے اواخر سے ان کے متعلق بعض انکشافات ہوئے ہیں لیکن وہ بھی مربوط شکل میں نہیں بلکہ

ماضی کے مختلف ادوار میں ان کے متبعین میں مروجہ رسومات پوجاپاٹ اور معاشرتی و حکومتی انداز جزواً جزواً سامنے آئے ہیں۔ مستشرقین نے اپنی لادینیت، زندگی اور کائنات کے متعلق اپنے مادہ پرستانہ نظریات اور ذہنی ساخت کی روشنی میں ان اجزا کو جوڑ کر ان میں کچھ ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حالات میں ہم ان مذاہب سے منسوب ابتدائی تعلیمات کو قابل اعتماد اور ثقہ نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ ہم بیان کریں گے، جن محققین کے ذریعے سے ہم تک ان کے متعلق معلومات پہنچی ہیں وہ خود ان کو بے یقینی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ عین ممکن ہی نہیں بلکہ اغلب ہے کہ ان ادیان کے بانیوں میں بعض نبوت کے مقام پر فائز ہوں، لیکن ان کی تعلیمات کے فراموش اور منحرف ہو جانے سے ان کی حیثیت اور پیش کردہ اصولوں کا صحیح کھوج نہ لگایا جاسکا ہو۔ اس لیے بھی ان پر رائے زنی کرنے کی جسارت کرنا ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم اسی علمی مواد پر بھروسہ کر کے گفتگو کر سکتے ہیں جو اس وقت دستیاب ہے۔ البتہ جن انبیا کا قرآن میں تذکرہ ہے، ان کی تعلیمات کے متعلق ہم پورے اعتماد کے ساتھ اظہار رائے کرنے کے مجاز ہیں۔

لہٰذا ہم نے مذاہب قبل از اسلام کے متعلق صرف اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت کوئی ایک مذہب بھی صفحہ ارض پر ایسا موجود نہ تھا جس کے بانی کی زندگی کے حالات تاریخی ثقاہت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق محفوظ ہوں، اور اس کی تعلیمات کا سلسلہ روایت اس تک پہنچتا۔ ہم نے اپنی آراء کی تشکیل غیر جانبدار ذرائع اور خود ان مذاہب سے وابستہ اہل علم یا ایسے لوگوں کی تحریروں کے حوالوں کی بنیاد پر کی ہے جو ان پر تحقیق کرتے ہیں۔

ان حالات میں ایک ایسے دین (Ideology) کی ضرورت تھی جس کے داعی و شارع کا اسوہ بھی محفوظ رہے اور اس کی تعلیمات کے اصول معمولی سے معمولی التباس اور شک و ریب سے آزاد ہوں، اور پورے یقین کے ساتھ ان کو داعی دین کی طرف منسوب کیا جاسکے۔ نیز وہ مابعد الطبیعیاتی فکر اور دنیوی زندگی کے متعلق بنی نوع انسان کو مکمل رہنمائی دیتا ہو اور کائنات میں انسان کے مقام و مرتبے کو متعین کر کے اس کو ان اوہام پرستیوں سے نکالتا ہو جن میں وہ مبتلا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی عقل و خرد اور اس کی دوسری جملہ توانائیوں کو استعمال کرنے کی صحیح سمت میں نشان دہی بھی کرتا ہو۔

اس کتاب میں اپنی گزارشات پیش کرتے ہوئے ہم نے اسلام کے حوالے سے چار اقسام کے فکری و اقتصادی رجحانات رکھنے والے حلقوں کو پیش نظر رکھا ہے:

اولاً وہ لوگ جو دین اسلام سے وابستگی تو رکھتے ہیں لیکن اس کی تعلیمات کے مجموعی تصور سے آشنا نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے احیااور نفاذ اسلام کی یہ ایک لازمی شرط ہے کہ ایسے لوگوں کو دین کے اساسی اصولوں سے اس حد تک روشناس کرایا جائے جن کے شعور کے ذریعے سے ہی ان مقاصد کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

ثانیاً مسلمانوں کے اندر پایا جانے والا وہ حلقہ جو مغربی فکر سے مرعوب ہے اور اس سے وابستہ افراد کے ذہنوں میں اسلام کی تعلیمات کے متعلق بہت سے اشکالات پائے جاتے ہیں۔ وہ اسلام کو مستشرقین کی تحریروں کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر، گویا اسلام کو مغرب کے مادہ پرستانہ تصور حیات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، جو ایک نہایت غیر منطقی طرز عمل ہے۔ بحیثیت مجموعی اسلامی اور مغربی افکار واقدار میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔

ثالثاً وہ عنصر جو بدعات کو فروغ دے کر اور مشرکانہ رسومات کی حوصلہ افزائی کر کے سادہ لوح اور بے خبر مسلمان عوام کے اذہان و قلوب میں اسلام کے غلط تصور کے رسوخ کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال ایسے اسلامی اداروں کی عدم موجودگی کی پیداوار ہے جو قرآن وسنت پر مبنی اسلامی افکار و نظریات کی نشر واشاعت کا فریضہ کماحقہ سرانجام دے سکیں۔ اس سے قبل جس طبقہ ثانی کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے وجود میں آنے کی بھی یہی ایک اہم وجہ ہے۔

رابعاً اس کتاب میں مباحث کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے جس سے غیر مسلموں میں ایک طرف اسلام کے بنی نوع انسان کے لیے ایک مکمل نظام فکر و عمل ہونے اور دوسری طرف مختلف مروجہ ضابطہ ہائے زندگی (Ideologies) کے یک رخے پن کی حیثیت کا تقابلی مطالعہ کرنے کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس وقت صفحہ ارض پر ایسے بہت سے حلقے پائے جاتے ہیں جو مادہ پرستانہ فکر کے تحت قائم ہونے والے عالمی نظام (World Order) کے ثمرات خبیثہ سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں، لیکن دین اسلام کی شکل میں خالق کائنات کی طرف سے حیات انسانی کو عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے منظم کرنے کے لیے جو ضابطہ نازل کیا گیا ہے اس کی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے وہ منزل کا تعین کر سکتے ہیں اور نہ اس تک پہنچنے کے لائحہ عمل کا۔ ہم قرآن وسنت کی بنیاد پر اور پندرہ صدیوں کے دوران علمائے حقہ نے ان دونوں ماخذ دین کی روشنی میں فکری اور عملی سطحوں پر دین اسلام کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے استفادہ کر کے یہ ثابت کریں گے کہ یہ دین بشمول دور حاضر، ہر زمانے کے حالات پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے ہم نے اس کتاب میں اسلامی تعلیمات کو اس روایتی انداز سے ہٹ کر پیش کیا ہے جو مسلمانوں میں در اجتہاد بند ہو جانے کے بعد سے چلا آرہا ہے۔ اور جس میں وقت کے غالب افکار اور مروجہ حالات کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، نہ ہی ان کے غیر اسلامی پہلوؤں کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہمارے ائمہ سلف و خلف اور علمائے حقہ نے ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اجنبی نظریات کے نفوذ کو روکا اور دین کے اصولوں کے بے آمیز تصور کی بقا کے لیے کوشاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمانوں کے اندر بھی مستغربین کا ایک ایسا عنصر پیدا ہو گیا ہے جو مغربی افکار کو اسلامی فکر میں درآمد کر کے دین میں پیوندکاری کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح ایک امتزاجی فکر (Synthesis) تیار کیا جائے۔ ایسے لوگ نہ اسلام کو سمجھتے ہیں اور نہ مغربی فکر کو۔ اسلام ایسے کسی چوں چوں کے مربے کو برداشت نہیں کر سکتا۔

ہم نے اس کتاب میں اسلام کے اصولوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے متعلقہ شعبوں کے متعلق مغربی فکر کو بھی مناسب حد تک بیان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسلام کی اور نہ مغرب کی، محض اپنی رائے کے مطابق ترجمانی نہیں کی بلکہ اسلام کے متعلق قرآن و سنت اور اکابرین اسلام کی تحریروں کے حوالے دیے ہیں۔ اس لیے اس کتاب میں خاصی تعداد میں اقتباسات شامل کرنے پڑے۔

قرآن کی اکثر و بیشتر آیات کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کی مرتب کردہ تفسیر ''تدبر قرآن'' سے نقل کیا گیا ہے۔ چند ایک مقامات پر مولانا ابوالکلام آزاد کے ''ترجمان القرآن'' سے آیات قرآنی کا ترجمہ بھی لیا گیا ہے۔ ہم نے قرآنی آیات کے علاوہ عربی اور انگریزی اقتباسات کے ترجمے ان کے اصل مفہوم میں کسی رد و بدل کے بغیر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہم جناب خالد مسعود ایڈیٹر رسالہ ''تدبر'' لاہور کے مشکور ہیں کہ انہوں نے کتاب کے مسودے کو پڑھنے کے لیے اپنی علمی مصروفیات کے باوجود وقت نکالا اور اپنے مشوروں سے ہمیں نوازا۔

تعارف کتاب کی سطور میں اسلام کی تعلیمات کو جس انداز سے اجاگر کرنے کے ارادے کا اظہار کیا گیا تھا ہم نے متن کتاب میں اسے حتی المقدور پیش نظر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود اس کو ایک سعی ناتمام ہی تصور کرتے ہیں۔ البتہ یہ توقع رکھتے ہیں کہ ناظرین کے لیے ہماری گزارشات دور حاضر کے پر فتن ماحول میں اسلام کے اصولوں کے متعلق غور و فکر کی کسی نہ کسی درجے میں نئی راہوں کی نشان دہی کا باعث ہوں گی۔

اسلام اور دور رواں کے مغربی فکر کے بہت سے پہلو زیر بحث لائے گئے ہیں۔ لہذا ان مباحث کی عدم تکمیل کے علاوہ بعض فرو گزاشتوں کا بھی امکان ہے۔ اگرچہ ہم نے ہر بات سند کے حوالے سے عرض کی ہے، چاہے وہ اسلام سے متعلق ہو یا غیر اسلام سے، بہر حال اس کتاب میں جو کچھ حق ہے وہ اللہ تعالی کی توفیق سے ہے، اور اگر کوئی چوک ہو گئی ہے تو وہ ہماری کم علمی اور فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہم ناظرین سے گزارش کرتے ہیں کہ اگر کسی مبحث کے بارے میں کوئی مشورہ یا تنقیدی اظہار خیال کرنا چاہیں تو بلا تکلف ہمیں اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان سے حتی الامکان استفادہ کیا جا سکے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم-

احقر العباد

سعید ملک

۲۳ شوال ۱۴۱۳ء

بمطابق ۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء

باب:۱

پس منظر

بعثت اسلام کے وقت ادیان عالم کی حالت

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کے وقت دینی، دنیوی اور نظریاتی نقطہ ہائے نظر سے عالم انسانیت کی حالت کا جائزہ دین کی تنزیل کے موقع کی زمانی مناسبت کا تصور قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اللہ تعالی کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

فلسفہ تاریخ میں یہ صورت حال بہت اہمیت رکھتی ہے کہ جب کوئی اہم واقعہ وقوع پذیر ہو رہا ہو تو اس کے حلقہ اثر یا مجموعی عالمی حالات کے پس منظر میں اس کے کردار کے تعین کے ساتھ اندازہ کرنا ممکن نہیں ہوتا لیکن جب وہ واقعہ قصہ ماضی بن جاتا ہے اور اس سے متعلقہ حالات واثرات تاریخ کے صفحات میں جگہ پا لیتے ہیں تو جملہ تفصیلات کے منصہ شہود پر آجانے سے اس کے روبہ عمل آنے کے مصالح اور حسن وقبح عیاں ہو جاتے ہیں۔ دین اسلام کی بعثت نوع انسانی کے سفر حیات کی اس منزل پر ہوئی جبکہ وہ اس کی اپنے حالات کی وجہ سے مقتضی تھی۔ بات صرف اتنی نہ تھی کہ اس وقت کوئی مطابق فطرت انسانی نظام قائم نہ تھا، بلکہ کسی ایسے نظام فکر و عمل سے انسان روشناس ہی نہ تھا۔ اس حقیقت کے ادراک کے لیے ذہنی افق میں وسعت اور تلاش حق کی مخلصانہ خواہش کی ضرورت ہے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی عمومی حالت

تفصیلی گفتگو تو آئندہ ابواب میں ہو گی۔ البتہ ہم یہاں اجمالاً یہ عرض کر دیں کہ قرآن کے مطابق اللہ تعالی تکمیل دین اور خاتم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مختلف اقوام اور خطہ ہائے ارض کی طرف انبیاء ورسل بھیجتا رہا ہے۔ یہ حضرات خالق کائنات کی طرف سے زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق اپنے اپنے مخاطبین کے لیے شریعتیں لاتے رہے ہیں اگرچہ دین کے بنیادی اصول ہر نبی کی تعلیمات میں مماثل ہی ہوتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف ''تاریخ ارض القرآن'' میں حضور کی بعثت سے قبل کے ادوار کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''اس اثنا میں انسان کی مختلف آبادیوں میں، ان کے مرتبہ فہم اور درجہ ترقی کے مناسب تعلیمات لے کر انبیااللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں آتے رہے'' (صفحہ ۳۶۰)

لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ادوار قبل از اسلام میں کسی قوم یا ہیئت اجتماعیہ نے ان تعلیمات کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ حضور کی تشریف آوری کے وقت کوئی ایک دین بھی اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں دنیا کے کسی علاقے یا قوم میں موجود نہ تھا۔ جو ادیان نام کی حد تک موجود تھے وہ محرف ہو چکے تھے۔ اگرچہ مروجہ ادیان کے متعلق ہم الگ الگ اجمالی گفتگو کریں گے تاکہ ہمارے ناظرین کے ذہنوں میں ان کے سلسلے میں عمل تحریف کی نوعیت اور شدت کا تصور قائم ہو جائے لیکن سر دست ہم ان اصولوں کا تذکرہ کریں گے جو یکساں طور پر تمام ادیان میں تغیر و تبدل اور حذف واضافہ کا شکار ہوئے۔

ا-توحید: تمام منزل من اللہ ادیان میں یہ اصول سر فہرست ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ ہر نبی نے اپنے دعوتی کام کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات اور اس کی تنزیہی صفات کے بیان سے کی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ(۲۱:۲۵)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی ہم نے نہ بھیجی ہو کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف میری ذات۔ پس چاہیے کہ میری ہی بندگی کرو۔

لیکن اولاً محسوسات کے انجذاب کی وجہ سے انسانوں کی ایک بڑی تعداد طلوع اسلام سے قبل ہمیشہ ہی فکری و عملی دونوں ہی دائروں میں شرک کی مختلف صورتوں کی طرف کھنچتی رہی ہے۔ ثانیاً مذاہب و ادیان کے سلسلے میں ایسے گروہ پیدا ہوتے رہے جو دین و مذہب کو ایک پراسرار شے قرار دے کر اس پر اپنی اجارہ داری قائم کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی سرگرمیوں کو پیشہ کی شکل دے کر اکتساب رزق کا ذریعہ بنایا۔ چونکہ دین کے اصولوں میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور توحید کے نظریے میں اللہ تعالیٰ کی براہ راست عبادت اور اس کی حاجت روائی کے تصورات شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ طبقات لوگوں کے دلوں سے اس نظریے کو محو کرنے ہی کو اپنے مقاصد خبیثہ کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مختلف عیارانہ حربوں سے کام لیتے ہیں۔

ان میں سے بعض نے یہ تاثر دیا اور اس نظریے کو پھیلانے کی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست قلبی تعلق قائم کرنا امر محال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ذات اس قدر بلند ہے کہ وہ انسانوں کی رسائی سے ماورا ہے۔ لہذا اس نے اس دنیا میں اپنے نمائندے مقرر کر رکھے ہیں جن کی عبادت کرنا اور ان سے اپنی حاجات طلب کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرنے اور اس سے اپنی حاجات طلب کرنے کے ہم معنی ہے۔ ان لوگوں کے اس طرز فکر و عمل کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے یوں کی ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ (۳۹:۳)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا اور دوسروں کو اپنا سرپرست (وحاجت روا) بنا رکھا ہے۔ (وہ کہتے ہیں) ''ہم ان کی اس لیے پرستش کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ کے قریب پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔''

اس طرح کچھ عرصے تک تو مشرکانہ حرکات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا نام بھی لیا جاتا تھا لیکن رات دن غیر اللہ کو الٰہ تسلیم کر کے اس کے حضور مراسم عبودیت ادا کرنے سے اللہ کے تصور اور توحید کے نظریے کا قلوب واذہان سے محو ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔ نوبت بایں جارسید کہ فکر و عمل کے دائروں سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا تصور غائب ہو گیا اور:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (۱۹:۸۱)

ترجمہ: اور ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا لیا ہے کہ ان کے مددگار ہوں۔

۲- بانیان ادیان و مذاہب: ہر دین، مذہب یا نظریہ زندگی کسی نہ کسی داعی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جس درجے میں اس دین کی اصلی اور ابتدائی تعلیمات سے اس کے متوسلین وابستگی قائم رکھتے ہیں اسی نسبت سے وہ داعی کی صحیح حیثیت و مقام سے باخبر رہتے ہیں۔ بعثت نبوی سے قبل تمام انبیاور سل (جن کا قرآن میں تذکرہ ہے) اور داعیان مذاہب (جن کا قرآن میں تذکرہ ہے اور نہ ہم یقین کے ساتھ ان کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا اقرار کر سکتے ہیں) کی زندگیوں کے حالات اور ان کے پیش کردہ نظریات کا علم ثقاہت کا مرتبہ کھو چکا تھا۔ اس ایک عامل نے مذاہب وادیان کی تعلیمات کو اپنی اصلی حالت سے محروم ہونے کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا ہوا دین ہر طبقے اور ذہنی سطح کے لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے مخاطبین صرف ایسے دانشوروں اور پڑھے لکھے افراد پر مشتمل نہیں ہوتے جو مجرد خیالی نظریات اور تھیوریوں کے دلدادہ ہوں لیکن عمل کا داعیہ نہ رکھتے ہوں بلکہ اللہ کا دین تعمیر فکر کرنے کے ساتھ زندگی کا دستور (Code of Life) بھی دیتا ہے اور خالق کائنات سے قلبی تعلق رکھنے کے لیے نظام اخلاق اور طرز عبادات کے سلسلے میں مکمل رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے۔ نبی کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ دین کے تمام پہلوؤں پر عمل پیرا ہو کر اپنی امت کے لیے ایک ایسا اسوہ مہیا کرے جو اس کو مینارۂ نور کا کام دے۔ اگر سنت نبوی، اور داعی کے کردار سے بے خبری کی کیفیت پیدا ہو جائے تو تاریخی واقعات اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ نظریات اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔ ایسی صورت رونما ہونے پر دین و مذہب میں اس پیمانے پر تحریف اور حذف و اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس کی شکل و روح یکسر تغیر پذیر ہو جاتی ہیں۔

واقعات اور حقائق سے یہ بات یقینیات کی حد تک پہنچ چکی ہے کہ ایسی حالت میں جہاں توحید کا تصور مسخ ہو جاتا ہے وہیں انسان اور داعی کی حیثیت سے نبی کا کردار نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت عام طور پر مسند الوہیت پر بٹھا دی جاتی ہے۔ دراصل یہ انسانی رجحانات کا تقاضا ہے کہ یہ مسند خالی نہ رہے اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ نبی یا داعی بلا شرکت غیرے مقام الوہیت پر فائز رہے بلکہ کائنات کو مختلف حکمرانی شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبے اس کے کسی مرئی یا غیر مرئی نائب سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ اس طرح خداؤں کی ایک فوج ظفر موج خیالات کی دنیا میں بس جاتی ہے۔ اور اس سے زندگی کے عملی پہلو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت کی بعثت سے قبل بنیادی سطح پر کوئی دین یا مذہب اس انجام سے دوچار ہونے سے نہیں بچ سکا۔ انبیا اور داعیان مذاہب کی پوجا اور پرستش کے مظاہر صفحہ ارض کے چپے چپے پر نظر آ رہے تھے۔ ہم اس کی متعین مثالیں اور نظائر پیش کریں گے۔

۳۔ صحف ادیان سابقہ اور قرآن: صفحہ ارض پر ظاہر ہونے والے تمام ادیان و مذاہب اپنا اپنا مصحف آسمانی رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآن میں حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کے مصاحف کا تذکرہ ہے۔ لیکن قرآن حضور کی بعثت سے قبل ظاہر ہونے والے خصوصی طور پر صرف انہی مصاحف کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ عمومی طور پر کہتا ہے:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ(۱۰:۳۷)

ترجمہ: اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے علاوہ اس کو کوئی اپنی طرف سے گھڑ لائے۔ یہ تو ان تمام وحی شدہ (صحیفوں) کی تصدیق ہے جو اس سے قبل نازل ہو چکے ہیں۔ اور کتاب اللہ (یعنی تمام منزل من اللہ کتابوں) کی تفصیل ہے۔ (اس میں) شک نہیں کہ یہ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے سلسلے میں ہم قاری کی توجہ دو نکات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں:

اولاً یہ کہ قرآن تمام ان ادیان و مصاحف کی تصدیق کرتا ہے جن کی اس سے قبل اللہ تعالی کی طرف سے پہلے رسولوں اور انبیاء کے ذریعے سے تنزیل ہوئی۔

دوئم یہ کہ قرآن ''الکتاب'' کی تفصیل ہے، یعنی اس میں ''الکتاب'' کو شرح و بسط کے ساتھ (مکمل طور پر) واضح کر دیا گیا ہے۔

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کی آیات ایک دوسری کی تفصیل و تشریح کرتی ہیں۔ یوں تو اور بھی متعدد آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے لیکن اختصار کے پیشِ نظر ہم صرف تین آیات سے رجوع کرتے ہیں:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۴)

ترجمہ: اور دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں (اعمال بد کے مال سے) ڈرانے والا (رسول) نہ ہو گزرا ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ (۴۰:۷۸)

ترجمہ: (اور اے پیغمبر) آپ سے پہلے ہم نے کتنے ہی پیغمبر بھیجے، ان میں سے بعض کے حالات ہم نے آپ کو سنائے اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات آپ کو نہیں سنائے۔ (یعنی قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۡ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۳:۸۴)

ترجمہ: (اے پیغمبر) تم کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز جو کچھ موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور خدا کے تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اس سب پر بھی ہمارا بھی ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں) ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

ان آیات سے ہمارے مقصد کے لیے یہ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:۔

اولاً یہ کہ تمام اقوام اور ہیہات اجتماعیہ کی طرف پیغمبر بھیجے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کی طرف کتب ہدایت بھی ارسال کی گئی ہوں گی۔

دوئم یہ کہ بعض پیغمبروں کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے اور بعض کا نہیں کیا گیا۔ لیکن چونکہ ہم مسلمان تمام پیغمبروں پر ایمان لانے کے پابند ہیں، لہذا ہم منزل من اللہ ان ادیان و مذاہب کے داعی حضرات کے متعلق احتیاط کا پہلو اختیار کریں گے جن کے پیرو اس وقت صفحہ ارض پر موجود ہیں، اگرچہ ہمیں یہ یقین ہو کہ ان کی پیش کردہ تعلیمات اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ جریدۂ عالم پر وہی شخصیتیں اپنا نام ثبت کر سکتی ہیں جنہوں نے کوئی عظیم کارنامہ انجام دیا ہو۔ البتہ قرآن میں ان کے تذکرے کی عدم موجودگی میں ہم تعین کے ساتھ ان پر ایمان لانے کے مکلف نہیں ہیں۔

سوئم یہ کہ اللہ تعالی مسلمانوں سے صرف قرآن ہی پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اصولی طور پر ان تعلیمات و کتب کی تصدیق کرنے کا بھی حکم دیتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے انبیا پر نازل کی گئیں، لیکن ان کتب کے سلسلے میں دقت یہ پیدا ہو گئی کہ یہ اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں۔

چہارم یہ کہ آیت (۳:۸۴) میں النبیون کا لفظ استعمال کر کے ہمیں ہدایت دی گئی ہے کہ ہم اصولی طور پر تمام ان پیغمبروں پر بھی ایمان لائیں گے جو پیغمبر تھے، لیکن ہم ان کو جانتے نہیں اور نہ ان کے اسمائے گرامی کا علم رکھتے ہیں۔

ان نکات کو ذہن میں یکجا طور پر رکھا جائے تو آیت نمبر (۱۰:۳۷)، جس کی وضاحت کے لیے ہم نے تین دوسری آیات درج کی ہیں، میں ''الکتاب'' کے مفہوم کی وسعت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی اور نہ اس میں کوئی اشکال باقی رہتا ہے کہ نوع انسانی کے شعور و فہم کے ارتقا کے اس مرحلے پر قرآن کی شکل میں ایسا صحیفہ نازل کر دیا گیا جو گزشتہ تمام کتب آسمانی میں منزل من اللہ کی تعلیمات کو نوع انسانی کی بلوغت کے تقاضوں کے مطابق سمیٹے ہوئے ہے اور اس طرح اللہ کے دین کو تکمیل کے اس درجے تک پہنچا دیا گیا جس کی بنیاد پر وہ ابدالآباد تک بنی نوع انسان کے لیے واحد ذریعہ فلاح و بہبودی قرار پایا۔

سطور بالا میں کی گئی بحث سے ناگزیر طور پر یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سابقہ ادیان کے مصاحف کی جگہ دے دی ہے۔ مؤخر الذکر کے سلسلے میں گفتگو ادیان سابقہ کے تذکرے کے ضمن میں اس کے بعد آئے گی اور قرآن کے مکمل نظام فکر و عمل پر مشتمل ہونے کی تفصیلات ''قرآن'' اور نظریاتی و اجتماعی مسائل سے متعلق ابواب میں بیان کی جائیں گی۔

ادیان قبل از اسلام

تاریخ دانی کے مختلف ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب ہر خطہ ارض کے بسنے والوں نے تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں علم و ہنر اور اجتماعی زندگی کی کسی نہ کسی صنف کے دائرے میں ترقی کی ہے۔ قومیت پرستی کے جذبے اور اپنے اپنے تمدن و ثقافت کے حق میں عصبیت کی وجہ سے مختلف خطوں، ملکوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے باشندوں نے یہ دعوے کئے ہیں کہ ان کے علم و تمدن نے یکہ و تنہا آسمانوں کی بلندیوں کو چھوا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اقوام جذبہ تعلی کے تحت اپنا رشتہ عالم بالا سے ملاتے ہیں۔ اس طرح وہ قوموں کی برادری میں بزعم خود اپنا مقام عالی تسلیم کروانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ غیر متوازن اور بے بنیاد سوچ کے علاوہ ملک و قوم پرستی کا کیا دھرا ہے۔ قدرت کی طرف سے ہر خطے اور علاقے کے لوگوں کو ذہن و فکر اور عمل و کردار کی صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں۔ اس عالم اسباب میں، جہاں علت و معلول کا خدائی قانون بھی نافذ ہے، جب بھی کسی اجتماعی اکائی نے ان صلاحیتوں کو کسی مقصد کے حصول کے لیے، چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، مناسب اور موثر انداز سے استعمال کیا ہے، مطلوبہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اس طرح بہت سے خطوں میں بسنے والوں نے ایسے ادوار دیکھے ہیں، جبکہ انہوں نے اپنے اپنے معیارات و اقدار کے مطابق نمایاں تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔

اسی طرح کسی نہ کسی دور میں ہر ملک اور خطہ ارض میں بلند پایہ شخصیتوں کا ظہور بھی ہوا ہے۔ ان لوگوں نے تاریخ پر اپنے مرتبہ عالی کے نقوش چھوڑے ہیں۔ لیکن یا تو امتداد زمانہ سے یہ نقوش اپنی شکل و صورت بدلتے رہے، یا دھندلے پڑ گئے اور یا مٹ گئے۔ عام طور پر مذہبی حلقوں میں ایسی شخصیتوں کے ارد گرد الوہیت کے ہالے تعمیر کر دیے گئے۔ اس طرح دنیا میں دوسری عصبیتوں کے ساتھ ساتھ مذاہب کی بنیاد پر بھی افتراق و تشتت کا دور دورہ دیکھنے میں آیا۔ اس اجمال کی حسب ضرورت تفصیلات آگے آئیں گی۔ لیکن اس مرحلے پر قرآن کا موقف بیان کر دینا مناسب ہو گا:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲:۲۱۳)

ترجمہ: ابتدا میں نوع انسانی ایک جماعت ہی کی حیثیت رکھتی تھی (پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے چنانچہ) اللہ نے انبیا کو مبعوث فرمایا جو (نیک اعمال بجالانے والوں کو) بشارت دیتے اور (اعمال بد کے مرتکب ہونے والوں کو) متنبہ کرتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی تاکہ جن باتوں پر ان کے درمیان اختلاف تھا ان کا فیصلہ کر دے اور ان لوگوں نے آپس میں اختلاف اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ ہدایت سے محروم تھے۔ نہیں، وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے پاس موجود تھے۔ لیکن محض آپس کی ضد کی وجہ سے اختلاف میں مبتلا ہو گئے۔ بالآخر اللہ نے ایمان لانے والوں کو (دین کی) وہ حقیقت اپنے حکم سے دکھا دی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔

ان سطور میں جو مسئلہ زیر بحث ہے اس کے پیش نظر ہم ناظرین کی توجہ اس آیت کے دو الفاظ کی طرف خصوصی طور پر منعطف کراتے ہیں۔ ایک تو ''الکتاب'' اور دوسرے ''بغیا بینھم'' الکتاب کا تمام انبیا کی طرف منسوب کرنا ان کی تعلیمات کی یکسانی کی شہادت دیتا ہے۔ اور بغیا بینھم سے ضد، ہٹ دھرمی، آپس کی مناقشہ اور مخالفت کے تمام عوامل مراد ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات سے کہ ہدایت ایک ہی تھی لیکن اختلافات کو جنم دیا گیا، منطقی طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف انبیا کی تعلیمات میں، جو یکساں تھیں، تحریف کر کے اختلاف پیدا کر دیا گیا۔

ان مذاہب وادیان اور ان سے متعلقہ تمدنوں اور تہذیبوں میں سے کسی ایک نے بھی بنی نوع انسان کو بحیثیت مجموعی مخاطب نہیں کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ظہور اسلام سے قبل کائنات اور حیات انسانی کے متعلق کوئی ایسا فلسفہ موجود تھا اور نہ کسی مذہب کے پاس ایسا ضابطہ زندگی اور لائحہ عمل تھا جو ہر عالمی سطح پر دعوت نفاذ دینے کی صلاحیت کا حامل ہوتا، نہ اسلام کے سوا کوئی ایسا دین (Ideology) موجود ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کے مختلف خطوں میں جو اعتقادات اور توہم پرستی کے مظاہر پائے جاتے تھے اور جن نمایاں مذاہب اور ان کے داعی حضرات کے پیرو موجود تھے ان کا سرسری جائزہ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرے گا۔

عرب

یہ ملک اور اس میں بسنے والی آبادی اسلام کے مخاطب اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مشرکین ہی کا ایک عنصر تھا جس سے اسلام کو عہدہ برآ ہونا تھا۔ یہ خیال تاریخ سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ قرآن کے صفحات میں پھیلے ہوئے متعلقہ مضامین سے۔ ''تاریخ ارض القرآن'' میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''۔۔۔ اسلام کو آغاز بعثت میں کسی ایک سے نہیں بلکہ سینکڑوں مذاہب اور مختلف الاصول عقائد سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ یہ پڑھ چکے ہو کہ عرب، اختلاف عقائد اور کثرت مذاہب کی بناپر، گویا کائنات مذہبی کا عالم اصغر تھا، اور تعجب نہیں کہ قرآن کے نزول کے لیے عرب کی سرزمین کا انتخاب منجملہ اور وجوہ کے ایک اس بناپر بھی ہو کہ یہاں بحث و مناظرہ کے لیے اس کو ہر قسم کے مخاطب اور ہر مذہب کے وکیل مل جائیں گے'' (صفحہ ۳۸۶)

اس طرح یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ عربوں کی زبان ان کے امی اور سیاسی و معاشرتی حیثیت سے کسی مرکزی نظام سے محروم ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کے مرحلہ ارتقا کے مطابق شاید وسعت و تمول کی خصوصیات سے محروم تھی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اس زبان کو ادوار قدیم میں مختلف تمدنوں کی زبان پر تفوق کا مقام حاصل رہا ہے۔ اس زبان کے دور ارتقا کو زمانہ جاہلیت کے اندر محدود کرنا تاریخی حقائق کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے۔ اس کی وسعت و بلاغت جو قرآن جیسی کتاب کی متحمل ہو گئی قدیم تہذیبوں اور تمدنوں کے ماحول میں تعمیر ہوئی۔

لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہونے کے باوجود بعثت اسلام کے زمانے میں عربوں میں شعر و شاعری کا اونچے درجے کا ذوق پایا جاتا تھا۔ قبائلی اجتماعات میں مقررین اپنے خطابات میں بلند معیار کی فصاحت و بلاغت کے جوہر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ایک ایک شخص کو ہزاروں اشعار یاد ہوتے تھے۔ ان میں ادبی ذوق نمایاں طور پر پایا جاتا تھا۔ اس وجہ سے وہ غروب آبادیوں اور اقوام کو عجمی (Speechless) کا نام دیتے تھے۔

ان کی اجتماعی زندگی قبائلی سطح کی تھی۔ ہر قبیلہ اپنا الگ تشخص رکھتا تھا۔ مختلف قبائل ایک دوسرے سے دوستی اور دشمنی کا تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا جنگ و جدل کا میدان گرم رہتا تھا۔ اس وجہ سے اپنے قبیلے کے ساتھ وابستگی اور اس کے حق میں وفاداری و عصبیت کے جذبات بہت شدید ہوتے تھے۔ بہت سی صورتوں میں چھوٹے چھوٹے معاملات پر اختلافات و نزاعات متعدد نسلوں کی مدت پر پھیلی ہوئی بین القبائلی لڑائیوں کا باعث بن جاتے۔ ملکی سطح پر کسی مرکزی اقتدار کی عدم موجودگی کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ کا بازار بھی گرم رہتا تھا۔ دوران سفر ہر ایک کو اپنی حفاظت کا خود انتظام کرنا ہوتا تھا۔

عربوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے جو حالات تاریخوں میں دیئے گئے ہیں ان کے سرسری مطالعہ سے ان کے کردار کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ عربوں کی تاریخ خود ان کے ملک اور اس کی حدود سے باہر کے علاقوں پر پھیلی ہوئی تہذیبی و تمدنی روایات پر مشتمل ہے۔ اقوام عاد، ثمود، اہل مدین وغیرہ کی مادی ترقیوں کی طرف قرآن میں اشارات موجود ہیں۔ اسی طرح حمیر، سبا اور کہلان جن کا تعلق قحطانی عربوں سے رہا ہے، بھی تمدنی سطح پر قابل ذکر ہیں۔ سد مارب کا تذکرہ تو قرآن میں موجود ہے۔ یہ بند دور حاضر کے تعمیر شدہ بندوں سے فن تعمیر (Dams Engineering) کی مہارت کے مظہر کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس سے نہ صرف زراعتی پیداوار کو ترقی دینے کے لیے نہریں نکالی گئیں بلکہ جن دو پہاڑوں کے درمیان اسے تعمیر کیا گیا تھا اس کے پانی کی سطح کو ان کی چوٹیوں تک لے جایا گیا۔ ان چوٹیوں پر خوشنما باغات اگائے گئے۔ نیز نہروں کے دونوں طرف باغات اور سرسبز کھیت پر لطف کا سماں پیدا کرنے کا باعث بنے ہوئے تھے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی انگریزی میں لکھی ہوئی تفسیر قرآن کے صفحہ ۱۱۳۸ پر لکھا ہے کہ فرانسیسی سیاح ٹی۔جے آرند (T.J.Aranud) نے ۱۸۴۳ء میں کھنڈرات کی پیمایش کی تو بند کی لمبائی دو میل اور اونچائی ۱۲۰ فٹ پائی گئی۔

قرآن کہتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۭ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ (۳۴:۱۵)

ترجمہ: اہل سبا کے لیے ان کے وطن میں نشانی موجود تھی۔ دائیں اور بائیں طرف دو باغ تھے۔ (ان سے کہا گیا کہ) ''اپنے رب کے عنایت کردہ رزق میں سے کھاؤ اور اس کا شکر بجالاؤ۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کے آباؤاجداد حضارت و شہریت کے تمدنی معیارات سے ناآشنا نہ تھے۔ نسلی طور پر ان کا رشتہ آشوریوں اور کلدانیوں سے بھی ملتا تھا جنھوں نے عراق میں اپنے اپنے تمدنوں کی تعمیر کی۔ مزید برآں یہ عربوں ہی کے آباؤاجداد تھے جو تاریخ میں چرواہے باشاہوں (Hyksos) کے نام سے مشہور ہیں اور جنھوں نے سترھویں صدی قبل مسیح میں مصر میں اپنا اقتدار قائم کیا اور اس ملک کے لوگوں کو گھوڑے، رتھ اور قلعہ بندی سے روشناس کرایا۔

اجمالی طور پر پیش کردہ عربوں کے اس تاریخی پس منظر کے نتیجے میں ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی وجہ سے بالقوہ وہ صلاحیت، استعداد اور تعمیری جوہر کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا جس نے ان کو اسلام کا مخاطب اول ہونے کا استحقاق بخشا۔

تمام قوموں اور ان کے شہریوں کے اندر نوعی اعتبار سے ایک ہی قسم کی فطرت پائی جاتی ہے۔ لیکن فطری خصوصیات کو استعمال کرنے کے لیے پیش نظر مقاصد کے حسن و قبح پر ان کے جادۂ ہدایت، ضلالت پر رواں دواں ہونے کا انحصار ہے۔ مثلاً کسی قوم کے افراد میں شجاعت کا ملکہ پایا جاتا ہے۔ اب اس شجاعت کا اظہار اچھے کاموں کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے اور برے کاموں کے لیے بھی۔ اسی طرح اس قوم میں حمیت قومی کا وصف بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ اب اگر تو اس قوم اور اس کے افراد کی تربیت صحیح خطوط پر ہوئی ہے اور اس کے پیش نظر اعلیٰ اقدار کا نفاذ ہے تو وہ تعمیری کاموں میں منہمک رہے گی۔ لیکن اگر اس کے پاس رہنمائی کے لیے کوئی تعمیری نظریہ نہیں تو یہی خصوصیات شجاعت و حمیت اسے چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا کر تخریبی کاموں پر مائل کردے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی صفات سے متصف قوم بے عملی کی زندگی نہیں گزار سکتی۔

کچھ ایسا ہی حال ظہور اسلام کے وقت عربوں کا تھا۔ ان میں قوت عمل پائی جاتی تھی۔ چونکہ ان کے پاس کوئی دین صحیحہ یا مادی نظریہ تعمیر موجود نہ تھا اس لیے وہ اپنی استعداد عمل کو ایسی سرگرمیوں میں صرف

کرتے تھے جو ان کی قومی زندگی کے لیے مضرات اور انتشار کا باعث تھیں۔ ان کی ہمسایہ اقوام ان کو غیر متمدن تصور کرتی تھیں۔ لیکن ان میں خودداری، دلیری، اپنی بات کی پختگی، جنگ کے موقع پر جان پر کھیل جانے کی ہمت، سخاوت اور مہمان نوازی جیسی صفات پائی جاتی تھیں۔ ان اوصاف پر وہ فخر کرتے تھے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ان کو عزیمت کے ساتھ زیر عمل لانے کو باعث عظمت و مباہات سمجھتے تھے۔ بستر پر مرنے کو بزدلی اور کم ہمتی کی علامت قرار دیتے تھے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ایسی خصوصیت کے حامل معاشرے کو اگر کوئی اعلیٰ وارفع مقصد مل جائے تو وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے بہترین افرادی مواد فراہم کر سکتا ہے۔

ہم سطور بالا میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ عرب میں بعثت اسلام کے موقع پر بہت سے مذاہب کے پیرو موجود تھے۔ دوسرے مذاہب کے متعلق تو ہم ان کے عنوان کے تحت لکھیں گے لیکن یہاں ہم اس عرب قوم کی اکثریت کی حالت پر گفتگو کریں گے۔ جس کے پاس برائے نام سطح پر بھی کوئی منزل من اللہ دین موجود نہ تھا اور جس کا مذہب۔۔۔ اگر اسے مذہب کہا جا سکتا ہے تو۔۔۔ شرک تھا۔ وہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل کے ناموں سے واقفیت رکھتے تھے اور بزعم خود انہی کے اتباع میں اور انہی کی سنت پر عمل پیرا ہو کر، حج کی رسوم ادا کرتے تھے۔ لیکن ان کے خمیر اور ذہن و قلب کی گہرائیوں میں یہ بات مضبوطی سے پیوست ہو گئی تھی کہ جس مرئی یا غیر مرئی، خیالی یا حقیقی چیز سے انہیں عقیدت ہوتی تھی اسے وہ پتھر کے بت کی شکل دے کر حاجت روا قرار دیتے تھے۔ اس طرح مختلف بتوں کو کائنات اور حیات زندگی کے مختلف شعبوں کے نگران قرار دے کر ان کے حضور نذرانے پیش کرتے اور اپنے مقاصد حیات کے حصول کے لیے ان کے سامنے عرضداشتیں گزارتے۔

اگرچہ مکہ میں خانہ کعبہ اسلام سے قبل بتوں اور بت پرستی کا سب سے بڑا گڑھ تھا، لیکن بتوں کا یہی ایک مرکز نہ تھا۔ بلکہ ہر قبیلے کے اپنے اپنے بت تھے۔ وہ ان کو اپنا کارساز سمجھتے تھے۔ انہیں اپنے ہاں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کو چڑھاؤں کے ذریعے سے خوش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض قبائل خانہ کعبہ کی مرکزیت کے حوالے سے اپنا کوئی نہ کوئی بت وہاں بھی رکھ دیتے تھے۔ اس طرح روایات کے مطابق خانہ کعبہ میں بتوں کی تعداد تین سو ساٹھ تک پہنچ گئی تھی۔ (صحیح بخاری، فتح مکہ)

بت پرستی کی داستان بہت طویل اور اس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ علم الآثار کے انکشافات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انسان کو انبیاء کے ذریعے سے توحید کی دعوت ملتی رہی ہے لیکن اس کے باوجود محسوسات کا اسیر ہونے کی وجہ سے انسان تمام خطہ ہائے ارض میں بت پرستی کی مختلف شکلوں کے مرض میں مبتلا رہا ہے۔ آج تک وہ اس عارضے سے خلاصی نہیں پاسکا۔ توحید کی راہ ہدایت ترک کر کے وہ کس طرح شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوتا رہا ہے اس کی ایک مثال ہم مولانا سید سلیمان ندوی کی ''تاریخ ارض القرآن'' سے ایک اقتباس کے ذریعے سے پیش کرتے ہیں:

''ہمارے ارباب روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیل کے بعد ان کی اولاد دین ابراہیمی پر قائم تھی۔ ان میں رفتہ رفتہ بت پرستی کا شیوع اس طرح ہوا کہ خانہ کعبہ جو پتھروں سے بنا تھا، ان کے نزدیک مقدس تھا۔ جب وہاں سے کسی اور مقام پر چلنے لگتے تو اس کا ایک پتھر تبرکاً اٹھا لیتے۔ بعد کو خانہ کعبہ کا امتیاز بھی اٹھ گیا۔ جو پتھر اچھا سا چکنا مل جاتا اسی کو اٹھا لیتے اور اس کو اپنے گھر کا دیوتا بنا لیتے۔'' (صفحہ ۸-۳۷۷)

بین القبائلی جنگوں میں ہر قبیلہ جنگ سے متعلق اپنے اپنے بت سے استمداد کرتا۔ بعض اوقات فاتح قبیلہ مفتوح کے بت ہی اٹھا کر لے جاتا۔ اس کے بعد موخر الذکر اس کوشش میں مصروف ہو جاتا کہ کسی طرح اپنے بت واپس حاصل کرے۔ لیکن اس صورت حال کے پیش آجانے کے باوجود انہیں بتوں کی بے بسی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ فی الحقیقت شرک انسان کی عقل و خرد کو اس قدر ماؤف کر دیتا ہے کہ وہ صلاحیت فکر و تدبر ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔

بتوں سے عربوں کی وابستگی اس قدر پختہ تھی کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تئیس سالہ زمانہ نبوت میں سے تیرہ برس مسلک شرک سے نبرد آزما ہونے میں صرف کرنا پڑے۔ ان تیرہ سالوں کے دوران قرآن کی جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں مرکزی مضامین توحید شرک اور معاد کے نظریات پر مشتمل ہیں۔

مفصل گفتگو تو ''توحید'' کے عنوان کے تحت ہو گی، ہم یہاں چند آیات کا حوالہ دیتے ہیں جن سے شرک کی حقیقت، قرآن کی دعوت توحید اور اجتناب عن الشرک کی نشاندہی ہوتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ (۲:۱۶۵)

ترجمہ: اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے۔

اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (۱۶:۲۲)

ترجمہ: تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے (اس کے سوا کوئی نہیں)

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔا (۴:۳۶)

ترجمہ: اور اللہ کی بندگی کرو، اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔

وَيَوۡمَ نَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ نَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَيۡنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ۲۲ ثُمَّ لَمۡ تَكُنۡ فِتۡنَتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشۡرِكِيۡنَ(۲۳-۲۲:۶)

ترجمہ: اور جس دن ہم ان سب کو اٹھا کر جمع کریں گے۔ پھر جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا ہے ان سے کہیں گے "بتلاؤ تمہارے (ٹھہرائے ہوئے)، شریک کہاں گئے جن کے متعلق تم زعم باطل رکھتے تھے؟ تو اس وقت وہ اس کے سوا کوئی فریب نہ کر سکیں گے۔ "خدا کی قسم تو ہمارا پروردگار ہے، ہم شرک کرنے والے نہ تھے۔"

ہم نے یہاں جن پانچ آیات کا حوالہ دیا ہے ان میں سے پہلی آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مشرکین بعض ہستیوں کی طرف اللہ تعالیٰ کی برابری، اس کی ہمسری اور اس کے ہم پلہ ہونے کا مقام منسوب کرتے ہیں۔ مشرکین عرب یہی کرتے تھے کہ وہ بتوں کو کارساز، مشکل کشا اور کائنات و انسانی معاملات میں منتظم و مقتدر قرار دیتے اور اس عقیدے کی بنیاد پر وہ اللہ تعالیٰ اور اپنے بتوں کو معنوی اعتبار سے ہم مرتبہ سمجھتے تھے۔

دوسری آیت کے ذریعے سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ وہ اپنے بتوں کو جن صفات سے متصف کرتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہیں اور وہ یکتا ہے۔

تیسری آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بلا شرکت غیرے کرو۔ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں زندگی کے جملہ معاملات میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجالانا شامل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مخاطبین شرک میں ملوث تھے لہٰذا انہیں اس حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔

چوتھی اور پانچویں آیات میں شرک کے عمل کا اور جن ہستیوں کو وہ اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے ان کے انجام اور ان کی بے حقیقتی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حشر کے روز مشرکین حلفاً یہ کہیں گے کہ وہ شرک کے

مرتکب ہی نہیں ہوئے۔ گویا وہ اپنی حرکت شرک سے اور جن کو وہ اللہ کے شریک ٹھہراتے تھے، ان سے لا تعلقی، تنفر اور بیزاری کا اظہار کر دیں گے۔

ہم یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ مشرکین عرب عام طور پر اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے، اگرچہ ان میں دہریوں کی معمولی تعداد بھی پائی جاتی تھی۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ موجود تو ہے لیکن اس نے اس عالم کے انتظام وانصرام اور انسانوں کے نفع و نقصان کے سلسلے کے اختیارات ان بتوں کو تفویض کر دیئے ہیں۔

چنانچہ قرآن کہتا ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۸۴ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۸۵ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۸۶ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۸۷ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۸۸ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ۸۹ (۸۴-۸۹:۲۳)

ترجمہ: (اے پیغمبر! ان منکروں سے) کہہ دے "اچھا اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ، زمین اور وہ تمام مخلوقات جو اس میں ہیں، کس کے لیے ہیں؟" وہ فوراً کہیں گے "اللہ کے لیے" تو کہہ پھر کیا ہے کہ تم غور نہیں کرتے؟" تو ان سے پوچھ "وہ کون ہے جو ساتوں آسمانوں کا پروردگار ہے؟ اور (جہانداری کے) عرش عظیم کا مالک ہے؟" وہ فوراً کہیں گے: "یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے" تو کہہ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ (شرک وانکار کے نتیجے سے) ڈرتے نہیں" تو ان سے پوچھ: "اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ، وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کی بادشاہی ہے؟ اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے، اور کوئی نہیں جو اس سے اوپر پناہ دینے والا ہو؟" وہ فوراً کہیں گے: "یہ صفتیں تو اللہ ہی کے لیے ہیں" تو کہہ "پھر یہ کیا ہے کہ تمہاری عقل ماری گئی؟"

ہم انہی آیات پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ قرآن میں اور بھی متعدد ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب خدا کی ہستی کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ مشرکین کا خاصا ہے ان کی توجہات ہمیشہ ان ہستیوں پر ہی مرکوز رہتی ہیں جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کا ساجھی مانتے اور دنیوی معاملات کے فیصلوں میں بااختیار تصور کرتے ہیں۔ وہ چاہے قولاً اللہ کے وجود کو تسلیم کریں لیکن فی الحقیقت اس کو (معاذ اللہ) کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ قرآن اس بات کا تذکرہ یوں کرتا ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹:۴۵)

ترجمہ: جب خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو جن لوگوں کو حیات اخروی پر کامل ایمان نہیں تو وہ جھلا اٹھتے ہیں۔ اور جب خدا تعالیٰ کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اظہار بشاشت کرتے ہیں۔"

اس آیت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کو بتوں کی شکل میں اپنے خداؤں کے ساتھ کس قدر وابستگی تھی۔ ایک ایسی قوم کو جس کی خصوصیات ہم نے اس سے قبل بیان کی تھیں اس کے مسلک سے ہٹا کر دین حنیف پر ایمان لانے پر آمادہ کرنا بہت ہی کٹھن اور ہمت طلب کام تھا۔

معاشرتی حیثیت سے عربوں کی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی۔ ہم نے اس سے قبل ان کی سیرت و کردار کے جو پہلو گنوائے ہیں، انہوں نے ان کے مزاج میں قساوت، قلبی شدت کی حد تک پیدا کر دی تھی۔ ان کی درشتی نے انہیں ترحم و تکریم کی صفات سے محروم کر رکھا تھا۔ مہمان نوازی اور سخاوت قسم کی جو حرکات ان سے سرزد ہوتی تھیں وہ تفاخر و ترضع کے جذبات کے تحت روبہ عمل آتی تھیں نہ کہ اخلاق حسنہ کے کسی تصور کے پیش نظر۔ قتل و غارت گری میں وہ بہت جری تھے اور ان پر بھی فخر کا اظہار کرتے تھے۔ قبائلی عصبیت کے تحت ان کے آباؤ اجداد نے اپنی جانوں کا جو اتلاف کیا ہوتا تھا اسے علامت علو شان کے طور پر ان کی شاعری میں نمایاں مقام حاصل ہوتا تھا۔ غلط قسم کے تصور انا کا اظہار انہیں اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے پر اکسا دیتا تھا۔

ان کے ہاں عورتوں کا معاشرے میں قطعاً کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ بلکہ انہیں دبا کر رکھنا مردانگی کی علامت تصور کی جاتی تھی۔ اپنے باپ کی بیوہ بیویوں کو گھر میں ڈال لینا ان کا معمول تھا۔ اظہار اور ایلا قسم کے حربوں کے ذریعے سے بیویوں کو گھروں سے نکال دیتے اور انہیں معلق رہنے پر مجبور کرتے۔ چونکہ ان کے پاس کوئی مالی وسائل نہیں ہوتے تھے لہٰذا وہ فلاکت و نکبت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتیں۔ یہ تھی وہ قوم جس کی عادات و اطوار اور عقائد کا ہم نے اختصار کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اور جس سے سب دوسری اقوام سے قبل اسلام کو سابقہ پڑا۔

اس کے بعد ہم یہود و نصاریٰ کی دینی حالت پر تبصرہ کریں گے۔ عرب میں یہ لوگ مختلف جگہوں (Pockets) میں آباد تھے۔ چونکہ یہ ادیان کے حامل تھے لہٰذا ان میں اہل علم کی اچھی خاصی تعداد پائی

جاتی تھی۔ امی ہونے کی وجہ سے عرب کے کفار و مشرکین ان سے مرعوب تھے۔ اگرچہ مذہبی معاملات کے سلسلے میں اول الذکر آخر الذکر سے رجوع کرتے رہتے تھے لیکن ان کے ادیان قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ البتہ اسلام کو ان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان کے قائدین اپنے مفادات کے لیے اس نئے دین کو خطرہ کی علامت تصور کرتے تھے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف کفار و مشرکین کو بڑھکانے اور متحد ہو کر اس کا راستہ روکنے پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔

اہل کتاب

قرآن میں اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کے منزل من اللہ دین سے انحراف اور اس کی تعلیمات اور صحائف میں تغیر و تبدل کرنے کے سلسلے میں تین طریقوں سے گفتگو کی گئی ہے۔ اولاً، بعض آیات میں یہود و نصاریٰ کی مشترک بے ضابطگیوں کا یکجا تذکرہ کیا ہے۔ دوئم خصوصی طور پر دین کے معاملے میں یہودیوں کے ناروا رویے کی نشاندہی کی ہے۔ سوئم، تعین کے ساتھ عیسائیوں کی طرف سے اللہ کے دین کو بگاڑنے اور اس کی روح کو مسخ کر دینے کی مذمت کی ہے۔ لہٰذا ہم بعثت اسلام کے وقت اہل کتاب کے حالات کے متعلق تین عنوانات کے تحت گفتگو کریں گے۔

یہود و نصاریٰ کی ایک ہی طرح کی گمراہیاں

آغاز گفتگو ہی میں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے پیش نظر ان ادیان کی تعلیمات پر تبصرہ کرنا یا انبیا کی دعوت کے سلسلے میں ان کے رد عمل کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے۔ ہم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی تعلیمات کو عملی دائرے ہی میں نظر انداز نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ انہیں فکری دائرے میں مسخ بھی کر دیا گیا تھا۔ صحف آسمانی بھی اپنی اصلی حالت میں موجود نہ رہے تھے۔ اس صورت حال کا قرآن میں مفصل تذکرہ ہے لیکن ہم چند آیات کا حوالہ دے کر مسئلے کے صرف اسی پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جسے اجاگر کرنا مقصود ہے۔

قرآن یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (۳:۷۱)

ترجمہ: اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو اور حالانکہ تم جانتے ہو۔

یہ تخاطب دراصل ان کے مذہبی رہنماؤں سے ہے۔ عوام نے تو تقلید ہی کرنا ہوتی ہے۔ ان کے اہل علم اور رہبان واحبار کے دو جرائم کی اس آیت میں نشاندہی کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ وہ جو صحیح تعلیمات باقی رہ گئی تھیں ان کو بھی خود ساختہ خیالات و نظریات سے خلط ملط کر کے بگاڑ دیتے تھے۔ دوسرے اپنے مفادات کی حفاظت کی خاطر وہ اصل احکامات صحف الٰہی کے کتمان کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ حرکات وہ لاعلمی، یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ بالارادہ اور جانتے بوجھتے کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتب کے مندرجات کو مسخ کرنے کی جسارت کے باوجود وہ اس سے نہایت قریبی تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ ہمارا اس سے ابنیت کا رشتہ ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ وَالنَّصٰرٰى نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ (۵:۱۸)

ترجمہ: اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں، ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ (ہم جو کچھ بھی کریں ہمارے لیے نجات ہی نجات ہے)۔

اگر تو وہ اس ادعائے باطل سے یہ مراد لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا نسبی تعلق ہے تو یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ لیکن اگر اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انہیں اللہ کا بہت قرب حاصل ہے تو وہ دنیا کو ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس قسم کے تقدس و برتری کے دعاوی انبیا کی سنت سے کھلے ہوئے انحراف کے مترادف ہیں۔ یہ حضرات تو متاع جان و مال کو اللہ کے راستے میں لٹا کر بھی رات دن استغفار کے ورد میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ پھیلانے سے لوگوں میں اعمال حسنہ بجا لانے کی تکلیف سے اپنے آپ کو آزاد تصور کرنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

قرآن میں جو تمام سابقہ انبیا و صحف آسمانی کا مصدق و نگران ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۹-۳۸:۲)

ترجمہ: ہم نے کہا: اترو یہاں سے سب، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

زمین پر زندگی گزارنے کے لیے خلعت خلافت سے سرفراز کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش ہی میں حضرت آدم کو اس قانون خداوندی سے آگاہ کر دیا تھا کہ فلاح و ناکامی کا انحصار اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی قبولیت و اتباع اور اس کے جھٹلانے اور اس سے روگردانی کرنے پر ہے۔ اس اصول کے اطلاق سے کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا۔ ویسے اللہ کی رحمت و بخشش کا دائرہ لامتناہی وسعت رکھتا ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی طرف سے اللہ کے ساتھ ایسے رشتے جوڑتا پھرے جن کے ذریعے سے وہ اللہ کے احکامات کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

اوپر کی آیت میں پیش کردہ یہود و نصاریٰ کا اللہ کی ابنیت کا تصور اپنے اندر بے عملی کے ایک عظیم فتنے کے پھیلنے کے امکانات رکھتا تھا۔ یہ دین اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے اہم ترین مقصد کو منہدم کر دینے کا باعث بن سکتا تھا۔

انہوں نے اللہ کی ابنیت کے تصور کے دائرے کو اس قدر وسعت دے دی کہ اپنے اپنے دین کے داعیوں کو نسبی سطح پر اللہ کے بیٹے قرار دے دیا۔ شرک کی اس سے زیادہ خوفناک اور اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی اور کوئی شکل نہیں ہو سکتی۔ اس تصور کے ترویج پا جانے سے اللہ کے بھیجے ہوئے دین کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ قرآن ان کی اس حرکت کو یوں بیان کرتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹:۳۰)

ترجمہ: اور یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی باتیں ہیں، محض ان کی زبان سے نکالی ہوئی (ورنہ سمجھ بوجھ کر کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتا) ان لوگوں نے بھی انہی کی سی بات کہی جو ان سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت! یہ کدھر کو بھٹکے جا رہے ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں یہ طریقہ رائج ہو گیا تھا کہ جو تحریف شدہ کتابیں ان کے پاس موجود تھیں وہ ان کے پروہتوں، پادریوں، رھبان اور احبار کے قبضے میں ہوتی تھیں۔ عام لوگوں کی ان تک رسائی نہ ہوتی تھی۔ جس حکم یا حصہ کتاب کو وہ چاہتے چھپا دیتے، جس کو چاہتے ظاہر کرتے۔ اس طرح، گویا مذاہب قبل از اسلام میں سے ہر ایک پر مذہبی پیشواؤں کے ایک ایک گروہ کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی۔ مرور زمانہ سے اور ان کے مفادات کے تقاضوں کے ذریعے سے تعلیمات کتب الٰہی تحریف اور حشو زوائد کا شکار ہو گئیں۔ اس طرح ہر مذہب کی وہ تعلیمات جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا اور رسل کے ذریعے سے بھیجی گئی تھیں یا تو مسخ ہو گئیں یا ناپید ہو گئیں۔ یہودیوں میں جو صورت ظہور اسلام تک پیدا ہو گئی تھی وہ درج ذیل حدیث سے واضح طور پر سامنے آجاتی ہے:

وعن عبداللہ ابن عمر ان الیھود جاوا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرو الہ ان رجلا منھم وامراۃ زنیا فقال لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماتجدون فی التوراۃ فی شان الرجم قالو انفضحھم ویجلدون قال عبداللہ بن سلام کذبتم ان فیھا الرجم فاتوا بالتوارۃ فنشروھا فوضع احدھم یرہ، علی ایہ الرجم فقرا ما قبلھا وما بعد ق یا محمد فیھا ایہ الرجم فقالوا صد ق یا محمد فیھا ایہ الرجم فامر بھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فرجما ـــ وفی روایۃ قال ارفع یدك فرفع فاذا ایہ الرجم تلوح فقال یا محمد ان فیھا ایہ الرجم ولکنا نتکاتمۃ بیننا فامر بھما فرجما (متفق علیہ)

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ ان (کی قوم) میں سے ایک مرد اور ایک عورت زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا "تم تورات میں رجم کے متعلق کیا پاتے ہو؟ "ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل کرتے اور کوڑے مارتے ہیں" (اس پر) عبداللہ بن سلام نے کہا "تم جھوٹ کہتے

ہو۔ تورات میں رجم (کی سزا) مذکور ہے۔ تورات لاؤ'' (یہودی توراۃ لائے) اور اس کو کھولا۔ ان میں سے ایک نے رجم کی آیت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، اور جو اس کے قبل اور بعد تھا اسے پڑھنے لگا۔ عبداللہ بن سلام نے کہا ''اپنا ہاتھ اٹھاؤ'' (پھر یہ بات واضح ہو گئی) کہ اس (تورات) میں رجم کی آیت موجود ہے۔ پھر یہودیوں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ (عبداللہ بن سلام) سچ کہتے ہیں۔ اس میں رجم کی آیت موجود ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے مطابق (زانی اور زانیہ کو) رجم کے لیے جانے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کر دیئے گئے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ عبداللہ بن سلام نے کہا: ''اپنا ہاتھ اٹھاؤ'' اس نے ہاتھ اٹھایا تو رجم کی آیت ظاہر ہو گئی۔ (یہودیوں میں سے) ایک نے کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تورات میں رجم کی آیت موجود ہے لیکن ہم اس کو ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں'' چنانچہ حضور نے دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔

جیسا کہ ہم یہود کے عنوان کے تحت عرض کریں گے، توراۃ کی جملہ تعلیمات مٹ نہیں گئی تھیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، یہودی اہل علم جس حکم کو چاہتے چھپا دیتے اور جس کو چاہتے ظاہر کرتے۔ ہم نے جو حدیث نقل کی ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

ان کے فقیہوں اور پادریوں نے تورات اور انجیل اور عوام پر اپنی ایسی مذہبی دھاک بٹھار کھی تھی کہ ازروئے حق تشریع احکامات بھی کرتے تھے اور اجرائے احکام بھی۔ ان کی اس حرکت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۹:۳۱)

ترجمہ: انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور درویشوں کو خدا کا مقام دے دیا۔ اور مریم کے بیٹے مسیح کو بھی اور ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ صرف ایک ہی معبود کی پرستش کرو۔ کوئی معبود نہیں مگر صرف وہی۔ اس کی ذات اس سا جھے سے پاک ہے جو یہ اس سے منسوب کر رہے ہیں۔

اس آیت کی عبارت ہی سے یقینیات کی حد تک اللہ تعالیٰ کی یہ منشا واضح ہو جاتی ہے کہ کسی کو اللہ کے سوا قانون سازی کا حق مطلق دینا شرک کا مرتکب ہونے کے ہم معنی ہے۔ آیت مذکورہ کے اس مفہوم کو حضور

نے خود واضح کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' جلد دوئم کے صفحہ ۱۲۴ پر ترمذی اور بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے:

''عدی بن حاتم طائی جو پہلے عیسائی تھے، کہتے ہیں، آنحضرت نے جب براۃ کی یہ آیت پڑھی تو میں نے عرض کیا ''ہم انہیں پوجتے تو نہیں'' آپ نے کہا ''کیا ایسا نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہرا دیتے ہیں تم حرام سمجھ لیتے ہو، جس بات کو حلال کر دیتے ہیں، حلال مان لیتے ہو؟''

عرض کیا ''ہاں'' فرمایا ''یہی انہیں پوجنا ہے۔''

یہود و نصاریٰ نے اللہ کے نازل کیے ہوئے دین میں اعتقاد و عمل کے دائروں میں جو بگاڑ پیدا کر دیا تھا اس کے پیش نظر اسلام نے ان کے سامنے یہ دعوت پیش کی:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)

ترجمہ: اے اہل کتاب! یہ واقعہ ہے کہ ہمارا رسول تمہارے پاس آ چکا۔ کتاب الٰہی (یعنی تورات و انجیل) کی بہت سی باتیں جنہیں تم (ہوائے نفس سے) چھپاتے رہے ہو، وہ تمہارے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے۔ اور بہت سی باتوں سے در گزر کر جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آ چکی، اور ایسی کتاب آ چکی جو (اپنی ہدایات کے اعتبار سے) واضح ہے۔

دعوت کا کس قدر خوبصورت اور مبنی بر حق انداز ہے۔ اہل کتاب کے ادیان کی اور ان کی کتابوں کی تکذیب نہیں کی گئی۔ جس حالت اور جن اصولوں کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے تھے، قرآن تو ان کی بار بار تصدیق کرتا ہے۔ لیکن ان کے فقہا اور پادری اخفائے حق کے مرتکب ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ تعلیمات کا جس طرح حلیہ بگاڑ چکے تھے اس کے پیش نظر انہیں قرآن کے ذریعے سے آئے ہوئے دین حق کو قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اس کے بعد ہم بعض ایسی آیات قرآنی پیش کریں گے جن میں یہود و نصاریٰ کو الگ الگ خطاب کر کے دین کے معاملے میں ان کی بے راہ رویوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

یہودیوں کے مذہبی قائدین کی جسارت اور خوف خدا سے ان کی بے نیازی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ خود نوشتہ عبارات واحکامات کو اللہ تعالیٰ کی وحی قرار دے دیتے تھے۔ جب حالات یہاں تک پہنچ جائیں تو دین کے اصلی حالت میں برقرار رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو گمراہی کے راستے پر ڈالنے کی یہ بدترین صورت ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ ان سرگرمیوں کو ذریعہ اکتساب زر بناتے تھے۔ عوام کی خوش اعتقادیوں اور ان کی لاعلمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۸ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۷۹-۷۸:۲)

ترجمہ: اور ان میں ان پڑھ ہیں جو کتاب الٰہی کو اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال کرتے ہیں اور محض وہموں گمانوں میں مگن ہیں۔ پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے ذریعے سے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ پس ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں۔

وہ انہی حرکات پر اکتفا نہیں کرتے تھے جن کا تذکرہ آیات بالا میں کیا گیا ہے بلکہ احکام خداوندی کو کتاب (تورات) سے حذف کر دیتے تھے۔ یا ان کی ایسی تاویل کر دیتے تھے جس سے ان کا اصل مطلب مفقود ہو جاتا تھا۔ اس کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ (۱۳:۵)

ترجمہ: کلام کو اس کے ٹھکانے سے پھیرتے ہیں (یعنی اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے ہیں)

کون سا حربہ تھا جو یہ لوگ دین موسوی کو مسخ کرنے کے لیے استعمال نہ کر چکے تھے۔

ایسی تمام شعوری حرکات کے علی الرغم وہ بزرگی، قرب الٰہی اور اللہ کے محب ہونے کے ان دعاوی کے علاوہ جن کا ہم اس سے قبل تذکرہ کر چکے ہیں، اپنی اخروی فلاح کا بھی اعلان کرتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی طرف سے بھیجی گئی کسی کتاب میں ایسے دعاوی کے لیے جواز کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ اجر آخرت اعمال کے ساتھ مشروط ہے۔ لیکن وہ کہتے تھے:

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (۲:۸۰)

ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان کے ادعا کا اپنی طرف سے رد عمل ظاہر کرتے ہیں:

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (۲:۸۰)

ترجمہ: پوچھو: کیا تم نے اللہ کے پاس اس کے لیے کوئی عہد کرا لیا ہے؟

ظاہر ہے کہ کسی فرقہ و گروہ بندی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے کسی کے ساتھ فلاح آخرت کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا۔ نتائج ایمان و عمل کے اعتبار سے اس کے نزدیک تمام انسان یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ادعائے نجات اخروی کے برسر حق ہونے یا نہ ہونے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کر دی اور حضور سے کہا:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲:۹۴)

ترجمہ: ان سے کہو کہ اگر دار آخرت کی کامیابیاں اللہ کے ہاں دوسروں کے بالمقابل تمہارے ہی لیے مخصوص ہیں تو موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

لیکن یہ واضح مشاہدے کی بات ہے کہ وہ زندگی اور اس کے زخرفات کے بہت حریص تھے۔ ایسے انسان اور ان پر مشتمل معاشرہ ہمیشہ عالی ہمتی، جو دین پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے، سے محروم ہوتا ہے۔

تورات کی تعلیمات میں تغیر و تبدل کرنے کی جسارت کرنے میں اس کی تاریخی حیثیت کو بڑا دخل حاصل تھا۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی کہ حضور کی بعثت کے وقت یہودیوں کے پاس جو تورات تھی وہ حضرت موسیٰ پر نازل شدہ تورات سے مختلف تھی۔ اس میں بہت سا تغیر و تبدل ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کرنا تو باعث طوالت ہو گا البتہ ہم اختصار کے ساتھ قاری کے سامنے بعض ایسے واقعات رکھ دیتے ہیں جن سے تورات میں اس تحریف اور حذف و اضافہ کی نوعیت کا تصور قائم ہو جائے جس کا سلسلہ بعثت اسلام سے کئی صدیاں قبل رواں دواں تھا۔ گویا صورت حال یہ تھی کہ بعثت اسلام کے موقع پر جو محرف شدہ تورات یہودی ربیوں اور احبار کے پاس موجود تھی اس کو وہ مزید تغیرات کا نشانہ بنا رہے تھے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل قرآن سے حوالے دے کر ثابت کیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ تورات حصول ہدایت کے لیے روشنی، یعنی رہنمائی کا کام دیتی تھی۔ ابتداً انبیاء اور اہل علم حضرات اس کی اصل تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ اس کی حفاظت کے سلسلے میں بھی مستعد رہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ (۵:۴۴)

ترجمہ: بلاشبہ ہم نے تورات نازل کی۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کے نبی جو (احکام الٰہی کے) فرمانبردار تھے اسی کے مطابق یہودیوں کو حکم دیتے رہے نیز ربی اور احبار (یعنی یہودیوں کے علما و مشائخ) بھی اسی پر کاربند رہے۔ کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے۔

تحریف کا عمل بعد میں شروع ہوا۔ صورت حال یہ ہے کہ اگر کوئی چاہے کہ تورات کی موجود شکل کے وجود میں آنے کی تاریخ کا بالتفصیل اور متعین علم حاصل کرے تو تحقیقی کاوشیں اسے ایسی ایسی صحرا نوردیوں میں لیے پھرتی ہیں جن کے نتیجے میں وہ اس ویرانے میں کھو جاتا ہے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے انگریزی زبان میں قرآن کے ترجمے اور حاشیے پر مشتمل تالیف میں سورۂ مائدہ کے بعد دو تتمے لکھے ہیں۔

ایک تورات اور دوسرا انجیل کے متعلق۔ ان میں انہوں نے محققانہ انداز سے لکھا ہے کہ یہ دونوں آسمانی کتب یہودیوں اور عیسائیوں کا تاریخ کے مختلف ادوار میں کس نشیب و فراز سے گزریں۔ ظاہر ہے کہ ایک چھوٹے سے مقالے میں اس موضوع کا پوری طرح احاطہ تو نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اختصار کے ساتھ

بعض بنیادی معلومات مہیا کر دی ہیں۔ البتہ اس تحریر میں تورات سے متعلق بہت سی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ اس سے ایسے قاری کے لیے جو ان سے واقفیت نہ رکھتا ہو زیر بحث مسئلے کو ذہنی گرفت میں لانا مشکل ہے۔ ہم اس تتمے سے بعض نکات سطور ذیل درج کرتے ہیں:

1. "To translate it" (i.e. Taurat) by the words "The Old Testament" is obviously wrong. "The Old Testament" is a Christian term, applied to a body of old jewish records. The Protestants and the Roman Catholics are not agreed precisely as to the number of records to be included in the canon of the "Old Testament".

ترجمہ: ا۔ تورات کا ترجمہ ''عہد نامہ عتیق'' کرنا واضح طور پر غلط ہے۔ ''عہد نامہ عتیق'' نصاریٰ کی اصطلاح ہے جسے یہود کی پرانی تحریروں پر منطبق کر دیا گیا ہے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقے اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ ''عہد نامہ عتیق'' میں کون کون سی یہودی تحریریں شامل کی جائیں۔

2. "Nor is it correct to translate Taurat as the "Pentateuch" a Greek term meaning the "Five Books" ….. They contain a semi-historical and legendary narrative of the history of the world from the Creation to the time of the arrival of the Jews in the Promised Land …… A great part of the Mosaic Law is embodied in this narrative. The Books are traditionally ascribed to Moses, but it is certain that they were not written by Moses or in an age either contemporary with Moses or within an appreciable distance of time from Moses. They were in their present form probably compiled some time after the return of the Jews from the Babylonian Captivity. The decree of Cyrus permitting such return was in 536 B.C." ……

۲۔ یہ درست نہیں کہ تورات کو پنٹاٹیوک کا نام دیا جائے جو ایک یونانی اصطلاح ہے جس کا مطلب ''پانچ کتابیں'' ہے۔ ان میں داستانوں کی شکل میں ازل سے لے کر یہود کے ارض موعودہ میں پہنچنے تک کے نیم تاریخی واقعات درج ہیں ۔۔۔ موسوی قانون کا بیشتر حصہ اس میں شامل ہے۔ روایتی طور پر ان کتابوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحریر کردہ نہیں ہیں نہ ہی یہ حضرت موسیٰ کے دور میں یا ان کے زمانے سے قابل اندازہ وقت کے بعد لکھی گئیں۔ یہ اپنی

موجودہ شکل میں غالباً یہود کی بابل کی قید سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد مدون کی گئیں۔ اس واپسی کے متعلق سائرس کے اجازت نامے کا حکم ۵۳۶ ق م میں دیا گیا۔

3. "But there are some ludicrous slips, which show that the compilers did not always understand their material. Modern criticism distinguishes two distinct sources among the documents of different dates used by the editors. For the sake of brevity and convenience they may be called (a) Jehovistic and (b) Elohistic. Then there are later miscellaneous interpolations. They sometimes overlap and sometimes contradict each other". ……

۳۔ لیکن اس سلسلے میں بعض مضحکہ خیز کوتاہیاں ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدونین ہمیشہ اپنے علمی مواد کو نہیں سمجھ سکے۔ مرتب کرنے والوں نے مختلف ادوار کی جن دستاویزات کو استعمال کیا ہے، زمانہ حال کے تنقیدی مطالعہ نے دو ذرائع میں تفریق کی ہے۔ اختصار و سہولت کے لیے انہیں (الف) جیہووی اور (ب) ایلوہسٹک کہا جا سکتا ہے۔ بعد میں خود ساختہ مواد بھی شامل کیا گیا۔ یہ بعض اوقات جزوی مماثلت رکھتے ہیں اور بعض اوقات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

4. "The statement in 2 Esolras (about the first century A.D) that the law was burnt and Ezra (say, about 457-458 B.C) was inspired to rewrite it, is probably true as to the historical fact that the law was lost, and that what we have now is no earlier than the time of Ezra, and some of it a good time later."

۴۔ ”دونوں ایسوروں (پہلی صدی عیسوی) کا یہ بیان کہ تورات جل گئی تھی اور عزیر نے (۴۵۷۔۴۵۸ ق م) میں اسے الہامی القا کے تحت دوبارہ لکھا، غالباً ایک تاریخی واقعہ کے طور پر اس حد تک درست ہے کہ تورات ناپید ہو گئی تھی اور جو کچھ اس وقت ہمارے پاس ہے وہ عزیر سے پہلے کے دور سے تعلق نہیں رکھتا اور اس میں سے کچھ خاصے عرصے بعد کی پیداوار ہے۔“

5. "The Primitive Torah must have been in old Hebrew, but there is no Hebrew manuscript of the Old Testament which can be dated with certainty earlier than 916 A.D."

۵۔ ''قدیم تورات لازماً عبرانی زبان میں ہو گی۔ لیکن عہد نامہ عتیق کے کسی عبرانی زبان کے مسودے کو یقین کے ساتھ ۹۱۶ عیسوی سے قبل کے دور سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر اوقات پیش کردہ باتیں اور بعض صورتوں میں معمولی معاملات میں اور بعض دفعہ اہم معاملات میں متضاد ہوتی ہیں۔ پنٹاٹیوک عہد نامہ عتیق کا چھوٹا سا حصہ ہے۔ یہ قصہ کی شکل میں ہے اور اس میں وہ قوانین و قواعد شامل ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے نام سے متعلق ہیں، لیکن غالباً یہ عزیر نے قدیم ذرائع سے حاصل کر کے پانچویں صدی قبل مسیح میں مدون و مرتب کیے۔ جیسا کہ رینان نے اپنی تصنیف ''اسرائیلی قوم کی تاریخ'' کے دیباچے میں لکھا ہے۔ ''یہودی قوانین کی متعین تدوین'' عزیر کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔''

6. "It will be seen therefore that there is no standard text of the Old Testament in its Hebrew form. The versions differ from each other frequently in minor particulars and sometimes in important particulars. The Pentateuch itself is only a small protion of the Old Testament. It is in narrative form, and includes the laws and regulations associated with the name of Moses, but probably compiled and edited from, older sources by Ezra (or Esdras Arabic, Uzair) in the 5th century B.C. As Renan remarks in the preface of his History of the People of Israel, the "definite constitutions of Judaism may be dated only from the time of Ezra".

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعثت نبوی کے زمانے سے قبل ہی تورات میں، جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں، تغیرات ہو چکے تھے اور وہ مستند ہونے کی حیثیت کھو چکی تھی۔ ہم اس حقیقت کی تائید میں مزید حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا ایڈیشن ۱۹۸۷ء کے درج ذیل حوالے قابل توجہ ہیں:

1۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۹۴ عنوان Biblical Sources کے تحت:

"Most of the writings in the Old Testament are of anonymous authorship, and in many cases it is not known whether they were compiled by individuals or by groups".

ترجمہ: ''عہد نامہ عتیق کی اکثر تحریریں نامعلوم مصنّفین کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور بہت سی صورتوں میں یہ معلوم نہیں کہ افراد نے لکھی ہیں یا گروہوں نے۔''

2۔ جلد۹ صفحہ ۸۲ عنوان Palestinian Talmud کے تحت:

"… one of two compilations of Jewish religious teachings and commentary that was transmitted orally for centuries prior to its compilation by Jewish Scholars in Palestine. The other such compilation produced in Babylon is called the Babylonian Talmud".

ترجمہ: ''فلسطینی تلمود کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ''مختلف ذرائع سے حاصل کر کے مرتب کی ہوئی یہودی مذہبی تعلیمات اور وضاحت پر مشتمل ان دو کتابوں میں سے ایک ہے جو فلسطین میں یہودی اہل علم کی تدوین سے قبل دو صدیوں کی زبانی روایات کے ذریعے سے ان تک پہنچائی گئیں۔''

3۔ جلد۸ صفحہ ۵۷۵ Nebuchadrezzay II کے تحت:

"The siege of Jerusalem ended in its capture in August 586 (BC) and in the deportation of prominent citizens with a further deportation in 582" (BC).

ترجمہ: ''یروشلم کا محاصرہ ۵۸۶ ق م میں اس کی فتح اور نمایاں شہریوں کے ملک بدر کیے جانے پر ختم ہوا۔ ۵۸۲ ق م میں مزید (لوگ) ملک بدر کیے گئے۔''

عالمی تاریخ مولفہ ڈبلیو این ویچ

(History of the World edited by W.N Weech)

سے ہم چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر شاہ بابل کے ہاتھوں یروشلم کی پے در پے حملوں کے ذریعے سے تباہی کے سلسلے میں چند فقرے نقل کرتے ہیں۔ صفحہ ۸۷ پر لکھا ہے:

"In 597 BC an army with Nebuchadnezzar at its head was at the gates of Jerusalem. There was a siege of three months, and the King, his haram and nearly all the wealthy people and skilled craftsmen, were deported to Babylon along with the valuables from the palace and the temple".
(History of the world edited by W.N. Weech)

ترجمہ: ۵۹۷ ق م میں بخت نصر کی قیادت میں فوج نے یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ جو تین ماہ تک جاری رہا اور بادشاہ، اس کا حرم اور تقریباً تمام دولت مند لوگ اور کاریگر دست کار محل اور عبادت گاہ کی قیمتی اشیا سمیت بابل کو ملک بدر کر دیئے گئے۔''

اس کے بعد اسی صفحے پر بخت نصر کے ایک اور حملے کا ذکر کر کے لکھا ہے:

"A second group of the inhabitants of Jerusalem was taken prisoner, all the chief buildings were systematically destroyed, and the city walls were broken down"..

ترجمہ: ''یروشلم کے باشندوں کا ایک دوسرا گروہ قیدی بنالیا گیا، تمام بڑی عمارتیں مسمار کردی گئیں اور شہر کی فصیل منہدم کردی گئی''

اسی تاریخ میں صفحہ ۸۴ پر تحریر ہے:

"It must be remembered that the books of the Old Testament were compiled from many sources. They were not written in their present form until about 350 BC, at least eigth hundred years after the Hebrews had settled in Palestine, and they are not always, especially in the accounts of the times before the kings, in accordance with contemporary records."

ترجمہ: ''یہ بات ذہن نشین رہے کہ عہد نامہ عتیق کی کتب بہت سے ذرائع سے (مواد لے کر) مرتب کی گئی تھیں، وہ اپنی موجودہ شکل میں ۳۵۰ق م تک نہیں لکھی گئی تھیں۔ یعنی یہودیوں کے فلسطین میں مقیم ہونے سے آٹھ صدیاں بعد تک اور وہ ہمیشہ، اور خصوصیت سے بادشاہوں کے ادوار سے قبل ہم عصر علمی سرمایہ کے مطابق نہیں رہیں۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن جلد دوئم کے صفحہ ۱۲۳-۱۲۴ پر جیوائش انسائیکلو پیڈیا، اسم عزرا کے حوالے سے تحریر کیا ہے:

''بخت نصر کے حملہ بیت المقدس میں تورات کے تمام نسخے جل گئے تھے۔ اس لیے جب یہودی قیدی بابل سے چھوٹ کر واپس آئے تو ان کے پاس تورات کا کوئی نسخہ نہ تھا۔ اور ان کی نئی نسل عبرانی زبان سے بھی ناآشنا ہو گئی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر عزرا نے کلدانی حروف میں اور ایسی عبرانی میں کہ کلدانی زبان سے مخلوط تھی، از سر نو تورات کے صحائف لکھے۔ اور یہی نسخہ اصلی نسخے کا بدل سمجھا گیا۔''

مندرجہ بالا اقتباسات اس قدر واضح ہیں کہ ان کے مطالعہ سے ناظرین کے لیے اس بات پر قطعی رائے قائم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ حضرت موسیٰ پر جو تورات نازل ہوئی تھی وہ نہ ظہور اسلام کے وقت صفحہ ارض پر کہیں موجود تھی اور نہ آج موجود ہے۔

عیسائیت

اس سے قبل ''یہود و نصاریٰ کی ایک ہی طرح کی گمراہیاں'' کے عنوان کے تحت ہم قرآن سے حوالے دے کر بعثت اسلام کے وقت عیسائیوں کے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے بعض بے راہ رویاں بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم نصاریٰ کی ان ضلالتوں کا ذکر کریں گے جو ان کے ساتھ مخصوص تھیں۔

ان کے توحید سے انحراف اور شرک میں ملوث ہونے کے متعلق قرآن کہتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ (۵:۷۲)

ترجمہ: جنہوں نے یہ کہا کہ ''اللہ تو یہی مریم کا بیٹا مسیح ہے'' انہوں نے یقیناً کفر کا ارتکاب کیا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ (۵:۷۳)

ترجمہ: جن لوگوں نے کہا کہ ''اللہ تین (خداؤں) میں سے ایک ہے۔ انہوں نے یقیناً کفر کا ارتکاب کیا۔

ہم اس سے قبل (۹:۳۱) کا حوالہ دے چکے ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح کے علاوہ اپنے فقیہوں اور راہبوں کو تشریع دین کا حق دے رکھا تھا۔ یہ بات حضرت مسیح اور اسلام کے نزدیک غیر اللہ کو الوہیت کا مقام دینے کے مترادف ہے۔

جیسا کہ درج بالا آیات سے واضح ہوتا ہے ان کے مشرکانہ عقائد اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو اللہ ہی قرار دے دیا اور اللہ تعالیٰ کو تین خداؤں میں سے ایک کہنے لگے۔ قرآن نے واضح طور پر اعلان کر دیا:

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۴۳:۵۹)

ترجمہ: وہ (عیسیٰ ابن مریم) محض ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اس کو ایک نمونہ قدرت بنایا تھا۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (۵:۷۵)

ترجمہ: مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کا ایک رسول ہے۔

اس سے پہلے بھی کتنے رسول (اپنے اپنے وقتوں میں) ہو چکے۔ اور اس کی ماں (بھی بڑی ہی راست باز تھی) یہ دونوں (تمام انسانوں کی طرح) کھاتے پیتے تھے۔

اور یہ کہ :

لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ(۴:۱۷۲)

ترجمہ: مسیح کو ہر گز اس بات میں عار محسوس نہیں ہوتی کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جائے۔

قرآن میں حضرت عیسیٰ کے مقام، حیثیت اور ان کے کردار کے متعلق بہت سی آیات موجود ہیں، لیکن ہم درج بالا تین آیات پر اکتفا کرتے ہیں۔ان میں واضح کر دیا گیا ہے کہ :

قرآن میں حضرت عیسی کے مقام، حیثیت اور ان کے کردار کے متعلق بہت سی، لیکن ہم درج بالا تین آیات پر اکتفا کرتے ہیں۔ان میں واضح کر دیا گیا ہے کہ :

ا۔ وہ اللہ کے انعام یافتہ بندے تھے اور بنی اسرائیل کے ہادی اور دین کو روبہ عمل لانے کی مثال قائم کرنے والے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسی صورت میں نمونے کی حیثیت اختیار کر سکتے تھے جب وہ اس نوع سے تعلق رکھتے ہوں جس کے لیے وہ مثالی کردار ادا کرنے پر متعین کیے گئے ہوں۔

۲۔ وہ اللہ کے رسول تھے اور ان سے قبل بھی رسول بھیجے جاتے رہے۔ اگر رسول ہونے کو مافوق البشر (یا مقام الوہیت) مستلزم ہے تو پھر یہ ضروری ہوگا کہ جملہ انبیاورسل کے لیے بھی خدائی کا درجہ تسلیم کیا جائے۔ لیکن نصاری کسی اور رسول کو تو خدا نہیں مانتے۔

۳۔ پھر یہ کہ وہ اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے اور ماں بیٹا دونوں عام انسانوں کی طرح بقائے حیات کے لیے کھانا کھاتے تھے۔ اللہ تعالی اس حاجت سے بالا ہے کہ وہ کچھ کھائے پیئے۔

۴۔ مزید بر آن حضرت عیسی خود اللہ کا بندہ ہونے کا اقرار کرتے تھے اور اس میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔

تصویر توحید کو ختم کر کے اور عقیدہ تثلیث کے مشرکانہ عقیدے کو بالاتفاق اختیار کر کے نصاری نے اسلام کی جو قرآن کے نزدیک ہر نبی کا دین تھا، اساس کو منہدم کرنے کی جسارت کی۔ ان کی تاریخ میں چوتھی صدی عیسوی میں ایک شخص ایریس (Arius) نے جس نے ۳۳۵ء کے ارد گرد وفات پائی، حضرت عیسی کی

بشریت کے حق میں اور ان کی الوہیت کے خلاف آواز اٹھائی لیکن اس کو دبا دیا گیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۴ کے صفحہ ۲۸۳ پر لکھا ہے:

"In the Greek East, the 4th century was dominated by controversy about the propositions of Aims, an Alexandrian presbyter (died C.335) that the incarnate Lord who was born, wept, suffered and died could not be one with the transcendent first cause of creation who is beyond all suffering. The Council of Nicaea (325) condemned Arianism and affirmed the Son of God to be identical in essence with the Father".

ترجمہ: یونانی مشرق چوتھی صدی میں الیگزینڈریا کے پادری ایریس (وفات تقریباً ۳۲۵ء) کی تجاویز پر کہ گوشت پوست کا صحیح جو پیدا ہوا، رویا، تکلیف میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔ اس ہمہ مقتدر ہستی کا ساجھی نہیں ہو سکتا جو تخلیق کی علت اول ہے اور تکلیف سے مبرا ہے۔ نیشا کی کونسل (۳۲۵ء) نے ایریس کے مسلک کی مذمت کی اور اس بات کی تصدیق کی کہ خدا کا بیٹا حقیقت میں باپ ہی کے مشابہ ہے"

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ تاریخ عیسائیت میں اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا کہ حضرت عیسیٰ پر منزل من اللہ انجیل کا ضبط تحریر میں لایا ہوا کبھی کوئی نسخہ موجود تھا۔ جو انجیل پہلی صدی عیسوی سے تصنیف ہونا شروع ہوئی اس کی ابتدا کی کوئی متعین تاریخ کسی کے علم میں نہیں، اناجیل اربع لوقا مرقس، متی اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں۔ یہ چاروں حضرات سینٹ (Saint) کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کی تاریخ ہائے پیدایش و وفات معلوم نہیں۔ نہ یہ بات قطعیت کے ساتھ کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کا دور دیکھا۔ مثلاً انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۷ کے صفحہ ۵۵۴ پر لوقا (Saint Luke) کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

(fI Ist Century AD) in christian tradition, the author of the third Gospel and the Acts of the Apostles, a companion of the Apostle Paul,---- He excludes himself from those who were eyewitnesses of Christ's ministry."

ترجمہ: لوقا (پہلی صدی عیسوی) نصاریٰ کی روایات کے مطابق تیسری کتاب انجیل اور Acts of the Apostles کا مصنف جو آپاسٹل پال کا ساتھی تھا وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے خارج کرتا ہے جنہوں نے مسیح کے دور (نبوت) کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا"

اسی انسائیکلوپیڈیا کی جلد ۸ صفحہ ۶۳۴ پر عہد نامہ جدید (New Testament) کے عنوان کے تحت یہ الفاظ ملتے ہیں:

"Among its 27 books are selected recollections of the life and acts and sayings of Jesus in the four Gospels, a historical narrative of the first years of the christian or letters of advice instruction, admonition, and exhortation to local groups of Christians - 14 attributed to Paul, one (Hebrews) probably in error, and seven by three other authors, and an apocalyptic description of the intervention of God in history, the Book of Revelation----------

ترجمہ: اس کی ۲۷ کتابوں کے اندر چار اناجیل میں عیسیٰ کی زندگی، اعمال اور اقوال کی منتخب یادداشیں "اپاسٹلز کے اعمال" میں نصاریٰ کے چرچ کے ابتدائی سالوں کی سرگزشت، حکم نامے، رہنمائی کے خطوط، ہدایات، انتباہ اور مقامی گروہوں کو نصیحتیں ہیں۔ ان میں سے ۱۴ پال کی طرف منسوب ہیں، جن میں سے غالباً ایک غلطی سے عبرانی میں ہے۔ سات دوسرے تین تحریر کرنے والوں کی طرف سے اور تاریخ میں وحی شدہ خدائی دخل "کتاب وحی کی" شکل میں۔۔۔۔۔۔

The setting of the New Testament within the christian community is one factor that makes a biography of Jesus or a history of the Ist century church difficult or impossible".

نصاریٰ کی قوم میں عہد نامہ جدید کی حیثیت عیسیٰ کی زندگی کے حالات کے کلیسا کی پہلی صدی کی تاریخ کا بیان مشکل یا ناممکن بنا دیتی ہے۔"

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ نصاریٰ کا مذہبی اجارہ داری رکھنے والا طبقہ اپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق اس محرف شدہ انجیل میں بھی، جو ان کے پاس موجود ہوتی تھی وقتاً فوقتاً بالارادہ تغیر و تبدل کرتے رہتے تھے۔ اس کی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن ہم یہاں زمانہ حال کی ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' جلد دوئم کے صفحات ۴۴۳ اور ۴۴۴ پر ''متروک اناجیل'' کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانے سے برآمد ہوا اس نے حضرت مریم کی پیدائیش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح ایسا یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے۔

''متروک اناجیل'' سے مقصود وہ اکیس سے زیادہ انجیلیں ہیں جو پہلی صدی سے لے کر چوتھی صدی کے اوائل تک عیسائیوں میں رائج اور معمول بہ تھیں۔ لیکن ۳۲۵ء میں نیشیا کی کونسل نے چار منتخب کر لیں اور باقی متروک سمجھ لی گئی ہیں۔ یہ انتخاب کسی تاریخی یا علمی اصل کی بنا پر نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ایک طرح کی فال دیکھی گئی تھی اور اس کا اشارہ فیصلہ کن تھا۔ اصل انجیل کے کھو جانے سے وحی کی صحیح تعلیمات سے نصاریٰ محروم ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بھی نظریہ توحید کے معاملے میں وہی راستہ اختیار کیا جو دوسری اقوام اور مذاہب کے متعبین نے اپنایا تھا۔ یعنی اللہ کو الٰہ واحد قرار دینے کے بجائے یا تو اس کو بھول ہی گئے اور یا اپنے مذہبی پیشوا کو اس کا ساجھی قرار دے دیا۔ اغلب یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا کیے تھے ان سے متاثر ہو کر نصاریٰ نے ان کی طرف خصوصیات الوہیت منسوب کر دیں۔ وہ تورات کے متبع ہونے کی وجہ سے دہریت کو تو نہیں اپنا سکتے تھے۔ البتہ بن باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے انہوں نے حضرت مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دے دیا اور اس دائرہ الوہیت میں انہیں حضرت مریم کو بھی شامل کرنا پڑا۔ اس طرح تثلیث کا عقیدہ وجود میں آگیا۔ قرآن نے اس کی واضح الفاظ میں تغلیط کی اور اسے کفر قرار دیا۔ اس سلسلے میں ہم آیت (۵:۷۳) کا حوالہ دے چکے ہیں ایک اور جگہ نصاریٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ (۴:۱۷۱)

ترجمہ: اور یہ بات نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ دیکھو ایسی بات کہنے سے باز آجاؤ کہ تمہارے لیے بہتری ہو۔ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ ہی اکیلا معبود ہے (اس کے سوا کوئی نہیں) وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لیے کوئی بیٹا ہو۔

وہ صرف اصل انجیل ہی سے محروم نہیں ہو گئے بلکہ حضرت عیسیٰ کی حیات طیبہ بھی ان کے لیے ایک چیستان بن گئی۔ چنانچہ آج تک یہی کیفیت ہے۔ اس دور کا مشہور مغربی فلسفی اور نقاد برٹرینڈ رسل کتاب (Why I am not a Christian) کے صفحہ ۲۱ پر لکھتا ہے:

"Historically it is quite doubtful whether christ ever existed at all, and if he did we do not know anything about Him,-----".

ترجمہ: "تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل مشکوک ہے کہ عیسیٰ عالم وجود میں تھے اور اگر تھے تو ہم ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔"

ان حالات میں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کیسے محفوظ رہ سکتی تھیں۔ نصاریٰ نے کفارے کا نظریہ بھی ایجاد کر لیا۔ اس کے تحت انہوں نے یہ عقیدہ ٹھہرالیا کہ صلیب پر جان دے کر حضرت مسیح نے اپنے متبعین کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس عقیدے کے تحت گویا انہوں نے انسان کو اپنی حسن عمل کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا۔ قرآن نے اس کی واضح الفاظ میں نفی کر دی:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳:۳۹)

ترجمہ: اور انسان کے لیے اس کی کوشش (عمل و خیر و شر) کے مطابق بدلہ ہے۔

اور یہ کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ (۱۷:۱۵)

ترجمہ: کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

مثبت طور پر یہ اصول بھی ٹھہرا دیا کہ:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰىکُمۡ ؕ (۴۹:۱۳)

ترجمہ: امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ جو اللہ کے نزدیک متقی ہے۔

اس طرح ہر فرد و بشر کی ذمہ دارانہ اور جوابدہ ہونے کی حیثیت کو ہر پہلو سے واضح کر دیا گیا تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔ گزشتہ تمام تحریف شدہ مذاہب میں، چاہے وہ عرب دنیا میں متعارف تھے یا نہیں، جو جو اس قسم کے عقائد پائے جاتے تھے کہ کوئی کسی کا بوجھ اٹھا سکتا ہے انہیں باطل قرار دے دیا گیا۔

نصاریٰ میں مذہبی رہنماؤں کو مخصوص طبقے کی مسلمہ حیثیت ہمیشہ سے حاصل رہی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے مقام کے متعلق غلو اس حد تک پہنچ گیا کہ انہوں نے کہا کہ فلاح اخروی کی اجارہ داری بھی سنبھال لی۔ چنانچہ برٹرینڈ رسل History of Western Philosophy کے صفحہ ۴۲۹ پر لکھتا ہے:

"Owing to their miraculous powers priests could determine whether a man should spend eternity in heaven or hell".

ترجمہ: ''پادری اپنی معجزانہ قوتوں کے تحت یہ طے کر سکتے تھے کہ آیا ایک شخص ہمیشہ کے لیے جنت میں رہے گا یا جہنم میں''

اسی صفحے پر عذاب آخرت کے سلسلے میں لکھتا ہے:

"Priests could shorten this time by saying masses for his soul, which they were willing to do for a suitable money payment".

ترجمہ: پادری اس مدت کو اس کی روح کے لیے دعا کر کے کم کر سکتے تھے۔ یہ کام وہ مناسب دام لے کر کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔"

قرآن کہتا ہے کہ ہر نبی اور ہر رسول دین اسلام ہی لے کر آیا تھا۔ اصولی حیثیت سے ان کی دعوت میں یک سر مو بھی کوئی تفاوت نہ تھا۔ صرف شرعی احکامات میں زمان و مکان کے حالات کے مطابق کچھ فرق ہوتا تھا۔ ہم نے نصاریٰ میں رائج شدہ جن نظریات کا تذکرہ کیا اور دین میں تغیر و تبدل کی جن شکلوں کی نشاندہی کی ہے ان کا تعلق اساسی اصولوں سے ہے۔ اسی لیے جیسا کہ ہم نے قرآنی آیت (۵:۱۵) کا حوالہ دیا ہے، اسلام نے نصاریٰ سمیت اہل کتاب کو دعوت عام دی کہ دین حق آچکا، اس کا اتباع کرو۔ بلکہ یہ بنی نوع انسان کو صلائے عام ہے کہ اس دین کے اصولوں پر غور و تدبر کرو۔ یہی تمہارے مسائل کا حل ہے۔

دین زرتشت

جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مرتبہ عرض کر چکے ہیں اسلام کے سوا کسی دین کے پیرو اپنے داعی کی زندگی کی تفصیلات اور اس کی دعوت کے اصولوں اور صحیفوں کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ یہی صورت جناب زرتشت کی زندگی اور ان کے پیش کردہ دین کے معاملے میں رونما ہوئی۔ ماضی قریب تک ان کا زمانہ بعثت مختلف آراء کا موضوع بنا رہا کہ کسی نے کہا وہ ایک ہزار برس قبل مسیح کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ بعض نے اس زمانے کو دو ہزار قبل مسیح تک طوالت دے دی۔ اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی کے دوران مغربی محققین تاریخ اور ماہرین آثاریات کی کاوشوں کے ذریعے سے مختلف تاریخی واقعات کے مطابق اور سائرس، دارا وغیرہ حکمرانوں کے پتھروں اور چٹانوں پر کندہ کیے ہوئے واقعات کی روشنی میں زرتشت کے زمانہ ظہور کا تعین ہوا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' جلد دوئم کے صفحہ ۴۱۵ پر لکھا ہے:

''لیکن اب بیسویں صدی کی ابتدا سے اکثر محققین تاریخ گلڈر کی رائے پر متفق ہو گئے ہیں۔ اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زرتشت کا زمانہ وہی تھا جو سائرس کا تھا! اس تحقیق کے مطابق زرتشت کا سال وفات تقریباً ۵۵۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۸۳ قبل مسیح تک ہونا چاہیے۔''

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۲ صفحہ ۹۳۴ پر Zoroaster کے عنوان کے تحت ان کا سال پیدائش ''تقریباً'' ۶۲۸ قبل مسیح اور سال وفات تقریباً ۵۵۱ قبل مسیح لکھا ہے۔ لیکن اس مقالے میں یہ بھی تحریر ہے:

"The date of Zoroaster's life cannot be ascertained with any degree of certainty. According to Zoroastrian tradition, he flourished "258 years before Alexander". ------- Following this dating Zoroaster converted Vishtaspa, most likely a king of Ghorasmia (an area south of the Aral Sea in Central Asia) in 588 B.C. According to tradition, he was 40 years old when this event occurred, thus indicating that his birthdate was 628 B.C".

ترجمہ: ''زرتشت کی زندگی کی تاریخ یقین کے ساتھ متعین نہیں کی جاسکتی۔ زرتشتی روایات کے مطابق وہ سکندر سے ۲۵۸ برس قبل عروج پر تھے۔ اس تاریخ کے مطابق زرتشت نے ۵۸۸ ق م میں شتسپا کو اپنا مسلک اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ غالباً خوارزم (ایک علاقہ جو مرکزی ایشیا میں بحرارل کے جنوب میں تھا) کا بادشاہ تھا۔ روایت کے مطابق وہ اس واقعہ کے وقت چالیس برس کا تھا۔ اس طرح اس کی تاریخ پیدایش ۶۲۸ ق م قرار پائی ہے۔

اسی مقالے کے مطابق جناب زرتشت کی پیدایش تہران کے گردونواح میں بمقام رے ہوئی۔

برٹرینڈرسل مغربی فلسفہ کی تاریخ (History of Western Philosophy) میں چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران یونانی تمدن کے متعلق لکھتے ہوئے کہتا ہے:

"At the same time events of fundamental importance were happening in other parts of the World. Confucious, Budha and Zoroaster, if they existed, probably belong to the same century" (Page 31).

ترجمہ: ''اسی زمانے میں دنیا کے دوسرے حصوں میں بنیادی اہمیت کے واقعات رونما ہورہے تھے۔ کنفوشیس، بدھا اور زرتشت، اگر ان کی ہستیاں تھیں، غالباً اسی صدی سے تعلق رکھتے تھے۔''

بہرحال مختلف ذرائع علم کی بنیاد پر یہ بات اب یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جناب زرتشت نے چھٹی اور ساتویں صدی قبل مسیح کا زمانہ پایا ہے۔ ان کے اصل دین کے متعلق تقریباً تین سو برس قبل مسیح سے

غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی محققانہ کاوشوں کے ذریعے سے تاریخ کے بہت سے سربستہ راز تو افشا ہو گئے۔ لیکن چونکہ مغربی دانشور (Intellectuals) مادہ پرستی کی رنگین عینک کے بغیر حاصل شدہ مواد سے اخذ نتائج کے لیے غور و تفکر کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے، اس لیے وہ ہر مسئلے کی تعبیر ایک ہی انداز سے کرتے ہیں۔ وہ اصل زرتشتی تعلیمات کے نفاذ کے دور اور اس سے پہلے اور بعد کے زمانوں میں مروجہ نظریات کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ بلکہ جب بھی زرتشت کا حوالہ آتا ہے، ہر زمانے کے مذہبی مسلک پر مجوسیت کا ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ وہ اپنی مخصوص اصطلاحات کے استعمال کے ذریعے سے ہر مذہبی تحریک کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ (ان کے اس رویے پر موزوں موقع پر گفتگو ہو گی) یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مجوسیوں کا جناب زرتشت، جو خالص اور بے آمیز توحید کے نظریے کے علمبردار تھے، سے کوئی تعلق نہیں۔ مجوسی ان سے پہلے دور میں ہوئے ہیں اور ستارہ پرستی اور سورج پرستی ان کے دین کی بنیاد تھی۔ اور آگ کو زمین پر سورج کا نعمل البدل قرار دے کر اس کی پوجا کرتے تھے۔ وہ دین زرتشتی کو، جب وہ ایک نظام زندگی کی حیثیت سے قائم تھا، پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۷ صفحہ ۲۹ پر Magus کے عنوان کے تحت تحریر ہے:

"It is disputed whether the magi were from the beginning followers of Zoroaster and his first propagandists. They do not appear as such in the trilingual inscription of Bisitun in which Darius the Great describes his speedy and final triumph over the magi who had revolted against his rule (522 B.C)".

ترجمہ: یہ بات مختلف فیہ ہے کہ آیا مجوسی آغاز ہی سے زرتشت کے متبعین اور اس کے مبلغین اول تھے۔ دارا اعظم کے سہ لسانی بیستون کے کتبے سے جس میں اس نے مجوسیوں کی بغاوت کو فوری اور حتمی طور پر کچلنے کی تفصیلات بیان کی ہیں ان کی یہ حیثیت ظاہر نہیں ہوئی (۵۲۲ ق م)

سائرس نے ۵۵۹ ق م میں حکومت سنبھالی اور دین زرتشت کا نفاذ کیا جو دو سو برس تک قائم رہا۔ اس کا مطلب ہے دارا جو اس کے سات سال بعد تخت نشین ہوا، بھی دین زرتشت کا متبع تھا اور مجوسیوں نے اس کے

خلاف بغاوت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بحثوت انہوں نے اپنے معبودوں کے حق میں اور نظریہ توحید کے خلاف کی ہو گی۔ دارا نظریہ توحید پر پختہ اور غیر متزلزل ایمان رکھتا تھا۔

دین زرتشی کے ظہور سے قبل ایران اور میڈیا میں نظریہ توحید کا وجود ہی نہیں تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ خیر اور اس کی نگہبانی روشنی کی مرہون منت ہے اور برائی کی پرورش و نمود تاریکی کے سپرد ہے اس طرح گویا دنیا میں دو قوتوں کی کار فرمائی تھی۔ ان کے ہاں عالم آخرت کا کوئی تصور نہ تھا۔ جیسا کہ قبل از اسلام ہر مذہب کے پیروان میں رواج تھا، ان میں بھی مذہبی معاملات میں ایک نام نہاد مقدس طبقہ کی اجارہ داری تھی جو بہت قوت واثر کا مالک تھا اور اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے نظریہ توحید کی مخالفت از بس ضروری تصور کرتا تھا۔ اس نے دارا کو جنگی مہمات میں مصروف پا کر علم بغاوت بلند کروایا۔

معاشرتی زندگی تین طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سربراہی کے مقام پر وڈیرے اور مذہبی اجارہ دار سرفراز تھے۔ دوسرے درجے پر جنگجو طبقہ متمکن تھا اور نچلا طبقہ کسانوں اور گلہ بانوں پر مشتمل تھا۔ ہر طبقہ کے الگ الگ دیوتا تھے۔

جناب زرتشت سے قبل ان میں چھوٹے پیمانے پر بھی کسی ایسی تحریک یا دعوت کا کسی ذریعہ تحقیق سے نشان نہیں ملتا جو قائم شدہ نظریات اور معاشرتی روش کی اصلاح کرنا چاہتی ہو۔ زرتشت نے درج بالا تمام مشرکانہ نظریات و اعمال اور طبقاتی اونچ نیچ کو یکسر مسترد اور بر سر باطل قرار دے دیا اور وحی، توحید، معاد اور حسن عمل کے اثبات پر مبنی ایک دین پیش کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں جس کی خصوصیات ہم نے اس سے قبل بیان کی ہیں، ایسے نظریات تک کسی شخص کی عقل و خرد اور حسیات کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ذہن و قلب پر ان کا القا ہدایت خداوندی کے ذریعے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جناب زرتشت کے نظریات کا ایک اجمالی تصور غیر مسلم حلقوں کے حوالے سے پیش کریں تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ داعیان کی طرف مسلمان اسلام کے اصول بتکلف اور کسی تاریخی ثبوت کے بغیر منسوب کر دیتے ہیں۔ اور قرآن کے اس دعوے کی عدم شواہد کے باوجود توثیق کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اقوام کی طرف انبیاو رسل کو اپنی ہدایت کے ساتھ مبعوث کیا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۲ کے صفحہ ۹۳۴ پر Zoroaster کے عنوان کے تحت مقالہ نویس لکھتا ہے:

"Zoroaster's teachings, as noted above, centered on Ahura Muzda, who is the highest god and alone is worthy of worship He is, according to the Gathas, the creator of heaven and earth; i.e. of the material and the spiritual world --------- The Gather, the early hymns many of which may have been written by Zoroaster, are permeated by eschatological thinking. Almost every passage contains some reference to the fate awaiting men in the afterlife. Each act, speech & thought is viewed as being related to an existence after death. The earthly state is connected with a State beyond, in which the Wise Lord will reward the good act, speech and thought and punish the bad".

ترجمہ: ''زرتشت کی تعلیمات، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اہورامزدا، جب خدائے اکبر تھا اور صرف وہی عبادت کے لائق تھا، پر مرکوز تھیں، گاتھا کے مطابق وہی آسمان و زمین کا خالق ہے۔ یعنی روحانی اور مادی دنیا ------ گاتھا کے ابتدائی حمدیہ اقوال جن میں سے بہت سے زرتشت نے لکھے ہوں گے، آخرت کے تصور سے معمور ہیں۔ تقریباً ہر حصہ کتاب اس حالت کا حوالہ دیتا ہے جو اخروی زندگی میں انسانوں کی منتظر ہے۔ ہر عمل، قول اور خیال موت کے بعد کی زندگی سے متعلق دکھائی دیتا ہے۔ ارضی حالت آئندہ کی حالت سے منسلک ہے۔ جس میں خدائے حکیم اچھے عمل، قول اور خیال کا انعام دے گا اور برے کی سزا۔''

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے، قائم شدہ مفادات رکھنے والے حکومتی اور مذہبی حلقوں نے ابتدا میں جناب زرتشت کی مخالفت شروع کر دی۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے معاشرتی اور معاشی اقدار میں اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مختلف علاقوں میں دعوتی کام کے نتیجے میں انہیں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ چنانچہ مندرجہ بالا اقتباس جس مقالے سے دیا گیا اس کے مصنف نے لکھا ہے کہ یونانی، یہودی اور عیسائی دوسری صفات اور استعدادوں کے علاوہ انہیں پیغمبر تسلیم کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن جلد دوئم کے صفحہ ۴۱۷ پر یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ جلد دوئم میں پروفیسر گمرنڈی کے ایک مقالے سے اقتباس دیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

اس کا مذہب حقیقت اور عمل کا مذہب تھا۔ یونانی مذہب کی طرح محض رسموں اور ریتوں کا مذہب نہ تھا۔ اس نے مذہب کو ایرانیوں کی روزانہ زندگی کی ایک حقیقت بنا دیا۔ اور اخلاق اس مذہب کا مرکزی عنصر تھا"

ایران میں حکمرانوں نے ان کے دین کو قبول کر کے ان کے نظریات کا نفاذ کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد "ترجمان القرآن" صفحہ ۴۱۵ پر لکھتے ہیں:

"اس میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زرتشتی پر عامل تھا، بلکہ اس کا پہلا حکمران داعی تھا۔ اور اس نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کے لیے چھوڑا جو دو سو برس تک بلا استثنا دین زرتشتی پر عمل پیرا رہے۔"

سائرس کے بعد دین زرتشت کے بقاو تسلسل کی رائے سے مغربی محققین بھی متفق ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۳ کے صفحہ ۸۸۶-۷ پر Darius I کے عنوان کے تحت مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"In the opinion of some authorities the religious beliefs of Durius himself as reflected in his inscriptions shows the influence of the teachings of Zoroaster and introduction of Zoroastrism as the state religion of Persia is probably to be attributed to him".

ترجمہ: بعض اہل علم کی رائے میں دارا کے اپنے مذہبی اعتقادات، جیسا کہ اس کے کتبات سے ظاہر ہوتا ہے، زرتشت کی تعلیمات کے اثر کی غمازی کرتے ہیں اور فارس میں زرتشتی مذہب کا نفاذ غالباً اسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔"

مقالہ نگار کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایک دین صالح کی بنیاد پر دارا سے قبل سائرس ایک نظام قائم کر چکا تھا۔ سائرس کی عظمت اور ایک حکمران کی حیثیت سے اس کی اخلاقی برتری عظیم تاریخ دان ہیروڈوٹس سے لے کر زمانہ حال کے محققین تسلیم کرتے ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔

مولانا آزاد نے ''ترجمان القرآن'' میں سورہ الکہف کے بعد زرتشت اور سائرس کے متعلق ایک نہایت پر از معلومات، محققانہ اور دلچسپ تفصیلی تحریر لکھی ہے جس کا تعلق قرآن کی اس سورہ کی مندرجہ ذیل آیات سے ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۸۳ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ۸۴ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۸۵ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۸۶ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۸۷ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۸۸ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۸۹ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۙ۹۰ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۹۱ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۹۲ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۹۳ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۹۴ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۙ۹۵ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ؕ۹۶ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۹۷ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا (۱۸:۸۳-۹۸)

ترجمہ: (اے پیغمبر) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں۔ تم کہہ دو میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سناتا ہوں۔ اسے ہم نے زمین میں حکمرانی دی تھی نیز اس کے لیے ہر قسم کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔ تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک (مہم کے لیے) ساز و سامان مہیا کیا (اور پچھّم کی طرف نکل

کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا۔ وہاں سے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے قریب ایک گروہ کو آباد پایا۔ ہم نے کہا "اے ذوالقرنین! (اب یہ لوگ تمہارے اختیار میں ہیں) تو چاہے انہیں عذاب میں ڈالے' چاہے اچھا سلوک کر کے اپنا بنالے۔"

ذوالقرنین نے کہا "(ہم ناانصافی کرنے والے نہیں) جو سرکشی کرے گا، اسے ضرور سزا دیں گے۔ پھر اسے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا، تو اس کے بدلے اسے بھلائی ملے گی۔ اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے، جس میں اس کے لیے آسانی و راحت ہو"

اس کے بعد پھر اس نے تیاری کی اور (یورپ کی طرف) نکلا۔ یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری جگہ تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا، سورج ایک گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔ ان کی حالت ایسی ہی تھی، اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اس کی ہمیں پوری پوری خبر ہے۔

اس نے پھر ساز و سامان تیار کیا (اور تیسری مہم میں نکلا) یہاں تک کہ دو (پہاڑوں کی) دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دیکھا، پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کی جائے تو وہ بالکل نہیں سمجھتی۔ اس قوم نے (اپنی زبان میں کہا) "اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں۔ اور اس غرض سے ہم آپ کے لیے کچھ خراج مقرر کر دیں؟" ذوالقرنین نے کہا: "میرے پروردگار نے جو کچھ میرے قبضے میں دے رکھا ہے، وہی میرے لیے بہتر ہے (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور یاجوج اور ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دوں گا۔"

(اس کے بعد اس نے حکم دیا) "لوہے کی سلیں میرے لیے مہیا کر دو۔"

پھر جب تمام سامان مہیا ہو گیا، اور دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی، تو حکم دیا (بھٹیاں سلگاؤ اور) اسے دھونکو" پھر جب ا(س قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ (کی طرح لال) ہو گئی، تو

کہا ''گلا ہوا تانبا لاؤ، اس پر انڈیل دیں'' چنانچہ اس طرح ایک ایسی سد بن گئی کہ (یاجوج اور ماجوج) نہ تو اس پر چڑھ سکتے تھے، نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے۔

ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا: "یہ (جو کچھ ہوا تو فی الحقیقت) میرے پروردگار کی مہربانی سے۔ جب میرے پروردگار کی فرمائی بات ظہور میں آئے گی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دے گا۔ (مگر اس سے پہلے کوئی اسے ڈھا نہیں سکتا) اور میرے پروردگار کی فرمائی بات سچ ہے ٹلنے والی نہیں۔''

اگر مولانا آزاد کی اس تحقیق کو کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین اور تاریخ کا سائرس ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، درست تسلیم کر لیا جائے اور اس بات سے بھی اتفاق کر لیا جائے کہ سائرس نے دین زرتشتی قبول کیا تھا تو مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر چارہ نہیں کہ دین زرتشت کی تعلیمات کی بنیاد پر ایک اسلامی نظام قائم ہوا تھا۔ آیات مذکورہ میں بعض باتیں ذہن میں رکھنے سے اس خیال کی سو فی صد تصدیق ہوتی ہے۔

اولاً ذوالقرنین سے ''قلنا'' کہہ کر اللہ تعالی کا خطاب اس کے تقرب الی اللہ کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔

ثانیاً ذوالقرنین کا یہ اعلان کہ رعایا کے ساتھ میرا سلوک مبنی بر عدل ہوگا۔ اس دور میں چاروں طرف حکمرانوں کے ماضی قریب اور زمانہ حال میں روا رکھے گئے ظلم و ستم کے چرچے زبان زد خلائق تھے۔ انصاف اور شہریوں کے حقوق کا یہ تصور بالکل ناپید تھا۔

ثالثاً ایمان و عمل صالح کے تذکرے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ ذوالقرنین کے ذہن میں کسی دین کا تصور اور عملاً اس سے وابستگی کا شعور موجود تھا۔ ایمان لانے اور اس دین کے اصولوں کے مطابق عمل صالح بجالانے کے سوالات تبھی پیدا ہو سکتے تھے۔

رابعاً ''ثم یردالی ربہ'' کے الفاظ سے معاد اور اللہ تعالی کے سامنے جواب دہی اعمال کے اسلامی تصور کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔

خامساً اپنے اقتدار اور استطاعت عمل کو اللہ تعالی کی رحمت کی طرف منسوب کرنا اور اسے ہی قادر مطلق تصور کرنا توحید پر پختہ ایمان کی علامت ہے۔

سادساً جس قوم کے دشمنوں سے حفاظت کے لیے دیوار بنائی اس سے کوئی معاوضہ یا خراج لینے سے انکار اس کی وسیع الظرفی اور خلق خدا کی خدمت اور ان سے ہمدردی کی عکاسی ہوتی ہے۔

ایک بادشاہ اپنی افتاد طبع کی وجہ سے مسلح ہونے کے باوجود عادل و منصف مزاج تو ہو سکتا ہے، لیکن وحی الہی کی رہنمائی کے بغیر توحید کا قائل ہو سکتا ہے اور نہ ہر بات کو اللہ کی قدرت کی طرف منسوب کر سکتا ہے، نہ ہی وہ معاد پر یقین کامل کا اظہار کر سکتا ہے۔ نہ وہ اپنے اقتدار کو اللہ تعالی کا عطیہ قرار دے سکتا ہے۔

سائرس کے لیے ذوالقرنین کے لقب کی توثیق اس بات سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ مولانا آزاد نے تذکرہ کیا ہے، سائرس ماہرین آثاریات نے سائرس کا ایک مجسمہ دریافت کیا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح کے دو سینگ ہیں۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین مکہ نے ذوالقرنین کے متعلق یہودیوں کے کہنے پر استفسار کیا تھا۔ ان کی کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود تھا۔ یہود کسی غیر یہودی حکمران کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے لیکن سائرس نے ہی انہیں وسعت قلبی کی وجہ سے بابل اور یروشلم فتح کرنے کے بعد بابل کی اسیری سے نجات دلائی اور ان کے ہیکل وغیرہ تعمیر کرا دیئے۔ اس کے علاوہ تاریخ میں کسی اور غیر یہودی حکمران کا تذکرہ نہیں ملتا جس نے ان سے اس قسم کا حسن سلوک کیا ہو۔ اس لیے ان کے سوال سے بھی اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ سائرس ہی کا لقب ذوالقرنین تھا۔

تاریخ کی کتب ہی میں نہیں، بلکہ مذہبی صحفیوں میں سائرس کی توصیف کی گئی ہے۔ موجودہ تورات اور بائبل میں یہود پر اس کے احسان کو خاص طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس تواتر میں یہود کے ایما پر حضور سے اس کے متعلق ذوالقرنین کے لقب سے سوال کیا جانا اور اس کے جواب میں قرآن کی سطور بالا میں مذکورہ آیات کا اس کے متعلق نزول مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریے کی تقویت کا باعث ہے۔

جہاں تک مغربی ذرائع سے سائرس کی اخلاقی عظمت کی روایات کا تعلق ہے، ہم سطور ذیل میں انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کی جلد ۳ صفحہ ۸۳۱ پر Cyrus II کے عنوان کے تحت لکھے ہوئے مقالے سے مختصراً چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

"It is a testimony to the capability of the founder of the Achaemenid empire that it continued to expand after his death and lasted for more than two centuries. But Cyrus was not only a great conqueror and administrator; he held a place in the minds of the Persian people similar to that of Romulus and Ramus in Rome or Moses for the Israelites ------- In short, the figure of Cyrus has survived throughout history as more than a great man who founded an empire. He became the epitome of the great qualities expected of a ruler in antiquity and he assumed heroic features as a conqueror who was tolerant and magnanimous as well as brave and daring. His personality as seen by the Greeks influenced them and Alexander the Great, and as the tradition was transmitted by the Romans, may be considered to influence our thinking over now".

ترجمہ: یہ بات کیانی سلطنت کے بانی کی قابلیت کی ایک شہادت ہے کہ یہ (سلطنت) اس کی موت کے بعد پھیلتی رہی اور دو سو سال تک قائم رہی۔ لیکن سائرس صرف ایک بڑا فاتح اور منتظم ہی نہ تھا، وہ فارس کے لوگوں کے دلوں میں ایک ایسا مقام رکھتا تھا جو روم میں رومیلس اور ریمیس اور رئیس کو اور موسیٰ کو اسرائیلیوں میں حاصل تھا ـــــ المختصر تاریخ میں تواتر کے ساتھ سائرس کی شخصیت کو ایک سلطنت قائم کرنے والے ایک بڑے آدمی سے اونچا مقام حاصل رہا ہے۔ وہ ان بلند صفات کا جن کی دور قدیم میں ایک حکمران سے توقع کی جاتی تھی، مظہر بن گیا ہے۔ اس نے ایک ایسے جوانمردانہ خصوصیات رکھنے والے فاتح کی حیثیت اختیار کرلی جو روادار اور وسیع القلب بھی تھا اور بہادر اور دلیر بھی۔ اس نے یونانیوں کو بھی متاثر کیا اور سکندر اعظم کو

بھی۔ رومی وساطت سے پہنچنے والی روایات سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اس نے ہماری موجودہ سوچ کو بھی متاثر کیا ہے۔

جیسا کہ قرآن میں مشرق و مغرب کی جانب ذوالقرنین کی فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے اسی طرح اس مقالہ نگار نے سائرس کی مہمات کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن طوالت سے بچنے کے لیے ہم ان تفصیلات میں نہیں جاتے۔

اس مرحلے پر ہم ایک بار پھر مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیقی تحریر کی طرف پلٹتے ہیں اور اس میں سے چند فیصلہ کن فقرے نقل کرتے ہیں:

'' سائرس کی شخصیت وقت کے تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے برخلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور صاف نظر آرہا ہے کہ وہ داعی شخصیت زرتشت ہی کی تھی۔''

''بہر حال سائرس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو، یا تخت نشینی کے وقت، لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دین زرتشتی پر عامل تھا۔''

''لیکن اگر ذوالقرنین دین زرتشتی پر عامل تھا اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا اثبات کرتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ اسے علیہم من اللہ قرار دیتا ہے تو کیا اس سے لازم نہیں آتا کہ زرتشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔''(ترجمان القرآن جلد دوئم صفحہ ۴۱۶)

سائرس کے بعد دارا اعظم بھی پوری استقامت کے ساتھ مسلک توحید پر قائم رہا۔ چنانچہ مولانا آزاد نے رالین سن (Rawlinson) کے حوالے سے، جس نے استخر کے کتبے پر تحقیق کی ہے۔ ترجمان القرآن کے صفحہ ۴۱۸ پر لکھا ہے:

''استخر کا کتبہ اڑھائی ہزار برس پیشتر کی یہ منادی آج تک بلند کر رہا ہے:

''خدائے برتر اہورہ مزدہ ہے۔ اس نے زمین پیدا کی، اسی نے آسمان بنایا۔ اسی نے انسان کی سعادت بنائی۔ اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمران اور آئین ساز بنایا۔''

''دارا اعلان کرتا ہے کہ اہورہ مزدہ نے اپنے فضل سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن وامان قائم کیا۔ میں اہورہ مزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے، میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے۔ اے اہورہ مزدہ! میری دعا قبول کر۔''

''اے انسان! اہورہ مزدہ کا تیرے لیے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر۔ صراط مستقیم کو نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچ۔''

سید امیر علی کی تحقیق درج ذیل ہے:

"A powerful religious Revolution had been inaugurated among the Western Aryans by a teacher whose name has been preserved in the literature of his religion as Citama Zarathustra". ("The Spirit of Islam" Page xxi).

ترجمہ: ''ایک (نظریاتی) معلم نے، جس کا تذکرہ اس کے مذہب کی تعلیمات میں زرتشت کے نام سے محفوظ ہے، مغربی آریاؤں میں ایک زوردار مذہبی انقلاب برپا کر دیا''

تاریخ عالم (History of the World) مولفہ ڈبلیو این ویچ (W.N. Weech) میں ایران کی داستان (The Story of Persia) کے عنوان سے مولف اور جی پی چرچل (G.P Churchill) نے مل کر ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں وہ تحریر کرتے ہیں:

"----and Zoroastrianism guided the thoughts of Persia's kings and princes."

"Whether Zoroaster himself lived in the sixth century we do not know. But there is no doubt of the influence of his teaching on the men who were bringing the old kingdoms

under the sway of Iranian highlanders. Zoroaster believed in a supreme, impersonal God Ahura Mazda or Ormuzd, the Lord of Great Knowledge, the Creator of the World. Opposed to Ahura Mazda was Ahriman, the spirit of Evil, the Lie. All men had a choice between true knowledge and the Lie and as they chose so would be their reward; in perpetuity shall be the torment of the liars". Ahura Mazda is the spirit behind earth, sun, moon, stars, wind and rain and his followers turn away from the idols of these, which men have made to worship". (Page 262).

ترجمہ: ''دین زرتشت ایران کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی فکری رہنمائی کرتا تھا۔''

'' ہمیں یہ معلوم نہیں کہ زرتشت نے خود چھٹی صدی (ق م) پائی۔ لیکن ان شخصیتوں پر جو قدیم سلطنتوں کو ایرانی کو ہستانیوں کے زیر تسلط لانا چاہتے تھے اس کی تعلیمات کے اثر سے متعلق شک نہیں کیا جاسکتا۔ زرتشت ایک بالاترین، تنزیہی (صفات سے متصف) اہورہ مزدا یا ارمزد (نامی) اللہ جو حقیقت کا مالک مطلق اور خالق کائنات ہے پر ایمان رکھتا تھا۔ اہورہ مزدہ (کی راہ ہدایت) کی مخالفت کرنے والا اہرمن تھا جو برائی کا محرک اور کذب (کی حیثیت رکھتا) تھا۔ تمام انسان برواثم اختیار کرنے میں آزاد تھے اور اپنے انتخاب کے مطابق جزا پائیں گے۔ ''راہ ضلالت اختیار کرنے والے دوامی عذاب میں مبتلا رہیں گے۔'' اہورہ مزدہ زمین، سورج، چاند، ستاروں، ہوا اور بارش کا مدبر ہے اور ان کے پیروان کے بتوں سے جو انسانوں نے پرستش کے لیے بنا رکھے ہیں اظہار بیزاری کرتے ہیں۔''

"In its present form, and even in the past, it embraces many beliefs and practices from the highest to the lowest often opposed to and contradicting each other"

ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ دین زرتشی دو سو برس تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہا۔ اس کے بعد بتدریج قدیم مشرکانہ رسوم پوجا پاٹ نے اس کے اندر نفوذ کرنا شروع کیا۔ اسی دوران ۳۳۶ سے ۳۳۰ ق م کے عرصے میں سکندر اعظم نے ہخامنیان (Achaemenian) سلطنت کو پوری طرح مغلوب کر لیا

اوراس کی تمدنی خصوصیات کو بھی تہہ و بالا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اسی سیلاب بلا انگیز نے زرتشت کے صحیفے اویستا (Avesta) کو بھی اسی طرح نیست و نابود کر دیا جس طرح بخت نصر کے حملہ یروشلم نے تورات کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اس واقعہ کے پانچ سو سال بعد تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ساسانی دور کے شروع ہونے پر اویستا کا نیا نسخہ مرتب کیا گیا جس میں توحید کا زرتشتی تصور بھی مجروح ہوا اور قدرتی طور پر ایسے خارجی عقائد دین میں شامل ہو گئے جنہوں نے اس کی اصلی روح کو ختم کر دیا۔ متعدد دیوی دیوتاؤں کو اویستا کی نئی تدوین کے دوران عناصر قدرت اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نگران اور بااختیار قرار دے دیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے ناظرین کے گوش گزار صرف یہ بات کرنا چاہتے ہیں کہ دین زرتشت بھی ظہور اسلام کے وقت اپنی اصلی تعلیمات کھو چکا تھا۔

ہندومت

ہندو عوام دور حاضر کے مغربی تصورات سے متاثر ہو کر ہر اس مذہب کو ہندو مذاہب میں شامل کرتے ہیں جس نے ہندوستان کی سرزمین میں جنم لیا ہو۔ یہ ان کی بھول اور تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

ان کے خواص اور صاحب علم حلقے ہندومت کی تعریف (Definition) کرنے سے عاجز ہیں۔ مثلاً اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کے سب سے مقدس صحیفے ''وید'' تین سے پانچ ہزار سال پہلے قدیم سنسکرت زبان میں، جو اس وقت زیر استعمال رہیں، آریائی حملہ آوروں کے ذریعے سے ایران کی سمت سے ہندوستان میں داخل ہوتے رہے۔ وہ ہندوستان کی سرزمین پر وجود میں نہیں آئے۔ نہ ہی یہ بات کسی کے علم میں ہے کہ وہ کیسے اور کس نے تصنیف کیے۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ بذریعہ وحی نازل ہوئے اور ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ بعض مغربی محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انڈو یورپین آریا حملہ آور ہندوستان میں جو مختلف وید لاتے رہے ان کے ہزارہا سالوں پر پھیلی ہوئی مہمات کے تجربات سے اخذ کردہ نتائج فکر پر مشتمل تھے۔ مزید برآں ان میں مختلف معاشروں میں رائج عقائد کا نفوذ بھی ہو گیا ہو گا جن سے وقتاً فوقتاً ان کا رابطہ ہوتا رہا۔ لیکن ان کی ابتدا سے کوئی باخبر نہیں۔ ویدوں کے علاوہ ہندومت میں مزید بہت سے متضاد

نظریات کی آمیزش ہوتی رہی ہے۔ یہ مذہب ہر قسم کے فکر کے لیے اپنے اندر جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ اس لیے تعین کے ساتھ اس کے اصولوں کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

پنڈت جواہر لال نہرو، سابق وزیر اعظم بھارت اور ہندوؤں کے عظیم سیاسی رہنما اپنی کتاب (The Discovery of India) کے صفحہ ۷۵ پر لکھتے ہیں:

"Hinduism, as a faith, is vague amorphous many-sided all things to all men. It is hardly possible to define it, or indeed to say definitely whether it is a religion or not in the usual sense of the word.

ترجمہ: ''مذہب کی حیثیت سے ہندومت غیر واضح، معنوی ڈھانچے سے عاری، مختلف الجہت اور سب کے لیے سب کچھ ہے۔ اس کی تعریف کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اور اس لفظ (مذہب) کے عام مفہوم کی روشنی میں یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ مذہب ہے بھی یا نہیں۔ یہ اپنی موجودہ اور ماضی کی شکل میں اونچے سے اونچے اور پست سے پست اعتقادات اور اعمال، جو اکثر ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد ہوتے ہیں کو قبول کر لیتا ہے۔''

Mahatma Gandhi has attempted to define it, "If I were asked to define the Hindu Creed, I should simply say: search after truth through non-violent means. A man may not believe in God and still call himself a Hindu. Hinduism is a relentless pursuit after truth.------- Hinduism is the religion of truth. Truth is God. Denial of truth we have not known". Truth and non-violence, so says Gandhi, but many eminent and undoubted Hindus say that non-violence, as Gandhi understands it, is no essential part of the Hindu creed. We thus have truth left by itself, as the distinguishing mark of Hinduism. That of course is no definition at all".

مہاتما گاندھی نے اس کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''اگر مجھے ہندو مسلک کی تعریف کرنے کے لیے کہا جائے تو میں صرف یہ کہوں گا: عدم تشدد کے ذریعے سے سچائی کی تلاش۔ ایک شخص خدا کی ہستی کو نہ مانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ ہندومت سچائی کو اختیار کرنے کا عزم کرنا ہے۔ ہندومت سچائی کا مذہب ہے۔ سچائی خدا ہے۔ خدا کا انکار ہم جان چکے لیکن سچائی سے انکار ہم نہیں جانتے۔''

گاندھی (ہندومت کو) سچائی اور عدم تشدد کہتا ہے لیکن بہت سے نمایاں اور پختہ ہندو کہتے ہیں کہ گاندھی کے تصور کا عدم تشدد ہندومت کا ضروری حصہ نہیں۔ اس طرح تنہا سچائی ہندومت کی خصوصی علامت کے طور پر رہ جاتی ہے۔ وہ درحقیقت کوئی تعریف نہیں۔

گاندھی ایک عظیم مفکر اور عالمی مرتبہ ہندو تھے۔ ان کو مہاتما کا لقب دیا گیا جو ہندو مذہب کے نکتہ نظر سے ان کے انتہائی تقدس کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ ہم نے ہندومت کے متعلق ان کی بیان کردہ تعریف (Definition) اور اس پر ایک رہنما اور دانش ور کی رائے پیش کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کچھ پلے نہیں پڑتا۔

اسلام کے سوا دنیا کا ہر دین و مذہب اپنے پیشواؤں اور صحیفوں کی ثقہ تاریخ سے محروم ہے۔ عام طور پر مذاہب اپنی ابتدا کے متعلق کچھ نہ کچھ مواد رکھتے ہیں۔ اس میں سے ہم نے ہندوؤں کی متعدد دیوی دیوتاؤں کے، جن کی وہ پرستش بھی کرتے ہیں اور ان کی طرف مختلف مظاہر قدرت کے سلسلے میں اختیار و تدبیر کی قوتیں بھی منسوب کرتے ہیں زمانہ ظہور کی تلاش کی لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ ویسے ان کے ناموں کے ساتھ مافوق الفطرت (Supernatural) داستانیں منسوب ہیں۔ اور یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ انہوں نے انسانوں کی حیثیت سے زندگیاں بسر کیں۔ جنگوں میں حصہ لیا۔ شادیاں کیں۔ پیدا بھی ہوئے اور موت سے بھی ہمکنار ہوئے۔ لیکن کسی کی تاریخ پیدایش و وفات کا کہیں تذکرہ نہیں۔ ان کے مجسمے بھی عام طور پر انسانی شکل میں بنائے جاتے ہیں۔ البتہ بعضوں کے مجسموں میں ان کی قوت جسمانی کی برتری و زیادتی کو ظاہر کرنے کے لیے بعض اعضا کی تعداد کو بڑھا دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کے دو سے زیادہ بازو بنائے یا ایک سے زیادہ سر بنا دیا وغیرہ وغیرہ۔ ہم بتوں اور دیوی دیوتاؤں کے نظریے کے سلسلے میں یہاں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہم صرف یہ

عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک سے طویل داستانیں اور کارنامے منسوب ہیں لیکن ان کے زمانہ وجود کے متعلق مکمل سکوت ہے۔

وید مختلف ادوار میں ہندو یورپی (Indo European) آریا حملہ آور ہندوستان میں اپنے ساتھ لاتے رہے۔ یہ متضاد نظریات کا مجموعہ بھی ہیں اور وطنی اشتراک کی بنیاد پر ایک وحدت کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کون سا وید کسی دور کی پیداوار ہے یا کس نے اسے تصنیف کیا اس کے متعلق یقین کے ساتھ تاریخ کچھ نہیں بتا سکتی۔ اسی طرح اوپانی شد ویدوں کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً لکھتے جاتے رہے۔ ان کی تعداد مختلف روایتوں کے مطابق ایک سو آٹھ سے ایک سو ساٹھ تک ہے۔ ان میں صرف ویدوں کے مضامین ہی کی تبیین نہیں ہے، بلکہ وقت کے عقائد کی عکاسی بھی شامل ہے۔ ان میں بھی واضح تضاد پایا جاتا ہے۔

پروفیسر ٹریور لنگ جو مغرب اور مشرقی ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں میں مذاہب کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں سالہا سال تک کام کر چکا ہے اور متعدد کتابوں کا مصنف ہے، نے اپنی تصنیف دی بدھا (The Buddah) کے صفحہ ۸۰ پر لکھا ہے:

ترجمہ: ''۔۔۔اوپانی شد مربوط نوشتے نہیں ہیں۔ جن میں سے بعض در حقیقت ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔''

آپ دیکھیں گے کہ ان کے مضامین میں توحید کے عقیدے کو تنزیہی اعتبار سے بہت بلندی پر بھی پہنچا دیا گیا ہے اور اس کے برعکس عقیدۂ اشتراک کو اس طور پر پیش کیا گیا ہے کہ سوائے زندہ انسان کے، دیوتاؤں کا ایک جم غفیر اور ہر مادی شے اور وہی تصور خدائی کے مسند پر جلوہ افروز ہو گیا۔ انفرادی طور پر ان کے زمانہ ہائے تصنیف کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں۔ البتہ ضعیف روایتوں کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ اوپانی شدوں کی تصانیف کا سلسلہ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوا۔ اس موقع پر آئندہ صفحات میں مزید روشنی ڈالی جائے گی اور مستند محققین کی آراء پیش کی جائیں گی۔ عام طور پر مذاہب اپنی ابتدا کے متعلق کچھ نہ کچھ مواد رکھتے ہیں اس میں سے بعض اجزا زبانی داستان سرائی (Mythology) کے ذریعے سے ان تک پہنچے ہیں اور بعض گزشتہ تقریباً دو صدیوں سے مغربی محققین کی کاوشوں کی مرہون منت ہیں۔ موخر الذکر معلومات کے سلسلے

میں علم الآثار نے خاصا کردار ادا کیا ہے لیکن اس کے ذریعے سے حاصل شدہ علم اور ایسی تحریری دستاویزات یا صحائف میں جن کی ابتداء، انداز تصنیف اور تاریخ کے متعلق قطعی معلومات محال ہوں، زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ علم الآثار کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق چٹانوں وغیرہ پر دور قدیم میں کندہ کی ہوئی بعض معلومات سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان چٹانوں پر کندہ کی ہوئی عبارات قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے سے مختصر حالات اور بعض اوقات نظریاتی اشارات ملتے ہیں جو کسی مذہب کی ہمہ جہتی رہنمائی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ دوسرے حصے کا تعلق کھدائیوں کے ذریعے سے سطح زمین کے نیچے دبے ہوئے زمانہ قدیم میں زیر استعمال سامان، انسانوں اور بتوں کے مجسموں اور عمارتوں کے نقشوں (Plans) سے ہوتا ہے۔ ان منتشر معلوماتی ٹکڑوں کی بنیاد پر ماہرین آثاریات اور ان کے معاونین تکلف کے ساتھ متعلقہ دور کے تمدن کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں جس میں حقیقت کا عنصر کم اور ان کے تخیلات کے اجزا زیادہ ہوتے ہیں۔

ہندومت کا بھی یہی حال ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان نے ادوار ماضی میں فلسفے کے شعبے میں ایسی شخصیات پیدا کیں جنہوں نے اسی سرزمین میں بسنے والوں ہی کو متاثر نہیں کیا، بلکہ دور دراز ممالک نے بھی ان سے نظریات اخذ کیے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج تک فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعے سے کسی ایسے ٹھوس تمدن نے جنم نہیں لیا جس نے انسانی فطرت میں مضمر صلاحیتوں کو جلا بخشی ہو۔ اور وہ کسی ایسے ضابطہ حیات کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو گیا ہو جو ان کو مابعد الطبیعیاتی مسائل کے متعلق رہنمائی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی زندگی کو بھی عدل کے تقاضوں کے مطابق منظّم کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندو قوم صدیوں سے کسی مربوط معاشرے اور نظام اجتماعی سے محروم رہی ہے۔ داخلی طور پر کبھی بھی اس قدر استحکام پیدا نہ کر سکی جس کے ذریعے وہ شمال مغرب سے آنے والے کسی حملہ آور کا مقابلہ اور دفاع کی توانائی کا مظاہرہ کر سکتی۔ ہندوستان کے باشندوں پر نظریاتی اور سیاسی دونوں سطحوں پر ہمیشہ بیرون ملک سے آنے والوں ہی کا غلبہ رہا۔ اسی لیے ان کا مذہب بھی متضاد نظریات و خیالات کے ملغوبے کی

حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں اس سے قبل گاندھی اور نہرو جیسی نمایاں ہندو شخصیتوں کی آراء پیش کر چکے ہیں۔ جہاں تک بیرونی دنیا کے اہل علم کا تعلق ہے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کی جلد ۲۰ میں صفحہ ۵۸۱ پر ہندوازم Hinduism کے عنوان کے تحت مقالہ نگار جو تمہیدی الفاظ تحریر کرتا ہے اسے ذیل میں درج کرتے ہیں:

"The term Hinduism refers to the civilisation of the Indus (originally, the inhabitants of the land of the Indus River). Introduced C.1830 by English Writers, it properly devotes the Indian civilisation of approximately the last 2000 years which evolved from Vedism, the religion of the Indo-European peoples who settled in India in the last centuries of the 2nd millennium B.C. Because it integrates a variety of elements, Hinduism constitutes a complex, but largely continuous whole and has religious, social, economic, literary and artistic aspects. As a religion Hinduism is a conglomerate of doctrines, cults, and ways of life."

ترجمہ: ہندومت کی اصطلاح ہندوؤں کے تمدن سے منسوب ہے۔ (ابتدائی طور پر دریائے سندھ کے رہنے والے ہندو کہلاتے تھے) اسے انگریزوں نے تقریباً ۱۸۳۰ء میں رائج کیا۔ یہ بجا طور پر اس تقریباً دو ہزار سال پرانی ہندوستانی تہذیب کی نشاندہی کرتی ہے جو ان انڈو یورپین لوگوں کے ویدانتی مسلک سے متشکل ہوئی جو ہندوستان میں دو ہزار سال قبل مسیح کی آخری صدیوں میں آباد ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ بہت سے (مسلکی) عناصر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ لہذا ہندومت متعدد نظریات کا ملغوبہ ہے۔ لیکن یہ زیادہ تر ایک اجتماعی تسلسل رکھتا ہے اور اس کے مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، ادبی اور فنی پہلو میں مذہبی حیثیت سے ہندومت انمل بے جوڑ اصولوں، مسالک اور اندازہائے زندگی کا مجموعہ ہے۔"

اس اقتباس سے ہندومت کا جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ اس تصور سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب سے دیئے گئے پہلے اقتباس سے مترشح ہوتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل دیئے گئے حوالوں سے اظہر من الشمس ہے، ہندومت کے اصولوں کا سراغ لگا کر اس کی نوعیت کو متعین کرنا ناممکن ہے۔ اس صورت حال پر اہل علم و دانش، چاہے وہ ہندو ہوں یا مغربی محققین سب کا اتفاق ہے۔ اصنام پرستی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس سے اس مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ عجیب و غریب کیفیت ہے کہ خود ہندوؤں کو اپنے مذہب کو سمجھنے کے لیے مغربی محققین سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے اس سے قبل پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب The Discovery of India کا تذکرہ کیا ہے۔ اس ساری کتاب میں سوائے سر رادھا کرشن کی کتاب انڈین فلاسفی (Indian Philosophy) سے ایک دو حوالے دینے کے علاوہ ہندوستانی مذاہب کی تعلیمات کے متعلق مغربی مصنفین کی کتابوں سے اقتباسات دے کر رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اپنے مذہب کی وضاحت کے سلسلے میں کسی اہم اصول کی تبیین کے لیے ان میں سے کسی کے متن سے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

اگر یہ تحقیق کرنا پیش نظر ہو کہ ہندوؤں کی مقدس کتابیں کب معرض وجود میں آئیں، یا ان کو کس نے تصنیف کیا، یا اگر وہ منزل من اللہ ہیں تو کس نبی یا رسول پر نازل کی گئیں اور کس دور میں ایسا ہوا تو اس کے لیے کوئی تاریخی مواد دستیاب نہیں۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہر دور اور ہر بیرونی حملہ آور کے نفوذ کے ساتھ اس کے نظریات کے لیے یہ مذہب اپنے اندر سما جانے کی گنجایش پیدا کرتا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقدس کتب کی طرف قدامت کی جو خصوصیت بقول جواہر لال نہرو فخریہ طور پر منسوب کی جاتی ہے اس کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ ان کتب کی قدامت کے متعلق پنڈت نہرو متذکرہ بالا کتاب کے صفحات ۷۶-۷۷ پر لکھتے ہیں:

"Before the discovery of the Indus Valley civilisation, the Vedas were supposed to be the earliest records we possess of Indian Culture. There was much dispute about the chronology of the vedic period, European scholars usually giving later dates and Indian scholars much earlier ones. It was curious this desire on the part of Indians to go so far back as possible, and thus enhance the importance of our ancient culture. Professor Winternit thinks that the

beginnings of the vedic literature go back to 2000 B.C. or even 2500 B.C. This brings us very near the Mohenjodaro period.

ترجمہ: ''وادی سندھ کے تمدن کے انکشافات سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ وید ہندوستانی تہذیب کے متعلق ہمارے پاس سب سے قدیم دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ویدوں کے زمانے کی وقتی ترتیب کے متعلق بہت اختلاف تھا، یورپ کے اہل علم بعد کی تاریخ متعین کرتے تھے اور ہندوستانی اہل علم بہت پہلے کی۔ ممکنہ حد تک اس قدر پیچھے کے زمانے میں جانے کی ہندوستانیوں کی یہ خواہش بہت عجیب تھی۔ اس طرح وہ اپنی تہذیب کو قدیم قرار دے کر اس کی اہمیت بڑھانا چاہتے تھے۔ پروفیسر ونٹرنٹ کا خیال ہے کہ ویدانتی ادب کا دو ہزار سے اڑھائی ہزار سال ق م میں آغاز ہوا۔ یہ بات ہمیں موہنجودارو کے زمانے کے قریب لے آتی ہے۔

The usual date accepted by most scholars today for the hymns of the Rig Veda is 1500 BC but there is a tendency, ever since the Mohanjodaro excavations to date further back these early Indian Scriptures. Whatever the exact date may be it is probable that this literature is earlier than that of either Greece or Israel, that in fact, it represents some of the earliest documents of the human mind that we possess. Max Muller has called it "The first word spoken by Aryan man".

آج کل اکثر اہل علم رگ وید کے زمزموں کی تاریخ ۱۵۰۰ ق م تسلیم کرتے ہیں لیکن موہنجودارو کی کھدائیوں کے دور سے رجحان یہ ہو گیا ہے کہ ان ہندوستانی صحیفوں کی ابتدائی تاریخ مزید پیچھے لے جائی جائے۔ جو بھی صحیح تاریخ ہو غالباً یہ تحریریں یونانی یا اسرائیلی صحیفوں سے پہلے دور کی ہیں اور یہ کہ در حقیقت انسانی ذہن کی تخلیقات میں ان کا شمار ان قدیم ترین دستاویزات میں ہوتا ہے جو ہمارے پاس موجود ہیں۔ میکس ملر نے ان کو ''آریائی انسان کی زبان سے ادا شدہ پہلا لفظ قرار دیا۔''

صفحہ ۹۴ پر وہ رقمطراز ہیں:

"It is difficult for me, as far most others to visualise the period of the Upanishads and various forces that were at play".

ترجمہ :''اکثر دوسرے لوگوں کی طرح میرے لیے اوپانی شدوں کے زمانہ (تدوین) اور موثرہ قوتوں کے دور کا تصور کرنا مشکل ہے۔''

اسی طرح اس مذہب میں تسلیم شدہ مقدس شخصیات میں سے کسی ایک کی تاریخ پیدایش و وفات کا بھی کسی کو علم نہیں۔ حتیٰ کہ ان کی نوعی حیثیت بھی باعث نزاع ہے۔ ان کی طرف انسانی خصوصیات بھی منسوب کی جاتی ہیں اور مافوق البشر توانائیاں اور اختیارات کا بھی انہیں حامل قرار دیا جاتا ہے۔ جہاں تک ان کے مقام و مرتبے کا تعلق ہے انہیں الہ اور معبودوں کا درجہ حاصل ہے۔

تاریخی لحاظ سے معلومات کے اس فقدان کی وجہ سے ہے سے ہندو مذہب کی ابتدائی تعلیمات کے متعلق مغربی محققین کی کاوشوں کے باوجود کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ اور نہ بقول پنڈت جواہر لال نہرو امتداد زمانہ سے اس کے نظریات پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کی نوعیت پر کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف ہدایت بھیجی۔ اس صراحت کی روشنی میں ہمارے نزدیک یہ امکان بہت قوی ہے کہ جیسا کہ خود ہندو اہل علم کا دعویٰ ہے، یہ مذہب بھی ابتداً بذریعہ وحی نازل ہوا ہو۔ اور اس میں بھی انہی اصولوں کی کار فرمائی ہو جن کو لے کر دوسرے انبیائے کرام مبعوث ہوئے لیکن جس طرح دین اسلام سے پہلے نازل ہونے والے ادیان میں تحریفات ہو گئیں اور خصوصیت کے ساتھ مشرکانہ خیالات کے نفوذ سے وہ محفوظ نہ رہ سکے یہی معاملہ اس مذہب کے ساتھ بھی پیش آیا ہو۔ ہمارا یہ خیال دور از کار نہیں ہے، بلکہ ہندو مذہب کی کتب میں ایک ذات مطلق اور سب پر چھائی ہوئی ہستی کے دھندلے نشانات و اشارات ملتے ہیں لیکن یہ اشارات چونکہ اصنام پرستی کی بے شمار قسموں کے اژدہام میں دب گئے، لہذا یہ گمان غالب حیثیت اختیار کر گیا کہ اس مذہب میں نظریہ توحید کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ نشان ابتدائی تعلیمات کے باقیات الصالحات میں سے ہو۔ اور ان تعلیمات کا ماخذ وحی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

سید امیر علی نے اپنی تصنیف Spirit of Islam میں جناب زرتشت کی دعوت کے دور میں موحدین اور مشرکین کے درمیان جنگ کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجے میں موخر الذکر نے شکست کھا کر ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں کے باشندوں کو جنوب کی طرف مار بھگا کر خود وہاں آباد ہو گئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"A powerful religious revolution had been inaugurated among the Western Aryans by a teacher whose name has been preserved in the literature of his religion as Citama Zarathustra. The sharp religious conflict which resulted from this movement has left its mark in the deep imprecations heaped by the Vedic hymn-singers on the enemy of their race and creed, the Djaradashi of the Vedas. The attitude of the vedic hymn-singers towards the reformed faith, even more than the extraordinary coincidence in names, furnishes the strongest proof that the religious divergence was the immediate cause of the split between the two branches of the Aryans proper. In this probably the first religious war waged among mankind, the western dualistic clans were successful in driving their half polytheistic half-pantheistic brethren across the Paropamisadac. The Eastern Aryans burst into India, driving before them the earlier black races, massacring and enslaving them, treating them …….

ترجمہ: ایک (نظریاتی) معلم نے جس کا تذکرہ زرتشت کے نام سے اس کے مذہب کی تعلیمات میں محفوظ ہے، مغربی آریاؤں میں ایک زوردار مذہبی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس تحریک کے نتیجے میں جو شدید مذہبی جنگ و جدل رونما ہوا اس نے اپنا نشان اس شدید مذمت کی شکل میں چھوڑا جو ویدوں کے گیت گانے والوں نے اپنی نسل اور ویدوں کے دشمنوں کے خلاف وضع کیے۔ ناموں کے غیر معمولی تطابق کے مقابلے میں اصلاح شدہ دین کے متعلق ویدوں کے گیت گانے والوں کا طرز عمل اس بات کا مضبوط ترین ثبوت فراہم کرتا ہے کہ مذہبی اختلاف آریائی جمعیت کی دونوں شاخوں میں تفرقے کا فوری سبب تھا۔ یہ غالباً نوع انسانی کی پہلی مذہبی جنگ تھی جس کے ذریعے سے بروا ثم (کی اقدار) پر ایمان رکھنے والے مغربی قبائل نے تعدد الہ اور وحدت

الوجود کے ملے جلے عقائد رکھنے والے بھائیوں کو پیرو پامی سادی کے پار مار بھگایا۔ مشرقی آریائی (قبائل) ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور وہاں کے سیاہ نسل کے پہلے باسیوں کو مار بھگایا، تہ تیغ کیااور دسیوز اور شودر کے علاوہ غلاموں اور زیر دستوں کی حیثیت دی۔''

واضح اور ثقہ ذرائع معلومات کی عدم موجودگی میں درج بالا اقتباس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جناب زرتشت کی دعوت توحید جہاں مقبول ہوئی وہاں اصنام پرستی کے حامیوں نے اس کی مخالفت میں جنگ و جدل کا فیصلہ کر لیا۔ قصص قرآن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ داعیان حق نے ہمیشہ تذکیر و نصیحت اور تنزیر و تبشیر کا راستہ ہی اختیار کیا ہے۔ لیکن مخالفین دین نے دعوت کو پھیلتے ہوئے دیکھ کر جب تشدد کا راستہ اپنایا تبھی اول الذکر نے بالسیف پر کمر ہمت باندھی، معلوم ہوتا ہے یہی صورت دعوت زرتشتی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی۔ ایک حصہ آبادی نے خالص توحیدی مسلک اختیار کر لیااور دوسرے حصے نے رب الاربابی نظریے پر اصرار کیا اور اشتراکی عقیدے کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس نظریاتی اختلاف نے جب مخالفت اور جنگ کی شکل اختیار کی تو اصنام پرست گروہ نے شکست کھا کر ہندوستان کی راہ لی اور وہاں کی آبادی کے کچھ حصے کو جنوب کی طرف دھکیل دیااور بعض کو شودر اور کم تر درجہ دے کر اپنے اندر جذب کر لیا۔ لیکن ہم یہاں جس صورت حال کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان آریا حملہ آوروں کے ذہن ایک بالاتر اور سب پر چھائی ہوئی ہستی سے بے خبر نہ تھے۔ وہ چونکہ اپنے آپ کو قوائے حسیہ کی طلب کے دباؤ سے آزاد نہ کر سکے لہٰذا اللہ کی ہستی کے ساتھ مادی اور وہمی معبودوں کو بھی کائناتی اور انسانی زندگی سے متعلق معاملات کو چلانے کے سلسلے میں شریک اور ساتھی بنانے پر مصر تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ام الکتاب'' میں لکھا ہے:

''ہندوستان کے تصور الوہیت کی تاریخ متضاد تصوروں کا ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ ایک طرف اس کا توحیدی فلسفہ ہے دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے۔ توحیدی فلسفہ نے استغراق فکر و عمل کے نہایت گہرے اور دقیق مرحلے طے کیے اور معاملے کو فکر کی بلندیوں کی ایک ایسی اونچی سطح تک پہنچادیا جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں قدیم قوموں کے مذہبی تصورات میں نہیں ملتی۔ عملی مذہب نے اشراک اور تعدد الٰہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اصنامی تصوروں کو اتنی دور تک پھیلنے دیا کہ ہر پتھر معبود ہو گیا، ہر درخت خدائی کرنے لگا

اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی۔ وہ بیک وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف بھی اڑا اور زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا۔ اس کے خواص نے اپنے لیے توحید کی جگہ پسند کی اور عوام کے لیے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی۔''(صفحات ۴-۱۹۳)

مولانا آزاد اسی کتاب میں گوتم بدھ کے ظہور سے پہلے ہندو مذہب کے تصور الوہیت نے جو عام شکل وصورت پیدا کرلی تھی اس کے متعلق ایک معروف ہندو دانشور اور بھارت کے سابق صدر پروفیسر ایس رادھا کرشنا کی تصنیف انڈین فلاسفی سے یہ اقتباس نقل کرتے ہیں:

''گوتم بدھ کے عہد میں جو مذہب ملک پر چھایا ہوا تھا اس کے نمایاں خدوخال یہ تھے کہ لین دین کا ایک سودا تھا جو خدا اور انسانوں کے درمیان ٹھہر گیا تھا۔ جب کہ ایک طرف اوپانی شد کا برہما تھا جو ذات الوہیت کا ایک اعلیٰ اور شائستہ تصور پیش کرتا تھا تو دوسری طرف ان گنت خداؤں کا ہجوم تھا جن کے لیے کوئی حد بندی نہیں ٹھہرائی جاسکتی تھی۔ آسمان کے سیارے، مادہ کے عناصر، زمین کے درخت، جنگل کے حیوان، پہاڑوں کی چٹانیں، دریاؤں کی لہریں، غرضیکہ موجودات خلقت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو خدائی حکومت میں شریک نہ کرلی گئی ہو۔ گویا ایک بے لگام اور خودرو تخیل کو پروانہ مل گیا تھا کہ دنیا کی جتنی چیزوں کو خدائی مسند پر بٹھا سکتا ہے بے روک بٹھاتا رہے۔ پھر جیسے خداؤں کی یہ بے شمار بھیڑیں بھی اس کے ذوق خداسازی کے لیے کافی نہ ہوئیں، طرح طرح کے عفریتوں اور عجیب الخلقت جسموں کی متخیلہ صورتوں کا بھی ان پر اضافہ ہوتا رہا۔ ہمیں شبہ نہیں کہ اوپانی شدوں نے فکر و نظر کی دنیا میں ان خداؤں کی سلطانی برہم کردی تھی لیکن عمل کی زندگی میں انہیں نہیں چھیڑا گیا۔ وہ بدستور اپنی خدائی مسندوں پر جمے رہے''

(ام الکتاب صفحات ۲-۲۰۱ بحوالہ انڈین فلاسفی جلد اول صفحہ ۴۵۳ طبع ثانی)

''ام الکتاب'' کے صفحہ ۱۹۷ پر پروفیسر مذکور کا ان کی متذکرہ صدر کتاب سے ایک اور اقتباس ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقیدۂ اشراک ہندوؤں کے قلب و ذہن میں اس درجہ پیوست ہو چکا ہے کہ اس کو اکھاڑنے کے سلسلے میں ان کے اپنے اہل علم جو نظریہ توحید کو برسر حق سمجھتے ہیں، بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ پروفیسر ایس رادھا کرشنا لکھتے ہیں:

''دراصل اشراکی اور تعددی تصور (Polytheistic concept) ہندوستانی دل دماغ میں اس درجہ جڑ پکڑ چکا تھا کہ اب اسے یک قلم اکھاڑ کے پھینک دینا آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک یگانہ ہستی کی جلوہ طرازی کے بعد بھی دوسرے خدا نابود نہیں ہو گئے۔ البتہ اس یگانہ ہستی کا قبضہ واقتدار ان سب پر چھا گیا اور سب اس کی ماتحتی میں آ گئے۔''

(انڈین فلاسفی جلد اول صفحہ ۱۴۴ طبع ثانی)

ہدایت خداوندی سے محرومی کی وجہ سے صرف نظریہ توحید ہی دب نہیں گیا بلکہ فکر و عمل کے تمام شعبوں کی تعمیر کے لیے بھی کوئی قطعی، حتمی اور مبنی بر عدل نظریات کا مجموعہ ہندومت کے پاس موجود نہیں۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر انسانوں کو مستقل طور پر چار ذاتوں یا درجوں (Casts) میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر انسان کے مرتبہ و مقام کے تعین کے لیے فکر و عمل کے معیار کے بجائے اس کے نسب کو اس کی حیثیت کے تعین کا ذریعہ بنایا گیا۔ عورت کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں۔ اس صنف کے لیے کسی قسم کے حقوق کا تصور تو دور کی بات ہے، اگر اس کا شوہر وفات پا جائے تو اس کو اس کے ساتھ ہی زندہ جل مرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ داستان بہت طویل ہے اور یہاں ہمارا مقصد ہندومت کا تفصیلی تجزیہ کرنا نہیں ہے۔ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس مذہب کے صحیفوں میں بعض ایسے اصولوں کے اشارات ملتے ہیں جن سے انسان صرف بذریعہ وحی ہی متعارف ہو سکتا ہے۔ ہندو بھی عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کی کتب کسی بالاتر ہستی کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو جو مادہ پرستانہ فکر کے کٹر حامی تھے، ان کتب کی تاریخی نکتہ نظر سے تعریف و توصیف تو کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ یہ عالی دماغ شخصیات کے اذہان کی تخلیقات ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۷۷ پر ان کتب کے متعلق لکھتے ہیں:

"I knew that some of them had powerfully influenced humanity and anything that could have done so must have some inherent power and virtue in it, some vital source of energy"

ترجمہ: ''میں جانتا ہوں کہ ان میں سے بعض نے نوع انسانی کو شدید طور پر متاثر کیا اور جو تحریر بھی ایسا کر سکتی تھی وہ اپنے اندر سموئی ہوئی قوت اور اچھائی رکھتی ہو گی جو استعداد کار کا مضبوط سر چشمہ ثابت ہو سکتی ہے''

لیکن اس کے بعد اسی صفحے پر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

"How are we to consider the scriptures of various religions much of it believed by its votaries to be revealed scripture? To analyse it and criticise it and look upon it as a human document is often to offend true believers. Yet there is no other way to consider.

ترجمہ: ''ہم ان متعدد مذہبی صحیفوں پر جن میں سے بہت سوں کو ان کے ماننے والے وحی شدہ صحیفے تصور کرتے ہیں کس طرح غور و تفکر کر سکتے ہیں۔ اس کا تجزیہ کرنا، اس پر تنقید کرنا اور اسے ایک انسانی دستاویز قرار دینا ان کے سچے عقیدت مندوں کو ناراض کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن غور و تفکر کا کوئی اور طریقہ بھی نہیں۔''

اس سے پنڈت جواہر لال نہرو کے ذاتی نظریے کے علی الرغم یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندو کسی قسم کی وحی کا تصور رکھتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے متعدد بار عرض کیا ہے اسلام کو مستثنٰی کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب وحی کی تعلیمات کو اور ان کو لانے والے کی زندگی کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔

دنیا کے تمام منزل من اللہ ادیان کو زمانے کے نشیب و فراز نے اس قدر محرف کر دیا کہ ان کے متبعین ان کی اصلی شکل و صورت سے بالکل ناآشنا ہو گئے۔ اسلام تمام ایسے ادیان کے پیروان کو ان کا بھولا ہوا مسلک یاد دلانے کے لیے ظاہر ہوا۔ مزید برآں ویدوں میں حیات اخروی کے متعلق بھی اشارات ملتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی ہم پنڈت نہرو ہی کی کتاب سے حوالہ دیتے ہیں۔ وہ ویدوں کے قدیم آریا حاملین کے متعلق لکھتے ہیں۔''

"In a vague way they believed in some kind of existence after death". (Page 79).

ترجمہ: ''وہ غیر واضح انداز سے حیات بعد الموت کی کسی صورت کا عقیدہ رکھتے تھے۔''

اگر کسی مذہب کے تاریخی سفر میں کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی تنزیہی صفات کا نظریہ ملتا ہو، ان کے فکر میں وحی کے تصور کے نشانات پائے جاتے ہوں اور اخروی زندگی کے کسی نے کسی درجے کا عقیدہ بھی اس میں موجود ہو تو ذہن اس طرف ضرور منتقل ہوتا ہے کہ ان سارے تصورات کا تعلق چونکہ علم غیب سے ہے لہٰذا ایسے مذہب کا کسی نہ کسی نبی اور رسول سے تعلق رہا ہے۔ اس تعلق اور نبوی رہنمائی کی نوعیت کا یقینی تعین تاریخی مواد کی ثقاہت کی نسبت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

بدھ مت

ہندوستان میں تاریخی واقعات کو محفوظ کرنے کی طرف بروقت توجہ نہیں دی جاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسا ہم نے ہندومت کے متعلق اپنی معروضات پیش کرنے کے دوران عرض کیا، بڑے بڑے دیوی دیوتاؤں مثلاً وشنو، سیوا، رام چند، کرشن وغیرہ کی ارضی زندگی کے ادوار کے متعلق مکمل لاعلمی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح گوتم بدھ، جن کا ابتدائی نام سدھارتا تھا کے مفصل حالات زندگی اور ان کی تعلیمات کے متعلق مغربی محققین نے انیسویں صدی کے اواخر میں معلومات فراہم کی ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۲۰ میں صفحہ ۶۱۹ پر مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"After the rise of Buddhological studies in the West and the archaeological discoveries and restorations since the end of the nineteenth century had made Indians more aware of the Indian origin of Buddhism, the Republic of India adopted the Buddhist emperor Asoka's lion Capital marking the place of Buddhah's first teaching as its national emblem".

ترجمہ: ''انیسویں صدی کے اواخر سے مغرب میں بدھ مذہب کے مطالعے کی ابتدا اور آثارات کے انکشافات اور تعمیر نظریات کے بعد ہندوستانیوں میں بدھ مت کے ہندوستان میں ظہور پذیر ہونے کے سلسلے کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں جمہوریہ ہندوستان نے بدھ مت کے حامی بادشاہ اشوکا کے دارالحکومت کو، جہاں سے بدھا نے اپنی تعلیم (کی نشر واشاعت) کا آغاز کیا، قومی یادگار کا مقام دے دیا۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب کے علمی حلقوں اور ماہرین علم الآثار کی کاوشوں کے ذریعے سے جو منتشر مواد ملا اس کے ذریعے سے بدھ مت کی تاریخ کی تعمیر جدید کی گئی۔ اس کی وجہ واضح ہے۔

برٹینکا جلد ۱۵ کے صفحہ ۲۶۹ پر بدھ ازم کے عنوان کے تحت مقالہ نویس لکھتے ہیں:

"The story of Buddah's life, as recorded here is based on the Pali texts of the Tipitaka (the "Triple Canon", or the "Three Baskets"), which is recognised by scholars as the earliest extant record of the Buddah's discoveries, and their Pali commentaries".

ترجمہ: بدھ کی جو داستان حیات بیان کی گئی ہے وہ پالی زبان میں لکھی ہوئی پٹی ٹکا پر مبنی ہے (تین مذہبی اصول) جس کو اہل علم بدھا کے مواعظ اور ان کی پالی (زبان میں لکھی ہوئی) سب سے پہلے رواج پانے والی تفسیروں میں شمار کرتے ہیں۔''

ٹپی ٹکا کی ثقاہت کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسے بدھا کے نروان (Enlightenment) حاصل کرنے سے تین سو سال بعد مرتب کیا گیا۔ برٹینکا جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۵ پر انڈین فلاسفی کے عنوان کے تحت تحریر ہے:

"In the Tipitaka (Pali: "The Three Baskets", Sanskrit Tripitaka) collected and compiled 300 years after the mahaparinisvana (attainment of Buddhahood) at the council of Patalipura (3rd century BC), both the canonical and philosophical doctrines of early Buddhism were codified"..

ترجمہ: ''پتلی پورہ کی مجلس (تیسری صدی ق م) میں بدھ کے اپنا مقام (بدھا کا مرتبہ) حاصل کرنے کے تین سو سال بعد ٹپی ٹکا کی شکل میں بدھ مت کے اولین مذہبی احکامات اور فلسفیانہ اصول جمع اور مدون کیے گئے۔''

بھارتی پروفیسر رومیلا تھاپر اپنی تصنیف ''ہندوستان کی تاریخ'' (History of India) میں لکھتی ہیں:

"The Buddhist canon was collected some five hundred years after the Buddha's death, which makes it extremely difficult to define the chronological sequence of the canon or to indicate with certainty the interpolations of the followers. Buddhism was to undergo many changes both in the country of its origin and in the course of its spread to other parts of Asia". (Page 67).

ترجمہ: ''بدھ مت کے مذہبی احکامات بدھا کی موت کے پانچ سو سال بعد جمع کیے گئے۔ یہ بات احکامات کی زمانی ترتیب کی توضیح یا پیروان (بدھ) کے غلط اختلاط کے قطعی تعین کو انتہائی مشکل بنا دیتی ہے۔ بدھ مت کو اس ملک میں بھی جہاں اس کی ابتدا ہوئی اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں پھیلنے کے دوران بہت سی تحریفات سے گزرنا پڑا۔''

ان تین یا پانچ صدیوں میں بدھ مت کے بنیادی مسائل محو ہونے کے علاوہ شدید قسم کی نزع اور اختلافات کا موضوع بن چکے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات کے رونما ہونے کے بعد تین یا پانچ سو سال پر پھیلی ہوئی زبانی روایات کیسے قابل اعتماد ہو سکتی ہیں۔ گوتم بدھ کی موت کے چند برس بعد راج گڑھ میں بدھوں کی پہلی کونسل منعقد ہوئی۔ اس میں آنند نے جو گوتم بدھ کا سب متبعین سے زیادہ قرب رکھتا تھا، بدھا کے حالات و نظریات پیش کرتے ہوئے یہ تاثر دیا کہ وہ انسان ہی تھے۔ اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور آنند اس مجلس کے ارکان کے زیر عتاب آ گیا۔ وہ لوگ گوتم بدھ کو الوہیت کے مقام پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ اس اختلاف

نے دو بڑے فرقوں ہنایانا اور مہایانا کو جنم دیا۔ ڈبلیو این ویچ (W.N. Weech) کی "عالمی تاریخ" (History of the World) کے صفحات ۳۱۸-۳۱۹ پر لکھا ہے:

"In the teaching known as Hinayana or "Lesser Way of Salvation" Gotoma remains an inspired man, but in the Mahayana or "Greater Way" he was recognised as a god."

ترجمہ: (فرقہ) ہنایانا کی تعلیم کے مطابق (جس کو نجات کا کم تر راستہ "کہتے ہیں) گوتما ماورا ہستی سے ہدایت حاصل کرنے والا انسان ہے، لیکن مہایانا (برتر راستہ) میں اس کو خدا تسلیم کیا گیا۔"

مولانا ابوالکلام آزاد، جن کی تحریروں سے ان کے ادیان عالم کے تقابلی مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے "ام الکتاب" کے صفحہ ۲۰۴ پر رقمطراز ہیں:

"گوتم بدھ کی وفات پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ پیروان بدھ کی اکثریت نے اس کی شخصیت کو عام انسانی سطح سے بالاتر دیکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کے آثار و تبرکات کی پرستش کا میلان بڑھنے لگا تھا۔ اس کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب مذہب کی پہلی مجلس اعظم راج گیری میں منعقد ہوئی اور اس کے شاگرد خاص آنند نے اس کی آخری وصایا بیان کیں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ اس کی روایت پر مطمئن نہ ہوئے اور اس کے مخالف ہو گئے۔ کیونکہ اس کی روایتوں میں انہیں وہ ماورائے انسانیت عظمت نظر نہیں آئی جسے اب ان کی طبیعت ڈھونڈنے لگی تھی۔"

اسی موضوع پر انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۵ صفحہ ۲۷۶ پر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے۔:

"The early Buddhist councils (Sangitis, or "recitals") were largely concerned with the purity of the faith and practice of the monastic community. Unfortunately the councils pose an enormous problem to the historian because each major sect has its own account and opinion of them. Legend and even myth have so coloured these accounts that scholars cannot be sure when and where they took place or even who took part in them. Though many scholars deny its

very existence all Buddhist traditions maintain that a council was called at Rajagrha immediately after the Buddha's death. According to legend, this council (comprising 500 arhats, or monks) was responsible for the composition of the venaya (monastic discipline) under the month Upali and the dharma (i.e. the sutras) under the monk Ananda, even though the latter was supposedly brought to trial at the same council".

ترجمہ: ''بدھ مت کی ابتدائی مجالس (ہدایات و تلقین) کا زیادہ تر تعلق مذہب پر یقین کے خلوص اور بھکشو طبقہ کے عمل سے تھا۔ بد قسمتی سے چونکہ ہر بڑا فرقہ ان کے متعلق اپنا ہی تاثر اور رائے رکھتا ہے لہذا یہ مجالس مورخ کے لیے ایک عظیم الجھن کا باعث ہیں۔ روایتی داستانیں اور پرانی (من گھڑت خداؤں کی) کہانیاں حالات کے ان بیانات کو ایسا رنگ دینے کا باعث ہوئی ہیں کہ اہل علم یقین کے ساتھ یہ متعین نہیں کر سکتے کہ یہ کب اور کہاں منعقد ہوئیں یا کن لوگوں نے ان میں حصہ لیا۔ اگرچہ بہت سے اہل علم ان کے انعقاد سے انکار کرتے ہیں، لیکن بدھ مت کی تمام روایات تصدیق کرتی ہیں کہ بدھا کی موت کے فوراً بعد راج گڑھا میں ایک مجلس منعقد کی گئی۔ روایتی داستانوں کے مطابق یہ مجلس (جو ۵۰۰ ارائیوں اور بھکشوؤں پر مشتمل تھی) ''اوپالی'' نامی بھکشو کے تحت فرمایا (بھکشوؤں کے نظم) کی ترکیب اور آنند نامی بھکشو کی زیر سیادت دھما (یعنی بدھ مت کے پوجا پاٹ کے طریقوں) کی ترکیب کی ذمہ دار تھی۔ اگرچہ موخر الذکر مفروضہ طور پر اسی مجلس میں زیر عتاب آگیا۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مت کی تاریخ میں ثقاہت کا پہلو بہت کمزور ہے۔ گوتم بدھ کی موت کے فوراً بعد اعتقاد و عمل کے دائروں میں نئی نئی باتیں شامل کرنا پڑیں اور بہت سے خلا پر کرنے پڑے۔

مادہ پرستانہ مسلک سے وابستگی کی وجہ سے مغربی مفکرین تشکیک (Scepticism) کے مرض میں ویسے ہی مبتلا ہیں۔ لیکن گوتم بدھ اور بدھ مت کی تاریخ کی صحت کے متعلق اس بے یقینی کی کیفیت کی وجہ سے، جو ہم نے سطور بالا میں بیان کی ہے، بہت سے اہل علم نے بدھا کے تاریخی وجود کو یا تو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا اور یا مرموز (Allegorical) حیثیت دے دی۔ ہم مذہب زرتشت کے بیان کے سلسلے میں

برٹرینڈ رسل کی تحریر سے حوالہ دے چکے ہیں جس میں اس نے بدھا، زرتشت اور کنفیوشیس کی تاریخی حیثیت کو محل نظر قرار دیا ہے۔ لیکن اب آثاریات کے سلسلے کی تحقیقوں نے بدھا کی تاریخی شخصیت کو تسلیم کروانے میں بہت مدد دی ہے۔ البتہ واقعات زندگی اور نظریات کی صحت کی ضمانت مفقود ہے۔

اصولی سطح پر اختلاف اپنی جگہ پر، لیکن گوتم بدھ نے مقبولیت کی بنا پر جو عظمت کا مقام حاصل کیا اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں بے شمار معلمین اخلاق اور باطنی اصلاح کا درس دینے والے گزرے ہیں۔ بدھا کی معنوی قدو قامت کو انسانوں کی زندگی میں ان کے لائے ہوئے تغیرات کی جغرافیائی وسعت کی نسبت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کے مجسموں سے وسط ایشیا سے لے کر جاپان تک اللہ کی زمین بھر گئی اور انہیں انسان ہونے کے باوجود الوہیت کا وہ مقام مل گیا جو تاریخ انسانی میں کسی فرد و بشر کے حصے میں نہیں آیا۔ اس بات سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ ان کے نام پر جو بت پرستی کی گئی اور کی جا رہی ہے، اس الوہیت کا استحقاق سوائے خالق کائنات کے اور کسی کو حاصل نہیں، لیکن تاریخ کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ انہوں نے خدائی اور مافوق البشر ہونے کا زندگی کے کسی مرحلے پر بھی دعویٰ کیا ہو۔

گوتم بدھ کو ابتداً بہت پذیرائی حاصل ہوئی اگرچہ اس کا اظہار ہمارے نزدیک نامناسب طریق پر کیا گیا۔ ایک انسان جو اپنے والدین کے جنسی تعامل سے عالم وجود میں آیا ہو، اس کے ظاہری اور باطنی خصوصیات وہی ہوں، جن کے دوسرے انسان بھی حامل ہوں، جس کی زندگی کی بقا کے لیے اسے کھانے پینے کی احتیاج ہو۔ چنانچہ بدھا نے جو چھ سالہ چلا کشی کی اس کے متعلق ان کے نام پر قائم ہونے والے مذہب کی کتابوں میں مذکور ہے کہ ان کا جسم اس قدر نحیف ہو گیا تھا کہ وہ حاجات ضروریہ کے سلسلہ میں حرکت کرنے پر گر پڑتے تھے۔ ایک دفعہ انہیں حالت غشی میں دیکھ کر لوگوں نے سمجھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۰ کے صفحہ ۲۷۰ پر بدھ ازم کے عنوان کے تحت لکھے گئے مقالے کے مصنفین تحریر کرتے ہیں:

"As a consequence of all these severe bodily austerities, Gotama became so weak that he once fainted and fell down and was believed by some to be dead. By these experiences, he realised that such mortification could not

lead him to what he sought; he thus changed his way of life and again began to eat proper amounts of food."

ترجمہ: ''جسم کو اس کی غذائی ضروریات سے اس حد تک محروم کر دینے کی وجہ سے گوتما اس قدر نحیف ہو گئے کہ وہ ایک دفعہ غش کھا کر گر پڑے اور بعض لوگوں نے سمجھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ ان تجربات کے بعد انہوں نے یہ باور کیا کہ (اپنے آپ کو) اس طرح کی اذیتیں دینے سے وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا طرز زندگی بدل دیا اور دوبارہ موزوں مقدار میں غذا کھانے لگے۔''

گوتم بدھ کے مافوق البشر نہ ہونے کا اس سے زیادہ واضح اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اپنے سفر حیات کے بعد وہ عام انسانوں ہی کی طرح موت کی آغوش میں سو گئے۔

ان کا قریب ترین متبع آنندا، جس کا اس سے قبل راج گڑھ کی مجلس اعظم کے سلسلے میں تذکرہ ہو چکا ہے، ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا، اس نے جب گوتما کی نقاہت کے پیش نظر یہ محسوس کیا کہ اب آخری وقت قریب ہی ہے تو آئندہ کے لیے وصیت چاہی۔ لیکن بدھا نے کوئی وصیت کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے جو کچھ میرے پاس تھا اس سے تم لوگوں کو آگاہ کر دیا اور اب میں ایک بوسیدہ چھکڑے کی مانند ہوں۔ جس کو ہر وقت مرمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں صرف یہی کہوں گا کہ دھما (سنسکرت میں: بدھا کی تعلیمات) سے وابستگی اختیار کرو اور اسے ہی اوڑھنا بچھونا تصور کرو۔

گوتم بدھ کی زندگی کے حالات اور ان کے فکر پر ہر قلم اٹھانے والے نے عام طور پر گفتگو کا آغاز ان کے تین انسانی حالتوں کے مشاہدے سے ہے------ اس وقت ان کی عمر انتیس برس تھی اور وہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے (یہ مسئلہ بدستور موضوع اختلاف بنا ہوا ہے کہ آیا وہ شاہی خاندان کے چشم وچراغ تھے یا حکمران طبقے کے کسی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہر حال یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی) بیان یہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک نحیف آدمی کو دیکھا جس کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے جھک گئی تھی۔ پھر ایک بیمار انسان پر ان کی نظر پڑی جو زمین پر گرا ہوا تھا اور لوگ اس کو اٹھا رہے تھے۔ ازاں بعد ایک مردہ شخص کی لاش ان کے مشاہدے میں آئی۔ ان تینوں کی حالت کے متعلق انہوں نے اپنے سائیس سے سوال کیا تو اس نے بتایا کہ

انسانی زندگی میں یہ حالتیں غیر معمولی حیثیت نہیں رکھتیں۔ کہا جاتا ہے کہ حیات انسانی کی ان کیفیات کو دیکھ کر سدھارتا بہت پریشان و مضطرب ہوئے اور اس بات نے ان کی آئندہ زندگی کے اسلوب اور ادراک حقیقت کی جستجو کی خواہش کے لیے قوت محرکہ فراہم کی۔ اور انہوں نے گھر بار، ماں باپ اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر ترک دنیا کا فیصلہ کر لیا تاکہ انسانی زندگی کی حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکیں۔

اب اس قصے کی صحت کے وزن کا اندازہ کرنے کے لیے ذہن میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ایک انیتس سالہ ذہین و فہیم انسان جس نے اس دور کی سلطنت سکیا س کے دارالحکومت کپلا وستو جیسے آباد شہر میں زندگی بسر کی ہو، انسانی زندگی کی ان تین حالتوں سے بالکل بے خبر ہو سکتا ہے، اس سوال کا جواب یقیناً نفی ہی میں ہوگا "عالمی تاریخ" (History of the World) مرتبہ ڈبلیو این ویچ (W.N.Weech) کے صفحہ ۳۱۸ The Peoples and Religeous of India (ہندوستان کے لوگ اور مذاہب) کے مقالے کا مصنف گوتما بدھا کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتا ہے:

"As a young prince, he enjoyed the usual amusements of his class in the country near the great city of Benaras. He hunted, played games, feasted, married and begat a son".

ترجمہ: ایک نوجوان شہزادے کی حیثیت سے وہ بنارس کے بڑے شہر کے قریب کے علاقے میں اپنے طبقے میں رائج شوقین مزاجی سے اپنے آپ کو خوش رکھتے تھے۔ وہ شکار کھیلتے، کھیلوں میں حصہ لیتے، کھانے کی ضیافتوں میں شرکت کرتے، شادی کی، اور ایک لڑکا پیدا کیا۔

اس کا واضح مطلب ہے کہ گوتم بدھ نے ترک دنیا سے قبل معمول کی زندگی گزاری۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیات انسانی میں ان معمول کے تین واقعات کا مشاہدہ سدھارتا کو اتنا بڑا فیصلہ کرنے پر اکسا سکتا تھا جو اس نے کیا؟ یہ بات بھی قرین قیاس نہیں قرار دی جا سکتی۔

ہم گوتم بدھ کی زندگی اور ان کے فکر سے متعلق تاریخی مواد کی ثقاہت کے سلسلے میں پہلے اجمالی گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کو پیش نظر رکھ کر اور تین افراد کی حالت کے مشاہدے کے قصے کو فہم عام (Common Sense) کی روشنی میں جانچ کر انسان اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سدھارتا کی ترک دنیا اور ادراک

حقیقت کے حصول کی شدید خواہش کے پیچھے اس سے بہت زیادہ وزنی اور ٹھوس محرکات تھے۔ لیکن دستیاب تاریخ سے کسی اور جذبہ محرکہ کی نشاندہی نہیں ہوتی لہذا ہم اس بحث کو یہیں ختم کر کے ان واقعات کی بنیاد پر ہی اپنی معروضات پیش کرتے ہیں جو بدھ مت سے متعلقہ کتب میں درج ہیں۔

تلاش حقیقت کے لیے گھر سے روانہ ہونے کے بعد گوتم بدھ یکے بعد دیگرے دو شخصیتوں کے پاس گئے تاکہ ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ لیکن وہاں سے انہیں جو کچھ حاصل ہوا، اس سے وہ مطمئن نہ ہوئے۔ بالآخر وہ "اوروِیلا" (Uruvela) کے مقام پر پہنچے جہاں درختوں کا ایک جھنڈ تھا اور ان کے درمیان میں سے ایک دریا بہہ رہا تھا۔ حصول ضروریات کے لیے قریب ہی گاؤں آباد تھا۔ اس مقام پر ایک پیپل کے درخت کے نیچے انہوں نے فقر و فاقہ کے انداز کی زندگی بسر کرنا شروع کی اور اپنے تصور کے مطابق استغراق و محویت میں ڈوب گئے۔ اس حال میں چھ سال گزرے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ایک مرحلے پر وہ اس قدر شدید نقاہت کی زد میں آ گئے کہ انہوں نے معمول کی غذا کھانی شروع کر دی جس سے ان کی قوت و صحت بحال ہو گئی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک رات میں ان پر جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، دو کیفیتیں وارد ہوئیں۔ جب وہ نروان (Enlightenment) حاصل کرنے کے قریب تھے تو برائی کی ہمت افزائی، نمود پرورش اور نفسانی خواہشات کو انگیخت دینے والی قوت جس کو بدھ مت کی اصطلاح میں مارا (Mara) کہا گیا ہے، نے گوتم بدھ پر اپنے لشکریوں کی مدد سے ایک شدید حملہ کیا۔ لیکن بدھا نے اپنی سابقہ بے شمار ارضی زندگیوں میں اپنے اندر جو دس خوبیاں پیدا کی تھیں اور جنہیں پالی زبان (بدھ مت کی مذہبی زبان) میں پارا متاز (Paramitas) کہا جاتا ہے کی مدد سے مارا کو شکست دی۔ یہ دس خوبیاں (۱) سخاوت (۲) اخلاق حسنہ (۳) لذات دنیا سے احتراز (۴) دنیا سے احتراز (۵) استقلال (۱) صبر (۷) صداقت (۸) عزم (۹) ہر کسی سے محبت (۱۰) اعتدال مزاج پر مشتمل ہیں۔

مارا کے فرار کے بعد اس رات میں بدھا پر چار چار گھنٹوں کے دورانیے کی تین حالتیں طاری ہوئیں جن سے گزرنے کے بعد انہوں نے نروان حاصل کر لیا۔ ان تین وقفوں میں انہوں نے مندرجہ ذیل استعدادیں پائیں، وقفوں کے اوقات بھی درج کر دیئے گئے ہیں:

۱۔اپنی گزشتہ ارضی زندگیوں کا علم (۶ بجے شام سے ۱۰ بجے تک)

۲-مافوق الانسانی مقدس آنکھ جس کے ذریعے سے وہ انسانوں کی موت اور ان کی اس کے بعد کی دنیوی زندگی (Rebirth) کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔(۱۰ بجے رات سے ۲ بجے تک)

۳۔ہر قسم کے باطنی امراض اور غلاظتوں کو محو کرنے کا علم (۲ بجے رات سے ۶ بجے صبح تک) یہ واقعہ مئی ۵۲۸ ق م کا ہے۔

گوتم بدھ نے دعویٰ کیا کہ ان کے اندر اس کے بعد چار بلند درجہ مبنی بر صداقت خصوصیات پیدا ہو گئیں:

۱۔میرا باطن (دنیوی خبائث سے) آزاد ہو گیا۔

۲-جہالت ولاعلمی کا خاتمہ ہو گیا۔

۳۔علم وحکمت کا ظہور ہوا۔

۴-تاریکی دور ہو گئی۔

نروان کے حصول کے بعد گوتم بدھ نے پینتالیس سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی مدت کے دوران اپنے خیالات و نظریات کی تبلیغ کی۔ لیکن بعد کے ادوار کی فلسفیانہ موشگافیوں کے برعکس انہوں نے اپنی گفتگوؤں کو انسان کی باطنی اصلاح وارتقا کے سلسلے کے نظریات تک محدود رکھا اور اس ارضی زندگی ہی کو اپنی توجہ کا محور بنایا جس سے ان کے خیال میں بار بار کی پیدائش و موت کے ذریعے سے انسان کا واسطہ رہتا ہے۔پروفیسر ٹریور لنگ اپنی تصنیف ''دی بدھا'' (The Buddha) میں لکھتا ہے۔

"What follows is an account of the intellectual penetration into the nature of the human situation which the Buddha then achieved, in which the notion of the individual 'self' (atman) is seen as the root of mankind's trouble" (Page 131).

ترجمہ: ''نتیجتاً بدھ مت کو انسانی ذہن و شعور کی دریافت قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کسی لحاظ سے بھی کسی غیر انسانی ماورائے مادہ یا خدائی ہستی کی طرف سے گوتما کو نہیں دیا گیا۔''

جو کچھ گوتم بدھ پر منکشف ہوا اس کا نچوڑ اسی مصنف کے الفاظ میں یہ ہے:

ترجمہ: ''اس کے بعد جو کچھ بدھا کو حاصل ہوا وہ انسانی مقام کی نوعیت میں ذہنی نفوذ تھا جس کے ذریعے سے انکشاف ہوا کہ بنی نوع انسان کی مصیبتوں کی اصل علت اس کی ''انانیت'' (آتما) کا زعم ہے۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ گوتم بدھ کی داستان حیات بھی زندگی کے قنوطی تصور سے شروع ہوتی ہے اور نروان کے بعد بھی ان کے نظریات پر اس کا غلبہ باقی رہا۔ ٹریور لنگ ''دی بدھا'' کے صفحہ ۱۳۴ پر بدھا کی طرف یہ عقیدہ منسوب کرتے ہیں:

"In every case the starting point, the datum, is dukkha, the suffering, pain or grief which is the common lot of all living beings. For Buddha this is what constituted the problem to be solved; it is from this that all his thinking started and it was to the curing of this condition that all his effort was directed".

ترجمہ: ہر معاملے میں نکتہ آغاز اور اصل الاصول ''دکھا'' یعنی مصیبت، تکلیف اور غم ہے جو تمام ذی حیات مخلوق کی مشترک قسمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدھا کے نزدیک یہ اصل گتھی ہے جسے حل کرنا مقصود ہے۔ اسی سے اس کے تمام فکر کا آغاز ہوا اور اس کی سعی و جہد اسی مرض کے علاج پر مرکوز رہیں۔

مخلوق خدا کی ہر ظاہری و باطنی حالت اور کیفیت پر گوتم بدھ نے ''دکھا'' کو منطبق کیا ہے۔ اس کی تفصیلات نہایت طویل ہیں۔ پیدایش، عمر کا آگے بڑھنا، بڑھاپا، موت اور ان مراحل سے منسلک تمام ذہنی خیالات "دکھا" کی زد میں ہوتے ہیں۔ موت کے بعد پھر آئندہ کے جنم کے لیے پیدایش کا مرحلہ پیش آتا ہے اور اس طرح ''دکھا'' کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہ نظریہ انسان کو جبریت (Fatalisim) کے پھندے میں اس شدت کے ساتھ جکڑا ہوا قرار دیتا ہے کہ اس سے آزادی عمل کا حق چھن جاتا ہے۔ اس کی موجودہ زندگی

گزشتہ جنم کا نتیجہ ہے اور اسی میں کیے گئے اعمال اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی ذات پات کے نظم (Caste System) کی بنیاد بھی اسی نظریے سے فراہم ہوتی ہے۔ چاہے کوئی برہمن ہو یا شودر، اس کی موجودہ حیثیت گزشتہ زندگی کا عکس ہے۔ لہذا یہ غیر متبدل ہے۔ برہمن از روئے پیدایش برہمن رہے گا اور شودر شودر رہے گا۔ گوتم بدھ نے ذات پات کی تمیز کو تو تسلیم نہیں کیا لیکن ہندوؤں کے نظریہ تناسخ (Transmigration) سے اتفاق کر کے اس کی بنیاد کو قائم رکھا (اس پر وضاحتی گفتگو آگے آئے گی) ''دکھا'' کا نظریہ بھی جبریت ہی کی توثیق کرتا ہے۔ ''دکھا'' اور تناسخ کے چکر سے نجات حاصل کرنے کے لیے ''نروانا'' کے مقام تک پہنچنے کی سعی وجہد تجویز کی گئی ہے، لیکن ایک تو اس کا تعلق فرد کی ذاتی کیفیات باطنی سے ہے اور دوسرے معمول کی زندگی گزارتے ہوئے اس کے حصول کی کوئی صورت نہیں۔ گوتم بدھ نے بنی نوع انسان کی زندگی کے اجتماعی پہلو پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔ سوشیالوجی آف ریلیجن (Sociology of Religion) کا مصنف پروفیسر جوچیم ویش (Joachim Wach) بدھا کے متعلق لکھتا ہے:

"Most students agree that this message was addressed to the individual seeker for salvation and does not concern itself with problems resulting from the "natural" organisation of human society but expressly rejects the claims of family, class, etc on the true followers of the law. No collective life, except in the form of the "order" and its cells, can be of any positive value for the ultimate goal." (Page 319).

ترجمہ: ''اکثر محققین اتفاق کرتے ہیں کہ اس کا پیغام انفرادی طالبین ہدایت و نجات کے لیے تھا۔ اور اس کا انسانی معاشرے کی ''فطری'' تنظیم کے متعلقہ مسائل کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ خاندان اور قبیلے وغیرہ کے مطالبات کو اپنے مسلک کے سچے پیروؤں کے لیے بالصراحت مسترد کرتا تھا۔ منزل مقصود کے حصول کے لیے اس ''نظم'' اور اس کی شاخوں کے سوا اور کوئی اجتماعی ہئیت زندگی کار آمد نہیں ہو سکتی۔''

یہاں ''نظم'' (Order) سے مراد ''سنگھا'' ہے جس کے متعلق ہم آئندہ گفتگو کریں گے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ تنظیم، اگر اس کو یہ نام دیا جاسکتا ہے، اجتماعیت پیدا کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس سے وابستہ بھکشوؤں کا کام لوگوں کو انفرادی سطح پر دکھاوے کے چرچے سے نکلنے کے لیے ہدایات دینا تھا۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نروانا کے مقام کے حصول کے بعد ''دکھا'' سے اور اس دنیا کی اذیت زدہ زندگی سے نجات کے بعد فرد متعلقہ کس حشر سے دوچار ہوتا یا کہاں جاتا ہے۔ اس کے متعلق برٹینکا جلد ۱۵ میں بدھ دھرم پر مقالہ لکھنے والے مصنفین لکھتے ہیں:

"The Buddha left indeterminate question regarding the destiny of the man who has attained this ideal state or the existence of the purified saint after death, for such judgements are inapplicable to this present existence." "Though it is true that the Buddha avoided discussion of the ultimate reality that lay beyond the categories of the phenomenal world he did not seem to have had any doubts around the absolute. He said, "There is an unborn, an unoriginated unmade, an uncompounded; were there not, there would be no escape from the world of the born, the originated the made and the compounded." The Buddha believed in something that endures beneath the shifting appearances of the visible world. The positive character of Nirvana is inexpressible in any terms of finite experience of human beings, for its reality transcends the realm of birth and death" (Page 275).

ترجمہ: ''بدھا نے اس شخص کے انجام کا مسئلہ جس نے یہ مطلوبہ کیفیت حاصل کرلی ہو یا موت کے بعد پاکیزہ متبرک شخصیت کی حالت وجود کا مسئلہ غیر طے شدہ چھوڑ دیا کیونکہ ایسے فیصلے حالیہ زندگی سے متعلق نہیں ہیں۔

''اگرچہ یہ درست ہے کہ بدھا نے اس حقیقت مطلقہ کے متعلق گفتگو کرنے سے گریز کیا جس سے حسیات کی دنیا کی حالتوں کے بعد سابقہ پڑے گا لیکن وہ ایک قادر مطلق ہستی کے وجود سے متعلق متردد دکھائی نہیں دیتا۔ اس (بدھا) نے کہا ''ایک غیر پیدائشی، قدیم، غیر مخلوق اور خلط عناصر سے منزہ (ہستی) ہے۔ اگر (وہ) نہ ہوتی تو (اس دنیا) جو پیدائش، حدوث، تخلیق اور خلط عناصر کا مجموعہ ہے، سے برات نہ ہو سکتی'' بدھا ایک ایسی شے (ہستی) کے قائل تھے جو اس ظاہری دنیا کی رو بہ تغیر شواہد کی تہ میں موجود ہے۔ نروانا کی مثبت نوعیت انسان کے محدود وقت تجربہ کے پیش نظر نا قابل بیان ہے، کیونکہ اس کی حقیقت پیدائش و موت کے دائرے سے ماورا ہے۔'' (صفحہ ۲۷۵)

خالق و مخلوق کا تعین اور انسانی اعمال کے نتائج کے سلسلے میں اس انداز گفتگو پر فلسفیانہ رنگ میں بے نتیجہ بحث و تمحیص تو ہو سکتی ہے لیکن قطعی اور واضح نظریات کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔

بدھ مت کی طرف ٹریور لنگ جی ایس پی مسرا (G.S. Misra) کی تصنیف "Logical and Scientific Method in Early Buddhist Texts" کے صفحہ ۵۴ میں درج ذیل اقتباس دے کر یہ نظریہ منسوب کرتا ہے:

"The most distinctive feature of Buddhist ethics is its freedom from theism, which leaves room for rationalism and rules out submission to some super human power controlling the world process" ("The Buddah" Page 140).

ترجمہ: بدھ مت کی اخلاقیات کی نمایاں خصوصیت خدا کے تصور سے اس کی آزادی ہے جو عقل پرستی کی گنجایش پیدا کرتی ہے اور کسی ایسی فوق البشر ہستی کے آگے سر تسلیم خم کی ضرورت کو ختم کر دیتی ہے جو کائناتی عمل پر قدرت رکھتی ہو۔''

پروفیسر رومیلا تھاپر ہسٹری آف انڈیا جلد اول میں لکھتی ہے:

"Buddhism was also atheistic in as much as God was not essential to the Universe, there being a natural cosmic rise and decline". (Page 66).

ترجمہ: ''بدھ مت خدا کا منکر بھی ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کا وجود کائنات کے لیے ضروری نہیں۔ پس منظّم کائنات میں نشیب و فراز کا سلسلہ از خود چلتا ہے۔''

بدھ کے متعلق گفتگو کے اس حصے کے اخیر میں ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی ''ام الکتاب'' سے بھی اقتباس پیش کرتے ہیں:

''قدیم برہمنی مذہب کے بعد شمنی مذہب (یعنی بدھ مذہب) کا ظہور ہوا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ہندوستان کا عام مذہب یہی تھا۔ شمنی مذہب کے اعتقادی مبادیات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے مستشرقین کے ایک گروہ نے اسے اوپانی شدوں کی تعلیم ہی کا ایک عملی استغراق قرار دیا ہے اور خیال کیا تھا کہ ''نروان'' میں جذب و انفعال کی روحانی اصل پوشیدہ ہے۔ یعنی جس سرچشمہ سے انسانی ہستی نکلی ہے۔ پھر اسی میں واصل ہو جانا ''نروان'' یعنی نجات کامل ہے۔ لیکن اب عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے شمنی مذہب خدا اور روح کی ہستی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔

اس کا دائرہ اعتقاد و عمل صرف زندگی کی سعادت اور نجات کے مسئلہ میں محدود ہے۔ وہ صرف پر کرتی، یعنی مادہ ازلی کا حوالہ دیتا ہے جسے کائناتی طبیعت حرکت میں لاتی ہے۔ نروان سے مقصود یہ ہے کہ ہستی کی انانیت فنا ہو جائے اور زندگی کے چکر سے نجات مل جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک مابعد زمانے کے شمنی مفکرین کی تصریحات کا تعلق ہے یہی تفسیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان کا ایک گروہ لا ادریت (Agnosticism) تک پہنچ کر رک گیا تو دوسرا اس سے بھی آگے نکل گیا ہے اور مدعیانہ انکار کی راہ اختیار کی ہے۔''صفحہ (۳۰۲)

بہر حال بدھ مت سے متعلق علم (Buddhology) کے متعلق مستشرقین نے وسیع پیمانے پر جو تحقیق و مطالعہ کیا ہے اس کے نتیجے میں جملہ محققین کی یہی رائے ہے کہ گوتم بدھ سے کوئی ایسی روایت موجود نہیں جس سے معلوم ہوتا ہو کہ انہوں نے کسی ماورائے انسان ہستی کے وجود کا اثبات کیا ہو جو اس کائنات اور انسان کی خالق ہے۔ نہ ہی انہوں نے معاد کا کوئی تصور دیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ماہرین علم بدھ مت کی تحریروں کے حوالے دے کر ثابت کیا ہے وہ انسانی عمومی زندگی کے ہر پہلو پر تکلیف اور اذیت کو چھایا ہوا دیکھتے

تھے اور نظریہ تناسخ کے قائل تھے جس کی وجہ سے انسان اس دکھ سے نروان حاصل کیے بغیر نجات نہیں پا سکتا۔ لیکن نجات کے بعد انسان کس انجام سے دوچار ہوتا ہے، اس کے متعلق بدھ مت خاموش ہے۔ اس طرح انسان کے وجود کی کہانی غیر مکمل رہ جاتی ہے۔ روح اور جسم کی ثنویت پر بھی وہ یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان خیالات کی بنیاد پر مستشرقین جن کی کاوشوں کی بدولت بدھ مت کی تعلیمات کا بیشتر حصہ احاطہ علم میں انیسویں صدی کے اواخر سے لایا گیا ہے، بدھ مت کو مذہب قرار دینے کے معاملے میں متردد ہیں اور کہتے ہیں کہ گوتم بدھ کی تعلیمات مادہ پرستانہ (Materialistic) اور لادینی (Secular) نظریات کی حامل تھیں اور ان کا تعلق انسان کی صرف ارضی زندگی سے تھا۔ پیروان بدھ نے اپنے مسلک کے سلسلے میں سنسکرت اور پالی زبانوں میں بڑے پیمانے پر لٹریچر تخلیق کیا لیکن ان میں سے کسی فرقے اور مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں نے بھی خدا کے وجود (Theism) اور اخروی زندگی کا اثبات نہیں کیا۔

لیکن چونکہ انسان اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی ایک ایسی وسیع و عریض کائنات کو دیکھتا ہے جس کے عالم وجود میں لانے اور اس کے نظم و نسق کو چلانے میں وہ اپنے عدم دخل کو تسلیم کرتا ہے۔ نیز وہ اپنی اس زندگی کے بہت سے معاملات میں بھی اپنے آپ کو بے بس پاتا اور ایسے ناخوش آئند واقعات سے دوچار ہوتا ہے جن سے وہ اذیت اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔ لہذا وہ کائناتی مظاہر اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز پر قدرت رکھنے والی کسی نہ کسی ہستی کو اپنے تخیل کے ذریعے سے ایجاد کرتا ہے۔ چنانچہ بدھ مت میں مسند الوہیت کو خالی دیکھ کر چند سال کے اندر اندر پیروان بدھ نے گوتم بدھ ہی کو اس مسند پر بٹھا دیا۔ ہندوستان میں بت سازی کی رسم تو چلی ہی آ رہی تھی لہذا جب بدھ مت کو عروج حاصل ہوا تو حیاتی تقاضوں کے دباؤ کے تحت مغرب میں وسطی ایشیا تک، مشرق میں جاپان تک شمال میں چین تک اور جنوب میں لنکا تک اللہ کی زمین گوتم بدھ کے بتوں سے معمور ہو گئی۔

بعض مستشرقین بدھ مت کو ایک نئے اور مخصوص تمدن کے ظہور کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم مذاہب اور تمدنوں کے معاملے میں ان حضرات کے ذہنی و فکری طرز عمل (Mental and intellectual attitude) کا تجزیہ تو ''مستشرقین'' ہی کے عنوان کے تحت کریں گے لیکن یہاں ہم صرف یہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ حالات و واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ گوتم بدھ کی جو تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں، اور جن کے معیار ثقاہت کے متعلق ہم مستند حوالے دے چکے ہیں، اور جن کے معیار ثقاہت کے

متعلق اپنا مخصوص نکتہ نظر رکھتے تھے۔ ہم شواہد کے ذریعے سے یہ ثابت کریں گے کہ جس ہندو معاشرے میں گوتم بدھ نے جنم لیاان کے نظریات سے تمدنی سطح پر اس میں کوئی بنیادی تغیر واقع نہیں ہوا۔اس کے برعکس اس تمدن کے بہت سے عوامل سے انہوں نے سازگاری اختیار کی اور جن عوامل سے اختلاف کیااس پر انہوں نے قطعاً کوئی زور نہیں دیا۔نہ ہی ان کے مٹانے کے سلسلے میں انہوں نے کوئی سعی وجہد کی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کی جلد ۱۵ میں بدھ ازم کے عنوان کے تحت مشترک طور پر لکھنے والے تین مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"While the contemplative elite may deny the real existence of gods & demons together with all the rest of phenomenal existence, the majority of Buddhists from the earliest times in India, and in whatever country north to south where Buddhism has spread never neglected indigenous religious beliefs. (Page 305)

ترجمہ: اگرچہ صاحب فکر منتخب طبقہ (وہی) خداؤں اور بدروحوں کے حقیقی وجود کا انکار بھی کردے، اور ساتھ ہی حسیات کے ذریعے سے جن اشیا کا ادراک ہو سکتا ہے ان کے بھی منکر ہو جائیں، لیکن (یہ حقیقت ہے کہ) ابتدائی ادوار ہی سے ہندوستان میں اور جس شمالی یا جنوبی ملک میں وہ گئے اور جہاں بدھ مت پھیلا بدھوں کی اکثریت نے کبھی بھی مقامی مذہبی عقائد کو نظرانداز (یا ترک) نہیں کیا۔

ان مذہبی عقائد ہی کے زیر اثر ان ادوار میں کائنات اور انسان کی ابتدا و انتہا سے متعلق نظریات پوجا پاٹ کی رسوم، بیاہ شادی اور موت کے مواقع پر رواج، انسانی، مزاج کی تعمیر، معاشرتی معیارات وغیرہ ترتیب پاتے تھے۔اگر ان سے بدھ مت نے کوئی تعرض نہیں کیا تو اس کے ذریعے سے کسی نئے تمدن کے ظہور میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

درج بالا اقتباس سے جو دوسرا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرز عمل کی وجہ سے بدھ مت کو خواص و عوام کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مروجہ مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) نظریات اور مذہبی و سماجی رسوم میں عدم مداخلت کی وجہ سے گوتم بدھ کو بغیر کسی مخاصمت و مخالفت کے نروان حاصل

کرنے کے بعد پینتالیس سال تک انسانی زندگی کے اخلاقی اور باطنی دائرے کے اپنے مخصوص عقائد کی اشاعت کا موقع مل گیا۔اس صورت حال نے بدھ مت کے وسیع پھیلاؤ میں بڑی معاونت کی۔ٹریور لنگ لکھتا ہے:

"The Buddha was not hostile to the religious ideas and practices of the ordinary people. He did not endorse these ideas and practices but neither did he in general, oppose them" (The Buddha. Page 143).

ترجمہ:''بدھا عام انسانوں کے مذہبی عقائد واعمال کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔انہوں نے ان عقائد واعمال کی تائید نہیں کی، لیکن نہ ہی عام طور پر انہوں نے ان کی مخالفت کی۔''

اپنے نظریات کے خلاف مروجہ عقائد و اعمال سے صرف اغماض ہی نہیں کیا بلکہ ان سے اکثر صورتوں میں سازگاری اختیار کی۔پروفیسر رومیلا تھاپر لکھتی ہے:

"Brahaminical ritual was almost entirely eliminated and was disapproved of in the early pure form of Buddhism: popular cults such as the worship of trees and funerary tumuli were accepted and Buddhist were thus able to associate themselves with popular worship". (A History of India I Pages 66-67).

ترجمہ: بدھ مت کی ابتدائی اصلی حالت میں برہمنی پوجا پاٹ کی رسم کو کلیتا "کالعدم اور ناقابل قبول قرار دیا گیا (بعد میں) مقبول عام مسالک جیسا کہ درختوں کی پوجا اور اموات کے موقع کی رسوم کو اپنا لیا گیا اور اس طرح پیروان بدھ عوامی طریق عبادت میں شریک ہونے کے قابل ہو گئے۔''

یہی مصنفہ لکھتی ہے:

"Buddhism and Jainism though they did not directly attack the caste system, were nevertheless opposed to it and can, to that extent, be described as non-caste movements. This provided an opportunity for those of low caste to opt out of their caste by joining a non-caste sect. The lack of

expenses involved in worship, as contrasted with Brahamanical worship, also attracted the same stratum in society". (Page 68)

ترجمہ: اگرچہ بدھ مت اور جین مت نے براہ راست ذات پات کے مسلک پر حملہ نہیں کیا لیکن اس کے باوجود وہ اس کے مخالف تھے اور اس حد تک ان کو ذات پات کی تمیز سے مبرا تحریکیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس بات نے نچلی ذات کے لوگوں کو اپنی ذات سے نکل کر ذاتوں سے آزاد فرقے میں شامل ہونے کا موقع مہیا کر دیا۔ برہمنی پوجا پاٹ میں اخراجات کی ضرورت کے مقابلے میں (یہاں) کسی قسم کے ایسے اخراجات کی عدم پابندی نے معاشرے کے اس طبقے کے لیے کشش پیدا کر دی ہے۔"

ڈبلیو ایچ ویچ (W.H. Weech) کی "دنیا کی تاریخ" (History of the World) کے صفحہ ۱۸ پر لکھا ہے:

"In parts of his teaching Gotama followed the ideas of the Upanishads. He acknowledged the doctrine of Karma and he bade the true follower of the Aryan path to aim at Nirvana or the soul's peace".

ترجمہ: "اپنی تعلیمات میں گوتما نے جزوی طور پر اوپانی شدھ کے نظریات کا اتباع کیا۔ اس نے کرما کے اصول کو درست تسلیم کیا اور آریائی مسلک کے پردوں کو نروانا یعنی روحانی تشکیل کا نصب العین پیش نظر رکھنے کی ہدایت کی۔"

اس کے بعد صفحہ ۳۱۹ پر ہے:

"In later ages he was worshipped as divine in many places while Vishnu and other old Hindu gods received prayers as his assistants".

ترجمہ: بعد کے زمانوں میں اس (بدھا) کی بہت سے علاقوں میں بطور خدا پوجا کی گئی، کہ وشنو اور دوسرے پرانے (مزعومہ) ہندو خدا اس کے معاونین کے طور پر پوجے جاتے تھے۔"

مندرجہ بالا مباحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول تو گوتم بدھ نے مروجہ مذہب میں کسی بنیادی تبدیلی کی کوشش ہی نہیں کی۔ زمانہ مابعد میں پیروان بدھ نے بھی ہر جگہ اور ہر ملک و علاقے میں رائج مذہبی طریقوں سے سازگاری اختیار کرنے کا طریقہ اپنالیا۔ جب سابقہ مذہبی تعرض کے چاہے ان سے ذہن میں جتنا بھی اختلاف کیا گیا ہو۔ محض مسلمہ اخلاقی خوبیوں پر زور دیا جائے تو مخاطبین کی مخالفت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا اور ان کو محدود اخلاقی نظریات کے دائرے میں متاثر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہر ایسا مسلک بے ضرر سمجھا جاتا ہے اور قائم شدہ مفادات رکھنے والے اس سے خوفزدہ ہو کر اس کی مخالفت پر کمربستہ نہیں ہوتے۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی تصنیف Discovry of India میں لکھتے ہیں:

Buddha said "Go into all lands and preach this Gospel. Tell them that the poor and the lowly, the rich and the high are all one, and that all castes unite in this religion as do the rivers in the sea".

"Never in the world does hatred cease by hatred; hatred ceases by love".

"Not by birth, but by his conduct alone, does a man become a low-caste or a Brahman."

"Let a man overcome a anger by kindness, evil by good."

"One may overcome a thousand men in battle, but he who conquers himself is the greatest victor" (Pages 127-8).

ترجمہ: ''بدھا نے کہا سب علاقوں میں جاؤ اور اس صداقت کی تبلیغ کرو۔ ان کو بتاؤ کہ مفلس اور کم حیثیت، امیر اور عالی مرتبہ بھی ایک جیسے ہیں۔ اور اس مذہب میں تمام ذاتیں اسی طرح متحد ہو جاتی ہیں جس طرح سمندر میں دریا۔'' ''دنیا میں نفرت سے نفرت ختم نہیں ہو سکتی، نفرت محبت کے ذریعے سے ختم ہوتی ہے'' ''پیدائش سے نہیں بلکہ عمل کے ذریعے سے انسان نیچ ذات یا برہمن بنتا ہے۔''

''انسان کو غصہ پر نرمی کے ذریعے سے قابو پانا چاہیے اور برائی پر اچھائی سے''۔

''جنگ میں ہزار افراد کو زیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جو اپنے آپ کو قابو کرتا ہے وہ سب سے بڑا فاتح ہے۔''

یہ ایسے عام فہم اخلاقی اصول ہیں جن کو اگر محض زبانی بیان کر دیا جائے تو ان کو برسر حق تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر امراء کو ناجائز انتفاع دولت اور غریب طبقات کو نشانہ ظلم و ستم بنانے اور ان سے حقارت کا سلوک کرنے سے روکنے کے لیے اور غریبوں اور بیکسوں کو ان کے حقوق دلانے کے لیے عملی اقدام کیا جائے اور ایسا نظام اجتماعی قائم کرنے کی کوشش کی جائے جن سے ان برائیوں کا قلع قمع ہو جائے، تو اس صورت میں جس طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے والا کوئی انسان بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر برہمن سے اس کی مذہبی اجارہ داری چھیننے کی کوشش کی جائے اور شودر کو اس کے ہم پایہ مقام دینے کی عملاً کوشش کی جائے تو اس کے رد عمل کا تصور آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

لیکن عمل کے میدان میں برواثم میں مفاہمت ہو گئی اور عقائد بھی اسی سانچے میں ڈھل گئے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اسی کتاب میں رادھا کرشن کی تصنیف انڈین فلاسفی (Indian Philosophy) سے مندرجہ ذیل اقتباس دیتے ہیں:

"Brahmanism made of Buddha an autar, a God, so did Buddhism. The Mahayana doctrine spread rapidly, but it lost in quality and distinctiveness what it gained in extent ---- The theories grew and flourished; each new step, each new hypothesis demanded another until the whole sky was filled with forgeries of the brain". (Page 179).

ترجمہ: برہمنی مسلک نے بدھا کو اوتار اور خدا بنالیا، بدھ مت نے ایسا ہی کیا۔ مہایانا مسلک تیزی سے پھیلا لیکن اس نے وسعت سے جو کچھ پایا معیار اور وضاحت اصول میں کھو دیا۔۔۔۔۔ خیالی نظریات بڑھے اور پھلے پھولے ہر نئے قدم، ہر نئے مفروضے نے دوسرے کا مطالبہ کیا یہاں تک کہ ساری فضا جعل سازیوں سے معمور ہو گئی۔''

ابتدائی تعلیمات میں بعد کی، بقول رادھا کرشن، ''جعلی'' تعلیمات و نظریات کے نفوذ نے بدھ مت کا حلیہ ہی بدل دیا۔ چنانچہ ٹریور لنگ جو محققین بدھ مت میں نمایاں مقام رکھتا ہے اور جس نے اس مذہب کے متعلق متعدد کتب تصنیف کی ہیں اپنی کتاب The Buddha میں لکھتا ہے:

"---Buddhism has been tolerant and has countenanced beliefs and practices which are fundamentally alien to its own central affirmations, beliefs, for instance of a polytheistic nature" (Page 145-6).

ترجمہ: بدھ مت نے رواداری کا مظاہرہ کیا اور ایسے عقائد و اعمال کو قبول کیا جو بنیادی طور پر ان کے مرکزی اصولوں اور عقائد سے متصادم تھے۔ مثلاً تعدد الٰہ کی نوعیت کے۔''

اس کے علاوہ گوتم بدھ نے مختلف حکمرانوں کے ساتھ جو روابط قائم کر رکھے تھے وہ مذہبی سطح پر مروجہ اصولوں کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے کے ساتھ مل کر بدھ مت کے پھیلاؤ میں مزید مددگار ثابت ہوئے۔ چنانچہ ٹریور لنگ ''دی بدھا'' میں لکھتا ہے۔

"As the son of the leading citizen of Kapilavastu Gotama had the equality of status which enabled him throughout his long public life to meet with the kings of northern India on equal terms --- when he died we are told that he was honoured and his mortal remains disposed of after the manner of a king. If one asked whether the Buddah had the greater affinity with the priest or with the king and whether it was to religion or to secular affairs that his characteristics were closer there can be no doubt about the answers which would have to be given." (Pages 142-3).

ترجمہ: کپلاوستو کے سربراہ شہری کے بیٹے کی حیثیت سے گوتما کو وہ مساوی مرتبہ حاصل تھا جو اسے اپنی طویل عوامی زندگی کے دوران شمالی ہندوستان کے بادشاہوں سے برابری کی سطح پر ملنے کے قابل بناتا تھا ۔۔۔۔۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جب وہ موت سے ہم آغوش ہوا تو اس کی تعظیم کی گئی اور اس کے جسد مردہ کو شاہی

انداز میں سپرد خاک کیا گیا۔ اگر کوئی سوال کرے کہ آیا بدھا مذہبی شخصیت کی طرف زیادہ رجحان رکھتا تھا یا بادشاہ کی طرف اور آیا اس کی خصوصیات (طبیعت) مذہبی معاملات سے قریب تر تھیں یا لادینی سے تو اس کا جو جواب دیا جائے گا اس کی صحت میں شک وشبہ کی گنجایش نہ ہوگی''

ہم نے گزشتہ چند صفحات میں بدھ مت پر تحقیق کرنے والے اہل علم کی تفصیلات سے جو اقتباسات دیئے ہیں ان سے تاریخ میں اس مذہب کے سفر اور جغرافیائی حیثیت سے زمین کے ایک معتدبہ حصے پر اس کے پھیلاؤ کے اسباب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اگرچہ تکرار تو ہوگی لیکن وضاحت مدعا کے لیے ان اقتباسات سے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں اور جنہوں نے بدھ مت کی اشاعت میں معاونت کی انہیں ہم نکات کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بدھ مت نے اپنے ابتدائی اور بنیادی اصولوں کے ساتھ کلی وابستگی پر کبھی اصرار نہیں کیا۔

دوسرے یہ کہ وہ جس ملک یا علاقے میں گیا، اس کے مذہبی عقائد سے تعرض کیا نہ انہیں نظر انداز کیا۔

تیسرے یہ کہ اگرچہ جو تاریخی شواہد دستیاب ہیں ان کے مطابق گوتم بدھ نے پوجا پاٹ کا کوئی طریقہ نہیں بتایا، لیکن بدھ جہاں بھی گئے، وہیں کے طریقہ ہائے پوجا پاٹ کو اپنا لیا۔ حتی کہ درختوں تک کی پرستش جہاں رائج تھی اس سے بھی گریز نہیں کیا تاکہ اس کے ذریعے سے مقامی آبادی سے گھل مل جائیں۔

چوتھے یہ کہ اگرچہ بدھا ذات پات کی تمیز کے مخالف تھے لیکن انہوں نے خود یا ان کے پیروؤں نے کبھی بھی برسر عام اس کی مخالفت کی اور نہ انسانوں کے درمیان اس ناروا تفریق کو مٹانے کے لیے کوشاں ہوئے۔ اس سے اگرچہ نچلی ذاتوں کے بہت سے لوگ بدھ مت کی طرف راغب تو ہوئے لیکن مروجہ معاشرے نے تبدیلی مذہب کے باوجود ان کو برابری کا مقام نہیں دیا۔

پانچویں یہ کہ گوتم بدھ نے خود اوپانی شدھ کے تصورات کو اپنایا۔ انہوں نے کرما کے نظریے کی تائید کی۔ اگرچہ ساتھ ہی باطنی سکون کے حصول کے لیے نروان کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین بھی کرتے رہے۔

چھٹے یہ کہ پوجا پاٹ کی رسوم اختیار کرنے کے سلسلے میں پیروان بدھ اور ہندو اس قدر شیر وشکر ہو گئے کہ موخر الذکر نے بدھا کو الوہیت کا مقام دے دیا اور اول الذکر نے وشنو اور دوسرے دیوتاؤں کو بدھا کے نائب قرار دے کر انہیں بدھا تک رسائی کا ذریعہ تسلیم کر لیا۔

ساتویں بات یہ کہ گوتم بدھ سے تو ایک خدا کی خدائی کو تسلیم کرنا بھی ثابت نہیں اور کسی ماورائے انسان ہستی کے وجود کو تسلیم کرنا ان کے اساسی نظریات کے منافی تھا لیکن پیروان بدھ نے تعدد الہ کے عقیدے کو اپنا لیا۔ اور اس طرح ایک اہم اور حساس ترین مروجہ مابعد الطبیعیاتی نظریے سے سازگاری اختیار کر لی۔ تعدد الٰہ کے عقیدے سے بت پرستی لازماً جنم لیتی ہے۔ چنانچہ بدھ مت میں بھی اسی وجہ سے بتوں کی بھرمار ہو گئی۔ بدھا کے استقرار حمل سے لے کر موت تک کی مختلف حالتوں کے بت بنائے گئے۔ سابق ادوار کے پانچ بدھوں کے بت تراشے گئے۔ نوبت بایں جارسید کہ برٹینکا کی پندرھویں جلد کے صفحہ ۳۰۷ پر لکھا ہے۔

"An image such as the fierce Vajrabhairava, the terrifying aspect of the bodhisattva Manjusri - nine hundred, heavily armed, locked in sexual embrace with his consort while trampling on various creatures underfoot - was not generally intended for the view of the uninitiated. Written commentaries relate its nine faces to nine parts of the scripture, its 34 arms to multiple facets of Enlightenment, its sexual embrace to the union of upaya (means) symbolised as male, with prajna (wisdom) symbolised as female".

ترجمہ: ''(مثال کے طور پر) گزشتہ جنم کے بدھا ''منجوسری'' کے خوفناک پہلو کا مظہر وحشی ''وجرا بھائی راوا'' کا بت ہے۔ یہ نو سروں والا، بہت سے ہتھیاروں سے مسلح جو اپنی نسوانی ساتھی (یا بیوی) کے ساتھ جنسی اختلاط کی حالت میں، متعدد جانداروں کو پاؤں تلے کچل رہا ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر ناپختہ لوگوں کو دکھانے

کے لیے نہیں ہوتا۔ تحریری وضاحتوں کے مطابق اس کے نوچہرے، نوصحیفوں اور چونیتس بازونروانا کے مختلف پہلوؤں اور جنسی اختلاط ''اوپایا''(ذرائع)یعنی مرد اور ''پراجنا''(عقل)یعنی عورت کی تشبیہی علامات ہیں۔''

چنانچہ صفحہ ۳۰۹ پر یہی مقالہ نگار بدھ مت کے متعلق لکھتا ہے۔

"It began in the spiritual excitement (at the time of the Buddha) in a region agitated with religious and speculative ardor and ended by dissolving into Hinduism."

ترجمہ: یہ (بدھا کے دور میں) اس روحانی جوش کے ماحول میں ایک ایسے علاقے میں شروع ہوا جو مذہبی اور باطنی تفکر کے جوش کی حالت میں تھا اور یہ (بدھ مت) ہندومت میں تحلیل ہو کر ختم ہوا۔''

آٹھویں یہ کہ نروان حاصل کرنے کے بعد گوتم بدھ نے حکمرانوں کے حلقے کے ساتھ بہت روابط قائم کیے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے وہ ان کے یا ان کی رعایا کے عقائد کی مخالفت تو کرتے نہیں تھے اور نہ معاشرتی و سیاسی مسائل میں دخل اندازی کرتے تھے۔ لہذا ان کے اخلاقی اصول اور اصلاح باطن کے نظریات قبول کرنے سے حکمرانوں کے مفادات پر کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ وہ دور ایسا تھا کہ لوگ اپنے حکمرانوں کے مطابق سطحی اور ظاہری رویوں کو بدل لیتے تھے، اگرچہ اپنے آبائی پوجا پاٹ کے مسالک کے معاملے میں حساس تھے۔ ان حالات میں حکمرانوں سے گوتم بدھ کے روابط بدھ مت کی اشاعت میں ممد ثابت ہوئے۔

ان نکات کو ذہن میں رکھ کر اگر بدھ مت کے متعلق غور و تفکر کیا جائے تو انسان کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کی نوعیت کیا تھی۔ گوتم بدھ کے حالات زندگی، ان کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں اور فرد کی باطنی اصلاح کے طریقوں کے متعلق بدھ مت کی تاریخ میں جو کچھ محفوظ ہے اگر اس کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک اصلاحی تحریک تھی۔ گوتم بدھ کے بعد ان کے پیروان نے مختلف علاقوں اور ملکوں میں رائج طریقہ ہائے پوجا پاٹ کو اپنا کر اور گوتم بدھ کو الوہیت کے مقام پر فائز کر کے جو صورت پیدا کر دی اس سے اس مسلک نے مذہب کی شکل اختیار کر لی اور اسے ایسا ہی تسلیم کیا جانے لگا۔

ٹریور لنگ لکھتا ہے:

"The question could also be raised and in fact often has been raised as to whether Buddhism is a religion at all. It is possible from the historical perspective to answer both 'yes' & 'No' to this question". "(The Buddha "Page 16)".

ترجمہ: ''یہ سوال بھی اٹھایا جاسکتا ہے، اور فی الحقیقت بہت دفعہ اٹھایا گیا ہے کہ آیا بدھ مت مذہب ہے بھی (یا نہیں) تاریخی پس منظر میں اس سوال کا جواب دونوں ''ہاں'' اور ''نہ'' کی شکل میں دینا ممکن ہے۔''

اس کے بعد مصنف نے اس مسئلے پر خود بھی بحث کی ہے اور متعدد مستشرقین کی آراء بھی دی ہیں۔ لیکن یہاں اس سلسلے میں مفصل گفتگو کرنا ہمارے پیش نظر نہیں۔ ہم صرف بدھ مت کے نظریات کے متعلق پیش آنے والے اس اقتباس کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ محققین بھی، جنہوں نے اس کے مطالعے میں سالہا سال صرف کیے ہیں، دوچار ہیں۔

اس ارضی زندگی میں فرد کی باطنی اصلاح کے اصولوں کی تعبیر و وضاحت کے سلسلے میں بدھ اہل علم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن طوالت کلام سے بچنے کے لیے ہم اپنی گفتگو کو اختصار اور اشارات تک ہی محدود رکھیں گے۔

ا۔ گوتم بدھ کے فکر کی ابتدا اس نظریے سے ہوتی ہے کہ دنیا کا ہر انسان ہر لحاظ سے اور ہر حالت میں دکھی ہے۔ اس کے لیے ''دکھا'' (Dikkha) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ تاریخ کے مندرجات کے مطابق اسی احساس نے بدھا کو ترک دنیا اور تفکر (Meditation) پر آمادہ کیا اور حصول نروان کے بعد اس عقیدے کی توثیق ہوئی۔ دکھا کی کیفیت سے ہر کوئی بندھا ہوا ہے اور فی الحقیقت یہی حل طلب مسئلہ ہے۔

۲-انسانی وجود کے تین مظاہر (Marks) ہیں:

اول، زندگی کی ہر حالت دکھا سے مغلوب ہے۔

دوئم، ہر شے اور اس کی حالت عارضی ہے۔

سوئم،انانیت (Ego) دکھا کی اصل وجہ ہے۔ (Ego) کالفظ بدھ مت کی زبان میں ''انتا'' (Anatta)اصطلاح کے معنی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس سے بدھا کا مطلب ''انانیت'' بھی ہو سکتا ہے اور ''خودداری'' بھی۔(ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ سنگھا کی تنظیم سے وابستہ لوگوں میں خودی کو بالکل کچل دینا مقصود ہوتا تھا)۔

۳۔چار اعلیٰ وارفع سچائیاں یہ ہیں:

اول،زندگی کا نکتہ آغاز دکھا پر مشتمل ہے۔

دوئم،دکھا کو تحریک دینے والی چیز خواہش نفس ہے۔

سوئم، طمع و لالچ اور بری خواہشات کو ختم کرنے کا ذریعہ حصول نروان ہے، جو بدھ مت کی اصل منزل ہے۔

چہارم،دکھا سے رہائی ممکن ہے۔اور ایسا حسن اخلاق، نظر اور حصول تعقل سے ہو سکتا ہے۔

۴۔حسن اخلاق اصول مہمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اگر انسان درج ذیل پانچ رذائل سے اجتناب کرے تو وہ اپنے آپ کو اس سے مزین کر سکتا ہے:

اول،کسی شخص کے قتل کرنے سے احتراز۔

دوئم،چوری نہ کرنا۔

سوئم،ناجائز منفی تعلق سے پرہیز۔

چہارم، جھوٹ نہ بولنا۔

پنجم،منشیات کا عدم استعمال۔

۵۔کہا جاتا ہے کہ بدھا کی تعلیمات میں ''اشٹانگ مارگ'' جس سے آٹھ اصول مراد ہیں اساسی حیثیت رکھتے ہیں:

اولاً　　اشیا کو صحیح زاویہ نگاہ سے دیکھنا

ثانیاً　　صحیح سوچ

ثالثاً　　اچھی گفتگو

رابعاً　　درست عمل

خامساً　　صحیح بود و باش

سادساً　　صحیح مقاصد کے لیے سعی وجہد

سابعاً　　صحیح مشاہدہ

ثامناً　　صحیح تفکر

ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے گوتم بدھ نے ''سنگھا'' کی تنظیم قائم کی۔ اس کے ارکان کو بھکشو کہا جاتا تھا۔ حصول نروان کے بعد بدھ نے اپنے نظریات پیش کر کے جب ساٹھ افراد کی تربیت کر لی تو انہیں اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لیے مختلف اطراف میں اکیلے اکیلے روانہ کر دیا۔ ان پر پابندی یہ تھی کہ وہ روٹی کپڑا اپنے اپنے حلقہ اثر کے لوگوں سے مانگ کر گزر بسر کریں گے اور رہایش کی جگہ کی فراہمی کے لیے بھی اسی حلقے پر انحصار کریں گے۔ لیکن یہ بھکشو کوئی ذاتی ملکیت رکھنے کے استحقاق سے محروم ہوں گے۔ بھکشو کا مطلب حصہ دار ہے گداگر نہیں۔ تصور یہ تھا کہ عام لوگ اپنا کاروبار کریں گے اور ان کو بدھ مت کی تعلیمات دینے کے عوض ان سے بھکشو اپنے گزر بسر کے لیے جو کچھ حاصل کریں گے وہ ان کی آمدنی میں سے اپنے حصے کے طور پر وصول کریں گے۔ لیکن عملاً وہ کشکول گدائی لے کر گھر گھر پھرتے تھے۔

گوتم بدھ کی شخصیت بہت پر کشش بیان کی جاتی ہے۔ ان میں انسانوں کو متاثر کرنے کی بہت صلاحیت پائی جاتی تھی۔ دوسرے انہوں نے چھ سال تک ترک دنیا کی زندگی بسر کی تھی اور مادی ضرورتوں اور آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر کے جو مشقت برداشت کی تھی وہ ہندوستان کے خواص و عوام کے اذہان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ یہ عقیدہ پہلے بھی وہاں موجود تھا کہ ترک دنیا روحانی ترقی کا ایک بہت بڑا

ذریعہ ہے۔اس وجہ سے اس چھ سال کے عرصے کے دوران میں ہی گوتم بدھ کے مقام کی بلندی کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا۔اس کے علاوہ نظریہ تناسخ بھی ہندوؤں میں رائج تھا۔جب بدھا نے اس کی مزید تشہیر کی اور یہ تصور پیش کیا کہ دکھا سے نجات کے لیے کئی زندگیوں سے بار بار گزرنا پڑتا ہے اور تب کہیں جا کر نروان حاصل کر کے اس اذیت دہ حیات انسانی کے چکر سے آزادی حاصل کی جاسکتی ہے تو کاروباری طبقے نے بھی سنگھا کے ادارے کی کچھ نہ کچھ مادی مدد کر کے اپنے لیے آئندہ زندگی میں بہتری کی شکل کو ترجیح دی۔ان عوامل نے ان عوامل کے ساتھ مل کر جن کا ہم اس سے قبل تذکرہ کر چکے ہیں، بدھ مت کے دائرہ اثر کو بہت وسعت دی۔اور سنگھا ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا۔

بھکشوؤں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ہمہ وقت سفر پر رہیں گے اور اپنا کوئی گھر بار نہ بسائیں گے لیکن جلد ہی یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ تین ماہ کے دوران برسات میں بارشوں کی بہتات کی وجہ سے سفر مشکل ہو جاتا ہے لہذا اس عرصے میں ہر علاقے کے بھکشو کسی ایسے شہر کے قریب مل کر رہیں جہاں اتنی آبادی ہو کہ وہ ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔اس ابتدا میں عارضی اجتماعی رہایش نے آہستہ آہستہ ،دہار، نام کی بڑی بڑی عمارتوں میں مستقل سکونت کی شکل اختیار کر لی۔ابتدا آتوقع یہ کی جاتی تھی کہ ان کے اندر کا انتا (Ego) ختم ہو جائے گا۔لیکن نئے انداز سے ان کی بود و باش، حکمرانوں کا قرب حاصل کرنے اور ایک مذہبی طبقے کی شکل اختیار کرنے سے حصول مقصد کے امکانات ختم ہو گئے (اس موضوع پر ہم گفتگو نہیں کرنا چاہتے کہ دوسروں کے سہارے پر زندگی بسر کرنا اور خودی کو کچلنا انسان کی فلاح کا کس حد تک ضامن ہو سکتا ہے) گوتم بدھا کی موت کے تقریباً دو صدیاں بعد ہندوستان میں اشوکا نے (تخت نشینی : ۲۶۵ ق م) جہاں اپنی سلطنت کو بڑی وسعت دی وہیں اس نے بدھ مت (جس حالت میں وہ اس وقت تھا) کی اشاعت میں ذاتی طور پر بھی حصہ لیا۔اپنے افسران کو بھی اس کا حکم دیا۔ غیر ممالک میں اس کی تبلیغ کے لیے وفود روانہ کیے اور اپنے بیٹے مہندا کو لنکا روانہ کر کے وہاں کے بادشاہ کو بدھ مت قبول کرنے پر آمادہ کیا۔اگرچہ ہندوستان کی طرح یہاں بھی ہندو ''خداؤں'' کی پوجا جاری رہی۔اشوکا نے بدھ مت کے دیئے ہوئے کسی نظام یا نظریات کی بنیاد پر حکومت قائم نہیں کی تھی، بلکہ بدھ مت اس نے تخت نشینی سے آٹھ برس بعد قبول کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اڑیسہ کا علاقہ فتح کرنے کے دوران جنگ میں لاکھوں انسان مارے گئے اور اس کی طبیعت پر یہ بات اس قدر گراں گزری کہ اس نے آئندہ تشدد نہ کرنے کا

ارادہ کیا اور بدھ مت قبول کر لیا۔ لیکن آداب حکومت و سلطنت کے سلسلے میں وہ آزاد تھا۔ جو چیم ویش اپنی تصنیف سوشیالوجی آف ریلیجین میں لکھتا ہے:

"In the ninth of his reign Asoka became a lay discipline and in the eleventh was ordained a monk, but he continued to rule his country and was probably excused from precepts which would have hindered activities as a ruler" (page 321)

ترجمہ: ''اپنی حکومت کے نویں سال میں اشوکا غیر مذہبی مرید بن گیا اور گیارہویں سال میں سادھو (بھکشو) بنا دیا گیا۔ لیکن اپنے ملک پر اس کی حکومت جاری رہی اور غالباً ایک حکمران کی حیثیت سے اس کی سرگرمیوں میں رکاوٹ ڈالنے والے (بدھ مت کے) احکامات سے اسے مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا۔''

اشوکا نے، روایات کے مطابق، ۸۴۰۰۰ سٹوپے بنوائے جن میں بدھا اور دوسرے بزرگوں کی یادگاریں رکھی جاتی تھیں۔ اور وہ پوجا پاٹ کے مراکز تصور کیے جاتے تھے۔ اس کے دور میں برہمن بھی کثیر تعداد میں بدھ مت میں شامل ہو گئے لیکن وہ اپنے نظریات اور پوجا پاٹ کے طریقوں کے ساتھ چمٹے رہے۔ اشوکا کے بدھ مت قبول کرنے سے سیاسی، معاشی یا معاشرتی سطحوں پر کوئی تبدیلی آئی اور نہ اس کا کوئی تصور تھا۔ جیسا کہ ہم مغربی اور بھارتی مصنفین و محققین کی تصنیفات سے اقتباسات دے کر ثابت کر چکے ہیں اشوکا کے دور سے بہت پہلے گوتم بدھ کو الوہیت کا مقام دیا جا چکا تھا اور عمل کی دنیا میں بدھ کی پوجا اور فکر کی دنیا میں نروانا کا تصور مرکزی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ بدھا کے نظریات کے برعکس بدھوں نے ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پرستش کو اپنا لیا تھا۔ بدھ مت آہستہ آہستہ ہندو مت میں ضم ہو رہا تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو صفحہ ۱۸۰ پر لکھتے ہیں:

"But both Brahmanism and Buddhism deteriorated and degrading practices grew up in them. It became difficult to distinguish the two" (Discovery of India)

ترجمہ: لیکن برہمنی مذہب اور بدھ مت دونوں انحطاط پذیر ہو گئے اور ان میں پست قسم کے اعمال کا ظہور ہونے لگا۔ دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہو گیا۔''

چنانچہ پنڈت نہرو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"Buddhism died a natural death in India, or rather it was a fading out and a transformation into something else." (Discovery of India Page 179).

ترجمہ: ''ہندوستان میں بدھ مت قدرتی موت مر گیا یا دوسرے لفظوں میں یہ بتدریج ختم ہو گیا اور ایک مختلف حالت میں تبدیل ہو گیا۔''

چین میں بدھ مت کے تعارف اور پھیلاؤ کا تذکرہ چینی مذاہب کے عنوان کے تحت ہو گا۔

چینی مذاہب

چین میں مروجہ روایات اور دور حاضر کی آثاریاتی تحقیق (Archaeological Investigations) چینی تاریخ کی قدامت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ زبان زد عام داستانوی قصوں کی بنیاد پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہزاروں برس قبل مسیح کے زمانوں میں چین کے اندر ایک ایسا ملوکانہ سنہری دور رائج تھا جبکہ بادشاہ آسمانی صاحب قدرت ہستی کی اولاد ہوتے تھے اور ان کے پاس اس ہستی کی طرف سے شہنشاہی (Mandate) ہوتی تھی۔ اس لیے چینی قوم اپنے آپ کو آسمانی جمعیت کہتی ہے۔ اس آسمانی ہستی تک بادشاہ کے سوا کسی کی رسائی نہ ہو سکتی تھی۔ بادشاہ اپنی رعایا اور اس کے درمیان وسیلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

مزید برآں ان کا عقیدہ تھا کہ اس دنیا میں مختلف ارواح اور (وہمی) قوتیں اس کے نظام پر تصرف و اختیار رکھتی ہیں۔ اور ان سے انسانی تعلق کا ذریعہ مختلف قسم کی قربانیاں ہی ہو سکتی ہیں، جن میں انسانی جان کی قربانی بھی شامل ہوتی تھی۔ آسمانی ہستی کے نام پر بھی جو ان دنیوی ارواح پر نگراں اور حکمران تصور ہوتی تھی، قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ جن چینی مذاہب اور صاحب فکر و نظر شخصیات کے حوالے سے پانچ چھ صدیاں قبل مسیح سے چینی فلسفوں پر دور حاضر کے محققین کی توجہات مرکوز ہیں ان کے ظہور کے بعد بھی قربانیوں کا یہ تصور قائم رہا۔ چنانچہ ٹانگ شاہی خاندان (۹۵۷-۶۱۸ء) کے ایک بادشاہ نے سات سالہ قحط سے نجات حاصل کرنے کے لیے آسمانی بادشاہ کی خدمت میں اپنی جان کی قربانی پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک رسم یہ بھی تھی کہ ہر سال کے آغاز میں بادشاہ قربانی کے نذرانے کے ساتھ طلب حاجات کرتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ موخر الذکر کسی دور

دراز مقام میں سکونت پذیر ہے۔ جو اس سمت میں واقعہ ہے۔ گزشتہ بادشاہوں کی پرستش کے آثار بھی ملے ہیں۔ جادو کو چینی قوم کے نزدیک حالات کے تغیر و تبدل کا نمایاں ترین ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔

علم الاثار کے ذریعے سے چین کی قدیم تاریخ کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی میں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے پانچ چھ ہزار سال قبل کے دور میں کسی طرح کی اخروی زندگی کا اسی انداز کا تصور رائج تھا جیسے مصر کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں منکشف ہوا ہے۔ وہ مردوں کے ساتھ ضروریات زندگی دفن کرتے تھے تاکہ وہ کسی آئندہ زندگی میں ان کے کام آئیں۔ شانگ (Shang) شاہی خاندان (۱۱۲۲-۷۶۶ ق م) اور ان کے درباریوں اور مقربین کے مقبروں سے حسب مراتب زندگی کی ضروریات سے متعلق بہت سا سامان ملا ہے۔

ان شواہد و انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ چین میں قدیم دور سے کائنات پر چھائی ہوئی سب مخلوق سے بالا تر ایک ہستی کے وجود کا احساس موجود رہا ہے، اگرچہ اشتراکی عقائد نے تصور توحید کو اجاگر نہیں ہونے دیا۔ ہو سکتا ہے کہ بالا تر ہستی کا یہ تصور کسی نبی یا انبیا کی تعلیمات کی محرف باقیات میں سے ہو۔ مفصل گفتگو تو توحید کے عنوان کے تحت ہو گی۔ لیکن یہاں ہم صرف یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ تاریخ میں اور خود قرآن میں ایسی وافر مثالیں ملتی ہیں کہ جب بھی توحید کا خالص نظریہ پیش کیا گیا ہے اسے برسر اقتدار طبقات نے، چاہے ان کا تعلق سیاسی شعبے سے ہو چاہے مشرکانہ مذہبی مفادات سے، ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن چین کی قدیم کتب میں کوئی ایسا مواد یا اشارہ نہیں ملتا جس سے کسی دعوت توحید کی نشان دہی ہوتی ہو۔ اس کے برعکس اس بات کی وضاحت بھی مفقود ہے کہ ایک سب پر چھائی ہوئی ہستی کے تصور کا ماخذ کیا ہے۔ اجداد و ارواح پرستی تو انسانی دماغ کی اختراعات ہو سکتی ہیں اور تاریخ انسانی میں اس کی ان گنت مثالیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ایک حکمران و خالق کل ہستی کا تصور انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہو سکتا۔ مستشرقین نے ایسی قدیم چینی تصور کی ہستی کے لیے Sovereign on High (آسمان کی بلندیوں پر رہنے والا حکمران) اور Heaven (عالم بالا یا عالم بالا میں رہنے والی مقتدر ہستی) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورت حال اخروی زندگی کے تصور سے وابستہ ہے۔ عقل انسانی تو موت کے بعد زندگی کے خاتمے کا فتویٰ ہی دے سکتی ہے جیسا کہ موجودہ دور کے مغربی عقل و مادہ پرست دانش وروں کا رویہ ہے اور جیسا کہ منکرین معاد قرآن کی بعثت کے وقت عقیدۂ حیات بعد الموت کے متعلق رائے رکھتے تھے۔ قرآن ان کے متعلق کہتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ (۳۴:۷-۸)

ترجمہ: اور منکرین کہتے ہیں آؤ ہم تم کو ایک ایسا آدمی بتائیں کہ (مرنے کے بعد) ریزہ ریزہ ہو کر بھی تمہیں ایک نئی پیدائش میں آنا ہوگا۔ کیا بنالایا ہے اللہ پر جھوٹ یا اس کو جنون ہے۔

ذہن قدرتی طور پر اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ توحید کی طرح معاد کا عقیدہ بھی اس کی اصلی اور درست حالت میں دیا گیا ہوگا جس میں تحریف کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا گیا لیکن ہمارے پیش نظر چینی عقائد کا تجزیہ کرنا نہیں۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کی غرض وغایت یہ بیان کرنا ہے کہ اگرچہ وہاں ایک بالاتر ہستی اور اخروی زندگی کے تصورات موجود تھے لیکن وہ اسلام کے پیش کردہ نظریات توحید و معاد سے مختلف تھے۔

چین میں فکر و نظر کا شعبہ سیاسی حالات سے کافی حد تک منسلک رہا ہے۔ یہ ملک رقبے کے اعتبار سے کرۂ ارض کے خشکی کے حصے کا ایک چوتھائی اور دنیا کی مجموعی آبادی کے پانچویں حصے پر مشتمل ہے۔ تاریخ میں دوسرے وسیع و عریض ممالک کی طرح چین میں بھی جغرافیائی اتحاد و انتشار کے ادوار آتے رہے۔ لیکن ادوار قدیم سے لے کر ۱۹۱۲ء تک ملوکانہ طرز حکومت ہی قائم رہا۔ ایسے کوئی تاریخی یا فکری شواہد نہیں ملتے جن سے معلوم ہوتا ہو کہ کسی مذہب، مسلک یا فکر نے یا اس کے رہنما و داعی نے شاہی نظام کی مخالفت کی ہو۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران مرکزی اقتدار کے انہدام سے ملک کی سیاسی و معاشی زندگی میں انتشار کی کیفیت رونما ہوئی اور یہی وہ دور تھا جبکہ ایسے مفکرین پیدا ہوئے جن کی زندگیوں اور ان کے نظریات پر دور حاضر کے مغربی محققین و ماہرین آثاریات کی توجہات بیش تر حد تک مرکوز رہی ہیں۔ اس زمانے میں ملک میں متعدد ریاستیں وجود میں آئیں۔ ہر حکمران کا خیال ہوتا تھا کہ اسے معاملات حکومت چلانے کے لیے اہل فکر و نظر اور صاحب استعداد لوگ میسر آجائیں۔ ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں ملک بتدریج چہار طبقات میں تقسیم ہوا۔ (۱) حکمران (۲) جاگیر دار طبقہ اور وزرا (۳) پڑھا لکھا طبقہ جس کو چینی زبان میں شی (Shih) کہتے تھے اور جو ذمہ دارانہ اور فوجی مناصب پر مقرر ہوتے تھے۔ (۴) عوام اور غلاموں کا طبقہ۔

جو نمایاں شخصیات جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے، بہت مشہور ہوئیں اور اپنے اپنے منفرد فکر کی بانی کہلائیں وہ شی طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اور مختلف چینی ریاستوں کے جنگ و جدل سے انہیں بہت تشویش رہتی تھی۔ البتہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں نے مختلف حکمرانوں کی ریاستوں میں مناصب حاصل کیے۔

کنفوشیزم

جن شخصیتوں نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ان میں کنفوشیئس (۵۵۱ق م۔۴۷۹ق م) کا نام چینی تاریخ میں سب سے نمایاں ہے۔ اس نے انسانی زندگی کی تعمیر کے لیے فکر و عمل کے تمام شعبوں کو اپنی تعلیمات کی جولانگاہ نہیں بنایا، بلکہ اپنی توجہ کو ایک محدود دائرے پر مرکوز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جس محقق نے بھی اس کی زندگی اور فکر پر تحقیقی کام کیا ہے وہ اس موضوع پر گفتگو کرنے پر مجبور ہو رہے کہ کنفوشیس ایک مادہ پرستانہ مسلک کا بانی تھا یا مذہب کا۔ اس کے فکر کے تجزیے کے بعد اکثر و بیشتر اہل علم اسی نتیجے پر ہیں کہ اس نے کسی مذہب کی بنیاد نہیں رکھی۔ اس نے خدا کے وجود کے مسئلے پر گفتگو کی ہے نہ حیات بعد الموت کے متعلق نہ وحی کے متعلق اور نہ کسی اور مابعد الطبیعیاتی مسئلے کے سلسلے میں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ایک حقیقت ہے کہ مذاہب عالم کے ساتھ کنفیوشیزم کا تذکرہ بھی لازماً ہوتا ہے۔

پروفیسر جوچیم ویش لکھتا ہے:

"There has been much discussion whether confucianism has to be considered as a religion or an ethicopolitical "System". "Sociology of Religion" (Page 314).

ترجمہ: ''اس بات پر (علمی حلقوں میں) بہت بحث ہوئی ہے کہ کنفیوشیزم کو مذہب سمجھا جائے یا سیاسی اخلاقیات کا ایک مسلک۔"

کنفوشیئس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔:

"Confucius was not a religious leader in the ordinary sense, for his teaching was essentially a social ethic" (Volume 3 Page 531).

ترجمہ: کنفوشیئس مذہبی رہنما نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر اس (مذہبی رہنما) کا مطلب لیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت اس کی تعلیم معاشرتی اخلاق سے متعلق تھی۔''

اس کے باوجود برٹینکا میں موضوعات کی جو تقسیم کی گئی ہے اس میں کنفیوشیزم کو مذاہب کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

بہر حال جو صورت بھی ہو کنفو شیزم گذشتہ دو ہزار سال سے چینی فکر کے ساتھ منسلک کہا ہے۔ کنفو شیئس نے چین کے قدیم مابعد الطبیعیاتی اعتقادات، جن کا ہم مختصر تذکرہ کر چکے ہیں، سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پرانے چینی بادشاہوں کو جو اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے دور میں ہوئے ہیں وہ قابل احترام سمجھتا تھا اور ان کے زمانے کو سنہری زمانہ قرار دیتا تھا۔ (اگرچہ دور حاضر کی آثاریات پر مبنی تحقیقی کاوشوں سے اس دور کی غیر معمولی خصوصیات کا کوئی انکشاف نہیں ہوا) کنفو شیئس کا خیال تھا کہ قدیم دور کے بادشاہ طاقت کے بجائے اپنی بزرگانہ شفقت و محبت کے ذریعے سے حکومت کرتے تھے اور چین کو اسی دور میں واپس جانا چاہیے۔

اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ افراد کو اپنے اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے مطابق تعمیر کرنی چاہیے اور اس کا عکس حکومت کے نظم اور طرز عمل پر پڑنا ضروری ہے۔ چینی زبان میں اس کی تعلیمات کی ترجمانی (JEN) کی اصطلاح سے کی جاتی تھی۔ اس کا مطلب محبت، شرافت نفس اور سچائی ہے۔ وہ یہ خصوصیات لوگوں میں بھی دیکھنا چاہتا تھا اور حکمرانوں میں بھی۔ اس نے خود سرکاری ملازمت اختیار کی اور چیف جسٹس کے عہدے تک ترقی کی۔ لیکن ایک دفعہ حکمران نے ہمسایہ ریاست کے حکمران کی طرف سے تین رقاصاؤں کا تحفہ ملنے پر تین روز تک حکومت کا کام نہیں کیا۔ اس کی اس حرکت پر کنفو شیئس نے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت اس کی عمر ترپن سال ہو چکی تھی۔ اس کے بعد وہ چودہ برس تک مختلف ریاستوں میں گھومتا اور حکمرانوں سے رابطے کی کوششوں میں منہمک رہا تاکہ اسے کوئی ایسا حکمران مل جائے جو اس کے اخلاقی نظریات کے نفاذ کے لیے اسے کام کرنے کا موقع فراہم کرے۔ لیکن اس مقصد میں اسے ناکامی ہوئی اور وہ اپنی آبائی ریاست لو (Lu) میں واپس آ گیا۔ اب اس کی عمر سڑسٹھ سال ہو چکی تھی۔ اس نے از خود کچھ جوانوں کو جمع کر کے انہیں اپنے نظریات کی تعلیم دینے اور ان کے مطابق ان کی تربیت کرنا شروع کی۔ اس طرح اپنی بقیہ زندگی کے پانچ سالوں میں تین ہزار نوجوانوں کو اس کے زیر تربیت رہنے کا موقع ملا۔ ان کو اس نے حکومتی مناصب پر فائز ہو کر اچھے اخلاقی طرز عمل کا مظاہرہ کرنے اور حکومتی ڈھانچے کو عوامی بھلائی اور فلاح کے لیے استعمال کرنے کا درس دیا۔

کنفو شیئس نے چین کی بعض قدیم کتب کو اپنی تشریحات کے ساتھ بطور نصاب تعلیم استعمال کیا۔ ان میں ''کتاب تغیرات'' (Book of Changes) خاص اہمیت رکھتی ہے جس کے متعلق روایات یہ ہیں کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اس کی مختلف تعبیرات پیش کی ہیں۔ وہ جادوگروں کے لیے بھی منبع علم

رہی ہے اور فلسفیوں کے لیے بھی سرچشمہ نظریات۔ اپنے مقالے بعنوان چین اور جاپان (China or Japan) میں پروفیسر سی ایم ون اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے:

"At some periods in its long history, this book of the patterns was used exclusively for divination, so that it became a magician's hand book..... At other times, it would be, as it were, snatched out of the magician's hand and replaced on an intellectual pinnacle by some scholar who had seen its philosophical aspect. In fact, people are still puzzling over the problems of the Book of Changes, just as they are still puzzling over the problems of the universe" (History of the World Edited by W.N. Weech Page 340)

ترجمہ: اس کی طویل تاریخ کے بعض ادوار میں یہ قابل اتباع کتاب بلا شرکت غیرے جادو کے ذریعے سے مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کرنے کے لیے استعمال کی گئی، یہاں تک کہ یہ جادو گروں کے لیے فوری رہنمائی دینے والی کتاب بن گئی۔۔۔۔۔ دوسرے زمانوں میں کچھ ایسا ہو گیا جیسے یہ جادو گر کے ہاتھ سے چھین لی گئی اور کسی ایسے اہل علم کے ذریعے سے، جس نے اس کے فلسفیانہ پہلو کو بھانپ لیا تھا، یہ کتاب دانش وری کے اعتبار سے بلند ترین مقام پر پہنچادی گئی۔ درحقیقت لوگ ابھی تک اس "کتاب تغیرات" کے متعلق اسی طرح مخمصے میں مبتلا ہیں جس طرح وہ کائنات کے مسائل کے سلسلے میں حیران و ششدر رہیں"

کنفوشیئس کی زندگی کے حالات، اس کے نظریات اور اس کی سرگرمیوں کے مطالعے کے بعد یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس کے پیش نظر چینی معاشرے میں کوئی عظیم انقلاب لانا نہیں تھا۔ وہ ایک اونچے درجے کا معلم اخلاق تھا۔ اس نے نظام ملوکیت پر کوئی اعتراض کیا نہ جاگیر دارانہ انداز زندگی پر۔ بادشاہوں کو وہ بدستور آسمان میں رہنے والی مقتدر ہستی کا مقرر کردہ اور سند یافتہ تصور کرتا تھا۔ اسی وجہ سے بعض اہل علم اس کے مسلک کو مذہب یا نیم مذہب (Quasi Religion) کا درجہ دے دیتے ہیں۔ وہ روایتی پوجا پاٹ بھی کرتا تھا۔ روزہ بھی رکھتا تھا، لیکن اس نے کسی مذہبی مسلک کی تبلیغ واشاعت کی نہیں اور نہ اس میں کسی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کی طرف یہ دعویٰ منسوب کیا جاتا ہے کہ تیس سال کی عمر میں اس کے نظریات میں استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ بیالیس سال تک زندہ رہا۔ لیکن اس کی توجہ کلیتاً اس ایک نصب العین پر مرکوز رہی کہ حکومتی ڈھانچے کو بدلے بغیر ریاستوں کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے بہتر کل پرزے تیار کیے جائیں اور بادشاہوں کو تلقین کی جائے کہ وہ پارسائی کا مسلک اختیار کریں۔ اسی نکتہ نظر سے وہ سڑسٹھ سال کی عمر تک

حکمران طبقوں اور بادشاہوں ہی سے رابطے قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ اسے کسی حکومت کے ساتھ اس حیثیت سے منسلک کیا جائے کہ وہ اپنے نظریات کا نفاذ کر سکے۔ لیکن اس سعی وجہد میں اسے مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد اس نے جب براہ راست حصول علم اور تعمیر اخلاق کی طلب رکھنے والوں کی تربیت کی تو بتدریج اس کے نظریات پھیلتے گئے اور اس کے مسلک نے چین کی تاریخ میں نمایاں ترین مقام حاصل کر لیا۔

چین میں اس مسلک کو اس کی زندگی کے بعد بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کی موت ۴۷۹ق م میں واقعہ ہوئی۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اس کے تربیت یافتہ تین ہزار شاگرد چین کے مختلف علاقوں میں حکومتوں کے مختلف مناصب پر فائز ہو گئے تھے۔ چین میں چونکہ نظم حکومت کو چلانے کے لیے کسی عنصر کے پاس سرے سے نظریات کا کوئی مجموعہ موجود ہی نہیں تھا لہٰذا ایک خلا موجود تھا جس کو پر کرنے کے لیے ان کے نظریات بتدریج حکومتی حلقے میں نفوذ کرتے رہے اور بالآخر ہنس شاہی خاندان نے (۲۰۶ ق م سے ۲۲۰ عیسوی) کنفوشیزم کو حکومتی مسلک قرار دے دیا۔ ۱۳۶ق م کے سول سروس میں تقرری کے لیے امتحانات اسی مسلک کے اصولوں کی بنیاد پر ہونے لگے۔ پیروان کنفوشیئس نے اتنا علمی مواد تخلیق کر لیا تھا کہ ۱۲۴ق م میں اس مسلک کے درس وتدریس کے لیے ایک یونیورسٹی وجود میں آ گئی۔ ابتدا ہی میں تین ہزار طلبہ نے اس میں داخلہ حاصل کیا اور بڑھتے بڑھتے خاندان ہن کے خاتمے تک ان کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی۔

دوسری صدی عیسوی کے اواخر میں تاؤازم (Taoism) (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کے تعاون سے ہن خاندان کے حکومتی نظام کے خلاف عوامی بغاوت نے سر اٹھایا اور ۲۲۰ء میں ہن شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ افراتفری کے اس دور میں کنفوشیزم کافی حد تک دب گیا اور تاؤازم اور بدھ مت نے خاصا اثر پیدا کر لیا۔

چینی مذاہب اور چینی حکومتوں کے متعلق ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ وہاں کے مذاہب و مسالک کے عروج و زوال ایک آدھ استثنیٰ کے سوا ہمیشہ بادشاہوں کے اشارۂ ابرو کے مرہون منت ہوتے تھے۔ بادشاہ کے آسمانی بادشاہ کے بیٹے اور منظور نظر ہونے کے تصور کو کبھی کسی نے چیلنج نہیں کیا۔ یہ نظریہ ۱۹۱۲ء تک قائم رہا۔ یہی جہ تھی کہ تمام مذاہب کے قائدین حکمران کی خوشنودی کے طالب ہوتے تھے۔

اسی وجہ سے اگرچہ حکومتی حلقوں میں کنفیوشیزم کا عمل دخل ۱۹۱۲ء تک قطعی طور پر کبھی بھی مٹا نہیں، لیکن اس کے اثر و قوت میں حکمرانوں کے زاویہ نگاہ میں تغیر و تبدل کی وجہ سے نشیب و فراز کے ادوار آتے رہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۲۰۶ق م میں ہن شاہی خاندان آیا تو اس نے کنفوشیزم کو حکومتی مسلک قرار دے دیا لیکن اس سے پندرہ سال قبل شین (Chin) خاندان نے کنفوشیزم کو مٹانے کی کوشش کی اور

اس سے متعلق کتب کو جلایا اور ان کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ اس سے اس بات میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ مختلف فلسفے اور مذاہب جن کی چھٹی صدی قبل مسیح میں ابتدا ہوئی، ان کا اثر ایک محدود حلقے تک ہی رسائی حاصل کرتا تھا۔ عوام زمانہ قدیم سے ورثہ میں حاصل شدہ خیالات اور پوجا پاٹ کے طریقوں سے وابستگی قائم رکھتے تھے۔ ورنہ کسی ایک بادشاہ کے اشارۂ ابرو سے کسی بااثر مذہب کے عروج و زوال کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

کنفوشیئس کا صحیفہ لون یو (Lun You) کہلاتا ہے اور اس کے نام کا مطلب ''گفتگوئیں'' ہے۔ یہ اس کے شاگردوں کے ان نکات کا مجموعہ ہے جو وہ گفتگوؤں کے دوران ضبط تحریر میں لائے۔ اس کتاب نے موجودہ شکل پہلی صدی عیسوی میں حاصل کی، یعنی کنفوشیئس کی موت سے پانچ چھ صدیاں بعد۔ اس سے قبل اس کے متضاد اور مختلف فیہ نسخے لوگوں میں گردش کرتے رہے۔

کنفوشیئس نے اپنی موت کے وقت اس بات پر بہت مایوسی کا اظہار کیا کہ اسے کسی ریاست میں کوئی ایسا منصب حاصل نہ ہو سکا جس پر فائز ہو کر وہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنا سکتا۔

کوئی ایسے تاریخی شواہد موجود نہیں ہیں جن سے معلوم ہو کہ کنفوشیئس کے پیش نظر انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے انقلابی مقصد یا ٹھوس لائحہ عمل تھا۔ اس کے زمانہ حیات میں اور اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک چین کے سیاسی و معاشرتی حالات بہت دگرگوں تھے۔ ملک متعدد ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا جن میں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور اپنے اپنے علاقے میں توسیع کرنے کے لیے کشمکش جاری رہتی تھی۔ بادشاہوں کی مطلق العنانی کے علاوہ جاگیر دار طبقہ من مانیاں کرتا تھا۔ مابعد الطبیعیاتی نظریات توہم پرستی پر مبنی تھے۔ لیکن کسی ایک مسئلے پر بھی کنفوشیئس نے کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں کیا جس سے کسی حلقے، مراعات یافتہ طبقے یا حامیان شر سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس نے اپنی ساری زندگی عافیت میں گزاری، اگرچہ وہ حالات سے مطمئن تھا اور اسی وجہ سے اس نے مرنے کے وقت اظہار مایوسی کرتے ہوئے کہا کہ وہ زندگی میں جو کرنا چاہتا تھا نہ کر سکا۔

اس کی ساری سعی و جہد کی محرک یہ خواہش تھی کہ کسی ریاست میں اس کو اپنے نظریات کے نفاذ کا تجربہ کرنے کا موقع مل جائے۔ لیکن تاریخ انسانی میں کوئی ایسا واقعہ بھی نہیں ملتا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی بادشاہ، حکمران طبقے یا کسی حیثیت سے صاحب اقتدار عناصر نے کسی فلسفی قسم کے انسان کو یہ سہولت فراہم کر دی ہو کہ وہ ان کے معاملات میں ایسا دخیل ہو جائے کہ اس کو اس کے نکتہ نظر سے اصلاح احوال کرنے کا پورا

اختیار حاصل ہو۔ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ سوچ تھی، جس نے اسے چودہ سال تک بے نتیجہ کوششوں کے سلسلے میں متعدد ریاستوں کی صحرانوردی میں مصروف رکھا۔ اس جدوجہد کے عواقب سے مایوس ہو کر البتہ اس نے قائم شدہ حکومت کی اصلاح کے اپنے اصولوں کے نکتہ نظر سے افراد کی تربیت اور ان کی نظریاتی تعمیر کا جو کام کیا اس سے نظم حکومت کی جزوی اصلاح کے سلسلے میں دور رس نتائج برآمد ہوئے، اور اس نے تاریخ میں اپنے لیے ایک بلند اور نمایاں مقام پیدا کر لیا۔

ذہن و کردار کی سطح پر تین ہزار افراد کی تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنفوشیئس کی موت کے بعد اس حلقے کے مزید پھیلاؤ سے کنفوشیزم کے پاس افرادی مواد اور اصلاح حکومت کے سلسلے کے نظریات کی بنیاد پر اتنی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ ملک میں کوئی اور مذہب یا مسلک اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۶ میں تین پروفیسران (جن میں سے دو چینی ہیں) اور ایڈیٹر نے کنفوشیزم پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں سے ہم آخر میں دو اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے کنفوشیئس کے رجحان فکر اور دائرہ اثر کا اندازہ ہو سکے گا۔ وہ کنفوشیئس کے متعلق لکھتے ہیں:

"Learning was not however, his greatest interest. He was deeply distressed by the misery that he say on every hand. China in his time was only nominally united, the being was ignored, and even the various fandal states were, in effect divided between powerful nobles. The aristocrats were made, taxed their subjects, exhausted them with forced labour, and approved them at will. In bad years starvation was common". "Confucius dedicated his life to the attempt to relieve the sufferings of the people. He believed that the solution must be fundamental, a reform of the government that would make its objective not the pleasure of the rulers but the happiness of their subjects. To this end, he advocated such measures as reduction of taxation, mitigation of severe punishments, and avoidance of needless war (which was often pleasant & profitable for the aristocrats). The rulers of his native state Lu paid little attention to his admonitions. His lifelong objective was to occupy a commanding administrative post in which he could put his ideas into practice. It is not surprising that he never obtained one; from

the point of view of rulers, his ideas must have seemed dangerous. (Page 692).

ترجمہ: تاہم علم میں وہ سب (مقاصد) سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وہ اس بدحالی پر بہت دکھی تھا جو وہ ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے زمانے میں چین صرف نام نہاد حد تک متحد تھا۔ بادشاہ کو نظر انداز کیا جاتا تھا اور بہت سی جاگیر دارانہ ریاستیں عملاً طاقت ور نوابوں میں تقسیم ہو چکی تھیں۔ یہ لوگ آپس میں جنگیں کرتے، رعایا پر (بھاری) ٹیکس لگاتے، جبری محنت سے انہیں بے حال کرتے اور اپنی منشا سے انہیں نشانہ ستم بناتے۔ برے سالوں میں بھوکوں مرنا معمول کی بات تھی۔"

"کنفوشیئس نے اپنی زندگی لوگوں کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسائل کا مستحکم حل ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے ٹیکسوں میں تخفیف، ظالمانہ سزاؤں میں کمی اور غیر ضروری جنگوں کو ٹالنے کے لیے (جو اکثر اوقات اعلیٰ طبقہ کے لیے خوشی اور فائدہ کا ذریعہ ہوتی تھیں) تجاویز پیش کیں۔ اس کی اپنی رہایشی ریاست نو کے حکمرانوں نے اس کے اقتباسات پر بہت کم توجہ دی۔ ساری عمر اس کی یہ خواہش رہی کہ اسے انتظامیہ میں کوئی بااختیار منصب مل جائے جس کے ذریعے سے وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکے۔ یہ بات باعث حیرانی نہیں کہ اس کو ایسی حیثیت نہ مل سکی (کیونکہ) حکمرانوں کے نکتہ نظر سے اس کے خیالات ان کو خطرناک محسوس ہوتے ہوں گے۔

ایک اور جگہ مقالہ نگاروں نے لکھا ہے:

"The activities of Confucius as a scholar have been greatly exaggerated. He was learned, and he used books in his teaching, but his interest in books as such was distinctly subordinate to his passion for reform. Although a great number of books have been ascribed by tradition to his authorship, it is improbable that he composed any of the books that have come down to us, and it is not even certain that he edited any of them. Nevertheless Confucius used material now contained in these books, and these great writings of ancient China have been called Confucian classics, chiefly because they were used for over 2000 years as the basic curriculum of Chinese eduction, which was under the control of men who used their position to maintain Confucianism as the official ideology of Chine." (Page 692.)

ترجمہ: ''صاحب علم ہونے کی حیثیت سے کنفو شیئس کی سر گرمیوں (کو پیش کرنے) میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔ وہ عالم تھا اور درس وتدریس کے سلسلے میں کتابوں سے کام لیتا تھا۔ لیکن کتابوں میں اس کی دلچسپی واضح طور پر اس کی شدید اصلاحی خواہش کی تابع تھی۔ اگرچہ روایتی اعتبار سے کتابوں کی ایک بڑی تعداد کی تصنیف اس سے منسوب کی گئی ہے لیکن اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اس نے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب خود مرتب کی ہو جو ہم تک پہنچی ہیں۔ اور یہ یقینی نہیں کہ اس نے ایک کتاب بھی مدون کی ہو۔ تاہم کنفو شیئس نے وہ علمی مواد استعمال کیا تھا جو ان کتابوں میں موجود ہے۔ اور یہ قدیم چین کی اعلیٰ سطح کی تحریریں کنفو شیئس کی کلاسیکی تخلیقات کہلاتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار سال سے چین کے اس تعلیمی نظام میں بنیادی نصاب کی حیثیت سے استعمال ہو رہی ہیں (جس کا نفاذ) ان لوگوں کے زیر اختیار تھا، جنہوں نے کنفو شیزم کو سرکاری نظام کے طور پر بحال رکھنے کے لیے حیثیت کو استعمال کیا۔''

ہماری رائے میں یہ دو اقتباسات کنفو شیئس کے فکر و عمل کی حدود کا تصور قائم کرنے کے لیے کافی حد تک مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

تاؤازم

تاؤازم کا پیشوا لاؤزو (Lao Tzu) قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے زمانہ حیات کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ بعض اس کو کنفو شیئس کا ہم عصر کہتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ چوتھی صدی قبل مسیح میں ہوا ہے۔ اس کی زندگی کے کچھ حالات بیان کر کے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ مغربی چین کی طرف چلا گیا، اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اس کے بعد کہاں رہا اور کب اور کہاں اس کی موت واقع ہوئی۔ بعض چینی داستانی روایات بتاتی ہیں کہ اس نے دو سو سال عمر پائی۔ اس کو بعد میں الوہیت کا مقام بھی دے دیا گیا اور یہ عقیدہ ابھرا کہ وہ عالم بالا میں انسانوں کے معاملات پر نظر رکھے ہوئے ہے اور ان کا نگران ہے۔

ایک مختصر سی کتاب جس کا نام بھی لاؤزو ہی ہے اس کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی مختلف فیہ ہے۔ بعد میں ہن شاہی خاندان کے دور میں اس کتاب کو تاؤتی چنگ (Tao te Ching) کہا جانے لگا۔ لیکن یہ روایت بھی ہے کہ اس کتاب کا زمانہ تصنیف آٹھ سے تین صدی قبل مسیح کے دوران پایا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کی تحقیقی سرگرمیوں کے نتیجے میں سرے سے لاؤزو کے تاریخی وجود ہی کو مشکوک قرار دے دیا گیا ہے۔ اس سے اس کی کتاب کی اس کی طرف نسبت خود بخود ساقط ہو جاتی ہے۔

تاؤازم کے مسلک کی تائید و وضاحت میں اپنے نام سے ایک کتاب تصنیف کرنے والا لاؤزی کا ایک پیرو چوآنگ زو (Chuang Tzu) گزرا ہے جس نے اول الذکر کی کنفوشیئس سے متعدد ملاقاتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ چوآنگ زو خود چوتھی صدی قبل مسیح میں ہوا ہے۔ اس کے وجود سے بھی بعض لوگ انکار کرتے ہیں۔ ایک اور التباس جو چوآنگ زو کے سلسلے میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو چینی روایات میں اس کا زمانہ حیات چوتھی صدی قبل مسیح میں بیان کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس کی کتاب میں یہ درج ہے کہ وہ خود لاؤزو کا شاگرد تھا جسے وہ کنفوشیئس کا ہمعصر قرار دیتا اور ان کی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان سب تضادات کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ زمانہ قدیم کی کوئی کتاب بھی ایک مصنف کی تحریر کردہ نہیں ہے چاہے وہ کسی ایک ہی شخصیت سے منسوب ہو۔ کتاب کی ابتدا کرنے والے شخص کے بعد اس میں حذف و اضافے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس طرح وہ تضادات کا ایک ملغوبہ بن جاتی ہے۔ تمام مذاہب و مسالک قبل از اسلام میں یہ صورت مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔

لاؤزی کے مسلک کا مرکزی فلسفہ تاؤ (Tao) سے متعلق ہے۔ تاؤ کا مطلب ''راستہ''، ''سڑک''، ''قدرت'' اور ''قدرتی نظام'' جیسے مختلف الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں تاؤازم نظریات کے اعتبار سے کنفوشیزم سے بالکل متضاد تھا۔ موخر الذکر مسلک حکومتی نظم کی اصلاح کے ذریعے سے عوامی فلاح پر زور دیتا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے تعلیم و تربیت کارکنان حکومت کو ضروری تصور کرتا تھا۔ اس کے برعکس اول الذکر ملکی حالات کو ان کے طبعی اور مروجہ رخ میں مداخلت کے ذریعے سے تبدیلی کرنے کی مخالفت کرتا تھا۔ دونوں ہی تاؤ کی اصطلاح کا استعمال کرتے تھے لیکن مفہوم میں بعد المشرقین پایا جاتا تھا۔ لاؤزی سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ حکومت کو بھی یہی تلقین کرتا تھا کہ عوام کو ان کے راستے پر چلنے دو اور ان کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہ کرو۔ اس کا خیال تھا کہ قدیم شاہی خاندان عوامی معاملات میں مداخلت سے اجتناب کرتے تھے اور یہی بہتر طریق حکومت ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنی حالت پر قناعت کرنے اور سکون سے زندگی بسر (Relax) کرنے کا درس دیتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ فلسفیوں نے لوگوں کو پریشان کیا ہے۔

لیکن بے عملی اور زندگی کے حقائق و مسائل سے فرار کا یہ مسلک مستقل طور پر نہ چل سکا۔ لہذا پیروان تاؤازم نے کچھ عرصہ بعد وجدان کی بنیاد پر مابعد الطبیعیاتی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کی۔ انہوں نے انفرادی طور پر یوگا قسم کی جسمانی حرکات اور سانس بند کر کے استغراقی کیفیات اپنے اوپر وارد کرنے کے طریقے اپنائے۔ اسی طرح وہ حکومت کے معاملات سے بھی غیر متعلق نہیں رہے۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں عرض کر چکے

ہیں چین میں ہر مذہب و مسلک حکومتی سرپرستی کا محتاج رہا ہے۔ کسی حکمران کے تحت ایک مسلک کو عروج حاصل ہوتا تھا تو کسی کو دوسرے کے تحت کسی اور کو۔ لیکن یہ بات ناقابل تردید ہے کہ کنفوشیزم نے انتظامیہ میں ہمیشہ ہی اپنا عمل دخل قائم رکھا، اگرچہ اتار چڑھاؤ کے ادوار آتے رہے۔

تاؤازم نے وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کے وہ بہت سے طریقے اپنائے اور ان تصورات کو بھی جذب کر لیا جو چین میں ہمیشہ رائج رہے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مقتدر ہونے کے عقائد بھی اختیار کر لیے گئے۔ کنفوشیزم اور بدھ مت کے نظریات کے سلسلے میں بھی ردو قبول کا عمل جاری رہا۔

موازم

پانچویں صدی قبل مسیح میں چین میں ایک اور مفکر نمودار ہوا جس کا نام موزو (Mo Tzu) یا موسی (Mo Tse) تھا۔ اور اس کے مسلک کو موہزم (Mohisim) کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ وہ دور تھا جبکہ چین میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس صورت حال نے کنفوشیئس، لاؤزو اور موزو جیسے مفکرین و مصلح پیدا کیے اور اگرچہ ان میں اختلافات تھے لیکن ہر ایک کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے ایسے نظریات پیش کیے جائیں جن کے ذریعے سے قومی زندگی میں سیاسی اور معاشرتی سطحوں پر اشتقاق و عداوت اور ظلم و تشدد کے رجحانات کو ختم کیا جائے۔ اس صورت حال کا علاج جہاں کنفوشیئس نے حکومت کے نظم کی اصلاح ذہنی طور پر اونچے حکومتی کارکن تیار کرنے کے ذریعے تجویز کی، وہاں لاؤزو نے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے اور حکمرانوں کی عوامی معاملات میں عدم مداخلت کو حالات کے سدھارنے کا علاج قرار دیا۔ موزو نے اس خیال کا اظہار کیا کہ تاؤازم اتنے نظریات دیتا ہے کہ اس سے عمل کے لیے گنجایش باقی نہیں رہتی اور کنفوشیزم عمل کے لیے اس قدر دباؤ ڈالتا ہے کہ گہری فکر پیدا ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ساری انسانی استعداد نظم حکومت کی اصلاح پر صرف ہو جاتی۔ ہے۔ موزو نے ایک بالاتر ہستی (Heaven) کا تصور پیش کیا جس کو اس نے ہمہ جہتی قوت و اقتدار کا مالک قرار دیا۔ پروفیسر سی ایم ون (C.M. Winn) ''چین اور جاپان'' کے عنوان کے تحت موزو کی تحریر سے مندرجہ ذیل اقتباس دیتا ہے:

"Heaven, the Lord of the World.... sees everything that happens .....in the words, in the valleys, in hidden places where no human sight penetrates ....Now heaven intends good and abhors evil, loves justice and hates

injustice ..... Heaven wishes the ruler to benefit his people, and that all men should love each other, because Heaven loves all men.

....No the ultimate motive for conduct is not the pleasing of a prince or of the sovereign (i.e. not human respect), it is the will of Heaven." (History of the World Edited by W.N. Weech Page 347).

ترجمہ: ''مقتدر اعلیٰ جو دنیا کا خدا ہے، ہر وقوع پذیر ہونے والی چیز کو دیکھتا ہے، چاہے وہ جنگلوں میں ہو، وادیوں میں ہو (یا) ایسی خفیہ جگہوں پر ہو جہاں انسانی آنکھ (کی بینائی) نفوذ نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔۔ اب (ظاہر ہے) کہ خدا بھلائی کا ارادہ کرنا (چاہتا) ہے اور برائی سے نفرت کرتا ہے، انصاف کو پسند کرتا اور ناانصافی سے گھن کرتا ہے۔۔۔۔۔ خدا چاہتا ہے کہ حکمران اپنے لوگوں کو نفع پہنچائے اور سب لوگوں کو آپس میں محبت کرنی چاہیے کیونکہ خدا تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔ نہیں، انسان کے طور طریقے کا اصل محرک کسی بادشاہ یا حکمران اعلیٰ کی خوشنودی کا حصول نہیں ہونا چاہیے (یعنی انسان کی عزت افزائی کی نیت) بلکہ خدا کی مشیت''

موزو کنفوشیئس کی والدین سے محبت اور ان کے ادب کی تلقین کو محدود ذہنی افق سے تعبیر کرتا تھا اور اس کو وسعت دے کر عالمی سطح پر انسانوں سے محبت کرنے کا درس دیتا تھا۔ وہ احترام آدمیت کے جذبے کو اپنی ریاستی سرحدوں پر ہی محدود نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کے پیش نظر ساری انسانیت کو اس کا ہدف بنانا تھا۔ موزو (Mo Tzu) کے عنوان کے تحت انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"….but Mo Tzu demonstrated that this principle of universal love had in it both utilitarian justification and divine sanction. He spoke of "Universal love and mutual profit" in one breath and he was convinced that this principle was both the way of man and the way of God." (Vol.8 Page 207).

ترجمہ: ''لیکن موزو نے یہ تعلیم بھی دی کہ عالمی محبت افادی اور مذہبی تقدس دونوں لحاظ سے قابل ستایش ہے۔ اس نے ایک ہی سانس میں عالمی محبت اور باہمی فائدے کے متعلق گفتگو کی۔ اور اسے یقین تھا کہ یہ اصول انسان کے لیے بھی بہترین طریق عمل ہے اور خدا کی مشیت کا بھی مظہر ہے۔''

موزو چین کی منضبط تاریخ میں واحد شخصیت ہے جس نے خدا کا نام کائنات پر چھائی ہوئی ہستی کی حیثیت سے لیا ہے۔ اس کے نظریات کے سلسلے میں مزید انکشافات بیسویں صدی کی تحقیقی کاوشوں کے ذریعے

سے ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ خدا صرف عمل صالح ہی کو پسند نہیں کرتا بلکہ گناہ کو بھی ناپسند کرتا ہے۔ اور اس پر جزا اور سزا کا نتیجہ مرتب ہوگا۔ وہ ایک راست باز اور اپنے پیش کردہ اصولوں پر عمل کرنے والا شخص تھا۔ اس کے پیروؤں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا اور کئی نسلوں تک اس کو اور اس کے مذہب کے متبعین کو لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی موت کے بعد دوسری صدی عیسوی تک اس کی مذہبی عبادت گاہیں آباد رہیں، لیکن یہ مذہب یکلخت زوال پذیر ہو کر سرے سے مٹ گیا۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ چینی تاریخ اس کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ البتہ ایسی روایات موجود ہیں کہ کنفوشیئس کے پیروان نے اس مذہب کی بہت مخالفت کی تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ چینی تاریخ میں ایک مراعات یافتہ طبقے کی حیثیت کے مالک رہے ہیں۔

بدھ مت

اس مذہب کے متعلق ہم مستقل عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں۔ اس کی مہایانا شاخ پہلی صدی عیسوی میں چینی اور ہندوستانی وفود کے تبادلے کے ذریعے سے چین میں پہنچی۔ ہندوستان سے چند ایسی شخصیتیں چین میں وارد ہوئیں جنہوں نے بدھ مت کے سوتروں کا ترجمہ چینی زبان میں کیا۔ اسی طرح بدھ مت میں دلچسپی رکھنے والے بعض لوگ ہندوستان گئے۔ وہاں انہوں نے بدھ مت کا مطالعہ کیا اور وہاں اس مذہب کا مروجہ لٹریچر اپنے ساتھ لائے۔ لیکن دو تین صدیوں تک یہ مذہب مخصوص حلقے میں محدود رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت لوگوں کے بھکشو بننے کو ناپسند کرتی تھی کیونکہ اس سے لوگ اپنا کاروبار اور زراعت ترک کر کے بے کاری کی زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ لہٰذا حکومت نے سادھو یا بھکشو بنے کی حکماً ممانعت کر رکھی تھی۔

لیکن اس کے باوجود خاموش کام جاری رہا۔ اس میں مہایانا مکتب فکر کے بدھوں کی اس بات نے بہت معاونت کی کہ وہ مصلحت بینی کے تحت ہر چلتے ہوئے نظریے اور طریقے سے مصالحت کر لیتے تھے۔ مثلاً چین میں آباپرستی کا رواج ہمیشہ سے چلا آتا تھا۔ پیروان بدھ نے سابق بدھاؤں کو شخصیتوں کا روپ دے کر پرستش کے لیے ان کے بت بنا دیے۔ چینیوں کے لیے ذوق و اشتیاق عبادت کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔ لہذا بدھ مت کی طرف سے اس سے رغبت میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے نروانا کی منزل کو ساقط قرار دے کر بدھی ستوا کا تصور اختیار کیا۔ اس سے ان کا مقصد اس تصور کو پھیلانا تھا کہ نروانا کے بعد تو شخص متعلقہ کا تعلق اس زندگی سے کٹ جاتا ہے اور وہ خدمت خلق کے مواقع سے محروم ہو جاتا ہے لیکن بدھی ستوا کے درجے پر پہنچ کر وہ بدھا

کا مقام تو حاصل کر لیتا ہے لیکن انسانی زندگی سے اس کا رشتہ منقطع نہیں ہوتا اور وہ موت کے بعد دوسرے جنم کے ذریعے سے اس دنیا میں واپس آسکتا ہے۔

بدھ مت کی اشاعت میں کنفوشیئزم اور ماؤازم کے علاوہ ہن شاہی خاندان بھی سد راہ تھا۔ لیکن اس خاندان کے زوال کے بعد چین کی وحدت ختم ہو گئی اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ شمال میں تاتاریوں نے متعدد ریاستیں قائم کر لیں۔ اس دور میں بدھ مت کے پیروؤں کو کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ چھٹی صدی کے اخیر میں چین پھر متحد ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بدھ مت ایک مذہبی قوت بن کر ابھرا۔

چین میں مذاہب اور فکری مسالک کے متعلق جو مجموعی نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ کم از کم گزشتہ اڑھائی ہزار برس کے دوران یہ مذہب و مسلک جغرافیائی اور مقبولیت کے اعتبار سے نشیب و فراز کا شکار رہا ہے۔ دوسرے، سوائے ماؤازم کے ہر مسلک آئے دن اپنے نظریات میں حذف و اضافہ کرتا رہا ہے اور عقاید کے سلسلے میں آپس میں ان کے لین دین کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک دوسرے پر تنقید بھی کرتے رہے ہیں۔ مثلاً کنفوشیئزم کے حامی بدھ مت پر یہ اعتراض ہمیشہ کرتے رہے ہیں کہ وہ ترک دنیا اور خاندانی علائق سے الگ اور اجتماعی مسائل سے فرار کا راستہ اختیار کر کے انفرادی نجات ہی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

پروفیسر ایرک زرچر (Prof: Eric Zurcher) اور پروفیسر ڈینٹس سی ٹوچٹ (Prof: Denis C. Twitchet) نے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کی جلد ۱۶ میں چین کے متعلق مقالے کا جو حصہ قلم بند کیا ہے اس کے اخیر میں وہ چینی مذاہب کے متعلق جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ ہم نقل کر دیتے ہیں:

"In any event, the constant amalgamation of Buddhism, Taoism and the innumerable local cults whose history went back into high antiquity was to continue for centuries, eventually producing an amorphous mass of creeds and practices collectively known as Chinese popular religion" (Page 83).

ترجمہ: بہر حال بدھ مت، تاؤازم اور دوسرے بے شمار مقامی مسالک، جن کی تاریخ قدیم ترین ادوار تک جاتی ہے، کے درمیان ایک دوسرے میں متواتر ضم ہونے کا عمل صدیوں تک جاری رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسالک اور عملیات کا ایک غیر متشکل ملغوبہ وجود میں آ گیا جسے مجموعی طور پر چین کا عوامی مذہب کہا جاتا ہے۔"

برٹینکا کی جلد ۲۸ تاؤازم کے عنوان کے تحت تحریر کیے ہوئے مقالے سے، جس سے ہم اس سے قبل تاؤازم سے متعلق گفتگو میں اقتباس دے چکے ہیں، مزید ایک اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا:

"….orthodox Confucianism limited its field of interest to the creation of a moral and political system that fashioned society and the Chinese empire; whereas Taoism, inside the same world view, represented more personal and metaphysical preoccupation."

"In the case of Buddhism - a third tradition that influenced China - fundamental concepts such as the non-existence of the individual ego and the illusory nature of the personal world are diametrically opposed to Taoism. In terms of overt individual and collective practices, however, competition between these two religions for influence among the people - a competition in which Confucianism had no need to participate because it had state patronage - resulted in mutual borrowing, numerous superficial similarities and essentially Chinese developments inside Buddhism such as the Chan (Japanese Zar) Sect." (Page 395).

ترجمہ: ''اصلی کنفوشیئزم نے اپنی دلچسپی کے دائرے کو اس اخلاقی اور سیاسی نظام کو وجود میں لانے تک محدود رکھا جو معاشرے اور چینی سلطنت کی تشکیل کرے۔ جبکہ تاؤازم اسی عالمی نکتہ نظر کے اندر رہتے ہوئے، زیادہ تر ذاتی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کی طرف متوجہ رہتا تھا۔''

''جہاں تک بدھ ازم کا تعلق ہے، جو چین کو متاثر کرنے والا تیسرا روایتی مذہب ہے، اس کے انفرادی انا کے عدم وجود اور ذاتی دنیوی زندگی کی سرابی کیفیت کے بنیادی نظریات تاؤازم سے قطعی طور پر متصادم تھے۔ تاہم انفرادی ظاہریت اور اجتماعی اعمال کے لحاظ سے ان دونوں کے درمیان لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے مقابلہ جس میں کنفوشیزم کو ریاستی سرپرستی کی وجہ سے شامل ہونے کی ضرورت نہ تھی، ان کے ایک دوسرے سے نظریات مستعار لینے، بہت سی سطحی مماثلتیں پیدا کرنے اور بدھ مت کے اندر ناگزیر چینی مظاہرات جیسا کہ چان (جاپانی زین مسلک)، پر منتج ہوا۔

نتیجہ مباحث

مذاہب وادیان قبل از اسلام کے متعلق ہماری ان گزارشات سے، جن میں غیر مسلم محققین کی آراء کو نمایاں مقام دیا گیا ہے، دو باتیں واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں: ایک یہ کہ کسی بانی مذہب کی زندگی اور اس کے زمانہ وجود تک کے متعلق قطعی اور مستند حالات دستیاب نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان کی تعلیمات پر مشتمل ان کی طرف جو صحائف یا روایات منسوب کی جاتی ہیں ان کی سند ان کے بانیان مذاہب تک نہیں پہنچتی۔

یہ صورت اس وقت بھی تھی جب اسلام کا ظہور ہوا۔ اور آج بھی ہے جبکہ گزشتہ دو صدیوں سے اپنی استعماری ضرورتوں کے تحت عالمی مذاہب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے دنیا کے ہر خطے میں آثاریاتی (Archaeological) ذرائع اور دوسرے ممکنہ وسائل سے کام لے کر مغربی محققین نے بہت کاوش کی ہے اور ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو ان مذاہب کے پیروان کو خود معلوم نہیں تھیں۔

باب ۲

اسلامی تفکر: توضیحات---ابتدائیہ

دنیا میں انسان کا مقام

زندگی کا کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس کرہ ارض پر اپنے مقام و مرتبے اور حیثیت کا تعین کرے۔ اس وہ منطقی طور پر اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ اسے اس چند روزہ زندگی کے دوران کیا کرنا ہے اور اس کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ یہ بات اسلامی اور غیر اسلامی دونوں اقسام کے نظام ہائے حیات پر صادق آتی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو اس کے نظم کو چلانے کے لیے بلا شرکت غیرے اختیار کلی رکھتا ہے۔ اس نے انسان کو اس کرہ ارض پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ (۲:۳۰)

ترجمہ: اور یاد کرو جب کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن جلد اول میں اس آیت کے لیے جو ذیلی عنوان لکھا ہے وہ ہے :

''انسان کا زمین کا خلیفہ ہوتا: نوع انسانی کی معنوی تحمیل، آدم کا ظہور اور قوموں کی ہدایت وضلالت کی ابتدا''۔

تفسیر جلالین میں اس آیت کے تحت لکھا ہے:

يخلفني في تنفيذ احكامي فيها وهو ادم

ترجمہ: وہ میرے احکام کی ترویج کے لیے زمین میں میری نیابت کرے گا۔ آدم کو یہ کام سونپا گیا ہے۔

نہایت پر از معنی فقرہ ہے۔ احکام الٰہی کا نفاذ اسی صورت میں باقاعدہ طریق پر ہو سکتا ہے جب ایک ایسا نظام فکر و عمل قائم کیا جائے جو تمام شعبہ ہائے حیات کو محیط ہو۔ اور یہ فریضہ انسان کو سونپا گیا۔ اسی طرح تفسیر جامع البیان میں یوں کہا گیا ہے۔

یعنی آدم فهو خليفه الله في الارض ينفذ قضاء الله واحكامه

انسان ہی زمین میں اللہ کا نائب ہو گا (وہی) اللہ کے فیصلوں اور احکام کو عملی جامہ پہنائے گا۔

اس سے زمین پر بنی نوع انسان کا مقصد اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ (۳۵:۳۹)

ترجمہ: اس نے تم (لوگوں) کو زمین پر (اپنا) خلیفہ بنایا۔ پس جس کسی نے (خدا کے احکامات سے رو گردانی کی تو اس کا وبال اسی پر ہو گا۔

یہاں خطاب بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان سے ہے۔ لیکن مخلوق میں سے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات و قوانین کو اپنی زندگیوں پر نافذ کرنے سے گریزاں ہوں وہ کفر کے مرتکب ہوں گے۔ لہذا منطقی طور پر خلافت الٰہیہ کی ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہو گی جو اللہ کے دین کو اس کی جملہ تعلیمات کے ساتھ قبول کر کے اپنائیں گے۔

اسی لیے حضرت داؤد کو تعین کے ساتھ خلیفہ قرار دیا گیا:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۲۶:۳۸)

ترجمہ: اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر اپنا نائب مقرر کیا سو امور سلطنت کو اس طرح سرانجام دیجئے کہ لوگوں کے لیے نظام عدل قائم ہو۔

اصطلاح خلیفہ سے انسان کے مرتبہ و مقام اور اس کے ایک خاص دائرے میں بااختیار ہونے کی نشاندہی ہوئی ہے۔ خلیفہ کا مطلب ''نائب'' بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیوی معاملات میں ایک بادشاہ کا نائب یا کسی مرکزی حکومت کا کسی خطہ سلطنت میں نمائندہ کچھ اختیارات اور ذمہ داریاں رکھتا ہے۔ جن کی بجاآوری کے لیے وہ انتقان اعلیٰ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ تقسیم کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے اسی نوعیت کی اصطلاح استعمال

کر کے اس ارض پر انسان کی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے خلیفہ الارض اور کسی بادشاہ کا مرکزی اقتدار اور ان کے نائب کے متعلق کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہذا اللہ تعالی کے خلیفہ اور رکسی انسان کے نائب کی حیثیت سے کلی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ اللہ تعالی قادر مطلق ہے اور وہ بنی نوع انسان کا جس کو بحیثیت مجموعی قرآن میں خلیفہ قرار دیا گیا ہے، خالق بھی ہے اور اس نے اپنے خالق کی طرف ہر حالت میں لوٹنا ہے۔ گویا اللہ تعالی اس کی تخلیق پر بھی قادر ہے۔ اپنے مقرر کردہ خلیفہ کو اپنی طرف لوٹانے کی بھی پوری قدرت رکھتا ہے تاکہ وہ اس کا احتساب کرے اور اس سے خیر و شر کے جو اعمال سرزد ہوئے ہیں۔ ان کی جزا سزا دے سکے اور اس سلسلے میں اس سے کوئی ناانصافی سرزد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ وہ ہر بات اور عمل کا جو انسان سے متعلق ہے براہ راست علم رکھتا ہے۔ قرآن میں اس نے احتساب کے روز عدل وانصاف پر قادر ہونے کے متعلق فرمایا ہے:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ (۷-۷) ہم روز محشر رسولوں اور ان کے مخاطین غرضیکہ) سب کو اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر (ان کے اعمال کی سرگزشت) سنا دیں گے، اور ہم غائب نہیں (بلکہ حاضر و ناظر) تھے۔

اس کے برعکس دنیوی حکمران اپنے نائبین مقرر تو کرتے ہیں لیکن اول الذکر کو آخر الذکر پر وہ تسلط اور اختیار کلی حاصل نہیں ہوتا جو اللہ تعالی کو اپنے خلیفہ یعنی بنی نوع انسان پر حاصل ہے۔ دنیوی نائبین اقتدار اعلیٰ کے خلاف بغاوت بھی کرتے ہیں اور ان کی حکم عدولیاں بھی کرتے ہیں لیکن سربراہان حکومت بعض اوقات ان کے معاملے میں بے بس ہوتے ہیں۔ اللہ تعالی کسی کے مقابلے میں بے بس نہیں۔ اس کے امیر تکوینی کی کسی میں خلاف ورزی کرنے کی استطاعت نہیں ہو سکتی اور امر تشریعی میں اس نے خود انسان کو ایک وقت مقررہ تک، جس کا تعین بھی اس نے خود کیا ہے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اس کا اتباع یا اس کی خلاف ورزی کر سکے۔ لیکن دونوں صورتوں میں وہ حاکم مطلق کے سامنے جواب دہ ہے اور اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا لیکن وہ کہتا ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (۲۹:۱۸)

ترجمہ: اور (اے نبی) اعلان کر دیں کہ تمہارے رب کی طرف سے بھیجی ہوئی) ہدایت ہی برحق ہے۔ پس جو چاہے، اس کے سامنے سر جھکا دے اور جو چاہے روگردانی وانکار کا راستہ اختیار کرے (ہم باز پرس کر لیں گے) گویا، انسان کو انتخاب حق و باطل کا اختیار بھی اسی نے دیا ہے۔

لفظ خلیفہ کے معنی پر غور کرنے سے اس کائنات کے نقشے اور تنظیمی ہیئت میں انسان کے مقام کی بلندی واضح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس سے حصول ہدایت اور عبادت واطاعت کے ذریعے سے تعلق رکھے، اسے ہی الٰہ وخالق کل، حاکم اعلیٰ اور حاجت روا سمجھے۔ کسی دوسری مرئی یا غیر مرئی شے کو اس کا ساجھی نہ قرار دے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسے مرتبہ عالی سے نوازا ہے کہ اس کے لیے کائناتی قوتوں کو مسخر کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ ۳۲ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۚ ۳۳ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴: ۳۲-۳۴)

ترجمہ: اللہ ہی آسمانوں اور زمین (سمیت کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اس نے بلندی سے پانی برسایا جس کے ذریعے سے تمہارے لیے بطور رزق نباتاتی ثمرات پیدا کیے۔ (اپنے وضع کردہ قوانین کے تحت) سمندر میں کشتی رانی پر تمہیں قدرت دی۔ نیز دریا بھی تمہارے مفاد کے تابع کر دیئے۔

شمس وقمر بھی ایک معین قاعدے کے تحت تمہارے لیے حصول مقاصد کا ذریعہ ہیں اور یہی حال رات دن کے ظہور کا ہے اور جو کچھ تم زبان قال وحال سے مانگا اس نے تمہیں عطا کیا۔ (اندریں حالات) اگر تم چاہو بھی تو اللہ کی عنایات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ (اس کے باوجود) انسان اعتدال ناشناس اور ناشکرا ہے۔

ان آیات میں نہایت بلیغ وفصیح انداز میں چند فقروں کے ذریعے سے انسان کے مرکزی حیثیت دے کر اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کے انتظامات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ تمام انتظامات اس پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کی قدرت خالقیت کیا مظاہر ہیں۔ ان کے وجود میں آنے اور جن قوانین کے تحت یہ وجود میں آئے ان کو بروئے کار لانے میں انسان کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ تسخیر کا مطلب یہ نہیں کہ ان نعمتوں کی فراہمی انسان کے احاطہ اختیار میں ہے بلکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلق کر کے انسان کی خدمت کے فریضے پر لگا دیا ہے۔ وہ پابندی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ انسان اس انتظام میں کوئی ردو بدل نہیں کر سکتا۔

ان آیات سے یہ یقین بھی حاصل ہوتا ہے کہ دنیا اور کائنات ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت خلق کی گئی ہے۔ اور یوں ہی الل ٹپ طریق پر یا اپنے آپ اس کا وجود میں آنا امر محال ہے۔ واقعات و حالات کا اسباب و مسیات اور علت و معلول کے تحت وجود میں آنے کا عقیدہ رکھنے والے مادہ پرست آخر اتنے بڑے کارخانہ قدرت کے اپنے آپ بھی وجود میں آنے اور چلنے کے نظریے پر اصرار کرنے پر کسی منطق و استدلال کے تحت حق بجانب قرار دیئے جا سکتے ہیں؟

وجود باری تعالیٰ پر تو ہم توحید کے عنوان کے تحت گفتگو کریں گے یہاں ہم اس مقام کی وضاحت کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ نوع انسانی عقل و خرد کی تمام استعدادوں کی فراوانی اور انفس و آفاق کے مظاہر کے مشاہدوں کے باوجود خالق کی شکر گزاری میں کماحقہ منہمک نہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق انفرادی سطح پر سیرت سازی سے گریز کیا جائے اور اجتماعی زندگی کے اس خاکے کا نفاذ نہ کیا جائے جو حکم خداوندی کے تحت شارع علیہ السلام نے قائم کیا تو یہ طرز عمل بھی ظلم و ناشکر گزاری کے مترادف ہوگا۔

اس سے ایک تو اس لحاظ سے انسان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ عناصر قدرت اس کی بقا اور خدمت کے لیے تخلیق کیے گئے اور دوسرے اس کے لیے تحقیق و مطالعہ کے میدان کی وسعت کا تصور ابھرتا ہے۔ فرمایا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۳۲ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۲:۳۱-۳۳)

ترجمہ: اور اس نے سکھا دیئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان (حقائق) کے ناموں سے آگاہ کر دو۔ انہوں نے کہا کہ تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ کہا اے آدم! ان کو بتاؤ ان (حقائق) کے نام۔ تو جب اس نے بتائے ان کو ان حقائق) کے ہم تو اس نے کہا کہ میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید میں ہی جانتا ہوں، اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے۔

مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) نے ان آیات کے تحت وضاحت کی ہے:

''خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم کو ہر چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع و نقصان کے تعلیم فرمادیا اور یہ علم ان کے دل میں بلاواسطہ کلام القا کر دیا کیونکہ بدوں اس کمال علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ان سے امور مذکورہ کا سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ تم کار خلافت انجام دے سکتے ہو، سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ۔ لیکن انہوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ ہدوں اس علم عام کے کوئی کار خلافت زمین میں نہیں کر سکتا۔ اور اس علم عام سے قدرے قلیل ہم کو اگر حاصل بھی ہوا تو اتنی بات سے ہم قابل خلافت نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر کہہ اٹھے کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے بعد حضرت آدم سے جو تمام اشیا عالم کی نسبت سوال ہوا تو فر فر سب امور ملائکہ کو بتا دیئے کہ وہ بھی سب دنگ رہ گئے اور حضرت آدم کے احاطہ علمی پر عش عش کر اٹھے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ کہو ہم نہ کہتے تھے کہ ہم جملہ مخفی امور آسمان و زمین کے جاننے والے ہیں اور تمہارے دل میں جو باتیں ہیں وہ بھی سب ہم کو معلوم ہیں۔ فائدہ: اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھئے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم، مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں اس لیے مرتبہ خلافت انسان ہی کو عطا ہوا۔ اور ملائکہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا۔ اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے کیونکہ عبادت تو خاصہ مخلوقات ہے، خدا کی صفت نہیں۔ البتہ علم خدائے تعالیٰ کی صفت اعلیٰ ہے اس لیے لائق خلافت بھی ہوئے۔ کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔''

مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت اور دسترس میں وہ علوم دے دیئے گئے جن کا فرشتوں تک کو علم نہیں۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس عطا شدہ بالقوہ جوہر کے استعمال سے اپنی سعی و جہد اور تحقیق و مطالعہ کے ذریعے سے کائنات کے سربستہ رازوں کو فاش کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی قوت کاملہ کی جھلک پا سکے اور اپنے خالق کی اطاعت و عبادت میں زیادہ توجہ اور ایقان کے ساتھ منہمک ہو جو رضائے الٰہی کے حصول کا اصل ذریعہ اور حیات انسانی کا حاصل مقصد و مدعا ہے۔

قرآن میں ایک اور جگہ انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کا ذکر کرنے کے بعد فرشتوں سے فرمایا:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۲۹:۱۵)

ترجمہ: تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔

سجدے کے سجدۂ تعظیمی ہونے کی بحث تو آگے آئے گی، یہاں ہم ناظرین کی توجہ انسان کو ہر لحاظ سے سنوارنے اور اس میں اللہ تعالیٰ سے نسبت صفاتی پیدا کرنے کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا دائرہ تو لا متناہی طور پر وسیع ہے، اور قرآن میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اس کی قدرت اور امور تکوینی میں اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی ہی بیان کی گئی ہیں جن کا تذکرہ تمثیلی طور پر انسان میں پائی جانے والی صفات کے حوالے سے کیا گیا ہے، اگرچہ انسان کے اندر یہ خصوصیات محدود پیمانے پر پائی جاتی ہیں لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی لا محدود صفات کا پرتو کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے لیکن اس کا رحم و کرم کل کائنات کو محیط ہے اور اس کی کوئی حد نہیں لیکن اس کے برعکس انسان سے ان صفات کا صدور اپنی زندگی کے دائرے ہی میں ہو سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر کے کہ میں نے اسے تخلیق کر کے انسان کے اندر اپنی روح میں سے پھونکا، اس کے مقام اور اس کے اخلاق حسنہ اور استعداد، اعمال حسنہ سے متصف ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے تفسیر "تدبر قرآن" میں اس آیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:

و نفخت فیہ من روحی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے اندر ایک نور یزدانی (Divine Spark) بھی ودیعت ہوا ہے جو اس کے تمام روحانی کمالات کا سرچشمہ ہے، اور اس کے واسطہ سے وہ خدا سے جڑتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی پوری پوری حفاظت کرے۔ اگر وہ اس کو ضائع کر دے تو وہ ایک بے چراغ گھر ہے جس کے اندر صرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔"

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں اشارات کیے ہیں کہ انسان کو صرف اونچے مقام و مرتبہ اور استعداد ہی سے نہیں نوازا گیا بلکہ اس کو ایک خاص انداز سے انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کا پابند بھی کیا گیا ہے۔ اس انداز کے متعلق ایک تو قرآن کے ذریعے سے اساسی اصول دے دیے گئے ہیں اور دوسرے رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت دے کر مبعوث کیا گیا اور حضور کے قول و عمل سے ان اصولوں کے کی تبیین اور نفاذ کے ذریعے سے ان کو دنیا کے سامنے پوری طرح واضح کر دیا گیا۔ اس کے راہنمائی اور ان اصولوں کے اتباع پر انسان کی تشریف و تکریم کا انحصار ہے۔ ان کی ارادہ اور مختلف قسم کی استعدادیں دے کر عطا کیا ہے۔ آخر الذکر کی صورت میں وہ حق خلافت علی الارض بھی ادا کرنے سے محروم رہے گا۔ اس نظریے کی تفصیل تو ناظرین کو کتاب کے آئندہ صفحات میں پھیلی ہوئی ملے گی، البتہ ہم یہاں قرآن کے دو مقامات سے حوالے دے کر اجمالاً یہ عرض کریں گے، کہ ہم نے اس سے قبل دو آیات (۲: ۳۱ اور ۲: ۳۷) کی بنیاد پر انسان کی جن فطری صلاحیتوں

کی نشاندہی کی ہے وہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے اسے عطا کی گئی ہیں۔ اسے ان کے استعمال کے لیے اپنے نفس کے فاسد رجحانات کے اتباع کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا۔

سورہ العصر میں فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳:۱-۳)

ترجمہ: زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

یہ قرآن کی سب سے چھوٹی سورہ ہے اور صرف تین آیات پر مشتمل ہے لیکن امام شافعی کا یہ نظریہ بہت مشہور ہے اور بہت سے مفسرین قرآن نے اس کو نقل کیا ہے کہ اگر قرآن کی صرف سورہ العصر ہی نازل کر دی جاتی تو یہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کافی تھی۔

اس میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں جو تمام اسلامی تعلیمات کو محیط ہیں۔ جس انسان میں یہ چار خصوصیات پائی جائیں وہ کامیاب و کامران ہے ورنہ وہ خسارے میں ہے یعنی ناکام زندگی گزار کر اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا۔

ان میں سے سب سے پہلی راہ اختیار کرنے کے لیے ابتدائی چیز ایمان لانا ہے جس کا مطلب اللہ تعالی کی تمام صفات کے ساتھ اس کی توحید پر حقیقتاً جم جانا اور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا رسول تسلیم کرتا ہے جو بنی نوع انسان کے لیے اس دنیا میں ہدایت کا منبع و سرچشمہ ہیں۔ اس میں قرآن و سنت کے اجماع کا اقرار شامل ہو جاتا ہے۔ دوسری بات انسان کا اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی پر اسلام کی جملہ تعلیمات کو نافذ کرنے سے متعلق ہے۔ دراصل یہاں انسان کا بحیثیت فرد کے بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور بحیثیت نوع کے بھی۔ عمل صالح سے مراد ان تمام ہدایات و احکامات کی پابندی ہے جو قرآن و سنت کے ذریعے سے انسان تک پہنچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ذریعوں سے جہاں فرد کے حصول رضائے الٰہی کے لیے رہنمائی ملتی ہے وہیں اجتماعی زندگی کو صالح خطوط پر استوار کرنے کے لیے بھی ہدایات دستیاب ہیں۔ کسی انسان کے لیے ایمان لانا اسی صورت میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب اس کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ ایمان لانا ہر شعبہ زندگی میں خدا اور رسول کے احکامات کی پابندی کے عہد کے مترادف ہے اور اسلامی اصطلاحات میں عمل صالح کی اصطلاح سے یہی مراد ہے۔

خسران سے محفوظ رہنے کی آرزو رکھنے والے انسانوں کے لیے جو تیسری ہدایت اس سورہ میں دی گئی ہے وہ حق، یعنی دین اسلام کے اصولوں کو قبول کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے متعلق باہمی تلقین کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس سورہ کا خطاب نوع انسانی کی سطح پر ہے۔ عام طور پر قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ اعمال حسنہ کی ترغیب دینے کے لیے مومنین کو مخاطب کرتا ہے کیونکہ جو لوگ اسلام کے دائرے سے باہر کھڑے ہیں انہیں تو ترتیب کار کے لحاظ سے سب سے پہلے ایمان لانے پر آمادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام کے اعمال حسنہ کے تصور کو اپنانے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے لیکن اس سورہ میں تمام انسانوں کو اپنی اصلاح حال کے لیے ایک پروگرام اور لائحہ عمل دے دیا گیا ہے اور اس خیال کی تصدیق اس قسم سے بھی ہوتی ہے جو اللہ تعالی نے اس کے آغاز میں کھائی ہے۔

مفسرین نے مصر کے زمانے اور نماز عصر کا وقت دونوں ہی لیے ہیں لیکن اول الذکر مفہوم اس سورہ مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں ایک عالمگیر اپیل ہے۔ لہٰذا قسم میں بھی آفاقیت کے تصور کا پایا جانا ایک منطقی ضرورت ہے۔

ایمان لانے کے بعد دو طرح کی جدوجہد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان اپنی ذات پر اسلام کے اصولوں کو نافذ کرے اور دوسرے اس کشمکش کے لیے اپنے اندر استقلال اور عزم پیدا کرے جو ایمان لانے کے بعد کفر کی طاقتوں کے ساتھ شروع ہو جائے گی۔ جہاں اس کو یہاں ''تواصی بالحق'' کہا گیا ہے وہی یہ ہدایت مسلمانوں کے باہمی تعلق کے ایک اہم پہلو کو قوت فراہم کرنے کے لیے بھی دی گئی ہے۔ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اسلام جیسے ہمہ گیر اور اولوالعزمی کا تقاضا کرنے والے دین کو بلند کرنے کے لیے جس ہمت کی ضرورت ہے اس کو برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کو نصیحت کے ذریعے سے فکری تقویت پہنچانا از حد ضروری ہے۔

تاریخ کا یہ واضح سبق ہے کہ جب عمل صالح کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو کفر اس سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ دین کے قافلے کی پیش قدمی کو جبر کے ذریعے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مومنین کے لیے نہایت آزمایش کا وقت ہوتا ہے اور اس مرحلہ پر ثابت قدمی کی از حد ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا تلقین کی گئی ہے کہ اس موقع پر جہاں ایک دوسرے کو حق پر ذہنی و قلبی سطح پر جمے رہنے کی تلقین کی جائے وہیں صبر استقلال کی بھی نصیحت کی جائے۔ اور یہ چوتھی بات ہے جو اس سورہ میں بیان کی گئی ہے۔ صبر کے معنی جہاں

ظلم وستم کے مقابلے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے وہی اس لفظ کا اطلاق اپنے ہدف اور ارادے پر جمے رہنے پر بھی ہوتا ہے۔

مختصر ہونے کے باوجود یہ سورہ اپنے اندر بہت معنوی وسعت رکھتی ہے۔ یہ دعوت اسلام کے دوران اس بات کو واضح کرنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی کہ انسان کا مقصد تخلیق اور اس کی اس دنیا میں حیثیت کیا ہے اور اس کے ذریعے سے ان مراحل کی نشاندی بھی ہو جاتی ہے جن سے انسان کو راہ ہدایت پر چلنے کے لیے گزرنا ہے۔ نیز ایمان کے مرحلے سے گزرنے والے لوگوں کے لیے اس میں آئندہ کے تین مراحل کا تذکرہ ہے اور موجود ہے۔ یہ مکہ میں ابتدائے دعوت اسلامی کے دور کی تیرھویں سورہ ہے اور مسلمانوں نے اپنے اس دور ابتلاد آزمائش میں اس کو اس قدر اہمیت دی کہ جب ان میں سے دو حضرات آپس میں ملتے تھے تو جدا ہوتے وقت علیک سلیک کے علاوہ ایک دوسرے کو یہ سورہ سناتے تھے۔ اس سے مکی دور کی مشکلات میں تلقین حق وصبر کا فریضہ ادا کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کار دعوت کے دوران حلقہ اسلام سے باہر کے مخاطبین پر اس سورہ کے ذریعے سے یہ وضاحت بھی کرنا ہوتی ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ان کو کن مراحل سے گزرنا ہو گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اسلام کو برپا کرنے کے لیے مسلمانوں کی جماعت انہی مراحل سے گزری۔

اس سلسلے میں ہم دوسرا حوالہ سورۃ التین سے دیں گے یہ سورہ بھی مکی دور ہی میں نازل ہوئی۔ فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۫ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (۹۵:۴-۲)

ترجمہ: ہم نے انسان کو بہترین حالت میں عدل پر پیدا کیا۔ پھر اس کو بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا، مگر وہ لوگ کہ ایمان لائے اور عمل صالح کیے تو ان کے اعمال کے نتائج صرف بہتری ہی کے لیے ہیں، ان کے عمل صالح کا بدلہ کبھی منقطع نہ ہو گا۔

ان آیات سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کی تخلیق اس طرح کرتا ہے کہ اس کی فطرت نیکی کی طرف راغب ہوتی ہے اور وہ بالقوہ اعمال حسنہ بجالانے کی استطاعت رکھتا ہے۔ لیکن اللہ کی توحید پر ایمان نہ لانے اور وحی کے ذریعے سے اس نے زندگی گزارنے کے جو اصول دیئے ہیں ان کے پیش کرنے والے رسول پر ایمان لا کر ان پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے وہ انتہائی گراوٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی اس حیثیت سے محروم ہو جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو ارضی زندگی شروع کرنے پر مزین کیا تھا۔

انسان کے ''احسن تقویم'' پر پیدا ہونے سے نصاریٰ کے اس تصور کی بھی تکذیب ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے کندھوں پر معصیت کا بوجھ لاد کر پیدا ہوتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کی قربانی کے ذریعے سے وہ اس بوجھ سے آزاد ہو گا۔ ان آیات کے ذریعے سے یہ واضح کر دیا گیا کہ انسان کے مرتبہ بلند پر فائز رہنے اور اپنے مقام سے گر جانے کا انحصار اس کے اپنے اعمال پر ہے۔ نیز ان اقوام و مذاہب میں رائج اس عقیدے کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو از روئے مرتبہ روحانی انسانوں کو محض پیدائشی نسبت سے اونچا نیچا مقام دیتے ہیں۔ اور یہ صورت حال وراثتاً چلتی ہے مثلاً ہندوؤں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ جو برہمن کے گھر پیدا ہوا وہ بلند مقام رکھتا ہے اور اچھوت کی اولاد ہمیشہ کے لیے مبتلائے معصیت اور گرفتار ذلت ہی رہے گی۔

سطور بالا کی بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت ارضی کا منصب دیا ہے اور یہ بہت اونچا مقام ہے لیکن دین اسلام کی تعلیمات کی رو سے اس کے واضح تقاضے ہیں۔ جن سے رو گردانی کی صورت میں انسان تحت الثریٰ کی پستیوں میں گر جاتا ہے۔

دین اسلام کی فکری اساسات کے مآخذ

دین اسلام کی فکری اساسات کے مآخذ قرآن و سنت ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ جو ان سے لا تعلق ہو قابل التفات نہیں۔ اس سے کچھ خارج کیا جا سکتا اور نہ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں مآخذ محض موہوم اصولوں پر مشتمل نہیں اور نہ یہ کوئی خیالی نظام فکر و عمل (Utopia) پیش کرتے ہیں۔ بلکہ حضور کی سیرت، عمل اور اسلام کو ایک نظام حیات کے طور پر برپا کرنے کی جدوجہد نے ایک ایک اصول اور ایک ایک نظریے کو عملی جامہ پہنا کر دکھا دیا اور صحابہ کی ایک کثیر تعداد کی ایسی تربیت کر دی کہ ان کے اذہان و قلوب میں فکر و عمل کے کسی گوشے کے متعلق ابہام نہیں رہا۔ مزید برآں ان کی تربیت فکر و اخلاق اس انداز سے ہو گئی کہ وہ ہر شعبہ زندگی کے سلسلے میں دین اسلام کے سچے ترجمان بن گئے۔

اس لیے اس بات پر مسلمان علما و جمہور کا کلی اتفاق ہے کہ اجماع صحابہ ہمیشہ قرآن و سنت کے مطابق ہو گا اور ہمارے لیے قابل اتباع ہے۔ اسی وجہ سے اس کو بھی مآخذ دین شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس کو یہ مقام اسی وجہ سے حاصل ہے کہ صحابہ میں فہم دین، خلوص، خشیت اللہ اور محبت رسول بدرجہ اتم موجود تھا۔ اور ان کے کسی خلاف اسلام نظریے یا فیصلے پر متفق ہو جانا امر محال کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان حضرات نے شارع علیہ السلام کو دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے، ان کی تبلیغ کرتے اور ان کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرتے دیکھا اور انتہائی تکلیف برداشت کر کے اور جانوں اور مالوں کی قربانی پیش کر کے حضور کے زیر

قیادت دین اسلام کے نفاذ کی اس جدوجہد میں شریک رہے۔ انہوں نے اپنی زندگیوں کا اولین مقصد یہ بنالیا تھا کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو حرز جان بنائیں اور اتباع سنت رسول سے یک سر انحراف نہ کریں۔

صحابہ کے متعلق حضور نے فرمایا:

اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم (مشکوۃ)

ترجمہ: میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاؤ گے

۔

صحابی کی تعریف اور علم و عمل کے اعتبار سے صحابہ کے مقام کے متعلق باب بعنوان "اسلام تاریخ میں بحث کریں گے۔ اسی طرح قرآن اور حدیث کے متعلق ان کے طرز عمل کو ابواب قرآن و حدیث میں بیان کیا جائے گا۔

قرآن و سنت اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے علمی کار جنہوں کے متعلق الگ الگ ابواب میں بحث کی جائے گی۔

دور صحابہ کے بعد تابعین، تبع تابعین، آئمہ سلف اور علما حقہ نے ان تین ماخذوں کی بنیاد پر دین کی وضاحت اور اجتہاد کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان حضرات کے تفکر و تدبر فی الدین کے نتائج امت مسلمہ کے نزدیک چوتھا مانند دین قرار پائے۔ اس سلسلے میں مختلف علما نے مختلف اصطلاحات اور انداز اختیار کیے ہیں لیکن وہ تمام صورتیں اجتہاد کے وسیع المعنی زمرے میں شامل ہیں۔

بنیادی اصولوں کی ضرورت

ہر نظام زندگی کے کچھ بنیادی اور مستقل اصول ہوتے ہیں۔ ان کو ہیئت اجتماعیہ میں نظریات کے فروغ اور زندگی کے عملی نقشے کو مرتب کرتے وقت ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کچھ بنیادی اصول پیش کرتا ہے۔ جن کے متعلق اس دین کا موقف یہ ہے کہ وہ بندوں کے وضع کردہ نہیں بلکہ خالق کائنات نے انھیں بذریعہ وحی اپنے پیغمبر کے قلب پر نازل کیا۔ اللہ کے پیغمبر نے ان کو بنی نوع انسان کی طرف منتقل کی۔ پیغمبر نے صرف وعظ و نصیحت پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان اصولوں کو اپنی زندگی میں کامل طور پر نافذ کرنے کے علاوہ ان کی تبیین کر کے انہیں ایک نظام حیات کے طور پر زندگی کے جملہ شعبوں میں جاری کیا۔ اگر آپ ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کوئی نظام حیات مرتب و نافذ کریں گے اور اپنی تمام علمی و فکری کاوشوں کو ان کی

روشنی میں سرانجام دیں گے تو وہ اسلامی کہلائے گا ورنہ نہیں۔ ہم یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہہ رہے۔ ہم بطور مثال یہ عرض کریں گے کہ اگر آپ کوئی نظام قائم کریں اور اس کے ذرائع پیداوار نجی ملکیت میں ہوں تو وہ کمیونسٹ نظام نہیں کہلا سکتا کہ اس طرح اگر آپ اللہ تعالیٰ کے وجود، وحی اور معاد کا انکار نہ کریں تو آپ کا قائم کردہ نظام مادہ پرستانہ اور سیکولر نہیں تسلیم کیا جائے گا۔ مادہ پرستانہ اور لادینی نظام کے لیے جہاں آپ کو مابعد الطبیعاتی فکر کے دائرے میں اس کے مخصوص نظریات اپنانے ہوں گے۔ وہاں انہی نظریات کے تحت آپ کو تعلیمی، تحقیقی اور فلسفیانہ دائرے میں کاوشیں کرنا ہوں گی۔ اگر آپ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام قائم کرنا چاہیں تو آپ کو جمہور کی حاکیت تسلیم کرنا ہو گی۔ معاشرے میں بے قید معاشی سرگرمیوں کا حق بھی شہریوں کو دینا ہو گی۔ اس نظام کے تحت قلیل تعداد پر مشتمل ایک طبقہ بقیہ آبادی کو لوٹنے کے لیے آزاد ہو گا۔

یہی اصول دین اسلام کے پیش کردہ نظام فکر و عمل پر وارد ہوتا ہے۔ معاشرہ تبھی اسلامی کہلائے گا جب وہ اپنے جملہ شعبوں سمیت قرآن و سنت کے پیش کردہ اصولوں کی بنیاد پر قائم ہو گا۔ دین اسلام کے اصولوں کو پامال کرنے والا کوئی اجتماعی نظام اسلامی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

رہنما اصولوں کا ہونا جمود کی علامت نہیں۔ وہ اگر ناقص اور انفرادی و اجتماعی فلاح کے لیے ضرر رساں ہوں تو فتنہ و فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر وہ فطرت انسانی کے تقاضوں سے مطابقت تو رکھتے ہوں لیکن ان سے وابستگی کے دعاوی کے باوجود کوئی قوم یا ملت ان پر عمل پیرا نہ ہو تو یہ طرز عمل باعث جمود و انحطاط ہوتا ہے۔

البتہ اسلام کے ان اصولوں اور انسان کے وضع کردہ مادہ پرستانہ نظام ہائے حیات میں ایک عظیم فرق ہے۔ اور یہ فرق ان کے منبع اور مصدر کا ہے۔ اول الذکر اصول اس ہستی کی طرف سے بذریعہ وحی عنایت کیے گئے ہیں جو اس کائنات اور انسان کے وجود اور فطرت کے خالق ہیں۔ اور جس کی قدرت میں انفرادی اور نوعی اعتبار سے اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کا وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲:۳۶) (اور تمہارے لیے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا پینا ہے) کے مطابق تعین کرنے کا اختیار ہے۔ ہبوط آدم کے موقعہ پر باری تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲:۳۸)

ترجمہ: ہم نے کہا کہ اترو یہاں سے سب، تو اگر آئے میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰:۱۲۳)

ترجمہ: (چنانچہ) اللہ نے حکم دیا تھا تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل چلو، تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا۔ (اب تم پر ایک دوسری زندگی کی راہ کھلے گی) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی پیغام ہدایت آیا تو (اس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ راہ سے بے راہ ہوگا، نہ دکھ میں پڑے گا

گویا، قرآن کی رو سے ارضی زندگی کے آغاز کے وقت ہی اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اس زندگی کے گزارنے کے ڈھب کے سلسلے میں اہم ہدایت یا اصول دیتے رہیں گے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچانک اور غیر متوقع طور پر ابدی سچائیوں کا حامل اور مکمل دین لے کر مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ ان سے قبل دنیا کے مختلف خطوں، قوموں اور قبائل کی طرف ان کے مرحلہ ارتقا کے مطابق ہمیشہ ہی رسول آتے رہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۴)

ترجمہ: اور کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں (بدعملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والا کوئی رسول نہ گزرا ہو۔

اب اس دین کے اصولوں کی روشنی میں بنی نوع انسان کو اپنی حیات انفرادی و اجتماعی کے نقشے کو مرتب کرنا ہے۔ ترتیب حیات انسانی کا یہ کام اور ان اصولوں کے انطباق کا فریضہ انسان کو خود انجام دینا ہے۔ اسی لیے اس کو حق اجتہاد دیا گیا ہے۔ چشم بینا اور تفکر و تدبر کی صلاحیت رکھنے والے ہر شخص پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگی کہ ہر نظام زندگی کا، چاہے وہ جتنا بھی ناقص ثابت ہو چکا ہو، یہی حال رہا ہے۔ کوئی مفکر یا گروہ مفکرین اگر کوئی اصول پیش کرتا ہے تو اس کا نفاذ ان اصولوں ہی کا حوالہ دے کر تدبر اور عملی صلاحیتوں کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے بنیادی اصولوں میں تغیر و تبدل کرنے کا کس کو حق نہیں دیا جاتا۔ جب تک کوئی نظام قائم ہے اس کے اصولوں سے انحراف نہیں ہو سکتا۔ فروعات میں ردوبدل ہو سکتا

ہے۔ مثلاً دور حاضر کے تصور کے جمہوری نظام اختیار کرنے کی صورت میں منتخب اداروں کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ البتہ طریق انتخاب اپنے اپنے حالات ورائے کے مطابق اپنایا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستقل اصول کسی نظام کے لازمی ستون ہیں اور اگر ان میں نفاذ خیر کی جزوی صلاحیت بھی ہو تو یہ باعث جمود وانحطاط نہیں ہو سکتے اگرچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسانوں کے وضع شدہ نظاموں کے اندر پائے جان والے ناقص پہلو خیر کے پہلوؤں پر غالب آجاتے ہیں۔

یہ ایک نہایت ہی سادہ سی حقیقت ہے جس کو اسلام کے سلسلے میں ہدف طعن وذریعہ غلط فہمی بنایا جارہا ہے کہ اسلام اور اصولوں کی ابدی سچائی کا دعویٰ کرنا انسانی معاشرے کے ارتقا کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اسلام کے اجتماعی نظام کے عنوان کے تحت ہم ثابت کریں گے کہ اس دین نے انفرادی واجتماعی زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز کیے بغیر ایک نہایت ہی مبنی بر خیر اور متوازن نظام دیا اور اس میں یک رخاپن (Onesidedness) نہیں پایا جاتا۔ لیکن اس کے نفاذ کی ذمہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے جیسا کہ سطور بالا میں تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ اللہ نے دین کے اصول دے دیئے ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں انسان کو مجبور نہیں کیا۔ وہ چاہے تو ان کو اپنائے، چاہے تو کفر کا راستہ اختیار کرے۔ گمراہی کے جو نتائج ارضی زندگی میں برآمد ہوں گے، وہ تو ہوں گے ہی لیکن آخرت کی جو ابدی فیصلہ کن ہو گی۔ اس دین میں اجتہاد کا تصور جمود وانحطاط کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے۔

انسان کے اندر حق و باطل کی کشمکش اور اس کی ذمہ داری

ہم اس سے قبل آیات (۲: ۳۱-۳۳) کا حوالہ دے کر علمی دائرے میں ملائکہ پر انسان کی فوقیت کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ آیات (۲: ۳۸ اور ۲۰: ۱۲۳) کی بنیاد پر ہم نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ انسان کی ارضی زندگی کے آغاز پر ہی اللہ تعالیٰ نے یہ اضح کر دیا تھا کہ انسان کو یہ زندگی احسن اور مطابق فطرت طریق سے گزارنے کے لیے ہم ہدایت بھیجتے رہیں گے۔ اس کے بعد (۲۰:۱۸) اور (۳۹:۳۵) کے ذریعے سے یہ وضاحت کر دی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مجبور نہیں کیا بلکہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اس کے دین کا اتباع کرے اور چاہے تو کفر کا راستہ اختیار کرے۔ لیکن کفر کا وبال اسی پر ہو گا جو کفر کا مرتکب ہو اور جو راہ ہدایت پر چلے وہ اس کا اجر پائے گا۔

چنانچہ اور جگہ فرمایا:

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ(۳۰:۴۴)

ترجمہ: جس کسی نے کفر کیا ہوگا اس کے کفر کا وبال اسی (کی گردان) پر ہوگا، اور جس نے نیک عمل کیے (وہ اپنے اعمال کا پھل پائیں گے کیونکہ) وہ اپنے ہی لیے تیاری کرتے ہیں۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے اور اس نے اپنی اس مخلوق کی فطرت میں حصول ہدایت کی خواہش رکھ دی ہے تو اس نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو مستقل طور پر قبول کیوں نہیں کیا۔ قرآن میں اس بات کا شافی جواب موجود ہے۔

قرآن کہتا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام بنی نوع انسان کو راہ ہدایت کا ایک ہی مسلک اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔ چنانچہ فرمایا:

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ(۶:۱۴۹)

ترجمہ: اگر وہ چاہتا تو تم سب کو سیدھی راہ پر چلا دیتا۔

پھر فرمایا:

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ(۲۶:۴)

ترجمہ: اگر ہم چاہیں تو آسمان سے کوئی ایسا نشان اتار دیں کہ ان کی گردنیں ان کے سامنے جھک جائیں۔

یہ بھی واضح کر دیا کہ:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ (۱۰:۹۹)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے۔

لیکن انسان کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ بے اختیار وارادہ ہو۔ اس نے اس کائنات میں ایسی بے شمار انواع کی مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں جو ہر لحاظ سے اور ہمہ جہتی طور پر اس کے امر تکوینی کی پابند ہیں۔ مثلاً ملائکہ میں حکم عدولی کی صلاحیت واستعداد ہی میں رکھی گئی۔ دوسری صورت جو درج بالا آیات میں بیان کی گئی ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دین اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے اور انسان کو اس کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے آسمان سے کوئی نشانی اتار دیتا۔ جو اس کرہ ارض پر رائج طبعی قوانین کی رو سے انہونی ہوتی اور اس طرح وہ مرغوب ہو کر دین قبول کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھ کر

اور قبول کرنے کا موقع دیا ہے۔ نہ ہی انسان پر کسی اور نوعیت کا دباؤ ڈالا گیا ہے جس سے مجبور ہو کر انسان اس دین کو اپنانے کے لیے سر تسلیم خم کر دے۔ اسلام تذکیر کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۲۲:۸۸)

ترجمہ: تو ان پر داروغہ مقرر نہیں ہے۔

اور:

وما انت علیھم بجبار یعنی تو ان پر زبردستی کرنے والا نہیں ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۚ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۲۵۶:۲)

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے۔

اس لیے انسان اپنے اعمال نیک و بد کے سلسلے میں جوابدہ ٹھہرایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۷۲:۳۳)

ترجمہ: ہم نے (احکام کی امانت کو آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا، اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھالیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حجتہ اللہ البالغہ" جلد اول کے چھٹے باب میں اس کی یوں تغیر کرتے ہیں:

ترجمہ: "امام غزالی اور علامہ بیضاوی وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ امانت سے مراد ذمہ داری اعمال کا قبول کرنا ہے یا یوں کہیے ثواب یا عذاب کے لیے آمادگی کا اظہار کرنا ہے جو بالترتیب اس کی اطاعت و عصیان کا نتیجہ ہے۔ پیش کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس ذمہ داری اور ان کی استعداد کا باہم موازنہ کیا۔ انکار سے مراد طبعی انکار ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان اشیا نے اپنے میں یہ استعداد نہ پائی کہ اس ذمہ داری کو قبول کریں۔

انسان کے اس امانت کے اٹھانے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں یہ استعداد موجود ہے اور اس لیے وہ اس قابل ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا ذمہ دار گردانا جائے۔"

اس امانت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہدایت و گمراہی کی راہوں کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے اور انسان پر ان دونوں میں سے کسی ایک راستے کو اختیار کرنے کے سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں۔

چنانچہ فرمایا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (۱۰:۱۰۸)

ترجمہ: (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو کہ "اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس آگئی ہے۔ پس جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا، تو اس کی گمراہی اس کے آگے آئے گی۔ میں تم پر نگہبان نہیں ہوں (کہ زبردستی کسی راہ پر کھینچ لاؤں)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ لوگوں میں یہ اعلان فرمادیں کہ حق آگیا اب تمہیں انتخاب کا موقع حاصل ہے۔ اگر اس کو قبول کروگے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے اور اگر اس سے روگردانی کروگے تو اس کے نتیجے میں جو نقصان اٹھاؤ گے اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اور میں تم پر مختار نہیں ہوں کہ تمہیں قبول ہدایت پر مجبور کروں۔

رد و قبول ہدایت کا یہ اختیار انسان کو لاحل مسمی (مقرر شدہ مہلت) کے لیے ملا ہے اور اس کی وجہ سے اس پر جوابدہی کی بھاری ذمہ داری عائد ہوئی ہے۔ جہاں تک ہدایت و ضلالت اپنانے کے انسانی اختیار کی علت کا تعلق ہے، جیسا کہ اس سے قبل بیان ہوا، جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ پر از روئے علم آدم کی فوقیت کا مظاہرہ کروایا تو ان سے کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۲:۳۴)

ترجمہ: اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔

فرشتوں سے سجدہ کرانے سے آدم کے شرف کا اظہار مقصود تھا۔ لیکن یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا تو شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو سجدہ کرنے کا ملائکہ کو کیوں حکم دیا۔

مفسرین قرآن کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہیں تھا بلکہ سجدہ تعظیمی تھا۔ ہم اس سلسلے میں چند مفسرین سے حوالے دے کر اس نکتہ نظر کی توثیق اور وضاحت کریں گے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس آیت کے تحت لکھا ہے:

''سجدہ کا لفظ عربی زبان میں جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جھکنے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ کسی کے آگے تعظیم کے طور پر سر نہوڑ دینا بھی جھکنا ہے اور پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دینا بھی جھکنا ہے۔۔۔ اگر یہ کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدم کو تعظیم بجالاؤ، اس سے زیادہ اس کا مفہوم نہیں ہے۔''

تفسیر جلالین میں ان الفاظ کے ساتھ وضاحت ہے:

سجود تحينه الانحناء جھک کر تعظیمی سجدہ

حاشیے میں مزید وضاحت ہے:

بالانحناء لا يوضع الجبهته على الارض

احتراماً جھکنا، پیشانی کو زمین پر رکھے بغیر۔

''(یہ) ایک تعظیمی سجدہ تھا جس کو دوسرے لفظوں میں سلام تعظیم کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ (سجدہ) عبادت ہوتا تو شیطان اپنی معذوری اور جوابدہی میں انا خير منه الخ نہ کہتا بلکہ صاف صاف کہتا کہ جناب والا یہ کیا انصاف ہے ہمیں ایک طرف تو شرک سے روکا جاتا ہے اور دوسری طرف اس شرک کی تعلیم دی جارہی ہے۔''

مولانا نے حضرت ابن عباس کا، جن کی قرآن فہمی کی صلاحیت کے صحابہ بھی معترف تھے، قول نقل کیا ہے:

كان ذلك انحناء ولم يكن خرورا على الذقن

یہ احتراماً جھکنا تھا اور ٹھوڑی کے بل سجدہ کرنا نہ تھا۔

تفسیر ''جامع البیان کی تفسیر القرآن'' میں لکھا ہے:

السجود حقیقی طاعه الله وتعظیما لا دم وهو مشروع قبل او انحناء الا وضع جبهه حقیقی سجدہ اللہ کی اطاعت میں ہوتا ہے اور آدم کے لیے تعظیمی (سجدہ تھا) پہلی شریعتوں میں جائز تھا یا احتراماً جھکنا پیشانی کو زمین پر رکھے بغیر۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

سجدے کا حکم بجالانا خداوند تعالیٰ کی اطاعت اور آدم علیہ السلام کا اکرام تھا۔

ملائکہ نے جب نوعی اعتبار سے انسان کی تکریم و تمجید کا اعتراف کیا تو ابلیس کے اندر چھپی ہوئی حسد و کینہ اور طغیانی و تکبر کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح تخلیق بنی نوع انسان کے ساتھ ہی ایک ایسی قوت ظہور میں آگئی جسے ازل سے ابد تک انسان کے اندر ودیعت شدہ استعداد حسن عمل کو زائل کرنے کے لیے کوشاں رہنا تھا۔ گویا، انسان کے لیے ہدایت و گمراہی اور برو اثم کی دو راہیں وجود میں آئیں اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا اسے اختیار دے دیا گیا۔ اور یہی حق انتخاب اس کے شرف کا باعث بنا۔ لیکن یہ اختیار جوابدہی کے ساتھ مشروط ہے۔

چنانچہ ابلیس اطاعت گزاروں کے زمرے سے نکل کر طائفہ کفار میں شامل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ملعون ٹھہرایا:

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ (۴:۱۸۱) اللہ اس کو ملعون ٹھہرا چکا ہے۔

اس نے بغض و حسد کی بنا پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنے عزم خبث کا اظہار کیا اور قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ سے انسان کو راہ راست سے بھٹکانے کی مہلت مانگی:

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ ۖ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷:۶۲)

ترجمہ: اس نے کہا دیکھئے یہی (آدم) جس کو آپ نے مجھ پر فضیلت دی ہے اگر مجھے قیامت تک زندگی دو تو میں باستثنائے چند اس کی تمام اولادوں کو برباد کر دوں۔

قَالَ اَنْظِرْنِىْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۱۴ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (۷:۱۴-۱۵)

ترجمہ: (ابلیس نے) کہا "مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) اٹھائے جائیں گے۔

چنانچہ یہ مہلت دے دی گئی اور شیطان نے اعلان کیا:

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (۷:۱۶۔۱۷)

ترجمہ: چونکہ تو نے مجھے در کایا ہے تو اب میں بھی تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں ضرور بیٹھوں گا۔ پھر سامنے سے، پیچھے سے، داہنے سے اور بائیں سے (انہیں بھٹکانے کے لیے) آؤں گا اور تو ان میں سے اکثروں کو شکر گزار نہ پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ(۷ : ۱۸)

ترجمہ: (خدا نے) فرمایا "یہاں سے نکل جا ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو میں البتہ تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

ہم نے سطور حوالے دیئے ہیں ان سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسان کے اس طرز عمل کی تصدیق ہوتی ہے جو ہمارے مشاہدے میں آتا ہے۔ انسان کی فطرت میں بشرطیکہ اسے ماحول کے دباؤ سے بالکل مسخ نہ کر دیا جائے، خیر کی طرف پختہ رجحان رکھ دیا گیا ہے اور قرآن کی رو سے اسے "احسن تقویم" پر پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی روحانی ترقی اور خودی کی پرورش و نمود کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے چیلنج کا سامنا ہو اور وہ اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہو سکے۔ اور یہ چیلنج اسے شیطان فراہم کرتا ہے۔ وہ اس پر چاروں اطراف سے حملہ آور ہوتا ہے جیسا کہ آیات (۷:۱۶-۱۷) سے ظاہر ہے۔ لیکن ایک مرد مومن کو اللہ تعالیٰ نے وہ موثر ہتھیار عطا کیے ہیں جن کے استعمال سے وہ شیطان کو پچھاڑ سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان ہتھیاروں سے کام لے سکے۔

ابلیس نے جب اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اللہ کے بندوں کو گمراہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ

وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا(۳۶:۷۱۔۵۶)

ترجمہ: خدا نے فرمایا بھلا جاتو (اپنا سارا زور لگالے) جو کوئی بھی ان میں سے تیرے پیچھے چلے گا تو اس کے لیے اور تیرے لیے جہنم کی سزا کی، پوری پوری سزا۔ اور ان میں سے جس پر تیرا زور چلے اپنی آواز سے بہکا لے۔ اپنی لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا، ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سرتا سر دھوکا'' ''جو میرے (سچے) بندے ہیں، ان پر تو قابو پانے والا نہیں۔ تیرا پروردگار کارسازی کے لیے بس کرتا ہے۔''

ان آیات سے دنیا میں اسلام اور کفر کے ٹکراؤ کی شدت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ جنگ دنیا میں ہر محاذ اور ہر سطح پر لڑی جارہی ہے۔ اس کا سب سے اہم معرکہ افراد کے باطن میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس کشمکش کا فیصلہ انسانوں کی حیثیت اجتماعیہ میں منعکس ہوتا ہے۔ تفصیلی گفتگو تو اپنے مقام پر آئے گی لیکن ہم یہاں اجمالاً عرض کر دیں کہ ابلیس کے حملوں کو پسپا کرنے کے لیے اولاً تو تعلیمات اسلامی واضح طور پر قرآن و سنت میں موجود ہیں۔ ان دو ذرائع سے جہاں انسان کے فکر کی تعمیر ہوتی ہے، وہاں اس کے تزکیہ نفس اور صفائی باطن کا لائحہ عمل دے دیا گیا ہے۔ اگر ان ماخذ ہدایت کے اصولوں کو اپنایا جائے گا تو انسان فلاح و اطمینان کی زندگی بسر کرے گا مگر ان سے روگردانی شیطان کے پھندے میں گرفتار ہونے کا باعث ہوگی۔ اس صورت میں انسانی معاشرہ معصیت میں مبتلا ہو جائے گا۔ ثانیاً تعلیمات اور اسوہ حسنہ رسول کی شکل میں رہنمائی کے ساتھ انسان کے اندر ضمیر کی قوت فرقان رکھ دی گئی ہے۔ جو اس کے ذہن و قلب اور اس کے نفس کو اس کی کج رویوں پر متنبہ کرتی رہتی ہے۔ ثالثاً فرد کو تن تنہا چھوڑ دینے کے بجائے اسے ایک ایسا اجتماعی نظام بنانے کے لیے تفصیلی احکام دیے گئے ہیں جو اسے ہدایت خداوندی پر چلنے اور شیطان کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے باعث تقویت ہوتا ہے اور جو اسے وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر کا فریضہ ادا کرنے کے قابل بناتا ہے۔

صراط مستقیم پر استقلال سے چلنے اور اغوائے شیطانی سے محفوظ رہنے کے لیے ان تینوں ذرائع کا استعمال از بس ضروری ہے۔ اگرچہ اتباع قرآن و سنت میں سب کچھ آجاتا ہے لیکن موخر الذکر دو ذرائع سے استمداد کا ذکر ہم نے وضاحت مدعا کے لیے کر دیا ہے۔ ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے عزیمت و استقرار کی اس لیے ضرورت ہے کہ جیسا کہ درج بالا آیات سے واضح ہوتا ہے، حملہ شیطانی اور اغوائے ابلیس بھی بڑا ہمہ جہتی

ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ انسان کے اندر کا نفس اگر قابو میں نہ ہو تو یہ ابلیس کا سب سے بڑا موید و مدد گار ہوتا ہے۔ اس صورت میں انسان کے جادہ راست پر چلنے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ(۱۲:۵۳)

ترجمہ: آدمی کا نفس تو برائی کے لیے بڑا ابھارنے والا ہے (اس کے غلبہ سے بچنا آسان) نہیں مگر ہاں، اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے۔ بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

اسلامی تعلیمات اسی نفس امارہ کو نفس مطمئنہ میں تبدیل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اور جب یہ تغیر رونما ہوتا ہے تو انسان کی تمام باطنی توانائیاں صراط مستقیم پر چلنے کے لیے اس کی معاونت کرتی ہیں۔

جہاں تک اسلام کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ انسان فطرتاً خیر پر مبنی رجحان کے خلق کیا گیا ہے تو اس کا واضح ثبوت اس کشمکش کی شکل میں ملتا ہے جس میں وہ تغیر حالات کے لیے منہمک رہتا ہے۔ اس سلسلے میں آئے دن اپنی بہتری کے لیے فکر و نظر کے شعبے میں نئے نئے زاویے اختراع کرتا اور انہیں عملی زندگی پر منطبق کرنے کی سعی وجہد میں اپنی توانائیاں صرف کرتا رہتا ہے۔ لیکن وہ کائنات کی تخلیق وانجام اور خود اپنے متعلق از خود اساسی نظریات کا ادراک حاصل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی وہ قومی، نسلی، لونی اور دوسرے تعصبات سے آزاد ہو کر سوچ سکتا ہے۔ لہذا وہ جو فلسفہ اور نظام زندگی خود وضع کرتا ہے، وہ خام ثابت ہوتا ہے۔ اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو ہم مناسب مقام پر کریں گے۔ یہاں ہم صرف انسان کی اس فطرت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تلاش حق میں رہتا ہے لیکن چونکہ وہ اس زندگی کے گزارنے کے لیے اس ہستی کی نازل کردہ ہدایت سے رہنمائی حاصل نہیں کرتا جس نے اسے خلق کیا، اسی کی طرف اس نے لوٹنا ہے اور وہی اس کا رب ہے، لہٰذا وہ اپنے لیے از خود کوئی جامع اور صحیح قدروں پر مبنی نظام عدل قائم نہیں کر سکتا۔

تلاش حق میں کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے، اگر انسان اپنی عقل و دانش اور حسیات کی حد پرواز کا تعین کر لے۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ سے وہ ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور کھاتا رہے گا۔

اسلام عقل و دانش کو اس کا صحیح مقام دیتا ہے۔

اسلام عقل اور اس کے استعمال کی افادیت سے انکار نہیں کرتا بلکہ اس کو نعمت خداوندی تصور کرتا ہے۔ فرمایا:

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ (۲:۲۶۹)

ترجمہ: اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳:۱ ۶۴)

ترجمہ: یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا، اور ان کو پاک کرتا اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

بعثت اسلام سے قبل عرب جہاں کسی صالح نظام فکر و عمل سے ناآشنا تھے، وہیں وہ شرک اور زندگی کے معاملات میں ضلالت کی بہت سی دوسری آلودگیوں میں ملوث تھے۔ دعوت اسلامی کے نتیجے میں مومنین کی جو جماعت وجود میں آئی اسے مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک رسول انہیں میں سے مبعوث کیا گیا جس کے نتیجے میں افہام و تفہیم اور دین کے اصولوں کی تدریس میں آسانی پیدا ہوئی۔ اس رسول نے جہاں انہیں راہ راست دکھائی وہیں ان کی سیرت سازی کر کے حکمت کی نعمت سے نوازا جو عقل و دانش سے بھی وسیع تر مفہوم کی مالک ہے۔

عقل جب معاملات زندگی کی گہرائی میں جا کر حیات انسانی کے اصولوں کا ادراک حاصل کرتی ہے تو وہ حکمت کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ لیکن دور حاضر اور ادوار سابقہ کے عقلیت پرستوں اور اسلام کے درمیان عقل کے مقام و کردار کا تعین کرنے کے سلسلے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسلام عقل سے اس دائرے میں کام لینے کی ترغیب دیتا ہے جس میں وہ زیادہ سے زیادہ مفید کردار ادا کر سکے۔ وہ ذہنی سعی و جہد کے ایضاع کی اجازت نہیں دیتا وہ عقل کے ذریعے سے ایسے مسائل کے متعلق اٹکل سے رائے قائم کرنے کے خلاف ہے جو انسان کی قوت ادراک سے ماوراہیں، ان معاملات میں اسلام اتنی اصولی رہنمائی دیتا ہے جس قدر انسان کے تجسّس کے رجحان کی تشنگی دور کرنے کے لیے کفایت کرتی ہو۔ اس رہنمائی سے عقل انسانی معطل نہیں ہو جاتی بلکہ اس کو سوچنے اور غور و تدبر کرنے کے لیے ایک سمت Direction مل جاتی ہے۔ اس لیے قرآن میں متعدد بار افلا تعقلون افلا یتدبرون ، افلا تذکرون جیسے جملے دہرائے گئے ہیں۔ عقل کے استعمال کے لیے انسان کو جتنی صلاحیتیں اور جس قدر قواء دیئے گئے ہیں ان کے عدم استعمال کو اللہ تعالیٰ نے بہت ناپسند فرمایا ہے اور ایسے لوگوں کو حیوانات سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸:۲۲)

ترجمہ: یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے اور گونگے ہو گئے، جو کچھ سمجھتے نہیں۔

عقل پرست اس کے مقابلے میں ہر اس حقیقت کے وجود سے انکار کرتے ہیں یا اس کو نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی عقل وحسیات کی گرفت میں نہ آسکتی ہو،

اس موضوع پر بالوضاحت گفتگو وحی کے عنوان کے تحت ہو گی۔

آپ سارا قرآن پڑھ جایئے جو اسلام کو پیش کرنے اور اس کو برپا کرنے کی نہایت مشقت جدوجہد کے دوران نازل ہوا۔ اس طرح حضور کی احادیث کا ایک بہت بڑا پر ذخیرہ موجود ہے جو قرآن کی تبیین اور مذکورہ دور میں مسلمانوں کی رہنمائی پر مشتمل ہے۔ لیکن آپ ان دونوں ماخذ دین وشریعت میں کبھی بھی مسلمانوں اور مخاطبین کو جذبات کی رو میں بہانے کی کوشش کی نشاندہی نہ کر سکیں گے۔ ہر معاملے میں عقل و خرد انسان کے اخلاقی حسن اور فطری رجحان خیر کو بروئے کار لانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہمیشہ ہر بات انتہائی فکر انگیز انداز اور سنجیدگی سے کہی گئی ہے۔ خواص وعوام کو تفکر وتدبر کی تلقین کی گئی ہے۔ امی اور اکھڑ افراد پر مشتمل معاشرے کے سامنے جو اسلام کا مخاطب اول تھا، اصول و نظریات پیش کیے گئے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی گئی۔

حضور کی حیات طیبہ کا نبوی دور اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد میں صرف ہوا۔ ادوار قدیم سے لے کر آج کل کے نام نہاد ترقی یافتہ دور تک کوئی ایک انقلابی تحریک ایسی نہیں ملتی جس کے مقاصد کے حصول کے لیے عوام کے جذبات سے نہ کھیلا گیا ہو۔ خامیوں کو چھپانے اور بے بنیاد سبز باغ دکھانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ تحریکوں اور انقلابی سرگرمیوں کی عمارت نفرت وحقارت کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم مثال کے طور پر مارکسی اشتمالیت (Marxist Communism) کے متعلق آئندہ بیان کریں گے۔ (ہم ان حقائق کو حضور کے اسوۂ حسنہ سے متعلق باب میں اور مختلف غیر اسلامی تحریکوں پر تبصرے کے ضمن میں پیش کریں گے) موجودہ گفتگو کی نسبت سے ہم قاری کی توجہ غزوہ بدر سے متعلق اس مشاورت کے تاریخی واقعات کی طرف دلاتے ہیں جو کتب احادیث میں صراحت کے ساتھ درج ہیں اور پھر قرآنی آیات (۳:۱۳)(۳:۱۲۳) کا حوالہ دیتے ہیں کہ قرآن نے کس سنجیدگی سے اس نہایت ہی اہم غزوہ پر تبصرہ کیا ہے۔ بدر کے بعد غزوہ احد کا معرکہ پیش آیا۔ اس کی جنگی حکمت عملی (Strategy) طے کرنے کے لیے بھی حضور نے مجلس مشاورت

منعقد کی اور جذبات کو قطعاً نہیں بھڑکایا، بلکہ اس مجلس میں مختلف متبادل تدابیر (Alternatives) حقیقت پسندانہ اظہار رائے ہوا۔ قرآن کی اس غزوہ پر آیات (۳:۱۲۴)(۳:۱۲۹-۱۵۲)(۳:۱۵۵-۳:۱۶۱-۳۷۵) بتاتی ہیں کہ قرآن نے جذباتی گفتگو کرنے کے بجائے کس طرح مضبوط اور کمزور دونوں طرح کے مسلمانوں پر تبصرہ کیا۔ اور اس انداز کا تبصرہ اس جماعت کے ارکان برداشت کر سکتے ہیں جو تدبر و دانش مندی کے زیور سے آراستہ ہوں۔

یہاں ہم ان دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ بہت سی مزید مثالیں اپنے مقام پر بالوضاحت بیان کی جائیں گی۔

انسانی تفکر و تعقل کی صلاحیتوں کا کام میں لانے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ انقلاب اسلام کی تحریک کبھی بھی رسول اللہ کے قابو سے باہر نہیں ہوئی۔ ہر موقع پر احکام و خشیت الٰہی کے تقاضوں اور حضور کی ہدایات کو ملحوظ رکھا گیا۔ مختلف تاریخی زمانوں اور دور حاضر میں جب کہ نشر و افکار اور قیادت کے مطمع نظر کو واضح کرنے کے لیے بہت ہی موثر ذرائع مہیا ہیں، کوئی انقلابی تحریک بھی پوری طرح قائدین کے قابو میں نہیں رہتی۔ انتہا پسند عناصر کارروائیوں اور ظلم و ستم پر مبنی حرکات سے باز نہیں رکھے جا سکتے۔ اور یہ سب کچھ ان تمدنوں کے زیر سایہ ظہور پذیر ہوتا ہے جو عقلیت پرست ہیں۔ انقلاب فرانس کے لیے روسو اور دوسرے متعدد دوار دانش وروں نے فکری غذا مہیا کی لیکن جب ملوکیت کا تختہ الٹ دیا گیا تو زمام تحریک عوامی اژدہام کے قبضے میں آگئی۔ قیادت بے بس ہی نہیں ناپید ہو گئی۔ قتل و غارت گری کا دور دورہ رہا۔ حتیٰ کہ ملوکیت کی جگہ فوجی آمریت نے لے لی۔ جس کے نتیجے میں نظام اجتماعی اور پیش کردہ افکار میں کوئی تعلق نہ پیدا ہو سکا۔ دوسری انتہا پر ہندوستان کے موہن داس کرمچند گاندھی کی مثال ہے جس کا اعلان کردہ اوڑھنا بچھونا عدم تشدد کا نظریہ تھا لیکن اس نے ۱۹۳۱ء میں احتیاط سے تیاری کر کے شروع کی ہوئی ایک تحریک اس لیے واپس لے لی کہ اس کی دور اندیشی نے چوراچوری کے مقام پر ایک پر تشدد واقعہ سے یہ بھانپ لیا کہ تحریک اس کے قبضے سے نکل جائے گی۔ یہ صورت حالات اس سہولت کے باوجود رونما ہوئی جب کہ گاندھی کے زیر اثر نہایت وسیع ذرائع نشر و اشاعت تھے۔ اور وہ ایک طویل عرصہ سے اپنے نظریہ عدم تشدد کو علمی اور عملی دونوں سطحوں پر پیش کر رہا تھا اور اس کے فکر میں یہی وہ سب سے نمایاں اصول تھا جس کی وجہ سے اس کی قوم نے اس کو مہاتما قرار دیا۔ اس کے بعد تقسیم ہندوستان کے موقع پر بھی گاندھی کی ایک نہ چلی اور اس کی قوم نے مسلمانوں کے خون سے جی بھر کر ہولی کھیلی۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ عقل و خرد کے عدم استعمال کا نتیجہ ہے۔ لیکن جس دین کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نظام فکر سے عقل کو خارج قرار دیتا ہے اس میں عقل و دانش کو اس قدر دخل حاصل ہے کہ فتح مکہ جیسا فیصلہ کن واقعہ خون بہائے بغیر رونما ہوتا ہے حالانکہ مفتوحہ آبادی سے ماضی میں فاتحین کو اتنے ظلم و ستم کا ہدف بنایا تھا کہ جس کی نظیر مشکل ہی سے ملتی ہے۔

مندرجہ بالا اجمالی بحث زندگی کے عملی مسائل کے سلسلے میں عقل و ہوش کے استعمال سے متعلق تھی۔ علم و فکر کے دائرے میں بھی اسلام انسانی عقل کے کارآمد استعمال کے لیے بہت وسیع میدان فراہم کرتا ہے۔ ہم نے اس باب کے آغاز میں تخلیق آدم کے سلسلے کی گفتگو کے دوران قرآن کے حوالے دے کر اور بعض مفسرین کی تفسیروں سے اقتباسات کی بنیاد پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ قرآن بنی نوع انسان کی فضیلت کی بنیاد علم ہی کو قرار دیتا ہے اور ہمارے علماء نے بھی اس سے یہی مراد لی ہے۔ اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ حصول علم کا وسیلہ عقل انسانی ہے۔

نبی کریم نے فرمایا:

طلب العلم فریضه علی کل مسلم (ابن ماجہ بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ)

ترجمہ: حصول علم (کی کوشش) ہر مسلمان پر فرض کر دی گئی ہے۔

علم کے سلسلے میں ہم مستقل باب میں گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم عرض کر دیں کہ اسلام کے تصور علم، مادہ پرستوں کے نظریہ علم سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ ادوار ماضی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ علم و دانش کو مقاصد قبیحہ کے لیے استعمال کیا گیا لیکن دور حاضر کا مغربی تمدن اس معاملے میں انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ رات دن ان علمی مشاغل میں منہمک ہیں جن سے انسان کی تباہی اور غیر اقوام کو مغلوب کرنے اور ان کا استحصال کرنے کے مقاصد حل ہو سکیں۔ اس کے برعکس حضور نے فرمایا:

تعوذ بالله من علم لا ینفع (ابن ماجہ بروایت جابر رضی اللہ عنہ)

ترجمہ: ہم اس علم سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں جو نفع بخش نہ ہو۔

لہٰذا اسلام عقل خداداد کو انہی علمی کاوشوں پر صرف کرنے کی ترغیب دیتا ہے جو انسان کی ہدایت و فلاح کی ضامن ہوں۔ انسانی فلاح و ہدایت کے ذرائع میں سرفہرست فہم دین کی استعداد ہے، یہ استعداد اس تدبر و بصیرت سے حاصل ہوتی ہے جس کا منبع عقل انسانی ہے۔ جب انسان اپنی عقل کے استعمال میں حسب استطاعت مجاہدہ کرتا ہے تو اس کو علم دین حاصل ہوتا ہے جو تمام اصناف علم میں سرفہرست ہے۔

قرآن کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (۲۹:۶۹)

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو بھی اپنی ہدایت کے راستوں پر چلاتے ہیں۔

اس آیت میں مجاہدے، کوشش اور محنت کا تعلق علمی کاوش اور اس کے نتیجے میں عمل صالح سے ہے۔ تفسیر جلالین کے حاشے پر ایک وضاحتی نوٹ میں والدین جاهدوا فینا کا مفہوم یہ بھی لکھا ہے:

وقال الفضيل بن العياض جاهدوا فی طلب قوله لنهدينهما سبل العمل به

فضیل بن عیاض کا یہ حوالہ مولانا ثناءاللہ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔

حضور نبی کریم نے اس محنت کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کاوش میں اگر کسی مسئلے پر مسلمانوں میں علمی اختلاف بھی ہو جائے تو باعث رحمت ہو گا:

اختلاف امتی رحمتہ۔ (بیہقی) ترجمہ: میری امت میں (رائے کا) اختلاف (رحمت کا باعث) ہے۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جب لوگ علمی مشاغل میں منہمک ہوں گے تو یہ عالم اپنی عقل و فہم کے مطابق در پیش مسائل کے متعلق رائے قائم کرے گا۔ اگر اس کو فساد، مخاصمت اور مخالفت کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو یہ اجازت جہاں آزادی رائے کا باعث بنے گی وہیں اس سے تحقیق مطالعے کا شوق بڑے گا اور اگر ایک قدم آگے بڑھ کر افہام و تفہیم کے لیے ادارے قائم کر دیے جائیں تو بہت سے اختلافات ختم کر کے اتفاق رائے بھی حاصل ہو سکتا ہے جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں ہوتا تھا۔ مثلاً فتنہ ارتداد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اقدامات کے سلسلے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو اس وقت خلیفہ الرسول تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق جو ان کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے،، کے درمیان اختلاف تھا۔ لیکن مجلس مذکور میں طویل بحث مباحثے اور افہام و تفہیم کے بعد اتفاق رائے ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ اس خیال کا اظہار کیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے صائب اور درست تھی۔ یہ حدیث اختلاف کا حق دے کر عقلی و فکری جمود کے راستے مسدود کر دیتی ہے۔ اس سے جو علمی سرگرمی پیدا ہوتی ہے اس کے لیے ''اجتہاد'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اسلام میں اجتہاد کا نظریہ عظیم اہمیت کا حامل ہے۔ اصطلاح اجتہاد سے مراد کسی مسئلے کے حل کے لیے پوری قوت عقلی کو صرف کر دینا ہے۔ لیکن اس ذہنی سعی و جہد کو قرآن و سنت کے تابع رکھنا ہوتا

ہے۔ کار اجتہاد ہوائے نفس، قومی، وطنی، گروہی یا کسی عصبیت کو ذہن میں رکھ کر سرانجام دینے کی اسلام میں اجازت نہیں۔

کوئی مذہب اپنے ماننے والوں کو اس صراحت کے ساتھ وہ حق نہیں دیتا جو مسلمانوں کو اسلام نے اجتہاد کی شکل میں دیا ہے۔ جب سے مسلمانوں نے در اجتہاد منتقل کیا ہے وہ ہمہ جہتی انحطاط و زبوں حالی کا زیادہ سے زیادہ شکار ہوتے چلے گئے ہیں۔ اگرچہ ہم آئندہ مناسب موقع پر اجتہاد کے موضوع پر گفتگو کریں گے لیکن سر دست ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ دور حاضر کے حالات میں وہی اجتہاد قابل اعتبار ہو گا جو نظام اسلامی کے سائے کے نیچے کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ غیر اسلامی نظام کو چلا اور اس کے تحت اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہوں انہیں حق اجتہاد دے دیا جائے۔ ذہنی و فکری غلاموں کو ایسا حق کیسے دیا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ یہ حق انفرادی طور پر استعمال کرنا چاہیں یا غیر اسلامی اور اخلاق سوز طریقوں سے منتخب شدہ کسی مقنّنہ میں بیٹھ کر استعمال کرنا چاہیں۔

ضابطہ حیات انسان کی نوعی ضرورت

ہم نے صفحات بالا میں اسلامی نکتہ نظر سے اس دنیا میں انسان کے مقام اس کی فکر و دانش کی صلاحیتوں، زندگی گزارنے کے لیے ہدایت خداوندی کی ضرورت اور اس کے باطن میں بر و اثم کے رجحانات کی موجودگی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نوعی اعتبار سے اس مخلوق کا ہر رکن دوسرے سے کٹ کر انفرادی حیثیت سے وظیفہ حیات ادا نہیں کرتا بلکہ اس کے افراد مختلف حیثیتوں سے شعوری طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ان کے درمیان باہمی احتیاج کے رشتے بھی موجود ہیں۔ آپس میں معاملہ کرتے وقت اس کے ان گنت نفسیاتی اور متضاد قسم کے جذباتی رجحانات کا صدور ہوتا ہے لیکن یہ جذبات و رجحانات اس کی ذہنی تربیت، ماحول اور مختلف عصبیتوں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اپنی فطرت کے اعتبار سے اور اپنی نوعی خصوصیات کے نکتہ سے بنی نوع انسان میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضابطہ حیات نازل ہوتا ہے وہ بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے ایسے ماحول دیتا ہے جن کی پابندی سے وہ اپنے فطرت نوعی پر قائم اور بگاڑ اور بے راہ روی سے محفوظ رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''حجتہ اللہ البالغہ'' کی جلد اول کے ساتویں باب میں انسان کی خصوصیات نوعیہ بیان فرماتے ہیں۔ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ان خصوصیات کا

تقاضا ہے کہ انسان کو اس کی دنیوی اور اخروی فلاح کے لیے ہدایت خداوندی سے سرفراز فرمایا جائے۔ ہم اس سلسلے میں ان کی مذکور تصنیف سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

ترجمہ: انسان بھی حیوان کی ایک نوع ہے اور اس میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو دیگر حیوانات کے مشترکہ خواص ہیں۔ علاوہ اس کے انسان میں بعض ایسے خواص بھی پائے جاتے ہیں جن کو اس کا تقاضائے نوعی کہنا مناسب ہے۔ انہی خواص کی وجہ سے وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز نظر آرہا ہے۔ مثلاً نطق یعنی بولنے کی خاصیت جس کے ذریعے وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے اور اس کی بدولت اپنے تمام افکار اور خیالات دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ اسی طرح منطق کے اصول کے مطابق مقدمات کو ترتیب دے کر اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا، اپنی ذکاوت طبع اور تیز فہمی سے یونہی بغیر ترتیب مقدمات کے کسی چیز کی حقیقت کو بھانپ لینا، تجربہ اور استقراء کے ذریعے نئی نئی معلومات حاصل کرنا، بعض ایسی خوبیوں کو اپنی عقل سے دریافت کرنا جن کو حواس خمسہ کے ذریعے نہیں دریافت کیا جا سکتا مثلاً اخلاق فاضلہ وغیرہ، اختراع اور ایجاد کے قابل ہونا۔ حیوانات کی طرح فطری الہایات پر اکتفانہ کر کے امور معاش میں اعلیٰ مراتب کمال تک ترقی کرنا وغیرہ وغیرہ انسان کے خواص نوعیہ ہیں۔"

آگے چل کر شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"انسان کو اس خصوصیت کے کامل طور پر ظہور میں آنے کے لیے یہ ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی بنا پر اس کے لیے یہ انتظام فرمایا ہے کہ نوع انسانی میں بعض ایسے افراد کو جن میں کہ عالم غیب کے علوم و معارف اخذ کرنے کی استعداد ہو، منتخب فرما کر ان پر وہ علوم و معارف فائق کئے جائیں، جن سے کہ انسان کی خصوصیات نوعیہ مذکورہ بالا کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ دوسرے لوگوں کو بھی اس صراط مستقیم پر چلنے کی دعوت دیں جس کی جناب اقدس نے ان کو تعلیم دی ہے۔ ایسے افراد کو جن کا مشہور نام انبیاء ورسل ہے، ایک شریعت دی جاتی ہے جو ان علوم و معارف پر مشتمل ہوتی ہے جن کی بدولت انسان کی آخرت کی ابدی زندگی سنوارتی ہے۔ علاوہ ازیں اس شریعت میں ان کو اتفاقات کی بابت بھی ایسی جامع ومانع ہدایات دی جاتی ہیں جن کی اگر وہ پابندی کریں تو ان کی دنیاوی زندگی بھی سنور جائے"۔

اس طعنے کی نشر واشاعت پر مغرب بہت قوت صرف کر رہا ہے اور بعض مغرب کے زدہ بے خبر مسلمان بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں نے اسلامی اجتماعی نظام تصور مغربی تمدن سے مستعار لیا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں کی روح اور حیات انسانی کے لیے مغربی مادہ پرستانہ نظریات

کے مضمرات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جیسا کہ ہم موزوں مرحلہ پر بحث کریں گے۔ اگر بظاہر اسلام اور مغرب کے کسی ادارے میں مماثلت پائی ہی جائے گی تو روح کے اعتبار سے ان میں تضاد کا پایا جانا یقینی ہو گا۔ مثلاً مغرب کے جمہوری نظام میں سربراہ حکومت انتخاب کے ذریعے مقرر ہوتا ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کا سربراہ بھی رائے عامہ کے ذریعے منتخب ہوتا ہے۔ لیکن اول الذکر نظام میں حق حکمرانی نام نہاد طور پر سہی، عوام کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں حاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس اختلاف سے دونوں نظاموں میں عظیم تفاوت پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں تمدنوں میں بعد المشرقین ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے درج بالا دونوں اقتباسات سے صاف طور پر عیاں ہے کہ اسلام میں مذہب اور دنیا کی علیحدگی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ مغربی نظام تمدان کی بنیاد ہی دین کی علیحدگی پر اٹھائی گئی ہے۔

ہم اس موضوع کو بھی زیر بحث لائیں گے کہ اسلام معروف معنوں میں ''مذہب'' نہیں ہے بلکہ ''دین'' ہے جو کہ عمل کے جملہ گوشوں کو محیط ہے۔ انہوں نے اپنی یہ تصنیف اب سے اڑھائی صدی قبل تخلیق کی۔ اس وقت مسلمانان ہند سیاسی و علمی لحاظ سے شدید قسم کے انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ مسلمان اپنے تشخص ملی کے متعلق مایوسی کا شکار تھے۔ لیکن شاہ صاحب نے اس ماحول میں بھی اسلام کی عالمگیریت اور اس کے ایک ہمہ جہتی نظام فکر و عمل ہونے کے تصور کو اجاگر کیا۔ اس سلسلے میں نامساعد حالات کے پیش نظر غیر اسلامی نظریات سے کوئی مصالحانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ جہاں تک مغربی فلسفے کا تعلق ہے، شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جس دور میں اپنی تصانیف تخلیق میں اس زمانے میں مغربی فکر نے ہندوستان پر اپنا کوئی اثر مرتب نہیں کیا تھا۔ لیکن کوئی ایسا شعبہ زندگی نہیں جس کے متعلق انہوں نے اسلام کا نکتہ نظر نہ پیش کیا ہو۔ انہوں نے سیاسی و معاشی لحاظ سے مسلمانوں کے گرتے ہوئے وقار کے باوجود پورے اعتماد سے اسلام کے اجتماعی نظام کی برتری اور اس کی ابدی اناریت کا تصور پیش کیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''دین فطرت وہ دین ہے جو ہر ایک عصر میں ایک جیسا رہتا ہے، کسی قسم کا تغیر و تبدل اس میں نہیں آتا۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، اس کا تعلق فروع سے نہیں بلکہ اصول سے ہے اور اصول سب ادیان میں ایک ہیں۔ سب انبیاء کا اس پر اتفاق ہے۔ کلام پاک میں ارشاد ہے۔ ان هذه امتكم امته واحدة وانا ربكم فاعبدون

یہاں شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے منزل من اللہ ادیان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اصولی یکسانیت کے متعلق ہم قرآن وحدیث سے حوالے دے کر متعلقہ باب میں گفتگو کریں گے۔

خالق حیات ہی ضابطہ حیات دے سکتا ہے

اس مرحلے پر ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو دین مختلف ادوار، قومی وحدتوں اور علاقوں کی ضروریات کے مطابق انبیاء ورسل کے ذریعے نازل ہو رہا ہے اس کی تکمیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ضمانت فراہم کر دی۔ چنانچہ حجتہ الوداع کے موقع پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (۵:۳)

ترجمہ: آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر کامل کر دی اور تمہارے لیے پسند کر لیا کہ دین اسلام ہو۔

یہ بھی فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ(۱۵:۹)

ترجمہ: بلاشبہ خود ہم نے الذکر (یعنی قرآن کا سرتاپا نصیحت ہے) اتارا ہے اور بلاشبہ خود ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

گزشتہ منزل من اللہ ادیان کے متبعین اپنے دین کی تعلیمات کی حفاظت نہ کر سکے۔ ان میں سے اکثر کے متعلق تو کچھ علم ہی نہیں، بہت سے تحریف اور حذف واضافہ کی نذر ہو گئے۔ ان کے لانے والے رسل اور انبیاء کی طرف الوھیت کی صفات منسوب کر دی گئیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا مکمل دین دے کر مبعوث کیا گیا جو ابد تک بنی نوع انسان کے لیے موزوں ہے اور ساری انسانیت کے لیے ہے۔ سابقہ انبیاء کو اپنی اپنی قوم، علاقے یا قبیلے کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا۔

مثلاً اول الذکر کے متعلق فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ(۱۰:۵۱)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تم سے پہلے بھی پچھلے گروہوں میں پیغمبر بھیجے۔

لیکن موخرالذکر کے متعلق فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴:۸۲)

ترجمہ: ہم نے تجھ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو بجا طور پر مکمل کہا گیا ہے۔ اس کی تعلیمات اور حضور کے اسوہ حسنہ میں تمام وہ اصول و نظریات اور عملی زندگی کے قواعد و ضوابط موجود ہیں جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کی فطرت کے مطابق گزارنے کے لیے ضروری ہیں۔ انسان توہم پرستی، شرک اور اپنی ذلت سے فروتر مخلوق کی عبادت کی طرف کائنات کی تخلیق اور اس کے انجام کے متعلق صحیح معلومات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے مائل ہوتا رہا۔ وہ جب ایک محیر العقول وسعت رکھنے والی کائنات اپنے ارد گرد دیکھتا ہے تو ہدایت خداوندی کے دائرے سے باہر رہ کر اس کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ مظاہر قدرت سے مرعوب ہو کر ان میں سے بعض کی طرف الوہیت کی صفات منسوب کر دے جیسا کہ مختلف ادوار اور مختلف قوموں اور گروہوں کی تاریخ شاہد ہے اور یا وہ اس دائرے میں مکمل طور پر ہزیمت و شکست تسلیم کر لے جیسا کہ دور حاضر کے مغربی تمدن نے دہریت اور لاادریت کے مسالک اپنا کر کیا ہے۔ ان کے ذہنی دیوالیہ پن کی یہ حالت ہے کہ وہ اجرام فلکی پر تو کمندیں ڈال رہے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ جن طبعی قوانین کے تحت وہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں ان کا خالق کون ہے۔

اس اہم ترین معاملے میں قرآن نے پوری وضاحت اور محکم دلائل کے ساتھ کہا کہ انسان سمیت اس پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور وہی اس کا نظم و نسق چلا رہا ہے چنانچہ فرمایا:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ (۱۰:۳)

ترجمہ (اے لوگو!) تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا (یعنی چھ معین زمانوں میں پیدا کیا) پھر اپنے تخت حکومت پر متمکن ہو گیا۔ وہی تمام کاموں کا بندوبست کر رہا ہے۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا مناسب ہو گا کہ اس آیت میں تخلیق سماوات وارض کا تذکرہ ہے اور اس وقت ابھی ہمارے تصور کے ایام وجود میں نہیں آئے تھے۔ لہٰذا یہاں ایام سے مراد ادوار اور زمانے ہی ہو سکتے ہیں جن کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ یہاں کائنات کے تدریجی ارتقاء اور نشو و نما کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

پھر فرمایا

قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۱۰:۴۳)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہو یہ اللہ ہی ہے جو (نیست سے) تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اسے دہرائے گا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳:۶۱)

ترجمہ: اس نے آسمان و زمین مصلحت کے تحت پیدا کئے۔ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں اس سے وہ بلند و بالا ہے۔

قرآن و حدیث میں اس موضوع پر بہت سا مواد موجود ہے جس کے ذریعے انفس و آفاق سے شہادتیں پیش کر کے اللہ تعالیٰ کے خالق و بدیع کائنات اور اس کے مدیر و منتظم ہونے پر دلائل قائم کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو توحید کے عنوان کے تحت ہو گی۔ یہاں موقع کی مناسبت سے ہم نے تین آیات پر اکتفا کیا ہے۔ اس مرحلے پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے متعلق اسلام نے واضح موقف اختیار کیا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے حل کی طرف انسان ہمیشہ ہی متوجہ رہا ہے لیکن اس سلسلے میں صرف وحی ہی نے عقدہ کشائی کی ہے۔

درج بالا تین آیات سے مسئلہ توحید کے متعدد پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اولاً یہ کہ آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

ثانیاً ان کی تخلیق چھ مراحل میں کی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں بجا طور پر ستہ ایام سے چھ معین زمانے مراد لیا ہے۔ یہ کوشش بے سود ہے کہ لفظ یوم سے وقت کے میعاد و مقدار کا تعین کیا جائے۔ اللہ زمان و مکان کا خالق ہے اور ان کا تعلق ہمارے حواس سے ہے۔ اللہ ان کا پابند نہیں۔ ہمارے معیار زمان و مکان کے اعتبار سے وہ کوئی کام دنوں کے حساب سے بھی کر سکتا ہے اور لمحہ البصر میں بھی یا اس سے بھی جلدی کر سکتا ہے۔

ثالثاً اللہ تعالیٰ اس کائنات کی تخلیق کے بعد اس سے غیر متعلق نہیں ہو گیا بلکہ وہ مسند حکمرانی پر جلوہ افروز ہے اور اس کا انتظام و انصرام اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یدبر الامر کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس کارخانہ قدرت میں حکمت الٰہی جاری و ساری ہے۔

رابعاً اس نے تمام مخلوق کو نیست سے ہست کیا ہے۔ اس کی ذات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور جو کچھ ہے وہی اس کو وجود میں لایا۔

خاساً وہ اپنی تخلیقات کو اس کی موجودہ حالت وجود سے محروم کر کے دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور اس طرح عالم آخرت برپا ہوگا۔

سادساً آسمان وزمین کا یہ سارا سلسلہ خیر کی بنیاد پر خلق کیا گیا ہے۔ یہ بے مقصد نہیں بنایا گیا۔

سابعاً ان سب باتوں سے اس کی توحید کی نشاندہی ہوتی ہے اور عقل سلیم اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں اور اس کا مقام و مرتبہ اس سے مبرا ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو۔

سطور بالا میں کی گئی گفتگو کے بعد اس نظریے کے بطلان کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ انسان کے اندر عصبیت کی شدت، جذبات کی رو میں بہہ جانے کی عادت، عقل و خرد کی محدودیت اور اختلافات کی بھرمار کے پیش نظر اس کی زندگی گزارنے کے لیے اصولی رہنمائی بھی خالق کائنات ہی کی طرف سے ملنی چاہیے۔ اس کے مدبر کائنات ہونے کی حیثیت کو تسلیم کرنے کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ انسان اسی کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل پیرا ہو۔

یہ ہدایت چونکہ اصولی ہے اس لیے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انسان کے پاس اپنے قوائے ذہنی و عملی کو استعمال کرنے کے لیے ایک وسیع میدان موجود ہے۔

یہ ہدایت حیات انسانی کے لیے مکمل ضابطہ فراہم کرتی ہے۔

ہم نے اس سے قبل آیت (۵:۳) کا حوالہ دے کر یہ تحریر کیا تھا کہ حجتہ الوداع کے موقع پر تکمیل دین کا اعلان کر دیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس دین کی تکمیل کے لیے مژدہ سنایا گیا کیا وہ بنی نوع انسانی کی فکری و عملی ضروریات کے لیے بھی مکمل اصولی ہدایات فراہم کرتا ہے۔ ایک چیز مکمل ہو سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جس مقصد کے لیے تعمیر کی گئی ہے اس کی مقتضیات کو پورا کر سکے۔ اس میں نقائص رہ سکتے ہیں۔ اس کا کوئی پہلو تشنہ تکمیل رہ سکتا ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کے بعض اجزا ناکارہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ بعض حالات کے تغیر و تبدل کے نتیجے میں از کار رفتہ ہو جاتے ہیں اس کے برعکس بنی نوع انسان کی حیات انفرادی و اجتماعی کی تنظیم اور اسے مستحسن خطوط پر استوار کرنے کے لیے ایک ضابطہ فکر و عمل کی ضرورت ہے جو فطرت انسانی سے مطابقت رکھتا ہو۔ مارکس اور ہیگل کے نظریات کے برعکس انسانی معاشرے کے عمل اور فکر کے دائرے میں اس قسم کے ضابطے کے اندر سے تضادات کے ابھرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تضادات وہاں نمودار ہوتے ہیں جہاں عدم توازن ہو، ایک طبقہ دوسرے طبقے کے حقوق غصب کرے، سیاست کی بنیاد استبداد پر اور معیشت کی بنیاد استحصال پر ہو۔ اس کے فکر کی اساس ظن و تخمین پر ہو نہ کہ مبنی بر حقیقت۔

ہم نے مثال کے طور پر جن وہ مغربی مفکروں کا سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے ان کے پیش نظر غیر متوازن اور عدل ناشاس فکری نظام اور معاشرے رہے ہیں۔ ان کے اندر سے ابھرنے والے تضادات پر تو انہوں نے اپنے جدلی (Dialectical) نظریے تعمیر کر لیے اور ان کو انسانی تاریخ کے سفر کا ایک ناقابل تغیر اور مستقل اصول قرار دے دیا لیکن یہ نہیں سوچا کہ مارکس کا مادی شعبہ زندگی میں جدلی نظریہ اور ہیگل کا فکری دائرے میں ایسا ہی نظریہ ایسے بنیادی مواد (Data) کی روشنی میں اخذ کیا گیا ہے جو غیر متوازن نظاموں کے حالات سے مرتب کیا گیا تھا۔ ہیگل کا نظریہ تو اس کی نگاہ میں ابدی تسلسل کا حامل تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق انسانی فکر سے تھا لیکن مارکس کی کوتاہ نظری بھی ملاحظہ ہو کہ اس نے اپنے پیش کردہ اشتمالی (Communist) نظام حیات کے نفاذ کے ساتھ اپنے جدلی نظریے کے اختتام و تکمیل کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ اس کے ضابطہ اجتماعی سے کوئی تضاد پر عامل نہیں ابھرا بلکہ وہ از خود ابتدائی مراحل ہی میں زمین پر بوس ہو گیا اور نہایت ذلت آمیز رجعت قہقری کے ذریعے اب وہ اس سرمایہ دارانہ نظام کے سائے تلے پناہ تلاش کر رہا ہے جس کی قطعی موت کے بعد مارکس کی رائے میں اس نظام (اشتمالیت) نے ابدی بہاروں۔ ہمکنار ہونا تھا۔

ہم نے فکر اور معیشت کی سطح پر پیش کئے گئے ان دو نظریات کا تعریضاً تذکرہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ ایک صدی کے دوران مغرب میں ان کا بہت چرچا رہا ہے اور بعض بے خبر لوگ اسے اسلام پر بھی منطبق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں جب کوئی نظام بھی ابدی افادیت اور وجود قائم نہیں رکھ سکتا تو اسلام اس سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ مفصل گفتگو تو موزوں موقعہ پر ہو گی ہم یہاں اسلام کے متعلق اپنا دعویٰ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دین واقعی ان خرافاتی نظریات کے اطلاق سے مستثنیٰ ہے۔ اور اس کا دعویٰ آج سے چودہ سو برس قبل کیا گیا۔ ہم اس دعوے کی تائید میں دوبارہ اپنے الفاظ کو دہراتے ہیں کہ نہ اسلام میں کوئی طبقہ دوسرے طبقے کے حقوق غصب کر سکتا ہے۔ نہ یہ سیاست کی عمارت استبداد کی بنیاد پر اور معیشت کا نظام استحصال کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے فکر کی عمارت ظن و تخمین پر نہیں بلکہ وحی کی محکم اساس پر اٹھائی گئی ہے۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ارضی زندگی کے تفویض شدہ اختیارات کے تحت انسان اس نظام سے وابستگی اختیار کرے تو اس کے اندر سے فکر کے شعبے میں اور نہ -اور نہ سیاست و معیشت کے دائروں میں کسی قسم کے تضادات سر اٹھا سکتے ہیں۔ ہاں اگر اس کو اپنایا تو نہ جائے لیکن اس کے ساتھ محض زبانی عقیدت کا اظہار کیا جائے تو اسلام کے سلسلے میں یہ ساری بخشیں کار عبث کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہم یہاں عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام نوع انسان کی حیات انفرادی واجتماعی کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

چنانچہ قرآن کہتا ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ(٦:٨٣)

ترجمہ: ہم نے نوشتہ میں کوئی بات بھی فروگزاشت نہیں کی۔

اس سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے انسان کو مکمل ہدایت فراہم کی ہے۔ کسی ایسی بات کو نظرانداز نہیں کیا گیا جس کی انسان کو احسن طریق پر زندگی گزارنے کے لیے ضرورت ہو۔

اگر آپ غور و تفکر سے مروجہ تصور مذہب، فلسفے اور سائنس کے ذریعے زیر بحث آنے والے بنیادی موضوعات کی نشاندہی کریں تو بحیثیت مجموعی درج ذیل پانچ مسائل ابھر کر آپ کے سامنے آئیں گے۔

اولاً: خالق کی تخلیق اور اس کا انجام

ثانیاً: خالق کائنات اور انسان کا تعلق

ثالثاً: انسان کی تخلیق اور اس کا انجام

رابعاً: انسان کی فطرت کے مطابق اس کی انفرادی سیرت کے نشوونما سے متعلق نظریات اور لائحہ عمل۔

خامساً: نوع انسانی کی اجتماعی زندگی کے متعلق موزوں ضابطہ

ان مسائل کے سلسلے میں ہر مذہب صرف پوجا پاٹ کے ذریعے مزعومہ طور پر اپنے اپنے تصور کے مطابق فرد کی باطنی ترقی کا اہتمام کرتا ہے بیشتر مذاہب کا رجحان یہ ہے کہ اس دنیا کے جھنجھٹوں سے الگ ہو کر رہبانیت اختیار کر کے ہی انسان روحانی نشوونما حاصل کر سکتا ہے کوئی مذہب یہ پرچار کرتا ہے کہ روح انسانی کی فلاح اس جسم کے مادی چکر سے آزادی حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ کسی نے یہ نظریہ پیش کر رکھا ہے کہ انسان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ان کے رہبر اعلیٰ نے قربانی دے کر ان کی اخروی فلاح کی ضمانت فراہم کر دی ہے۔ ہر مذہب کسی نہ کسی شکل میں اپنے آپ سے کسی نہ کسی بالاتر ہستیوں یا عقیدہ رکھتا ہے جو انسان کو زندگی بخشے اور اس کے مختلف شعبوں کے انتظام وانصرام میں اسے الگ الگ دائروں میں تقسیم کر کے منہمک ہیں۔ بعض ایسی ہستیوں کو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کی شکل میں اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں ایسے بھی ہیں جو

وہمی طور پر مختلف نام وضع کر کے اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں سے ہر ایک کے سلسلے میں کسی نہ کسی الہ کو مختار کل تصور کرتے ہیں۔ایسے مذاہب بھی ہیں جو اپنے فروتر مخلوق، مثلاً شجرہ حجر کو اپنی حاجات کو پورا کرنے کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

ہر مذہب کے پیرو اسے کسی نہ کسی بالاتر ہستی کی طرف سے منزل شدہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔- لیکن کسی کے پاس اپنی کتب منزلہ کی تاریخ موجود ہے اور نہ وہ ان کتب کے لانے والے کی زندگی کے حالات و زمانہ کا تعین کے ساتھ علم رکھتے ہیں۔یہ کتب بارہا محرف ہوئیں اور ان میں بڑے پیمانے پر حذف واضافے ہوتے رہے۔اکثر بیشتر مذاہب کے پیروان نے اپنی مذہبی پیشواؤں ہی کی طرف خصوصیات الوہیت منسوب کر رکھی ہیں۔ جیسا کہ ہم ''پس منظر'' کے باب میں عرض کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ نہیں ہے کہ یہ مذاہب ابتدا انہی تعلیمات کے ساتھ اپنے اپنے مخالفین کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔بلکہ سانحہ یہ ہوا کہ امتداد زمانہ سے نہ ان مذاہب کے پیش کرنے والوں کی زندگیوں کے حالات محفوظ رہ سکے اور نہ ان کی تعلیمات اپنی اصل روح برقرار رکھ سکیں۔مثلاً توحید کے متعلق قرآن اس صورت حال کو یوں واضح کرتا ہے:

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ(۱۰:۶۶)

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کے سوا(اپنی طرف سے بنائے ہوئے) شریکوں کو پکارتے ہیں وہ محض اپنے وہم وگمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

پھر فرمایا:

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۚ۱۹۱ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ(۷۱۹:۱۔۲۱۹)

ترجمہ: کیا ایسے لوگوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور خود کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔اور نہ ان کی وہ مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنے آپ کی۔

قرآن میں توحید کے اثبات اور شرک کے بطلان کے متعلق بہت سا مواد موجود ہے۔ تفصیلی گفتگو توحید کے عنوان کے تحت ہو گی۔ یہاں ہم نے دو حوالوں پر اکتفا کیا ہے۔قرآن کہتا ہے خالق کائنات اور اس کارخانہ ہستی کے انتظام وانصرام کے متعلق ان کے تصورات اٹکل اور ظن پر مبنی ہیں اور ان کی کوئی محکم اساس نہیں۔

الہ العالمین کی صفات کے صحیح تصور سے محروم ہونے کی وجہ سے دین اسلام کے سوا تمام مذاہب (ہم دین اور مذہب کے فرق کے متعلق بھی گفتگو کریں گے) کے پیروؤں نے مذہب اور حیات دنیوی کی تفریق کو عقیدۃً اور عملاً تسلیم کر رکھا ہے۔

سطور بالا میں کی گئی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب خالق اور تحقیقی کائنات سے متعلق نظریات ہی مضبوط اساسات پر مبنی نہ ہوں تو ہم نے جن پانچ مسائل کا تذکرہ کیا تھا ان سے پہلے تین کے متعلق تو سرے سے کوئی واضح تصور قائم ہی نہیں ہو سکا۔ چوتھے مسئلے کے متعلق چونکہ مذاہب عالم کا مروجہ تصور انسان کی انفرادی نشوونما کو ترک دنیا سے منسلک کرتا ہے اس لیے تعمیر سیرت و کردار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا تعلق تو اجتماعی زندگی میں فرد کے طرز عمل سے ہے۔ جہاں تک پانچویں مسئلے کا تعلق ہے وہ مذہب کے مذکورہ تصور کے تحت زیر بحث ہی نہیں آتا۔ اس کو دنیاداری قرار دے کر مذہب کے دائرے سے خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔

فلسفہ عقل و خرد اور منطق و استدلال کے ذریعے کائنات کے وجود کے سلسلے کے اسرار و رموز دریافت کرنا چاہتا ہے اور ادراک حقیقت کے لیے کوشاں ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جس میں تسلسل عنقا ہے۔ یہ یقینیات سے بالکل مبرا ہے۔ ہر فلسفی اپنی ہی ہانکتا ہے۔ آج تک کسی فلسفی کے افکار کی بنیاد پر کوئی نظام فکر و عمل تشکیل نہ پا سکا۔ فلسفیوں کی موشگافیاں کتابوں کی زینت تو بنی رہیں لیکن قوموں اور تمدنوں کے عروج و زوال میں ان کا کبھی کوئی حصہ نہیں رہا۔

رواں صدی کا مشہور انگریزی ماہر منطق و فلسفہ برٹرینڈ رسل جس نے تقریباً ایک سو سال (۱۸۷۲ سے ۱۹۷۰) عمر پائی اور چالیس کتابوں کا مصنف تھا، ادراک حقیقت کی معمولی سی جھلک سے بھی محروم رہا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں اس کے متعلق آرٹیکل لکھنے والا اس کی سوانح کو (Skeptical Atheist) (مشکک و ہریا) کے الفاظ سے ختم کرتا ہے۔ گویا یہ اتنا بڑا فلاسفر اتنی طویل عمر جو ساری کی ساری علمی مشاغل میں گزری اور جس نے نوبل پرائز بھی حاصل کیا منکر خدا بھی تھا اور شک و ریب میں بھی مبتلا تھا۔ وہ ان مسائل کے متعلق جن کی طرف غور و تدبیر کرنے والے شخص کا ذہن جاتا ہے، کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ وہ منکر خدا (Atheist) بھی رہا اور کبھی کیفیت تذبذب میں لاادریت (Agnostic) یا تشکیک (Skepticism) کا شکار ہو جاتا تھا۔

رسل اپنی مشہور عالم کتاب ''مغربی فلسفے کی تاریخ'' (History of Western Philosophy) میں وہ سوالات گنواتا ہے جن پر فلسفیوں کی جولانگاہ مشتمل ہے۔ وہ کتاب کے تعارف کے آغاز ہی میں لکھتا ہے:

"Is the world divided into mind and matter, and, if so, what is mind and what is matter? Is mind subject to matter, or is it possessed of independent powers? Has the universe any unity or purpose? Is it evolving towards some goal? Are there really laws of nature, or do we believe in them only because of our innate love of order? Is man what he seems to the astronomer, a tiny lump of impure carbon and water impotently crawling on a small and unimportant planet? Or is he what he appears to Hamlet? Is he perhaps both at once? Is he there a way of living that is noble and another that is base, or all ways of living merely futile. If there is a way of living that is noble, in what does it consist, and how shall we achieve it? Must the good be eternal in order to deserve to be valued, or is it worth seeking even if the universe is inexorably moving towards death? Is there such a thing as wisdom, or is what seems such merely the ultimate refinement of folly? To such questions no answers can be found in the laboratory. Theologies have professed to give answers all too definite, but their very definiteness causes modern minds to view them with suspicion. The studying of these questions, if not the answering of them, is the business of philosophy ."

ترجمہ: ''کیا کائنات استعداد و شعور و تعقل اور مادے (کے دو الگ الگ شعبوں) میں تقسیم ہے، اور اگر ایسا ہی ہے، تو استعداد و تعقل کیا ہے اور مادہ کیا ہے؟ کیا استعداد شعور و تعقل مادے کے تابع ہے یا آزاد حیثیت رکھتی ہے؟ کیا کائنات اکائی ہے یا کوئی مقصد رکھتی ہے؟ کیا یہ کسی منزل کی طرف ارتقا پذیر ہے؟ کیا قدرت کے حقیقتاً کوئی قوانین ہیں یا ہم نظم کی اپنی اندرونی وجہ سے ان کے معتقد ہیں؟ کیا ایسا ہی ہے جیسا کہ اسے ماہر فلکیات سمجھتا ہے یعنی کاربن اور پانی پر مشتمل ایک چھوٹا سا ٹا خالص ڈھیلا جو ایک چھوٹے سے غیر اہم سیارے پر رینگ رہا ہے اور وہ ایسا ہے جیسا کہ وہ ہملٹ کو دکھائی دیتا ہے؟ یا وہ غالباً بیک وقت دونوں ہی حیثیتیں رکھتا ہے؟ کیا کوئی

ایسا انداز حیات ہے جو اعلیٰ وارفع ہے اور دوسرا گھٹیا ہے یا زندگی کے تمام طرز بے مقصد ہیں؟ اگر کوئی ایسا طرز زندگی ہے جو اعلیٰ وارفع ہے تو یہ کیسا ہے اور ہم اس کو کیسے حاصل کریں؟ کیا قابل قدر ہونے کے لیے بھلائی ابدی سچائی کی حامل ہونی چاہیے یا اس کی تلاش فائدہ مند ہے چاہے یہ کائنات رکاوٹ کے بغیر خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہو؟ کیا عقل کوئی حقیقت رکھتی ہے یا جو کچھ یہ دکھائی دیتی ہے وہ حماقت کی اصلاح ترین شکل ہے؟ ان سوالات کا جواب (سائنس کی) تجربہ گاہ میں نہیں پایا جاسکتا۔ مذہبیات نے تعین کے ساتھ ان کے جوابات دینے کا دعویٰ کیا ہے، لیکن ان کا یہ یقین موجودہ ذہن کو انہیں شک کی نگاہ سے دیکھنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ان سوالات کا مطالعہ کرنا فلسفے کا کام ہے اگرچہ اس پر ان کا جواب دینے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی"۔

ہم نے جو طویل اقتباس دیا ہے کہ اس میں ایک فلسفی، جس نے فلسفے کی تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے، یہ تسلیم کرتا ہے کہ فلسفی ان سوالات پر غور تو کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کا جواب دے سکیں۔ یہ مابعد الطبیعاتی مسائل اور زندگی کی حقیقت کو عقل و خرد کے ذریعے معلوم کرنے کی عدم استعداد کا اعتراف ہے۔ اس لیے فلسفہ اس دائرے میں کوئی پیش رفت نہیں کر سکا۔ وہ آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں آج سے ہزاروں سال قبل کھڑا تھا۔ (ہم اس موضوع پر مزید گفتگو وحی اور اسلامی نظریات کے مختلف عنوانات کے تحت ان کی مناسبت کے لحاظ سے کریں گے)۔

رسل کے تمام سوالات ان پانچ موضوعات میں شامل ہیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ البتہ اس نے ان میں سے بعض سوالات ایسے انداز میں کیے ہیں جس میں اس کے مادہ پرستانہ نظریہ کی جھلک موجود ہے۔

وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ سب سوالات سائنس کے دائرہ میں شامل نہیں اور کسی لیبارٹری میں انہیں حل نہیں کیا جاسکہ اس کا یہ کہنا کافی حد تک درست ہے کیونکہ ان کا تعلق صرف مشاہدے اور تجربے سے نہیں جس کی سائنس محتاج ہے۔ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ہے کہ وہ ان طبعی قوانین کا تجربات اور مشاہدات کے ذریعے انکشاف کرے جو اس دنیا میں جاری و ساری ہیں۔ اسی سعی و عمل کے نتیجے میں اختراعات و ایجادات کا وہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے جو ہمیشہ سے انسانی زندگی کے عمل مظاہر کا حصہ رہے ہیں۔

البتہ دور حاضر میں مغربی تمدن نے اس دائرہ علم میں بہت ترقی کی ہے، بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ یہی شعبہ علم ہے جس پر اس تمدن نے سب اصناف علوم سے زیادہ توجہ دی ہے، اسی کے ذریعے اس نے عالمی سطح پر تفوق و غلبہ حاصل کیا۔

ہم نے سطور بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ سائنس انسانی زندگی اور اس کائنات سے متعلق بہت سے سوالات کے جوابات فراہم کرنے سے قاصر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ علم زندگی کے مسائل سے غیر متعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی تمدن میں کوئی صنف علم بھی زندگی کی سرحدوں پر تماشائیوں کی حیثیت سے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ وہ اجتماعی زندگی کے فکر و عمل ہر دو کو اپنی وسعت و اہمیت کے مطابق متاثر کرتا ہے۔ طبعی شعبے میں تحقیق و مشاہدے کے نتائج نے مغربی حیات اجتماعی میں ایک انقلاب کا برپا کر دیا اور سیاسی و معاشی ڈھانچوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تغیرات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ ان کے اندر اتنی قوت تھی کہ حیات انسانی کے متعلق فکر ان سے ہم آہنگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان تغیرات کو سرفہرست رکھا گیا۔ داخلی طور پر سرمایہ دار اور صنعت کار طبقات نے محنت کش کا بری طرح استحصال شروع کیا اور اپنی مصنوعات کو کھپانے کے لیے اپنی تیکنیکی برتری کے سہارے مشرقی اقوام کو اپنے زیر نگین کرنے کے لیے ایک ایسے استعماری دور کا آغاز کیا جو تاریخ عالم میں سیاہ ترین زمانہ شمار کیا جائے گا۔ ویسے اس کے باقیات ابھی تک موجود ہیں۔

انسان کا کوئی عمل نیت اور فکر سے یکسر لاتعلق نہیں سکتا۔ چنانچہ اس سرمایہ دارنہ اور صنعتی تمدن نے اس حد تک اور اسی نوعیت فکر پروان چڑھایا جس کی اسے اپنے اغراض مقاصد کے لیے ضرورت تھی۔ اور اس فکر بحیثیت مجموعی مادہ پرستی (Materialism) لادینیت (Secularism) کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ اس دائرے میں وہ سوالات آتے ہی نہیں جن کا برٹرینڈ رسل نے ذکر ہے، نہ ان کے فکر کے کسی جزو کو دوام حاصل ہے۔ وہ ہر اصول اپنی اخلاق ناشناس ضرورتوں کے تحت اختراع کر کے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اس کائنات میں جاری و ساری حقیقتوں سے ان کا کیا تعلق سکتا ہے۔ چنانچہ اس شعبے کے لیے انہوں نے دہریت (Atheism) لاادریت (Agnosticism) جیسے افکار کو رواج دینا ہی مناسب سمجھا اور انفرادی اجتماعی زندگیوں کو اخلاقی اقدار سے یکسر آزاد کر لیا۔ لیکن اس تمدن کے مظاہرے کے برعکس اسلام کے اصول محکم، ابدی افادیت کے حامل اور عدل پر مبنی ہیں اور وہ اس لیے کہ حالات کے سارے تغیرات کے علی الرغم انسان کی فطرت غیر متبدل ہے۔

فکر انسانی جن مسائل کے محور پر گھومتا ہے، ہم نے اس کے سلسلے میں پانچ نکات بیان ہیں۔ اسی طرح ہم نے برٹرینڈ رسل کا جو اقتباس دیا ہے اس میں بھی متعدد سوالات موجود ہیں جو انسانی زندگی کی ماہیت دریافت کرنے سے متعلق ہیں۔ اس کی تحریر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں ان کا جواب مذہب دیتا ہے وہ

قابل قبول نہیں کیونکہ اس میں دلیل اور عقل و خرد کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ فلسفی صرف ان سوالات کو موضوع تفکر بناتا ہے لیکن جواب نہیں دے سکتا۔ سائنس کے متعلق اس کا یہ خیال ہے کہ یہ معاملات اس کے دائرہ تحقیق سے خارج ہیں۔

چنانچہ وہ نہ خود اپنے اٹھائے ہوئے سوالات کا کوئی حل پیش کرتا ہے اور نہ کس شعبہ علم و عقیدہ کی نشاندہی کرتا ہے جو ایسا کر سکے۔ وہ صرف یہ کہتا کہ تاریخ کا واقعات کی روانی کے دوران فلسفہ حالات کو اور حالات فلسفے کو متاثر کرتے رہے ہیں۔

"The circumstances of men's lives do much to determine their philosophy, but, conversely, their philosophy does much to determine their circumstances.

ترجمہ: ''انسانوں کی زندگیوں کے حالات ان کے فلسفے کا تعین کرنے میں خاصا کردار ادا کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس ان کا فلسفہ ان کے حالات کو استوار کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے''۔

اس سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ ان سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ حالات کے مطابق اصول اور ان سوالات کے جوابات تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کائنات اور فطرت انسانی سے متعلق ایک سوال کے مختلف جوابات نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا رسل کا نکتہ محکم اساس پر مبنی نہیں بلکہ اگر اس کو بے بنیاد اور حقائق سے فرار کیا جائے تو زیادہ موزوں ہو گا۔

ہم نے یہاں مغربی فکر سے متعلق اکابرین میں سے ان کے ایک نمائندے کے انداز فکر کی مثال دی ہے۔ اپنی علمی ترقی پر ناز کرنے والے یہ مفکرین و فلاسفہ ایسے تمدن سے وابستہ اور اس کے داعی ہیں جس کی کوئی مضبوط فکری اساس موجود نہیں۔ اور انہوں نے دہریت اور لاادریت کے منفی نظریات میں پناہ لے رکھی ہے۔

ہم اس موضوع پر مغربی تہذیب کے زیر عنوان گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم دور حاضر میں اسلامی فکر کے ترجمان اور مغربی تمدن کے حقیقت شناس علامہ اقبال کے ایک شعر پر اکتفا کرتے ہیں:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

(بانگ درا صفحہ: ۳۱۳)

ہم عرض کر چکے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ فکر و عمل ہے۔ لہٰذا وہ ان تمام مسائل و سوالات کی عقدہ کشائی کرتا اور جوابات فراہم کرتا ہے۔ انسان کا ذہن اور اس کی متجسانہ فطرت اپنے باطن اور خارج کی

دنیاؤں کے متعلق مجسم سوال بنے رہے ہیں۔ گویا وہ ایسا مکمل نظام فکر و عمل چاہتا ہے جس کی وجہ سے اسے کوئی تشنگی محسوس نہ ہو۔ وہ ان تمام سوالات کا جواب مہیا کرے جو اس کے ذہن میں مابعد الطبیعاتی مسائل کے سلسلے میں ابھرتے ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی کے عملی میدان میں بھی اس کو لائحہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کو اسلام کلیتاً پورا کرتا ہے۔ مادہ پرست مذاہب کے نظریات و احکامات کے لیے Dogmas کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس سے بلا دلیل پیش کردہ نظریات و عقاید مراد لیتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک دین ہے نہ کہ ان کے تصور کا ایک مذہب۔ لہٰذا اس نے فکر و عمل کے دائروں میں جو ہدایات بھی دی ہیں ان کو محکم دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لہٰذا دین اسلام میں Dogmas قسم کی کوئی چیز موجود نہیں۔

انسان کا تعلق دو قسم کے معاملات سے ہوتا ہے۔ ایک قسم تو ان معاملات کی ہے جن کا ادراک حسیات، مشاہدے اور تحقیق سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تعلق جملہ مرئی اشیاء اور قوانین طبعی سے دوسری قسم ان نظریات سے متعلق ہے جن کی پشت پر استدلال کی قوت موجود ہو۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس پر اتفاق عام ہو یا نہ ہو۔ مثلاً نظریہ جمہوریت، اشتراکیت، شہری آزادیاں، اخلاقیات، ارتفاقات وغیرہ، ظاہر ہے کہ موخر الذکر نظریات کو Dogmas قرار نہیں دیا جائے گا۔ اگرچہ ان سے کسی کو اختلاف ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد غلط یا صحیح استدلال پر ہوتی ہے۔

مذاہب کے برعکس یہی حال دین اسلام کے اصولوں کا ہے۔ قرآن و سنت میں کوئی ایسا حکم یا نظریہ نہیں پایا جاتا جو مضبوط دلائل پر مبنی نہ ہو۔ توحید اسلام کا سب سے اہم نظریہ ہے۔ لیکن انفس و آفاق سے جتنے دلائل ان دونوں ماخذ دین میں اس نظریے کے متعلق دیئے گئے ہیں اور کسی عقیدے کے متعلق نہیں دیئے گئے۔ یہی حال اسلام کے تمام دوسرے نظریات کا ہے، اگر کوئی اسلام کے احکامات پر (Dogmas) کی اصطلاح کا اطلاق کرتا ہے تو وہ دراصل اس دین کی تعلیمات اور ان کو پیش کرنے کے انداز سے ہی بے خبر ہے۔

اس کے علاوہ اسلام کے تمام نظریات میں گہرا ربط و تعلق اور یگانگت پائی جاتی ہے کہیں کوئی منطقی تضاد یا جھول نہیں۔ غور و تفکر کرنے پر ہر شخص پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مربوط نظام فکر و عمل ہے، اگر اس کے ہر شعبے اور پر اصول کی پشت پر عقل و دانش کے تقاضوں پر مبنی دلائل موجود نہ ہوں، تو مجموعی حیثیت میں اس کے اندر توازن و ربط پیدا ہونا محال ہوتا ہے۔ بلا دلیل وضع کئے گئے اصول و احکامات جنہیں مغرب میں Dogmas کہا جاتا ہے مگر کبھی ساری زندگی کے لیے ایک مربوط نظام کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ ان میں انتشار اور تضاد ہو گا۔ ان سب میں ایک ہی فکری روح کا موجود ہونا ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ انسانی زندگی

کے کسی ایک آدھ پہلو سے متعلق ہو گا۔ اس میں یک رخا پن ہو گا۔ وہ عقل کو اپیل ہی نہیں کرے گا۔ یا تو وہ تعقل و تفکر کی انسانی صلاحیتوں کے تعطل کا تقاضا کرے گا اور یا کسی عصبیت کو ہوا دے گا۔ اسی لیے اسلام کے سوا کوئی دین (Ideology) زندگی کے سبھی پہلوؤں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتا۔ مذاہب اپنی توجہات بزعم خود صرف انسانی باطن پر مرکوز کرتے ہیں۔ مادہ پرست نظاموں میں سے کوئی سرمایہ داری اور استحصال و استعمار کی ظالمانہ روش پر چل رہا ہے اور اخلاق و عدل کے مقتضیات کو پس پشت ڈالے بیٹھا ہے، کسی نے انسان کے ہر فطری تقاضے کو سرمایہ دار کی اختراع قرار دے کر اخلاق کی ہر صنف کا مذاق اڑایا اور اشتراکیت و اشتمالیت کے نام پر مزدور کو یہ جھانسہ دیا کہ وہ کامل طور پر سیاسی و معاشی قوت کا مالک ہو گا لیکن عملاً یہ ہوا کہ غریب محنت کش کی حیثیت غلاموں کی سطح سے بھی گر گئی۔ اسی طرح کسی نے اپنی اور اپنی قوم کی ساری توانائیں اپنی نسلی برتری ثابت کرنے میں صرف کر دیں اور عوام کو حقوق انسانی اور شہری آزادیوں سے محروم کر کے ساری دنیا کو مغلوب کرنے کے ناقابل فہم اور خلاف عدل مقصد کے حصول کی مہم پر روانہ ہو گئے۔ ان سب نظاموں میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حیات انسانی کے لیے مکمل ضابطہ مہیا کرتا ہے یا وہ عدل کی بنیاد پر قائم ہے۔

تاریخ عالم میں صرف اسلام ہی کا نظام ہے جس نے ساری حیات انسانی کو فکری اور اور عملی سطحوں پر محیط ہونے کا عملاً مظاہرہ کیا اور عدل کی اساس پر قائم ہوا۔

تفکر و تعقل کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قرآن کا مطالعہ کیجئے۔ یہ کتاب تیئس سال کے عرصے میں اس دعوت اور جدوجہد کے دوران جو نظام خلافت الہیہ کے نفاذ پر منتج ہوئی۔ حسب ضرورت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں نازل ہوئی۔ لیکن ایک امی نبی کی وساطت سے ہم تک پہنچنے کے باوجود اس میں ایک تضاد نہیں۔ ساری کتاب میں ایک ہی روح کار فرما ہے۔ حیات انسانی کو منظم کرنے لیے اس میں سبھی وہ اصول دے دیئے گئے ہیں جن کی ضرورت تھی۔ ہر اصول اور نظریے کی تائید دلائل دیئے گئے ہیں اور سبھی کے سبھی انسانی زندگی عملاً نافذ کئے گئے۔ فکری اور عملی اصولوں میں پورا ربط واضح طور پر نمایاں ہے۔ کیا آج تک ایسے اصولوں کی بنیاد پر کوئی مستحکم اور مبنی بر عدل نظام قائم ہوا جو انسان کو بلا دلیل دیئے گئے ہوں اور ان میں مضمر مصالح کا مخاطبین کو شعور ہی حاصل نہ ہوا ہو۔ (مفصل گفتگو مختلف ابواب تحت ہو گی۔

اور پھر یہ صورت بھی رونما نہیں ہوئی کہ ہنگامی حالت میں ایک دور آیا اور اس دین اور اس کے اصولوں کی طرف بنی نوع انسان ایک حصہ متوجہ ہوا۔ اس دور گزر جانے کے بعد وہ ایک قصہ پارینہ بن گیا۔ اس

کے تحت قائم ہونے والے نظم حکومت یا سیاسی شعبے میں تبدیلی رونما ہونے سے اس کے نظریات نسیاً منسیاً اور اس کے اصولوں کے ساتھ ان کے صحیح مضمرات اور معنوی اہمیت سے وابستگی ختم ہو گئی۔ اگرچہ ازمنہ سابقہ میں ایسا ہوتا ہے دور رواں میں بھی یہی دیکھنے میں آرہا ہے۔ مارکسی اشتراکیت دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گئی اور ساتھ ہی اس اصول ناقابل عمل مردود قرار پا گئے۔ لیکن اس کے برعکس گزشتہ چودہ سو سالوں دوران تاریخ اسلام میں فکری و عملی سطح پر کثیر تعداد میں ایسے صاحب عظمت عزیمت شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے علم و سیرت کے لحاظ سے تاریخ عالم میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ مزید براں انہوں نے اقوام عالم کو علمی قدروں سے روشناس کرایا اور ازمنہ تاریک سے رہائی دلوائی۔ یہ سارا کام قرآن وسنت سے استفادے کی اساس پر کیا گیا۔ تاریخ انسانی میں روانی وارتقاء کے عمل اور تہذیبوں اور تمدنوں کے ٹکراؤ اور ان کے ایک دوسرے پر عمل اور رد عمل کے مظاہرات میں کسی نظریہ زندگی کا اصولی سطح پر غیر متبدل حالت میں رہنا، اس کے برسر حق اور قابل عمل ہونے کیلئے محکم دلیل ہے۔

اسلام خیالی نہیں بلکہ قابل عمل نظام ہے

سیاسی غلبے کے نتیجے میں مغرب کے علمی تفوق کے ذریعے سے مسلمان ممالک بہت سی اصطلاحات بھی درآمد ہوئیں۔ جس تمدنی ماحول میں وہ وجود میں آئیں اس کے تناظر میں تو ان کا استعمال مناسب ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تمدنی، اخلاقی اور دوسری دینی اقدار کے مختلف ہونے کے علی الرغم بڑی بے تکلفی سے مغربی اصطلاحات کو ہمارے معاملات پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں رہبری تو، جیسا کہ ہم آئندہ عرض کریں گے، مستشرقین کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کا مغرب زدہ طبقہ آمنا وصدقنا کہنے میں معمولی سی ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں کرتا۔

انہی اصطلاحات میں ایک (Utopia) ہے جو ایک ناقابل عمل خیالی یا تصوراتی معاشرے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسلام کے بلند نظریات اور ان کے کلی نفاذ سے رونما ہونے والے نظام زندگی کا ذکر سنتے ہیں تو اس پر یہ اصطلاح چسپاں کر دیتے ہیں۔ مغرب میں یوٹوپیا کا تصور وہاں کے ناگفتہ بہ سماجی حالات کے رد عمل کے طور پر بعض محب انسانیت افراد کی طرف سے گزشتہ تین چار صدیوں سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔

سب سے پہلے سر ٹامس مور (Sir Thomas More) نے ۱۵۱۶ء میں اسی نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس نے اس میں ایک ایسا خدا ناشناس معاشرہ تجویز کیا جس کی تعمیر انصاف پر رکھی جائے۔ لیکن اس

میں مثبت بنیادوں پر عملی تجاویز کے بجائے معاشرے کی برائیوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کوئی متعین نظام پیش نہیں کیا گیا۔ اس سے محض ایک اچھے معاشرے کے قیام کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن محض تمناؤں اور غیر واضح خوشنما آرزوؤں سے عمل کی دنیا میں کوئی انقلاب رونما ہو سکتا اور نہ اس کو بروئے کار لانے کے کسی لائحہ عمل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اسی لیے مور (More) کی اس کتاب کا کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔ اس کے برعکس یوٹوپیا کی اصطلاح ناقابل عمل خیالات و نظریات کے استعمال ہونے لگی۔ اس کے بعد بھی رواں صدی تک حیات انسانی کے کسی نہ کسی شعبے کو لے کر متعدد مصنّفین نے یوٹوپیا کے رنگ میں کتابیں لکھی ہیں۔ کسی میں مذہبی رنگ غالب رہا ہے اور کسی میں لادینی۔ بعض نے سیاست کو اہمیت دی ہے اور بعض نے معیشت کو۔ لیکن ایسی تجاویز کو کبھی عمل کا جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ نہ انہیں کبھی قبولیت عامہ کا شرف حاصل ہوا۔

جو لوگ اسلام پر اس اصطلاح کا اطلاق کرتے ہیں وہ درحقیقت دو وقتوں میں مبتلا ہیں۔ اول تو انہوں نے اسلام کے پیش کردہ فکر اور نظام اجتماعی کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ ان کے ذہن میں اسلام کے بعض انفرادی اصول ہوتے ہیں۔ اصل صورت یہ ہے کہ اسلام میں دین، ریاست اور نظام حکومت و سلطنت میں کوئی تفاوت نہیں۔ یہ ایک ایسے مربوط تمدن کو وجود میں لاتا ہے جس کا ہر فرد دوسرے تمام اجزاء سے گہرا تعلق رکھتا اور ان سے سہارا حاصل کرتا ہے۔ فرد کو ایسا ماحول فراہم ہوتا ہے جس کے ذریعے سے اس کو سیرت و کردار کے اعلیٰ سے اعلیٰ تقاضوں کو پورا کرنے میں کلی آسانی میسر آتی ہے۔

جو لوگ ایک مسلمان کے تزکیہ نفس کے اصولوں کے متعلق اسلام کے اجتماعی نظام میں چھائی ہوئی فضا سے انہیں الگ کر کے سوچتے ہیں وہ اپنے معیار اقدار کی روشنی میں ان کو ایک یوٹوپیا تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ دین اسلام میں شہری اپنی بلندی کردار کے ذریعے سے اجتماعی نظام کو تقویت پہنچاتے ہیں اور اجتماعی نظام شہریوں کی ایسی تربیت کرتا اور ان کے لیے ایسا ماحول اور اس نوعیت کی تعلیم اور سہولتیں فراہم کرتا ہے جن کے ذریعے سے اونچی اقدار کو اپنانا ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو اسلام کے اجتماعی نظام سے متعلقہ حصہ کتاب میں ہو گی۔ یہاں ہم اپنی گزارش کو اس وضاحت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں کہ دین اسلام پر یوٹوپیا کی اصطلاح منطبق نہیں کی جا سکتی۔

ان لوگوں کی دوسری وقت یہ ہے کہ ان کے اندر سل جوئی کی عادت پختہ ہو چکی ہے۔ کسی غیر مطلوب اور ناکارہ نظام کو ختم کر کے اس کے بجائے کسی اصلح نظام کو برپا کرنا تعمیر فکر اور بڑے اونچے عزم و

حوصلے کا کام ہے۔ اس کے لیے قربانیاں پیش کرنا ہوتی ہیں۔ جب حضور نبی کریم کی سربراہی میں نظام کفر کو منہدم کر کے اسلامی نظام برپا کیا جارہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (۳:۲۴۱)

ترجمہ: کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممیز نہیں کیا جنہوں نے جہاد کیا اور نہ مشکلوں اور شدتوں میں ثابت قدم رہنے والوں کی نشاندی ہوئی ہے۔

پھر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۱۵۳ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۱۵۴ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۱۵۵ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲:۱۵۳۔۱۵۶)

ترجمہ: اے ایمان والو! ثابت قدمی اور ایمان سے مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے، بے شک ہم تمہارا امتحان کریں گے، کسی قدر خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور ان ثابت قدموں کو خوشخبری سنا دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

قرن اول میں جب مسلمان دین اسلام کو برپا کرنے کے لیے ہر قسم کی تکلیف و پریشانیاں برداشت کر رہے اور جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یہ اصول مقرر فرمایا کہ فلاح اخروی دین کو برپا کرنے کے لیے انتہائی کوشش کرنے اور عزم و محبت کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ اذیتوں پر صبر کرنے سے مشروط ہے۔ عربی میں صبر کے معنی تکالیف کو عزم و ہمت سے برداشت کرنے کے بھی ہیں اور اپنے ارادے اور اصول پر جم جانے کے بھی۔ قرآن میں جابجا اس طرح کی آیات موجود ہیں۔ بلند اصولوں کے لیے جانوں کی بازی لگانے کے بجائے انہیں ناقابل عمل قرار دینا فرار کا ایک آسان راستہ ہے۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے غالباً اسی صورت حال کو واضح کرنے کے لیے کہا:

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہیں کوتاہ
ترا گناہ کہ نخیل بلند کا گناہ ہے

(بال جبریل ۶۹)

یہ دین ایک یوٹوپیا کے طور پر صرف ذہنوں ہی میں نہیں بسا ہوا اور نہ صرف کتابوں کی زینت بنا ہوا ہے بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دین اسلام کو شارع علیہ السلام نے اس کے تمام اصولوں کے ساتھ نافذ کیا اور خلفائے راشدین نے حضور کے نقش قدم پر چل اس کو قائم رکھا۔ اس سلسلے میں بلا استثنٰی ہر شعبہ زندگی میں صرف اسلام کے اصولوں ہی رہنمائی حاصل کی گئی اور ہر غیر اسلام ادارے کو اکھاڑ پھینکا گیا۔

اس عمل سے حیات انفرادی واجتماعی میں کہیں کوئی خلا محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ بہت سی ایسی اصلاحات نافذ کی گئیں جن کا دنیا میں کہیں تصور تک نہ پایا جاتا تھا۔ یہ صورت حال اس نظام کی صحت کی سب سے بڑی علامت اور دلیل ہے۔ لیکن اگر فکر کی بلندی، کردار کی رفعت اور عزم کی پختگی کا معیار اسلام کے مقتضیات کے مطابق اپنے اندر پیدا کی نہ جائے تو اس کے نظام تمدن کی تعمیر اور اس کے اصولوں پر پوری طرح عمل پیرا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ اس کے اصول اس قدر سخت جان ہیں کہ سیاسی سطح پر اس کے نظام خلافت کے مبدل بہ ملوکیت ہونے کے باوجود مسلمانوں کے معاشرے میں دین کے بہت سے اصول نافذ رہے۔ چودہ صدیاں گزرنے پر بھی دین کا اصل تصور زندہ ہے۔ مسلمان اپنی کوتاہیوں کے باوجود اس کے اصل کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔ (اس راستے کی رکاوٹوں کا تذکرہ موزوں مقام پر کیا جائے گا) تاریخ اسلام ایسے کثیر التعداد اور ان گنت اکابر علما پیدا ہوئے جنہوں نے دین کے ایک ایک اصول اور اس کی تعلیمات کے ایک ایک شوشے پر عمل کیا۔ تبلیغ دین میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اس کے اصولوں کو قسم کی ایسی آلایشوں اور بدعات سے پاک کرتے رہے جو مختلف تمدنوں واسطہ پڑنے پر مسلمانوں کے ذہنوں کو متاثر کرتے یا نو مسلم اپنے ساتھ لاتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دین زیر عمل لانے کے لیے ہے۔ محض بلند پروازی تخیل کے لیے نہیں۔

حضور کا زمانہ نبوت صرف تیئس سالوں کے قلیل عرصے پر پھیلا ہوا تھا لہ آپ کا واسطہ ایک ایسے جغرافیائی خطے جو متعدد قبائل کا مسکن تھا۔ ہر قبیلے اپنا الگ تشخص ہونے کی وجہ سے کسی مرکزی اقتدار یا طرز حکومت کا وجود خارج از بحث تھا۔ ان قبائل کا نمایاں مشغلہ جنگ و جدل اور ان کی توانائیوں کا مصرف رسوم خبیثہ اور غارت گری تھا۔ تعلیم و تعلم اور کسی نوعیت کی درس وتدریس کا کوئی تصور نہ تھا۔ کسی مذہب یا دین کا وہ کوئی تصور نہ رکھتے تھے۔ توہم پرستی کی بنیاد پر شرک ان کے دل و دماغ کے ایسے ریشے میں سرایت کیے ہوئے

تھا۔ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے پتھر کے بتوں کو وہ اپنا حاجت روا تصور کرتے تھے۔ ان کی طبیعتوں میں انتہا درجے کی خشونت تھی۔ ملکات بہیمیہ کا ان پر شدید غلبہ تھا۔ تراحم و تکرم کے جذبات سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ آباپرستی ان میں اس حد تک رچی بسی ہوئی تھی کہ وہ ورثے میں حاصل کیے ہوئے خیالات و توہمات کے خلاف ایک بات بھی سننے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔

ہم نے سطور بالا میں عربوں کے فکری و عملی انتشار اور ان بھی بین القبائلی عداوتوں کی مفصل تصویر کشی نہیں کی۔ صرف ان کے مزاج کے بعض وہ پہلو گنوائے ہیں جو کسی نئے تصور زندگی کی قبولیت کے لیے سد راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور جب طبیعتوں میں اس قدر تشدد ہو تو ایسے لوگوں میں مکمل تبدیلی لانا اور ان کے حالات میں ہم جہتی اور مکمل انقلاب برپا کر دینا محض خیالی اور موہوم نظریات سے ممکن نہیں ہو سکتا۔

مزید برآں محض نظریات پیش کر دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ ان کی بنیاد پر انقلاب برپا کرنا عظیم صلاحیتوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ جہاں تک اسلامی انقلاب کا تعلق ہے تو اس کی نوعیت مغرب میں پائے جانے والے اور وہاں سے مشرقی ممالک میں درآمد کیے ہوئے تصور انقلاب سے بالکل مختلف ہے۔ اس اختلاف پر گفتگو تو بعد میں ہو گی۔ یہاں ہم صرف یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ اسلامی انقلاب فرد کے ظاہر و باطن اور تمام اجتماعی شعبوں میں تغیر و تبدل اور اصلاح و تعمیر کو محیط ہوتا ہے جبکہ مغرب میں انقلاب کی جو مختلف صورتیں ظاہر ہوئی ہیں، ان میں زندگی کے کسی ایک آدھ شعبے میں تبدیلی حالات مطلوب ہوتی ہے اور عام طور پر تشدد ان انقلابات کا لازمی جزو ہوتا ہے۔

حضور نے جو اسلامی انقلاب برپا کیا اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی تھیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ اس کار دعوت میں جس سطح اور نوعیت کی جانفشانی اور سعی و جہد سے کام لیا گیا اس کی تفصیلات متعلقہ عنوان کے تحت بیان کی جائیں گی۔ دین اسلام اپنے نفاذ کے ایک مخصوص لائحہ عمل کا مقتضی ہے جس کے سلسلے میں اصول رہنمائی اسوۂ حسنہ رسول سے ملتی ہے۔

بے مثل فطری نظام

ہم مادہ پرستوں، دہریوں اور لاادریت کے نظریے کے موید ین کی توجہ اس نکتے پر مبذول کراتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک امی معاشرے میں ایک امی شخصیت ظاہر ہو اور چالیس برس کی عمر کو پہنچتے ہی ایسے اصول و نظریات کی اساس پر ایک نظام تمدن پیش کرے جن کا تصور دنیا کے کسی گوشے یا ملک میں نہ پایا جاتا ہو۔ اپنی عمر کے ابتدائی چالیس سالوں کے دوران اس نے اگرچہ انفرادی طور پر نہایت پاکباز زندگی گزاری لیکن کبھی

بھی کسی نظریے کی تبلیغ نہیں کی۔ جب حضور کو رسالت سے نوازا گیا تو سرے سے کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ انسان کی اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے مربوط نظریات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ایک شخص یا طبقے کو عوام پر حق حکمرانی حاصل نہیں ہونا چاہئے۔

قومی دولت کی منصفانہ تقسیم کا بھی کہیں تصور نہ تھا۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل سے متعلق تمام عقائد تو ہم پرستی پر مبنی تھے۔ بنی نوع انسان کی وحدت کا امکان کسی ذہن میں جگہ ہی نہ پا سکتا تھا۔ یہ اور وہ تمام مسائل جن پر قرآن و حدیث میں بحث کی گئی ہے اور جن میں سے بعض کا ہم اس کتاب میں تذکرہ کریں گے، انسانوں اور قوموں کے نزدیک کوئی وجود ہی نہ رکھتے تھے۔

ایسے حالات میں ایک امی اچانک ایک مکمل ضابطہ فکر و عمل کی دعوت کا آغاز کر دیتا ہے۔ اس نے کسی فلسفے یا مذہب کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ اس کو کسی ایسے پیشرو کے خیالات کوئی علم نہیں ہوتا جس نے اس کے پیش کردہ نظریات کے مماثل خیالات کی اشاعت کی ہو۔ اس کے علاوہ وہ مقامی ایسی سیرت کردار مظاہرہ کرتا ہے جس سے اس کے مرد کامل ہونے کا بین ثبوت فراہم ہوتا ہو۔ تاریخ عالم میں اپنے اخلاق حسنہ کے اعتبار سے اپنا ثانی رکھتا ہو اور نہ اس نے تن تنہا سعی و جہد کر کے ایک نظام پیش کر کے جس طرح مکمل کامیابی حاصل کی تاریخ عالم میں اس کی مثال ملتی ہو۔

حضور کی بعثت سے قبل اقوام عالم صرف ملوکانہ طرز حکومت ہی سے آشنا تھیں۔ بادشاہ اختیارات کلی کا مالک اور کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہوتا تھا۔ وہ قانون سے بالاتر ہوتا اور خزانہ عامرہ اس کی ذاتی ملکیت تصور ہوتا تھا۔ تعیش اور مسرفانہ طرز کی زندگی بسر کرنا اس کا حق ہوتا تھا۔ ان میں سے بہت خدائی کا دعویٰ کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ اور بہت سے تو یہ بات تسلیم کرواتے تھے کہ وہ اس دور کے تصور کی خالق کائنات ہستی سے پروانہ ملوکیت رکھتے ہیں۔ عوامی فلاح بہبود کے سلسلے میں اس کوئی کی ذمہ داری نہیں ہوتی تھی۔

اس صورت اگر بعض مستثنیات نشاندہی کی جا سکتی ہے تو وہ منزل من اللہ ادیان کی دعوت دینے والے انبیاور سل کی سعی و جہد کا نتیجہ تھیں۔ لیکن نہ حضور اپنی بعثت سے قبل ان کے حالات سے واقفیت رکھتے تھے اور نہ آج ان کے ایسے کوائف موجود ہیں جن سے متعین رہنمائی حاصل کی جا سکے۔

حضور نے کار دعوت کی خود ابتدا کی۔ اگرچہ آپ سے قبل، جیسا کہ ہم قرآن سے حوالے کر بیان کریں، تمام اقوام کی طرف رسول اسلام لے کر آتے رہے لیکن آنحضرت کے مخاطب اول کسی رسول کی تعلیمات پر عمل پیرا نہ تھے۔ شرک ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھا۔

جن عالمی اور مقامی حالات کا ہم نے سطور بالا میں اجمالاً تذکرہ کیا ہے ان کے پس منظر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا ضابطہ فکر و عمل نافذ کرنے کی سعی وجہد کا آغاز کیا جس کی حضور کے سامنے نہ کوئی مثال موجود تھی اور نہ دنیا کے کسی ملک یا خطے میں کوئی ایسا نظام موجود تھا جس کی اساس حیات انسانی سے متعلق ہمہ جہتی اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ آج فلاح انسانیت کے نام مختلف نظام ہائے حیات پیش کیے جاتے ہیں۔ کوئی بھی ایسا نظام پیش یا قائم نہ کیا جا سکا جس کی بنیاد عدل پر ہو۔ نہ کسی کائنات نے اور انسان کے آغاز کے متعلق ان سوالات کے جوابات مہیا کیے جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہم اس سے قبل یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ اسلام بنی نوع انسان کو اس کی تمام ضروریات کے لیے مکمل ضابطہ حیات دیتا ہے۔

موجودہ دور کے غالب مغربی فکر کی بنیاد اور اٹھان مادہ پرستی پر ہے۔ یہ فکر انسان کو محض مادی عناصر کا مظہر دیتا ہے۔ وہ انسان کو شرف و حجر کا وہ مقام نہیں دیتا جو اسے اسلام دیتا ہے۔ اگر کوئی یہ طے کر لے کہ اس زندگی کا مقصد انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر صرف حیوانی ضروریات ہی پورا کرنا ہے تو اس کے لیے اسلام کی اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں کے وزن کا تعین کرنا ممکن نہیں سکتا۔ منطقی طور پر ایسے نظریات کے حامل انسان اور معاشرے انسانی فلاح و بہبود اور تنزل و انحطاط کے اصولوں کی تاویل و تعین کرنے کے سلسلے میں حیوانوں کی زندگی اور طرز عمل سے استدلال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقا کو انسانی زندگی منطبق کیا گیا ہے۔ اور اسی انداز تفکر کا نتیجہ ہے کہ جن اقوام کو کسی نہ کسی وجہ سے عارضی طور پر دوسری اقوام پر غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ انہوں نے اخلاقی اقدار کو جو انسان کی امتیازی خصوصیات کی علامت ہیں۔ خیر باد کہہ کر بین الاقوامی زندگی کے ایک ایک شعبے میں جنگل کے قانون کا نفاذ کر دیا اور کر رکھا ہے۔

حیوانوں سے نوع انسانی کا معنوی اعتبار سے رشتہ جوڑنا صرف نامناسب نہیں بلکہ صریحاً غلط طرز فکر اور انسانی معاملات پر غور و تدبر کا بے ڈھنگا طریقہ ہے۔ انسان اپنی گنت فکری و شعوری استعدادوں اور اپنے مسائل کی بوقلمونی کے اعتبار سے اپنی ایک مخصوص اور یکتا حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اپنی ایک فطرت ہے جس سے خالق کائنات نے اسے متصف کیا۔ انسانی فطرت کی پیچیدگیوں اور گہرائیوں کی کہنہ تک آج تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ علم فلسفہ جس نے ہمیشہ کسی نہ کسی پیمانے پر اس موضوع کو اپنی مباحث و تفکر کا موضوع بنایا ہوا ہے، اور کچھ عرصے سے سائنسی علوم کے کئی شعبے بھی فطرت انسانی کے عواض کی پردہ کشائی کے لیے وقف ہیں۔ لیکن کوئی روشنی کی ایک کرن بھی نہ پا سکا۔ اختلافات اور متضاد تھیوریوں کا ایک انبار ہے جو ان علوم سے متعلق کتب کے صفحات کی زینت بنا ہوا ہے۔

اسلام بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے اور عقل انسانی بھی معروضی غور و تفکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچ سکتی ہے کہ دراصل نوع انسانی کو مطابق فطرت زندگی بسر کرنے کے لیے اس ہستی سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے جس نے اس کی فطرت کو خلق کیا، لیکن اس فطرت کا حامل اس کے اسرار کلی سے خود ناآشنا ہے۔ اسلام جو نظام فکر و عمل انسان کے لیے دیتا ہے اس کی اساسات انسانی فطرت سے مطابقت رکھتی ہیں۔

انسان راہ ہدایت کی طلب رکھتا ہے

تاریخ کے معروضی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر روحانی پرواز اور اعلیٰ اقدار پر عمل پیرا ہونے کی بے انتہا فطری امنگ اور استعداد موجود ہے۔ وہ اپنے اندر اونچے اخلاق پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ان اصولوں کے لیے جنہیں وہ برسر حق سمجھتا ہے جان و مال کی قربانی پیش کر سکتا ہے۔ حصول علم کے لیے اپنی زندگی وقف کر سکتا ہے۔ دوسرے انسانوں کی خدمت اور ان کے بھلے کے لیے تکالیف انگیز کر سکتا ہے۔ اپنے نظریات کے نفاذ کے لیے دار و رسن کو چوم سکتا ہے۔ اقتدار، حصول زر اور اپنی زندگی کی سہولتوں کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے جس بات کو حق سمجھتا ہے اس کو اپنانے کے لیے جدوجہد کر سکتا ہے۔ عدل و انصاف اور رواداری کا پیکر بن سکتا ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کی ان تمام خصوصیات کا مظاہرہ فی الحقیقت ان مقاصد کے حصول پر منتج ہو جو بنی نوع انسان کے لیے مفید ہوں۔ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ انسان کا باطن حق و باطل کی کشمکش کی آماج گاہ ہے۔ وہ اپنی مذکورہ بالا خصوصیات کو حق کی حمایت میں بھی استعمال کر سکتا ہے اور باطل کی خدمت کے لیے بھی۔ لیکن عام طور پر مشاہدے میں یہی آیا ہے کہ موخر الذکر صورت میں داعیان ضلالت و ظلم کو مستثنیٰ کر کے جمہور جس مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے اور قربانیاں دیتے ہیں اسے وہ غلط فہمی کے تحت برسر حق ہی تصور کرتے ہیں۔ ہم آئے دن مختلف نظریات کے ظہور اور ان کے حق میں سعی و جہد کے جو مظاہر دیکھتے ہیں، ان کے محرکات تلاش حق ہی کے جذبات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ہمارا موقف یہ ہے کہ انسان فطرتاً حق کا متلاشی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ اسے صراط مستقیم معلوم کرنے اور اس پر گامزن ہونے کے لیے ہدایت الٰہی کی ضرورت ہے۔

اگر انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے اور قرآن سے اس معاملے میں ہدایت حاصل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ راہ حق اختیار کرنے کی رکاوٹوں میں سے گمراہ انسانوں کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ عصبیت کی مختلف اقسام ہیں۔ یہ جذبہ صرف عمل خیر سے روکنے کا منفی کردار ہی ادا نہیں کرتا بلکہ یہ دنیا میں فتنہ وفساد کے لیے بھی تحریک مہیا کرتا ہے۔

ان عصبیتوں میں سب سے بڑی عصبیت آباپرستی اور آباء طریق کو اختیار کیے رکھنے پر اصرار ہے اور یہی جذبہ ہدایت خداوندی کی قبولیت کے سلسلے میں سب سے زیادہ سدراہ ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲:۱۷۰)

ترجمہ: اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں۔

یہ عصبیت انسانوں کی عقل و خرد کو اس قدر ماؤف کر دیتی ہے کہ وہ اپنے مسلک میں واضح خرابیاں محسوس کرنے کے باوجود کسی دوسرے مسلک خیر کو زیر غور لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس سے انسانی طبیعت میں پائے جانے والے ایک بڑے تضاد کی نشاندہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تضاد عصبیت ہی کی پیداوار ہے۔ اس عصبیت کو اسی طرح ختم کیا جاسکتا ہے جیسے حضور نے اسے اپنے اسوہ حسنہ، تبلیغ دین اور تربیت صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعے سے محو کیا۔ اس لائحہ عمل کے ذریعے سے مخاطبین کی آنکھوں سے عصبیت کی پٹیاں اتر گئیں اور ان کے باطن میں وہ طلب ہدایت کی چنگاری بھڑک اٹھی جو ہر انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ (اس طریق کار اور دعوت دین کے انداز کی تفصیلات اپنے موقع پر آئیں گی)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بہت سے لوگ قرآن وسنت سے رجوع نہ کرنے کی وجہ سے اس ذہنی مخمصے میں مبتلا رہتے ہیں کہ جو جس تمدن اور مذہب کے ماحول میں جنم لیتا ہے وہ عام طور پر انہی کے سانچے میں ڈھلتا اور انہی کی تعلیمات و مزاج کو اپناتا ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی اسی لیے مسلمان ہیں کہ وہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس سے اسلام کی برتری کیسے ثابت ہوسکتی ہے۔ اور جو لوگ دائرہ اسلام سے باہر ہیں انہیں برسر باطل کیسے قرار دیا

جاسکتا ہے۔ نیز اگر انسان فطرتاً حق کا متلاشی ہے اور صرف اسلام ہی دین حق ہے تو کفر کیوں پھل پھول رہا ہے اور اسلام کو بنی نوع انسان نے اجتماعی طور پر کیوں قبول نہیں کر لیا؟

اس سلسلے میں آغاز بحث سے قبل ہی ہم یہ وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمیں تہ اللہ کے متعلق تمہیدی طور پر کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا ہوگا۔ ہم کسی تردد کے بغیر اسلام کے اس دعوے کا تذکرہ کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ بلاشرکت غیرے دین حق ہے۔

قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۸ ۳:۵)

ترجمہ: اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔

اور مزید وضاحت کے لیے فرمایا:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ (۳:۱۹)

ترجمہ: بلاشبہ "الدین" (یعنی اصلی دین) اللہ کے نزدیک "الاسلام" ہی ہے۔

یہ حکم خداوندی صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین و شریعت پر ہی عائد نہیں ہوتا بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور تک جو انبیاء و رسل جتنے ادیان لے کر آئے وہ سب اسلام ہی کہلاتے ہیں اور ان کے ماننے والے مسلمان،

چنانچہ فرمایا:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۳:۸۴)

ترجمہ: (اے پیغمبر) تم کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اس کی اولاد اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور خدا کے تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا ہے اس سب پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کس کو مانیں اور کس کو نہ مانیں) ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مخاطین سے کہا:

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ(۱۰:۷۲)

ترجمہ: مجھے (اللہ کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے کہ اس کے فرمانبردار بندوں (مسلمانوں) کے گروہ میں شامل رہوں۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (۱۰:۴۸)

ترجمہ: اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو تو چاہئے کہ صرف اسی پر بھروسہ کرو اگر تم اللہ پر فی الحقیقت ایمان لائے ہو۔ (یعنی مسلمان ہو)

اسی طرح تمام انبیاء اور ان کے ماننے والے مسلمان اور ان کا دین اسلام ہی تھا۔ دوسرے تمام منزل من اللہ ادیان اور انبیاء کی تصدیق کو اسلام کے سوا کسی اور مذہب یا نظام فکر نے لازمی اور ایمان و کفر کا مسئلہ نہیں بنا رکھا۔ لہٰذا یہ تصور ٹھیک نہیں ہے کہ مسلمان دین اسلام یا ہدایت خداوندی کو دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں محدود سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کا یہ بھی اصول ہے کہ تمام انبیاء پر ایمان لانا اور ان کو برسر حق ماننا ضروری ہے۔ کسی ایک نبی پر ایمان لانے سے انکار کفر کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تمام انبیاء کرام ایک ہی سلسلے کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی ایک کڑی کو بھی اصولاً حذف نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ زنجیر کا تسلسل قائم نہیں رہ سکے گا۔

قرآن میں اسلام کی تاریخ کا جو تصور ملتا ہے اس کے مطابق بشر اول حضرت آدم علیہ السلام سے بنی نوع انسان کے لیے سلسلہ ہدایت شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر قوم اور خطہ زمین میں ایک ہی قسم کے اساسی اصول لیکن مکان و زمان کے تقاضوں کے مطابق شریعتیں لے کر انبیاء و رسل مبعوث ہوتے رہے

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۴)

ترجمہ: اور کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں (بدعملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والا کوئی رسول نہ گزرا ہو۔

وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۷:۳۱) ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوا ہے۔

لیکن ان ادوار میں انسانی تمدن کا ارتقا اس مرحلے پر نہیں پہنچا تھا کہ وہ ان انبیاء ورسل کی زندگیوں اور ان کی لائی ہوئی ہدایت کو محفوظ رکھ سکتا۔ انبیاء کو وقت کے گزرنے کے ساتھ الوہیت کا مقام دے دیا گیا۔ ان کے بت تراش دیئے جاتے رہے اور ان کی پوجا کی جانے لگی۔ ان کے لائے ہوئے صحیفے یا تو کلیتاً کھو گئے اور یا بعض میں حذف واضافہ اور تحریف کر دی گئی۔ اس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی آمد کا سلسلہ جاری رہا لیکن انسانی آبادیاں اس سے متاثر بھی ہوتی رہیں، اس کی مخالفت بھی کرتی رہیں اور ان کو فراموش بھی کرتی ہیں۔ آخر کار حضور کو بنی نوع انسان کے اس ارتقائی مرحلے پر مبعوث کیا گیا جب اس کو یہ استعداد عطا کی گئی کہ وہ آپ کے لائے ہوئے دین کو بحفاظت ابدالآباد تک اس کی صحیح تعلیمات کے ساتھ محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ حضور کے متعلق قرآن میں یہ ارشاد نہیں ہوا کہ آپ کو کسی قوم، قبیلہ یا ملک کی طرف بھیجا جارہا ہے۔ بلکہ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸:۳٤)

ترجمہ: ہم نے تجھ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ جانتے نہیں۔

آپ کو ''الناس'' یعنی تمام بنی نوع انسان کی طرف بھیجا گیا۔ اور ساتھ ہی آیت (۵:۳) کے ذریعے سے حجتہ الوداع کے موقع پر اس دین کی تکمیل کا اعلان ہوا جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام کے معبوث ارضی سے ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ رسالت ووحی بھی ختم ہو گیا اور حضور خاتم النبیین قرار دیئے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمادیا جیسا کہ ہم اس سے قبل آیت (۱۵:۹) کا حوالہ دے کر عرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن (اور دین) کی حفاظت کا خود ذمہ لے لیا۔ اس عالم اسباب میں اللہ تعالیٰ اس زمہ کو کس طرح نباہ رہا ہے اس کی تفصیل اسلام کی تاریخ کے سلسلے میں بیان کی جائے گی۔ یہ پہلی منزل من اللہ کتب کی طرح مٹ نہیں سکتا۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ یہ ابدالآباد تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہے گا۔ جیسا کہ اس سے قبل اجمالاً عرض کیا گیا۔ یہ فکر اور حیات انسانی کے تمام شعبوں کے لیے مکمل اصولی رہنمائی دیتا ہے۔ لہٰذا اب یہی دین ہے جو خالق انس وکائنات کی رضا حاصل کرنے اور دنیاوی اور اخروی زندگی میں حصول فلاح کا واحد ذریعہ ہے۔ اس نظریے کی تائید مزید میں تاریخی شہادت اور محکم دلائل آپ کو کتاب کے آئندہ ابواب میں بھی ملیں گے۔

ہم نے دین اسلام کا جو تاریخی پس منظر حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ اسلام صرف اسی دین کو برسر حق قرار دیتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ ہم نے قرآن سے شواہد پیش کیے ہیں کہ ہر نبی کا لایا ہوا دین سچا تھا۔ لیکن چونکہ وہ سبھی ادیان محرف ہو گئے اور حضور نے ساری دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مکمل دین علمی نظریات اور علمی نفاذ کے ساتھ پیش کر دیا۔ لہٰذا اب صرف یہی دین ذریعہ فلاح انسانیت قرار دیا جا سکتا اور کسی مذہب، دین یا نظام زندگی میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ یہ دین علیٰ حالہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے موجود ہے۔ اس کے لانے والے رسول کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحے کے حالات ثقہ روایات کے ذریعے سے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ اور صرف میں یہی ایک دین (Ideology) ہے جو بنی نوع انسان کی تمام فکری، روحانی اور اجتماعی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

جہاں تک اس اشکال کا تعلق ہے کہ جو جس مذہب کے ماحول میں پیدا ہوتا ہے وہ اسی کو اختیار کیے ہوئے ہے اور مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے تو اس کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ یہ بات معیار حق و باطل نہیں کہ کوئی شخص کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے والدین کے ہاں غیر اختیاری طور پر پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر بھی اسلام یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ محض زبانی کلامی اپنے آپ کو مسلمان کہہ دینے سے وہ اللہ تعالیٰ کی منشا کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں گے۔ ہم نے اس سے قبل آیت (۳:۱۴۲) سے یہ واضح کیا ہے کہ دین کو برپا کرنے کے لیے پوری تندہی سے کوشش کرنے ہی سے کامرانی کا منہ دیکھنا نصیب ہو گا۔ یہ بھی فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ (۲:۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت (یعنی اسلام) میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تخاطب مومنوں سے ہے تو یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ دوسرے لفظوں میں اپنی گندگی کو پورے طور پر اسلام کے احکامات کے تابع کر لو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان کے زبانی اقرار کے باوجود یہ ممکن ہے کہ انسان کو پوری طرح اسلام کے تحت زندگی گزارنے کی سعادت حاصل نہ ہو۔ سو جن دو آیات کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے ان سے اور متعدد دوسری قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کو زیر عمل لانے اور اس کے اصولوں کی پابندی کرنے کی دعوت صرف

غیر مسلموں ہی کو نہیں دی جارہی بلکہ ان مومنوں کو بھی دی جارہی ہے جو محض زبان سے اسلام سے وابستگی کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن اس کے تمام اصولوں کو نہیں اپناتے۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور نظاموں کو برسر حق تسلیم نہ کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل و خرد اور اختیار وارادہ سے نوازا ہے۔ان خصوصیات کا یہ تقاضا ہے کہ ہر شخص تلاش حق کی سعی و جہد کرے۔ دین اسلام اور اس کی تعلیمات دنیا میں موجود ہیں۔ ہر شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ زندگی بسر کرنے کے صحیح اصول معلوم کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کے دوران ان کا مطالعہ کرے۔

بحث کے اس مرحلے پر ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ عملاً ہر شخص کے بس کا روگ نہیں کہ وہ تلاش حق میں مطلوبہ وقت صرف کرے اور یہ کہ اس میں وہ ذہنی و تعلیمی صلاحیت موجود ہو کہ وہ اس فریضے کو سرانجام دے سکے۔مزید برآں آبائی مسلک کو اپنانے کے عام رجحان، ماحول کے اثر اور سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی جدوجہد کی وجہ سے ہر انسان مختلف مذاہب کا مطالعہ کر کے اسلام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر قوم وملک اور معاشرے میں ایسے دانشور اور اونچی سطح کی تعلیم رکھنے والے بہت سے افراد موجود ہوتے ہیں جو تعصّبات سے آزاد اور معاشرے کے رد عمل سے بے پرواہ ہو کر مروجہ اصولوں کے خول سے باہر نکل کر یہ سوچیں کہ آخر سارے کرہ ارض کی اقوام ایسے نظام سے کیوں محروم ہیں جو ان کے لیے فلاح اور اطمینان کی زندگی کی ضمانت مہیا کر سکے۔ ہم نے اس سے قبل برٹرینڈ رسل کی ایک اہم کتاب سے جو اقتباس نقل کیا تھا اس میں اس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ فلاں فلاں سوالات حل طلب ہیں۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ ان کا تعلق فلاسفہ کے دائرہ فکر سے ہے اور ضروری نہیں کہ یہ لوگ ان کا جواب فراہم کر سکیں۔ برٹرینڈ رسل کا ان لاینحل سوالات کو گنوانا اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لیے اہم ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو فلاسفہ کو انہیں اپنی فکری کاوشوں کا موضوع بنانے کی کیا ضرورت پیش آتی رہی ہے۔ لہٰذا کوئی متبادل راستہ تلاش کرنا ہی عقل و دانش کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ صحرا میں بھٹکتے رہنے کو کسی شاہراہ کی دریافت کی کوشش پر ترجیح دینا کارعبث ہے۔ یہ بات حقیقی کام کرنے والے اہل علم کے بس میں ہے کہ وہ اسلام کی صحیح تعلیمات کا علم حاصل کر سکیں اور اپنی اپنی قوم کو اس سے روشناس کرائیں۔ تفصیلات تو بعد میں آئیں گی لیکن یہاں ہم اشارتاً تذکرہ کرنا چاہتے ہیں کہ گزشتہ دو تین صدیوں سے یورپی تمدن، زندگی کے مادہ پرستانہ تصور اور قوم پرستی کے عفریت کے قابو میں ہے۔ ان سے متعلق اصولوں اور نظریات کے نتائج بد بھی دنیا کے سامنے آچکے ہیں۔ لیکن ان کے اکثر مفکرین اس پھندے سے نہیں نکل سکے۔ جو لوگ ان نظریات زندگی سے وہاں

بھی غیر مطمئن ہیں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مترادف ہے۔ عام طور پر مختلف قسم کی عصبیتوں کے پھندن اور وہی آہائی فکر سے وابستگی قسم کی ہٹ دھرمیاں یہاں بھی راہ مستقیم کو تلاش اور اختیار کرنے میں رکاوٹ بن رہی ہیں جن سے احتراز کرنے کی قرآن نے بار بار تاکید کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمان بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ہم اس وقت چار درجن ممالک میں اکثریتی حیثیت سے آباد ہیں اور کرہ ارض پر ہماری آبادی کم و بیش ایک ارب نفوس پر مشتمل ہے۔ لیکن کسی ایک مسلمان ملک میں بھی اسلامی ضابطہ حیات باخذ نہیں ہے۔ اگر اس صورت حال کے مضمرات کو ذہن میں رکھ کر سوچا جائے تو بنی نوع انسان کی دین اسلام کی افادیت سے، محرومی کی اصل ذمہ داری خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔

اس سے قبل کہ ہم اس ذمہ داری کی وضاحت کریں ہم ناظرین کی توجہ مشیت ایزدی کے ایک پہلو کی طرف مبذول کراتے ہیں جو اس مسئلے سے متعلق ہے۔

قرآن کہتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً(۸: ۴ ۲)

ترجمہ: اور اگر اللہ چاہتا تو ان (تیرے مخالف اور موافق) لوگوں کو ایک گروہ (ایماندار) بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں کئی قسم کی مخلوق پیدا کی ہے۔ ہم بعض کو جانتے ہیں اور اکثر کے وجود و خواص سے لاعلم ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ملائیکہ کی مخلوق محض اطاعت کے لیے ہے۔ ان کو اختیار و ارادہ کے خواص دیئے ہی نہیں گئے۔ وہ حکم عدولی کرنے کی استعداد رکھتے ہی نہیں۔ اسی طرح حیوانات کی کئی قسمیں ہیں جو نطق اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی کم از کم ہمارے قسم کے مطابق صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ پھر غیر ذی حیات مخلوق ہے، مثلاً معدنیات اور نباتات۔ ان میں سے ہر مخلوق اپنی نوعی قوانین کی پابند ہے۔ اپنے اپنے خواص رکھتی ہے چاہے انسان ان کے خواص کی حقیقت تک پہنچ سکے یا اس کے بعض پہلوؤں سے بے خبر رہے۔

اسی طرح بنی نوع انسان بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کے اپنے خواص اور اپنی فطرت ہے۔ قرآن کے مطابق اس نوع کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسے مسجود ملائیکہ ہونے کا شرف عطا کیا۔ اس کے ظاہر و باطن میں بے شمار خصوصیات اور صلاحیتیں رکھ دی ہیں۔ یہ قوت گویائی رکھتا ہے۔ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتا اور اپنے دوسرے ہم جنسوں کو اس سے آگاہ کر سکتا ہے۔ کلام اور تحریر پر قادر ہے۔ کئی قسم کے ہنر سیکھ سکتا ہے۔ ایجاد و اختراع کا ملکہ رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے قبل آیات (۲: ۳۱-۳۳) کا حوالہ

دے کر وضاحت کی تھی، تخلیق آدم کے وقت انسان کو ''علم الاسماء'' سے نوازا گیا جو ایک عظیم نعمت ہے اور جو فرشتوں پر بھی انسان کی فوقیت کا باعث ہوئی۔

ان اوصاف سے متصف کر کے انسان کو آزمائش کے لیے اس کے خالق نے اس کرہ ارض پر ایک مدت معین تک کے لیے بسایا جس کی طوالت وہ خود ہی جانتا ہے۔ درج بالا آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی طریق زندگی پر مجتمع کر دیتے اور ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ لیکن نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری ہی صورت اور فطرت عطا کی اور اس پر ایسی ذمہ داری ڈالی جو کسی اور مخلوق پر نہیں ڈالی۔ اور وہ یہ کہ وہ راہ ہدایت اور راہ نہ ہ ضلالت اختیار کرنے کے سلسلے میں اس دنیا کی زندگی کے دوران آزاد ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے کہ وہ انسانی انتخاب عمل کے نتائج کسی حد تک اس دنیا میں برآمد کرتا ہے اور کس حد تک آخرت کی زندگی کے دوران۔ کیونکہ اس نے ڈھیل دینے کا طریقہ بھی اختیار کر رکھا ہے اور راہ راست اختیار کرنے والوں کو جان و مال اور دنیوی سہولتوں کی قربانی کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالنے کا بھی ارادہ کیا ہے۔

ہاں ایک بات یقینی ہے کہ اگر اسلام کے فکری و عملی نظام کو اپنا لیا جائے تو دنیوی اعتبار سے بھی ترقی و فلاح انسانیت کا نصب العین حاصل ہو سکتا ہے اور افراد باطنی سطح پر اطمینان و سکون کی دولت سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ تو گویا، اس صورت میں اسی جہان میں نتائج اعمال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور اخروی زندگی میں جو اجر حاصل ہوگا وہ اس کے علاوہ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے قرآنی آیت (۲۰:۱۲۳) کا حوالہ دے کر عرض کر چکے ہیں بوقت آفرینشن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ ہماری طرف سے ارضی زندگی گزارنے کے لیے ہدایت آتی رہے گی، جو اس پر چلے گا اور اس کو اپنا لے گا وہ گمراہی میں مبتلا ہوگا اور نہ تکلیف میں لیکن اس نے اس سلسلے میں اپنے تکوینی اختیار کو استعمال نہیں کیا کہ سارے انسانوں کو اپنے حکم کے تحت ایک ہی مسلک پر متفق کر دے۔ یہ بنی نوع انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہدایت خداوندی کی روشنی میں اس کے لیے کوشاں ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے حصول کے لیے بھی قرآن و سنت کی وساطت سے مکمل رہنمائی مہیا کر دی ہے۔ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب ہدایت دے کر بھیجا۔ آپ نے اس کو پوری روح کے ساتھ اسے اپنی ذات پر نافذ کر کے اپنے اسوہ حسنہ کو دنیا کے لیے مثال کے طور پر پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی حضور نے

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد کی تطہیر فکر و عمل کر کے اصولوں سے لیکر جزیات تک اسلام کا اجتماعی زندگی پر نفاذ کیا۔ یہ کام بڑی جانفشانی اور اولوالعزمی کا تقاضا کرتا تھا۔ لہٰذا فرمایا:

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳:۵)

ترجمہ: ہم (خدا) تجھ پر بہت بھاری حکم بھیجیں گے۔

ایک بہت بڑا کام اور عظیم مقصد جس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کی ذمہ داری ہم آپ کے سپرد کر رہے ہیں۔ پھر کمر ہمت باندھ لینے کی بھی تاکید کی:

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴:۱-۳)

ترجمہ: اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھ اور عذاب سے ڈرا، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر

لفظ قم کے معنی بہت وسیع ہیں۔ سیاق و سباق اور موقعہ کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر غور کیا جائے تو اس میں اولوالعزمی، جرات، ثابت قدمی اور خود اعتمادی جیسے سبھی عناصر کو بروئے کار لانے کا حضور کو حکم دیا گیا ہے۔ شرک کی مختلف صورتوں سے بھری ہوئی دنیا کے سامنے خدائے واحدہ لاشریک کی کبریائی کا اعلان کرنا ایک غیر معمولی کام اور طوفانی رد عمل کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ توحید کی دعوت اور غیر اللہ کی ہر قسم کی کبرائی کو منہدم کرنے کی مہم کا آغاز دہکتے انگاروں کو مٹھی میں لینے کے ہم معنی تھا بقول علامہ اقبال:

شے یہ میکدہ وش گفت پیر زندہ دلے
بہ ہر زمانہ خلیل است و آتش نمرود (پیام مشرق)

ترجمہ: توحید و شرک کے سلسلے کی کشمکش میں آتش نمرود کی آزمائش سے ہر حالت میں گزرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (۷۴:۷)

ترجمہ: اور اپنے رب کے لیے صبر (واستقامت) سے کام لیجئے۔

ان حالات میں اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے ظلم و تشدد اور ایذا رسانی کے مقابلے میں صبر کرنا ہوگا اور اپنے اصولوں اور نظریات پر جمے رہنا ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی ایک موقعہ پر عرض کیا ہے۔ لفظ صبر میں یہ دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے احکامات اس وقت تو حضور کو مخاطب کر کے دیئے گے لیکن قرآن اور اس کی تعلیمات ہمیشہ کے لیے ہیں اور ان احکامات کے مخاطب ہر دور کے مسلمان بھی ہیں۔ جو دین کے احیاء اور اس کو برپا کرنے کا کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

یہ فریضہ سرانجام دینے کے سلسلے کی ہدایات قرآن کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اسوہ حسنہ میں اس کی عملی تفصیل واضح طور پر موجود ہے۔

حضور کی جدوجہد کے نتیجے میں ایک ایسا نظام اجتماعی وجود میں آیا جو رہتی دنیا تک بنی نوع انسان کے لیے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے جو امت مرتب ہوئی اور اس کے نقش قدم پر چلنے والی جو امتیں اس کے بعد وجود میں آئیں ان سے یوں خطاب ہوا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (۳:۱۰۱)

ترجمہ: تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو۔ معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

قرآن کی ہر آیت کا ہر لفظ موزونیت استعمال کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہاں امت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس میں قوم، جو کسی جغرافیائی خطے سے منسلک ہو، کا مفہوم نہیں پایا جاتا نہ یہ کسی نسلی یا لونی یا لسانی گروہ پر مشتمل ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو اسلام کے اصولوں کے ساتھ دانستگی کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ اس کی اجتماعیت کی کیفیت میں ملکی و قومی سرحد میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو کوئی اس امت میں شامل ہو گا اس کی تمام سابقہ وابستگیاں ثانوی یا غیر اہم حیثیت اختیار کر لیتی ہیں حتیٰ کہ اگر قومی و خاندانی رشتوں مفاد ملت سے ٹکرا جائے تو اول الذکر کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ اسلام کے اس اصول کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا:

تو اے کودک منش خود را ادب کن
مسلماں زادہ؟ ترک نسب کن
بر نگ احمر و خون ورگ پوست
عرب نازد اگر، ترک عرب کن (پیام مشرق)

اس کی خصوصیت کو لفظ خیر، یعنی بہتری سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دنیا میں اس کے کردار کا تذکرہ ہے۔ یہ انسانوں کے کسی محدود گروہ سے خطاب یا اس سے وابستگی اختیار نہیں کرے گی، بلکہ الناس یعنی تمام بنی نوع انسان کی اصلاح کا فریضہ انجام دے گی۔ اصلاح کی صورت یہ ہو گی کہ لوگوں کو بہتری اور خیر پر آمادہ کیا جائے۔ اس کے لیے امر، یعنی حکم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی برائی اور اثم سے اجتناب کی تلقین کرے گی۔ انداز بیان سے یہ تاثر حاصل ہوتا ہے کہ بھلائی، خیر اور ایمان باللہ کے تقاضوں کو فراموش کیے بغیر اسلام کے اصولوں کی روشنی میں صورت حالات کے تقاضوں کے مطابق یہ امت ہر قسم کے مناسب اقدامات کر کے اچھائی کا نفاذ کرے گی اور برائی کا قلع قمع کرے گی۔ گویا امت کے لیے صفت ''خیر'' کا لفظ ان دو فرائض کی بجاآوری سے مشروط ہو گیا۔

نیز اس امت کے متعلق یہ بھی فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (۲:۱۴۳)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

یہ آیت امتہ مسلمہ کی بلندی مقام اور بنی نوع انسان کی اصلاح کے سلسلے میں اس کے کردار کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس پر ایک عظیم ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔

امت وسط کے مفہوم کے متعدد پہلو ہیں۔ الفرائد الدریہ میں وسط کے درج ذیل معانی دیئے گئے ہیں :

To become noble distinguished (مجسمہ شرافت اور بہترین خصوصیات کے) to seat in the mile (درمیان میں ہوتا) to be equally distant from the extremea)

(افراط و تفریط سے بچ کر مقام اعتدال پر ہونا)

اللہ تعالیٰ نے وسطاً کا جامع لفظ استعمال کر کے اس امت سے اپنے اندر وہ تمام صفات پیدا کرنے کا مطالبہ کیا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اسے ان خصوصیات سے متصف ہونا چاہیے۔

بنی نوع انسان کی تاریخ کے پس منظر میں غور وتدبر کیا جائے تو اس امت کو اس لیے بھی امتہ وسطاً کہنا عین حقیقت کے مطابق ہے کہ یہ زمانہ قدیم وجدید کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتی ہے (اس موضوع پر ہم مناسب موقع پر آئندہ گفتگو کریں گے)

علامہ اقبال ملت اسلامیہ کے متعلق کہتے ہیں:

اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی مصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور

ان خصوصیات کی حامل امت کو یہ عظیم کام سونپا گیا کہ وہ ساری دنیا کو قبول ہدایت کی دعوت دے۔ یہاں شہادت کا لفظ گواہی دینے کے محدود مفہوم میں استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کے معنی دعوت کے سارے مراحل اور پہلوؤں سے عہدہ برا ہونے کو محیط ہیں۔ ساتھ ہی رسول کے اس امت پر ''شہید'' ہونے کا تذکرہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ امت کو اسی طرح اور اسی انداز سے دعوت کا کام سرانجام دینا ہے جس طرح حضور نے انجام دیا۔ مزید برآں اسی اصطلاح شہید کو حضور کی طرف منسوب کرنے سے اس کے معنی قطعی طور پر متعین ہو گئے۔ جو کام آنحضرت نے اس امت کو وجود میں لانے اور اسلام کو ایک نظام اجتماعی کی حیثیت سے برپا کرنے کے لیے کیا تھا اس کو اصطلاح ''شہادت'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہی کام حضور کے اس دنیا سے تشریف لے جانے پر اس امت کے کندھوں پر آن پڑا۔

اس نظریے کی تقویت کے لیے ہم دور حاضر کے عظیم مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر موسومہ بہ ''تدبر قرآن'' سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

''رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو'' یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شادت علی الناس کا جو فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول کے تھا آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے، اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہو گی۔'' (تدبر قرآن جلد اول ص ۳۲۰-۳۲۱)

اشاعت دین، اس کی قبولیت اور کرہ ارض پر مختلف نظام ہائے زندگی کے وجود کے متعلق ہم نے ابھی جو گفتگو کی ہے اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے بالخبر بنی نوع انسان کو دین اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس جیسا کہ ہم نے آیت (۱۸:۲۹) نقل کر کے عرض کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے

فرمایا کہ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ حق آگیا ہے جو چاہے اس کو قبول کرلے اور جس کا جی چاہے اسے رد کر دے۔ لیکن سطور بالا کی بحث سے اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی و منشا بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنے رسول سے یہ بھی کہا کہ وہ اشاعت دین کے لیے کمر ہمت باندھ لیں اور امت مسلمہ پر بھی یہ بات واضح کر دیں کہ تم پر ساری دنیا کی آبادی کے سامنے اسی طرح دین کو پیش کرنا ہے جس طرح میرے رسول نے اسے تمہارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ ناگزیر طور پر اخذ ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کے راہ راست پر آنے اور ان سے اللہ کے دین کو قبول کروانے کا لائحہ عمل یہی ہے کہ ایک ایسی امت مسلمہ وجود میں آئے جو اپنی فکری و عملی زندگی پر دین اسلام کو ہمہ جہتی طور پر نافذ کرے۔ اس کے بعد وہ سطور بالا میں دی ہوئی آیات (۳۱:۱) اور (۲:۱۴۳) کے مطابق تمام دوسری اقوام اور انسانوں کے سامنے اس دین کی حقانیت کو واضح کریں۔ تبلیغ سے بھی اور مثال قائم کرنے کے ذریعے سے بھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس درجے میں اور جس پیمانے پر یہ طریق کار اختیار کیا گیا اس کے خاطر خواہ نتائج بر آمد ہوئے۔ دین کو کلیتاً اپنانے والے. مبلغین اسلام نے ایسے ایسے علاقوں اور قوموں تک دین کی دعوت پہنچائی جہاں کا تمدن بھی ان کے لیے اجنبی تھا اور جن کی زبان بھی مختلف تھی۔ لیکن دین کو اس کی صحیح شکل میں پیش کرنے اور خود اس کے اصولوں کے اتباع کی عملی مثال کا مظاہرہ کرنے کا یہ اثر ہوا کہ دور دراز علاقوں کی آبادیاں جہاں مسلمانوں کے سیاسی اثر کا بھی نفوذ نہیں ہوا حلقہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

کسی مقصد کے حصول کے ذرائع کا تعین ضروری ہے۔ اس کے بعد ان ذرائع کو اختیار کرنے ہی سے وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر مقصد کا تصور بھی ذہن تک محدود ہے اور اس کے حصول کے ذرائع کے لیے بھی کوئی قدم نہ اٹھایا جائے تو عمل کے دائرے میں کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکتا بلکہ اس بے عملی کا مال مقصد اور ذرائع کے سلسلے میں لایعنی اور بے وزن قسم کے اختلافات کی شکل میں رونما ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ جب آپ کسی کام کو عملاً سرانجام دے دیں اور اس کے نتائج حسنہ کھل کر سامنے آجائیں تو اس صورت میں کسی کو اس مقصد کی افادیت کے حق میں اور استدلال سے قائل کرنے کی ضرورت یا تو ہوتی ہی نہیں یا اس میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے۔ جو تیقن آنکھوں کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے وہ محض عقلی دلائل سے وجود میں نہیں آسکتا۔ اس وقت اسلام اور اس کے نفاذ کے امکانات پر جو اشکالات پیدا ہو رہے اور جو اس وقت زیر بحث ہیں ان کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمان زبان سے اسلام کیا حقانیت کا اعتراف کرنے کے باوجود اس کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ضابطے کے طور پر نہیں اپنا رہے۔ دور رواں میں کرہ ارض کے مختلف ممالک اور خطوں میں جو نظام

چل رہے ہیں ان کا تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقتاً عدل، مساوات اور آزادی کی بنیاد پر قائم نہیں ہیں۔ ہم موزوں مقام پر حقائق اور اعداد و شمار پیش کر کے یہ ثابت کریں گے کہ بنی نوع انسان کا بیشتر حصہ اپنے جائز حقوق سے مردم اور ظلم کی چکی میں پس رہا ہے۔ اس صورت حال کے خلاف بعض افراد اور حلقوں کی طرف سے صدائے احتجاج بھی بلند ہو رہی ہے۔ لیکن مراعات یافتہ طبقات اور اقوام متحدہ کی مادی قوت اور نشر و اشاعت کے ذرائع کے استعمال سے ایسی آوازیں دب جاتی ہیں۔ البتہ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ بنی نوع انسان کے معاملات کے متعلق بحیثیت مجموعی، زبوں حالی، عدم استحکام، فقدان مساوات اور اطمینان و مسرت سے محرومی کا احساس روز افزوں ہے۔ اس کے نتیجے میں اصلاح احوال کی کوششوں کے دعاوی کیے جا رہے ہیں لیکن یہ زبانی جمع خرچ ان طاقتوں اور عناصر کی طرف سے ہو رہا ہے جو خود اس خرابی کے ذمہ دار ہیں۔ وہ اپنی اس روش سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں جو اس صورت حال کو وجود میں لانے کا باعث ہے۔ اگر کسی مرض کو ختم کرنے کے لیے ان بے اعتدالیوں سے گریز نہ کیا جائے جو اس کا موجب ہوں اور مثبت طور پر علاج معالجے کی طرف توجہ نہ دی جائے تو شفایابی کی آرزوئیں فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتیں۔

مسلمان زبانی طور پر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس دنیا میں مروجہ خرابیوں کا حل موجود ہے۔ لیکن خود اسلام پر عمل پیرا ہونے سے گریزاں ہونے کی وجہ سے یا تو ان کا یہ دعویٰ صدا بصحرا ثابت ہو رہا ہے اور یا اغیار اور خود اپنے اندر کے مغربی افکار سے مرعوب اور اسلام کی تعلیمات سے بے خبر لوگ دور حاضر میں اس دین کے قابل عمل ہونے کے سلسلے میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگرچہ اسلام کے اصولوں کی نشر و اشاعت کی اشد ضرورت ہے لیکن جب تک ان کا عملی مظاہرہ نہیں کیا جائے گا اس دین کے ذریعے سے ان دکھوں کا علاج ممکن نہیں جن کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں مسلمان نہ ''امت وسط'' کہلانے کے حق دار ہیں اور نہ ''شہداء علی الناس'' کے مقام پر فائز ہو سکتے ہیں۔

دین اسلام کو عمل کے دائرے میں نافذ کر کے دکھایا گیا ہے۔ اسی لیے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳:۱۲)

ترجمہ: اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

دین کے قابل عمل ہونے اور رسول کے ذریعے سے اس کو کلیتاً برپا کر دینے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر حضور نے صرف وعظ و تلقین اور تقریر و خطاب

کے ذریعے سے اسلام کے اصول بیان کرنے پر اکتفا کیا ہوتا تو ''اسوۂ حسنہ'' کے الفاظ استعمال نہ ہوتے۔ یہ الفاظ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ آپ نے پورے کے پورے اسلام پر خود بھی عمل کیا اور جس تمدن اور اجتماعی نظام کے لیے سعی وجہد کر کے آپ نے اس کو برپا کیا وہ اسلام کی ایک واضح تصویر تھی۔ اللہ تعالیٰ گویا، یہ فرمارہا ہے کہ جس نے اسلام کو سمجھنا ہو وہ رسول کے عمل کو دیکھ لے۔ ہماری اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جس اشکال کا ہم نے آغاز میں تذکرہ کیا تھا اس کو دور کرنے کے لیے ان متعدد عوامل کو ذہن نشین کرنا ہوگا جنہیں ہم نے بیان کیا ہے۔

انفرادی اصول اور دین کا مجموعی تصور

اگر اسلام کو ایک دین (مکمل نظام فکر و عمل) کی حیثیت سے اپنانا مقصود ہو اور اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنانا ہو تو اس کے ایک ایک اصول کو اس کے مضمرات سمیت سمجھنے کے علاوہ ایک مربوط ضابطہ زندگی کی حیثیت سے اس کے واضح تصور کو بھی ذہن نشین کرنا ہوگا۔ مزید برآں اس کے مجموعی خاکے میں ہر اصول کے کردار اور اس کے مقام کا واضح تصور بھی ذہنوں میں ہونا چاہیے۔ اس وقت مسلمانوں کی اسلام کے متعلق یہ ذہنی کیفیت ہے کہ وہ ہر انفرادی مسئلے پر اس کو اسلام کے مجموعی نظام سے لاتعلق کر کے سوچتے ہیں۔ اس لیے ہر ایسے غلط کار رہنما کے جال میں پھنس جاتے ہیں جو ایک آدھ مسئلے کو، جو اکثر فروعات سے تعلق رکھتا ہے، اچھال کر اس پر سارے دین کا ٹھپہ لگا دیتا ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ ایک یا چند مسائل کا محض تذکرہ کر دینے یا ان کو دھواں دھار تقریروں کا موضوع بنا لینے سے دین کا پورا فہم کیسے پیدا ہو جائے گا یا اس کے نفاذ کے لیے راستہ کسی طرح ہموار ہو جائے گا۔

اپنی ساری تاریخ میں مسلمان عوام کے ضمیر نے عام طور پر اور علما نے خاص طور پر اسلام کے کسی اصول کو فراموش نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ خلافت راشدہ کے بعد جزواً جزواً اسلام کو اپنانے کے علی الرغم اس دین کو باضابطہ طور پر اپنی حیات اجتماعی کا مکمل لائحہ عمل بنانے سے محروم رہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن کا تذکرہ مسلمانوں کی تاریخ کے باب میں کیا جائے گا۔ یہاں ہم اس بنیادی وجہ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے دین کا مجموعی تصور لے کر نفاذ دین کی کوشش نہیں کی۔ اور اگر مثلاً شہید دین رحمہ اللہ کی طرح کوئی پورے دین کے تصور لے کر کار دعوت کے لیے اٹھا ہے بھی تو کم فہمی اور مفاد پرستی کی وجہ سے اسے مسلمانوں کی طرف سے اسے درجے کی حمایت حاصل نہیں ہوئی جو ایسے جلیل القدر اور ہمت طلب کام کے لیے ضروری ہے۔

اس طرز عمل کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ ملی سطح پر اصل مقصد کے واضح اور مجموعی تصور کے بجائے جزیات پر توجہات مرکوز رہی ہیں۔ کلیات کی طرف قدم نہیں بڑھایا جو فکر کی تعمیر کا اصل ذریعہ ہیں۔

کسی نے کہہ دیا نظام صلوۃ قائم کرو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ نہ خود سوچا اور نہ دوسروں کو سمجھایا کہ اسلام میں نظام صلوۃ کا مقام کیا ہے۔ اس سے تعمیر خودی کیسے ہوتی ہے۔ اس میں قیام دین کے لیے استمداد کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں اجتماعیت کو تقویت حاصل ہونے کا عصر بھی شامل ہے۔ اور اللہ نے یہ جو فرمایا کہ واستعینوا بالصبر والصلوۃ تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز ذریعہ ہے قیام دین کے سلسلے میں آزمائشوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا۔ ادائے نماز کے بعد کے بھی مقامات ہیں۔

کسی نے اپنی سیاست چلانے کے لیے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ حکمرانوں سے، چاہے وہ جس نظریے اور کردار کے مالک ہوں، مطالبہ کرو کہ وہ اسلامی نظام قائم کریں۔ ایسا مطالبہ کرنے سے ایک ایسے معاشرے میں جو سراسر غیر اسلامی بنیادوں پر تعمیر ہوا ہے اسلام سے لاتعلق حکمران کیسے اسلام برپا کر دیں گے۔ اس کی وضاحت کوئی نہیں کرتا۔ صرف اسلام کی لاٹھی سے سیاسی مخالفوں کو مارنا اور عوام کے جذبات سے کھیلنا مقصود ہوتا ہے۔ تاریخ نے آج تک یہ تماشا نہیں دیکھا کہ حکومت کے ایوانوں سے حق کی آواز اٹھی ہو اور اس کے ذریعے سے حق قائم ہوا ہو۔

کوئی یہ انوکھا نظریہ پیش کر دیتا ہے کہ اگر اسلامی دستور بن جائے تو خود بخود اسلامی نظام بھی قائم ہو جائے گا۔ حالانکہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ انقلابات پہلے آتے ہیں اور طرز حکومت کے سلسلے کے قوانین بعد میں وضع ہوتے ہیں۔ چاہے انقلاب اسلامی اصولوں کی روشنی میں لایا جائے یا اس کے محرکات غیر اسلامی ہوں۔

ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اتحاد بین المسلمین کا نعرہ بلند کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں واضح کرتے کہ یہ اتحاد کس لائحہ عمل کے ذریعے سے رونما ہوگا۔ اس کو وجود میں لانے سے کیا مقصد حاصل کرنا پیش نظر ہے۔ اور اس اتحاد کو بروئے کار لانے کے لیے کس نوعیت کی جدوجہد کرنا ہوگی۔

کوئی صفحہ قرطاس پر اپنے قلم کی جولانیوں کا مظاہرہ کر کے اسلام کے متعلق کچھ مضامین شائع کر دیتا ہے۔ جماعت سازی کر کے ارکان جماعت کو ان مضامین پر مشتمل کتابوں کو تبلیغ دین کے نام پر بیچنے کی ذمہ داری سونپ دیتا ہے۔ تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ ان کتابوں کی نشر و اشاعت کے ذریعے سے انقلاب اسلامی برپا ہو جائے گا۔ عشروں پر عشرے گزرتے جاتے ہیں لیکن تبدیلی کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس لٹریچر میں اتنی اثر انگیزی ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی انقلاب کا ذریعہ ثابت ہو سکے۔

اللہ کے دین کے معاملے میں خوف خدا سے بعضوں کے قلوب اس قدر خالی ہو گئے ہیں کہ وہ اپنا نصب العین تو اسلامی نظام کا قیام بتاتے ہیں لیکن اپنے آپ کو سیاسی طور پر نمایاں کرنے کے لیے خلاف اسلام اور صریحاً بد دیانتی پر مبنی ذرائع استعمال کر کے منتخب شدہ اسمبلیوں میں جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ وہاں پہنچ کر اسلام کو برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے لیے ایک طرف تو وہ مسلمانوں کی زکوٰۃ و عشر اور دوسرے صدقات کی رقوم بے دریغی سے خرچ کرتے ہیں اور دوسری طرف انتخابات کے دوران ہر قسم کے اور مجالس قانون ساز کے اندر ایسے عناصر سے تعاون کرتے ہیں جو یا تو سیاست کو اسلام کے تابع کرنے ہی کے خلاف ہوتے ہیں یا سرے سے اس معاملے سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ اسلام کے ان دعویداروں کی مثال ایسی ہے:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (۲:۹)

ترجمہ: یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں۔

کسی نے قصر اقتدار سے تعلق قائم کرنے کو حق بجانب قرار دینے کے لیے یہ دلیل وضع کر رکھی ہے کہ اس سے ہم حکمرانوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ حالانکہ تاریخ اسلام سے قطعی شواہد ملتے ہیں کہ علماحقہ ہمیشہ، ان مسلمان، حکمرانوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے جو ان کے ذریعے سے بعض شعبوں میں دین کے اصولوں کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس معاملے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی مثال بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے پیٹھ اور سر پر کوڑے کھائے اور حوالہ زنداں بھی ہوئے لیکن ساری مملکت کے قاضی القضاۃ (Chief Justice) کا منصب قبول نہیں کیا۔ ظاہر طور پر اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے نظام کا جزو نہیں بننا چاہتے تھے جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی تعریف میں نہ آتا ہو۔ اس معاملے کی وضاحت تاریخ اسلام سے متعلق حصہ کتاب میں کی جائے گی۔

ایسے سطحی خیالات کا اظہار اور اسلام کے نام پر اس کی روح کے خلاف حرکات اتنی کثرت سے کی جا رہی ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ ہم نے صرف اظہار مدعا کے لیے چند مثالیں پیش کی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اسلام کے اجتماعی نظام کا خاکہ پوری طرح ذہن میں مستحضر ہیں رکھا جاتا رہا۔ ایک ایک مسئلے کو الگ الگ لیا جاتا ہے۔ قرآن و سنت جو مل کر ایک شعبہ زندگی کے سلسلے میں مجموعی تصور دیتے ہیں، کے سارے مواد کو

سامنے رکھ کر اس شعبہ زندگی کے خدوخال کو متعین کرنا چاہیے۔ اسی طرح یہ شعبے بھی ایک دوسرے سے ربط و تعلق رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے اسلام پر اصطلاح دین (Ideology) کا اطلاق ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حضور نے اپنی حیات طیبہ میں جو اعمال حسنہ سرانجام دیئے ان کو ہمیشہ الگ الگ زیر غور نہ لایا جائے۔ اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ آپ کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس یہ سوچا جائے کہ حضور نے زندگی کا کیا مجموعی تصور دیا۔ یہ بھی سوچا جائے کہ کون سے احکام ابدی سچائیوں اور احساسات دین کی حیثیت رکھتے ہیں اور کون کون سے فروعات کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس معاملے میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آئمہ سلف کی رہنمائی ثقہ کتب میں محفوظ ہے۔ بعض معاملات میں حضور نے امت کو پابند نہیں کیا۔ وہ ایسے معاملات ہیں جن کے تقاضے زمان و مکان کی تبدیلی اور مصالحہ کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔ اس وہ سلسلے میں امت کو اجتہاد کا حق دیا گیا ہے جو امت کی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ انفرادی قوت تفکر کو جلا اور اجتماعی استعداد تدبر کو فروغ دیتا ہے۔ اس سے علمی سرگرمی کو تحریک ملتی ہے لیکن اجتہاد ایک دینی عمل ہے اس کے ذریعے سے طے شدہ مسائل بھی اسلامی فکر اور اجتماعی نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اجتہاد بہر حال دین کی رو کو مد نظر رکھ کر کیا جائے گا۔ لہٰذا اس کے نتائج فکر دین ہی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ابن خلدون نے ''مقدمہ'' میں لکھا ہے:

''ہر شخص جانتا ہے کہ شریعت کے اصل ماخذ کتاب و سنت ہیں۔ لہٰذا اجتہاد ممکن نہیں تاوقتیکہ حدیث و سنت پر بھی وسیع اور گہری نظر نہ ہو۔ اس لیے اگر کوئی حدیث میں قلیل البضاعت ہے تو اجتہاد کے دائرے میں قدم رکھنے سے پہلے وہ علم حدیث حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کرے گا اور روایات کا ممکن حد تک ذخیرہ فراہم کرنے کی سعی کرے گا تاکہ اصول صحیحہ سے دین اخذ کرلے اور صاحب شریعت کے اغراض کے مطابق استنباط احکام کرے۔

(''تاریخ افکار علوم اسلامی'' مصنف علامہ راغب الطباخ ترجمہ از افتخار علی بلخی جلد دوم صفحہ ۴۶)

اس اقتباس سے ابن خلدون کے نزدیک دین اسلام کی مجموعی تعلیمات کا تصور قائم کرنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس تصور کو پس پشت ڈال دینے سے مسلمانوں میں فروعات پر مخالفتوں نے جنم لیا۔

مسلمان اسلام کی مجموعی تعلیمات کا عکس ہوتا ہے

مسلمان کی حیثیت سے انسان کا مقام و مرتبہ کسی ایک عمل سے چاہے وہ جس قدر بھی غیر معمولی ہو، متعین نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی میں اس کے مجموعی طرز عمل کو پیش رکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے قرآن و سنت سے اخذ کردہ معیار خیر سے کس حد تک مطابقت اختیار کی۔ غیر مسلموں میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جنہوں نے کسی اصول کی خاطر مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ جانوں کی انہوں نے بھی بازی لگائی۔ کسی نے قومی آزادی کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ کسی نے خدمت خلق کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ کسی نے علم کے کسی دائرے میں ذہنی کاوش کی اعلیٰ مثل قائم کر دی۔ اس طرح کئی قسم کے اعمال حسنہ ہیں جن میں سے ایک ایک دو دو کو مختلف افراد مقصد حیات بناتے رہے۔ لیکن اسلام مومن کو زندگی کے مجموعی نقشے میں ایک خاص مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کے لیے ایسے قواعد و ضوابط تجویز کرتا ہے جو اس کے فکر اور عمل دونوں کو محیط ہوں۔ اس کو یہ گوارا نہیں کہ ایک شخص علم کی کسی ایک صنف میں درجہ کمال تک رسائی حال کر لے لیکن اخلاقی لحاظ سے تحت الثریٰ میں گر جائے۔ کوئی فرد خدمت خلق کے کسی شعبے میں اپنی پوری توجہ صرف کر دے لیکن اپنے اور کائنات کے خالق کے وجود ہی سے انکار کر دے، کوئی عوام کی معاشی بدحالی سے پریشان ہو کر علمی اور عملی میں سے کسی ایک یا دونوں دائروں میں منصفانہ تقسیم دولت کے لیے کوشاں ہو لیکن انسانی کردار کے دوسرے تمام محاسن کو نظر حقارت سے دیکھنا اپنے مسلک کا جزو اہم قرار دے لے۔ اسی پر آپ دوسرے سب ایسے افراد کو قیاس کر لیں جو ایک آدھ اچھے کام کو سرانجام دے کر انسان کی دوسری تمام فطری خوبیوں کو نظر انداز کر دینے کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلام فرد کو تزکیہ قلب و نظر کے علاوہ ان سب کارہائے خیر سے مزین دیکھنا چاہتا ہے جن کی وہ تعلیم دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسلام کے اسی اصول کی ترجمانی کرتے ہوئے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

گویا، اصلاح فرد و معاشرہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام کا مقصد انسان کے اندر فکر و کردار کی وہ خصوصیات پیدا کرنا ہے جس کے لیے تقویٰ کی جامع اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس میں اسلامی فکر اور عمل دونوں شامل ہیں۔ اور اسلام کی پر بھی اس کی مقدرت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، جیسا کہ فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ (۲:۲۸۶)

ترجمہ: اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔

گویا، یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اسلامی فکر کی بلندیوں اور اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل کرنے اور عمل کے دائرے میں سعی و جہد کرنے کی ذمہ داری انسان پر اس کی عملی استعداد اور قوت عمل کے مطابق عائد ہوتی ہے۔ کسی ہدایت یا اصول کو نظر انداز کر دینے کی قطعاً اجازت نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ (۲:۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت (اسلام) میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

دین کے ہر اصول، ہر نظریے اور اس کے فکر کے ہر گوشے پر ایمان لانا لازمی اور شعبہ ہائے اخلاق، سیاست، معیشت اور اجتماعی زندگی کے متعلق تمام معاملات میں جو اصولی ہدایات دی گئی ہیں ان کو روبہ عمل لانا ضروری ہے۔ معاشرے میں جو جس حیثیت کا مالک ہو گا اس کی ذمہ داریاں اسے اللہ کے سامنے جوابدہی کے تصور کے ساتھ ادا کرتا ہوں گی۔

نظم کے ماخذ اور اسلام

افراد کی تہذیب اخلاق کا مرحلہ طے ہونے پر ان کے اندر کسی تکلف کے بغیر ضرورت نظم کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ جس درجے میں تعمیر اخلاق ہو گئی، ہی کی مناسبت سے بھی نظم میں خیر کا پہلو اجاگر ہو گا۔ اسی طرح فقدان بد نظمی منتج ہو گا۔ تاریخ انسانی شاہد ہے کہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء و ترقی کے مظاہر و علامات میں نوعیت نظم کو بہت اہم عامل کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق انسانی زندگی اور معاشرے کو مرتب کیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کے بہترین مفاد کے لیے ہی نظم ایسے صالح اصولوں کی بنیاد پر برپا ہونا چاہیے جن کے ذریعے سے انسان کے ظاہر و باطن میں خوبی اور عدل کو تحریک ہے نہ کہ فساد اور تخریبی رجحانات کو۔ اس کے علاوہ اس کا ہمہ جہتی اور مربوط ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر کیفیت اس کے برعکس ہو گی تو اس پر علم کی اصطلاح کا نفاذ نہیں ہو گا۔

ویسے تو غیر مہذب انسانی اجتماعی اکائیاں بھی کسی نہ کسی نوعیت کا نظم رکھتی ہیں۔ جنگلوں اور ویرانوں میں رہنے والے خاندان اور قبیلے بھی ماضی و حال میں اپنا کوئی نہ کوئی باہمی تعاون کا اسلوب اپناتے رہے ہیں۔ لیکن اس میں اجتماعی زندگی کی اعلیٰ قدروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نہ ان کا تصور و نفاذ۔ بلکہ یہ نظم چند ایسی رسومات اور تعاون کی شکلوں پر مشتمل ہے جو زندگی کے محدود تصور کے تحت ان کی ہنگامی ضرورتوں اور اپنی حفاظت اور متقضیات شکم کے لیے کفایت کر سکیں۔

آج کل بھی جن معاشروں کو تمدن اور تہذیبی برتری کا دعویٰ ہے وہ نظم و نظریات کے لحاظ سے نامکمل ہیں۔ ان کی عدم تکمیل کے اپنے اپنے مخصوص پہلو ہیں۔ کوئی تخلیق کائنات اور اس کے انجام کو سرے سے نظر انداز کیے بیٹھا ہے۔ کوئی اس سلسلے میں تشکیک کی بیماری میں مبتلا ہے۔ اس سے ذمہ داری کے فقدان سے جو اخلاقی واقعہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے تنظیم معاشرہ میں بہت سے سقم ذہنوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اخلاقی سطح پر جوابدہی کا تصور افراد کے ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے اور اس کا نام آزادی فکر و عمل رکھ دیا جاتا ہے۔ ایسے تمدن بھی وجود میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جن میں ضروریات شکم کو اولین ترجیح دے کر انسانوں کو حیوانوں کی سطح پر گرا دیا گیا۔ اس طرح ان پر ایسا نظم مسلط کرنا پڑا جس کی بنیاد جبر پر رکھی گئی۔ بعضوں کا نظم معاشرت و سیاست کسی طبقہ یا نسلی و لونی اکائی کی برتری کے تصور پر استوار کیا گیا اور اعلیٰ انسانی قدروں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔

ہم نے چند مثالیں یہ واضح کرنے کے لیے دی ہیں کہ تنظیم و تمدن کا تعلق براہ راست ان نظریات سے ہوتا ہے جن کی بنیاد پر اسے وجود میں لایا جائے۔ اگر وہ نظریات انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کو محیط ہوں، اس میں عدل و توازن ہو گا۔ اگر کوئی نظم کسی پہلو کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے گا اور بعض کو نظر انداز کر دے گا تو اس میں عدم توازن کے جراثیم موجود ہوں گے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے جراثیم کی نمود و پرورش کے ذریعے سے معاشرے کے اندر تضادات اور کشمش کی مختلف صورتیں ظاہر ہونا شروع ہوں گی۔ اسی وجہ سے ان مظاہرات کی روشنی میں مارکس جیسوں کو مادہ پرستانہ جدلی عمل (Dialectical Materialism) اور ہیگل کا انداز روانی رکھنے والوں کو جدلی عمل کی کارگزاری فکری سطح پر دکھائی دی۔ تاریخ انسانی کی روانی کی اول الذکر تعبیر تو مارکسزم کے مکمل انہدام کی وجہ سے غلط ثابت ہو چکی ہے۔ اور موخر الذکر بوجوہ خیالات و تصورات کی دنیا سے وابستہ ہے۔ اگرچہ مارکس نے مادی سطح پر اپنے نظریہ اشتمالیت کی بنیاد کے طور پر مادہ پرستانہ جدلی عمل کو وضع کرنے میں ہیگل ہی کا اثر قبول کیا تھا۔

لیکن اسلام کا انداز فکر بالکل الگ ہے۔ وہ حالات کے تابع رہ کر نظریات پیش نہیں کرتا بلکہ حالات کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالتا ہے اور وہ ہر قسم کے اچھے برے فکر اور زمانے کی روش کے ساتھ سازگاری اختیار نہیں کرتا، نہ ان کو سامنے رکھ کر اصول وضع کرتا ہے بلکہ اس کے اپنے اصول ہیں۔ وہ ان کے مطابق انقلابی کام کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بقول علامہ اقبال رحمہ اللہ وہ کہتا ہے۔

زمانہ باتو نہ سازد تو باز مانہ ستیز

یعنی اگر مروجہ حالات تمہارے اصولوں کے مطابق نہیں ہیں تو ان سے نبرد آزما ہو کر ان کو اپنے نظریات کے سانچے میں ڈھالو۔

مغربی تفوق کے دور میں افکار کی جتنی قسموں کا ظہور ہوا ہے ان کی بنیاد مبنی بر ہے فساد معاشروں اور اجتماعی نظاموں کے حالات کی متضاد تعبیروں پر رکھی گئی ہے۔ اور ان تعبیروں کو فطرت انسانی کے ہم معنی قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلام فساد کی ہر شکل کو مردود قرار دیتا ہے اور اس کی اساس پر قائم شدہ ہر نظریے اور نظم کو مٹا کر انسان کو متوازن اور مبنی بر عدل نظم قائم کرنے کی مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ہم یہاں اشارۃً یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام کی دی ہوئی ہدایت کو نظر انداز کر کے بنی نوع انسان کئی قسم کے انصاف ناشناس نظاموں کو اپنائے ہوئے ہے۔ ایک تجربہ ناکام ہوتا ہے تو اس کے اسباب ناکامی پر معروضی انداز سے سوچنے کے بجائے اس کی خرابیوں کے ذمہ دار طبقے یا عناصر کے خلاف جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک ایسے نظم پر سوچوں کو مرکوز کر دیا جاتا ہے جو ان طبقات اور عناصر کے عناد کو اولین ترجیح دے۔ اس طرح عدم توازن کی ایک اور شکل و صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام ظلم و زیادتی کو ختم کرتا ہے لیکن ان حلقوں کو نشانہ جور و ستم نہیں بناتا جو اس کے ذمہ دار ہوں بلکہ ان کی اصلاح کرتا ہے۔ اور سارے معاشرے کو ایک ہی سطح پر رکھ کر ہر ایک شہری کو ہر شعبہ زندگی میں حسن عمل کے قدرتی مواقع فراہم کرتا ہے۔ ترتیب نظم کا آغاز کرتے وقت ہی کسی عصر کو مردود اور کسی کو ترجیحی سلوک کا اہل قرار نہیں دیتا۔ اس کے باوجود اگر صلاحیتوں کے قدرتی تفاوت اور بعض شہریوں کو ناسازگار مواقع سے واسطہ پڑنے کی وجہ سے معاشرے میں جو جو عدم توازن کی صورتیں پیدا ہو جائیں ان کی اصلاح کے لیے واضح اور غیر مبہم ہدایات و احکامات دیتا ہے۔ ان کی صراحت حسب موقع کی جائے گی۔

اسلام میں فرد اور جماعت کا تعلق

اگرچہ اسلام اجتماعی نظام کے لیے مفصل اصولی ہدایات واحکامات دیتا ہے لیکن ان کے نفاذ کے لیے اس معنی میں جبر کی تعلیم نہیں دیتا جس سے کسی قسم کا کلیت پسندانہ نظام (Totalitarian System) وجود میں آجائے۔ وہ اپنے مخصوص انداز کے ذریعے سے فرد اور معاشرے (Society) کا تعلق استوار کرتا ہے۔

پہلی قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ قاہرانہ نظاموں کے برعکس جو اپنے فکری اساسات رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، دین کے غلبے کے باوجود کسی فرد کو اسلام قبول کرنے کے متعلق مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کہتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۚ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲:۲۵۶)

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے۔

گویا، اسلام کا دعوی یہ تو ہے کہ زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ بتا دیا گیا ہے اور غلط راستوں کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کے باوجود اول الذکر راہ عمل اختیار کرنے کے سلسلے میں کسی پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ مذکورہ آیت کے اس حصے سے جو ہم نے نقل کی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام تعمیر فکر اور تعمیر سیرت و کردار کا انتظام کرتا ہے۔ اس صورت میں ہدایت اور گمراہی میں امتیاز کیا جاسکتا ہے اور اتمام حجت کی بھی یہی صورت ہے لیکن دین کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار فرد کو حاصل ہے۔ البتہ آخرت میں اس کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس اصول کے تحت جبر بھی نظام کی نفی ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے کوئی رعایت نہیں۔ اسلام کا اصل مقصد ان کے اندر فکر و نظر اور سیرت و کردار کی وہ خصوصیات پیدا کرنا ہے جس کے لیے تقویٰ کی جامع اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ قرآن و سنت کی جملہ تعلیمات کا منتہا یہی ہے۔ اگرچہ انسان اس دنیا میں اکیلا آتا ہے اور اکیلے ہی اسے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ اخروی زندگی میں بھی انفرادی حیثیت سے اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخصوص فطرت، رجحان، طبیعت اور قوائے فکر و عمل دیئے ہیں۔ اس کی تدبر و تفکر اور فہم دین کی صلاحیتوں، اس کی زندگی کی بقا اور تسلسل نوع کے لیے ایک نظام مقرر کیا ہے۔ ان خصوصیات کی مقتضیات کے تحت وہ محض انفرادی حیثیت سے اس زندگی کو نہیں گزارتا بلکہ وہ بنی نوع انسان کی اجتماعی ہیت کا حصہ بن کر اسے بسر کرتا ہے۔

اس لحاظ سے ایک مسلمان کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک باطنی اور دوسرے ظاہری۔ اول الذکر کا تعلق اس کی نیت اور تعلق باللہ سے ہے اور آخر الذکر کا معاشرے میں اس کے کردار ہے ہے۔ اسلام ان دونوں میں کلی تطابق کا تقاضا کرتا ہے۔

اسی بات کو واضح کرنے کے لیے حضور نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات (بخاری)

ترجمہ: اعمال کے لیے نیت کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہاں ہم اس موضوع کے سلسلے میں اسی ایک حدیث کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کا آغاز اسی سے کیا ہے۔ ہر کام میں اس کا جذبہ محرکہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اچھے اعمال اگر حصول رضائے الٰہی، خدمت خلق کے خالص جذبے، اور اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کی غرض سے کیے جائیں تو وہ اعمال سرانجام دینے والے کے لیے بھی مفید ہوتے ہیں اور معاشرے میں بھی اس سے خیر و برکی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اگر یہ کام سیاسی اغراض اور ریا کی نیت سے کیے جائیں تو یہ تزکیہ اخلاق کا باعث بھی نہیں بنتے اور معاشرے کی فضا بھی مکدر ہوتی ہے۔ ان کاموں کے ذریعے سے بعض لوگوں کو وقتی فائدہ تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن اسلام اعمال حسنہ کو جن معاشرتی خوبیوں کو پروان چڑھانے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے وہ وجود میں نہیں آتیں۔ قرآن باطنی صفائی کا یہ معیار مقرر کرتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ(۲:۸)

ترجمہ: مومنوں کی حالت تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اللہ کے حکم ان کو سنائے جاتے ہیں تو ان کے ایمانوں میں زیادتی (پختگی) ہو جاتی ہے۔ اور وہ (ہر حال میں) اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا حدیث اور آیت ایک مسلمان کے لیے اسلامی نکتہ نظر سے اپنی باطنی کیفیت کا اندازہ کرنے کے لیے واضح منزل فراہم کرتی ہیں۔ یہ گویا، مقیاس ہیں جو اس ایمان کو اس پر منکشف کر سکتے ہیں۔ اس کا اثر اس معاشرے پر منعکس ہو گا، جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ جس نسبت سے مسلمان اپنے اندر یہ باطنی خصوصیات پیدا کریں گے، اسی درجے کا صالح اجتماعی نظام قائم کر سکیں گے۔

انسان کے ذہن و فکر اور قلب و نظر کی اندرونی دنیا بھی اسی طرح وسیع اور پیچیدہ ہے جس طرح خارج کی دنیا کائناتی صورت میں اپنی وسعت و عظمت کے مظاہر کی وجہ سے اس کو حیرت زدہ کر رہی ہے، اور اسے ہر وقت دعوت تفکر وتدبر دیتی ہے۔ بنی آدم کے اندر متجسانہ رجحان بہت نمایاں ہے جو اسے اپنے انفرادی اور اجتماعی وجود اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے متعلق بہت سے سوالات کے جوابات حاصل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔۔۔۔۔۔

انسان کی داخلی کائنات کے بے شمار معنوی شعبے ہیں۔ اس کے اندر دماغ ہے جو غور وتدبر کی استعداد کا مرکز ہے۔ اسے ایک قلب دیا گیا ہے جو بظاہر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اس کے فعل پر اس کی جسمانی دنیا کی بقا کا انحصار ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ اس کے مقام بشریت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے رہنمائی اور صلاحیت عزم فراہم کرتا ہے۔ اس کے اندر اس کی خواہشات کو مطیع نہ کیا جائے تو وہ انسان کو بے راہ روی کی صحرا نوردیوں میں مشغول رکھتا ہے۔ اس کیفیت سے آزاد ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ قلب و دماغ پر ہدایت خداوندی کا غلبہ ہو اور وہ نفس انسانی کو قابو میں رکھیں۔ اس کے علاوہ اس کے اندر لطیف روح بھی موجود ہے جو جسم انسانی کو بطور سواری استعمال کرتی ہے۔ ان سارے عناصر کے عالم وجود میں آنے کی حقیقت کا تعلق علم غیب سے ہے اور اس کی تہہ تک پہنچنا انسانی عقل کی بساط سے ماورا ہے۔ انسان کی باطنی دنیا ان کے تعامل سے مرتب ہوئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اس کی شخصیت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر ان کا باہمی تعلق متوازن ہو تو انسان میں وجدان کی بلند پردازی کی استعداد بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

اس صورت حال کے تحت ہر انسان کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہر انسان کے اعضا جسم فرداً فرداً ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ساری دنیا میں کوئی دو ایسے افراد موجود نہیں جو بعینہٖ ہم شکل ہوں اور ان کو جاننے اور ان کی شناخت کرانے میں کوئی التباس پیدا ہو سکے۔

اگرچہ ہر فرد اپنی الگ شخصیت اور مزاج رکھتا ہے لیکن ہر تمدن میں ایک مشترک رنگ اس سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں نظر آتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر معاشرے اور تمدن کے اندر بعض اصول مسلمات کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کو اختلاف اور بحث مباحثے کے بغیر درست اور تعمیر تمدن کی اساسات کے طور پر تعلیم کر لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مسلمات ہر تمدن کے بنیادی فکر سے وجود میں آتی ہیں۔ اور یہ فکر ہر اس شخص کے ذہن میں پیوست ہو جاتا ہے جس نے اس تمدن کی فضا میں آنکھ کھولی ہو۔ اگر اس فکر کے تمام شعبے باہمی رابطہ رکھتے ہوں، اس میں زندگی کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت ہو اور اس کے تحت بسنے والے افراد

اس کے اصولوں پر ایمان ویقین رکھتے ہوں تو یہ خصوصیات تعمیر و ترقی کی واضح علامات ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ان خصوصیات سے کوئی معاشرہ تہی دامن ہو، اس سے مختلف و متضاد فکر و تمدن کے نظریات اس میں نفوذ کر رہے ہوں۔ اس کے افراد کے ذہن فکری سطح پر یکسو نہ ہوں اور اپنے ہی تمدنی اصولوں کے معاملے میں اس کے فکری انتشار کا اثر اس کی اجتماعی زندگی کو مضبوط اساسات پر قائم نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ یکسوئی کے ساتھ تعمیر و ترقی کے کام میں منہمک ہونے کے لیے ہر ہئیت اجتماعیہ اپنی فکری سرحدوں کی حفاظت کرے، اپنے افراد کے ذہنوں کی تعمیر کرنے اور سوچ کا انداز اپنے اصولوں کے مطابق ڈھالنے میں کوشاں رہے۔

یہ کام نرے دعاوی اور کھوکھلے نعروں سے سرانجام نہیں پاسکتا۔ اس کے لیے ٹھوس اور واضح اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شعبہ زندگی میں ایسے اداروں کا وجود میں آنا اس منزل تک پہنچنے کی لازمی شرط ہوتا ہے جو اپنے فکر کے اصولوں کی روشنی ں نظری اور عملی سطحوں پر سرگرم عمل ہوں۔ یہ کام اجتماعی ترقی کی رفتار کو پرکھنے کی کسوئی کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہی اداروں کے ذریعے سے افراد کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی میں اور انہی کے درجہ ارتقاء کا اثر معاشرے پر پڑتا ہے۔ اسلام اسی لیے فرد کی تعمیر کردار و سیرت اور ملت کے ارتقاء و ترقی کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام نے فرد کی خودی کی تعمیر اور حیات اجتماعی کی شیرازہ بندی اور تنظیم کے لیے واضح تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق اور فرائض وذمہ داریوں کو بھی بیان کر دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں (بانگ درا)

اسلام کی راہ اعتدال اور رہبانیت

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا ہے کہ انسان کی فطرت میں اپنی بہتری کی مختلف نوعیتوں کی خواہشات ودیعت کی گئی ہیں۔ ان تمناؤں میں روحانی واخلاقی سطح پر ترقی وارتقاء کے مراحل طے کرنے کا مسئلہ تاریخ انسانی میں سرفہرست رہتا ہے۔ تمام منزل من اللہ ادیان کا منتہائے مقصود یہی رہا ہے۔ انبیاء ورسل نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے اصولوں اور شریعتوں کو اپنے مخاطبین تک پہنچایا۔ بعض لوگ ان پر ایمان لائے اور بعضوں نے کفر کا راستہ اختیار کرنے ہی پر اصرار کیا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کرہ ارض کے مختلف خطوں کی آبادیاں ہمیشہ ہی کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ رہی ہیں۔ البتہ انسانوں نے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کر کے ہر دین میں حذف واضافہ کے ذریعے سے اس قدر تحریفات کر دیں کہ اس کی شکل و

صورت اور روح کو مسخ کر دیا۔ تحریفات کے اس عمل کا ایک نمایاں پہلو معاشرے سے کٹ کر محض ذاتی حیثیت سے اپنی باطنی ترقی وارتقاء کے مقصد کا حصول رہا ہے۔اس کو حیات انسان کی منزل قرار دیا جاتا ہے۔اسی طرز عمل کو رہبانیت کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا ہے۔اسلام چونکہ معروف معنوں میں مذہب نہیں بلکہ دین ہے اس لیے اس کے فکر و عمل کے نظام میں رہبانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن دوسرے تمام مذاہب میں اس کو تزکیہ باطن کی معراج تصور کیا جاتا ہے۔

ان تمام مذاہب میں مسلک رہبانیت کا سب سے پہلا اصول رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی نفی سے متعلق ہے۔ یہ رشتہ اجتماعی زندگی کے کردار کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تسلسل نوع کے لیے بھی اس کا وجود ناگزیر ہے۔انسان کے اندر دوسری تمام غیر ذی شعور حیوانی مخلوق کی طرح جنسی خواہش بڑی شدت سے موجود ہوتی ہے۔اس طرح گویا، رہبانیت کا یہ سب سے پہلا اصول جہاں تسلسل نوع انسانی کو قائم رکھنے کی فطری ضرورت کے خلاف ہے اسی طرح یہ بنی نوع انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی ہر شکل وصورت کی اصولی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات یقیناً نوع انسان کی ابتداء کے تقاضوں سے متصادم ہے۔اگر بشر اول ہی یہ مسلک اختیار کر لیتا تو یہ وجود ہی میں نہ آتی۔ عقل سلیم اس صورت حال کو قبول نہیں کر سکتی۔

دوسرے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے زندگی کو اپنی جملہ صلاحیتیں استعمال کر کے گزارنے اور معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا پابند ہے۔ ورنہ اس میں اور غیر ذی شعور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان کے مقام سے بھی گر جاتا ہے۔ حیوانوں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کی کئی اقسام میں مختلف درجوں میں اجتماعی تعاون کی صورتیں پائی جاتی ہیں اگرچہ وہ انسان کے شعور اجتماعیت کے مقابلے میں بہت ہی کم درجے کی ہوتی ہیں۔ رہبانیت کے مسلک کو اختیار کر کے انسان ان حیوانوں کے مساوی اجتماعی ذمہ داری ادا کرنے سے بھی گریز کی راہ اختیار کرتا ہے۔

تیسرے تقریباً تمام عالمی ادیان اپنی مقدس کتب کو انسان سے بالاتر اپنے تصور کی ہستی کی طرف سے نازل شدہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔اور ان کتب کو لانے والوں کو اس ہستی کی طرف سے پیغام رساں کی حیثیت دیتے ہیں یا انہی کی طرف الوہیت کا مقام منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ بات عقل انسانی باور نہیں کر سکتی کہ یہ سب حضرات انسانوں کو گھیر کر غاروں اور جنگلوں کی تنہائی میں دھکیلنے آئے تھے اور بستیوں اور معاشروں کو اجاڑنا ان کا مقصد وحید تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض ہستیوں نے بھوک، پیاس برداشت کر کے اور بنی نوع انسان سے قطع تعلق کا راستہ اختیار کر کے بڑی بڑی چلا کشیاں کی ہیں۔ عوام نے مذہب کے غلط تصور کی وجہ سے ان کے ان کارناموں کو بہت اہمیت دی ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات کے اس عمل نے بنی نوع انسان کی اصلاح اور بہبودی کے لیے کیا کردار ادا کیا۔ انسان ہمیشہ سے مختلف اقسام کی الجھنوں میں مبتلا رہا ہے۔ ضرورت ان اولوالعزم، باشعور اور اصلاح احوال کا صحیح اور مبنی بر عدل نظریات رکھنے والے اور ان نظریات کے نفاذ کے استعداد سے مزین شخصیتوں کی ہے جو انسان کے بہترین مفاد کی خاطر اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں۔ جنگلوں اور غیر آباد علاقوں میں بیٹھ کر چلا کشی کرنے والے انسانیت کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ اسلام نے اپنے ظہور کے وقت ساری دنیا پر مذاہب کے نام پر اختراع کیے ہوئے اس تصور کی کلی نفی کی۔ قرآن میں جتنے سابق انبیاء علیہ السلام کا تذکرہ ہے ان کے متعلق یہی موقف اختیار کیا گیا کہ انہوں نے اپنے مخاطین کی بداعمالیوں کی اصلاح کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بہت سے انبیاء نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ عوام عام طور پر اور صاحب اقتدار طبقات خاص طور پر انبیاء علیہم السلام کو متنبہ کرتے تھے کہ آپ ہمارے معاملات میں دخل اندازی نہ کیجئے لیکن ان حضرات کا یہی موقف اور اعلان ہوتا تھا کہ ہم مفاسد کو مٹانے اور منتہائے الٰہی کو نافذ کرنے کی سعی و جہد سے باز نہیں آئیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم برائیوں کی نشاندہی اور اچھائیوں کی تبلیغ کرتے رہیں گے۔ تم اگر ہماری بات نہیں مانتے تو ہمارے خلاف اپنا جس قدر زور و اثر استعمال کر سکتے ہو کر گزرو۔

اس طرز عمل سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انبیاء علیہ السلام کی سنت یہ ہے کہ وہ نہ ترک علائق کر کے راہبانہ زندگی بسر کریں گے، نہ معاشرے میں رہتے ہوئے بر واثم کے معاملات میں غیر جانبدار رہیں گے بلکہ آگے بڑھ کر برائی کے خلاف جہاد کریں گے اور اچھائی کو رواج دینے کے لیے پوری کوشش کریں گے چاہے اس طرز عمل کے نتیجے میں انہیں کتنی ہی مشکلات اور اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔

قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ(۴۰:۸۷)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) آپ سے پہلے ہم نے کتنے ہی پیغمبر مبعوث فرمائے، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات آپ کو سنائے ہیں، اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات آپ کو نہیں سنائے (یعنی قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

اس سے قبل ہم قرآن کی آیت (۳۵:۳۴) کا حوالہ دے کر قرآن کا یہ موقف بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت سے قبل ہر قوم کی طرف رسول اور نبی بھیجے۔

ان دو آیتوں کو ملا کر اگر غور و تدبر کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں اصولی طور پر ایک ہی تعلیم پہنچی ہے۔ اور وہ برائی کے خلاف اور بھلائی کے نفاذ کے لیے جہاد کی تعلیم تھی۔ گویا، معاملات زندگی میں اصلاح کی غرض سے بھرپور حصہ لینے کا عزم۔ لیکن لوگ اس تعلیم کو کھو بیٹھے اور اس کے بالکل برعکس ترک دنیا ہی کو انسانی کمال تصور کرنے لگے۔ قرآن تمام انبیاء کو ایک امت قرار دیتا ہے۔ بعض انبیاء کا تذکرہ کر کے وہ کہتا ہے:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۲:۱۴۱)

ترجمہ : یہ ایک امت (ایک ہی قسم کے نظریات رکھنے والا گروہ) تھی جو گزر چکی۔

اس آیت کی روشنی میں بالیقین یہ کہا جاسکتا ۔ کتا ہے کہ تمام انبیاء و رسل نے ایک ہی اصولی تعلیم دی۔ لہٰذا کسی نبی کی تعلیم میں رہبانیت نہیں ہو سکتی۔ ورنہ کرہ ارض کے ہر حصے اور ہر دور میں آنے والے تمام انبیاء کرام علیہ السلام کو ایک امت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر مزید گفتگو اس حصہ کتاب میں ہوگی جہاں ہم نے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ عالم انسانی کے اتحاد اور عالمی ریاست کے قیام کے لیے صرف اسلام ہی محکم اساس مہیا کر سکتا ہے۔

رہبانیت کے متعلق اسلام کا موقف بالکل واضح ہے۔ قرآن و حدیث زندگی کے معاملات میں جس پیمانے پر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی دائروں میں اوامر و نواہی کا پابند کرتے ہیں ان کا ترک دنیا کی صورت میں کیسے اتباع ہو ر ہے۔ اسلام کی تعلیمات سے پوری طرح عیاں ہے کہ یہ دین مسلمانوں کو اللہ اور رسول کی طرف سے مقررہ کردہ حدود اور ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے بھر پور زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ مثلاً اس سے ملتی جلتی قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں :

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ (۳۲-۳۱:۷)

ترجمہ : اے اولاد آدم ! عبارت کے ہر موقعہ پر اپنے جسم کی زیب و زینت سے آراستہ رہا کرو۔ نیز کھاؤ پیو، مگر حد سے نہ گزر جاؤ۔ خدا انہیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گزرنے والے ہیں۔ (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو" خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں، کس نے حرام کی ہیں۔"

اسی طرح ازدواجی زندگی کے متعلق ہدایات و قوانین دیے گئے ہیں۔(اسلام کے معاشرتی نظام کے عنوان کے تحت اس موضوع پر گفتگو کی جائے گی) جتنے مذاہب میں رہبانیت کی تلقین کی ہے ان سب میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہونے کو روحانی ترقی میں سد راہ ہونے اور اس کے گریز کرنے کو اس راستے کی منازل طے کرنے میں ممدو معاون قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بر عکس اسلام اس کو ایک اہم معاشرتی ذمہ داری کی حیثیت دیتا ہے۔

عیسائیت میں رہبانیت کا بڑا چرچا رہا ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے حضرت نوح اور ابراہیم علیہما السلام کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا :

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ(۲۷:۵۷)

ترجمہ : پھر ہم نے ان رسولوں کے پیچھے اور رسول بھیجے، اور ان کے بعد عیسٰی بن مریم کو رسول بنا کر بھیجا، اور ہم نے اسے انجیل دی اور جو لوگ اس کے پیرو ہوئے تھے ان کے دلوں میں ہم نے رحم اور نرمی پیدا کی تھی۔ اور انہوں نے رہبانیت اختیار کرلی جس کا ہم نے ان کو حکم نہ دیا تھا۔ مگر انہوں نے اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اسے اختیار کیا۔ پھر انہوں نے اس کے لائق اس کی رعایت ملحوظ نہ رکھی۔ پس ان میں سے جو

اصل ایمان پر مضبوط رہے تھے ان کو ہم نے ان کا پورا بدلہ دیا، اور بہت سے ان میں نافرمان تھے۔

یہ قرآن کے اعجاز اور بلند فصاحت و بلاغت کی علامت ہے کہ ایک ایک آیت میں متعدد مضامین سمو دیئے جاتے ہیں۔ درج بالا آیت ہم نے یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہے کہ قرآن کے مطابق عیسائیت میں تصور رہبانیت کو حضرت عیسٰیعلیہ السلام کے بعداختراع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالٰی نے جناب مسیح علیہ السلام کو اس کا کوئی علم نہیں دیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ اس آیت کے ذریعے سے قرآن یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ:

اولاً حضرت عیسٰیعلیہ السلام انبیاء کے سلسلے کی کڑی ہیں جس سے حضرت ابراہیم و نوح علیہ السلام اوران کے بعد مبعوث ہونے والے انبیاء و رسل تعلق رکھتے تھے۔

دوئم جو انجیل ان پر اللہ تعالٰی کی طرف سے نازل کی گئی وہ برحق تھی۔

سوئم حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان لانے والے اخلاق حسنہ سے مزین تھے۔ ان کا یہ طرز عمل اجر کا مستحق ہے۔ ان کے بر عکس جنہوں نے ان کے دین سے رو گردانی کی وہ فاسقین یعنی نافرمانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

قرآن نے اور بھی متعدد مقامات پر ادیان سابقہ کی ان تعلیمات کو برحق قرار دیا ہے اور ان کو بھی اسلام کے نام سے موسوم کیا جو اللہ تعالٰی کی طرف سے نازل کی گئیں۔ لہذا ان کی اصولی یکسانی ہوگی، تفاوت نہیں ہو سکتا۔

ہم یہاں رہبانیت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آگے چل کر حضرت مسیح علیہ السلام کے متبعین نے بے دین بادشاہوں سے تنگ اور دنیا کے مخمصوں سے گھبرا کر ایک بدعت رہبانیت کی نکالی، جس کا حکم اللہ کی طرف سے نہیں دیا گیا"۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں "فقیری اور تارک الدنیا بننا نصاریٰ نے رسم نکالی، جنگل میں تکیہ لگا کر بیٹھتے۔ نہ جو رو رکھتے نہ بیٹا، نہ کماتے نہ جوتے، محض عبادت میں لگے رہتے، خلق سے نہ ملتے، اللہ نے بندوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ (اس طرح دنیا چھوڑ کر بیٹھ رہیں) مگر جب اپنے اوپر ترک دنیا کا نام رکھا، پھر اس پردے میں دنیا چاہنا بڑا وبال ہے"

شریعت حقہ اسلامیہ، نے اس اعتدال فطری سے متجاوز رہبانیت کی اجازت نہیں دی۔ ہاں بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ اس امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے دو علماء اسلام یعنی دور رواں کے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہاور دو صدیاں قبل کے شاہ عبد القادررحمہاللہ فرزند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویرحمہ اللہ کی رہبانیت کے متعلق قرآن سے اخذ کردہ آراء کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ بیان کرنے سے ہمارا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ مسلمان علماء نے ہر دور میں رہبانیت کو اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دیا ہے۔ دراصل رہبانیت حضرت آدم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی نبی کے نزدیک کبھی بھی جائز نہ تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویرحمہ اللہ اپنی تصنیف حجتہ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :

ترجمہ : اور(یا بات) ذہن نشین کرلو کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی معاملات و ضروریات زندگی اور ان کی بہتری سے لاتعلقی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور نہ کسی ایک نبی نے بھی اس کا حکم دیا ہے۔ اور نہ(اللہ تعالیٰ نے) اس بات کا حکم دیا ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا جو پہاڑوں کی طرف فرار ہو گئے۔ اور دوسروں سے برائی بھلائی میں میل جول ترک کر دیا اورغیر متمدن لوگوں کی سطح تک گر گئے اور اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کو جنہوں نے دنیا سے لاتعلقی کا ارادہ کیا اس سے روک دیا اور فرمایا ''میں رہبانیت (کو فروغ دینے) کے لیے مبعوث نہیں کیا گیا ہوں بلکہ میں ملت حنفیہ کو وجود میں لانے کے لیے آیا ہوں۔''اور انبیاء علیہم السلام نے حیات انسانی کے معاملات میں اعتدال پیدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ (جلد اول، صفحہ۲۱۹)

جہاں تک دین اسلام کا تعلق ہے۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات بالکل واضح ہیں اور ان میں زمانے کے گزرنے کے ساتھ دوسرے ادیان کی طرح کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ یہ دین مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے کوشاں رہو۔ جیسا کہ ہم نے قرآنی آیات(۷ : ۳۱ – ۳۲) کا حوالہ دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن نعمتوں سے تمہیں نوازا ہے انہیں میانہ روی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر استعمال کرو۔ اور

اسراف سے اجتناب کرو۔ لوگوں میں دو طرح کی جو انتہائیں پائی جاتی رہی ہیں، یعنی ترک دنیا اور تعیش و بے راہ روی کی زندگی اسلام ان دونوں سے منع کرتا ہے۔

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ زخارف دنیا میں پوری طرح منہمک ہو جانے کا نتیجہ ہر قسم کی ناجائز نفسانی خواہشات کے اتباع کی شکل میں ظاہر ہوتا اور اخلاقی حدود کو یکسر نظر انداز کر دینے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ اذہان و قلوب ہر قسم کے تمرد و طغیانی کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ لہٰذا اسلام اس دنیا میں کھو جانے سے اجتناب کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ(۱۰:۷۔۸)

جو لوگ(مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، صرف دنیا کی زندگی ہی میں مگن ہیں اور اس حالت پر مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کا(آخری) ٹھکانا دوزخ ہو گا۔ یہ سبب اس کمائی کے جو(خود اپنے ہی عملوں کے ذریعے سے)کماتے رہتے ہیں۔

سورۃ یونس کی ان دو آیات سے قبل رسالت محمد اور کائنات کے بعض مظاہر کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت تخلیق اور تدبیر امر کو توحید و وجود باری تعالیٰ کی علامات کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ان دو آیات میں متنبہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان نشانیوں کے مشاہدے کے باوجود ہماری طرف پلٹنے کی توقع نہ رکھنے کی وجہ سے اس دنیا ہی سے وابستہ ہوگئے ہیں اور اسی کو مقصود و مطلوب بنا لیا ہے۔ وہ بالآخر آگ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ اپنے احکامات کے مطابق انہیں ارضی زندگی کو اس کی نعمتوں سے حدود اعتدال کے اندر رہتے ہوئے لطف اندوز ہونے کی تو انسان کو اجازت دیتا ہے لیکن اس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنا اور اسی پر قانع ہو جانا اس کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

ایسی آیات قرآنی اور احادیث نبوی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول کا منشا یہ ہے کہ مسلمان اس دنیا میں دل نہ لگائے اور اس کے زخرفات سے دور رہے۔ لیکن

ایسے آثار بھی موجود ہیں جن کے ذریعے سے مومن کو بھر پور لیکن مبنی بر اصول دیانت دارانہ زندگی گزارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسے اکتساب رزق کے لیے کوشش کرنے کی اجازت اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض لوگ دنیا ہی کا نہ ہو جانے کے احکامات کو اپنے فکر و عمل کا محور بنا لیتے اور دنیوی معاملات سے الگ رہنے کو دینی زندگی کا معراج سمجھتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ انسانی تمدن کو اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی سعی و جہد کے سلسلے کی رہنمائی کو پیش نظر رکھ کر اسلام کے متعلق یہ تصور دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ نری دنیا داری اور سیاست کا درس دیتا ہے۔ ایسا نکتہ نظر رکھنے والے ہر بات کی تاویل مادہ پرستانہ اصول حیات کی روشنی میں کرتے ہیں۔

دونوں ہی افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ اسلام میں دونوں قسم کے تصورات کو ایک مخصوص رنگ اور انداز میں جو اسی دین کا خاصہ ہے، مربوط ضابطہ حیات میں سمو دیا گیا ہے۔ اسی لیے دور نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ایک مسلمان دن کے رت تجارتی مراکز میں بھی نظر آتا تھا اور رات کو اللہ تعالیٰ کے حضور ادائے عبادت میں بھی منہمک ہوتا تھا۔ جہاد کے لیے صحرائی قبائل کے درمیان بیٹھ کر قرآن اور اسوہ حسنہ رسول کا پیغام پہنچاتا تھا۔ معاشرتی او اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتا تھا اور فہم دین کے حصول کی تگ و دو میں بھی مصروف ہوتا تھا۔ اور ان سارے مشاغل کے لیے رہنمائی قرآن و سنت سے اور قوت محرکہ عشق خدا اور رسول سے حاصل کی جاتی تھی۔ مسلمان کے ظاہر و باطن کے سلسلے میں ان اجمالی اشارات کی تفصیل اسلام کے انفرادی اور اجتماعی اصولوں سے متعلقہ ابواب میں ملے گی۔

بعض لوگ اصحاب صفہ کے انداز زندگی کو دیکھ کر التباس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ترک دنیا کا مسلک اختیار کر رکھا تھا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ لوگ جادہ عشق کے سالک تھے۔ چونکہ وہ حضور کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے ایک لفظ کو سننے اور آپ کے ایک ایک عمل کا مشاہدہ کرنے کو دنیا و مافیھا پر ترجیح دیتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مسجد نبوی کے ایک کونے میں ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ وہ دنیوی سہولتوں سے محروم ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے تھے۔ دور دراز علاقوں میں تبلیغ دین کے لیے بھی جاتے تھے۔

رواۃ حدیث میں بھی ان کے اسماء گرامی آتے ہیں۔ اس دنیا کی چمک دمک کو بے وزن تصور کرنے اور اس کی اور اپنی اصلاح کے لیے اپنی پوری توانائیوں کو صرف کرنے کا انسانی زندگی میں اس جیسا امتزاج نہیں ملتا۔

فہم دین کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں کو بیک وقت پیش نظر رکھا جائے۔ کسی ایک طرف پوری طرح جھک جانا منتہائے دین کے خلاف ہے۔ اسلام متوازن زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ بات حضور کی حیات طیبہ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ آنحضرت نے امت کے سامنے ایک ایسا اسوۂ حسنہ رکھ دیا ہے جو رہتی دنیا تک بنی نوع انسان کے لیے مینارہ نور کی حیثیت رکھتا اور ابد تک قائم ودائم رہنے والا ہے۔ ادیان سابقہ کے داعیوں کی زندگیوں کی طرح حضور کے اسوۂ حسنہ کے مٹنے یا اس سے مترشح ہونے والی تعلیمات کے محرف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسلام دین ہے معروف معنوں میں مذہب نہیں

مذہب (Religion) کے متعلق عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اس کا تعلق اس کائنات کے نظم کو چلانے والی ہستی یا ہستیوں، جو بھی اس سلسلے میں عقیدہ ہو، کی پوجا پاٹ سے ہے۔ شادی بیاہ اور موت و جنم کے موقع پر کچھ رسومات کی ادائیگی بھی مذہب کے بتائے ہوئے طریقوں پر انجام دی جاتی ہیں۔ اسی طرح اخلاق کے ایک محدود تصور کے متعلق بھی مذہب ہی رہنمائی دیتا ہے۔ اس دائرے سے باہر سیاست، معیشت، معاشرت کے وسیع تر شعبے، بین الاقوامی تعلقات، قوموں کے درمیان صلح و جنگ کے مسائل اور اس قسم کے دوسرے اجتماعی معاملات سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں۔

لیکن اسلام اپنی تعلیمات کو انسان کی فکری و عملی زندگی کے کسی ایک یا چند شعبوں تک محدود نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس یہ ساری انسانی زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ محیط ہے۔ یہ ایک دین ہے ہم اس سے پہلے آیت(آل عمران ۱۹:۳) نقل کرچکے ہیں کہ اللہ کو دین کی حیثیت سے صرف اسلام ہی قابل قبول ہے۔ ہم حجتہ الوداع کے موقعہ پر نازل ہونے والی تکمیل دین کے سلسلے کی آیت(۵ : ۳) کا اس سے قبل حوالہ دے چکے ہیں جس میں اصطلاح دین کا دو دفعہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ عربی زبان اور اسلامی ادب میں مذہب کی

اصطلاح مکتبہ فکر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ آئمہ اربعہ کے فقہی مسالک کو مذاہب کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ مذہب کا لفظ عربی زبان سے تعلق رکھتا ہے لیکن قرآن میں کہیں بھی اسلام کے لیے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی گئی، بلکہ اس کے لیے دین کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ ہم اس سلسلے میں بہت سی قرآنی آیات میں سے مزید چند آیات ذیل میں درج کرتے ہیں :

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ (۹:۳۳)

ترجمہ : وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰهِ یَبۡغُوۡنَ(۳ :۸۳)

ترجمہ : کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں۔

اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِیۡرًا ۙ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰهِ وَاَخۡلَصُوۡا دِیۡنَهُمۡ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ(۴ : ۱۴۵ –۱۴۶)

ترجمہ : منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے۔ اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو توبہ اور اصلاح کرلیں گے اور اللہ (کے حکم) پر مضبوطی کے ساتھ جم جائیں گے، اور اپنے دین میں صرف اسی کے لیے ہو جائیں گے، تو ایسے لوگ مومنوں کی صف میں ہوں گے۔

درج بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جس پہلو اور جس نکتہ نظر سے بھی بات کی گئی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہوئے پیغام ہدایت کو، جسے ہم اسلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دین ہی کہا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ رسل سابقہ کی تعلیمات کو بھی مجموعی طور پر دین ہی کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ بَنِیۡهِ وَیَعۡقُوۡبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰی لَكُمُ الدِّیۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (۲ : ۱۳۲)

ترجمہ : ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اس کی وصیت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اے میرے بیٹے اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر۔

اس آیت سے اس بات کی بھی توثیق ہو جاتی ہے کہ ہر رسول کے پیروان کو مسلمان ہی کہا گیا ہے اور اسلام کا وجود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ اسے اسی نام سے پکارا جائے گا۔

دور حاضر میں اسلام پر بھی مذہب کی اصطلاح منطبق کرنے کی ایک واضح وجہ موجود ہے، اگرچہ اس میں حقیقت کا پہلو مقصود ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخاطبین کے لیے زمان و مکان کی مقتضیات کے مطابق زندگی کے لیے لائحہ عمل اور ایک ہی قسم کا مابعد الطبیعیاتی فلسفہ لے کر آیا تھا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی دین اسلام ہی لے کر مبعوث ہوئے تھے۔ لیکن ابتداء میں مغربی ممالک کے حکمرانوں کے ظلم و تعدی کی وجہ سے اور بعد میں از منہ تاریک کے دوران عیسائی پادریوں نے سارے یورپ پر افرا تفری اور لاقانونیت پھیلنے اور ہر قسم کی تمدنی اقدار کے فنا ہو جانے کی وجہ سے اپنے مذہب کے محرف شدہ نظریات کی بقا کی خاطر پہاڑوں کی غاروں اور جنگلات کے ویرانوں میں پناہ حاصل کی۔ اس طرح بچا کھچا دین عیسیٰ علیہ السلام زندگی کے عملی مسائل سے کٹ گیا۔ شعبہ علم و تحقیق سے بھی وہ لا تعلق ہو گیا۔ لیکن پادریوں کا طبقہ ہی ایک ایسے عنصر کی حیثیت رکھتا تھا جس کا کسی نہ کسی درجے میں پڑھنے لکھنے کے مشغلے سے کوئی واسطہ باقی رہا تھا۔ علمی تاریکی کی ان صدیوں کے دوران مغربی یورپ کی سمت سے ہسپانیہ میں مسلمانوں کی علمی سرگرمیاں اور مشرق کی جانب سے سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں علاقوں سے پھوٹنے والی علمی شعائیں وسطی یورپ کو متاثر کرتی رہیں۔ اس کے نتیجے میں جب یورپ میں علمی احیاء (Renaissance) کا آغاز ہوا تو کاروان علم کی سربراہی عیسائی پادریوں کے حصے میں آئی۔ اس طرح مذہبی و سیاسی قیادت ان کے ہاتھ آگئی۔ لیکن مذہبی شعبے میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے نا آشنا ہو چکے تھے اور انہوں نے چرچ کا ایک خود ساختہ نظام قائم کر لیا تھا جس کا تذکرہ ہم ''پس منظر'' کے زیر عنوان باب میں کر چکے ہیں۔ انسانی

زندگی کے اجتماعی مسائل کے سلسلے میں ان کے پاس سرے سے کوئی نظریات موجود ہی نہ تھے۔ ان کے سیاسی اختیارات کا انحصار ان کی مذہبی قیادت پر تھا۔ جس کے ذریعے سے مذہبی احکامات کے اجراء کا منصب اور لوگوں کی اخروی نجات کے پروانے تقسیم کرنے کا حق بھی انہوں نے حاصل کر رکھا تھا۔ لیکن سیاسی خیالات میں تغیرات، فکری شعبوں میں ارتقاء اور اقتصادی و صنعتی ترقی میں بڑے پیمانے پر پیش رفت سے جو حالات وجود پذیر ہوئے کلیسا ان میں موید ثابت ہونے کے بجائے اپنے غیر حقیقت پسندانہ اور جامد تصورات کی وجہ سے سد راہ ثابت ہوا۔ خصوصیت کے ساتھ علم طبیعیات کے شعبے میں تحقیقات و مشاہدات کے نتیجے میں یورپ میں جو ایجادات و اختراعات ہوئیں کلیسا نے انہیں خلاف ذہب اور ان کے موجدین کو جرائم کا مرتکب قرار دیا لیکن چونکہ مغرب میں سائنسی ترقی کے ساتھ صنعتی تمدن کے وجود میں آنے سے زندگی کے مسائل پر سرمایہ دار طبقہ مکمل تفوق حاصل کر چکا تھا اور علمی حلقے بھی ان کی معاونت کر رہے تھے لہٰذا ان دونوں کے تعاون کے ذریعے سے مادہ پرستانہ نظریات حیات کو فروغ حاصل ہوا اور مذاہب کو کلیساؤں کے اندر محصور کر کے زندگی کے معاملات سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ ایسا کثیر علمی مواد تخلیق کیا گیا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ عیسائیت کے پاس حیات انسانی کی الجھنوں کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ مذہب کی تعریف بھی اس طرح کی گئی کہ یہ فرد کا ایک نجی مسئلہ ہے اور خدا اور دوسری مافوق البشر ہستیوں سے، جنہیں عوام اپنے تو ہم پرستانہ رجحانات کے تحت مانتے ہیں، انسان کا تعلق اسی زمرے میں آتا ہے۔

دنیا کے مختلف گوشوں میں جب ایسے نظریات مغربی تفوق کی وساطت سے پھیلے تو یہ مختلف مذاہب پر راست آگئے ، کیونکہ کسی ''مذہب'' کے پاس بھی عقل و دانش کی جھلک پر کھے جانے کے نتیجے میں درست اور قابل قبول ثابت ہونے والا مابعد الطبیعیاتی فلسفہ موجود تھا اور نہ کسی کے سرمایہ فکر میں حیات انسانی کے جملہ شعبوں کو محیط کوئی لائحہ عمل پایا جاتا تھا۔ مغربی استعمار پرست سیاستدانوں اور مفکرین کو صدیوں سے یہ معلوم تھا کہ اسلام ایک مکمل نظام فکر و عمل رکھتا ہے۔ نیز — جیسا کہ ہم ''اسلام تاریخ میں'' اور ''مسلمان تاریخ میں'' کے عنوانات کے تحت لکھے جانے والے ابواب میں کسی قدر تفصیل سے وضاحت کریں گے ۔

گزشتہ تین صدیوں کے دوران مشرقی ممالک پر مغرب کی یلغار کا مقابلہ صرف مسلمانوں ہی نے کیا اور اس سلسلے میں اسلام کا نام ہی قوت محرکہ فراہم کرتا رہا۔ اگر چہ مسلمانوں کی دفاعی سرگرمیاں کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئیں لیکن مغربوں کا یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ اسلام چونکہ اپنا ایک مخصوص اجتماعی نظام فکر و عمل رکھتا ہے۔ لہٰذا اس انحطاط کے دور میں بھی یہ دین مسلمانوں کو مغربی فکر اور استعمار سے مطابقت اختیار کرنے میں سد راہ ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ مستشرقین کی ایک کثیر تعداد نے ایسی تصانیف کا انبار لگا دیا جن میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے اور مذہب کا سیاسی و اجتماعی مسائل میں دخل دینے کا حق ہے اور نہ موجودہ دور کے حالات کے نکتہ نظر سے اس میں یہ استعداد ہے۔

اس پروپیگنڈے سے ایک محدود مغرب زدہ طبقے کو مستثنیٰ کر کے مسلمان متاثر نہیں ہوئے۔ وہ جب قرآن کے مضامین کو ذہن میں مستحضر کرنے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے دل و دماغ پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اسلام میں اس معنی میں ''مذہب'' ہے ہی نہیں جس معنی میں غیر مسلم اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ وہ حیات انسانی کے ہر شعبے کے لیے رہنمائی دیتا ہے اور اس کی حیثیت ایک دین کی ہے جس کے قریب قریب ہم معنی الفاظ انگریزی میں Ideology یا Code of Life ہو سکتے ہیں۔

آپ اول سے آخر تک قرآن پڑھ جایئے اس میں زندگی کے جملہ معاملات کے سلسلے میں عمل صالح کی ترغیب ملے گی۔ مابعد الطبیعیاتی نظریات بھی اس انداز اور ڈھب سے پیش کیے گئے ہیں کہ ان سے مروجہ مذاہب کے برعکس ترک دنیا، ترک سعی و جہد، ترک تفکر و تدبر اور نفس کشی کے بجائے عمل و حرکت کے لیے آمادگی پیدا ہوتی ہے۔ انسانی صلاحیتوں کا کوئی پہلو نہیں جس کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ ذہنی، قلبی اور عزم و ارادہ کی قوتوں کے لیے غذا مہیا کی گئی ہے۔ روح و قلب کو جلا ملتی اور گرمائش و قوت پرواز حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے اندر پائی جانے والی فطری بھلائی اور جوہر کے نشو نما کا سامان مہیا کرنے کے لیے یہ دین ایک ہمہ جہتی نظام اجتماعی وجود میں لاتا ہے۔ اور اس کام کے لیے انتہائی کوشش اور جانفشانی کو جہاد کا نام دے کر واجب قرار دیا گیا ہے جس کی آخری حد اصلاح دنیا کے لیے نقد جان

کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ یہ تمام خصوصیات عملی طور پر حضور کے اسوہ حسنہ آپ کے تربیت یافتہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران آپ کے نقش قدم پر چلنے والے آئمہ سلف و خلف اور علماء حقہ کی سیرتوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ آئندہ ابواب میں انشاءاللہ اس اجمال کی تفصیل بیان ہوگی۔ علامہ اقبال اپنے سات خطابات کے سلسلے کے پہلے خطاب میں اسلامی فکر میں خدا اور کائنات کے ساتھ انسان کے تعلق کے متعلق فرماتے ہیں:

"The main purpose of the Quran is to awaken in man the higher consciousness of his manifold relations with God and the universe. It is in view of this essential aspect of the Quranic teaching that Goethe, while making a general review of Islam as an educational force, said to Eckermann: 'you see this teaching never fails: with all our systems, we cannot go, and generally speaking no man can go further than that."".

قرآن کا سب سے بڑا مقصد خدا اور کائنات کے ساتھ انسان کے جملہ تعلقات کے اعلیٰ درجے کا شعور بیدار کرنا ہے۔ قرآن کی تعلیم کے اس ضروری(اور اہم) پہلو کے پیش نظر گوئٹے (Goethe) نے اسلام کے متعلق اس کی تعلیمی قوت (و اثر) کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے ایکر مین (Echermann) سے کہا" یہ تعلیم کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ اپنے تمام نظاموں کے ساتھ ہم اور عام طور پر کوئی شخص بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔"

آگے چل کر اسی خطاب میں علامہ مادی دنیا سے کٹ کر روحانیت پر زور دینے کے عیسائیت کے نظریے کا تذکرہ کر کے کہتے ہیں:

"Islam however, faces the opposition with a view to overcome it. This essential difference in looking at a fundamental relation determines the respective attitudes of these great religions towards the problem of human life in its present surroundings. Both demand the affirmation of the spiritual self in man, with this difference only that Islam, recognising the contact of the ideal with the real, says 'yes' to the world of matter and points the way to master it with a view to discover a basis for a realistic regulation of life".

تاہم اسلام(انسان کی داخلی کائنات اور خارجی دنیا) کی مخاصمت (و تضاد) پر غلبہ پانے کے لیے اس (مسئلے) کا سامنا کرتا ہے۔ اس بنیادی تعلق کے سلسلے میں ان دونوں عظیم مذاہب کے نکتہ نظر کا یہ اہم اختلاف موجودہ ماحول میں زندگی کے مسئلے کے متعلق ان کے اپنے اپنے طرز عمل کو متعین کرتا ہے۔ دونوں انسان کے اندر روحانیت کے وجود کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن صرف اس فرق کے ساتھ کہ اسلام نظریے اور حقیقت کے تعلق کو تسلیم کرتے ہوئے مادی دنیا (کی اہمیت) کا اثبات کر کے زندگی کی حقیقت پسندانہ تنظیم کی بنیاد کا تعین کرنے کے لیے اس پر حاوی ہونے کا راستہ بتاتاہے۔''

مقام حیرت ہے اور فکری اقدار کو مسخ کرنے کا کرشمہ بھی کہ اسلام کو معروف معانی رکھنے والے مذاہب قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور اسے صرف کسی آنے والی زندگی کو اہمیت دینے والا مسلک (Cult of Otherworldliness) کا حامل ہونے کا طعنہ دیا جارہا ہے۔ اس خیال کا اظہار اس دین کے متعلق کیا جاتا ہے جو اس دنیا کو مرزع الآخرت (آخرت کی کھیتی) کا نام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریے کے تحت اسی فرد یا قوم کی آخرت سنور سکتی ہے جو اس دنیا کو اسلام کے احکامات کے مطابق سنوارے۔ ایسے فکر کی موجودگی میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اس دنیا کو نظر انداز کر کے صرف اخروی دنیا پر ساری توجہات کو مرکوز کردینے کی تلقین کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مادی دنیا کی سفلی قدروں سے لگاؤ اور اس کے تابع ہونے سے اس دین نے مرد مومن و مسلم کو منع کیا ہے اور اس دنیا کی زخرفات سے مغلوب ہونے کے بجائے اس پر حاوی ہونے کا سبق دیا ہے۔ لیکن ان تصورات کی تہ میں ایک فلسفہ مضمر ہے۔ جس کا صحیح تصور اور متوازن متخیلہ قرآن و سنت پر غوروتدبر کرنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مذہب کے متعلق جو عام تصور پایا جاتا ہے اس کو آنکھیں بند کر کے دین اسلام پر چسپاں کر دینے سے انسانی زندگی میں اس کے کردار کے متعلق درست رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

یہ کس قدر بڑا بہتان اور کتنی بڑی غلط بیانی ہے کہ ایک ایسے شخص کے متعلق جو مکمل زندگی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہوا ہو، جس نے انسانی زندگی کے کسی پہلو کو فکرو عمل کے شعبوں میں نظر انداز نہ کیا ہو اور اپنی حیات طیبہ کے دوران اپنے پیش کردہ

اصولوں کے مطابق ایک مربوط اور ہم جہتی ضابطہ حیات برپا کیا ہو، یہ کہا جائے کہ اس نے عام مذاہب کی طرح کا توہم پرستی پر مبنی فکر دیا اور اپنے پیروؤں کو ایک آنے والی زندگی کے لیے وقف کرتے ہوئے اس دنیا کے بنیادی حقائق سے لا تعلق کر دیا۔ ظاہر ہے کہ دین اسلام کے اصل فکر کو مسخ کرنے کی اس سعی ناکام کے پیچھے یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ مسلمان ترک اسلام پر آمادہ ہو کر فکر سے قوت حاصل نہ کر سکیں۔

اس موقع پر ہم ان کے شعری اقتباس کی طوالت پر معذرت کے ساتھ اس سازش کے متعلق علامہ اقبال رحمہ اللہ ہی کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے ارمغان حجاز میں ''ابلیس کی مجلس شوری'' کے عنوان سے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ابلیسان عصر حاضر کے عزائم کا نہایت خوبصورتی سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ پورا متن تو متعلق کتاب میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن ہم کچھ اشعار موقع کی مناسبت سے یہاں نقل کرتے ہیں :

ابلیس جو دور حاضر کی استعماری و استحصالی قوتوں کا مظہر ہے، اپنی مجلس شورٹی میں بیٹھا اپنے مشیروں سے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کرتا ہے ان میں سے درج ذیل اشعار میں ان قوتوں کے بعض عزائم کی ترجمانی ہوتی ہے :

جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے	مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے
جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں	ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں	بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف	ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر آئین پیغمبر سو بار الحذر	حافظ ناموس زن مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے	نے کوئی فنفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف	منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب	بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب	یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں
ہے یہی بہتر الہیات میں الجھا رہے	یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے	تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیراسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام	چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں	ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مت رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے	پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

(صفحات ۲۲۴۔ ۲۲۸)

علامہ رحمہ اللہ کے یہ اشعار مسلمانوں اور اسلام کے متعلق مغربی سرمایہ دار اقوام کے فکر اور ارادوں کے بہت سے پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ان خیالات میں بنیادی نکتہ یہی ہے کہ یہ اقوام چاہتی ہیں کہ مسلمان اسلام کو دین نہیں بلکہ مذہب تصور کریں اور دنیا کے معاملات سے دستکش ہوجائیں،اور دین اسلام کے اس تصور کو خیرباد کہہ دیں جس کے تحت وہ انہیں سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی شعبوں کی تعمیر کرنے پر اپنے اصولوں کے مطابق مجبور کرتا اور حیات انسانی کے انفرادی و اجتماعی دائروں میں مکمل تغیرو انقلاب کی دعوت دیتا ہے۔

مغربی استعماری قوتیں اور ان کے معاون علمی حلقے تو اپنے عزائم خبیثہ کے تحت اسلام پر معروف معنوں میں ''مذہب'' کی اصطلاح کا اطلاق کرتے ہیں لیکن بعض لوگ ان کے پروپیگنڈے اور تحریروں سے متاثر ہو کر یا دین اسلام سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے محض اس لیے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ چونکہ اسلام میں خدا، وحی اور معاد کا تصور پایا جاتا ہے لہٰذا یہ بات اس کو مذہب قرار دے دینے کے لیے کافی ہے۔ اس تصور کو اس لیے بھی تقویت ملتی ہے کہ مسلمان خود اسلام سے روگردانی کرکے غیر اسلامی نظاموں کے تحت اجتماعی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر غیر لوگ مسلمان معاشرے پر اسلامی اصولوں کے نفاذ کا مشاہدہ کر رہے ہوں تو یہ غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اور ان سے یہ توقع رکھنا ایک خیال عبث ہے کہ وہ مسلمانوں کے موجودہ حالات کو تو نظر انداز کردیں اور ادوار ماضی کے سلسلے میں تحقیقی کاوشیں کر کے اصل اسلامی تعلیمات کا کھوج لگائیں۔ قرآن کی رو سے تو یہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ خود اسلام کو اپنائیں اور پھر شہادت حق کی وہ ذمہ داری بھی ادا کریں جو ان پر عائد

کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام دنیا میں مسلمانوں کو وہ کردار نہیں دیتا جو دور حاضر کے مادہ پرستوں کے فکر و عمل پر چھایا ہوا ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لیے یہ دین اپنے پیروؤں کو کچھ اور ہی فرائض سونپتا ہے، اور مادہ پرستانہ نظریہ حیات اس سے بالکل مختلف طرز عمل کا مقتضی ہے۔ اس بات کے کلی ادراک کے فقدان کی وجہ سے اسلام کی ایک دین یعنی مکمل نظام فکر وحیات کی حیثیت کو سمجھنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ آئندہ ابواب میں ہم انشاللہ مختلف پہلوؤں سے دین اسلام پر گفتگو کریں گے تاکہ اس کی ہمہ جہتی تعلیمات کی وضاحت بھی ہو جائے اور یہ غلط فہمی بھی رفع ہو جائے کہ یہ معروف معنوں میں ایک مذہب ہے۔

انسانی فکر و عمل کے ہر شعبے میں اصطلاحات کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، ان کے موزوں استعمال کے ذریعے علمی دائروں میں انسان ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ان کے علمی معنی و مفہوم میں اتفاق عنقا ہو جائے تو فکر میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ افراد اور گروہوں میں نظریاتی اختلافات انسان کے وجود میں آنے کے ابتدائی دور سے چلے آ رہے ہیں، لیکن بہت سے اختلافات محض اصطلاحات کی طرف معنی منسوب کرنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مختلف افراد اپنے نظریات پیش کرنے کے لیے ایک ہی قسم کی اصطلاحات پیدا کرنے کے باوجود اپنے اپنے نکتہ ہائے نظر اور فکر میں بعد المشرقین رکھ سکتے ہیں۔ زیر گفتگو مسئلے کے ضمن میں ہی سوچئے تو اسلام کے سلسلے میں دین اور مذہب کی اصطلاحات نے جیسا کہ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں، بڑے پیمانے پر مفہوم اسلام کے معاملے میں غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ اسلام کے لیے دین اور مذہب کی اصطلاحات یکساں معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کا مفہوم

گزشتہ دو صدیوں سے سیاسی دائرے میں ''انقلاب'' کے لفظ کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ سیاسی قائدین اور جماعتیں عوامی توجہات اور تائید حاصل کرنے کے لیے اس کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مختلف لوگوں کے نزدیک ''انقلاب'' کی اصطلاح کے معنی و

مفہوم جدا جدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کو برپا کرنے کے لیے ہر نظام فکر کے حاملین کا اپنا اپنا لائحہ عمل ہوتا ہے۔ اکثر حلقے انقلاب کے لیے تشدد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انقلاب کی اصطلاح فوجی قوت سے حکومت پر قبضہ کر لینے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ قوم کے کسی عصر کا موجودہ حکمرانوں کو معزول کر دینا بھی انقلاب کے ہم معنی قرار دے دیا جاتا ہے، چاہے معاشرے کے حالات میں اس سے کوئی تغیر واقع نہ ہو۔ مستبد اور ظالم حکمرانوں کی زیادتیوں سے تنگ آکر عوام اگر ان کے خلاف بغاوت کر کے ان کا تختہ الٹ دیں، تو چاہے موخر الذکر کے پاس قومی تعمیر نو کا کوئی اصول یا لائحہ عمل ہی نہ ہو، تب بھی اس تبدیلی پر یہی اصطلاح چسپاں کردیا جاتی ہے۔ اس کے استعمال میں بعض لوگ اس قدر سطح بینی سے کام لیتے ہیں کہ ان کے پاس فلاح مملکت کے لیے کوئی فکر ہوا ہے اور نہ اس کے نفاذ کے لیے کوئی طریق کار، لیکن محض بخت و اتفاق اور سیاسی جوڑ توڑ کے حربوں کی وساطت سے برسراقتدار آ جانے پر وہ اعلان کر دیتے ہیں یہ وہ ملک و قوم کے حالات میں انقلاب برپا کر دیں گے۔

دور حاضر میں بعض ایسی تحریکیں بھی ظہور پذیر ہوتی ہیں جیسے مارکسی کمیونزم، نازی ازم، جو کسی ایک مسئلے کو لے کے اٹھتی ہیں اور اسے ساری حیات انسان کے ہم معنی قرار دے کر یہ دعوئی کر دیتی ہیں کہ اس سے قوم ان کے پیدا کردہ اصلاحی عمل کے ذریعے سے انقلاب سے ہمکنار ہو جائے گی،حصول مقاصد کے لیے وہ انسانی جانوں کے بے دریغ اتلاف کو بالکل جائز و روا تصور کرتے ہیں۔ اخلاقی اقدار ان کے نزدیک پر کاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتیں۔ یہ اس لیے کہ ان کے تصور میں انسانی جان کی تقدیس کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ دور حاضر کے حوالے سے ''مغربی تمدن'' کے زیر عنوان بھی اسی مسئلے پر گفتگو ہوگی۔

سطور بالا میں ہم نے قوموں اور ہیئت اجتماعیہ میں انقلابات بروئے کار لانے کے جن معنی اور مفہومات کی نشاندہی کی ہے اسلام ان میں سے کسی ایک سے بھی اتفاق نہیں کرتا۔ نہ ہی اس اصطلاح کو قرآن و حدیث یا اسلام لٹریچر میں استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ یہ لفظ عربی زبان سے تعلق رکھتا ہے الفرائد الدریہ نامی مشہور لغات میں''انقلاب'' کے لغوی معنی to be inverted reversed to be upset دئے گئے ہیں۔ نفاذ اسلام میں ایسا

کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ جس کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ اسلام کے پیش نظر کسی قائم شدہ نظام کو محض تہ و بالا کرنا ہوتا ہے اور نہ محض حکمرانوں کی تبدیلی یا کسی ایک طبقہ آبادی کو معزول کر کے کسی دوسرے طبقہ کو مسند اقتدار پر بٹھانا اس کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔ نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ مروجہ اقدار کی مخالفت برائے مخالفت کی جائے اور موجودہ نظام کو درہم برہم کر کے کسی متبادل سیاسی عنصر کو برسراقتدار لایا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ انسانی جانوں کا جس قدر بھی ضیاع ہو جائے۔ اس کتاب میں ہم نے اس اسلامی انقلاب کے الفاظ محض تقسیم کے طور پر استعمال کیے ہیں۔ اس دور میں الفاظ ''انقلاب'' مغرب سے زیادہ مسلمانوں کے ممالک میں استعمال ہو رہا ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ جو معانی وابستہ ہو چکے ہیں اسلامی فکر کی روح کو اس کے ساتھ کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔ قرآن نے اسلام کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے ''دعوت'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے سلسلے میں انداز کار اور لائحہ عمل کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ مثلاً فرمایا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱۲۵:۱۶)

ترجمہ : اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو، اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہو۔

سورہ الشوریٰ میں فرمایا:

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ (۱۳:۴۲)

ترجمہ:مشرکین پر وہ چیز شاق گزرتی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔

آگے چل کر اسی سورۃ میں حکم ہوا:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ (۱۵:۴۲)

ترجمہ : پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اسی پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے۔

اسی طرح دین کا کام کرنے کے لیے جہاں بھی ہدایت دی گئی ہے اس کو لفظ دعوت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایسی کوئی اصطلاح کہیں بھی قرآن و حدیث میں مذکور نہیں جس سے اسلام کو قائم کرنے کے لیے ہلڑ بازی، جذباتیت، تشدد یا نسلی، لونی اور جغرافیائی عصبیتوں کو ہوا دینے کی تحریک ملتی ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ اول الذکر آیت میں وضاحت کے ساتھ ہدایت کی گئی ہے، دعوت دین کا مطلوبہ اسلوب حکیمانہ انداز سے تفہیم اور ناصحانہ طرز پر اور احسن طریق کے ذریعے سے اس کے اصولوں کو مخاطبین تک پہنچاتا ہے اور اگر اس دوران میں بحث مباحثے کی نوبت آ جائے تو گفتگو کرتے وقت خوبی و جمال کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اگر دوسرا فریق اخلاقی قدروں کو خیر باد کہہ دے تو اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے بجائے مسلمان کو گفتگو ختم کر دینے کا حکم ہے:

وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵:۶۳)

ترجمہ : اور جب لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔

دعوت کے اس طریق پر تفصیل سے روشنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر عنوان لکھے گئے باب میں ڈالی جائے گی۔ یہاں ہمارے پیش نظر اجمالی طور پر یہ بیان کرنا ہے کہ دور رواں میں لفظ ''انقلاب'' کے ساتھ جو مفہوم چسپاں کر دیا گیا ہے اس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلام مخاطبین کے اذہان میں استدلال کے ذریعے سے فکر میں تغیر پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کی اساس پر افراد کے تعمیر کردار اور تزکیہ نفس کر کے انسانی زندگی کو قائم شدہ جاہلانہ اور مضرت رساں انداز حیات سے نکال کر خالق کائنات کے بھیجے ہوئے اصولوں کو اپنانے پر آمادہ کرتا ہے۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہر قائم شدہ غیر اسلامی نظام میں بعض افراد اور طبقات کیلیے ایسی مراعات پیدا کر چکے ہوتے ہیں اور عوام ان کے زیر اثر ایسے نظریات سے وابستگی اختیار کر چکے ہوتے ہیں جنہیں ترک کرنے کے لیے وہ محض ایسی کوششوں سے آمادہ نہیں ہوتے جن کی بنا محض استدلال پر ہو۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر کے بعض لوگ اسلام کی پر امن دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں، ان کی تعداد روز افزوں ہے اور وہ ان کے افکار اور

نظام کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں تو وہ مسلمانوں کو نشانہ ظلم و ستم بناتے ہیں اور تشدد کے ذرائع استعمال کرتے کرتے جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس مرحلے پر پہنچ کر اسلام اپنے وابستگان کو جہاد بالسیف کی اجازت دیتا ہے۔ اس جہاد کی تفصیلی شرائط تو باب ''جہاد'' ہی میں بیان ہوں گی لیکن یہاں ہم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام جس تمدن اور نقشہ حیات کو وجود میں لانا چاہتا ہے اس کے لیے وہ کسی سیاسی جوڑ توڑ کا سہارہ لیتا ہے، نہ سازشی طریقے روا رکھتا ہے اور نہ محض تشدد اور جنگ و جدل کے نتائج پر انحصار کرتا ہے بلکہ اسلامی دعوت اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والے تغیر و انقلاب اور وجود میں آنے والے تمدن کا اصل سرمایہ انسانی فکر وحیات کے سلسلے میں وہ نظریات و افکار ہوتے ہیں جنہیں فکری و عملی طور پر اپنانے کی اسلام تلقین کرتا ہے۔ اگر کسی جدوجہد کا مال و انجام ان کے نظریات و افکار کے ہمہ جہتی نفاذ کی صورت میں ظاہر نہ ہو رہا ہو تو اس کے علمبر دار چاہے اسلام کو ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے زبان و و حلق کا جتنا زور بھی صرف کر ڈالیں، اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی ان کے لائے ہوئے کسی تغیر و تبدیلی پر اسلامی انقلاب کی اصطلاح چسپاں کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ ''اسلامی اجتماعی نظام'' کے عنوان کے تحت بحث کی جائے گی۔ دنیا میں متعارف یا رائج تمام اجتماعی نظاموں، مذاہب اور ادیان کے برعکس کلی انقلاب کا تصور صرف اسلام ہی میں پایا جاتا ہے۔ دوسرے سب نظام جزوی انقلاب ہی کی دعوت دیتے ہیں، چاہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ ان میں سے ہر کوئی کسی ایک آدھ مسئلے کو لے کر اٹھتا ہے اور اس سے متعلقہ بعض دوسرے مسائل کے سلسلے میں ضمنی تبدیلی پر مجبور ہوتا ہے لیکن اسلام فکر و عمل کے تمام پہلوؤں کو اہمیت دے کر ان کے متعلق متعین اور واضح نظریات پیش کرتا ہے اسی لیے بلا خوف و تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی دعوت خالصتاً اصولوں پر مبنی ہے جس میں کسی قسم کی عصبیت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس میں جغرافیائی اساس پر کوئی عصبیت پائی جاتی ہے اور نہ طبقاتی، لسانی، قومی اور نسلی اساس پر تمام نسل انسانی کو جملہ اولاد آدم کی فلاح کے لیے بعض اصولوں اور حقیقتوں کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ اور انہی کے نفاذ کے عمل کواسلامی انقلاب سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلام کے اصول صرف بعض قانونی اور انتظامی معاملات ہی کا احاطہ نہیں کرتے جن کا تعلق حیات اجتماعی کے مظاہر سے ہوتا ہےبلکہ ان کا تعلق فرد کے باطن سے بھی ہے اور اس بات کو مبالغہ آمیزی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کہ فی الحقیقت کسی بیت اجتماعیہ کے افراد کی باطنی کیفیات کے معیار کے مطابق ہی ان کا نظام اجتماعی تعمیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام پر ہر فرد کی تعمیر سیرت و اخلاق صفائی ذہن و قلب اور تہذیب کردار کے لیے تفصیلی احکامات دیتا ہے جن پر ان کے متعلقہ مقامات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس وقت دنیا میں کوئی ایسا ازم نافذ نہیں جو اصلاح کا کوئی اعلیٰ و ارفع تصور رکھتا ہو۔ لیکن تزکیہ نفس کے اسلامی تقاضوں کو پورا کرنا اسلامی انقلاب کا جزو لاینفک ہے۔ اس انقلابی جدوجہد میں حصہ لینے کی استعداد انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتی ہے جو سطور بالا میں مذکور خصوصیات سے حسب استطاعت مزین ہوں۔ اس طرح اسی معاشرے میں اسلام کا ضابطہ فکر و عمل نافذ کیا جا سکتا ہے جو اسلامی اصولوں کو زندگی کے ایک غالب لائحہ عمل کے طور پر اپنانے پر آمادہ ہو چکا ہو۔ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے اسی نہج پر اسلامی نظریات کا اشاعت اور تعمیر سیرت کا کام کرنا پڑتا ہے جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ دور حاضر میں اس انقلابی کام کو سرانجام دینے کے لیے جس نوعیت کی جدوجہد کرنا ہو گی اور جن مشکلات اور رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا ان پر تفصیلی گفتگو ''نفاذ اسلام'' کے باب میں ہوگی۔

لہٰذا اس کتاب میں اسلام کے حوالے سے جہاں بھی انقلاب کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس کا مطلب سطور بالا میں پیش کی گئی وضاحت کی روشنی میں لینا چاہیے۔

اسلام کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے

جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ دور حاضر میں مادہ پرستانہ قوتوں کے استیلاء کی وجہ سے مذہب کو انسان کی دنیوی زندگی کے معاملات سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ غلط فہمی بھی پیدا کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جا رہا کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے۔ لہٰذا اس کو بھی انسانی زندگی کے مادی معاملات میں مداخلت سے احتراز کرنا چاہیے۔ ہم اس سے قبل یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ مروجہ معنوں میں اسلام مذہب ہے ہی

نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا دین ہے جو بنی نوع انسان کو بحیثیت مجموعی مخاطب کر کے ایک مکمل نظام فکر و عمل دیتا ہے۔ مغربی ذرائع نشر و اشاعت نے استعماری اور استحصالی . مصلحتوں کے پیش نظر اس نظریے کو پھیلانے کی بہت کوشش کی ہے کہ اسلام صرف اخروی زندگی ہی پر اپنی توجہ کو مرکوز کرتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے (Other worldliness) کی اصطلاح اختراع کر رکھی ہے۔

جن مذاہب میں ترک دنیا پر زور دیا گیا ہے ان میں انسان کی اس ارضی زندگی کے لیے کوئی مربوط و منّظم لائحہ عمل موجود نہیں ہے۔ موت کے بعد انسان کا کیا حشر ہو گا؟ اس کے متعلق بھی اس کے پاس غیر واضح اور توہم پرستی پر مبنی نظریات ہوتے ہیں۔ مابعد الموت کے متعلق اکثر مذاہب میں کچھ ایسے تصورات پائے جاتے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے معتقدات میں اس دنیا کو تج کر ہی فرد ایک موہوم قسم کی کامرانی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے تمام علائق سے کٹ کر کسی پہاڑ کی کھوہ یا بیابان قسم کی جگہ پر ڈیرہ لگا کر اپنی یہ زندگی گزار دینا ہوتی ہے۔ بہت سے مذاہب میں روحانی بلندی حاصل کرنے کے لیے تجرد کی زندگی ضروری ہے۔

اسلام واضح طور پر دو مربوط زندگیوں کا قائل ہے اس دین میں ارضی زندگی کی بھی اہمیت ہے اور اخروی میں حصول فلاح کا مقصد اصول دین کا بہت اہم ستون ہے۔ دونوں ہی کے متعلق آئندہ ابواب میں مفصل گفتگو ہو گی۔ یہاں ہم اجمالی طور پر یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام میں اس دنیا سے فرار اور صرف ایک اخروی زندگی ہی پر توجہات کو مرکوز کر دینے کا کوئی تصور نہیں۔ بلکہ یہ دونوں زندگیاں آپس میں منسلک ہیں۔ اخروی زندگی اس حیات ارضی کا ایک تسلسل جس طرح ایک محدود دائرے میں انسان کی ذہنی اور تکنیکی کاوشیں رائج پیدا کرتی ہیں، اسی طرح اس دنیا میں ہر فرد کے اعمال بحیثیت مجموعی بلا کم و کاست اخروی زندگی میں منعکس ہوں گے۔

قرآن کہتا ہے :

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ ۚ (۳:۳۰)

ترجمہ : جس دن ہر انسان دیکھے گا کہ جو کچھ اس نے (دنیا میں)نیک عملی کی تھی، اس کا سایا موجود ہے (یعنی اس کا اجر اسے مل رہا ہے)اور جو کچھ برائی کی تھی، وہ بھی اس کے سامنے ہے۔

پھر فرمایا:

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۱۲۳ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (۴:۱۲۳ ـ۱۲۴)

ترجمہ : جو کوئی برائی کرے گا ضروری ہے کہ اس کا بدلہ پائے، اور پھر اس کے سوا نہ تو اسے کوئی دوست ملے گا نہ مددگار۔ اور جو کوئی اچھا کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت، اور وہ(خداور سول پر) ایمان بھی رکھتا ہو گا، تو ایسے ہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے۔

قرآن و حدیث میں متعدد انداز سے ارضی زندگی اور آخرت کے تعلق کو واضح کر دیا گیا ہے۔ اس سے پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ اول الذکر زندگی غیر اہم اور ناقابل اعتنا نہیں ہو سکتی۔ اسی نے تو آخرالذکر میں نتائج پیدا کرنے ہیں۔ لہٰذا اسلام کو (Other worldliness)کا علمبردار ہونے کا طعنہ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انسان نے یہاں مثبت کردار ادا نہ کیا تو وہ آخرت میں نامرادی و ناکامی کا سامنا کرے گا۔

چنانچہ فرمایا:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا(۱۷:۷۲)

ترجمہ : اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا رہا(اور اس نے اللہ کے دیئے ہوئے ہوش و حواس سے کام نہیں لیا) تو یقین کرو آخرت میں بھی وہ اندھا ہی رہے گا اور راست سے یک قلم بھٹکا ہوا۔

گویا اخروی زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا انحصار اس دنیا میں انسان کے طرز عمل پر ہے۔ اگر اس نے خالق کائنات کے دیئے ہوئے دین پر عمل کیا تو وہ آخرت میں بھی بامرالو اور شاد کام ہو گا اور اس دنیا میں بھی خودداری، فلاح، عزیمت اور وقار کی زندگی بسر

کرے گا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ اسلام اور کفر کی کشمکش سے اسے ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ وتیار رہنا ہوگا اور اس سلسلے میں وہ جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ اس طرح کی ارضی زندگی بسر کرنے کے لیے تخلیق آدم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک اللہ تعالیٰ نے متواتر کثیر تعداد میں اس مقصد و مدعا کے تحت پیغمبر بھیجے جو اس کے دین کو مخاطبین کی اصلاح احوال کے لیے ان کے ساتھ پیش کریں۔ اگر یہ زندگی اسلام کے نزدیک اہم نہ ہوتی اور اس نے بنی نوع انسان کی توجہ کو صرف ایک آنے والی زندگی ہی پر مرکوز کروانی ہوتی تو انسانی زندگی کے لیے اسلام کی شکل میں ایک صالح و مطابق فطرت دین کے لیے ہزار ہا بلکہ روایت کے مطابق سوا لاکھ پیغمبر مبعوث کرنے اور ان سے جانوں تک کی قربانی دلوانے کی کیا ضرورت تھی اس دنیا میں اپنے مخاطب انسانوں کو صحیح نظم کے تحت لانے اور ان کے تزکیہ نفس کے لیے پیغمبروں نے بہت محنتیں کیں، انہیں اس کام کے سلسلے میں بڑی مشقتیں برداشت کرنا پڑیں اور ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے بالاخر ایک ایسا ضابطہ حیات قائم کیا جو بنی نوع انسان کے لیے فکر و عمل کے دائروں کے لیے مکمل اور مربوط لائحہ عمل دیتا ہے۔ گزشتہ نظاموں کے مقابلے میں اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ابدالآباد تک اپنی تعلیمات کے لحاظ سے زندہ رہے گا، اس کے وجود کو تاریخ کے صفحات سے محو نہیں کیا جا سکتا۔ اور مسلمان اس کو نافذ کرنے کے پابند ہیں کیا یہ صورتحال (Other worldliness) کے تصور کی موید ہے؟

اسلام تو اس دنیا میں محکم بنیادوں پر اپنے ماننے والوں کے ذریعے اپنا دیا ہوا نظام اجتماعی قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس حقیقت کی موجودگی میں وہ دنیوی معاملات سے لا تعلق ہو کر اپنے مخاطبین کو محض اخروی زندگی پر اپنی توجہات کو مرکوز کرنے کا کیسے درس دے سکتا ہے۔ قرآن کا کہنا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط (۲۲:۴۱)

ترجمہ : یہ(مومن)لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔

اس آیت میں اس دنیا میں ایک ایسا نظام قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس میں پیروان حیات انسانی کے تمام شعبوں کو اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اسلامی خطوط پر تغیر و انقلاب کے لیے کوشاں ہوں۔

البتہ اسلام انسان کو اس دنیا ہی کا ہو کر رہ جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور نہ ہی اس کو اس بات کی کھلی چھٹی دیتا ہے کہ اس کا نفس امارہ اس کو گمراہی کی جن دلویوں میں لیے پھرے انہیں میں وہ سرگرداں رہے۔ بلکہ اسے، زندگی کے ہر شعبے کے لیے احکامات دیئے گئے ہیں جن کی پابندی اس کے لیے لازی قرار دی گئی ہے۔ ان احکامات کی پابندی کروانے کے لیے جہاں اس کو حصول علم کی صلاحیت دی گئی ہے وہیں اسے ایسے نظام اجتماعی کے اصول بھی دیئے گئے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ گیا ہے جو اسے احکام دین پر عمل پیرا ہونے کے لیے سازگار ماحول مہیا کرے۔

یہ احکامات دے کر اسے کھلا نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ ان کے سلسلے میں اس سے آخرت میں باز پرس ہوگی۔ اسی لیے اسلام کے نظریاتی نقشے میں آخرت کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس کی وضاحت ہم عالم آخرت کے عنوان کے تحت لکھے گئے باب میں کریں گے۔

اس سے ناگزیر طور پر انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اسلام ارضی اور اخروی زندگی دونوں کو محیط ہے۔ وہ دونوں کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ جس کے وہ سزاوار ہیں۔الہٰذا وہ حیات ارضی کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ورنہ تصور معاد بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس مرحلے پر ذہنوں میں ایک سوال ابھر سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر مذہب اور مادی فلسفہ حیات زندگی کا کوئی نہ کوئی لائحہ عمل تو دیتا ہے۔ اسلام میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اسے ہی وہ واحد نظام فکرو عمل قرار دیا جائے

جو انسان کے لیے فلاح دارین کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہی وہ سوال ہے جس کا ہم آئندہ ابواب میں جواب دیں گے۔ مروجہ مذاہب کے تعلیمات میں تحریف اور حذف و اضافہ کے ذریعے ان کی عدم ثقاہت کا تذکرہ ہم ''پس منظر'' کے باب میں کر چکے ہیں۔ ان میں وہ مذاہب بھی شامل ہیں جن کی ابتدائی اور پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیمات کی قرآن تصدیق کرتا ہے اور ایسے مذاہب بھی شامل ہیں جن کا قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں۔ ان کے متعلق ہم نے اپنی طرف سے کوئی رائے دینے سے احتراز کیا ہے۔ اس کے برعکس ہم نے ان محققین کی تصانیف سے اقتباسات دیئے ہیں جنہوں نے ان مذہب کی تعلیمات گم گشتہ کا سراغ لگانے میں اپنی عمریں صرف کی ہیں۔ آئندہ مباحث میں ہم دود حاضر میں جنم لینے والے مادہ پرستانہ نظام ہائے حیات کا جائزہ لے کر یہ ثابت کریں گے کہ وہ بنی نوع انسان کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم محض منطق اور اپنی رائے پر انحصار نہیں کریں گے بلکہ معروضی انداز سے حقائق اور اعداد و شمار کی روشنی میں اپنے معروضات پیش کریں۔

اسلام انسان کو فکر و عمل کے لیے اساسی رہنمائی دیتا ہے

وہ لوگ جنہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور نہ وہ انسانی تاریخ کے نشیب و فراز سے واقفیت رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جیسے یہ دین بھی دوسرے مذاہب کی طرح چند نظریات و خیالات کا مجموعہ ہے اور اس وجہ سے اس پر عمل پیرا ہونے سے انسانی سوسائٹی میں حرکی رجحانات دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ زندگی ناگزیر طور پر ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ لہٰذا آج سے چودہ سو برس قبل دیا ہوا ضابطہ فکر و عمل ہر ارتقائی منزل کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ وہ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ ہر اجتماعی وحدت اور تمدنی اکائی کے لیے ایک ہی قسم کے اصولوں کا مجموعہ کسی طرح یکساں طور پر موزوں و مناسب ہو سکتا ہے۔

اسلام کی تعلیمات کی نوعیت سے قطع نظر کر کے سوچنے والوں کے لیے بادی النظر میں یہ باتیں بہت وزنی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر اس کردار کو مد نظر رکھا جائے جو اسلام انسانی زندگی میں ادا کرنا چاہتا ہے تو سطور بالا میں مذکورہ الجھن باقی نہیں رہتی۔'' بنیادی

اصولوں کی ضرورت''کے بغلی عنوان کے تحت ہم نے اس موضوع پر اشارات کیے ہیں، لیکن مغربی فکر کے مویدین نے انتہا پسندی کی عادت کے تحت مسئلہ ارتقا کو اس قدر اچھالا ہے کہ ہر مستقل افادیت رکھنے والی قدر ان کو انسان ترقی کی راہ میں حائل نظر آنے لگی ہے۔ لہٰذا ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس بات کو ایک مستقل بحث کے ذریعے واضح کر دیں کہ اسلام حیات انسانی کو صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کس نوعیت کی رہنمائی دیتا ہے۔

دراصل درج بالا تاثرات متعدد وجوہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ دنیا میں رائج تمام مذاہب جامد نظریات پیش کرتے اور دنیا اور اس کے عملی مسائل سے فرار کا درس دیتے ہیں۔ دوسرے، دور انحطاط میں مسلمانوں کے اندر بعض ایسے مکاتیب فکر نے سر اٹھایا جنہوں نے دین اسلام کی غلط ترجمانی کی اور قرآن و سنت سے تعمیر حیات کا جو تصور اخذ کیا جا سکتا ہے اسے یکسر پس پشت ڈال دیا۔ اور اسلام کے اصول ہائے مہمہ کے بجائے فروعات مرکز توجہ بن گئیں۔ اس سے پیدا شدہ فکری جمود نے ذہنی توانائیوں کو مفلوج کر دیا، جس سے بعض لوگوں کی نظروں میں اسلام کو بھی ایک ایسے جامد مسلک کی حیثیت دے دی گئی جو حیات انسانی کے تغیر پذیر حالات کا ساتھ دینے سے قاصر ہو۔

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اس بات کا شعور ضروری ہے کہ دو طرح کے معاملات بنی نوع انسان کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک قسم کے معاملات کا تعلق اس کی فطرت سے ہے۔ جس کے خلق و ابداع کی تمامتر قدرت اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے اور اس میں انسان یکسر بے بس ہے۔ لیکن اس کی فطرت اس کے طرز عمل پر متواتر اثر انداز ہوتی رہتی ہے، اور پھر اس کے کچھ تقاضے ہیں جنہیں پورا نہ کرنے کے باعث حیات انسانی میں کجروی اور فساد پیدا ہو جاتے ہیں۔ انسانی فکر و تدبر اورغورو خوض کی ساری تاریخ جو فطرت انسانی کے تجزیے کی کاوشوں سے مملو ہے، زبان حال سے اس کے راز ہائے سربستہ معلوم کرنے سے قاصر ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ دوسری قسم کے معاملات وہ ہیں جو انسان کے تنظیم معاشرہ سے متعلق ہیں اور جن میں انسان کو فیصلہ کن دخل تو حاصل ہے لیکن وہ اس سلسلے میں کوئی ایسے حتمی اصول وضع نہیں کر سکا جو اس کے انفرادی و اجتماعی مسائل کو حل کر کے اس کی مجموعی فلاح و سعادت اور تمام انسانی آبادی کے لیے یکساں طور پر ذریعہ

سکون و راحت بن سکیں۔ اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو تو ''وحی'' کے عنوان کے تحت ہوگی۔ البتہ ہم یہاں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی فطرت کی گہرائی اور اس کے کنہ وما علیہ سے عدم واقفیت کی وجہ سے معاشرتی و تمدنی نظام کی پیچیدگیوں سے کماحقہ، آگاہ نہ ہونے کی بنا پر انسان اپنے لیے موزوں اخلاقی ضابطہ اجتماعی متعین کرنے میں بار بار ناکامی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ مایوس کن تجربات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل رہا ہے جس کی وجہ سے صفحہ ارض پر فساد اور ظلم و تعدی کے مظاہر کا دور دورہ ہے۔(اس موضوع پر حالات زمانہ سے متعلق ابواب میں گفتگو ہوگی)۔

ہم نے سطور بالا میں انسان کی جس بے بسی کا تذکرہ کیا ہے اس کا اسلام نے تشفی بخش اور قابل عمل حل پیش کیا ہے لیکن جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس حال کو بنی نوع انسان پر مسلط نہیں کیا۔ عقل و خرد، شعور و ارادہ اور قوت و استعداد عمل کی صلاحیتیں دے کر اس کو یہ آزادی دی ہے کہ چاہے تو اس حل کو اپنائے اور اگر چاہے تو اس سے روگردانی کرے۔ البتہ اس کو اپنے اس انتخاب خیر و شر کے سلسلے میں جوابدہی کے عمل سے گزرنا ہو گا۔

اب رہا یہ سوال کہ اسلام نے بنی نوع انسان کو جو رہنمائی مہیا کی ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، اور اس میں کیا مصلحت مضمر ہے۔ ہم نے اس باب کے آغاز میں ''دنیا میں انسان کا مقام'' کے عنوان کے تحت انسان کے علم، خلیفتہ اللہ کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری، انتخاب حق و باطل کے سلسلے میں اس کے اختیار اور ارضی زندگی گزارنے کے دوران اس کے اعمال خیر و بد کے نتائج کے متعلق گفتگو کی تھی۔ ظاہر ہےان خصوصیات سے متصف مخلوق کو اس کائنات کے ایک عضو معطل کی حیثیت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کی ''صلاحیتوں کے مطابق'' ---- وادین والے الفاظ کو ذہن میں خصوصی جگہ دی جائے ---- اسے ایک کردار دینا تقاضائے عقل و خرد ہے ورنہ ان صلاحیتوں کو اس کے اندر ودیعت کرنا کار لاحاصل ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی خالق بنی نوع انسان اس کے نفس کے رجحانات اور اس کی فکری و عملی محدودیتوں کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسلام نے انسان کی ان دونوں حالتوں میں مصالحت کو مد نظر رکھا ہے۔ چنانچہ فکرو عمل کے اساسی اصول دے کر انسان سے کہا گیا کہ

تمہیں جو صلاحیتیں دی گئی ہیں انہیں روبہ عمل لا کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر ایسی نافذ کرو۔ اسی کاوش کو جہاد کا نام بھی دیا گیا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ بھی اس کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ عمل صالح کی اصطلاح بھی اسی کو محیط ہے اور جملہ ذہنی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے اجتہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر ان اصطلاحات کے مفہوم کو صحت کے ساتھ ذہن نشین کر لیا جائے اور اسلام کے اساسی اصولوں کو اپنا لیا جائے تو حیات انسانی کی نشوونما اور اس کے حرکی رجحانات کی حوصلہ افزائی کی پوری ضمانت مہیا ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ زندگی کے سفر کی سمت میں ٹیڑھ پیدا ہونے کے تمام دروازے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اس سے بنی نوع انسان کی توانائیں ان بے نتیجہ صحرا نوردیوں میں ضائع نہیں ہوتیں جن سے تلاش حق کا مقصد تو حاصل نہیں ہوتا البتہ وہ وہ دنیا میں فساد پھیلانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے برعکس انسان کو یکسوئی کے ساتھ اپنی فلاح و بہتری کے لیے کوشاں رہنے کا موقع فراہم ہوتا ہے اور اس میں ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ نیز اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں یکسوئی کے ساتھ سعی و جہد سے مراحل ترقی طے کرنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اس نظریے کو سید جمال الدین افغانی رحمہ اللہ کی زبان سے اس طرح کہلوایا ہے:

باطن او از تغیر بے غمے
ظاہر او انقلاب ہر دے

(جاوید نامہ صفحہ ۷۴)

جمود اور عدم حرکت کی موجودگی میں انقلاب اور احوال و ظروف کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسلام ایسے اساسی اصول دیتا ہے و تکوینی اور تشریعی دونوں سطحوں پر ابدی اور مستقل سچائیوں کے حامل ہیں اور جنہیں درج بالا شعر میں اسلام کا باطن قرار دیا گیا ہے ان میں ایسے نظریات و عقائد شامل ہیں جو حقیقت اور امر واقعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً توحید، معاد وغیرہ۔ اور ایسے بھی جن کا تعلق انسان کی سیاسی اقتصادی اور سماجی شعبہ ہائے زندگی سے ہے۔ مثلاً سیاست میں مشاورت اور اولی الامر کا قرآن و سنت کے تابع ہونا، ان کے تقرر میں عوام کا عمل دخل ہونا اور عوام کے سامنے ان

کا محض کاغذی نہیں بلکہ حقیقتاً جوابدہ ہونا۔ اس سے ملوکیت، مطلق العنانی ، آمریت اور حاکمانہ ظلم و ستم کے امکانات مفقود ہو جاتے ہیں۔ معیشت میں پیداوار اور تقسیم دولت کے نظریات اور معاشرت کے دائرے میں اخلاقی اور ازدواجی زندگی کی تنظیم کے اصول ان میں سے ہر شعبہ زندگی پر تفصیلی روشنی تو متعلقہ باب میں ڈالی جائے گی، یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ نظریات تمدن میں توازن برقرار رکھنے ، فلاح و بہبود کو رواج دینے، انفرادی و اجتماعی سطحوں پر ظلم و طغیانی کا قلع قمع کرنے کی بنیاد فراہم کرتے ہیں ان کے نفاذ کو انسانی صوابدید پر چھوڑ کر اس کی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے اس قدر وسیع میدان فراہم کر دیا گیا ہے جو ساری حیات انسانی کو محیط ہے۔ البتہ اس کو ہر جگہ نشانات ہدایت ملتے ہیں جن کی وجہ سے وہ راہ راست اختیار کرتا اور بھٹکنے سے محفوظ رہتا ہے۔

چونکہ اسلام نے ہمہ جہتی رہنمائی دی ہے اس لیے زندگی کے مختلف شعبوں میں ربط پایا جاتا ہے اور ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں اسلام کا منفرد مقام اس حقیقت سے عیاں ہے کہ دنیا میں پیش کیا جانے والا اور یا نافذ کیا جانے والا ہر نظام کسی ایک آدھے شعبے یا دائرہ حیات کو مرکز توجہ بناتا ہے اس کے تقاضوں کے تحت بتکلف دوسرے شعبے متشکل ہوتے ہیں جو عام طور پر فطرت انسانی سے متصادم ہونے کے ساتھ ساتھ ظلم و تعدی کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ تفصیلات تو اپنے موقع پر آئیں گی،یہاں ہم مارکسی کمیونزم کی مثال دیتے ہیں۔ جس کی کل فکری کائنات پیداواری ذرائع کو ایک مرکزی اقتدار کے تابع لانا ہے۔ لیکن اس . مقصد کے حصول کے لیے زندگی کے تمام دوسرے شعبوں میں قتل و غارت گری، ایذا رسانی، شہری آزادیوں کی پامالی اور افلاس و جہالت کے ایسے مظاہر وجود میں آئے جن سے بربریت کی سابقہ روایات ماند ہے گئیں۔ اس طرح جب مغربی مادہ پرستانہ جمہور میں سرمایہ داری کو حیات انسانی کا واحد مقصد قرار دے لیا گیا تو انسانوں کی عظیم اکثریت کو استعمار اور استحصال کے ذریعے افلاس و نکبت کا نشانہ بنایا گیا، اور بنایا جا رہا ہے، انسان کے خود ساختہ و مبنی بر تعصب و خود غرضی کے ضابطوں اور کوتاہ بینی کی بنیاد پر وضع کردہ نظاموں سے اس بات کی ضرورت یقینی ہو جاتی ہے کہ کائنات اور انسان کے خالق کی طرف سے انسانی فکر و عمل کو راہ راست پر ثابت قدم رکھنے کے لیے اساسی رہنمائی دی

جائے اور ان رہنما اصولوں کے نفاذ کا معاملہ اس کی خدادا عقل و خرد، استعداد، اختیار و استرداد اور باطنی خوبیوں اور صلاحیتوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اسی لیے قرآن نے یہ وضاحت کر دی کہ:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ (۱۰:۲۵۔۲۶)

ترجمہ :اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے(کامیابی کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے(اس کا قانون تو یہ ہے)جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لیے بھلائی ہی ہوگی اور اس سے بھی کچھ زیادہ۔

اصولی رہنمائی کی ضرورت کے اس تذکرے سے متوحش ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ ہر مادہ پرستانہ اور انسان کا اپنا وضع کردہ نظام بھی کچھ مستقل اصول مسلمات رکھتا ہے، جیسا کہ ہم ''بنیادی اصولوں کی ضرورت'' کے عنوان کے تحت عرض کر چکے ہیں۔ ایک نظام کے اندر مختلف مکاتیب فکر کی حامل سیاسی جماعتوں میں جو اختلاف ہوتے ہیں وہ ان مسلمات کی تعبیر و تاویل اور نفاذ و ترویج کے طریقوں سے ہی متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے اندر پائی جانے والی کم فہمی اور آنکھیں بند کر کے مغرب سے آنے والے ہر خیال و نظریے کے مقلدین پر مشتمل ایک گروہ ہے جو ہمارے حکومتی اور تعلیمی نظام اور شعبہ ہائے نشرو اشاعت میں خاصا عمل دخل رکھتا ہے، مغرب میں جنم لینے والے ضابطہ ہائے اجتماعی میں پائے جانے والے مستقل اصولوں اور مسلمات سے تو متوحش نہیں ہوتا لیکن اسلام کے اساسی اصولوں کو وجہ جمود اور مانع ارتقاء تصور کرتا ہے۔ حالانکہ مغرب سے درآمد شدہ نظریہ ارتقا کی خصوصیات کی حقانیت کائناتی، حیاتیاتی اور تمدنی سطحوں پر بہت سے مغربی مفکرین کے نزدیک اب بھی محل نظر ہے جیسا کہ ہم موزوں مقام پر واضح کریں گے لیکن چونکہ یہ گروہ مغربی استعمار کی باقیات کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا مغربی تمدن کے ان اصولوں کا بھی شیدائی ہے۔ جو مغربیوں کے ہاں دم توڑ رہے ہیں۔

نظریہ ارتقا اور اثبات وجود باری تعالیٰ

۱۷۲۱ء میں فرانسیسی مفکر مانٹسکو (Montesquieu) نے اس خیال کا اظہار کیا کہ نباتاتی اور حیواناتی انواع (Species) اپنے اپنے شعبوں میں باہمی تعامل سے اپنی تعداد میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ اس موضوع پر اور لوگ بھی یورپی ممالک میں کام کرتے رہے۔ مثلاً ۱۸۰۹ء میں فرانسیسی نیچری جین لے مارک (Jean Lamarck) نے مختلف جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کے انواع و اقسام پر تحقیقات کر کے بزعم خود ان کے انسان تک ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔

لیکن اس سلسلے میں چارلس ڈارون (Charles Darwin) نے، جس کا سال پیدائش ۱۸۰۹ء ہے، ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۶ء تک کرہ ارض کے مختلف خطوں کے سفر کے دوران مشاہدات اور تجربات کے ذریعے مواد جمع کر کے اور ۱۸۵۸ء تک اس جمع شدہ مواد کی بنیاد پر غور و تفکر کر کے اپنی کتاب (Origin of Species) (ابتدا انواع) ۱۸۵۹ء میں شائع کر دی۔ اس کتاب نے مغربی ممالک کے علمی حلقوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی اور اس پر فاتحانہ موافقانہ مباحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کتاب میں اس نے قدرتی انتخاب (Natural selection)، تنازع للبقا (Struggle for Existence) اور بقاء اصلح (Survival of the Fittest) کی اساسات پر ارتقاء کی (Evolution) کی تھیوری پیش کی جس میں ایک اہم نظریاتی عنصر یہ تھا کہ ہر نوع خصوصیات کے اعتبار سے بہتر نوع کو جنم دیتی ہے اس کے بعد اس نے Descent of Man شائع کی۔

ڈارون کی ارتقاء کی تھیوری کا لب لباب یہ ہے کہ اربوں برس تک پانی میں زندگی کے جرثوموں کی موجودگی کے بعد پچاس کروڑ سال قبل زمین پر نباتاتی اور پھر حیوانی مخلوق کا آغاز ہوا اور مختلف ارتقائی مراحل سے گزر کر اب تک بہترین نوع کے اعتبار سے انسان وجود میں آیا ہے۔ انسان سے جزوی مشابہت رکھنے والی متعدد انواع کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نے Homo Spcein Homo Erectus اور بعض دوسری انواع کی ارتقائی پیش رفت کے لحاظ سے درجہ بندی کی ہے۔ ڈارون کے مطابق، ان انسان نما در جوں سے گزرنے میں انسان کو تیس لاکھ برس صرف ہوئے ۔ اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ڈارون نے انسان کو فروتر مخلوق (بند رنما) کی ترقی اور ارتقا پذیر مخلوق ہونے کی حیثیت کا ذکر

Origin of Species میں نہیں کیا بلکہ یہ خیال اس نے Descent of man میں جو بارہ برس بعد یعنی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی، پیش کیا۔

جس وقت ڈارون اپنی تحقیقی کاوش میں مصروف تھا، عین اسی دور میں الفرڈر سل ولیس (Alfred Russell Wallace) نامی ایک اور سائنس دان انہی خطوط پر مختلف انواع کے ارتقاء پر مایا میں کام کر رہا تھا، اور ڈارون سے مشابہ نتائج تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کی خبر پا کر ڈارون نے چونکہ اپنے نتائج تحقیق پہلے شائع کر دیے۔ لہٰذا ارتقا کی تھیوری اس کے نام سے منسوب ہو گئی۔

اس سلسلے میں ڈارون کے بعد بھی وسیع پیمانے پر تحقیق ہوئی ہے، اور معلومات اور آراء کا کثیر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے لیکن ہر بات میں تشکیک اور تخرص اور اندازوں اور تخمینوں کے پہلو غالب ہیں۔ غیر یقینی معلومات کی بنیادوں پر یقینیات کی حد تک نتائج اخذ کر لیے گئے ہیں۔(جیسا کہ ہم آئندہ گفتگو کریں گے) لیکن ہر شعبہ علم،کائناتی مظاہر، انسانی عمرانیات اور حایتات کے تمام پہلوؤں پر عمل ارتقا کو از خود اور میکانکی طریق پر جاری و ساری قرار دیا اور اسے حکم اور ناقابل تغیر مسلمات (Postulates) میں شمار کیا جا رہا ہے، مغرب میں خاص طور پر اور بقیہ دینا کے علمی حلقوں میں عام طورپراس نظریے کی کار فرمائی کو نہایت مبالغہ آمیزی کے ساتھ ایک مستقل حقیقت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اپنی تصنیف The Story of Philosophy میں پر اس ول ڈیورنٹ (Will Durant) لکھتا ہے۔

"In ۱۸۵۸ Darwin and Wallace read their famous papers before the Linnaean Society, and in ۱۹۵۹ "the old World, as the good bishops thought, crashed to pieces with the publication of the Origin of Species. Here was no more vague notion of evolution, of higher species evolving somehow from lower ones; but a detailed and richly documented theory of the actual mode and process of evolution "by means of natural selection, or the preservation of favoured races in the struggle for life. In one decade all the world was talking about evolution." (Page ۳۵۴-۵:Pocket Book Edition).

۱۸۵۸ء میں ڈارون اور ویلس نے لینن سوسائٹی کے زیر اہتمام اپنے مشہور مقالے پڑھے، اور ۱۹۵۹ء میں پرانی دنیا ،جیسا کہ معزز پادریوں نے خیال کیا، Origin of speciesکی اشاعت کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یہ نچلے درجے کے انواع کا اونچے درجے کے انواع میں ارتقا کرنے کا کوئی مبہم ارتقائی تصور نہ تھا بلکہ قدرتی انتخاب یا بہتر نسلوں کی زندگی کے لیے جدوجہد کے ذریعے بقاء پر مبنی ایک مفصل اور (تجرباتی) دستاویزات کی مدد سے پیش کردہ ارتقاء کے تحقیق طریقے اور عمل سے متعلق نظریہ تھا۔ دس سال کے عرصہ میں تمام دنیا ارتقاء کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر رابرٹ بی ڈاؤنز (Dr.Robert B Downs) اپنی تصنیف Book that Changed the worldمیں لکھتا ہے:

"When one reflects upon the immense influence which Darwin's work has had on practically all lines of human though and especially on the biological, psychological and social sciences one is forced to conclude that…. given the seat of highest honour as the most fructifying thinker which the nineteenth century produced, not only in England but in the whole world." (Page ۱۷۲-۳. Mentor Book). Darwin must be

جب کوئی شخص اس انتہائی وسیع اثر کے متعلق سوچتا ہے جو ڈارون کے علمی و تحقیقی کام نے انسانی فکر کے تمام گوشوں اور خصوصی طور پر علم الحیاتیات، علم النفسیات اور معاشرتی علوم پر ڈالا ہے تو اس نتیجے پر پہنچنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ڈارون کو انیسویں صدی میں صرف انگلستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ایک ثمر آور مفکر کی حیثیت سے سب سے اونچا اور قابل احترام مقام دیا جانا چاہیے۔

درج بالا دونوں اقتباسات بیان واقعہ یعنی ارتقا کی تھیوری کو جو قبولیت حاصل ہوئی اس کی یک رخی تصوری کشی سے متعلق ہیں۔ ورنہ ڈارون سے بعض لوگوں نے اختلاف بھی کیا اور آج تک اس کی تھیوری کے سقم بیان کیے جا رہے ہیں لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ دور رواں میں فکر کی دنیا میں مغرب کا غلبہ ہے، وہاں جس قدر فکری اور اجتماعی

فلسفے پیش کیے جاتے ہیں انہیں ذرائع نشر و اشاعت کے زور پر پھیلایا جاتا ہے۔ وہ سیاسی، اقتصادی اور فوجی قوت کی برتری کے سہارے بقیہ دنیا میں مرکز توجہ اور کسی نہ کسی درجہ میں قبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ نظریے میں کوئی نہ کوئی جزوی سچائی ہوتی ہے لیکن اس کو ساری زندگی پر پھیلا دینا مناسب نہیں ہوتا ۔ اس طرز عمل سے انسانی اصلاح کے سلسلے میں اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ کچھ ایسی ہی صورت ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی ہے۔ کائنات اور انسانی حیات متحرک ہیں۔ ان میں مختلف نوعیتوں کی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کوئی تبدیلی تخریبی ہوتی ہے اور کوئی ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ اب تکلف سے یہ ثابت کرنا کہ ہر تبدیلی ڈارون اور اس کے طرز عمل پر سوچنے والے اہل علم ہی کے تصور ارتقا کی مظہر ہوتی ہے، علمی پختگی اور توازن فکری کی علامت نہیں۔ اور پھر اس تبدیلی کو ان شعبوں پر بھی پھیلانا جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں، اور اس کے پیچھے یہ نیت کار فرما ہو کہ اپنے اعمال خبیثہ کو سند جواز عطا کی جائے، انتہائی درجے کی علمی بددیانتی اورخیانت ہے۔

ڈارون کی تھیوری مغرب کے اعصاب پر پوری طرح سوار ہے۔ ہر بات اور ہر علمی تحقیق میں اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ہر سیاسی، معاشی اور معاشرتی ظلم کے لیےمغرب کے حکمرانوں کی طرف سے اسے وجہ جواز بنایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے، اور ہم موزوں مقامات پر اس کی وضاحت کریں گے، کہ مادہ پرست مغرب کائنات اور انسان کے متعلق کسی مستحکم نظریے سے محروم ہے لہٰذا جب بھی کوئی محقق یا مفکر کسی ایک شعبہ علم کے سلسلے میں تحقیقی کاوش کر کے زندگی اور کائنات کے متعلق کوئی جزوی نظریہ پیش کر دیتا ہے تو اسے ان معاملات کے متعلق کلی نظریے کا درجہ دے کر لوگ اس کی طرف لپکتے ہیں اور اسے فکر و نظر اور عمرانیت کے تمدن کے سلسلے کی ساری خامیوں کے لیے آب حیات تصور کر کے اپنانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد تجربے اور مشاہدے کے ذریعے اس کی نقصان دہ علامتیں منصہ شہود پر آجاتی ہیں تو اس کے رد عمل کے طور پر ایک دوسری انتہا کو اپنا لیا جاتا ہے، جو اسی طرح کے عدم توازن کی متحمل ہوتی ہے۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر مزید گفتگو کو موخر کرتے ہوئے ہم یہاں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان علماء ڈارون سے تقریبا ایک ہزار سال کے دوران سے ارتقاء کا نظریہ پیش کرتے رہے، لیکن وہ اس کو افکار خالق کائنات و انسان کے لیے استعمال نہ کرتے تھے بلکہ ایک نظری مسئلہ تصور کرتے تھے۔

ابو عثمان عمر بن بحرین محبوب الجاحظ(۷۷۶ – ۸۶۸)نے جو بصرہ کے ایک عظیم ماہر علوم اسلامی اور دانشور ہوئے ہیں، اپنی تصنیف ''کتاب الحیوان'' میں ماحول سے حیوانی زندگی کی سازگاری اور اس کے نتیجے میں ارتقائی پیش رفت، نیز حیوانی نفسیات پر بحث کی ہے۔

جاحظ کے بعد اس مسئلے پر گفتگو کرنے والی سب سے اہم شخصیت ابوعلی احمد بن محمد بن یعقوب بن مسکویہ(۹۳۰– ۱۰۳۰ء) کی ہے۔ یہ اونچے پائے کے سائنس دان، فلاسفر اور مورخ تھے۔ ان کی علمی تخلیقات سے زمانہ ما بعد میں بہت علمی رہنمائی حاصل کی گئی۔ مسئلہ ارتقاء علامہ اقبال نے(Reconstruction of Religious thought in Islam) کے پانچویں لیکچر میں ابن مسکویہ کے خیالات کا تذکرہ کیا ہے لیکن علامہ نے چونکہ اسی عبارت کا قریب‌قریب ترجمہ ہی پیش کیا ہے جس کے ذریعے مولانا شبلی‌رحمہ‌اللہ نعمانی نے اپنی تصنیف ''علم الکلام'' میں ابن مسکویہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے، لہٰذا ہم موخر الذکر کتاب ہی سے اقتباس پیش کرتے ہیں:

''موجودات کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ صرف اجسام مفردہ یعنی عناصر موجود تھے۔ عناصر نے جب باہم ترکیب پائی تو سب سے پہلے جمادات وجود میں آئے جو عالم ترکیب کا سب سے ادنی درجہ ہے۔ جمادات سے ترقی کر کے نباتات کا درجہ آیا۔ نباتات نے بھی درجہ بدرجہ ترقی کی، پہلے گھاس وجود میں آئی جو تخم سے نہیں بلکہ آپ سے آپ پیدا ہوتی ہے پھر درخت ہوئے۔ درختوں میں بھی درجہ بدرجہ ترقی ہوئی۔ یہاں تک کہ اس قسم کے درخت پیدا ہوئے جن میں تنا شاخ، پھول، پھل ہوتا ہے۔ ان کی خوراک کے لیے عمدہ زمین، عمدہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ترقی کرتے کرتے ان میں حیوانات کے خواص پیدا ہوئے اور ان کی سرحد حیوانات کے بالکل قریب ہو گئی۔ مثلاً کھجور اور خرما جن میں حیوانات

کی طرح نر اور مادہ ہوتے ہیں اور جس طرح فر اور مادہ کی مباشرت سے اولاد ہوتی ہے، اسی طرح ان درختوں میں جب تک پیوند نہیں ہوتا بار آور نہیں ہوتے"۔۔۔

"نباتات ترقی کرتے کرتے جب حیوانات سے متصل ہو جاتے ہیں تو وہ صنف پیدا ہوتی ہے جو حیوان اور نباتات دونوں کا مجموعہ ہے مثلاً مونگا، سیپ "۔

"نباتات جب ترقی کر کے حیوان کے درجہ پر پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے کیڑے پیدا ہوتے ہیں جن میں حرکت اختیاری کے سوا اور کوئی چیز نباتات سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ ان میں ترقی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ لاعیہ کے سوا ان میں اور حواس بھی پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں۔ جن میں لاعیہ، شامہ، ذائقہ باصرہ تمام حواس خمسہ موجود ہوتے ہیں۔ ان میں بھی ترقی کی رفتار قائم رہتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی درجہ کے جانور محض کو دن ہوتے ہیں۔ پھر تیز ذہن ، زود غم ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ترقی کرتے کرتے انسان کی سرحد تک آ جاتے ہیں مثلاً بندر وغیرہ۔ اس مرتبہ سے بھی جب آگے بڑھتے ہیں تو انسان کی طرح ان کا قد بھی سیدھا ہو جاتا ہے اور ان کے قوائے عقلیہ بہت کچھ انسان سے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ یہ مرتبہ حیوانیت کا انجام اور انسانیت کا آغاز ہے"۔

"انسان کے قوائے ادراکی کی ترقی اس طرح درجہ بدرجہ ہوتی ہے کہ پہلے وہ محسوسات کا ادراک کرتا ہے۔ پھر محسوسات سے تخیل، تخیل سے فکر اور ٹکرے عقلیات محضہ کے ادراک تک پہنچتا ہے۔ لیکن جب انسان اس مرتبے تک ترقی کرتا ہے جس کو اوپر ہم نے نبوت کے درجہ سے تعبیر کیا ہے تو اس کو معلومات اور حقائق کے اوراک میں تدریجی ترقی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کو ابتداً حقائق اشیاء کا ادراک ہو جاتا ہے۔ یعنی جو بات اور لوگوں کو جزئیات کے استقراء اور محسوسات کی تجرید اور مقدمات کی ترتیب سے معلوم ہوتی ہے وہ پیغمبر کو ابتداً بغیر غورو فکر کے القا ہو جاتی ہے۔ اسی کو وحی یا الہام کہتے ہیں"۔(صفحات ۱۰۷ – ۱۰۹)

اسی اقتباس سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ اس دور میں مسلمان اہل علم ،علم النباتات (Botony) ،علم حیاتیات (Biology) اور علم الحیوان (Anthropology) اور ان سے متعلقہ دوسرے علوم میں پوری دلچسپی اور درک رکھتے ہیں۔

مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ(۱۲۰۷ – ۱۲۷۳)نے مثنوی معنوی کے دفتر چہارم میں" بیان اطوار و منازل خلقت آدمی از ابتدائی خلقت" کے عنوان کے تحت یہ اشعار کے ہیں:

آمدہ اول با قلیم جماد ——— وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد ——— وز جمادی یاد تاورد از بزد
ور نباتی چون حیوانی فتاد ——— خاموش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کر دارد سوئی آں ——— خاصہ در وقت بہار و ضمیراں
باز از حیوان سوی انسانیش ——— می کشد آں خالقے کے دائیں
ہم چنین اقلیم تا اقلیم رفت ——— تاشدا کنوں عاقل دا زخت
عقل ہائے اولنشیں یاد نیست ——— ہم ازیں عقلش تحول کرد نیست
تار ہرزیں عقل پر حرص طلب ——— صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب

ترجمہ: تخلیق کی ابتدا جہان جمادات میں ہوئی، اور جہان جمادات سے نباتات میں منتقل ہوئی۔ اپنی عمر کے بہت سے سال نباتات میں بسر کیے اور جمادات کا دور ہنگامہ آرائی کی وجہ سے یاد نہیں رہا۔

اور اسی طرح جب نباتاتی دور سے حیوانی حالت میں انتقال کیا تو نباتاتی دور فراموش ہو گیا۔

سوائے اس رجحان کے جو خصوصاً موسم بہار اور ضمیران میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہ خالق جس سے تو واقف ہے اس کو حالت حیوانی سے حالت انسانی کی طرف کھینچتا ہے۔

اس طرح وہ ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اب وہ عقل و خرد اور قوت و استحکام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کو اپنی سابقہ عقل یاد نہیں اور موجودہ عقل سے بھی کوچ کرنا ہے تاکہ وہ طمع و لالچ سے بھری ہوئی اس عقل سے رہائی حاصل کرے اور ہزاروں انداز کی عجیب و غریب ادراک کی کیفیتوں سے مستفید ہو۔

ہم نے سطور بالا میں انسانی زندگی کی ابتدا کے متعلق جن تین مسلمان مفکرین کی آراء پیش کی ہیں ان میں سے جاحظ کا دور ڈارون سے ایک ہزار سال قبل، ابن مسکویہ کا آٹھ

نو صدی قبل اور مولانا روم رحمہ اللہ کا چھ سو سال پہلے تھا۔ پہلے دو حضرات نے اس زمانے میں ارتقاء کی تھیوری پیش کی جب یورپ علم و تمدن کے لحاظ سے تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہاں کے باشندے انسانی سطح پر ہوں گے لیکن عقلی و تہذیبی نکتہ نظر سے وہ کسی پہلو سے بھی حیوانی سطح پر بلند نہ تھے۔ جہاں تک مولانا روم رحمہ اللہ کا تعلق ہے، ان کے زمانے میں یورپ نے از منہ تاریک سے نکل کر صرف آنکھ ہی کھولی تھی۔ یہی وہ دور تھا جب مغرب نے مغربی سمت میں ہسپانیہ کی وساطت سے اور مشرقی سمت سے عثمانی سلطنت کے ذریعے سے علمی روشنی حاصل کرنے کا آغاز کیا اور مسلمان اہل علم کی کتب ان تک پہنچنا شروع ہو چکی تھیں۔یہ تینوں مسلمان مفکر دنیا کے علمی تاریخ کے صف اول میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ حیات انسانی کے ارتقا پر ان کے نظریات ایک ہزار سال تک یورپ کے علمی حلقوں سے مخفی ہوں گے جب کہ مسلم ہسپانیہ کے علمی مراکز علمی ذوق رکھنے والوں کے لیے یورپ سے سارے خطے میں واحد ذریعہ علم و فضل تھے۔ ڈارون نے اس زمانے میں اپنی ارتقاء کی تھیوری پیش کی جب یورپ میں علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے آغاز کو دو تین صدیاں گزر چکی تھیں اور مروجہ علوم کے ہر شعبہ سے متعلق مسلم مفکرین کی کتب مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر یورپی ممالک کی لائبریریوں میں پہنچ چکی تھیں۔ اس لیے اس ادعاء کے مبنی بر صداقت ہونے کی کوئی گنجائش نہیں کہ نظریہ ارتقا کے موجد مسلمان مفکرین نہیں بلکہ انیسویں صدی میں بعض یورپین اہل علم تھے۔

یوں تو مغرب میں یہ شعبہ علم کے سلسلے کی تحقیق اور اس سے اخذ نتائج کے کام اللہ تعالیٰ کے وجود کے انکار کے نکتہ نظر سے کیے جاتے ہیں، لیکن مسئلہ ارتقاء کے ملاحدہ نے دہریت کے جواز کے لیے بہت اچھالا۔ حالانکہ اس کے لیے کوئی قطعی جواز ابھی تک ان کے ہاتھ میں نہیں آیا۔ دراصل تخلیق کائنات اور ارتقاء کی مغربی تھیوری کا زیادہ تر انحصار غیر یقینی اٹکل اندازوں اور تخرص پر ہے۔ لیکن اگر اس تھیوری کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو مادہ پرستانہ نکتہ نظر میں ایک نہایت اہم جزو تو یہ ہے کہ ہر ابتداء یا تبدیلی کے لیے قوت محرکہ کی موجودگی ضروری ہے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر مرحلہ ارتقاء میں جو تبدیلی آئی

وہ از خود کس طرح آگئی اور مادہ پرستوں کے نزدیک ارتقا نام ہے کائنات کے اندر بالقوہ استبداد تغیر و تبدیلی کا۔ بغیر اس کے کہ اس کے پیچھے کوئی فاعل و محرک ہو۔ اور پھر یہ کہ یہ سلسلہ ہمیشہ سے چل رہا ہے اوررہے گا۔ برٹرینڈ رسل اپنے ایک مجموعہ مقالات (Why I am not a Chritian)میں لکھتا ہے:

: "In spite of the immense number of observations that have been made, and of the detailed experimental work that has been done in recent years, there is no yet unanimity of opinion as to the way, or ways, in which evolution has come about (Page ۹۳)

کوئی ایسی دلیل موجود ہے(جس سے یہ ثابت ہو) کہ یہ کائنات کسی محرک کے بغیر وجود میں نہ آسکتی تھی مزید برآں نہ ہی کوئی ایسی دلیل ہے(جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے)کہ یہ ہمیشہ سے نہیں چلی آ رہی ہے۔ اس بات کو فرض کرنے کی کوئی بنیاد نہیں کہ اس کائنات کا کبھی آغاز ہوا تھا۔

بے شمار کتابوں کے مصنف اور مغربی فلسفے کے لیے اتنے بڑے نقاد کا اس نوعیت کا استدلال حیران کن ہے۔

علوم طبیعیات کا ایک مشہور نقاد جے ڈبلیو این سلیوان (JWN Sullivan) اپنی تصنیف (the Limitations of Science) میں برکسان (Bergson) کاحوالہ دے کر لکھتا ہے:

(برگسان کے مطابق) ہم دیکھتے ہیں کہ ارتقاء کی پیش رفت کا انداز ایک بامقصد جدو جہد سے منسوب ہے، جس کا ظہور مادہ میں ہوتا ہے۔ یہ بامقصد محرک پرانے مذہبی لوگوں کا خدا نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو ارتقا کے عمل کو خارج سے چلاتا ہے (بلکہ) یہ کوئی ایسی چیز ہے جو موجودات کی دنیا میں ظہور پذیر ہوئی ہے اور ہم میں(یعنی انسانوں میں) یہ شعور(کے مرحلے) تک پہنچ گئی ہے۔

اس ابہام فکر کی وجہ سے خود ڈارون اس معاملے میں تذبذب میں مبتلا تھا۔ اس نے Life and Lettersمیں لکھا ہے:

"Another source of conviction in the existence of God, concreted with the reason, and not with the feelings, impresses me as having much more weight. This follows from the extreme difficulty or rather impossibility of conceiving this immense and wonderful universe, including man, with his capacity of looking for backward and far into futurity, as the result of blind chance or necessity when thus reflecting I feel compelled to look to a First Cause, having an intelligent mind to some degree analogous to that of man; and I deserve to be called a Theist. This conclusion was strong in my mind about the time, as far as I can remember, when I wrote the Origin of Species, and it is since that time that it has very gradually with many fluctuations, become weaker. But then arises the doubt: developed from a mind as low as that possessed by the lowest can the mind of man, which has, as I fully believe, been problems. The mystery of the beginning of all things is animals, be trusted when it draws such grand conclusions? I cannot pretend to throw the least light on such abstruse insoluble by us: and I for one must be content to remain an agnostic." (Quotation from Books that changed the World by Dr. Downs Pages ۲-۱۷۱).

خدا کے وجود پر یقین محکم کے ایک اور ذریعے نے ،جو دلائل عقلی سے متعلق ہے نہ کہ(محض) محسوسات سے بہت زیادہ وزنی ہونے کی وجہ سے مجھے متاثر کیا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ بات انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ اس وسیع اور (حیرت انگیز طور) پر شاندار کائنات کو، جس میں انسان ماضی اور مستقبل کے دور دراز حالات کے سلسلے میں تفکر کرنے کی استعداد کے ساتھ شامل ہے، محض اندھے اتفاق اور ضرورت کا نتیجہ تصور کیا جائے جب میں اس طرح تدبر کرتا ہوں تو محرک اول کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جو کسی نہ کسی حد تک انسان کی طرح کے ذہن و فکر کا حامل ہو۔ اور (اس طرح)میں موحد کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہوں۔ جہاں تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے، میرے دل میں یہ نتیجہ فکر Origin of speciesلکھنے کے موقع پر شدت سے موجود تھا۔ اور(پھر) نشیب و فراز کے ساتھ بتدریج کمزور ہوتا گیا۔ لیکن اس کے بعد شک و ریب کے کانٹے چھے(اور میں نے

سوچا کہ) کیا اس انسان کی عقل و فکر پر جس نے پست ترین حیوانات عقل و فکر سے ترقی کی ہے یہ اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ وہ اتنے عظیم فیصلے کرے ؟"

"میں ایسے پیچیدہ مسئلوں پر معمولی سے معمولی روشنی ڈالنے کا زعم بھی نہیں کرسکتا۔ تمام اشیاء کی ابتدا معلوم کرنے کی گتھی کا حل ہمارے بس میں نہیں۔ اور کم از کم میں لا ادریت کے عقیدے پر قائم رہنے پر ہی اکتفا کروں گا۔"

ڈارون کی تحریر کردہ درج بالا چند سطور سے مغرب میں پھیلے ہوئے ملحدانہ فکر کے ساتھ جو تذبذب اور بے یقینی و اضطراب کی کیفیت وابستہ ہے وہ ذھین قاری سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے ان الفاظ سے اپنی تحقیق و مشاہدات کے نتیجے میں درج ذیل خیالات کے پیدا ہونے کی واضح نشاندہی ہوتی ہے :

اولاً پچیس سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی فکری محنت کی بنا پر اور اپنی سب سے مشہور کتاب Origin of species لکھنے کے دوران وہ توحید باری تعالیٰ کا قائل ہو گیا تھا۔

دوتم : یہ کہ وہ کائنات کی عظمت اور انسان کے صاحب علم و فکر ہونے کی حقیقت سے اس قدر متاثر و مرعوب ہوا کہ اسے مجبوراً اس عقیدے پر پہنچنا پڑا کہ یہ سب کچھ کسی منصوبے اور غایت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

سوئم : یہ کہ اس کے باطن سے آواز آئی کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہونا چاہیے اور ہے۔ یہ آواز اس کے تدبر و تفکر کا قدرتی نتیجہ تھی۔

چہارم : اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی اصل وجہ کیا تھی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فطرت نے اس کی جو رہنمائی کی تھی اس نے محکم فکر اور یقین کامل کی شکل وقت کے طاغوتی فکری ماحول کے زیر اثر اور وحی کی روشنی سے محرومی کی وجہ سے اختیار نہیں کی۔ وہ خود کہتا ہے کہ شک و ریب نے اسے گھیر لیا۔

پنجم : اس نے یہ رائے بھی قائم کی کہ انسان ادراک حقیقت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ اس نے ذاتی طور پر اپنے آپ کو اس بات کا اہل سمجھا کہ وہ اس مسئلہ پر اظہار رائے کرے۔ لہٰذا اس نے شکست تسلیم کرتے ہوئے لا ادریت کا مسلک اختیار کر لیا۔

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ دنیا میں عظیم مفکرین و حکماء کی فطرت اور ان کی تحقیقی سرگرمیاں انہیں توحید اور اس کی اساس پر تعمیر ہونے والے نظام فکر و عمل کی طرف متوجہ کرتی ہیں، لیکن چونکہ ان تک دین اسلام کی تعلیمات نہیں پہنچتیں ، اس لیے وہ احساس نامرادی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی بات کو پیش نظر رکھ کر علامہ اقبال رحمہ اللہ نے نٹشے کے متعلق کہا تھا:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

(بال جبریل صفحہ ۸۲)

حقیقت یہ ہے کہ عقل، خرد کی بلندیوں کو چھونے اور تفکر و تدبر کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے باوجود انسان وحی کی روشنی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلے پر ''وحی'' کے عنوان کے تحت گفتگو ہو گی۔

یہ بات حیران کن ہے کہ ڈارون کے مذکورہ بالا رجحانات کے باوجود مغرب کے بہت سے، بلکہ اکثر اہل علم نے ڈارون کی ارتقاء کی تھیوری کا استعمال بہت ناجائز طریقوں سے کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈاوئنز جس کی کتاب سے ہم اس سے قبل بھی حوالے دے چکے ہیں ، لکھتا ہے:

"....there have been applications of Darwin's theories of which he undoubtedly would have passionately disapproved. An example is fascism's use of the idea of natural selection, or survival of the fittest, to justify the liquidation of eastern races. Similarly wars between nations have been defended as a means of eliminating the weak and perpetuating the strong. Darwinism has been twisted further, by Marxists, to apply to the class struggle. And ruthless business corporations have justified methods of destroying smaller companies on the same grounds." (Page ۱۷۳).

ڈارون کے نتائج فکر کو(ایسے معاملات پر) منطبق کیا گیا ہے جس کی (اگر وہ زند ہوتا تو) بلا شک و شبہ پوری ذہنی و فکری قوت سے تردید کرتا۔ ایک مثال بعض نسلی اکائیوں

کو نیست و نابود کرنے کے لیے ناشتی فکر (کے حاملیں) کی طرف سے قدرتی انتخاب اور بقائے اصلح کے نظریات کو استعمال کرنا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی جنگوں کا دفاع(یہ کہہ کر) کیا گیا ہے کہ یہ کمزوروں کو ختم کرنے اور قوی (اقوام) کو دوام بخشنے کا ذریعہ ہیں۔ ڈارون کے نظریوں کو مزید مسخ کر کے مارکس کے متبعین نے طبقاتی کشمکش کے لیے جواز مہیا کیا ہے اور ظالم کا روباری تنظیموں نے انہی اساسات پر چھوٹی کاروباری تنظیموں کو تباہ کرنے کے طریقوں کو جائز قرار دیا ہے۔"

یہ ایک مغربی مصنف اور نقاد کی رائے ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی تمدن علمی و فکری کاوشوں اور تحقیق و مطالعہ کے میدان میں کی جانے والی سعی و حمد کو کن مقاصد خبیثہ کے لیے استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسی طرح اس اقتباس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس تمدن نے جن سیاسی و معاشی نظریات اور ان کی بنیاد پر قائم ہونے والے جن قومی، اجتماعی ڈھانچوں کو جنم دیا وہ قساوت قلبی اور انسانیت سوزی کی کس انتہا کو چھو چکے ہیں۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کس خوبی سے اس صورتحال کی عکاسی کی ہے:

آدمیت زار نالعد از فرنگ
زندگی ھنگامہ بر چید از فرنگ

ہم موزوں موقعوں پر اس نظریے کی تائید میں مزید نظائر پیش کریں گے کہ استعمار پرست اور استحصال پسند مغرب اس تھیوری کو جو اس کے علمی حلقوں میں پیش کی جاتی ہے، اسی نسبت سے اہمیت دیتا ہے جس نسبت سے وہ اس کے استعماری اور استحصالی عزائم کی تائید یا تکلف کے ساتھ اسے تائید کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

ارتقا کے سلسلے میں مسلمان حکماء اور مغربی علمی حلقوں کے فکری مقاصد میں بنیادی اختلاف ہے۔ موخر الذکر اس سے مادہ پرستانہ اور خدا ناشناس فکر اخذ کرتے ہیں، جبکہ اول الذکر اس سے خدا کی خالقیت پر دلیل قائم کرتے ہیں۔ ہم نے مولانا روم رحمہ اللہ کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں سے آپ پانچواں شعر پڑھئے اور دیکھئے کہ اس میں منازل ارتقاء کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں جو منازل طے ہو

چکی ہیں اس سے آگے کی منازل کے لیے معاد ہے، جس کے انعقاد پر مادہ پرست مغرب یقین نہیں رکھتا۔ لیکن ایک مسلمان اس ارضی زندگی کے دوران فطری و نوعی اعتبار سے موجودہ انسان سے، جسے خالق کائنات نے اس زمین پر خلیفہ کی حیثیت سے تخلیق کیا ہے، بہتر نوع کی پیدائش کی اس لیے بھی توقع نہیں رکھ سکتا کہ انسان کامل اور خاتم النبیین کا ظہور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ظاہر ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب حیاتیاتی اعتبار سے (Biologically)مزید منازل ارتقا ایک بالاتر سطح کی زندگی کے دوران ہی طے ہوں گے۔ اس کے علاوہ قرآن نے حضرت آدم علیہ السلام کا جو تذکرہ کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی عطا کرنے کے علاوہ علم ادم الاسماء کلھا (۳۱:۲))کہ گویا انسان کی حالیہ نوع کو کرہ ارض پر ارتقا کی آخری منزل متمکن قرار دے دیا ہے۔

مندرجہ بالا نظریے کے برعکس مغربی تصور ارتقا نے انسان کو اسی دنیا میں ختم کر دیا اور اس طرح اس کو مایوسی اور احساس ناتمامی میں گرفتار ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کے چوتھے لیکچر میں کہا ہے:

"It was only natural and perfectly consistent with the spirit of Quran that Rumi regarded the question of immortality as one of the biological evolution and not a problem to be decided by arguments of purely metaphysical nature, as some philosophers of Islam had thought. The theory of evolution however, has brought despair and anxiety instead of hope and enthusiasm for life to the modern world. The reason is to be found in the unwarranted modern assumption that man's present structure, mental as well as physiological, is the last word in biological evolution, and that death, regarded as a biological event, has no constructive meaning."

یہ ایک بدیہی اور قرآن کی روح سے قطعی مطابقت رکھنے والی بات تھی کہ رومی رحمہ اللہ (انسان کی) ابدیت کے مسئلے کو حیاتیاتی ارتقا سمجھتے تھے اور اسے ایسا مسئلہ نہیں تصور کرتے تھے جس کا فیصلہ خالصتاً مابعد الطبیعیاتی بحثوں سے کیا جائے۔ جیسا کہ بعض مسلمان

فلاسفہ کا خیال تھا۔ ارتقاء کے(مغربی) نظریے نے دور حاضر کو زندگی کے معاملے میں امید اور حوصلہ دینے کے بجائے نا امیدی اور پریشانی میں مبتلا کیا ہے۔ اس کا سبب زمانہ رواں کا وہ بے بنیاد مفروضہ ہے کہ انسان کا موجودہ ذہنی اور حیوانی ڈھانچہ حیاتیاتی ارتقا کا آخری مرحلہ ہے۔ اور یہ کہ موت حیاتیاتی واقعہ کے اعتبار سے کوئی تعمیری معنی نہیں رکھتی۔

علامہ کے مذکورہ بالا نظریے پر مولانا روم رحمہ اللہ کے ان اشعار کی روشنی میں غور کرنا چاہیے جو ہم نے اس سے قبل درج کیے ہیں۔ مغرب کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ انسان کی ابتدا کے ساتھ اس کے مستقبل پر بھی غور کرے۔ ہم نے اس سے قبل ڈارون کی ایک تصنیف سے جو اقتباس دیا ہے اس میں اس نے اگرچہ انسان کی ابتدا کے معمے کو حل کرنے کے سلسلے میں اضطراب و بے بسی کا اظہار کیا ہے، لیکن اس مستقبل کا تذکرہ نہیں کیا جس سے سابقہ پڑنے والا ہے۔

ارتقا کے سلسلے میں مغرب کے مفکرین سے جو ایک بہت بڑی بھول ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم اس سے قبل بھی اشارہ کر چکے ہیں، وہ اس عمل کو اسباب ومسببات اور علل و معلولات کے اس قاعدے سے مبرا اور آزاد خیال کرتے ہیں جس میں وہ کسی استثنٰی کے قائل ہی نہیں، اور جس کی بنا پر وہ خدا، وحی اور رسالت کے منکر ہیں۔ آخر سلسلہ ارتقا کی ان گنت کڑیاں کس طرح خود بخود کسی محرک کے بغیر معرض وجود میں آجاتی رہی ہیں۔ جبکہ ڈارون کے اس سے قبل پیش کردہ الفاظ کے مطابق یہ مسئلہ ایک حیرت انگیز طور پر وسیع و عریض کائنات اور انتہائی بلند استعدادیں رکھنے والے انسان سے متعلق ہے۔

گزشتہ ڈیڑھ صدی میں مغرب کے مادہ پرستانہ فکر کی کوکھ سے قوموں کی حیات اجتماعی کو مرتب و منظم کرنے کے لیے جتنے نظام پھوٹے ہیں، انہیں پیش کرنے والوں میں سے ہر ایک ارتقاء کی تھیوری پر مشترک طور پر ایمان لاتا رہا ہے۔ یہ سبھی لوگ بہت بڑے تضاد میں آج بھی مبتلا ہیں اور ماضی میں بھی مبتلا رہے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ارتقاء کی ایک ایک منزل کروڑوں برس میں طے ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ چند صدیوں بلکہ ایک آدھ نسل کے دوران یہ منزلیں طے کرلینے کا دعویٰ کرتے ہیں بشرطیکہ ان کے نظریات اپنائے جائیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ یورپ از منہ تاریک

کے تحت الثریٰ میں پڑا تھا۔ لیکن چند صدیوں ہی میں اس کے حکماء اور سیاستدانوں نے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ اس کا تمدن دنیا میں سب سے زیادہ ارتقاء پذیر تمدن اور گوری چمڑی والوں کو دوسری تمام نسلوں کے مقابلے میں ارتقاء پذیر نسل کی حیثیت حاصل ہے۔ اور انہوں نے یہ کہنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ گوری چمڑی والے حیاتیاتی (Biological) سطح پر بقیہ دنیا سے برتر ہیں۔ ایسی ہی غلط فہمی میں مارکس مبتلا ہو گیا کہ اس کا پیش کردہ کمیونسٹ نظام اپنانے والی ہر قوم گویا انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر ایک ہی جست میں ارتقائی منازل طے کر کے بلند ترین مقام پر فائز ہو جائے گی۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق عملی زندگی اور واضح حقائق سے تھا نہ کہ محض نظری قیل و قال سے اس لیے اس سلسلے میں ارتقاء کی تھیوری سے استمداد کی کوشش کا بھانڈہ چوراہے میں پھوٹ گیا۔

دو نسلوں کے عرصے میں آہنی پردے کی اوٹ میں انتہائی ظلم وجور کے باوجود وہ ''انتہائی ارتقا یافتہ'' نظام ابتدائی شکل میں بھی قائم نہ ہو سکا، اور کسی فکری یا فوجی حملے کے تحت نہیں، بلکہ وہ خود تاش کے پتوں کے گھروندے کی مانند زمین پر آرہا۔ اس نظام بر مفصل گفتگو متعلقہ باب میں ہوگی۔ یہی نکتہ نظر نازی جرمنی اور فاشت اٹلی کا تھا۔ اسی زاویہ نگاہ سے مغربی اقوام بقیہ دنیا کو اپنے استعماری و استحصالی مظالم کا نشانہ بنانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دراصل مغرب میں رائج ارتقا کی تھیوری کا فکری شمر یہ ہے کہ انسانوں کا عالمی معاشرہ جنگل کے قانون کے تابع ہے۔

اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ آدم کو فطری سطح پر وہ سب کچھ سکھا دیا گیا یا بہ الفاظ دیگر اس کو حصول علم کی اس قدر استعداد بخش دی گئی جس کی اسے عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق ضرورت تھی۔ تخلیق آدم کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاآتے رہے۔ وہ خود بھی بلند فکر اور سیرت و اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہے اور ایسے صحابہ کی تربیت بھی کرتے رہے جو اخلاق کے اعلیٰ معیار پر فائز ہوئے۔ اسی طرح بعد کی نسلوں کے لیے ایسی رہنمائی مہیا کر گئے جس کی روشنی میں بلند ترین اخلاق کی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

مثلاً غیر انبیا میں حضرت لقمان کا تذکرہ بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے ایسے نظریات کا اظہار کیا جو ان کی عقل و خرد اور اخلاقی مقام کی نشاندہی کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں ان

کا نام نامی دنیا میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اسی قدیم دور میں توحید کے تصور کی بنیاد خالق کائنات پر ان کا پختہ اور غیر متزلزل ایمان تھا۔ اسی طرح مغرب بھی زمانہ قدیم میں عظیم شخصیتوں کے وجود کا اعتراف کرتا ہے۔ مغربی لٹریچر میں سقراط کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہم اس کا کسی تفصیل کے ساتھ ''توحید'' کے باب میں تذکرہ کریں گے۔ یہاں ہم صرف یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے اعلیٰ و ارفع نظریات کی خاطر اس نے ایک غیر اسلامی تو ہم پرستانہ، مشرکانہ اور عدم مساوات انسانی پر مبنی معاشرے کے ساتھ سازگاری اختیار نہ کرنے اور اپنی فکر کا برملا اعلان کرنے کی پاداش میں انتہائی صبر استقامت اور خندہ پیشانی کے ساتھ جان کی بازی لگا دی۔

اگرچہ تخلیق آدم کے بعد فکری و اخلاقی لحاظ سے متواتر ایسی شخصیتیں ظاہر ہوتی رہیں اور ایسے نظام ہائے حکومت بھی قائم ہوتے رہے جو اعلیٰ قدروں کے حامل تھے لیکن چونکہ ان کے تفصیلی حالات کو محفوظ کرنے کی صلاحیت ابھی انسانی معاشروں میں پیدا نہیں ہوئی تھی، لہٰذا ان کے حالات کو ہم تفصیلاً نہیں جانتے۔ اس کمی کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا کیا اور حضور کی بعثت کے ساتھ ہی نظریات، آپ کے نافذ کردہ نظام اجتماعی اور شخصیات کی زندگی کی تفصیلات کو محفوظ کرنے کی صلاحیت مسلمانوں نے اپنے اندر پیدا کرلی اور بقیہ دنیا کی رہنمائی کر کے ان کو بھی تاریخ نویسی کے راستے پر گامزن ہونے کا سلیقہ سکھا دیا۔

اسلامی نظام کے انتہائی ارتقا یافتہ ہونے کی تفصیلات تو ہم متعلقہ ابواب میں بیان کریں گے، یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے صرف ایسا استعداد و جو ہر انسانیت ہی ارتقاء کی اصل بنیاد سے جو فلاح آدمیت کا ضامن ہو، نہ کہ اخلاقی اقدار سے تہی دامن وحشیانہ قوت (Brute Force)چاہے اس کی پشت پر انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے جس قدر بھی اختراعات و ایجادات و کمالات موجود ہوں۔صالح علمی کاوشوں کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کرنا انسانی معاشرے میں ارتقائے ذہنی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس چیز کو اسلام نے باقاعدہ طور پر اور بہت بڑے پیمانےپر رائج کیا۔ اس سے انسان کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔

لیکن ان نتائج کا ظہور فکری و عملی دائروں میں اسلامی اصولوں کو اپنانے کے ساتھ مشروط ہیں۔

ان گزارشات کی روشنی میں، اور ساتھ ہی ڈارون کے ان الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن پر مشتمل اقتباس ہم اس سے قبل پیش کرچکے ہیں اور جس میں اس نے اپنی تھیوری کی بنیاد پر وہ ادراک حقیقت حاصل کرنے کے امکان کو رد کیا ہے، اس نتیجے پر ہی پہنچا جاسکتا ہے کہ قوموں اور اجتماعی ہیئتوں کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے اپنے کچھ اصول ہیں، اور ڈارون اور بعض دوسرے محققین نے اپنے اپنے شعبہ ہائے علم میں جو کاوشیں کر کے ارتقاء نام کی تھیوری پیش کی ہے وہ ایک تکنیکی کوشش ہے، جو علمی سطح پر مستحسن ہو سکتی ہے لیکن حیات انسانی کے سارے پہلوؤں پر حاوی اور ان کی ترقی و منزل کو متعین کرنے کے لیے رہنمائی فراہم نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ایسی کاوشوں سے فکر و نظریات، تخلیق کائنات اور انسانی زندگی سے متعلق نتائج اخذ کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے اور ان کی محدودیتوں (Limitation) کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ تکنیکی اعتبار سے ارتقاء کی تھیوری ابھی بہت خام ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ انسانی تحقیق کی بنیاد پر یہ کس منزل تک پیش رفت کر سکے گی۔ اس میں کثیر تعداد میں جھول اور خلا (Gaps) پائے جاتے ہیں۔ سلسلہ ارتقاء کی بہت سی کڑیاں غائب ہیں۔ جو باوجود سعی پیہم کے ڈارون کی تصنیفات کے شائع ہونے کے ایک صدی سے زائد عرصے میں بھی تلاش نہیں کی جاسکیں۔ اور نہ ہی عمل ارتقا کے انداز کے معاملے میں مختلف محققین اور ماہرین علم طبیعیات کے درمیان اتفاق رائے پیدا ہو سکا ہے۔ ان خامیوں کے سلسلے میں سلیوان کی کتاب Leinitations of Scienceسے چند حوالے دیتے ہیں:

"Enough has been said to show how different the scientific world has become from that plain, straightforward, objective universe with which we started. At the present day the scientific universe is more mysterious than it has ever been before knowledge of natural processes in greater than it has ever been, this knowledge is, in a way, less satisfactory,

for in every direction we are faced by ambiguities and contradictions." (Page ۶۹)

یہ ظاہر کرنے کے لیے سائنس کے تصور کی دنیا اس واضح، غیر مبہم اور معروضی نظریے کی حامل کائنات سے جس کا تصور لے کر ہم چلے تھے ، کس قدر مختلف ہو چکی ہے، کافی کچھ کہا جا چکا ہے۔ دور حاضر میں سائنسی کائنات اتنی زیادہ پر اسرار ہو چکی ہے جس قدر وہ فکر(انسانی) کی تاریخ میں کبھی بھی نہ تھی۔ اگرچہ ہمارا قدرتی مظاہر کا علم (اب) ہمیشہ سے زیادہ ہے (لیکن) یہ علم ایک لحاظ سے کم تسلی بخش ہے، اس لیے کہ ہر سمت(یا شعبے) میں ہمارا سابقہ الجھنوں اور تضادات سے ہے۔

کائنات ، اس کی ابتداء اور اس کے ارتقائی سفر کے متعلق سائنس نے آج تک جتنی تھیوریاں پیش کی ہیں ان کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد متعدد کتب کا یہ مصنف اس نتیجے پر پہنچا ہے:

.....the actual line of man's descent from a definitely non- human stock is still a matter of speculation." (Page ۹۸).

دنیا، جیسی کہ وہ ہے، وجود میں آنے کے طریقے کی روئیداد کا جائزہ لینے پر ہم دیکھتے ہیں کہ قابل حل بڑی گتھیوں میں سے کوئی بھی اونچے درجے کے یقینی نظریات کی حیثیت نہیں رکھتی—اور اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ وہ کبھی بھی اس درجے کی یقینیات کا مقام حاصل کر سکیں گی، اس لیے کہ وہ تجربے کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ابھی تک یہ ایک اندازہ ہی ہے کہ انسان نسلی اعتبار سے قطعی طور پر غیر انسانی مخلوق سے منسلک ہے۔

اس نظریے کی تائید انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد ۱۸ میں ''ارتقاء کی تھیوری'' (The Theory of Evolution) کے زیر عنوان تحریر شدہ مقالے کے درج ذیل الفاظ سے ہوتی ہے۔

"It must be stressed that Darwin himself never claimed to Provide proof of evolution or of the origin of species; what he did claim was that if evolution has occurred a number of otherwise inexplicable facts are readily explained. The evidence for evolution was, therefore, indirect." (Page ۹۸۲-۳)

یہ بات پورے زور(و یقین) کے ساتھ کہنی چاہیے کہ ڈارون نے خود ارتقا یا انواع کی تخلیق کی ابتدا کا ثبوت مہیا کرنے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ اس نے جس چیز کا دعویٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ارتقاء(کا عمل) وقوع پذیر ہوا ہے تو بہت سے ایسے حقائق کی، جو بصورت دیگر ناقابل فہم (و بیان) ہیں، آسانی سے تاویل (و تشریح) کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ارتقاء کی شہادت (یا ثبوت) بالواسطہ ہے۔

گویا ڈارون نے اپنی تھیوری ایک مفروضے کی بنا پر پیش کی ، لہٰذا اس سے قبل پیش کیے گئے اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی اس اقتباس سے تائید ہوتی ہے۔ ہم عرض کردیں کہ درج بالا اقتباس جس مقالے سے لیا گیا ہے اس کا وہ حصہ جس سے یہ لیا گیا ہے پروفیسر سرگیون ڈی بیر (Prof. Sir Gavin de Beer) کا لکھا ہوا ہے جس نے زیر بحث موضوع پر بہت کام کیا ہے اور اس سلسلے میں اس نے متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔

مزید بر آں ارتقا کی تھیوری کا تجزیہ کرنے پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسانی ذہانت کیسے وجود میں آگئی۔ چنانچہ سلیوان لکھتا ہے:

"We see that the question of the Evolution of Intelligence bristles with unsolved problems." (Page ۱۰۷).

ہم دیکھتے ہیں کہ(انسانی) ذہانت کے ارتقا کا مسئلہ لاینحل پیچیدگیوں سے (پوری طرح) ڈھکا ہوا ہے۔

"The great theory of natural selection, for example, when studied in detail, is full of lacunae." (Page ۱۲۶)

مثلاً قدرتی انتخاب کی عظیم تھیوری کا جب تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے تو(عمل ارتقاکے تواتر میں) بے شمار خلا ہیں(یعنی سلسلہ ارتقاء کی بہت سی کڑیاں غائب ہیں)

ہم یہ عرض کردیں کہ قدرتی انتخاب (NaturalSelection) ارتقا کی تھیوری کا بنیادی پتھر ہے۔ اگر یہ غیر مستحکم ہے تو اس تھیوری کا وجود قائم رکھنا مشکل ہوگا۔

۳. ... the actual line of man's descent from a definitely non- human stock is still a matter of speculation. (Page ۹۸).

انسان کے یقینی طور پر غیر انسانی مخلوق سے وجود میں آنے کا معاملہ ابھی تک محض ایک قیاس ہے۔

جن مغربی سیاستدانوں اور محققین کے ذہنوں پر استعماری و استحصالی خیالات کا غلبہ ہے وہ تو ڈارون کی پیش کردہ ارتقاء کی تھیوری کو توڑ موڑ کر اپنے مذموم عزائم کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرنے پر مصر ہی ہیں، لیکن اگر مغرب ہی کے ان محققین اور ناقدین کی تحریروں کو دیکھا جائے تو وہ اس تھیوری کے متعلق یہ رائے نہیں رکھتے کہ یہ مستحکم اساسات رکھتی ہے۔

عقل یہ بات کیسے تسلیم کر سکتی ہے کہ انسان کے اخلاق حسنہ اور دوسرے بشری خواص جو احاطہ شمار میں آہی نہیں سکتے از خود اور میکانکی طور پر یوانی مخلوق میں پیدا ہو گئے۔ مثلاً اخلاقی و جنسی سطح پر شرم و حیا(جن کے ہم معنی الفاظ یورپ کی زبانوں میں نہیں پائے جاتے) ادراک و شعور، رواداری و علم، صدق و سچائی، تحقیق و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کا ذوق جو اختراعات و ایجادات کی بنیاد کا کام دیتا ہے۔ جزئیات سے مرکبات کو مرتب کرنا، کائنات کے اسرار و رموز پر غور و تفکر کا رجحان، ذہن و قلب کی جملہ صلاحیتیں و توانائیاں، ادراک حقیقت کی طلب و جستجو، خودارادی، تلاش حق کی خواہش، برابر میں تمیز اور نفس لوامہ کا وجود تخلیقی صلاحیت، علمی و فنی ذوق، اصولوں کی خاطر جذبہ قربانی اور پھر انسان کی یہ پیچیدہ نفسیات ،جن کی گہرائی تک آج تک کوئی پہنچ سکا اور نہ کوئی ان کی پیچیدگی کا تیقن کے ساتھ تجزیہ کر سکا۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عمل ارتقا کی رفتار تو اس قدرست بتائی جاتی ہے کہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال میں کروڑوں اربوں برس صرف ہوتے ہیں اور یہ بھی باور نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے تحت انسانی خصوصیات ،جن میں سے بعض کا ہم نے سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے، ایک ہی وقت میں بیک جست نوع حیوانی میں پیدا ہوئی ہوں اور انسان وجود میں آگیا ہو اور نہ اس کا کوئی مغربی محقق دعویٰ کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حیوان اور انسان کی درمیانی کڑیاں کہیں نظر کیوں نہیں آرہیں۔ اگر حیوانی سطح کی مخلوق ارتقاء کے بعد انسان کی نوع کے وقوع میں آنے کے بعد نہیں مٹی تو حیوان اور انسان کے درمیان کے مختلف درجوں کی عبوری دور کی مخلوق جس میں سے کسی میں انسان کی بعض خصوصیات

پائی جائیں اور بعد میں حیوانی خصوصیات نظر آئیں وہ صفحہ ارض پر کیوں موجود نہیں ہیں۔ ان کے مٹنے کا ، اگر وہ ہوتیں، تو کوئی جو از نظر نہیں آتا۔

اس کے علاوہ اس تھیوری کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان، حیوان، پرندے اور حشرات الارض اسی زمین پر پیدا ہوتے اور پرورش پاتے ہیں۔ انسان کو چھوڑ کر سبھی اقسام مخلوق میں سے ہر ایک کی لاکھوں انواع ہیں۔ انسان کی صرف ایک نوع کیوں ہے؟ اس میں حیوانوں ، پرندوں کیڑے مکوڑوں اور سمندری مخلوق کی طرح تنوع کیوں نہیں پایا جاتا ؟

پھر ذہن میں یہ بات ناگزیر طور پر ابھرتی ہے کہ آیا غیر ناطق اور ان اعلیٰ ذہنی و شعوری استعدادوں سے محروم جاندار مخلوق کی کسی خاص نوع سے سے بیک وقت انسان ایسے وجود میں آگیا جسے بجلی کا ایک بٹن دبانے سے اس کے متعلق تمام قمقمے روشن ہو جاتے ہیں یا اس نوع کے کسی نر اور مادہ پر مشتمل جوڑے نے انسان کی شکل اور فطرت اختیار کرلی اور تمام دنیا پر پھیلی ہوئی انسانی آبادی انہی دو کی اولاد ہیں۔ اگر یہ صورت ہے تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک وقت میں دو الگ الگ ارکان نوع (نر اور مادہ) نے ایک ہی وقت میں انسانوں کی شکل اختیار کرلی چاہے اس تبدیلی کو ایک طویل عرصہ لگا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ طویل عرصہ تو لگا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ نر رکن اس تبدیلی کے دوران کہاں تھا اور مادہ کہاں تھی اور اس کا ملاپ کیسے ہوا؟ اور اگر پہلی صورت تھی تو مختلف زمینی علاقوں، مختلف ماحول اور مختلف آب و ہوا اور غذا کے باوجود ایک ہی وقت میں انسان کے حیوانی آباؤ اجداد میں ایسی تبدیلیاں آتی رہیں جن کے ذریعے ان میں متوازی طور پر انسانی خصوصیات پیدا ہوتی رہیں۔

پھر اس سوال کا کیا جواب ہے کہ جب مغربی فکر کے مطابق یہ کائنات ہمیشہ سے چل رہی ہے اور اس کی زندگی لا متناہی ہے(اب موخر الذکر نظریے میں اختلافات رونما ہو چکے ہیں) تو ذی حیات انواع، خصوصاً انسان کی مدت حیات کیوں اس قدر قلیل ہےحالانکہ ابھی تک ساری کائنات میں اس سے زیادہ باصلاحیت و استعداد مخلوق کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں ہوئیں۔ مادہ پرستانہ نکتہ نظر سے تو اس کی جملہ صلاحیتیں اور ذہنی توانائیاں بے

نتیجہ ہی ثابت ہو رہی ہیں۔ کیونکہ مغربی نظریے کے مطابق تو موت کے ساتھ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ خیر و شر اور برو اثم کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں ہے اور انسان کے لیے ارتقاء کی مزید منازل طے کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ہلاکو اور انبیاء کرام علیہم السلام جو بنی نوع انسان میں گلہائے سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں (نعوذ باللہ) ایک ہی انجام سے دوچار ہو گئے۔ مادے (Matter) پر مشتمل یہ کائنات تو ہمیشہ رہے گی، لیکن انسان بمہ شعور و ادراک اور عقل و خرد چند برسوں کی زندگی کے بعد نسیاًمنسیاً ہو جائے گا۔ کیا ایسا فلسفہ و حکمت تخلیق کرنے والا تمدن واقعی فکری لحاظ سے مستحق تحسین ہے۔

قرآن علم الحیاتیات (Biology) یا ماحول کے حوالے سے نباتات، حیوانات اور نوع انسانی کی نشو و نما (Ecology) یا کسی مخصوص متعلقہ تکنیکی شعبہ علم کی کتاب نہیں ہے۔ وحی شدہ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کے میدان میں انسان کو مکمل رہنمائی دی ہے (تفصیل ''قرآن'' کے عنوان کے تحت عرض کی جائے گی) مظاہر کے معاملات پر اس حد تک گفتگو کی گئی ہے جو اللہ کے خالق و مدبر کائنات قدرت کے ہونے کے لیے آیات و دلائل کا کام دے سکیں۔ اس سلسلے میں بعض ایسے موضوعات پر اشارات بھی کر دیئے گئے ہیں جو یا تو علم غیب سے تعلق رکھتے ہیں یا آنے والے ادوار میں انسانی استعداد تحقیق کے ذریعے ان کی تفصیلات معلوم کی جاسکیں گی۔ جیسا کہ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے فرمایا:

عصر با پیچیدہ در آیات اوست

جہاں تک انسان کی ذات اور اس کے نتیجے میں اس کے اخلاقی اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ارتقاء کا تعلق ہے۔ مغرب میں رائج ارتقاء تو یہ نظریہ دیتا ہے کہ ان تمام شعبوں میں انسان ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ لیکن نہ تاریخ کے واقعات اس نظریے کی تائید کرتے ہیں اور نہ اسلام اس کی توثیق کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صفحہ ارض کے مختلف خطوں میں مختلف ادوار میں بہت سے تمدنوں نے جنم لیا ہے، اور ہر تمدن سے متعلق خطہ ارض کی تاریخ کا وہ زمانہ اس کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسے تمدنی عروج فلاح آدمیت کے صحیح اصولوں کو اپنانے کی بدولت ظہور میں آئے ہوں۔ بلکہ ان کے وجود میں آنے کا باعث بعض ایسی خصوصیات ہوتی رہی ہیں جو اس تمدنی اکائی نے اپنے حاصل شدہ

مادی ذرائع کو اپنے پڑوسی قوموں یا خطوں کی آبادیوں کے مقابلے میں بہتر طور پر استعمال کرنے کے لیے اپنے اندر پیدا کرلیں۔ اس سے یہ ناقابل تردید نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ خطہ ارض کی کسی آبادی کا وقتی طور پر مادی ترقی کرلینا بنی نوع انسان کے مجموعی ارتقاء کی علامت نہیں ہے۔

جہاں تک انسان کی ذات کا تعلق ہے وہ تخلیق آدم سے لیکر آج تک بالقوہ ایک ہی قسم کی فطرت اور خصوصیات سے متصف ہے۔ تمدنی تبدیلیوں سے مختلف اجتماعی نشیب و فراز آتے رہے ہیں، اور یہ خصوصیات یا تو دب جاتی رہی ہیں یا ابھرتی رہی ہیں۔ البتہ چاہے انسان کو جنگل میں غیر مہذب زندگی میسر ہو یا کسی چمک دمک والے تمدن کی شہری زندگی، اس کی فطرت بحیثیت مجموعی ایک جیسی ہی ہوگی۔ ہاں افراد میں نامعلوم وجوہ کی بنا پر مختلف صلاحیتوں کے اعتبار سے تفاوت ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن یہ صورت بھی ہمیشہ رہی ہے، آج بھی ہے اور اس زندگی کی حد تک ہمیشہ رہے گی۔ البتہ اصلح اصولہائے حیات انسانی فطرت کے اظہار کے لیے بہتر میدان مہیا کرتے اور اس کی خفتہ روحانی و عملی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ حیاتیاتی (Biological) اعتبار سے انسان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، جیسا کہ مغربی تمدن کی کوکھ سے پھوٹنے والے ہر فتنہ انگیز مکتب فکر کے داعیوں نے دعویٰ کرڈالا ہے، اور یکے بعد دیگرے منہ کی کھا رہے ہیں۔

اسلام یہی اصلح اصول دیتا ہے جن کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ ان اصولوں کے اپنانے سے ہی انسان ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے، اور اس ترقی سے مراد انسان کے اندر فکر و عمل کی صفات حسنہ پیدا کرنا ہے، لیکن اسلام نے یہ نظریہ کہیں پیش نہیں کیا کہ ان اصولوں کے نفاذ پر اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو مجبور کرے گا۔ اس مسئلے پر ہم قرآن کی آیات (۱۰ : ۱۰۸) اور(۲ : ۲۵۶) کا حوالہ دے کر گفتگو کر چکے ہیں۔ ان اصولوں کی حیثیت تشریعی ہے تکوینی نہیں۔ موخر الذکر غیر متبدل اور انسان کے بس سے باہر ہے۔ اول الذکر کو اپنانے میں وہ آزاد ہے اور انہیں اپنانے ہی پر اس کے تمدنی ارتقاء کا انحصار ہے۔ جب ان کو اپنائے گا تو بلندی کی طرف جائے گا، جب ان سے رو گردانی کرے تو معنوی اعتبار سے انسانیت کی مجموعی فلاح کے لحاظ سے تنزل کی طرف جائے گا۔

لیکن ہم نے ابھی جو کچھ عرض کیا اس سے یہ تاثر نہ لینا چاہیے کہ ہدایت اور رہنمائی کے بعد اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کے معاملات میں ہر قسم کی مداخلت سے دستبردار ہو گیا ہے۔ وہ خالق کائنات ہونے کے علاوہ مدبر کائنات بھی ہے۔ لہٰذا وہ اس کے کسی گوشے میں مخلوق کو بخشی ہوئی آزادی کے نتیجے میں برپا ہونے والے فساد کو ان حدود سے نہیں پھلانگنے دیتا جو اس نے اپنی مشیت کے تحت مقرر کر رکھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳:۱۷)

ترجمہ : اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلیں۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا اور اسی طرح جھاگ ان چیزوں کے اندر سے بھی ابھرتا ہے جن کو یہ زیور یا اسی قسم کی کوئی اور چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہوتی ہے وہ زمین میں ٹک جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔

اپنے اپنے الفاظ اور اپنے اپنے انداز سے سبھی مفسرین نے اس آیت کو اس معنی میں لیا ہے کہ یہ حق و باطل یا دوسرے الفاظ میں بنی نوع انسان کے لیے نافع و مضر نظریات کی کشمکش سے متعلق ہے۔ اس میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ ہر دور اور زمانے میں جو برائیاں پائی جاتی ہیں وہ طشت از بام ہو جاتی ہیں۔ اس آیت میں دو تمثیلوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے کہ باطل کو ثبات حاصل نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ انسانی معاشروں میں حق و باطل کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہاں قانون قدرت یہ بتایا گیا ہے کہ باطل کو چھانٹنے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس کو ترقی کا نام دیجئے یا ارتقاء کا۔ بہتری کی طرف رخ کی ایک علامت یہ ہے کہ باطل کی مختلف شکلوں کا احساس انسان کے ذہن میں پیدا ہوتا رہے اور وہ اس کو تفکر اور عملی تجربات کے ذریعے بتدریج مسترد کرتا رہے۔ اگر تاریخ کے پس منظر میں اس آیت میں

پیش کردہ صورت پر غور کیا جائے تو استرداد باطل کا یہ عمل واضح ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہم متعلقہ باب میں گفتگو کریں گے۔ بعثت اسلام کے وقت سیاسی، معاشی اور معاشرتی شعبوں میں ایسا فکر چھایا ہوا تھا جسے اسلام نے کلیتاً رد کردیا۔ مثلاً اسی دور میں سیاسی سطح پر دنیا کے کسی خطے یا ملک و قوم میں بادشاہت یا آمریت کے سوا کسی اور نظام کا تصور تک نہ پایا جاتا تھا، شہری آزادیوں کا کسی کو کوئی شعور ہی نہ تھا۔ معیشت میں خزانہ عامرہ کو بادشاہ کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ بدحال طبقوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مساوات و اکرام انسانی کی طرف کسی کا ذہن سرے سے جاتا ہی نہ تھا۔ اسلام نے بیک وقت ایسی ساری چیزوں کی طرف توجہ دی اور ایسا نظام قائم کیا جس کی نظیر سابقہ ادوار میں ملتی ہے اور نہ بعد کے ادوار میں۔ لیکن ایک بات ہوئی ہے کہ اس عمل نے جس کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے ایک ایک کرکے ان ساری باتوں کا انسان کے ذہن میں شعور پیدا کر دیا۔ اگرچہ اسلام کے قرن اولیٰ کی طرح مکمل صالح نظام قائم کرنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی، لیکن قومی و بین الاقوامی سطحوں پر ظلم و جور پر مبنی موجود نظاموں کے باوجود یہ بات واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے کہ بعثت اسلام کے بعد بہت سے مضرت رساں نظریات کو فکری سطح پر مسترد کر دیا گیا ہے۔ اور یوں بتدریج قدرتی عمل اصلاح کے ذریعے زیر بحث آیت کے مطابق انسان کی انفرادی و اجتماعی بہتری کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر تطیر فکرو عمل کا یہ سلسلہ جاری رہے تو ظاہر ہے کہ یہ نوع انسانی سے متعلق زندگی کے معالمات میں منازل ارتقا طے ہونے ہی کے مترادف ہے۔

لیکن اس قدرتی عمل کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو اپنا کر اگر انسان شعوری طور پر ایک صالح نظام کو زیر عمل لانے کا ارادہ کرلے تو اسی صورت میں مثبت اور محسوس شکل میں وہ ایسے ضابطہ حیات کے تحت زندگی بسر کرنے کی توقع رکھ سکتا ہے جس کے ذریعے سے اعلیٰ اقدار کی کار فرمائی کی ضمانت مہیا ہو سکے۔ اصلاح کا یہ پہلو قرآن کی ان آیات سے متعلق ہے جن کا ہم نے اس سے قبل حوالہ دیا ہے اور عرض کیا ہے کہ ان کے مطابق انسان کو ایک متعین مدت تک کے لیے آزادی عمل سے نوازا گیا ہے۔ انسان کا اس ارضی

زندگی میں حیاتیاتی ارتقاء تو مکمل ہے اب صرف اسی نوعیت کے ارتقاء کے امکانات ہو سکتے ہیں جس کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۹:۸٤)

ترجمہ : تم کو لازما چڑھنا ہے درجہ بدرجہ ۔

یہ سورۃ انشقاق کی ایک آیت ہے۔ اس سے قبل اسی سورہ کی آیت ٦ میں خطاب الانسان کی طرف ہے۔ اس آیت میں بھی بنی نوع انسان ہی سے خطاب ہوگا۔ لہٰذا درجہ بدرجہ چڑھنے سے مراد اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے تحت منازل ارتقاء طے کرنا ہی مراد لیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک انسان کی نوعی تخلیق کا تعلق ہے اس کے متعلق تو فرما دیا گیا :

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۷ : ۱۸۹)

ترجمہ: وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان ہے۔

ابتدائے تخلیق کے متعلق بتا دیا گیا :

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ (۲:٦)

ترجمہ : وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔

پھر اس بات کے سلسلے میں بھی حوصلہ افزائی کی کہ ابتدائے تخلیق کے متعلق غورو تفکر کرو :

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (۲۰:۲۹)

ترجمہ : ان سے کہو ،زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ کس طرح اللہ نے خلق کا آغاز کیا۔

لیکن اس کاوش علمی کے نتیجے میں وجود باری تعالیٰ سے انکار کی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جیسا کہ ہم اس سے سے قبل بیان کرچکے ہیں، اس سے پختگی ایمان کے لیے مزید مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس تفکر و تدبر کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی تخلیقی اور

تدبیری حکمتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس پہلو سے مزید گفتگو" توحید" کے زیر عنوان باب میں ہوگی۔

آبا پرستی اور دین اسلام

آبا پرستی ترقی اور فکری و نظری ارتقا کے راستے کی ایک بہت بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ یہی رجحان غلط نظریات سے چمٹے رہنے اور مبنی بر حق دعوت کو قبول کرنے میں مزاحم ہوتا رہا۔ تاریخ کی شہادت بھی موجود ہے اور قرآن بھی اس کی مثالیں پیش کرتا ہے کہ افراد و اقوام زمانہ قدیم سے اس مرض میں مبتلا رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ انبیا سابقہ کو بھی اس سے عہدہ برآ ہونا پڑا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اس سے سابقہ پڑا۔ اس کی نفی کر کے اور اپنے مخاطبین کو اس سے منحرف ہونے پر آمادہ کر کے حضور نے تمدنی ارتقا کی راہ ہموار کی۔ اس سے امت مسلمہ میں علم و عرفان کی روشنی اس تیزی سے پھیلی، جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ ایک امی معاشرہ میں حضور کے مختصر زمانہ نبوت کے دوران تحقیق و مطالعہ کا شوق اس قدر بڑھا کہ زمانہ مابعد میں عظیم حکماء اور دانشوروں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علمی جواہر پاروں سے استفادہ کیا۔

حضور سے قبل مبعوث ہونے والے انبیاء و رسل کے تذکرے کے دوران قرآن قوم عاد کے سرداروں کی طرف سے حضرت ھودعلیہ السلام کی دعوت توحید کے جواب میں یہ الفاظ نقل کرتا ہے:

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا(۷:۷۰)

ترجمہ : کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ؟

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں بھی قائدین قوم نے اسی نوعیت کا جواب دیا:

مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ(۲۳:۲۴)

ترجمہ : اس طرح کی بات ہم نے اپنے اگلے بزرگوں میں تو سنی نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ایسے ہی جواب کا سامنا کرنا پڑا :

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۝ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ(۲۱ : ۵۱ – ۵۳)

ترجمہ : اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی ہدایت عطا فرمائی اور ہم اس سے خوب باخبر تھے جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو ! انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کے متعلق قرآن کہتا ہے :

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ(۵:۱۰۴)

ترجمہ : اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

اسی طرح قرآن ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام سابقہ انبیا کا ایک ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۲۲ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۲۳ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ(۴۳:۲۲۔۲۳)

ترجمہ : بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پلایا ہے اور ہم بھی انہی کے نقش قدم پر راہ یاب ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے جس بستی میں بھی تم سے پہلے کوئی منذر بھیجا تو اس کے خوشحالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔ منذر نے کہا، کیا میں اس سے زیادہ ہدایت

بخش طریقہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے جب بھی تم انہی کے نقش قدم کی پیروی کرو گے ! انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس سارے کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔

مندرجہ بالا تمام آیات میں تین حقیقتیں واضح طور پر سامنے آجاتی ہیں:

ایک یہ کہ قوموں اور اجتماعی اکائیوں میں آباء پرستی کا مضبوط رجحان ہمیشہ سے رہا ہے، چاہے یہ مذہب سے متعلق ہو یا دین سے یا سیاسی فکر ہے۔ کسی مصلح، مجدد یا نبی کی اصلاحی، تحریری اور دین کو پیش کرنے اور منوانے کی جدوجہد میں یہ رجحان بہت بڑی سد راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بھی یہی صورت ہے اور گزشتہ ادوار میں بھی یہی کیفیت تھی۔

دوسرے یہ کہ قوموں کی فکری رہنمائی ہمیشہ ان کا ایک ذہین، صاحب ثروت اور بااختیار طبقہ کرتا ہے۔ جتنی آیات کا ہم نے ابھی حوالہ دیا ہے ان میں سے ہر ایک کے مخالفانہ الفاظ قرآن میں اسی طبقے سے منسوب ہیں۔ یہی طبقہ اپنے مفادات کی خاطر عوام کو گمراہ کرتا ہے۔ اس کا زور توڑ کر اور عوام کو ان کی قیادت سے آزاد کرکے ہی دعوتی کام کو کامیابی سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے۔ ہر تغیر و انقلاب میں میں قاعدہ کار فرما نظر آتاہے۔لیکن موجودہ دور میں ہوس اقتدار میں مبتلا ایسی مخلوق بھی دکھائی دے رہی ہے جو اسی قیادت کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے ، جس کو مسند حکومت سے اتار کر ہی دعوت اسلامی کا کام سرانجام دیا جا سکتا ہے، اقامت دین کے لیے کوشاں ہونے کا دعوی کر رہی ہے۔

تیسرے یہ کہ اسلام آباپرستی کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل قدر ''حق'' ہے۔ اس کو اپنانا چاہیے اور یہی وہ کسوئی ہے جس پر ہر نظریے کو پرکھنا چاہیے۔ اس دین میں حق وہ ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہو۔ سابقہ انبیاء نے بھی اسی حق کی طرف دعوت دی جو اللہ تعالی کی طرف سے ان پر وحی کیا گیا اور نبی آخرالزمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ کی کتاب اور اپنی سنت میں بیان کردہ اصولوں کی طرف دعوت دی ہے۔

آباء پرستی کا ایک مظہر تقلید جامد کا مسلک ہے۔ اس نے مسلمانوں کو فکری و ذہنی جمود میں مبتلا کردیا اور یوں انہوں نے دنیا کی علمی و سیاسی قیادت سے محروم ہو کر غیروں کی

غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈال لیا۔ دراجتہاد مقفل کر دیا گیا اور یہ عقیدہ اختیار کر لیا گیا کہ ہمارے بزرگ اور اکابرین جو کچھ کہہ گئے ہیں اسے قرآن و سنت کی روشنی میں زمان و مکان کی تبدیلی کے باوجود نئے حالات پر منطبق نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان کے اجتہادات کی رو کو نظرانداز کر کے ان کے الفاظ کے ساتھ چمٹے رہیں گے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ آخر ان حضرات کو اجتہاد کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی تھی۔ اگر انہیں حالات کے تقاضوں کے تحت اجتہاد کرنا پڑا تو بعد کے ادوار میں اس کی ضرورت کیوں ساقط ہو گئی ؟ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے علماء اجتہاد کی استعداد ہی سے محروم ہو گئے۔ اور یوں دینی معاملات میں فکری سطح پر آبا پرستی ہی کی ایک ایسی معنوی صورت پیدا ہو گئی جس کا درج بالا آیات میں تذکرہ ہے۔

تدبر و تفکر کی توانائیوں کو معطل کردینے کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ہم علمی و تحقیقی میدان سے خود بخود خارج ہو گئے اور ہماری ساکھ اس قدر گر گئی کہ غیروں ہی نے نہیں بلکہ ہمارے اندر پیدا ہونے والے مستغربین نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ دین اسلام کے اساسات اول تو دور حاضر میں چل ہی نہیں سکتے ، اور اگر ان کے ساتھ وابستگی اختیارکرنی مطلوب ہے تو انہیں غالب اور زمانہ رواں میں نافذ نظریات کے ساتھ سازگاری اختیار کرنا ہوگی۔ مسئلہ ''اجتہاد'' پر تو ہم بعد میں بالوضاحت گفتگو کریں گے، یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اجتہاد کے مسلک سے دستبرداری آبا پرستی ہی کی ایک صورت ہے جس سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرز عمل کی بدولت اب ہم کسی کے طعن کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اگر ہماری علمی ساکھ بحال ہوتی اور ہم اپنے سلف کی علمی کاوشوں کے تسلسل کو برقرار رکھ کر دین کی برتری کو قائم رکھتے تو کسی کو زبان طعن دراز کرنے کی ہمت ہوتی اور نہ اس کے لیے کسی کے پاس کوئی بنیاد ہوتی۔

دینی سطح پر ہماری ساکھ کے گر جانے کی وجہ سے غیروں کی اسلام ناشناسی اور اپنوں کی مغرب پرستی کے زیراثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چودہ سو سالہ پرانی روایات کا اتباع فرسودہ قسم کی آبا پرستی ہی کی ایک شکل ہے جس کی وجہ سے مسلمان پسماندہ اور روبہ .انحطاط ہیں۔ اس رائے میں تعصب، بے خبری اور اصل صورتحال کے تجزیے سے گریز کے عناصر شامل

ہیں۔ ہم موزوں موقع پر تعصب کے متعلق تو حوالہ جات دے کر یہ ثابت کریں گے کہ از منہ تاریک سے نکل کر گیارہویں صدی عیسوی سے یورپ میں کلیسا نے اس ہتھیار کو اسلام کے نفوذ کو روکنے کے لیے کذب و افترا کا سہارا لیکر استعمال کیا۔ بے خبری کا عنصر اس وجہ سے اس صورتحال میں شامل ہے کہ مسلمان جب خود ہی اسلام کو اپنانے سے گریز کر رہے ہیں تو دوسروں کو اسلام کی تعلیمات سے کس طرح آگاہ کریں گے۔ اگر بعض لوگ تبلیغ کے نام پر دوسرے ممالک کی سیر و سیاحت کا شغل فرماتے ہوئے خطابات سے لوگوں کو نوازتے ہیں تو اس کا اپنوں پر کوئی اثر محسوس نہیں ہو رہا تو غیروں پر کیا ہو گا !ان مبلغین حضرات نے باہر کے ممالک میں بھی دین کے اصولہائے مہمہ کی وضاحت کے بجائے فروعی مسائل کی بنیاد پر فرقہ واریت کو فروغ دیا ہے۔ جہاں تک تیسرے عنصر کا تعلق ہے اسلام نے آج سے چودہ صد سال قبل انسانیت کو فکر و عمل کے تمام گوشوں کے لیے جو اصول دیئے ہیں وہ مستقل حیثیت کے مالک ہیں اور ابدی افادیت کے حامل ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے حالات میں قابل عمل ہیں۔ ان پر مفصل گفتگو آئندہ ابواب میں کی جائے گی۔ یہاں ہمیں یہ عرض کرناہے کہ دنیا کا ہر ضابطہ زندگی، مذہب اور مسلک اپنے اپنے مستقل اصولوں ہی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔اگر ان میں سے کسی اصول کو بھی حذف کر دیا جائے تو اس سے متعلقہ ضابطہ حیات، مذہب یا مسلک مسخ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر اشتراکیت سے پیداواری ذرائع کے اجتماعی ملکیت کے اصول کو خارج کر دیا جائے تو وہ اشتراکیت نہیں رہے گی، اسی طرح اگر سرمایہ دارانہ جمہوریت سے شخصی ملکیت یا عوامی رائے سے حکومت کی تشکیل کے اصولوں کو حذف کردیا جائے تو اس نظام اجتماعی کا حلیہ ہی نہیں بگڑے گا بلکہ یہ محو ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریات اپنے اپنے متعلقہ نظام کے غیر متبدل اجزا ہیں۔ چاہے کوئی نظام صدیوں تک چلتا رہے یا وہ تاریخ کا حصہ بن جائے۔ اس کے موئیدین، اور غیر لوگ بھی ان مستقل اصولوں کو اس سے منسوب کریں گے اور یہی اصول اس کی شناخت مہیا کریں گے۔ اس میں آبا پرستی کی پھبتی کسنے کا کوئی جواز نہیں۔ ہاں ان اصولوں کے غلط یا صحیح ہونے یا ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کامسئلہ الگ.ہے۔ البتہ ان اصولوں کو زیر عمل لانے کے لیے آباؤ اجداد کے طریقوں پر جمے رہنا اور زمان و مکان کی تبدیلی کے تقاضوں کے باوجود ان کے نفاذ کے

مناسب انداز سے گریز کرنا آباء پرستی کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد باطل سے محض اس لیے وابستہ رہنا کہ وہ آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا ہے، بھی آباء پرستی ہے۔ لیکن اپنی پسند کے دین یا ضابطہ حیات کے اساسی اصولوں سے وابستگی کو آیا پرستی سے معنون نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن میں آبا پرستی کے سلسلے کی آیات سن کر آج کل کے بعض مسلمان عام طور پر سوچتے ہیں کہ یہ تو اقوام کہن اور قریش مکہ سے متعلق ہیں اور تخاطب موخر الذکر سے ہو رہا ہے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہر دور کے لوگ قرآن کے مخاطب ہیں۔ جن لوگوں کو تقلید جامد کا عارضہ لاحق ہے اور وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ در اجتہاد مقفل ہو چکا اور اپنے اپنے مکتب فکر کے مقابلے میں عملاً قرآن و سنت کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے، چاہے زبان سے اس کا اقرار نہ کرتے ہوں ،یا وہ لوگ جو سجادہ نشینوں کے مراکز سے وابستہ ہو کر قبروں سے حاجات طلبی کے مرتکب ہوتےہیں، اور اس تصور کے حامل ہیں کہ ان کی یہ عقیدت مندیاں آباؤ اجداد کا ورثہ ہیں، ان پر ان آیات کا پوری طرح انطباق ہوتا ہے۔

اسلام میں کوئی مذہبی مراعات یافتہ طبقہ نہیں

دنیا کے تمام مروجہ غیر اسلامی مذاہب و ادیان اپنے اندر ایک ایسے طبقہ کے وجود کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں جو ان کے مذہبی امور کے سلسلے میں اجارہ داری کے منصب پر فائز ہو۔ مثلاً ہندومت میں ذات پات کی تمیز کو ان کی کتب مقدسہ میں ایک مذہبی اصول کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ برہمن ذات کو نسلی بنیاد پر مذہب کا اجارہ دار مانا جاتا ہے، اور صرف اسی ذات سے تعلق رکھنے والے ہی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے رہنمائی کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ ان کے تقدس کے تصور میں اس قدر غلو کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے اندر ایک ذات جنہیں شودر کہا جاتا ہے، کا کوئی فرد نہ مندر میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ کسی برہمن کو چھو سکتا ہے اور نہ کسی مذہبی کتاب کو پڑھ یا سن سکتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کی درمیانی ذاتوں میں سے کوئی شخص بھی مذہبی دائرے میں پابندی احکامات کر کے روحانی ارتقاء کے ذریعے برہمنوں کے زمرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ تقسیم ہندومت کے مسلمہ اصولوں کا

اہم ترین جزو ہے۔ اگرچہ گوتم بدھ نے اپنی مذہبی تعلیمات میں ذات پات کی اس تقسیم کو شامل کرنے سے انکار کردیا، لیکن اس کو مٹانے کے لیے کوئی عملی جدوجہد نہیں کی۔ برہمن ذات کی مذہبی اہمیت کو تسلیم نہ کرنے کی پاداش میں بدھ مت کو، جو ایک زمانے میں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل چکا تھا، قریب قریب ملک بدر ہونا پڑا۔ یہ بات قابل توجہ ہے۔ یہ خود گوتم بدھ نے بھکشو نام سے ایک طبقہ کی بنیاد رکھی، جن کے لیے ازدواجی زندگی اور اکتساب رزق کے معاملات میں الجھنے کی ممانعت تھی۔ وہ ابتداً ہمہ وقت سفر میں رہتے تھے اور عوامی اعانت کے سہارے گزر بسر کرتے تھے، اگرچہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے جگہ جگہ اپنے مراکز قائم کر لئے، اور اس طرح مذہبی دائرے میں ایک مخصوص اور امتیازی مقام حاصل کرلیا۔

اسی طرح ہم ''پس منظر'' کے زیر عنوان باب میں یہود و نصاریٰ کے اندر احبارو رہبان کے ایسے طبقات کا تذکرہ کر چکے ہیں جنہوں نے توراۃ اور انجیل میں تحریفات کر کے اپنے لیے مذہبی اجارہ داری کا مقام تسلیم کروا لیا۔ ان طبقات نے معاوضوں کے بدلے میں اخروی نجات دلوانے تک کا عقیدہ بھی رائج کروا لیا۔ اس نظریے کی صدائے باز گشت بعد کے ادوار میں یورپی سیاست میں کلیسا اور ملوکیت کے اداروں کے درمیان کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں اگرچہ کلیسا کو عملی زندگی میں دخل اندازی سے دستبردار ہونا پڑا لیکن پادریوں کے طبقے کو مذہبی امور میں مراعات آج تک حاصل ہیں۔ مزید برآں ان کے لیے الگ مذہبی احکامات ہیں اور عوام کے لیے الگ۔

اسلام نے روز اول سے یکساں طور پر تمام بنی نوع انسانی کو مخاطب کیا۔ جوں جوں قرآن نازل ہوتا گیا، اسے عوام کے حوالے کیا جاتا رہا۔ سب کو اس پر غور و تدبر کی دعوت دی گئی۔ معمول کی قرات کے علاوہ پانچ وقت کی نمازوں میں، اس کی تلاوت ہر مسلمان کے لیے لازمی قرار دے دی گئی۔ اس کے علاوہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبیین و وضاحت فرماتے اور عملی زندگی پر اس کے احکامات کے انطباق کے سلسلے میں رہنمائی فراہم کرتے رہے۔ کوئی مخصوص گروہ یا طبقہ اس کام کے لیے منتخب نہیں کیا گیا کہ وہ ہدایت خداوندی پر اپنی اجارہ داری قائم کرکے عام لوگوں پر اپنے تقدس کی دھاک بٹھائے اور

احکامات دین کی من مانی تعبیرات و تاویلات پیش کرے۔ قرآن ایک امی معاشرے میں نازل ہوا۔ لوگ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے حضور کی رہنمائی میں قرآن کی تعلیمات پر مجالس مذاکرہ منعقد ہونے لگیں اور تعلیم و تعلم کا شوق تیزی سے پھیلنے لگا۔ مدینۃ النبی کے قرب و جوار اور دور دراز علاقوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کا پیغام لیکر پھیل گئے۔ قرآن کسی کی دسترس سے باہر نہیں تھا۔ چند سالوں کے اندر اندر ہزار ہا حفاظ قرآن پیدا ہو گئے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن تھا کہ قرآن کسی مخصوص طبقہ تک محدود رہتا۔ نہ اس کے متن کے متعلق کوئی اختلاف پیدا ہو سکتا تھا۔

اس کے برعکس دوسرے مذاہب و ادیان میں بلا استثنی یہ صورت پیدا ہوتی رہی کہ ان کے صحیفے اور بانیان مذاہب کے اقوال عام لوگوں کی پہنچ سے بالا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جیسا کہ ہم" پس منظر" کے زیر عنوان باب میں لکھ چکے ہیں ، جب بخت نصر (Nebuchadnazzer)شاہ بائل نے بیت المقدس پر حملہ کرکے تو رات کو جلا دیا تو اس کا نام و نشان صفحہ ارض سے مٹ گیا۔ اس کے بعد جب سائرس نے بابل فتح کرکے یہودیوں کو قید سے رہائی دلوائی تو عزیر نے ادھر ادھر سے غیر ثقہ روایات جمع کر کے نئے سرے سے تورات کو مرتب کیا۔ اگر یہ صحیفہ عوامی دسترس سے باہر اور ایک محدود طبقہ میں نہ ہوتا تو اس کا مٹنا محال ہوتا۔

یہی حال موجودہ انجیل کا ہے۔ اس کا سلسلہ روایت حضرت عیسٰی علیہ السلام تک نہیں پہنچتا۔ اسی طرح ہم تذکرہ کر چکے ہیں کہ زرتشت کا صحیفہ" اوستا "سکندر اعظم کے ایران پر حملے میں جل کر نا پید ہو گیا۔

قرآن اور ذخیرہ احادیث تک ہر مسلمان کی رسائی ممکن ہے۔ کسی پر کوئی بار نہیں۔ کسی طبقے یا گروہ کی ان پر اجارہ داری نہیں۔ ہر کوئی اپنی علمی استعداد کے مطابق ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ آپ قرآن اور پورا ذخیرہ احادیث پڑھ جائیے، کہیں آپ کو اشارہ تک نہیں ملے گا کہ ان ماخذ دین کی تعبیر و نفاذ کی اجارہ داری کا استحقاق کسی ایک حلقے کے حوالے کیا گیا ہو۔

جب مسلمان خلافت علی منہاج النبوۃ کی جگہ ملوکانہ سیاسی نظام کے تحت آگئے، تو آہستہ آہستہ دینی علوم کے سلسلے کی سرگرمیوں اور سیاسی معاملات سے عہدہ برآ ہونے کی کارگزاریوں کے دھارے الگ الگ بہنے شروع ہو گئے۔ اگرچہ مسلمان بادشاہوں نے کبھی بھی اسلام سے برات کا اظہار نہیں کیا اور اپنے اپنے طرز پر خدمت دین کرنے کا تاثر دینے کی کوشش کرتے رہے۔ تفصیلات تو موزوں مقام پر آئیں گی، ہم اختصار کے ساتھ یہاں اشارتاً یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ جوں جوں دینی امور اور سیاست میں جدائی کی خلیج عملاً اور مغلِ وسیع ہوتی گئی زندگی کے تمام شعبوں میں مفاد پرستوں نے سر اٹھانا شروع کیا۔ اگرچہ ہر دور میں علماء حقہ کا ظہور ہوتا رہا اور ان کی مساعی جمیلہ کے ذریعے سے دین ہر قسم کی ترمیم و تحریف اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہا، لیکن عوام چونکہ مقلدانہ ذہن رکھتے ہیں(اور ہر معاشرے میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے) لہٰذا تقلید جامد، جو اسلام کی تعلیمات کی روح کے سراسر منافی ہے، نے سر اٹھایا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے قوائے فکر و نظر میں اضمحلال کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے اور صدیوں پر پھیلے ہوئے روبہ تنزل رجحان کے نتیجے میں امت مسلمہ کو وہ دن دیکھنے پڑے جن سے ہم گذشتہ دو تین صدیوں سے دوچار ہیں۔ تقلید جامد ہی کے یہ ضمنی ثمرات (By products) ہیں جو ہم پیروں اور ملاؤں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔—اول الذکر اپنی گدیوں کو وراثت کے طور پر اپنے خاندانوں کے قبضے میں رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرسوں اور نذرانوں کے ذریعے سے یہ گدیاں بہت بڑا ذریعہ آمدنی ہیں۔ ان کے جبہ و دستار کی تعمیرات عام طور پر انتہائی نادار عوام سے وصول کیے گئے نذرانوں کے بل پر ہوتی ہیں۔ چنانچہ" جواب شکوہ" میں علامہ اقبال یہ سوال کرتے ہیں :

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے ؟

(بانگ درا صفحہ ۲۲۳)

ایک اور مقام پر علامہ کہتے ہیں:

بمرگ ناتمامے جاں سپرون
گرفتن روزی از خاک مزارے

اور مرید کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں :

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی و مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں بچتے ہیں کعبے کے برہمن!
نذرانہ نہیں ! سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن!
میراث میں آئی انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

(بال جبریل صفحہ ۲۱۹ – ۲۲۰)

مشاہدے میں آیا ہے کہ دین کی تعلیمات سے بے خبر ہونے اور مذہب کا غلط تصور دین اسلام پر بھی چسپاں کر دینے کی وجہ سے دور حاضر کے بوسیدہ نظام تعلیم کے بعض فارغ التحصیل لوگ بھی اپنی موہوم اور ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے ان مراکز کی راہ لیتے اور نذرانے پیش کرتے ہیں۔ لیکن علمی اور نظریاتی سطح پر مسلمانوں کے سواد اعظم نے نہ ماضی میں مذہبی اجارہ داری رکھنے والے کسی طبقے کو کبھی تسلیم کیا ہے اور نہ آج کسی ایسے طبقے کو از روئے اسلام تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کے اندر مندرجہ بالا قسم کی جو حرکات سرزد ہو رہی ہیں وہ دور انحطاط اور غلامی سے پیدا شدہ حالات سے بعض ہوشیار لوگوں کی طرف سے غلط قسم کا فائدہ اٹھانے کا نتیجہ ہیں۔ قرآن و سنت سے کوئی نص اس طرز عمل اور رویے کی تائید میں موجود نہیں، بلکہ اس کے برعکس اسوہ حسنہ رسول ، صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل اور علماء حقہ کی زندگیوں اور تصانیف کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بلا شک و ریب عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ان باتوں کا کوئی وجود نہیں اور یہ سراسر قابل مذمت ہیں۔ فقیری کا دعویٰ کرنے والے یہ لوگ انتہائی دنیا پرست اور ہر چڑھتے سورج کے پرستار ہوتے ہیں۔

بقول علامہ اقبال:

باقی کلنہ فقر سے تھا ولولہ حق
طروں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار

(بال جبریل ۲۱۲)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے جنگ عظیم اول میں خلافت عثمانی کے خلاف انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہونے کو از روئے اسلام تحریری طور پر جائز قرار دیا، اور اب آزادی ملنے کے بعد یہ ہر حکمران کی چوکھٹ پر سر نیاز خم کرنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں قطع نظر اس بات کے کہ اسلام کے متعلق فی الاصل اس کا رویہ کیا ہے۔

اسلام میں ایسے اداروں کا کوئی تصور یا جواز نہیں۔ اس کے برعکس ان کے ڈانڈے شرک سے جاملتے ہیں جو اس دین کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ناقابل معافی جرم اور اس کے غضب کو بڑھکانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ادارے اس وقت عوام میں دین کے صحیح تصور کو بیدار کرنے کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

خدمت اسلام ہر شخص اپنی علمی استعداد اور درجہ تقویٰ کے مطابق کر سکتا ہے۔ لیکن اس خدمت کو پیشہ بنانا، اس دین میں بالکل ناجائز ہے۔ نہ ہی اسلام خاندان کسی شخص یا کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بزرگی اور تقدس کے مقام پر خود ہی فائز کر کے لوگوں کو اپنی طرف آنے کی دعوت دے، اور اپنی کرامات کے خود ساختہ قصے مشہور کروا کر تصور دین کو مسخ کرے، اسلام مرشد اور مرید کی اس قسم کی تقسیم کا کوئی نظریہ نہیں رکھتا یہ یہودیت اور عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل کی تقلید ہے۔ جس کا تذکرہ ہم'' پس منظر'' کے باب میں آیت(۹ : ۳۱) کا حوالے دے کر کرچکے ہیں۔ البتہ قرآن اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ(۱۳:۴۹)کے مطابق تقویٰ یعنی حتی الامکان اسلام کے اصولوں کے فہم اور ان سے کلی وابستگی کی بنیاد پر درجہ تکریم کا قائل ہے۔ اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جدوجہد اصل مقاصد ہونے چاہئیں۔ یہی بات حضور کے اسوہ حسنہ سے ثابت ہے اور اسی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علمائے حقہ نے تبلیغ اسلام میں عمل کیا۔

اسلام میں توبہ کا تصور

توبہ کا تصور اسلام میں ایک معرکۃ الآراء نظریے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عام طور پر تمام دوسرے ادیان میں فرد کے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ متعلقہ مذہب میں پایا جانے والا تقدس کا مدعی ایک طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں یہ معاملہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان براہ راست طے پاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ خود دعوت توبہ دیا ہے۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام سے کہلواتا ہے :

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ(۱۱:۹۰)

ترجمہ: اور اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب نہایت مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔

پھر فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ۝ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ(۴۲ : ۲۵ – ۲۶)

ترجمہ : وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں سے در گزر فرماتا ہے، اور جو کچھ تم کر رہے ہو سب جانتا ہے۔ ایمان والوں اور نیک کار لوگوں کی سنتا ہے۔

ایک قدرتی امر ہے کہ جب انسان کو اپنی گمراہیاں یا گناہوں کے ارتکاب کا احساس ہو جاتا ہے اور راہ راست اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی سابقہ لغزشوں اور بد اعمالیوں کے سلسلے میں تشویش لاحق ہوتی ہے۔ انسان کے باطن میں اس کیفیت کے ظہور پذیر ہونے کی پہلی شرط تو ان اصولوں کا علم ہے جن کی کسوٹی پر پرکھ کر وہ اپنےاعمال کے حسن و قبح کا شعور حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کا نفس لوامہ حرکت میں آتا ہے اور وہ یہ طے کرتا ہے کہ مجھے اپنی بداعمالیوں سے گریز کرنا چاہئے۔ ازاں بعد وہ ارادہ اور عزم ظہور میں آتے ہیں جن کی بنیاد اور سہارے پر وہ گناہ و عصیان کی زندگی کو خیر باد کہہ کر اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کا تہیہ کرتا ہے۔ اسی سلسلہ افکار و اعمال کا نام اسلام میں توبہ ہے۔

دوسرے مذاہب میں برہمنوں، پنڈتوں، احبار و رہبان اور کلیسا نے معاوضے لیکر بخشش عصیان کروانے کا اصول تسلیم روا رکھا ہے۔ لیکن اسلام کی ساری تاریخ میں غیر اللہ کا ایسا کردار کبھی تسلیم کیا گیا اور نہ علمی سطح پر زیر بحث ہی لانے کے قابل سمجھا گیا۔

اسلام نے توبہ کا جو تصور دیا ہے اس میں ساری دنیوی زندگی کے دوران گناہوں کی معافی اور آخرت کی باز پرس سے مستثنیٰ کروانے کے لیے کسی کی سفارش کی کوئی گنجائش ہی موجود نہیں۔

ہم نے سطور بالا میں تو بہ کے ظہور میں آنے کے جس عمل اور تدریج کی نشاندہی کی ہے اس میں غیر اللہ کی کسی سفارش کو کوئی دخل حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا تعلق انسان کی اپنی باطنی واردات و تغیرات سے ہے۔ یہ وہ نظریہ اور اصول ہے جو گنہگار اور معصیت کی آلودگیوں میں ملوث انسانوں کو مایوسی کے بجائے امید اور روشن مستقبل کی شاہراہ پر ڈال دیتا ہے۔ موت سے سابقہ پڑنے سے قبل کفر و عصیان حتیٰ کہ شرک تک کا عظیم جرم بھی توبہ کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے معاف ہو سکتا ہے۔ لیکن جب موت سامنے آکھڑی ہو تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ(۱۸:۴)

ترجمہ : اور ان لوگوں کی توبہ نہیں جو برابر برائی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولا کہ اب میں نے توبہ کرلی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے وہ عام طور پر کفر و شرک اور دوسرے بہت سے معاشرتی اور اسلام کی مخالفت کرنے کے گناہوں میں ملوث تھے ، لیکن اسلام میں داخل ہوتے ہی ان کی تمام خطائیں معاف ہو گئیں۔

یہ بات ہر نبی کی دعوت کا جزو رہی ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر لبیک کے گا اس کہے گااس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، چنانچہ قرآن کہتا ہے :

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (۳۸:۸)

ترجمہ : ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر یہ باز آجائیں تو جو کچھ ہوچکا ہو وہ معاف کر دیا جائے گا۔

اسی طرح حالت اسلام میں بھی اگرجہالت کی بنا پر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے اور وہ اس سے توبہ کرلیتا اور اللہ سے استغفار کرتا ہے تو اس سے بھی معافی کا وعدہ ہے (بشرطیکہ اس میں حقوق العباد کو پامال کرنے کی صورت شامل نہ ہو) چنانچہ فرمایا:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ (۴:۱۷)

ترجمہ : اللہ پر توبہ کرنے کی ذمہ داری تو انہی کے لیے ہے جو جہالت سے مغلوب ہو کر برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے۔

تفسیر"تدبر قرآن" میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جہالت کے لفظ کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے : "جہالت، کے معنی عربی میں صرف نہ ماننے کے نہیں آتے بلکہ اس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کر گزرنے کے معنی میں ہے۔"

لیکن توبہ کی قبولیت ایمان کے ساتھ مشروط ہے:

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷ :۱۵۳)

ترجمہ : جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد(متنبہ ہو کر) توبہ کرلی اور ایمان لے آئے، تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا رحمت والا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ توبہ کے اس اصول کو ذہن میں رکھ کر انسان ارتکاب گناہ پر جری ہو جائے۔ اول تو کسی انسان کو اپنی موت کا علم نہیں ہوتا، اور ہو سکتا ہے کہ ایسا سوچنے والے شخص کو توبہ کا موقع نہ ملے اور وہ حالت عصیاں ہی میں اس دنیا سے چل ہے۔ دوسرے دین کو یا اس کے اصولوں کو مذاق اور کھیل تماشہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہر مسلمان کے دل میں ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کے سامنے جوابدہی کا تصور موجود

رہنا چاہئے۔ یہ ایک نہایت ہی بودی بات ہے کہ انسان یہ سوچے کہ چلو اب گناہ کیے لیتے ہیں بعد میں توبہ کرلیں گے۔ دوسرے ،انسان ایک خاندان اور معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کے اعمال اس کے حسب مرتبہ و مقام دو سروں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک باپ کے اعمال سیہ اس کی اولاد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک عالم کے اعمال بہت سے ایسے لوگوں کے لیے ارتکاب اثم کی رہنمائی فراہم کرسکتے ہیں جو اس سے حسن ظن رکھتے ہوں۔ اب دو صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ باپ یا عالم اسی حالت میں اس دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے اعمال بد کا بار بھی اپنے سر پر اٹھا کر آخرت کی جوابدہی کے لیے حاضر ہو گیا اور اس کے علاوہ ان سب لوگوں کے گناہوں کی ذمہ داری بھی اسے اٹھانا ہوگی جنہوں نے اس کی تقلید میں ان گناہوں کا ارتکاب کیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ بزرگ خود تو اپنے کسی عمل بد سے رجوع کرلیتا ہے اور اسے تو بہ کا موقع نصیب ہو جاتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو لوگ اس کے ان اعمال کا اثر قبول کرچکے ہیں ان کو اس کی توبہ کی خبر ہو جائے اور وہ بھی ان سے رجوع کرلیں۔ ایسی صورت میں جب تک وہ لوگ اس کی مثال کو سامنے رکھ کر ان معصیتوں میں ملوث رہیں گے، ان کے ساتھ وہ بھی ان گناہوں کے مرتکب قرار پائے گا۔ لہٰذا تو بہ سے متعلق غلط تصورات سے گریزکرناچاہئے۔

تو بہ دینی نکتہ نظر سے ہر سطح کے انسانوں کے لیے ہے۔ ''ترجمان القرآن'' جلد دوئم میں سورہ التوبہ کی آیت نمبر۱۱۷کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:

''توبہ کے معنی رجوع ہونے اور لوٹنے کے ہیں۔ اللہ کا اپنی رحمت کے ساتھ لوٹنا کاملوں کے لیے یہ ہے کہ مزید رحمت و اکرام ہو۔ قصور مندوں کے لیے قبولیت ومغفرت ہو۔''

اسلام کے ساتھ کسی خارجی نظریے کو نہیں جوڑا جا سکتا

اسلام اپنے مخصوص نظریات کا حامل اور مکمل دین ہے۔ اسے اسی نام سے پکارا جانا چاہئے۔ اس کے ساتھ دور حاضر کی کوئی پرکشش سمجھی جانے والی اصطلاح کو چپکانے کا کوئی

جواز نہیں۔ اس کو کسی دوسرے نظریے کی حامل اصطلاح کے ساتھ جوڑنا اس میں ترمیم کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا نام محض ''اسلام'' ہی رکھا گیا ہے۔ یہی دین سب پیغمبر لائے اور اس پر ایمان لانے اور اس پر عمل پیرا ہونے والے فرد کا نام''مسلم'' ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی بہت سی آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، لیکن ہم ناظرین کی توجہ صرف تین آیات(۵ : ۳) (۳ : ۱۹)اور(۳ : ۵۲) پر مبذول کراتے ہیں۔ پہلی دو آیات کا ہم اس سے قبل حوالہ دے چکے ہیں اور تیسری آیت یوں ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۳ : ۵۲)

ترجمہ : پس جب عیسٰیعلیہ السلام نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں ؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار اور آپ گواہ رہئے کہ ہم مسلم ہیں۔

مشکوٰۃ میں باب الرقاق کے تحت درج ذیل حدیث اس سلسلے میں بات کو واضح کرنے کے لیے کفایت کرتی ہے:

وعن أبي حريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم نجى الاعمال فنجي الصلوة فتقول يا رب انا الصلوة فيقول انك على خير فتجى الصدقه فتقول يا رب انا الصدقه فيقول انک على خير ثم يجى الصيام فيقول يا رب انا الصيام فيقول انك على خير ثم نجى الاعمال على ذالك يقول الله تعالى انک على خير . ثم يجى الاسلام فيقول يا رب انت السلام وانا الاسلام فيقول الله تعاليه انک على خير يک اليوم اهدر يک اعطى قال الله تعالى في كتابه ومن ينبع غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين (۸۵ : ۳)

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ(روز محشر)اعمال(اللہ تعالیٰ کے حضور) حاضر ہوں گے۔ نماز حاضر ہو کر کہے گی کہ میں نماز ہوں یا پروردگار ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو بھلائی ۔ پھر صدقہ (زکوۃ) حاضر ہوگا اور عرض کرے گا کہ اے پروردگار میں صدقہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم بھلائی پر ہو۔ پھر

روزہ آئے گا اور کہے گا اے میرے رب میں روزہ ہوں۔ اس کو بھی اللہ خیر سے تعبیر کرے گا۔ پھر دوسرے اعمال (حسنہ) حاضر ہوں گے اور اللہ ان کو بھی بھلا قرار رے گا۔ (اس کا بظاہر یہ مطلب ہوا کہ ان میں سے کسی ایک عمل کی بنیاد پر کسی مسلمان کی بخشش کا فیصلہ نہیں ہوگا۔ جب انفرادی طور پر سب اعمال خیر حاضری دے چکیں گے تو) پھر اسلام حاضر ہو کر کہے گا کہ اے پروردگار تو سلامتی بخشنے والا ہے اور میں اسلام ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو خیر ہے اور آج کے دن (تیرے ہمہ جہتی اتباع کی بنیاد پر)میں مواخذہ کروں گا اور(اسی اساس پر کسی) کو بخشش و اکرام کا حق دار قرار دوں گا۔ (اسی بنا پر) اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کہ جو کوئی بھی اسلام کے سوا کسی دین کو اپنائے گا اسے شرف قبولیت نہیں بخشا جائے گا اور اخروی زندگی میں وہ خسارے سے دوچار ہو گا۔

اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے بھی سامان تفکر و رہنمائی موجود ہے جو اسلام کو یا تو مختلف شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں یا جزئیات کے چکر ہی میں گرفتار رہتے اور کلیات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس رجحان ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن لوگوں کے ذہنوں کی گرفت میں اسلام کا مجموعی تصور موجود نہیں یا ان کی ذہنی فرد مائیگی نے ان کو اس تصور سے محروم کر رکھا ہے وہ اسلام میں ہر اس نظریے کو درآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں وہ کسی قسم کی کشش محسوس کرتے یا اس کے حق میں یک طرفہ پراپیگنڈے سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ ان کے اس مرغوب نظریے کے ذریعے وہ جس مسئلے کو حل کرنا چاھتے ہیں، اسلام کے پاس اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بہتر نظریہ موجود ہے۔ اور دوسرے ان کی ذہنی رسائی کی محدودیت انہیں اس حقیقت تک بھی نہیں پہنچنے دیتی کہ اسلام کسی اجنبی نظراتی عنصر کو ہضم نہیں کر سکتا۔

ایک اور بدعت یہ چل نکلی ہے کہ اسلام کو اپنی رائے کے مطابق کوئی کسی نظریہ حیات سے ہم آہنگ ثابت کرنا چاہتا ہے اور کوئی کسی دوسرے سے، کوئی یہ انکشاف کرتا ہے کہ اسلام میں مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے آزاد معیشت اور سیاسی آزادی کے اصول پائے جاتے ہیں ، کوئی دوسرا یہ گہر افشانی کرتا ہے کہ اس میں اشتراکیت کے مساویانہ یا منصفانہ تقسیم دولت کے اصولوں کی آمیزش ہے۔ کسی کے نزدیک یہ دین آمرانہ نظام قائم کرتا ہے

اور کوئی دوسرا یہ کہتا ہے کہ اس میں لبرلزم ہونی چاہئے۔ یہ سب باتیں اسلام کے مجموعی منہاج فکر و عمل سے عدم واقفیت، ذہنی انتشار (Confusion) اور چلتے ہوئے غالب لیکن مبنی بر ظلم و تعدی نظاموں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی پیداوار ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ایسے لوگ کرتے ہیں جو ان غیر اسلامی نظاموں کی تاریخ ،ان کے وجود میں آنے کے محرکات و حالات اور ان کے پھلنے پھولنے میں مضمر بے انصافیوں اور اخلاق سوز ہتھکنڈوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور اگر ایسے لوگوں نے ان نظاموں کا مطالعہ کیا بھی ہے تو ان کے اساسی فلسفہ تک ان کی رسائی نہیں ہوتی جو کسی فکر کے حسن و قبح کو متعین کرنے کی لازمی شرط ہے۔

انسانی تاریخ میں کئی طرح کے طریقہ ہائے حکومت جن کو نظام کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا، نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ظلم و ستم اور طغیانی و تعدی کی اساس پر پا کیے گئے لیکن ظاہر ہے کہ ہر قائم ہونے والے اقتدار اور اس کے سربراہوں کے نظریات کو محض ان کی کامیابی اور غلبہ کی وجہ سے برسر حق اور قابل اعتناء نہیں سمجھا جائے گا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، گزشتہ دو تین صدیوں کی مغربی استعماری و استحصالی حکومتوں اور نظاموں کو محض ان کے استیلا و تفوق کی وجہ سے کوئی بھی قابل ستائش قرار نہیں دے سکتا۔ آج بھی جن ترقی یافتہ کہلانے والے ممالک نے کمزور ممالک کے نااہل حکمرانوں کی وساطت سے سطح ارض کے بیشتر خطوں کو جس طرح جہنم کدہ بنا رکھا ہے، اور جس صورت حالات کی تفصیلات ہم ''مغربی تمدن '' اور ''مسلمان اور دور حاضر ''کے ابواب میں بیان کریں گے، وہ اس حقیقت کو اعلانیہ طور پر مبنی بر انصاف و عدل قرار دینے کی جرات نہیں کرسکتے۔ یہی ترقی یافتہ تمدن کے نمائندہ ممالک ہیں جو ایک ایک جنگ میں محض استحصالی عزائم کے تحت کم و بیش دو دو کروڑ افراد کولقمہ اجل بناتے اور اس کے علاوہ اربوں انسانوں پر مشتمل آبادیوں کو قحط و فلاکت کے ناروں میں دھکیل رہے ہیں۔اس کے علاوہ یہی تمدن ہے جو اپنی موجودہ شکل و صورت اور استیلاء و غلبہ کو سہارا دینے کے لیے دنیا کے لاتعداد علاقوں میں اپنی سازشوں اور شرارتوں کے ذریعے مقامی جنگوں کی آگ بڑھکا رہا ہے اور دونوں حربی حلقوں کو بیک وقت اسلحہ فراہم کر رہا ہے تاکہ ان کی نفع بخش حربی سامان کی تجارت فروغ پائے اور متحارب

علاقے مزید کمزور اور ان کے چنگل میں پھنسے رہیں۔ جس تمدن کے یہ ثمرات ہوں کیا اس کے فکر کو بحیثیت مجموعی یا اس کے بعض اجزاء کو اپنانے کا کوئی جواز پیداہو سکتا ہے ؟

اسی تمدن کے علمبرداروں کی علامہ اقبال رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں تصویر کشی کی تھی :

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ بہ چید از فرنگ

اس تمدن سے ہمارے بعض نام نہاد دانشور جو نظریات اخذ یا در آمد کر کے اسلام کے ساتھ چپکانا چاہتے اور بزعم خود اس دین کو دور حاضر میں قابل عمل بنانا چاہتے ہیں انہیں یہ تو سوچنا چاہئے کہ کیا اس(تمدن) کے تحت بسنے والی اقوام خود ان نظریات کو حقیقی طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان اقوام کے چلن کے چند گوشوں کی طرف جو اشارات سطور بالا میں کیے ہیں کیا وہ ان خیالات و نظریات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں جن کو مقدس سمجھ کر ہمارے مستغربین ان کو اسلامی فکر کا جزو بنانے کی فکر میں ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغرب کبھی بھی اپنے آپ کو انتہائی ظلم، آمریت، کلیت پسندی، جارحیت میں ملوث اور شہری آزادیوں کو پامال کرنے والے نظاموں سے آزاد نہیں کر سکا۔ بلکہ ان کا تمدن انہی ستونوں کے سہارے کھڑا ہے، جیسا کہ ہم موزوں مقام پر وضاحت کریں گے۔

اسلام کے ان کرم فرماؤں میں سے کوئی کہتا ہے جمہوری اسلام ہونا چاہئے، کوئی کہتا ہے اشترا کی اسلام ہونا چاہئے، کسی کی رائے ہے کہ لبرل (Liberal) یا آزادی پسند اسلام ہی اس دور میں چل سکتا ہے اور کوئی یہ نصیحت کرتا ہے کہ اسلام کے عدالتی قوانین سے حدود کو خارج کرو ورنہ ''پاک باز'' اور ''مہذب'' مغرب اس کو بنظر استحقاق نہیں دیکھ سکتا۔ یہ لوگ نہیں سوچتے کہ اگر موجودہ شکل میں قرآن و سنت کااسلام چل ہی نہیں سکتا تو ایسا کیوں ہے کہ جب بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے ملک میں بھی اسلام کا انفرادی و اجتماعی نظام برپا کرنے کی کوئی موثر تحریک اٹھتی ہے تو بڑی طاقتوں کے ایوانوں میں کھلبلی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور اس کو ناکامی سے ہمکنار کرنے کے لیے وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ جمہوریت، اشتراکیت اور

لبرلزم کی حقیقت کے متعلق تو ہم" مغربی تمدن" کے باب میں عرض کریں گے ، البتہ یہاں ہم صرف یہ تذکرہ کر لینا چاہتے ہیں کہ ان اصطلاحات کی کسی تعریف (Defination) پر مغرب کے سیاسی مفکرین میں آج تک اتفاق پیدا نہیں ہو سکا، اور نہ ان کے کسی واضح تصور کا نفاذ آج تک کسی مغربی ملک میں ہوا ہے۔ ہم اس دعوے کے ثبوت میں شواہد پیش کریں گے۔ جہاں تک حدود کا تعلق ہے یہی اسلامی معاشرے کے لیے موزوں ہیں جیسا کہ "اسلامی عدلیہ" کے عنوان کے تحت عرض کیا جائے گا، البتہ مغربی تمدن میں اگر ان کو رائج کردیا جائے تو ان کی زد سے شاید ہی وہاں کوئی شہری بچ سکے۔ لہٰذا وہاں انہیں بربریت کی علامت کے علاوہ اور کیا سمجھ جائے گا۔

بہرحال اسلام کسی دوسرے نظام فکر سے اصول اور نظریات مستعار لینے کا محتاج نہیں اور نہ یہ کسی قسم کی پیوند کاری برداشت کر سکتا ہے۔

انسان کے لیے اسلام کی رہنمائی کی نوعیت

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام انسان کو صفحہ ارض پر زندگی گزارنے کے لیے ہمہ جہتی اور مکمل نظام فکر و عمل دیتا ہے اور یہ کہ قرآن و سنت سے اس معاملے میں پوری رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے تو اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قرآن کوئی حیاتیات (Biology)یا علم النبات (Botony) یا طبیعیات (Physics) یا علم الکیمیا (Chemistry)یا فلکیات (Astronomy) یا تاریخ (History) جغرافیہ (Geography)یا معاشیات (Economy) یا تکنیکی علم (Technology) یا ایسے سب علوم کے مجموعے یا کسی اور ایسے شعبہ علم یا فلسفہ (Philosophy) پر مشتمل کتاب ہے، جن کے سلسلے میں تحقیق و مطالعہ اور مشاہدہ وتخصص کرنے لیے اس کے خالق نے اسے عقل و خرد اور دوسری بہت سی توانائیوں سے نوازا ہے۔ اور وہ جلی علوم ،جو انسان کے ذہن اور حسیات کی گرفت میں آسکتے ہیں، کے سلسلے میں اپنی بساط کی حد سعی و کاوش کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ ایک مستحسن مشغلہ ہے۔

اسلام بنی نوع انسان کو جو علم عطا کرتا اور رہنمائی فراہم کرتا ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق علم غیب (Metaphysics) سے اور دوسرے کا تعلق اس ارضی زندگی کو فکر و عمل کے دائروں میں نظام عدل کے تحت استوار کرنا ہے۔

تکنیکی ترقی کی بنیاد پر مغرب سے مشرق کی سمت میں جو فکری آندھی چلی ہےاس کے محرکات و نوعیت کا سطحی اور سرسری مطالعہ کرنے والوں نے اول الذکر علم کو بے وزن اور افادیت سے یکسر مبرا تصور کرلیا ہے۔ حالانکہ اس علم سے متعلق(منفی) نظریہ مغربی تمدن کے رگ و پے میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ یہی وہ موضوع ہے جو عالمی فکری تاریخ میں ہمیشہ زیر بحث رہا ہے، قدامت کے لحاظ سے بھی تمام علوم فکریہ میں سب سے نمایاں ہے اور اس کی بنیاد پر تمام مذاہب و ادیان عالم وجود میں آتے رہے ہیں قطع نظر اس بات کے کہ ان کے اس سلسلے کے نظریات مبنی برحق ہوں یا باطل۔ اس سے بلا خوف تردید یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انسان ہمیشہ سے اس علم کا کھوج لگاتا رہا ہے اور اس سلسلے میں اس کے اندر شدید ترپ پائی جاتی رہی ہے۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ ہی بے شمار سوالات پیدا ہوتے رہے۔ ان کا صحیح جواب نہ پاکر وہ ظن و تخمین کی بنیاد پر اپنی طرف سے ان سوالات کے جوابات گھڑتا رہا۔ مغربی مادہ پرست تو اپنی علمی سرگرمیوں کے باوجود ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے معاملے میں مایوسی کا شکار ہو کر زندگی کے مقصد اور غایت ہی سے انکار کر رہے ہیں اور اخلاقی اقدار کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔

برٹرینڈرسل (Bertrand Russell) جو بیسویں صدی کے نقبائے مادہ پرستی، دہریت ولا ادریت کے صف اول کی شخصیتوں میں سے ہے اپنی مشہور تصنیف موسومہ (History of Western Philosophy)کا آغاز ہی غیبی و مشاہداتی حقیقتوں کے تذکرے اور ان کے اور اک میں انسانی بے بسی سے کرتا ہے، لیکن اس کا انداز تحریر اس بات کا غماز ہے کہ ان کو زیر غور لانے سے مفر نہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"Almost all the questions of most interest to speculative minds are such as Science cannot answer, and the confident answers of theologians no longer seem so convincing as they did in former centuries.

ظن و تخمین کی بنیاد پر سوچنے والے اذہان کی دلچسپی کے تقریباً تمام سوالات(یا مسائل) ایسے ہیں جن کا سائنس جواب نہیں دے سکتی۔ اور جو پر اعتماد جواب مذہبی لوگ دیتے ہیں وہ اب اس حد تک ذہنوں کو مطمئن نہیں کرتے جس طرح وہ سابقہ صدیوں میں کرتے تھے ۔ اس کے بعد رسل وہ سوالات اٹھاتا ہے جو ہم اسی باب میں" یہ ہدایت حیات انسانی کے لیے مکمل ضابطہ فراہم کرتی ہے"کے ذیلی عنوان کے تحت درج کر چکے ہیں۔ بہتر ہو کہ ناظرین ان کو ایک بار پھر پڑھ لیں۔ ان سوالات کے بعد وہ کہتا ہے:

Why, then, you may ask, waste time on such insoluble problems? To this one may answer as a historian, or as an individual facing the terror of cosmic loneliness.

ترجمہ : تم کہہ سکتے ہو کہ(اگر یہ صورت ہے تو) ان مسائل پر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب مورخ کی حیثیت سے دیا جاسکتا ہے، یا ایک فرد کی حیثیت سے جو اس کائنات میں اکیلے پن کے ڈر کا سامنا کر رہا ہے۔

The answer of the historian, in so far as I am capable of giving it, will appear in the course of the work." (Pages ۱۰-۱۱).

جس حد تک مجھ میں استطاعت ہے۔ میں اس کتاب میں اس کا جواب دوں گا۔

اس اقتباس اور اس میں اٹھائے گئے سوالات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو درج ذیل باتیں قاری کے ذہن میں لازماً ابھریں گی :

ا۔ اس تحریر کے پیچھے جو ذہن کام کر رہا ہے وہ انتہائی شکست خوردہ اور تشکیک و مایوسی کے عارضے میں مبتلا ہے۔ وہ یہ نظریہ رکھتا ہے کہ نہ انسان کے پاس ان مسائل کے حل کا کوئی ذریعہ ہے جو اس کے مشاہدے میں آتے ہیں اور اس زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں اور نہ ان غیبی اور غیر مرئی معاملات کے متعلق جو اس کے طرز عمل اور نہج حیات کو متاثر کرتے ہیں، کوئی نظریہ قائم کرنے کے کوئی وسائل اس کی دسترس میں ہیں۔ اس سلسلے میں نہ فلسفہ کام آسکتا ہے نہ سائنس اور نہ مذہب۔ (اپنی تقریباً ایک صد سالہ زندگی(۱۸۷۲ء تا ۱۹۷۰)جس کے دوران اس نے بہت سی کتب تصنیف کیں، دین اسلام کی طرف وہ بغرض ہدایت کے متوجہ ہی نہیں ہوا اگرچہ وہ مذاہب کا بہت حوالہ دیتا ہے۔

۲۔ اس نے اس مسئلے کو سرے سے نظر انداز کردیا ہے کہ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی اور اس کا بشمول انسان خالق کون ہے۔ محرک اول (first Cause) کامسئلہ قدیم ترین دور سے آج تک وحی کی تعلیمات سے مستفید ہونے والوں اور وحی کی نعمت سے محروم مفکرین و حکماء کی توجہات کا اہم ترین مرکز بنا رہا ہے۔

۳ ۔ اس نے اپنے بے ترتیب سوالات میں ایسی باتوں میں جو انسان کی قوت ادراک سے ماورا ہیں اور ان باتوں میں جو اس کے براہ راست مشاہدے میں آتی ہیں، کوئی تفریق نہیں کی۔ اس کے نزدیک ہر مسئلہ تشکیک کی زد میں ہے۔ اگر انسان یہ زاویہ نگاہ اختیار کرلے تو وہ اس کائنات کا ایک عضو معطل کی حیثیت اختیار کر جائے اور اخلاقی سطح پر فکر و عمل کے لحاظ سے مفلوج زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے حالانکہ ہمارے مشاہدے میں وہی ایک مخلوق ہے جو متعدد صلاحیتوں سے مزین ہونے کی وجہ سے دوسری تمام انواع سے زیادہ اشرف ہے، اور اسے اشرف ہونا چاہئے۔

۴ ۔ اس نے جس انداز سے سوال اٹھائے ہیں، اس طرح اٹھائے جاسکتے ہیں جو احاطہ شمار سے باہر ہیں۔ انسانی فکر و عمل کے دائرے بہت وسیع ہیں، اور اگر معاملے اور مسئلے پر تشکیک کی عینک لگا کر نگاہ ڈالی جائے تو ہر مسئلہ لاینحل ہی رہے گا۔

۵۔ ساری کتاب پڑھ جایئے۔ اس اقتباس کے اخیر میں مصنف نے جو وعدہ کیا ہے اس کے ایفا کا کہیں وجود نظر نہیں آتا، اور یہ مغربی فلسفے کی تاریخ کی کتاب ہے۔ فلسفے کے دائرہ تفکر میں واضح ابہام پایا جاتا ہے جس کی ہم نے وحی کے باب میں تصویر کشی کی ہے اور جس کے متعلق مصنف نے خود زیر نظر کتاب میں لکھا ہے:

"....it consists of speculations on matters as to which definite knowledge has, so far, been unascertainable." (Page ۱۰).

ترجمہ: (فلسفہ) ظن و تخمین کی بنیاد پر ان معاملات کے متعلق نظر کرنے پر مشتمل ہے جن کے متعلق اب تک کا علم پایہ تصدیق تک نہیں پہنچ سکا۔

اس لحاظ سے اس قسم کی کتاب میں ایسے سوالات کے حل تلاش کرنا سعی عبث ہے۔

تکنیکی انداز تفکر اس وقت مغربی فکر کی سب سے بڑی کمزوریوں میں شمار کیا جاسکتا ہے اور جو اس میں گرفتار ہو جاتا ہے اس کے لئے، چاہے اس کے علمی مشاغل جتنی وسعت بھی اختیار کر جائیں، اس کے چنگل سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی برٹرینڈرسل کے متعلق انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کی جلد ۱۰ صفحہ ۲۴۹ - ۲۵۰ پر اس کے نام کے تحت اس کے حالات زندگی، خیالات اور تصنیفات کے متعلق لکھنے والے مقالہ نگارنے اس کے حالات زندگی کے بیان کے آغاز میں لکھا ہے :

"At the age of ۱۱ he had already begun to have religious doubts, and, eventually, the sceptical cast of his intelligence prevailed over his upbringing.....but he was also able to accept the disillusionment of finding that logical certainty was unattainable in empirical matters and to accept as well the stunning disappointment.....that the axioms of geometry could not be proved but had to be taken on trust".

ترجمہ : گیارہ سال کی عمر میں وہ مذہب کے متعلق شکوک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اور اس کے ذہن کی تشکیکی افتاد اس کی تربیت پر غالب آگئی ــــلیکن اس کو اس غلط فہمی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بھی اعتراف کرنا پڑا کہ تجربے سے ثابت شدہ معاملات کے متعلق بھی منطقی تعینات کا حصول ناممکن ہے۔ نیز اس کو اس حیران کن مایوسی کا بھی سامنا کرنا پڑا کہ جیومیٹری کے مسلمات کو بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا، بلکہ انہیں اعتماد کی بنیاد پر قبول کرنا پڑتا ہے۔

رسل کے متعلق مقالہ نگار کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"....a liberal anarchistic, left-wing, and sceptical atheist temperament."

ترجمہ : (کہ وہ) آزاد منش مزاج پسند، بائیں بازو کے نظریات رکھنے والا تشکیکی دہریانہ افتاد طبع(کا مالک تھا)

ہم نے مغربی فکر میں پائے جانے والے رجحانات کے ایک پہلو کو ایک یورپی مفکر و فلسفی ہی کی تحریک کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی تمام تر علمی ترقیوں اور کاوشوں کے باوجود یہ تمدن بنیادی کائناتی اور انسانی مسائل کے معاملے میں تشکیک

کے مرض میں مبتلا اور یقین محکم سے یکسر محروم ہے۔ اس تمدن کے مفکرین کو اعتراف ہے کہ وہ راستہ بھولے ہوئے ہیں لیکن یہ بھی ایک ضد اور آباء پرستی کی صورت ہے کہ وہ پٹے ہوئے راستے پر چلتے جارہے ہیں۔

عقلمندی کا تو یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنے مقصد کو ایک ذریعے سے حاصل نہ کر سکے تو کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کرے۔ لیکن وہ اپنے نظریات ہی کے ساتھ چمٹے رہنے پر مصر ہیں۔ اس صورتحال ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ تمدن سب اعلیٰ اخلاقی اقدار اور خالق کائنات کے سامنے جوابدہی کے تصور سے بے نیاز ہو کر تکنیکی ترقی کی اساس پر بہیمانہ قوت(Brute Force) کے سہارے داخلی و خارجی سطحوں پر ظلم و عدوان کے راستے پر گامزن ہے۔ بقول علامہ اقبال،

جلالی پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(بال جبریل صفحہ ٦)

اس کے قائم کردہ عالمی نظام (World Order) کی بدولت بنی نوع انسان لاینحل مسائل سے دوچار ہے اور مستقبل اپنے اندر ہولناک امکانات چھپائے ہوئے ہے۔ تفصیلی گفتگو ''مغربی تمدن'' کے عنوان کے تحت کی جائے گی، یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ یہ فکری الجھنیں جن کا تذکرہ برٹرینڈرسل نے کیا ہے اور ان سے بھی دوسرے اہم تر مسائل کا جو اس ارضی زندگی کے دوران انسان کی سمت سفر کا تعین کرتے ہیں، اسلام ہی حل پیش کرتا ہے۔ وہ اس کائنات کی تخلیق و انتظام اور اس کے خالق کے متعلق ایسا تصور دیتا ہے جس کا انسانی عقل و خرد اور حسیات تحمل کرسکیں۔ یہ مسائل مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کا تذکرہ تمثیلی اور علامتی (Symbolical) انداز ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ قرآن نے ان کے سلسلے میں جہاں استدلال سے کام لیا ہے وہیں انفس و آفاق سے شہادت بھی پیش کی ہے اسلام اس ارضی زندگی میں انسان کے مقام اور اس کے کردار (Role) کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ اسے از خود رونما ہونے والے کائناتی ارتقائی عمل کی ضمنی پیداوار (By Product) قرار نہیں دیتا جو اتفاق کی

بدولت معرض وجود میں آگیا ہو اور چند سال گزار کر اس نے نیست و نابود ہو جاتا ہے، بلکہ اسے ایک باشعور ادارہ اور حکمت و دانش کی ایسی خصوصیات سے نوازا ہے جو اس بات کی واضح علامت ہے کہ اس کی خودی حوادثات زمانہ کی نذر ہو کر فنا نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبال نے اس خودی کے ثبات کو یوں بیان کیا ہے:

از مرگ تری اے زندہ جاوید
مرگ است تو صیدے تودر کمینی
جانے بہ بخشند دیگر نہ گیرند
آدم عمیرو ازبے یقینی

ہم انسان کے مقام کے متعلق اس سے قبل اسی باب میں وضاحت کر چکے ہیں اور اسی باب میں قرآن اور حکماء اسلام سے حوالے دے کر یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ ارضی زندگی انسانی ارتقاء کی آخری منزل نہیں جیسا کہ ڈارون کی تھیوری کے تحت مغرب نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ ابھی اس نے اپنا سفر ارتقاء جاری رکھنا ہے۔ مادہ پرستوں نے اس کائنات میں غیر ناطق، بے شعور اور عقل وارادہ سے محروم عناصر (Mute Elements) کو تو کروڑوں اربوں برس کی زندگی عطا کردی لیکن اشرف المخلوقات کو چند برس سے زیادہ کی ڈھیل نہیں دی اور فنا کی گھاٹ اتار دیا۔ کیا یہ اللہ تعالی کی تخلیقی سرگرمی کا ایضاع نہیں، اگرچہ وہ تو بے نیاز ہے لیکن اس کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں۔ وہ نا معلوم ان عقل پرست (Rationalist) حضرات کی عقلیں اس بات کو کس طرح قبول کرتی ہیں کہ جس مخلوق کو اتنے وسیع پیمانے پر اتنی صفات عالیہ عطا کی گئی ہیں اس کا کوئی مقصد وجود ہو اور نہ اس کی زندگی سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا ہو ۔ جو کوئی بھی انفرادی و اجتماعی سطح پر جو کچھ بھی کرتا پھرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ انسان کو(مرد عورت دونوں کو) اس دنیا میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ایک ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنا ہے اور اسے اس سے بلند تر اور ترقی یافتہ ایک اور زندگی میں اپنے یہاں کے چلن کی جوابدہی کرنا ہے(یہ موضوع ''معاد'' کے عنوان کے تحت زیر بحث آرہا ہے) قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ زندگی کھیل تماشا اور بے مقصد

نہیں۔ اس ارضی زندگی کے دوران بھی انسان کو اعلیٰ و ارفع اقدار سے وابستگی اور ان کے فروغ کے لیے سرگرم عمل رھنا ہے اور اخروی زندگی کو بھی ایک ارتقائی منزل تصور کر کے اس میں فلاح و کامیابی کے لیے اس لائحہ عمل کو اختیار کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے نازل کیا۔ ایسا نہیں کہ اس زندگی میں انسان صرف تن آسانیوں کے ذرائع کے حصول اور مادہ پرستی ہی کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنائےرکھے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۳۸ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ(۴۴:۳۸۔۳۹)

ترجمہ : اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان کی چیزیں کھیل کے طور پر نہیں بنائیں۔ ہم نے ان کو نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک غایت کے ساتھ لیکن ان کے اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

ان آیات میں مقصد تخلیق کائنات کو لفظ"الحق" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ہم نے یہ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن سے لیا ہے اور انہوں نے الحق کا ترجمہ" غایت" سے کیا ہے۔ یعنی کائنات بغیر کسی پر معنی مقصد کے اور نہ یونہی بغیر کسی نتیجے اور ماں کے چلتی رہے گی، بلکہ اس نے کسی منزل پر پہنچا ہے۔ لہٰذا بنی نوع انسان کو اس کی مقصدیت کو ذہن میں رکھ کر زندگی گزارنا چاہئے۔

علامہ اقبال نے ان آیات کا یہ ترجمہ کیا ہے:

"We have not created the Heavens and the earth and whatever is between them in sport. We have not created them but for a serious end: but the greater part of them understand it not.

(یہ ترجمہ علامہ اقبال نے مدراس لیکچرز کے پہلے لیکچر میں کیا)

ہم ناظرین کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے لفظ حق کا ترجمہ Serions End کے الفاظ سے کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے" ترجمان القرآن" کی جلد اول کے صفحہ ۴۸ پر"الحق" کا ترجمہ "حکمت و مصلحت" کیا ہے۔ چنانچہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ"الحق" کے معنی ومفہوم پر مسلمان اہل علم کا اتفاق ہے۔

اس سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ اس کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق اسلام کا نکتہ نظر (Approch) پر اعتماد ہونے کے علاوہ شک و ریب کے کانٹوں سے یکسر مبرا ہے۔

پھر ایسا نہیں کہ اللہ تعالی نے کسی دین (Code of Life) کے ذریعے رہنمائی تو نہ کی ہو لیکن انسان کو جوابدہ ٹھہرا لیا ہو۔ ایسا نہیں بلکہ اس نے قرآن کے نام سے وحی کے ذریعے ایک کتاب نازل کی جس میں اس نے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی دائروں میں انسان کو اصولی رہنمائی دے کر ایک نظام کا خاکہ پیش کردیا اور اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے رسول اور شارع علیہ السلام کو پوری صلاحیت و استعداد عطا کردی۔ اس میں بتا دیا گیا کہ کسی انسان کو انسانوں پر حکمرانی کا حق حاصل نہیں۔ حاکم اور قانون دہندہ صرف وہی ہستی ہے جس نے اس کائنات اور انسان کو پیدا کیا۔ سیاست میں شورائی نظام اپنانے کا حکم ہوا اور سربراہ حکومت کی خصوصیات بیان کر کے عوام کو حق دے دیا گیا کہ وہ اسے اپنی آزاد مرضی سے منتخب کریں۔ اخروی زندگی میں جوابدہی کے علاوہ وہ اس دنیا میں عوام کے سامنے جوابدہ ہو گا۔ اور اس کا چلن خدا اور رسول کے احکامات کے تابع ہوگا۔ شہری آزادیاں اس حد تک بحال ہوں گی کہ ہر شخص سربراہ اور عمال حکومت سے بر سر عام ان کے طرز عمل کے سلسلے میں ان سے باز پرس کر سکیں گے کیونکہ سربراہ نماز کے لیے دارالخلافہ میں امامت نماز کے فرائض انجام دے گا اور دوسرے عمال حکومت اپنی اپنی جگہوں پر ایسا ہی کریں گے۔ لہٰذا وہ عوام سے کٹے ہوئے نہیں ہوں گے۔ ایسے انتظام سے عوامی تربیت اور احساس ذمہ داری کی بنا پر کوئی غیر مناسب صورت پیدا ہونے کا امکان نہ ہو گا۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ انسان ان مسائل کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنے کی طلب رکھتا ہے۔ انسان ان کے متعلق جو بھی رائے قائم کرے گا وہ اس کے اخلاق کو متاثر کرے گی۔ تعمیر اخلاق کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان کے اندر اس بات کا

شدید احساس موجود ہو کہ وہ کسی بالاتر ہستی، جس نے اس کو اور اس کائنات کو پیدا کیا، کے سامنے جوابدہ ہے۔ ان مسائل کا منفی تصور ظلم و تعدی اور عدل و انصاف کی تفریق کے تصورات کو قلب انسانی سے محو کر دیتا ہے۔ فکری سطح پر تو ہم پرستی اور شرک پھیلتے ہیں، اور انسان اپنے آپ کو تحت الثریٰ کی پستیوں میں گرا دیتا ہے۔ (تفصیلی گفتگو توحید ، شرک اور معاد سے متعلقہ ابواب میں ہوگی)

معاشی شعبے میں منصفانہ دولت کے لیے قرآن و سنت میں واضح احکامات موجود ہیں۔ اسلامی حکومت میں لوٹ کھسوٹ اور امیر اور غریب کی بے محابہ تفریق(Polarization) نہیں ہوگی۔ سربراہ مملکت و حکومت کو اپنا معیار زندگی (Standard of Living) مسلمانوں کے عام معیار زندگی کے مطابق رکھنا پڑے گا ،اسے بیت المال سے خفیہ اخراجات کے نام پر یا اپنی تعیش یا شاہی انداز سے سفر کرنے کے لیے بے تحاشہ خرچ کرنے اور مسلمانوں کی یا ان کے نمائندوں کی اجازت کہ بغیر ایک حبہ بھی حاصل کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ ایسے واضح احکامات بھی موجود ہیں یہ ارتکاز دولت نہ ہونے پائے۔ اگر چہ اجتہاد کے ذریعے امیر اور شوریٰ مروجہ پیداواری ذرائع کے لیے سرمایہ وجود میں لانے (Formation of Capital)کے لیے انتظامات و اقدامات کا فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن کسی ایک طبقے کو عوام کے استحصال کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جائے گا۔ اسلامی نظام کے تحت قائم ہونے والی حکومت سیاسی، معاشی اور فوجی طور پر اس قدر کمزور ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ دوسری اقوام کے استحصال کا نشانہ بنے۔ بلکہ غیر ممالک کے ساتھ برابری کی بنیاد پر اقتصادی و تجارتی تعلقات قائم کرے گی، جیسا کہ آج بھی بہت سے ایسے ممالک کر رہے ہیں جو ترقی یافتہ کہلاتے ہیں۔

اسی طرح معاشرتی اور اخلاقی شعبے کے لیے بھی اصول دے دیئے گئے ہیں۔ عبادات کا ایک پورا نظام قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ازدواجی زندگی کو احسن طریق پر گزارنے کے لیے ڈھب کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ تربیت یافتہ افراد اور ان کے تزکیہ نفس کرنے کا پورا انتظام ہے۔ صفات تقویٰ پیدا کرنے کے لیے رہنمائی کی گئی ہے۔ تعلیم و تعلم پر پورا زور دیا گیا ہے۔ دراصل یہی شعبہ ہے جس میں جس نسبت سے اچھا کام ہو گا ،اسی نسبت سے

معاشرہ اور سیاسی و معاشی نظام احسن صورت اختیار کریں گے۔ یعنی مردم سازی اسی شعبے میں ہوگی، اگرچہ تمام شعبوں میں ربط ہونے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے معاون ہوں گے۔

قوانین جنگ و صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی استواری کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ جارحیت کی کسی صورت میں اجازت نہیں۔ اس سلسلے میں ہر موقع کے مطابق انصاف اور وسیع ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قرآن و سنت میں ہدایات موجود ہیں اور وقت کے حالات کے مطابق اسلامی حکومت کے ارباب حل و عقد اجتہاد کے ذریعے سے قرآن و سنت کے احکامات کی روشنی میں اپنا رویہ اور حکمت عملی طے کریں گے۔

عدلیہ کے نزدیک سربراہ سلطنت و حکومت سے لیکر ہر شہری تک سب کی برابری مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ اول الذکر کو قاضی کی عدالت میں اسی طرح کھڑے ہو کر کارروائی میں حصہ لینا ہو گا جس طرح عام لوگوں کو۔ تفصیلات عدلیہ کے عنوان کے تحت بیان ہوں گی۔

وقت یہ ہے کہ مغربی مفکرین جب مذہب کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر عیسائیت یا دوسرے مذاہب کی تعلیمات کا تصور ہوتا ہے جو انسان کو فکر و عمل کے دائروں میں مکمل اصولی رہنمائی فراہم نہ کرنے کے علاوہ نظری جمود کے بھنور میں دھکیل دیتی ہیں۔ کوئی مذہب انسان کو اس زندگی کے لیے ہمہ جہتی نظام کا نقشہ فراہم نہیں کرتا۔ہم اسی باب میں بحث کر چکے ہیں کہ اسلام اس معنی میں مذہب ہے ہی نہیں بلکہ یہ ایک دین ہے اور قرآن میں ہمیشہ اسے اسی نام سے پکارا گیا ہے۔ مغربی مفکرین اور مصنفین نے کچھ تو روایتی تعصب کی وجہ سے اور کچھ لاعلمی کی وجہ سے اسلام کو بھی زمرہ مذاہب میں شامل کردیا ہے اور ہمارے ہاں کے مستغربین نے بھی چونکہ اپنے فکر کو مغربی نظریات کے سانچے میں ڈال رکھا ہے اس لیے وہ بھی مقلدانہ طور پر مغربی ڈگر پر چل رہے ہیں۔

ہم نے فکر کے شعبے میں اس صدی کے اہم ترین ترجمان اسلام علامہ اقبال سے اسی باب میں" اسلام دین ہے معروف معنوں میں مذہب نہیں" کے بغلی عنوان کے تحت حوالے دے کر اسلام کی روحانی و مادی معاملات کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ علامہ نے قرآنی تعلیمات کا مرکزی مقصد بھی بیان کیا ہے۔

ہم نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مابعد الطبیعاتی شعبہ فکر میں اب تک جو معروضات پیش کی ہیں یا آئندہ کریں گے، اور اس کے ساتھ ہی دنیا میں ایک تمدن کو وجود میں لانے کے سلسلے کے جو اصول مجملاً بیان کیے ہیں جن کی آئندہ ابواب میں تفصیلات ملیں گی۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر پیروان اسلام کے اذہان و قلوب میں ایک مخصوص قسم کی ذہنیت اور کائناتی اور تمدنی نکتہ نظر وجود میں آتا ہے۔ اسی کے تحت تمام ایسے علوم مرتب کیے جاتے اور ان سے اخذ نتائج کیا جاتا ہے جو انسانی تحقیق، تجربات اور مشاہدات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ مغرب میں اس وقت جتنے شعبہ ہائے علم میں تحقیق ہوئی یا ہورہی ہے ان سے بتکلف خدا شناسی ، مادہ پرستی اور انسانی اعمال کے سلسلے میں عدم جوابدہی کے تصورات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، بلکہ انہیں مرتب ہی ان نکتہ ہائے نظر سے کیا جاتا ہے۔ ہم نے اسی باب میں" نظریہ ارتقاء اور اثبات وجود باری تعالیٰ کے بغلی عنوان کے تحت مغربی ناقدین کی تحریروں سے حوالہ جات دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو زندگی کے مادہ پرستانہ اور ناخدا شناس فکر کی تائید میں تکلف کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے وہیں ڈارون ہی کی تحریر سے ایک اقتباس دیا ہے جس میں اس نے تسلیم کیا ہے کہ اپنے پانچ سالہ تحقیقی و تجرباتی اور مشاہداتی سفر کے دوران اور بیس سالہ تصنیفی دورمیں وہ وجود باری تعالیٰ کا قائل ہو گیا تھا اور اس کے ذہن میں اس خیال نے بھی رسوخ حاصل کر لیا تھا کہ انسان کے لیے اس حیرت انگیز طور پر وسیع کائنات کی حقیقت اور اس کی ابتداء اور علت اول معلوم کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ڈارون کی تھیوری کو ایسے مقاصد خبیثہ کے لیے جواز کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسلامی تمدن میں نہ اس سے قبل ایسی حرکات کی گئیں اور نہ مستقبل میں اس کے معرض وجود میں آنے کی صورت میں ایسا کیا جائے گا۔ ہمارا پختہ یقین ہے کہ انسان کی ذہنی کاوشوں سے جو علوم بھی وجود میں آئیں گے وہ فطرت انسانی کے مطابق اور نظام عدل قائم کرنے میں ممد ثابت ہوں گے۔ یہ اسلامی تمدن ہی تھا جس نے دنیا کو بہت سے علوم سے

روشناس کرایا اور تحقیق و مطالعہ کے دائرے میں عالمی امامت کا فریضہ انجام دیا۔ تفصیلات آگے آئیں گی۔

باب نمبر ۳

وحی

ہم ''پس منظر'' کے عنوان کے تحت عالمی مذاہب وادیان کی تعلیمات اور ان کے بانیوں کی زندگیوں کے حالات کی عدم ثقاہت کے متعلق محققین کی تحریروں کے حوالوں کی اساس پر لکھ چکے ہیں۔ ان حالات میں ایک منزل من اللہ دین کی ضرورت تھی جو وحی کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اسے آنحضور نے انتہائی جدوجہد کر کے اپنے مخاطبین تک فکری سطح پر پہنچایا، اس کے اصولوں کے مطابق ان کے کردار کی تعمیر کی اور اس دین کو اجتماعی زندگی پر عملاً نافذ بھی کیا۔ یہ بھی ہم عرض کر چکے ہیں کہ وحی یا دوسرے لفظوں میں ہدایت خداوندی بنی نوع انسان کی نوعی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں ہم وحی کے جواز اور آدم کی اولاد کے لیے اس کی افادیت و نوعیت نیز قرآن و حدیث میں بیان کردہ اس کے کردار Function کے متعلق گفتگو کریں گے۔ اصل موضوع کی طرف آنے سے قبل ہمیں کچھ تمہیدی معروضات پیش کرنا ہوں گی، جن سے وحی کی ضرورت پر استشہاد کیا جا سکے گا۔

انسانی بے چارگی

انسان ایک باشعور مخلوق ہے۔ بلکہ انسانی دانست اور معلومات کے مطابق اس کائنات میں مرئی اور غیر مرئی مخلوقات میں صرف اسی کو شعور و ارادہ اور ایک خاص دائرے میں اختیار سے نوازا گیا ہے۔ اس کو یہ آزادی بھی دی گئی ہے کہ زندگی کے اختیاری حصے میں اپنا مقصد و ہدف مقرر کرے اور اس کے حصول کے لیے لائحہ عمل بھی طے کرے۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی انسان کو اپنی محدودیتوں کا بھی شدید احساس ہے۔ قدم قدم پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور کائنات سے متعلق اس کی معلومات نہایت محدود ہیں، اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی پر اسراریت اس کو مجسم سوال بنا دیتی ہے علامہ اقبال نے اسی صورت حال کو یوں بیان کیا ہے :

انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بینا ب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

(بانگ درا صفحہ ۱۳۴)

لیکن وہ بہت سے سوالات کا حتمی جواب پانے سے قاصر ہے۔ اس سے اس کے ذہن و قلب جب اضطراب کی گرفت میں آ جاتے ہیں تو دلیل، مشاہدے اور ثبوت کی ضرورت کو نظر انداز کر کے وہ ظن و تخمین، جاہلانہ عصبیتوں اور اٹکل سے کام لے کر توہم پرستی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے، اور بزعم خود عقلیت پرستی کے راستے پر چل کر بھی اپنے لئے نئی نئی راہیں تلاش کرتا اور ان پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ تکلف سے کام لے کر بعض سوالات کے جواب گھڑتا ہے، حالانکہ ان کے لیے کوئی منطقی بنیاد نہیں رکھتا۔

متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ اس نے تھک ہار کر ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے کی ضرورت ہی سے انکار کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ حالت کسی معاشرے، قوم، تمدن، یا تہذیب کو کبھی بھی پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لے سکی۔ اس صورت حال کی بدترین مثال دور حاضر کی مغربی تہذیب ہے جہاں ابہام فکر نے تشکیک (Scepticism) کا ایک باقاعدہ مکتب فکر پیدا کیا ہے جو انسان میں نظری نراج (Intellectual Anarchy) کو جنم دیتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں، مغربی دانشوروں نے عام طور پر دہریت (Atheism) اور لاادریت (Agnosticism) کے منفی تصورات میں پناہ لے رکھی ہے۔ یہ شکست خوردگی کی ایک واضح علامت ہے۔

مختلف اکتسابی علوم، فہم معاملات اور اجتماعی مسائل کے سلسلے میں تشکیل نظریات تاریخی تجربات سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ لازمی ہے کہ اگر واقعات و حالات زمانہ سے سبق سیکھنے اور نتائج اخذ کرنے کی عادت ہو تو انسان کے فہم و بصیرت میں اضافہ ہوتا جائے۔ زمانہ گزشتہ کے حالات کے نشیب و فراز پر تدبر اور اخلاقی حسن، اگر وہ اس کے باطن میں بیدار ہو، کی بنا پر اس کے اندر قومی اور بین الاقوامی دائروں میں نفاذ عدل کی خواہش پیدا ہو جانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ نظام عدل کا اہم ترین محرک نظری توازن ہی فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن عالمی تاریخ گواہ ہے کہ ہدایت خداوندی سے محروم قوم اور تمدن میں فکری و عملی یک رخا پن نمایاں رہا ہے۔ اس وجہ سے انسان اپنی سوچ کی اساس پر اپنے لئے کوئی جامع اور ہمہ جہتی خصوصیات کے حامل مکمل و اصلح فکری و عملی نظام وضع نہیں کر سکا۔ اس صورت حال کی بظاہر یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ مختلف قسم کے ناجائز مفادات اور تعصبات کے اثرات اور انسان کی عقل و فہم کی اپنے تمام پیش آمدہ مسائل کے حل کرنے کے لیے مطلوبہ مقام تک رسائی کا فقدان ہی اصل اسباب ہیں جو اس راستے کی سب سے نمایاں رکاوٹیں ہیں۔

البتہ مطالعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے بعض پہلوؤں سے انسانی معاشرہ اور علوم منضبط تاریخ (Recorded History)کے محدود سے زمانے کے دوران ارتقائی منازل طے کرتے رہے ہیں، اگرچہ یہ ارتقاء ہر دور، ہر قوم اور ہر منطقہ ارض کے لحاظ سے تواتر سے عاری ہے۔ بحیثیت مجموعی نوع انسانی کے پاس تجربات کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے جس کی بنیاد پر منطقی طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اسے پختگی کی طرف بڑھنا چاہیے لیکن دور حاضر کے حالات کے سلسلے میں متعلقہ ابواب کے مباحث سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بادی النظر میں اس مقصد کے حصول کی سد راہ ہر قوم کے اندر اور بین الاقوامی دائرے میں پائے جانے والے وہ اختلافات اور کشمکش ہیں جو لاعلاج حد تک شدت اختیار کر چکے ہیں۔

''اسلامی فکر'' کے باب میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ انسان راہ ہدایت پانے اور اپنے لئے خوب سے خوب تر نظام اور زندگی کا لائحہ عمل دریافت کرنے اور اسے نافذ کرنے کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ اسی لئے آئے دن نئے نئے اجتماعی فلسفے پیش ہوتے ہیں، اگرچہ وہ ناکامی سے ہمکنار اور بحیثیت مجموعی انسانوں کے لیے موجب فساد و عدوان ثابت ہو رہے ہیں۔ انسان کی

اس آباد دنیا میں چونکہ کوئی صورت حال (Phenomenon) کسی سبب (cause) سے مبرا نہیں، لہٰذا بنی آدم کی سطور بالا میں پیش کردہ ناکامی کا بھی لازماً سبب ہوگا۔

اگر بشمول دور رواں عالمی تاریخ کا بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو تشریف انسان کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان کے علم و شعور کی پرواز لامتناہی نہیں بلکہ اس کی کچھ حدود ہیں۔ اس کے نتیجے میں نوع انسانی کو زندگی کے کسی شعبے میں یا اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے کسی پہلو پر آخری بات کہنے کی صلاحیت حاصل نہیں۔ اس کی اپنی ذات بھی بہت سی جہتوں سے اس کے لیے پر اسرار ہے ،اور اس کو جو کائنات نظر آتی ہے اس کے اور خود اپنے آغاز و انجام سے بھی وہ بالکل بے خبر ہے۔ بقول علامہ اقبال:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے آتا ہے کہاں سے

(بانگ درا صفحہ ۱۰۱)

دراصل یہ ساری کائنات اور اس کی حقیقت ایک منظم کل (Whole Organised) کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان اور اس کی زندگی اس کل کا ایک حصہ اور اس کے ساتھ منسلک ہے۔ اگر کوئی شخص اس کائنات کو غیر مسلک اور منتشر اجزاء میں بانٹتا اور کائنات کے تمام گوشوں اور مظاہر کے باہمی ربط و تعلق سے انکار کرتا ہے تو اس سے بات کرنا ہی بیکار ہے، کیونکہ ایک کودن شخص بھی اگر انسان کی اندرونی اور بیرونی کائنات پر سرسری نگاہ ڈالے تو اسے احساس ہو جائے گا کہ اسے جو کچھ نظر آتا ہے وہ ایک مربوط نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر چیز اور تمام مظاہر قدرت ایک لگے بندھے قاعدے اور ضابطے کے تحت اپنا اپنا وظیفہ وجود ادا کر رہے ہیں۔ تفصیلی گفتگو تو اسلام کے تصور کائنات کے عنوان کے تحت ہوگی یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اس کائنات کا ہر گوشہ اس کے کل سے منسلک ہے لہٰذا جب تک مؤخر الذکر کی حقیقت کا ادراک نہ ہو تب تک اول الذکر کا بھی کلی ادراک نہیں ہوسکتا۔ تمثیلی طور پر بات کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی صنعتی کارخانے میں نصب مشینری کا آپ تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے ہر ہر پرزے کی کارکردگی (Function) کی حقیقت آپ کو اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے اگر آپ اس

مشینری کی مجموعی ساخت کا علم رکھتے ہوں۔ اگرچہ سرسری طور پر آپ دیکھ رہے ہوں گے پرزہ حرکت میں ہے اور کارخانے کی پیدا کردہ شئے کی تیاری کے فلاں مرحلے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے لیکن مشین کے تمام حصص کی حقیقت اس کے علم میں ہے جس نے اس کو بنایا ہے جو اس کا پورا علم رکھتا ہے۔

یہی حال اس کائنات کے پس منظر میں حیات انسانی کا ہے۔ آپ اس کے متعلق کچھ مشاہدات کرتے ہیں اس کے مظاہر کا کچھ جزوقتی سا علم رکھتے ہیں لیکن اس کو صحیح خطوط پر ایک نظام عدل کے تحت منظّم کرنے کی صلاحیت سے محروم رہیں گے جب تک ساری کائنات کا خالق اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی نہ کرے۔

اس کے علاوہ انسان کی فطرت و مزاج میں مختلف قسم کے تعصبات، تنگ مزاجی خود غرضی و خود پرستی اور بہت سی ایسی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں جو علمی کم مائیگی سے مل کر اسے از خود اپنے لئے کوئی ایسا نظام زندگی وضع کرنے کی استعداد سے محروم کر دیتی ہے جو اسے اپنی تکالیف اور پریشانیوں سے نکال کر پر سکون زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے۔ اس صورت حال کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ انسان ایک تجربے سے دوسرے تجربے اور دوسرے سے تیسرے تجربے میں منہمک رہتا ہے، لیکن کوئی ایسا ضابطہ یا اصولوں کا مربوط مجموعہ دریافت کرنے سے قاصر رہا ہے جو افراد، طبقات اور اقوام کو معنوی برابری کی سطح پر لا کر ان کے لیے انصاف کا ضامن بن سکے اور تمام نوع انسانی کے لیے عدل کے کسی راستے پر متفق ہو جائے جس کی آرزو کا اظہار غیر اسلامی حلقوں میں بھی کم از کم ایک دو صدی سے ببانگ دہل کیا جا رہا ہے۔ مساوات (Equality) اخوت (Fraternity) اور آزادی (Freedom)کے اصولوں کو اپنانے کی ضرورت اور انہی نظریات پر اجتماعی نظام مرتب کرنے کی افادیت پر گذشتہ دو تین صدیوں سے دور حاضر کے غالب تمدن کے بہت سے حکماء نے اشد زور دیا ہےلیکن اس تمدن نے جس طرح ان اصولوں کو پامال کیا ہے اور چار دانگ عالم میں ان کی دھجیاں بکھیری ہیں وہ کوئی راز کی بات نہیں، اور ہم موزوں مقام پر اس کی تفصیلات بیان کریں گے۔ سردست ہم یہی اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ جن اصولوں کا انسان دعویٰ کرتا ہے وہ بھی ناروا مفادات اور قوم و ملک پرستی کی نذر ہو کر جامہ عمل نہیں پہن سکتے۔

دو عالمی نظریات

اس عالم ارض میں کائنات اور انسانی زندگی کے آغاز وابتدا کے خالق اور انسان کے نظم حیات کے متعلق مختلف نظریات رائج ہیں۔ ان میں سے دو ایسے ہیں جو عالمی سطح پر نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ آج کل جس نظریے کا سیاسی وجوہ کی بنا پر زیادہ چلن ہے وہ مغربی مادہ پرستانہ تصور حیات ہے جسے گزشتہ صدی میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے بہت تقویت دی۔ مغربی حکماء نے تکلف کے ساتھ اسے کھینچ تان کر اس کائنات، انسان کے وجود اور اس کے جملہ شعبہ ہائے حیات پر چسپاں کیا(ہم ڈارون کی تھیوری پر ''پس منظر'' کے باب میں گفتگو کر چکے ہیں اور مادہ پرستانہ فکر پر متعلقہ باب میں اپنی معروضات پیش کریں گے) دوسرا نظریہ وہ ہے جسے دین اسلام نے پیش کیا یہ نہایت جامع اور ہمہ جہتی ہے۔ یہ وقتی اور ہنگامی حالات یا کسی طبقہ قوم یا خطہ ارض کے مفادات کے نکتہ نظر سے وضع نہیں کیا گیا بلکہ اس میں تخلیق آدم سے لے کر آج تک تسلسل زمانی موجود ہے۔ مدون اور معلوم تاریخی واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ہم اول الذکر کا تنقیدی جائزہ لیں گے اور مؤخر الذکر کے بر سر حق ہونے پر دلائل پیش کرنے کے علاوہ حتی المقدور اس کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت کریں گے۔ اس نظریے کے مطابق انسان عقل کل کا حامل نہیں۔ اللہ تعالی نے اس کو جسم خاکی کے ساتھ ایک باطن عطا کیا ہے جس کے اندر خیرو شر کا ارتکاب کرنے کی استعداد موجود ہے۔ لیکن انسان کو پیدا فطرت صحیحہ پر کیا ہے۔ جسے قرآن میں احسن تقویم کہا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کے والدین اور معاشرہ اس کے ذہن اور افعال پر اثر انداز ہو کر اسے مختلف قسم کے نظریاتی اور اخلاقی سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں۔

بے تدبیر انسانی جذبات

قرآنی آیات سے بھی استنباط کیا جا سکتا ہے اور یہ بات مشاہدے سے بھی ثابت ہے کہ اگرچہ انسان کے اندر خیر کی خواہش و صلاحیت موجود ہے لیکن اس کے باوجود یہ خیر کو جبلی طور پر

اپنانے پر مجبور نہیں جس طرح بے شعور حیوانات اپنا وظیفہ حیات ادا کرتے ہیں۔ وہ شعور و ادراک کا مالک ہے اور جس چیز کا مقصد نہیں یا اسے زیر عمل لانے پر آمادہ نہیں اس کے استرداد کا اختیار رکھتا ہے۔ انفرادی لحاظ سے اس کے اندر ان گنت جذبات بھی موجزن ہیں جن کے صحیح اور مناسب استعمال سے اس کی زندگی میں خیر کا پہلو غالب ہو سکتا ہے اور غلط استعمال سے شر نمودار ہوتا ہے۔ یہ جذبات رحم دلی، محبت، فیاضی، شجاعت، خود غرضی، لالچ و طمع، غضب، خواہش، استیلاء قسم کے ہیں، ان کا تعلق انسان کی اپنی بقاء کے لیے صحیح یا غلط راستے اختیار کرنے سے ہے۔ انسان جب فکری و عملی توازن کھو بیٹھتا ہے تو جب عاجلہ کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کے اندر یہ رجحان شدت اختیار کر جاتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں، استعدادوں اور جذبات کو کسی احسن اور منظّم قاعدے کے تحت استعمال کرے اور اپنے معاملات میں صبر و تحمل سے کام لینے اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے بجائے خود غرضی پر مبنی فوری قدم اٹھائے۔ اس سے اس کی زندگی میں شر کی بنیاد پر یک رخا پن پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ افراد میں ایسے رجحانات مل کر معاشرے کی روح کو بھی مسموم کر دیتے ہیں اور اجتماعی سطح پر شر کی کار فرمائی ظہور میں آتی ہے۔

عالمی سطح پر انسانوں کی مختلف سیاسی اکائیاں کئی قسم اور نوعیت کے باہمی تعلقات سے بندھی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں مفادات کے ٹکراؤ، خواہشات و عزائم کے تضادات اور رجحانات کی تفریقات آڑے آتی ہیں اور ان گنت قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جن کے حل نہ ہو سکنے کی وجہ سے قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

مادہ پرستانہ نظریے کی تباہ کاریاں

سیاسی و اقتصادی اور فلسفیانہ زاویہ نگاہ انسانی اور قومی زندگی کے مختلف مظاہر اور پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ بہت تحقیق و مطالعہ ہو رہا ہے، اور یہ عمل کسی نہ کسی درجے میں ایک عرصے سے جاری ہے۔ لیکن اکثر امور اور تغیرات کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ تخمین و ظن کی اساس پر حیات انسانی کی روانی اور تاریخ میں اس کے سفر کی حقیقت و ماہیت کی متضاد تعبیرات کی گئی ہیں۔ یہ تعبیرات مختلف ہئیت اجتماعیہ کو اپنے اپنے انداز سے متاثر کرتی ہیں اور اس طرح الجھاؤ (Confusion) کی ایک پریشان کن صورت پیدا ہوگئی

ہے۔ اس کے علاوہ آفاقی و کائناتی اسرار و رموز اور۔۔۔۔۔ باطنی گہرائیوں کی پیچیدگیوں کے فہم کے معاملے میں انسان اس قدر محدود قوائے عقل و فکر رکھتا ہے کہ وہ ان کی کنہ تک پہنچنا تو کجا ان کے کنارے پر ہی گھوم رہا ہے۔ وہ خود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی، جو اس کی آنکھوں کے سامنے بسر ہو رہی ہے، کے متعلق بہت سے قواعد و مظاہرات کی حقیقت معلوم نہیں کر سکا اور اس سلسلے میں بہت سی کاوشیں بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہیں۔ آج ایک پیش کردہ تھیوری منہدم ہو رہی ہے تو کل دوسری۔

یہ بیان کرنے سے ہمارا مدعا انسانی استعدادوں کو ان کی حقیقی سطح سے گرانا یا ان کی تحقیر کرنا نہیں ہے۔ ہم صرف یہ عرض کر رہے ہیں کہ انسان کی فکری و عقلی پرواز غیر محدود نہیں ہے اور اسے اس بات کا اندازہ کرنا چاہیے کہ اس کی صلاحیتوں کا طول وعرض کیا ہے۔ کن معاملات میں وہ اپنی استعداد ذہنی و فکری کے سہارے آگے بڑھ سکتا ہے اور کن امور میں اس کی بے بسی واضح ہو چکی ہے اور اسے خارجی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

پھر یہ بات بھی مشاہدے میں آ رہی ہے کہ انسان نے چند طبعی قوانین، جو اس عالم میں جاری و ساری ہیں، اور جنہیں وجود میں لانے میں انسان کا کوئی حصہ نہیں، کی دریافت سے سائنس کے نام سے جو عملی ترقی کر لی ہے، بجائے اس کے کہ نوع انسانی کو اس سے کوئی فائدہ پہنچتا، اس کے لیے وبال جان بن گئی ہے۔ سارا کرۂ ارض پیچیدہ مسائل، لا ینحل الجھنوں اور ظلم و ستم کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ ہر طرف سے مظلوموں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جھوٹ ، فریب اور کذب و افتراء نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کو دبا رکھا ہے۔ لیکن ایک طرف پروپیگنڈے کی ساحری اور دوسری طرف عوامی بے خبری نے مغربی تمدن کو خوبصورتی کا لباس پہنا دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے لوگوں کی ریزہ کاری ہے

(بانگ درا صفحہ ۳۱۳)

آپ گزشتہ دو عظیم جنگوں کے مناظر کو ذہن میں مستحضر کیجئے اور ان میں کروڑوں انسانوں کی جانوں کے اتلاف اور دوسری تباہیوں کا تصور کیجئے۔ اس کے علاوہ مغربی استعمار پرستوں اور

عوام اور مزدور دوست" کیمونسٹ "حکومتوں کے مہیا کردہ جنگی ہتھیاروں کی مدد سے انہیں کی سازشوں کے نتیجے میں دنیا کے مختلف خطوں میں غریب و مفلس اقوام کے درمیان ہونے والی بے شمار جنگوں کی افرادی و اقتصادی تباہ کاریوں پر بھی تفکر کیجئے اور مختلف ممالک میں مصنوعی طور پر پیدا کردہ قلت غذا کے نتیجے میں قحط سے مرنے والی آبادیوں کا تخمینہ لگایئے، کروڑوں انسانوں کے ترک وطن کر کے اور گھر بار چھوڑ کر کیمپوں میں کسمپرسی کی حالت میں زندگیاں گزارنے کی حالت کو نظروں کے سامنے لایئے اور صنعتی اور اسلحہ سازی کے ذریعے سے پھیلنے والی آلودگی (Pollution) کے اثرات اور اخلاق سوز اقدار کے ذریعے سے پیدا شدہ بیماریوں کا مشاہدہ کیجئے اور ان سب مردم آزار عوامل کے مجموعی اثر کا تصور قائم کرکے یہ رائے قائم کیجئے کہ مغربی تمدن نے کیا گل کھلائے ہیں۔ یہ ثمرات ہیں آزادی کے نام پر شتر بے مہار انداز سے زندگی گزارنے اور خواہش کے استیلاء کے تحت بے قید علمی سرگرمیوں کے۔ اگر یہی علمی کاوشیں کسی اعلیٰ مقصد کے تحت سرانجام دی جائیں تو یہ تکریم و فضیلت انسانی کی علامتیں قرار پائیں گی۔ لیکن اس اعلیٰ مقصد کا تعین انسان کے بس میں نہیں دکھائی دیتا۔ ہم نے یہاں صرف چند عوامل کی طرف اشارات کئے ہیں، مفصل گفتگو اپنے مقام پر ہوگی اور "آزادی" کی حقیقت بھی واضح کی جائے گی۔

انسان زندگی کے ہر مرحلے پر رہنمائی حاصل کرتا ہے

مختلف قسم کے جانداروں کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے مختلف استعدادیں عطا ہوئی ہیں۔ انسان شعور و ارادے کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے جب کہ دوسرے جانورجبلت کے سہارے اپنی تمام حرکات و سکنات انجام دیتے ہیں۔ ہر نوع کے مختلف انداز ہیں۔ پیدائش کے بعد کچھ عرصہ تک انسان بھی ہر حرکت جبلی طور پر کرتا ہے۔ وہ بغیر کسی کے سکھائے اور بلا شعور و ارادہ منبع خوراک کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے پاس آنکھ، ناک، کان، ہاتھ ، پاؤں، اور قلب و دماغ ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے کوئی کام لیتا نظر نہیں آتا۔ ایک مدت کے بعد یہ حسیات یکے بعد دیگرے بیدار ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اس . مرحلے پر وہ سو فیصد اپنی ماں کے سہارے جیتا ہے۔ اگرچہ حسیات کی بیداری کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد وہ جزوی طور پر اپنے ارد گرد کی اشیاء میں تمیز کر سکتا ہے اور بیٹھنے اٹھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے

برے بھلے سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اپنی انتہائی محدود سرگرمیوں کے ضمن میں بھی اپنے والدین یا جو بھی اس کے سرپرست ہوں، کا محتاج ہوتا ہے۔ جب اس کی فکری قوتیں بیدار ہوتی ہیں تو اس کا حصول تعلیم کا دور شروع ہوتا ہے تو ابتدا سے اپنے اساتذہ پر کلی انحصار کرنا ہوتا ہے جو اسے ایک نظام تعلیم کے ذریعے میسر آتے ہیں۔ اس نظام تعلیم کو وجود میں لانے میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تعلیم گاہیں، گھر کا ماحول، والدین کی تربیتی مساعی اور معاشرے کی فضا مل کر اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس دوران ہر فرد اپنی قدرتی صلاحیتوں اور استعدادوں کے مطابق بتدریج پختگی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کا شوق و جذبہ اس کے باطن کو مزید جلا بخشتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس مرحلہ پر اسے ایک معاشرے کے مزاج، ایک نظام سیاسی و معاشی کے قواعد و ضوابط سے واسطہ پڑتا ہے اور عام طور پر اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی پابندی کرے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اونچی اور غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والی شخصیتیں پٹے ہوئے راستے کو ترک کر کے چھائے ہوئے نظام کو متاثر کرتی اور انداز زندگی کے دھارے کا رخ تبدیل کر دیتی ہیں۔ لیکن یہ استثنائی صورت ہوتی ہے۔ ہم یہاں افراد اور معاشروں کے عمومی طرز عمل کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ افراد اور اجتماعی ہییات اپنے اپنے ان نظام ہائے حیات کے پابند ہوتے ہیں جن کے تحت وہ زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اور یہ نظام اپنے اپنے اصولوں اور دساتیر سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ البتہ متعینہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر شہری کو آزادی عمل کا کچھ نہ کچھ استحقاق ہوتا ہے۔ ورنہ اس میں اور حیوانوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس استحقاق کے دائرے کو بھی دستور ہی متعین کرتا ہے۔

ہم نے سطور بالا میں انسان کے جسمانی و ذہنی ارتقاء کی جن منازل کا اجمالی تذکرہ کیا ہے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے پیچھے کوئی قوت محرکہ کام نہیں کر رہی۔ یہ بات مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ یہ دنیا اسباب و مسببات سے عبارت ہے لیکن متذکرہ ترقی و ارتقاء کے پیچھے تو کوئی مرئی ہاتھ نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ

ہر مرحلہ زندگی پر انسان، جیسا کہ ہم نے مرحلہ وار بیان کیا، خارجی اعانت ورہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ اور اس کا احتیاج یہاں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پیدائش اور اس کے وجود کا بقا ہوا، پانی، زمینی نمکیات، سورج کی شعاعوں اور دوسری بہت سی ایسی تخلیقات پر منحصر ہے جو اس کے لیے عطائے غیبی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وقت کائناتی ارتقاء کی جس تھیوری کا چلن ہے اور جس کے تحت اس کائنات کی موجودہ شکل کی ابتدا عظیم دھماکے (Big Bang) سے ہوئی اگرچہ وہ یقینیات کا درجہ نہیں رکھتی اور اس میں مزید تحقیقاتی سرگرمیوں کے ذریعے سے دراڑیں نمودار ہو چکی ہیں، اس کے مطابق کروڑوں اربوں برس پر پھیلے ہوئے زمانے کے دوران پہلے یہ سہولتیں وجود میں آئیں اور اس کے بعد انسان کی تخلیق ہوئی۔ اس سے اس انتظام غیبی کی حقیقت مترشح ہوتی ہے جو انسان کے وجود و بقاء کے لیے کئے گئے۔ اس میں انسان کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ اگر اس سارے عمل کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ از خود رونما ہوا تو اس صورت میں اسباب ومسببات (Cause and effect) کے نظریے کو خیر باد کہنا ہوگا اور اس کی جگہ کسی اور اصول کی تلاش میں نکلنا ہوگا۔ لیکن یہ عمل ایسا نہیں ہوگا کہ ایک نظریہ گیا اور دوسرا آگیا، بلکہ یہ اسباب و مسببات کا نظریہ سلسلہ نظریات کی فقط ایک کڑی ہے۔ اس کڑی کے نکالنے سے بہت سے متفقہ نظریات کی نفی ہو جائے گی۔

بہرحال سطور بالا میں ہم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن جملہ انسانی احتیاجات کو پورا کرنے کے انتظامات کا تذکرہ کیا ہے، کیا منطقی طور پر اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اس زندگی کو بسر کرنے کے ڈھب اور طریقے کے متعلق بھی اللہ ہی اصولی رہنمائی عنایت کرے گا؟ اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ(۲:۱۰)

ترجمہ : کیا لوگوں کو اس بات پر حیرانی ہے کہ ہم نے انہیں میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ہوشیار کر دو۔

انزار اور ہوشیار کر دینے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے حاصل ہونے والی ہدایت پر عمل پیرا ہونے سے انکار کے نتائج سے خبردار کرنا مراد ہے۔ مولانا ابوالکلام

آزاد نے ''ترجمان القرآن'' میں اس کا مطلب ''انکار و بد عملی کے نتائج سے خبردار کر دینا بیان کیا ہے۔''

کیا یہ فروتر درجے کا احتیاج ہے؟

کائناتی وسعت اور انسانی فہم کی بے بضاعتی

ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کا وہ حصہ جو ہمارے مشاہدے میں آ رہا ہے اور خود انسان، دوسرے جانداروں اور جہان نباتات کا اگر مجموعی حیثیت سے ذہن میں تصور قائم کیا جائے، اس پر تدبر کی نگاہ ڈالی جائے اور اس کے مختلف گوشوں کے باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ایک مربوط نظام کی شکل میں ہمارے سامنے آئے گا۔ ہر چیز اور عنصر دوسرے سے متعلق ہے اور ہر ایک کا اسی نظام میں کردار ہے۔ اگر ان عناصر سے ایک عنصر بھی عنقا ہو جائے تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گا جو دوسرے گوشوں کو شدت کے ساتھ متاثر کرے گا۔ بعض صورتوں میں انسان اور دوسرے جانداروں کی زندگی ممکن رہے گی، نہ غیر جاندار مظاہرات قدرت کا وجود باقی رہے گا اور پھر یہ کارخانہ قدرت کوئی چھوٹی سی یا حقیر شے نہیں بلکہ حیرت انگیز طور پر وسیع ہے۔ اگر ایک طرف انسان اس کا مشاہدہ کر کے اس کی بدیہات کو واضح طور پر دیکھ رہا ہے اور اس کے مختلف گوشوں کے متعلق محدود پیمانے پر رائے قائم کر رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا کیا کردار ہے تو دوسری طرف ورطہ حیرت میں بھی ڈوبا ہوا ہے۔ جوں جوں خلاء میں سفر کرنے کے لیے سائنسی ایجادات معرض وجود میں آ رہی ہیں اسی نسبت سے انسان کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ آفاقی کناروں اور اس کی سرحدوں کو چھونا ممکنات میں سے نہیں۔ دراصل صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات حدو شمار کے دائرے سے باہر ہیں۔ قرآن کہتا ہے :

وَلَوْ اَنَّمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۳۱:۲۷)

ترجمہ :اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر مزید سات سمندروں کے ساتھ ، روشنائی بن جائیں، جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتیں۔

اس کے مقابلے میں یہ بھی فرما دیا :

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا(۸۵:۱۷)

ترجمہ : اور تمہیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے۔

کسی بھی چیز کی ماہیت پر اپنی جملہ دانش اور استعداد مشاہدہ و تجزیہ کے باوجود انسان حتمی رائے قائم نہیں کر سکا۔ اس ضمن میں ہر کوشش کے نتیجے میں پیش ہونے والی تھیوریاں آئے دن بدلتی ہیں۔ وہ خود اپنے متعلق یہ رائے قائم نہیں کر سکا کہ اس کے قلب و باطن کے رشتے کی نوعیت کیا ہے، اس کے وجود میں آنے کی اصل کنہ کیا ہے ،اس کی ارضی زندگی کے اختتام میں کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں، جس چیز کے اس کے جسم سے معدوم ہونے سے اس کی زندگی ختم ہوتی ہے اس کی ماہیت کیا ہے، اس کے جسم خاکی اور اس شے کا تعلق قائم کس طرح ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کی سمت سفر کیا ہے۔ مشاہدے کی قوت بیان پر وہ فقط یہ جانتا ہے کہ حیوانی اور نباتاتی زندگی جوڑوں کے تعامل سے وجود میں آتی ہے، لیکن کیوں ایسا ہوتا ہے، اس راز سے وہ بے خبر ہے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ اس سے یہ تاثر دینا مقصود نہیں کہ انسان جاہل مطلق ہے۔

ایسا نہیں ہے۔ ابھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ادراک حقیقت کے لیے جس سطح اور نوعیت کی استعداد کی ضرورت ہے وہ انسان میں موجود ہے اور نہ وہ اس کا تصور کر سکتا ہے۔ ہم نے ''اسلامی فکر کے باب میں ''دنیا میں انسان کا مقام'' کے ذیلی عنوان کے تحت انسان کے مرتبہ و شرف کے متعلق قرآن کے نکتہ نظر کے متعلق لکھا ہے۔

معرفت حقیقت کے سلسلے میں سائنس اور فلسفہ کی ناکامی

ادوار کہنہ کی تاریخ کی عدم موجودگی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس نے دور حاضر میں خاصی نشوونما حاصل کی ہے۔ ابتداء میں اس کو تجسّس اور کائنات میں مروجہ قوانین و قواعد معلوم کرنے کی خواہش نے قوت محرکہ فراہم کی، لیکن نتیجۃً جو سعی و جہد ظہور میں

آئی اس کو خالصتاً مادی نہ کہ علمی اغراض کے لیے وقف کر دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی چرچ نے تحقیق و مشاہدے پر مبنی ہر نو دریافت شدہ طبعی قاعدے قانون کو مذہبی تعلیمات کے خلاف قرار دیا۔ اس طرح یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد علمی دائرے میں ترقی کی جو لہر اٹھی تھی اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اس رجحان کے آگے تو بند نہ باندھ سکا البتہ عیسائیت بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے اس خطے کے اجتماعی مسائل سے خود خارج ہو گئی۔ اس طرح مذہب کے خلاف ایک ایسا شدید رد عمل ابھرا جو یورپ کو فکری سطح پر مادہ پرستی کی گود میں لے گیا۔ چونکہ طبعیات کے شعبے میں تحقیق و مطالعہ نے مشینی پیداواری طریق کو جنم دیا لہٰذا اس سے جوصنعتکار طبقہ پیدا ہوا وہ قومی دولت پر قبضہ کر کے سیاست و معیشت پر چھا گیا۔ اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے اس طبقے نے ایک تو جاگیردارانہ نظام کو ختم کیا اور دوسرے اخلاقی قدروں کے ساتھ وابستگی اور خدا شناسی اور اس سے متعلقہ تمام مسائل کو یہ کہہ کر کہ جو بات انسانی ذہن کی گرفت میں نہ آئے وہ قابل التفات نہیں، دنیائے فکر سے خارج قرار دے دیا۔

اس نظریے کی قبولیت کے ساتھ سائنس کو علمی میدان میں حکمرانی کا مقام حاصل ہو گیا۔ اس شعبہ علم نے جو گل کھلائے ہیں ان کا ہم اس سے قبل اختصار کے ساتھ تذکرہ کر چکے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ انسان تمدنی اعتبار سے جس سطح کی زندگی بھی بسر کر رہا ہو، اس کا ذہن اپنے اور کائنات کا آغاز و انجام اور تخلیق کے متعلق سوچنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ سائنسدان بھی اس روش سے نہیں بچ سکے۔ ان کی تحقیقاتی سرگرمیوں کے دوران ایسے مقامات آجاتے ہیں جہاں انہیں آگے بڑھنے کے لیے حقیقت کے کسی گوشے کے اسرار معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ان کا انداز تحقیق و مشاہدہ ایسا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کر سکے۔ چنانچہ برٹرانڈ رسل جو اس صدی کے مادہ پرستوں اور دہریوں کی صف اول میں نمایاں مقام رکھتا ہے اپنی کتاب History of Western) Pholosophy) میں لکھتا ہے:

Science tells us what we can know, but what we can know is little, and if we forget how much we cannot know

we become insensitive to many things of very great importance. (Page 11)..

سائنس ہمیں وہ کچھ بتاتی ہے جو ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن جو کچھ ہمارے ادر اک کی گرفت میں آسکتا ہے وہ بہت کم ہے اور اگر ہم حقیقت کے اس بہت سے حصے کو جو ہم نہیں سمجھ سکتے، فراموش کر دیں تو ہم بہت سی ایسی باتوں سے جو بہت بڑی اہمیت کی مالک ہیں، غیر متعلق ہو جائیں گے۔

یہ رائے ایک ایسے شخص کی ہے جو زمانہ ماضی اور دور حاضر میں ابھرنے والے نظریات کا نقاد ہونے کے علاوہ بیسویں صدی کے فلاسفہ اور حکماء میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس نے جو ایجادات و اختراعات کی ہیں ان کے ذریعے سے عوام و خواص کے انداز زندگی میں نمایاں تغیر واقعہ ہوا ہے۔ لیکن ایسے تغیرات حیات انسانی کو اصلح اور مطابق فطرت خطوط پر استوار کرنے کے لیے رہنمائی کر سکتے ہیں اور نہ اس کی ضمانت مہیا کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایسے منبع ہدایت کی ضرورت ہے جسے نظریات انسان کا کامل علم اور اس کائنات میں بنی آدم کے مقام سے پوری شناسائی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس دائرہ معرفت تک سائنس کو رسائی حاصل نہیں ہے، اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس جب اس جستجو اور تجسّس کی کوشش کرے گی تو اپنے حلقہ کار سے نکل کر فلسفے کی قلمرو میں داخل ہو جائے گی۔

سائنس کی اب تک کی کارگزاریوں اور ایجادات کے سرمائے میں سامان حرب کا پلڑا سب سے بھاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کو سائنس نے جو لمبی سہولتیں فراہم کی ہیں وہ مہلک ہتھیار تیار کرنے کی کاوشوں کے دوران ضمنی پیداوار (By Products) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حتیٰ کہ خلائی سفر کے لیے جو مشینی اختراعات کی گئی ہیں اگرچہ ان کا سائنسی ترقی کی علامت کے طور پر فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے لیکن ان کی تیاری کے محرکات میں بھی جنگی مقاصد اور نتیجۃً انسانی تباہی کے لیے استعمال کرنے والے عزائم پوشیدہ ہیں۔ جس شعبہ علم کے یہ ثمرات ہوں اس سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی لائحہ عمل اور نظام اجتماعی وضع کرنے کے سلسلے میں

رہنمائی کرے گا۔ موجودہ صورت سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بچے کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار ہتھیار دے دیا گیا ہے اور ہر وقت اس کی سمجھ کی کمی کے باعث یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ وہ کہیں اس سے اپنے آپ ہی کو ختم نہ کر لے۔ اگرچہ کیفیت اس وقت ایسی ہی ہے لیکن ہم آدم کی اولاد پر کلیتاً اس مثال کے انطباق پر اصرار نہیں کرتے۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ انسان کے اندر خیر اور بھلائی کی سوچ کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ اصل دقت دراصل یہ ہے کہ جیسا کہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے معاملات کو پوری طرح چلانے کے لیے انسان کے اندر اس معیار کی فہم و بصیرت نہیں جو اس کے لیے ضروری ہے۔ اس کو اس طرح کسی نہ کسی طرز کی رہنمائی کی ضرورت ہے جیسے فرد کو پیدائش کے بعد اپنی نشوونما کے دوران ضرورت ہوتی ہے یا اجتماعی زندگی میں دستور و قوانین اور معروف قواعد و معاشرت کی حاجت ہوتی ہے جیسا کہ ہم اس سے قبل تذکرہ کر چکے ہیں۔ لیکن اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ اسے اس کی انگلی پکڑ کر اسی طرح چلانا ہو گا جس طرح ایک نا سمجھ بچے کو چلایا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ صرف اس کو سمت سفر بتانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے بھٹک نہ جائے۔ اسے چلنا خود ہی ہوگا جیسا کہ ہم نے ''اسلامی فکر'' کے باب میں بیان کیا۔ اس کے خالق نے اسے بہت اونچی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

ہم اس سلسلے میں سائنسی شعبے سے تعلق رکھنے والے معاملے ہی کی مثال دیتے ہیں۔ جب کوئی شخص کارخانہ نصب کرنے کے لیے کوئی مشینری حاصل کرتا ہے تو وہ اگر نادان نہ ہو، تو کبھی اصرار نہیں کرتا وہ اس کو چلانے کے لیے اس کے بنانے والے سے کسی قسم کی ہدایت حاصل نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس وہ اس ادارے سے جو اس مشینری کے سارے خارجی و داخلی اسرار و رموز جانتا ہے، اس کو استعمال کرنے کے طریق اور جو احتیاطیں ملحوظ رکھنا ضروری ہیں، ان کے متعلق پوری معلومات حاصل کرے گا۔ اس کے بعد وہ اس کارخانے کو اپنے تجارتی فہم و فراست کے تحت آزادی سے چلائے گا۔ لیکن اگر وہ صرف مشینری خریدنے ہی پر اکتفا کرے گا تو اولاً تو وہ اس کو ایک کارخانے کی شکل ہی نہ دے سکے گا اور اس کو نصب کرنے میں نہ معلوم کتنی غلطیوں کا مرتکب ہوگا اور ثانیاً اس کو

چلانے کے سلسلے میں اس سے جو کوتاہیاں سرزد ہوں گی، اس سے وہ مشینری ہی تباہ ہو جائے گی۔

انسان کی انفرادی سطح پر عادات و نفسیات بھی پیچیدہ ہیں اور آپس میں مختلف انسانوں کے مزاجوں اور رجحانات میں بھی بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان مل کر جو معاشرہ تعمیر کرتے ہیں وہ بھی اختلاف طبائع و مفادات سے اٹا پڑا ہوتا ہے۔ اس کے بین الاقوامی معاملات تو فی الاصل جنگل کے قانون کے تابع ہوتے ہیں چاہے معاہدات اور بین الاقوامی تنظیموں کا وجود بظاہر نظر کیوں نہ آتا ہو۔ یہ انسان ایک ایسی کائنات کا حصہ ہے جس کی وسعت کا احاطہ کرنا انسان کے بس میں ہے نہ اس کے نظم کے سلسلے کی تدابیر اس کے علم میں ہیں۔ اگر انسان ایک حقیر اور چھوٹی سی مشین کو تب تک استعمال میں نہیں لا سکتا جب تک اس کی ساخت اور فعالیت (Working) کے متعلق معلومات حاصل نہ کر لے تو نوع انسانی کی اتنی وسعت اور پیچیدگیوں کی حامل کائنات کو خالق کائنات کی ہدایات کے بغیر سائنس کے طبیعیات کے دائرے میں چند انکشافات کے بل پر احسن طریق پر کیسے چلایا جا سکتا ہے؟ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ تو خود اپنی ایجادات و اختراعات کو انسان کے لیے مفید اور باعث فلاح بنانے کے لیے رہنمائی کی محتاج ہے۔ اس رہنمائی کے بغیر اس نے دنیا کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ مزید بر آں اس کا دائرہ کار بھی بہت محدود ہے۔

علامہ اقبال نے (Reconstruction of Religious thought in Islam) کے چوتھے خطاب میں سائنس کے دائرۂ تحقیق و مشاہدہ کی محدودیت کے متعلق کہا ہے:

"Science must necessarily select for study certain specific aspects of Reality only and exclude others. It is pure dogmatism on the part of science to claim that the aspects of Reality selected by it are the only aspects to be studied. No doubt man has a spatial aspect but this is not the only aspect of man, such as evaluation, the unitary character of purposive experience, and the pursuit of truth which science must not necessarily exclude from its study, and the

understanding of which requires categories other than those employed by science.".

سائنس کو ناگزیر طور پر اپنے مطالعہ کے لیے حقیقت کے صرف بعض متعین پہلوؤں کو منتخب کرنا چاہیے اور دوسرے پہلوؤں کو اپنے لیے خارج از بحث قرار دے دینا چاہیے۔ یہ سائنس کی طرف سے بلادلیل اپنے دعوے کو ٹھونسنے کی ایک واضح صورت ہے کہ اس نے حقیقت کے جن پہلوؤں کو چنا ہے صرف وہی پہلو قابل مطالعہ ہیں(یعنی کل حقیقت انہی پر مشتمل ہے) اس میں شک نہیں کہ انسان کا ایک امکانی پہلو بھی ہے لیکن صرف یہی ایک انسانی پہلو قابل مطالعہ نہیں دوسرے پہلو بھی ہیں جیسا کہ اخلاقی قدروں کے تعین، مقصدیت کے حامل(روحانی) تجربے کی یکسانیت اور(تلاش) عمل بالحق۔ سائنس کو ان مسائل کے مطالعہ سے گریز کرنا چاہیے۔ ان کا ادراک حاصل کرنے کے لیے ایسے ذرائع تحقیق کی ضرورت ہے جنہیں سائنس اختیار نہیں کرتی۔

سائنس کے برعکس فلسفہ کا دائرہ تفکر بہت وسیع ہے۔ مؤخر الذکر کائنات اور انسان کی ابتدا و انتہا، ان کی تخلیق اور خالق کا تعین، انسان کا اس کائنات میں مقام، اس کے اخلاقی فرائض، اچھائی اور برائی کا منبع و نوعیت اور اس قسم کے ان گنت مسائل سے بحث کرتا ہے جن کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ ہر فلسفی اپنے مزاج اور ترجیحات کے مطابق اپنا موضوع تفکر خود چنتا ہے۔ غرض یہ کہ فلسفہ سوچ و بچار اور ظن و قیاس کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کا نام ہے۔ عقلیت پرست (Rationalists) فلسفے کو غیر سائنٹفک انداز تفکر گردانتے ہیں۔

فلسفے کی تاریخ بہت پرانی ہے لیکن اس ذہنی کاوش میں زیر تدبر و تفکر موضوعات اور اخذ نتائج کے اعتبار سے تسلسل ناپید ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فلاسفہ بھی زمانی حالات و رجحانات سے متاثر ہوتے ہیں، اور گزشتہ تین چار صدیوں کے دوران مغربی فلسفہ خصوصیت کے ساتھ سائنسی انکشافات، انسانی نفسیات سے متعلق نئے نئے نظریات، ارتقاء کی تھیوری اور جدلی تصور یا مادیت وغیرہ سے متاثر ہوتا رہا ہے، لیکن ہر فلسفی اپنی ہی ہانکتا ہے۔ اس لئے اس دائرہ علم میں ایسی صورت نہیں جیسے سائنس کے شعبے میں ہے۔ آخر الذکر میں فنی و معلوماتی پیش رفت واضح طور پر نظر آتی اور زندگی کے معاملات میں براہ راست دخیل ہوتی

دکھائی دیتی ہے۔ ایک شخص کچھ کام کرتا ہے تو دوسرا اس کو اپنا کر تحقیق و مشاہدے کے ذریعے آگے بڑھاتا ہے، پھر تیسرا اور چوتھا اس کو مزید ترقی دیتا ہے اور علی ھذا القیاس۔ یہ صنف علم تجربات سے عبارت ہے اور سائنسدانوں کے خطوط کے مطابق یقینیات پر مبنی ہے۔ لیکن فلسفہ ظن و تخمین اور منطق و استدلال کے سہارے چلتا ہے جو تجربہ اور محسوسات کی دنیا سے لا تعلق ہے۔

لہٰذا فلسفے کی دنیا میں بے شمار مکاتب فکر پائے جاتے ہیں اور ایک الجھاؤ (Confusion)دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ ہر فلسفی بزعم خود حقیقت کے کسی پہلو پر گفتگو کرتا ہے، لیکن سب فلسفیوں کی کاوشوں نے مل کر بھی حقیقت کی معمولی سی جھلک نہیں دکھائی۔ اسی لیے عام طور پر ایک تو اس بات پر اہل علم متفق ہیں کہ فلسفہ اپنی طویل المدت تاریخ کے باوجود اپنے مقاصد کے سلسلے میں کوئی پیش قدمی نہیں کر سکا اور دوسرا ایک صنف علم کی حیثیت سے اس کی کوئی متعین تعریف نہیں کی جا سکتی۔

چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد کے عنوان کے تحت لکھے ہوئے مقالے میں تحریر ہے:

The project of seeking knowledge of a reality behind appearances must be abandoned because it is beyond the scope of human understanding. And this applies as much to man himself as to the rest of the natural world. (Page 562).

ظواہر کے پیچھے حقیقت کا علم تلاش کرنے کے ظنی تفکر(کے طریقے) کو ترک کر دنیا چاہیے کیونکہ یہ بات(یعنی ادراک حقیقت) انسانی فہم کے دائرے سے باہر ہے۔ اور یہ اصول اسی طرح انسان پر منطبق ہوتا ہے جس طرح بقیہ کائنات پر۔

برٹینکا کی اسی جلد میں فلسفے کے تین پروفیسروں نے (The History of Westren Philosophy)کے عنوان کے تحت جو مقالہ لکھا ہےاس میں وہ رقم طراز ہیں:

It is difficult to determine whether any common element can be found within this diversity and whether any

clear meaning can be discovered for philosophy that could serve as a universal and all inclusive definition. (Page 472).

اس بات کا تعین بہت مشکل ہے کہ آیا اس مختلف النوع نظریات کی صورت کے اندر کوئی مشترک عنصر پایا جاتا ہے، اور آیا فلسفے کی صنف علم میں کوئی ایسے داخلی معنی و مفہوم معلوم کیے جا سکتے ہیں جو اس کی جامع اور وسیع المعنی تعریف کرنے کا ذریعہ بن سکیں۔

مسلمانوں کے اکابر علماء آج سے صدیوں پہلے اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ فلسفہ ادراک حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتا بلکہ اس معاملے میں یہ ایک بیکار مشغلہ ہے۔ یہ نظریہ انہوں نے فلسفے کے گہرے مطالعہ کے بعد مرتب کیا۔

فلسفے کی داستان عام طور پر حکماء فارس اور فلاسفہ یونان کی تحریروں سے شروع ہوتی ہے۔ یونان کے زوال کے بعد صدیوں تک ان فلاسفہ کی تصنیفات گوشہ گمنامی میں پڑی رہیں۔ اس کے بعد مسلمان حکماء نے ان کا مطالعہ کیا اور ان کی بعض باتوں سے متاثر ہوئے اور بہت سے نظریات پر تنقید کرکے انہیں رد کیا۔ جن اہل علم نے یہ رائے قائم کی کہ فلسفہ یونان کی یلغار اسلامی عقائد میں انتشار پیدا کرنے کا باعث ہو رہی ہے انہوں نے تنقیص کے لیے علم کلام ایجاد کیا۔ ہم اس مسئلے کے سلسلے میں علامہ ابن خلدون جو دنیا کا سب سے بڑا مؤرخ اور اجل حکماء کے زمرے میں شمار ہوتا ہے کی مشہور تصنیف ''مقدمہ'' سے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو اگرچہ طوالت کلام کا باعث ہوں گے لیکن فلسفہ کے سلسلے میں مسلمانوں کا طرز عمل اس سے واضح ہو جائے گا۔ اور بعض حلقوں میں مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی کہ مسلمانوں نے مقلدانہ طور پر یونانی فلسفے کو اپنا لیا تھا۔

''علوم عقلیہ'' کے عنوان کے تحت علامہ موصوف نے لکھا ہے:

''روم میں شروع میں یونانیوں کی حکومت تھی اور ان میں علوم عقلیہ کا ایک وسیع میدان تھا۔ یونانیوں میں بڑے بڑے مشہور اور حکمت کے ستون حکماء گزرے ہیں ۔۔ ۔ ان علوم میں سند ارسطو کے زمانے سے باقاعدہ چلی آتی تھی ۔ ۔ ۔ ارسطو ان علماء کا استاد تھا۔ اور ان میں اسے بڑی شہرت حاصل تھی۔ اسے لوگ معلم اول کہا کرتے تھے۔ دنیا کا گوشہ گوشہ اس سے واقف ہے۔ پھر جب یونانیوں پر زوال آیا اور حکومت رومیوں کے قبضہ میں چلی گئی

اور رومی عیسائی تھے تو شریعتوں کے تقاضوں کے مطابق یہ تمام علوم چھوڑ دیئے گئے البتہ یہ خزانہ کتابوں اور کاپیوں میں محفوظ رہا جو کتب خانوں میں مقفل رہیں۔ جب یہ لوگ شام کے مالک ہوئے تو یہ کتابیں وہاں کے کتب خانوں میں محفوظ رہیں۔''

''پھر دنیا میں آفتاب اسلام طلوع ہوا اور مسلمانوں کا دنیا پر ایسا غلبہ ہوا جس کی مثال نہیں ملتی۔ مسلمان جیسے دنیا کی دیگر اقوام پر غالب آئے تھے اسی طرح رومیوں پر بھی غالب آئے ان کی حکومت کا سادگی اور صنعتوں سے ناواقفیت سے آغاز ہوا حتی کہ جب ان کی حکومت عروج پر پہنچی تو تمدن میں تمام اقوام سے بڑھنے لگی تو انہیں علوم حکمیہ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔۔۔۔''

''چنانچہ ابو جعفر منصور متوفی(۱۵۸ھ) نے شاہ روم کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ تعلم علوم حکمیہ کی کتابوں کا ترجمہ کرا کر ہمارے پاس بھیجا جائے۔ شاہ روم نے منصور کے پاس اقلیدس اور طبیعیات کی چند کتا بیں ترجمہ کرا کر بھیج دیں۔ مسلمانوں نے ان کا مطالعہ کیا اور وہ ان کے مسائل سے آگاہ ہوئے۔ پھر ان میں باقی کتابوں کے مطالعہ کاشوق بھڑک اٹھا۔ جب مامون کا دور حکومت آیا (چونکہ ماموں عالم تھا، اس لئے اسے علم کی طرف رغبت تھی) تو اس کے دل میں ان علوم کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے رومی بادشاہ کے پاس وفد بھیجے کہ یونانیوں کے علوم نکال کر انہیں عربی رسم الخط میں لکھوا دیا جائے اور مترجموں کو ان کے تراجم کے لیے مقرر کر دیا۔ اور بغیر ترجمہ کرائے کوئی فن نہیں چھوڑا۔ پھر مسلمان اہل فکر نے ان کا گہرا مطالعہ کیا اور ان فنون میں مہارت پیدا کی۔ اور ان علوم میں ان کی نگاہیں گہرائی تک پہنچ گئیں۔ بلکہ انہوں نے بہت سے مسائل میں معلم اول(ارسطو) کی بھی مخالفت کی اور خاص طور پر جاننے نہ ماننے کے اعتبار سے اسی کے مسائل زیر بحث لائے کیونکہ ان کے نزدیک وہی زیادہ مشہور تھا اور ان علوم میں بہت سی کتابیں لکھیں اور اپنے پیش رو یونانیوں سے بڑھ گئے۔''

''اسلام میں مشہور بڑے فلاسفہ ابونصر فارابی(متوفی ۳۳۹ھ)اور بوعلی بن سینا(متوفی ۴۲۸ - ۱۰۳۷ء) مشرق میں قاضی عبد الولید بن رشد(متوفی ۵۹۵ – ۱۱۹۸ء) اور وزیر ابوبکر

بن الصائغ(معروف بہ ابن ماجہ متوفی ۵۳۳ء) و غیر ھم اندلس میں ان علموں میں انتہا کو پہنچ گئے تھے۔"

(مقدمہ جلد دوم مترجم مولانا راغب رحمانی دہلوی صفحات ۲ – ۳۸۱)

علامہ ابن خلدون نے بڑی وضاحت سے فلسفہ اور علم الکلام کا فرق بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان دونوں علوم کو ممیز کرنے میں کس طرح التباس پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ الہیات ال ۱۰ کے عنوان کے تحت کہتے ہیں :

"علماء کے نزدیک الہیات کا مرتبہ علوم کی ترتیب میں طبیعیات کے بعد کا ہے۔ اس لئے اسے علم ماوراء الطبیعہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس فن میں لوگوں میں معلم اول کی کتابیں پھیلی ہوئی ہیں جن کی تلخیص ابن سینا نے کتاب الشفاء والنجا میں کی ہے۔ اسی طرح حکمائے اندلس میں سے ابن رشد نے کیا ہے۔ جب پچھلے علماء نے ان لوگوں کے علوم میں اپنے علوم وضع کر کے داخل کئے اور علوم میں کتابیں لکھیں تو امام غزالی نے فلاسفہ کے اکثر مسائل کی تردید فرمائی۔ پھر پچھلے اہل کلام نے علم کلام کے مسائل الہیات کے موضوع سے ملا دیے اور دونوں علموں کے مسائل میں خلط ملط کر دیا اور یہ مسائل ایسے معلوم ہونے لگے جیسے ایک ہی علم کے مسائل ہیں۔ اسی طرح لوگوں نے طبیعیات والہیات کے مسائل کی ترتیب بھی حکماء کی ترتیب کے خلاف بدل ڈالی، اور دونوں کو گڈمڈ کر کے بمنزلہ ایک علم کے بنا دیا تو انہوں نے امور عام میں سب سے پہلے گفتگو کی۔ پھر جسمانیات اور ان کے توابع میں گفتگو کی۔ پھر روحانیت اور ان کے توابع میں گفتگو کی۔ جیسا کہ امام رازی نے مباحث شرقیہ میں اور آپ کے بعد دیگر تمام علماء کلام نے کیا۔ اور علم کلام کے مسائل، مسائل حکمت سے گڈمڈ ہو گئے اور اس فن کی کتابیں انہی مسائل سے بھر گئیں ، گویا ان دونوں علموں کے موضوعات و مسائل سے ایک ہی غرض ہے۔ اس گڈمڈ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو علم کلام کے مسائل، مسائل حکمت سے علیحدہ کرنے مشکل ہو گئے۔ کیونکہ علم کلام کے مسائل تو وہ عقائد ہیں جو شریعت سے ماخوذ ہیں، جیسا کہ انہیں سلف نے عقل پر اعتماد کئے بغیر نقل کیا ہے۔ یعنی مسائل شرعیہ میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اور اہل کلام نے جو ان عقائد شرعیہ پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں تو اس لئے نہیں قائم کئے کہ ان میں سے کسی نا معلوم حق کا کھوج

لگایا جا سکے۔ کیونکہ مجہول چیز کو معلوم کرنے کے لیے دلائل قائم کرنا فلاسفہ کی شان ہے۔ علمائے کلام نے تو اس لیے عقلی دلائل قائم کیے ہیں کہ یہ دلائل ایمانی عقائد کو اور سلف کے مذاہب کو تقویت پہنچائیں۔ اور بدعتیوں کے شکوک و شبہات رفع کریں، جن کا گمان ہے کہ ایسے عقائد میں ان کے دلائل کے ماخذ عقلی نہیں اور اس سلسلے میں دلائل عقلی ہی ہونے چاہئیں۔ عقلی دلائل اس وقت لائے گئے ہیں جب کہ ان عقائد کو نقلی دلائل سے صحیح مان لیا گیا ہے جیسا کہ سلف نے انہیں صحیح مانا تھا۔ دونوں مقاموں میں کتنا عظیم فرق ہے۔ کیونکہ صاحب مشرع کے ماخذ انتہائی وسیع ہیں۔ ان کا دامن دلائل عقلیہ سے وسیع ہے اس لئے وہ ان سے اونچے ہیں اور انہیں گھیرے ہوئے ہیں، انہیں انوار الٰہی سے مدد مل رہی ہے۔ اس لیے وہ فکرو نظر کے کمزور قانون کے ماتحت داخل نہیں ہوئے۔ پھر جب ہمیں شارع علیہ السلام(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک ماخذ کی رہنمائی فرمائی تو ہمیں اسے مقدم رکھنا چاہیے اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے جس کا ہمیں حکم ہے۔ عقیدے کے طور پر بھی اور یقین کے طورپر بھی۔ ہاں اگر اس کی کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہمیں اس میں لب نہیں ہلانا چاہیے، اور شارع کے حوالے کر دینا چاہیے اور عقلی گھوڑے نہیں دوڑانے چاہئیں۔ اہل کلام کو عقلی دلائل مجبوراً دینے پڑے، کیونکہ بے دینوں نے سلف کے عقائد میں اپنی نظری بدعتوں سے معارضے پیش کرنے شروع کر دیئے تھے، اس لیے عقلی دلائل سے انہیں خاموش کر دینا ضروری تھا۔ اسی وجہ سے ان کی تردید میں انہیں کی جنس کے دلائل سے دلائل لانے پڑے لیکن طبیعیات والٰہیات کسی مسئلے کو عقلی دلائل سے صحیح یا غلط بتانا علم الکلام کا موضوع نہیں اور نہ یہ علمائے کلام کے فکر و نظر کے زمرے میں سے ہے۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے تاکہ دونوں علموں میں تمیز کی جا سکے۔ کیونکہ متاخرین نے دونوں علم وضع و تالیف کے لحاظ سے ایک کر دیئے ہیں حالانکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ دونوں کا الگ الگ موضوع ہے، اور الگ الگ مسائل ہیں۔ دونوں کے مسائل کو گڈمڈ کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ استدلال کے وقت دونوں کے مقاصد ایک ہی جیسے تھے۔ اس لیے یہ سمجھ لیا گیا کہ غالباً علم کلام بھی اعتقادات کو عقلی دلائل سے ثابت کرنا چاہتا ہے، حالانکہ یہ بات نہیں۔ مسلمانوں کے عقائد تو

بلا عقلی دلیل کے بھی صحیح ہیں، عقلی دلائل تو ملحدوں کا منہ بند کرنے کے لیے لائے گئے ہیں جیسا کہ ابھی ہم نے بتایا ہے۔''

(مقدمہ جلد دوئم مترجم مولانا راغب رحمانی دہلوی صفحات ۳۹۹۔۴۰۰)

فلسفے کی آمیزش سے علم کلام نے جو صورت اختیار کرلی تھی اور جس کی وضاحت علامہ ابن خلدون کے درج بالا اقتباس سے ہو گئی ہے، اس کے متعلق امام غزالی رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''احیاء العلوم'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''فائدہ اس علم کا یہی گمان میں آتا ہے کہ حقیقتوں کا منکشف ہونا اور ان کی ماہیت اصلی کا پہچاننا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علم کلام سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ غالباً کشف حقیقت اور معرفت ماہیت کی نسبت خبط اور گمراہی میں زیادتی ہوتی ہے۔ اور اس بات کو اگر تمہارے سامنے کوئی محدث یا کٹھ ملا کہے گا تب تو تم اپنے دل میں یہ کہو گے کہ چونکہ یہ اس علم سے ناواقف ہیں، اور آدمی جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہوا کرتا ہے، اس لئے برا کہتے ہیں۔ لیکن اس کو ہم سے سنو کہ ہم نے اس علم کا خوب امتحان کیا اور اس کے اقصیٰ غایت تک پہنچے، اور جو علم اس سے مناسبت رکھتے تھے ان میں بھی خوب مہارت پیدا کی۔ مگر بعد کو یہی پایا کہ اس علم کے ذریعے سے معرفت حقائق کی راہیں مسدود ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے اس علم سے ہم کو نفرت ہو گئی۔''

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ(٦٦١ - ٧٢٨ھ)نے فلسفے کی ان الفاظ میں مذمت کی ہے:

''میں یہ گمان نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ مامون (الرشید) سے درگزر فرمائے گا، اور یہ لازمی ہے کہ وہ اللہ کا سامنا کرے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ جو اس نے اس امت میں علوم فلسفہ داخل کرکے اس کے حق میں کانٹے بوئے ہیں، اور ان تمام باتوں کی جوابدہی کرے۔''

(تاریخ افکار و علوم اسلامی مصنفہ علامہ راغب الطباخ ترجمہ مولانا افتخار احمد بلخی صفحہ ۳۴۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ام الکتاب میں امام فخرالدین رازی کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :

ترجمہ : میں نے علم الکلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں کو خوب دیکھا بھالا ہے لیکن بالآخر معلوم ہوا کہ نہ تو ان میں کسی بیمار کے لیے شفا ہے نہ کسی پیاسے کے لیے سیرابی۔ سب سے بہتر اور حقیقت سے نزدیک تو راہ وہی ہے جو قرآن کی راہ ہے۔ اثبات صفات میں پڑھو، الرحمٰن علی العرش استویٰ اور نفی تشبہ میں پڑھو، لیس کمثلہ شئ، یعنی اثبات اور نفی دونوں کو تھامے رہو اور جس طرح کسی کو میرے اس معاملے کے تجربے کا موقع ملا ہو گا، اسے میری طرح یہ حقیقت معلوم ہو گئی ہوگی"

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے چار جلدوں پر مشتمل رد فلسفہ پر ایک کتاب تصنیف کی۔ "الرد علی المنطق" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی جس میں ارسطو کی منطق پر اختلافی بحث کی ہے۔

ہم نے جو حوالے دیئے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے اکابرین نے فلسفہ کو کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ نہ ہی اسے ادراک حقیقت اور زندگی کے معاملات کے سلسلے میں فکر و عمل کے دائروں میں رہنمائی دینے کا اہل سمجھا۔ نہ ہی کسی غیر مسلم اہل علم و دانش نے فلسفے سے انسانی زندگی کو اصلح اساسات پر منظم کرنے کے لیے امیدیں وابستہ کی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تو فلسفیوں اور متکلمین سے علمی گفتگو کرنا بھی پسند نہ فرماتے تھے۔

ہم نے سائنس اور فلسفے کے سلسلے میں جو گفتگو کی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان علمی شعبوں سے یہ توقع وابستہ کرنا کار عبث ہے کہ یہ بنی نوع انسان کو کسی نظام عدل کے تحت زندگی گزارنے کے لیے راہ ہدایت کی نشاندہی کر سکتے ہیں یا مستقبل میں کر سکیں گے۔ ان کے پاس وہ معنوی ہتھیار ہی موجود نہیں جنہیں استعمال کر کے وہ اس کام کو سرانجام دے سکتے ہوں۔ ان دو کے علاوہ اور کوئی شعبہ اس بات کا مدعی ہی نہیں ہے کہ وہ اس فریضے کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ آج تک تاریخ انسانی میں جتنے نظام بھی قائم ہوئے ہیں وہ انبیاء اور ان کے متبعین کے قائم کردہ نظاموں سے قطع نظر کے بادشاہوں، جنگی جرنیلوں، آمروں، استعماری قوتوں اور مختلف معاشرتی طبقات نے ظلم و ستم کی بنیاد پر قائم کئے ہیں۔ بعض صورتوں میں ان عناصر کو مفاد پرست مفکرین کی معاونت بھی حاصل رہی ہے۔

ہم اس باب کے آغاز میں متعدد ذیلی عنوانات کے تحت انسان کے کسی نظام عدل کا شعور حاصل کرنے اور اسے زیر عمل لانے میں بے بسی و بے چارگی اور اس کے خود ساختہ نظاموں پر اصولی اور مجموعی اعتبار سے تبصرہ کر چکے ہیں۔ ہم نے ان کے برپا کردہ فساد کی بھی نشاندہی کی ہے۔(ناظرین کو اس مرحلہ پر ایک بار پھر ان سطور کو پڑھ کر ہماری گذارشات کو اذہان میں مستحضر کر لینا چاہیے۔)

وحی واحد ذریعہ ہدایت

اس کے بعد سطح ارض پر ایک ہی ذریعہ علم و ہدایت باقی رہ جاتا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہی انسان کو اصولی رہنمائی کا ایک ایسا خاکہ فراہم کر سکتا ہے جسے اپنا کر اپنے معلمات اور فکر کو اپنی کاوشوں کے ذریعے سے صحیح طور پر استوار کر سکتا ہے۔ یہ ذریعہ ہدایت انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی وجود میں آیا اور اسے وحی کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے (ترجمان القرآن) میں اس بات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

''ہم وجدانی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ہماری محسوسات کی سرحد سے آگے بھی کچھ ہونا چاہیے لیکن ہمیں علم وادراک کے ذریعے کوئی یقینی بصیرت نہیں ملتی۔ اگر اس بارے میں یقین کی کوئی حد ہے تو وہ صرف الہامی ہدایت کی صدا ہے۔ اگر ہم اس سے انکار کر دیں گے تو پھر ہمارے پاس جہل و تاریکی کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ''

''ہم نے اس وقت تک علم وادراک کے ذریعے اس بارے میں جو کچھ معلوم کیا ہے، اس میں کوئی یقینی بصیرت ایسی نہیں ہے جو ان حقائق کے خلاف ہو۔''

(جلد اول - صفحہ ۳۰۸)

خالق کائنات وانس یہ رہنمائی اپنے معاشرے کے بعض برگزیدہ اور اعلیٰ اخلاقی قدروں سے مزین تسلیم کئے جانے والے انسانوں کے ذریعے سے ان کے مخاطبین تک پہنچاتا ہے۔ تاریخی روایات کے مطابق مذاہب و ادیان کے بانیوں نے حصول وحی کا دعویٰ کیا ہے۔ اور جس مذہب کے پیروں کے پاس کوئی مقدس کتاب موجود ہے وہ اس خالق کائنات کی طرف سے اتاری ہوئی ہی قرار دیتے اور مانتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک ایسا ذریعہ ہدایت ہے جو تمام مذاہب کے درمیان مشترکہ اور متفقہ حیثیت رکھتا ہے۔ جن انسانوں پر یہ ہدایت بذریعہ

وحی نازل ہوتی ہے دین اسلام میں انہیں رسول اور نبی کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ یا بقول قرآن امت انبیاء اپنے اپنے ماحول میں صداقت و دیانت کے اعتبار سے روشنی کے بلند ترین مینار کی حیثیت کا مالک رہا ہے۔ ان سے کذب وافتراء کی قطعاً کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔(اس سلسلے میں ''رسالت'' کے ذیلی باب میں مفصل گفتگو ہوگی۔ ہم''اسلامی فکر'' کے باب میں بنیادی اصولوں کی ضرورت کے عنوان کے تحت قرآن کی آیات (۳۸:۲) اور(۱۲۳:۲۰) نقل کر کے یہ بیان کر چکے ہیں کہ آدم کو اس کرۂ ارض پر بسانے کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا کہ تمہاری اتباع کے لیے ہماری ہدایت آتی رہے گی تاکہ تم راہ راست سے بھٹک نہ جاؤ۔ اس فرمان خداوندی کے مطابق مختلف اقوام اور زمین کے مختلف خطوں پر انبیاء رسل پیغام خداوندی لے کر مبعوث ہوتے رہے۔ جیسا کہ آیت (۲۴:۳۵)میں مذکور ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ تکوینی حکم کے تحت انسان پر اپنے احکامات تشریعی نافذ نہیں کرتا بلکہ اسے اس ارضی زندگی کے دوران اخروی جواب دہی کی شرط کے ساتھ یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کی نازل کردہ ہدایت پر عمل پیرا ہو اور چاہے تو اس سے روگردانی کرے۔ ہم اس سلسلے میں اسلامی فکر کے باب میں انسان کے اندر حق و باطل کی کشمکش کے ذیلی عنوان کے تحت قرآن کی متعدد آیات نقل کرکے اللہ تعالیٰ کی اس سنت پر گفتگو کر چکے ہیں۔ البتہ اس جہان میں بھی مکافات عمل کا قانون رائج ہے اگرچہ اس کے نفاذ کی حکمتیں ہماری حدود ادراک سے باہر ہیں۔

دور قدیم کی عالمی تاریخی مدون و منضبط حالت میں موجود نہیں۔ کچھ قصے کہانیاں لوگوں میں گردش کر رہے ہیں یا علم الآثار نے کھنڈرات کی کھدائیوں کے ذریعے سے منتشر قسم کی کچھ معلومات فراہم کی ہیں جن کی بنیاد پر اٹکل کے ذریعے تمدنوں کی خیالی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں یہ انداز''رائی کا پہاڑ بنانے'' کی مثل سے مشابہ ہے۔ ایسی سب معلومات مقام ثقاہت سے گری ہوئی ہیں۔ ان کی بنیاد پر قدیم تمدنوں میں رائج افکار اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی تنظیم کے متعلق کوئی محکم رائے قائم نہیں کی جا سکتی ۔ البتہ قرآن میں بعض انبیاء رسل کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں حضرات یوسفؑ، داودؑ اور سلیمان علیہم السلام جیسے ان انبیاء کا بھی تذکرہ ہے جن کے ہاتھوں میں سلطنتوں کی باگ ڈور آئی اور

ذوالقرنین جیسے خدا ترس بادشاہ کا بھی ذکر ہے جس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نبی بھی تھے یا نہیں۔ اس طرح بعض ظالم اور متمرد بادشاہوں کی بد اعمالیوں اور فکری گمراہیوں کا بھی ذکر ہے جیسے نمرود، فرعون، موسیٰؑ، نیز ان کے دربانوں کے ان کے ساتھ تعاون علی الاثم کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ فرعون کے درباریوں، ہامان اور قارون کو اس کے مشیروں کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے۔ مؤخر الذکر کا تذکرہ ایک کنجوس حب مال کے مرض میں مبتلا خود پسندی کے پیکر سرمایہ دار کی حیثیت سے بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام، قوم لوط ، قوم شعیب، عاد، ثمود وغیر کے کچھ حالات بھی قرآن میں مذکور ہیں۔ لیکن قرآن تاریخ یا کسی اور ایسے شعبہ علم کی کتاب نہیں۔ قصص القرآن ایک طرف سابقہ انبیا و رسل کے عزم واستقلال اور وحی کے ذریعے حاصل ہونے والی تعلیمات کی یکسانی و تسلسل زمانی نمایاں کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں تو دوسری طرف بعض متمرد اور خدا کے باغی حکمرانوں اور ان کے ہمنوا مشیروں کے انجام سے مخاطب قرآن کو آگاہ کرنے اور اس سے عبرت حاصل کرنے کی ترغیب دلانا مقصود ہے۔ ان کا مقصد سابقہ ادوار کی مکمل تاریخ بیان کرنا نہیں ہے۔

ہمارے پاس تاریخی اہمیت کے اعتبار سے صرف بعثت اسلام کے وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظیم اور زمانہ ساز دعوت کے انداز اور اس کے نتائج کی تفصیلات محفوظ ہیں جس کے اصول آنحضرت پر بذریعہ وحی نازل ہوئے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضور نے انسانی زندگی کو منظّم کرنے کے لیے جو نظریات پیش کیے ان کی اور ہر شعبہ حیات پر ان کے اطلاق کے سلسلے کی معلومات جس مکمل ثقاہت کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہیں اور ان پر اس دور سے لے کر آج تک جس قدر فکری اور تحریری کام کیا گیا ہے، اس کی ہمسری کسی اور دور کی تاریخ نہیں کر سکتی۔ ہم اس کتاب سے ناظرین کو دعوت دیتے ہیں کہ ایک تو ان اصولوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے جو وحی کے ذریعے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور دوسرے حیات انسانی پر ان کے انطباق سے جو نظام وجود میں آیا اس کی تفصیلات پر اس حیثیت سے غور کیا جائے کہ آیا وہ نظام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی ضمانت آج بھی فراہم کرتا اور اسکے دکھوں کا درماں ہے یا نہیں۔ ہم اس سے قبل"اسلامی

فکر'' کے باب میں تمہیدی طور پر اسلامی نظام کی نظری خصوصیات کے سلسلے میں بعض نکات پیش کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنی بساط کے مطابق آئندہ کے ابواب میں اس کی عملی تفصیلات پر گفتگو کریں گے اور دور حاضر کے مادہ پرستانہ نظاموں کا جائزہ لے کر یہ ثابت کریں گے کہ یہ تمام نظام یک رخ اور کسی نہ کسی فرد، طبقے، جغرافیائی اکائی، قوم یا نسل کے مفاد کے پیش نظر وضع اور نافذ کیے جاتے ہیں، اور ان کی بنا تعصب جاہلیہ پر ہے۔ صرف اسلام ہی وہ نظام مہیا کرتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے مفاد کو اپنا ہدف اور مقصد قرار دیتا ہے۔ سردست ہم قرآن و حدیث اور بعض مستند علماء کی وضاحتوں کی روشنی میں وحی کے نزول کے متعلق گفتگو کریں گے۔

اسلام میں نظریہ وحی :

قرآن و حدیث میں وحی کے مقاصد اور اس کے رسول کے قلب پر نازل ہونے کے ذریعے کے متعلق اس حد تک وضاحت کی گئی ہے جو انسانی عقل و خرد کی گرفت میں آسکے۔ اس کی کیفیت کا ہم کلی ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ ایک قلبی و روحانی تجربہ ہے جس کا معمول کا انسانی فہم وادراک متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تمثیلاً گفتگو کی گئی ہے۔

وحی کا آنا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہوتا تھا۔ کسی نبی اور رسول کو یہ استعداد عطا نہیں ہوئی کہ موقع اور وقت کے اعتبار سے نزول وحی اس کی مرضی و منشا کے تابع ہو۔ قرآن اور دیگر آثار سے ثابت ہے کہ حضور کے قلب مبارک میں وحی کے آنے کے متعلق بہت شوق پایا جاتا تھا، اور آپ چاہتے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام جلد جلد آیا کریں۔ لیکن بعض اوقات طویل وقفہ ہو جاتا تھا۔ مثلاً فترۃ الوحی کا طویل زمانہ جس کے دوران سورۃ اقراء کی ابتدائی آیات کے بعد وحی نازل نہیں ہوئی اور حضور اس دور میں شدید بے چینی اور اضطراب محسوس کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مفسرین کا اتفاق ہے۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر القرآن'' میں سورۃ الضحیٰ کے تحت لکھتے ہیں :

'' -- - مکی دور میں قریش کی مخالفت جب زیادہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے آپ کو خاصی پریشانی جو ہوئی وہ یہی ہوئی کہ مبادا ان لوگوں کی اس بیزاری میں آپ کی کسی

کو تاہی یا بے تدبیری کو کوئی دخل ہو جو اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سبب ہوئی جس کے باعث یہ حالات پیش آ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"اس پریشانی میں قدرتی طور پر آپ کو سب سے زیادہ بے چینی کے ساتھ وحی الٰہی کا انتظار ہوتا۔ وحی کے لیے شدید انتظار کی اصل وجہ اس لیے کہ یہی ایک چیز ہے جو تاریک حالات میں روشنی بھی دکھا سکتی ہے اور اس سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہوتاکہ آپ فریضہ دعوت رب کے منشاء کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا اس میں کوئی کو تاہی یا بے تدبیری ہو رہی ہے۔لیکن وحی کا معاملہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ حضور کو انتظار اور پریشانی ہو تو وحی نازل بھی ہو جائے"۔

(جلد ۹ صفحات ۴۱۳ – ۴۱۴)

پیر کرم شاہ الازہری سجادہ نشین بھیرہ تفسیر "ضیاء القرآن" میں سورۃ المدثر کے تعارف میں لکھتے ہیں :

"لیکن محققین کے نزدیک یہی بات مسلم ہے کہ سب سے پہلے سورۂ اقراء کی آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ یہ دن حضور کے لیے بڑے کرب و اضطراب کے دن تھے۔ طبیعت ہر وقت بے چین رہتی"۔

(جلد ۵ صفحہ ۴۱۳)

اس کے علاوہ وحی آتی بھی انہی مسائل پر تھی جن پر اللہ تعالیٰ بھیجنا چاہتا تھا۔ ایسی صورت نہ تھی کہ ہر معاملے میں اللہ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام ہدایت لے کر آجاتے اور وہ جزو قرآن بن جاتی۔ مثلاً حضور ٦ھ میں خواب دیکھ کر عمرہ کی نیت سے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ آپ کے خواب کی تعبیر یہ نہیں ہے کہ آپ اس سال عمرہ ادا فرمائیں گے۔ بعد کے حالات نے (جن کا تذکرہ اپنے موقع پر آئے گا) ثابت کر دیا کہ اس میں بہت بڑی حکمت الٰہی پوشیدہ تھی اور اس سفر میں انجام پانے والی صلح حدیبیہ اسلام کی تاریخ میں ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جب مشرکین مکہ سے گفت و شنید کے لیے مکہ روانہ کیا گیا تو ان کے قتل کی افواہ اڑ گئی۔ اس معاملے میں بھی وحی نہ آئی اور حضور افواہ سے بہت کبیدہ خاطر

ہوئے۔ چنانچہ بیعت رضوان کا انعقاد ہوا۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نبی یا رسول کو بھی اسی غیب کا علم ہوتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ اس کو اطلاع دے دے۔ اس کے بعد مشرکین مکہ سے صلح حدیبیہ کے نام سے جو معاہدہ ہوا، ان پر مذاکرات اور شرائط صلح طے کرنے کا معاملہ بھی اللہ تعالیٰ نے حضور کی نبوی فراست اور صوابدید پر چھوڑ دیا، اور معاہدے کے بعد اسے سورۃ الفتح میں فتح مبین(۴۸:۱)قرار دیا۔(یہ سورہ حدیبیہ سے واپسی پر دوران سفر نازل ہوئی)۔

اس طرح بدرواحد وغیرہ کے غزوات کی حربی حکمت عملی (War Strategy) کے سلسلے میں بھی ان کے وقوع سے قبل کوئی وحی نہیں آئی اور ان کے سلسلے کے معاملات کو حضور اور مسلمانوں کے درمیان مشاورت پر چھوڑ دیا گیا۔ (ان سب معاملات پر ''اسلام تاریخ میں'' کے باب میں مفصل روشنی ڈالی جائے گی) ان باتوں سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انداز مسلمانوں کی تربیت اور مستقبل میں اپنے معاملات کو چلانے کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے اختیار کیا تھا ورنہ وہ ہر موقع پر پیش آمدہ مسئلے پر وحی کے ذریعے سے رہنمائی کر سکتا تھا۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جب ایک ایسا واقعہ پیش آ جاتا جس سے حضور بہت پریشانی میں مبتلا ہو جاتے تو خاموشی اور صبر کے ساتھ ہدایت الٰہی کا انتظار فرماتے تھے۔ اس کی نہایت اہم مثال واقعہ افک کی ہے۔ اس سلسلے میں خود آنحضرت، جمہور مسلمان اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک شدید ذہنی کوفت میں گزارا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب کافی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے متعلق ایسی بات موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے تو ان کے شب و روز رونے دھونے میں گزرنے لگے۔ اس دوران میں عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کی انگیخت پر بعض لوگوں کے حلقے میں افواہوں، طعنوں اور مخالفانہ پروپیگنڈے کا زور رہا۔ منافقین کو کھل کھیلنے کا موقعہ ملا۔ بعض سادہ لوح بھی خلش کا شکار ہو گئے البتہ جمہور مسلمان خاموش لیکن سخت اذیت میں گرفتار رہے۔ انہوں نے اس معاشرتی اخلاق کا مظاہرہ کیا جس سے وہ حضور کی تربیت کے نتیجے میں متصف ہو چکے تھے۔ اس طرح کھرے سے کھوٹا ممیز ہو گیا۔ اور زیر زمین پائے جانے والے مفسد عناصر کے

مقابلے میں اس دور کی اسلامی سماج کی قوت مدافعت اظہر من الشمس ہو گئی جب کہ ابھی وہ چاروں اطراف سے دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ واقعہ ۶ھ کا ہے۔

بہر حال مسلم معاشرے کو امتحان اور آزمائش کی اس بھٹی سے گزارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کی دس آیات(۱۱:۲۰)کے ذریعے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عفت و پاکدامنی کی ضمانت اور توثیق مہیا کر دی۔ اور مسلمانوں کو ایسے ہنگامی اور غیر معمولی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ابدی اور مستقل ہدایات دے دیں۔ اگر چہ یہ ہدایت ایک معین واقعہ کے نتیجے میں دی گئیں لیکن دین اسلام کی شکل میں وحی کے ذریعے ہونے والی رہنمائی اور ہدایت کا اطلاق عمومی اور ہر دور پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان آیات کے نزول کا سبب تو ایک واقعہ تھا جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے متعلق تھا لیکن ان میں ان کا نام نہیں لیا گیا۔

وحی کی اہمیت اور اس کے نزول کی صورتیں :

مابعد الطبیعیاتی مسائل کے سلسلے میں جو عالم الغیب سے تعلق رکھتے ہیں، قرآن و حدیث میں تفہیم کا مخصوص انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان دونوں ماخذ دین میں بعض ایسی باتیں مذکور ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عالم غیب کے بعض حقائق منکشف کیے گئے تھے لیکن ایسے انکشافات کے مواقع پر آنحضرت کو مشیت خداوندی کے تحت عالم ملکوت سے الحاق کی حالت میسر آ جاتی تھی۔ لہٰذا بشر ہونے کے باوجود حضور میں ایسی استعداد پیدا کر دی جاتی تھی جس کے ذریعے سے آپ ایسے حقائق کا ادراک کر سکیں جیسے انبیاء و رسل کے قلوب کا مہبط وحی ہونے کی استعداد سے مزین ہونا یا حضور پر معراج کے موقعہ پر ان حقائق غیبی کا منکشف کیا جانا جن کا انکشاف اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ لیکن غیر نبی کی اس مقام تک رسائی ممکنات میں سے نہیں۔ اس امکان کا قرآن میں کوئی ذکر ہے اور نہ حدیث میں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور آئمہ سلف و خلف میں بھی ایسا کوئی نظریہ نہیں پایا جاتا، اس لیے ما بعد الطبیعیاتی مسائل کو جاننے کے لیے انسان کے اندر جو طلب پائی جاتی ہے اس کے پیش نظر ان مسائل کے متعلق اشارۃً اور تمثیلاً اس کے حدود و ادراک و حسیات

کے مطابق معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ حقیقت و کیفیت وحی کا ہے۔

وحی کی حقیقت کو تسلیم کروانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو ہمیشہ ہی بہت محنت کرنا پڑی۔ اسی حقیقت کو بر سر حق ماننے پر انبیاء کی نبوت پر ایمان لانے کا انحصار تھا اور پھر اسی بنیاد پر ان کی لائی ہوئی ہدایت کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا جواز وجود میں آسکتا تھا۔ قرآن میں حسب موقع و محل جابجا کبھی ایک نبی یا رسول اور کبھی یکے بعددیگرے متعدد انبیاء و رسل کی دعوتوں کا تذکرہ ہے۔ جب بھی کسی نبی یا رسول نے دعوائے نبوت کیا تو مخاطب قوم یا قبیلے کے اصحاب اقتدار اور مراعات یافتہ طبقہ نے اس کو بغیر سوچے سمجھے جھٹلانے میں تاخیر کی اور نہ کوئی ہچکچاہٹ محسوس کی۔ اور ان کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا تھا کہ نبوت کے اس مدعی کے پاس وحی قسم کی کوئی چیز نہیں آتی۔ مثلا قرآن کہتا ہے :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَۃٌ وَّلٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَکُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَکُمْ ذِکْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْکُمْ لِیُنْذِرَکُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ فَکَذَّبُوْہُ فَاَنْجَیْنٰہُ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ فِی الْفُلْکِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ ۝ (۷:۵۹۔۶۴)

ترجمہ : ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں۔ میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کے تسلط سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے ہم قومو، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے بلکہ میں تمام عالم کے رب کا رسول ہوں۔ تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمہارے

پاس تمہارے رب کی یاد دہانی تم ہی میں سے ایک شخص کے ذریعے سے آئی تاکہ وہ تمہیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے ! پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرے کے بعد سورہ الاعراف میں معنوی اعتبار سے حضرات ہود علیہ السلام صالح علیہ السلام لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی طرف سے اسی اندازے سے اپنی اپنی قوم کو اس دعوے کے ساتھ کہ اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہدایت آئی ہے، دعوت حق دینے کا اوران کے قائدین کے جھٹلانے کا تذکرہ ہے۔ طرز کلام سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ مؤخر الذکر اس بات ہی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان انبیاء حضرات کے پاس خالق والہ کائنات کی طرف سے وحی آتی ہے۔ تعلیمات کو قبول کرنا تو بعد کی بات تھی کیونکہ اگر کوئی یہ تسلیم کرلے کہ داعی کے پاس واقعتاً وحی آتی ہے تو اس کی پیش کردہ تعلیمات کی تکذیب کی منطقی طور پر کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ان تعلیمات پر غور و تدبر تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے بر سرحق ہونے کی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس لحاظ سے دین میں وحی کی اہمیت کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں۔

جہاں تک نزول وحی کی کیفیت کا تعلق ہے تو اس کے متعلق قرآن میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ کسی انسان میں رویت باری تعالیٰ کی برداشت کی استطاعت نہیں، نہ ہی وہ روبرو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا :

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۴۳:۷)

ترجمہ اور جب موسیٰ علیہ السلام آیا تاکہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو جوش طلب میں بے اختیار ہو کر پکار اٹھا پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نگاہ کر سکوں۔ حکم ہوا تو مجھے کبھی نہ دیکھ سکے گا مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ تجلی حق کی تاب لے آیا اور اپنی جگہ ٹکا رہا تو سمجھ لیجئو تجھے بھی

میرے نظارے کی تاب ہے اور تو مجھے دیکھ سکے گا پھر جب اس کے پروردگار نے نمود کی تو پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑا !جب موسیٰ ہوش میں آیا تو بولا خدایا !تیرے لیے ہر طرح کی تقدیس ہو میں اپنی جسارت سے تیرے حضور توبہ کرتا ہوں میں ان میں پہلا شخص ہوں گا جو اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۲:۵۱)

ترجمہ :اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے یا پردے کی اوٹ سے یا بھیجے کسی فرشتہ کو پس وہ وحی کر دے اس کے اذن سے جووہ چاہے۔

صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۔۔۔ خدا سے بالمشافہ کلام میں جو چیز مانع ہے وہ در حقیقت انسان کا اپنا صنف اور اس کی اپنی نااہلیت ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی عالی مقام، ایسی با عظمت اور ایسےانوار و تجلیات کا مظہر ہے کہ کوئی بشر اس سے رودر رو ہونے کی تاب نہیں لا سکتا ۔"

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اگر کسی سے خطاب کرتا ہے تو تین طریقوں سے خطاب کرتا ہے۔"ایک وحی کا طریقہ ہے وحی سے مراد دل میں بات ڈال دینے کے ہیں اس کو احادیث میں"القاء في الروح یا نفث فی الروح" سے تعبیر فرمایا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے دل پر اپنا کلام القاء فرما دیتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ چیز مجرد فکر یا خیال کی شکل میں نہیں بلکہ کلام کی شکل میں نازل ہوتی ہے جس کو نبی سنتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے اور اس کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نبیوں سے اپنے کلام کا طریقہ بتایا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو کہتے ہیں وحی مجرد فکر کی شکل میں دل پر القاء ہوتی ہے جس کو الفاظ کا جامہ پیغمبر پہناتا ہے۔"

"- - - دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ پردے کی اوٹ سے بات کرتا ہے یعنی نبی اللہ کا کلام اور اس کی آواز تو سنتا ہے لیکن اس کو دیکھتا نہیں اس کی مثل حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا کلام و خطاب ہے - - -"

"--- تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی رسول یعنی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے پیغمبر کے دل پر القاء کر دیتا ہے"۔

"یہاں صرف تین طریقے مذکور ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ جس سوال کو پیش نظر رکھ کر یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کا جواب انہی تین صورتوں کے ذکر کا مقتضی تھا۔ لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین طریقوں کے علاوہ دو اور طریقے بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنے بعض ارادوں سے آگاہ فرماتا ہے۔"

"ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ بشری شکل میں ممثل ہو کر ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کے ان واقعات میں موجود ہے جو قرآن میں تفصیل سے مذکور ہوئے ہیں۔"

"دوسرا طریقہ رؤیا کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جو کچھ مطلوب ہوتا ہے وہ رؤیا میں امر فرما دیتا ہے یا مشاہدہ کرا دیتا ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم رؤیا میں ہوا۔"

باب : ۴

منصب رسالت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل ہر قوم کی طرف رسول

وحی کی وساطت سے ہدایت من جانب اللہ کی حقیقت کی بحث کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہدایت کس ذریعے سے بنی نوع انسان تک پہنچائی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے اس مقصد کے لیے رسولوں کی بعثت کا طریقہ اختیار کیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا:

وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳:۷)

ترجمہ : اور ہر قوم کا ایک ہادی ہے

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ (۱۰:۴۷)

ترجمہ : اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۴)

ترجمہ : اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس کے اندر ایک نذیر نہ آیا ہو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ(۱۶:۳۶)

ترجمہ : اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو تو ان میں سے کچھ کو اللہ نے ہدایت بخشی اور ان میں سے ایسے بھی ہوئے جن پر ضلالت مسلط ہو کر رہی۔ تو ملک میں چلو پھرو تو دیکھو تو کیا ہوا جھٹلانے والوں کا انجام۔

اس سے قبل ہم دوسرے باب میں جو آیات نقل کر چکے ہیں مثلاً(۲:۳۸)اور (۲۰:۱۲۳) اگر انہیں ذہن میں رکھ کر مندرجہ بالا آیات پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد قوم اور ہیئت اجتماعیہ کی طرف رسولوں کے ذریعے ہدایت آتی رہی۔ اگرچہ جیسا کہ ہم اسی باب میں عرض کریں گے بعثت رسل کا یہ سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کی حکمت بھی ہم وہیں بیان کریں گے۔

ابھی جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں اللہ تعالیٰ کے فرستادگان کے لیے تین اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

ھاد، رسول اور نذیر۔

مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا نے ھاد کا ترجمہ'' راہ بتانے والا'' کیا ہے۔

تفسیر جامع القرآن فی تفسیر القرآن میں''ھاد'' کے معنی''نبی'' مخصوص یدعوھم الی الھدی بیان کیے ہیں تفسیر ''جلالین'' میں''ھاد'' کا مطلب یہ بیان ہوا ہے:'' نبی یدعوھم الی ربھم بما یعطیہ من الایات'' لغت الفرائد الدریہ میں ہادی کا ترجمہ Leader, Guideاور ہدیٰ کاTo show the right way or course toبیان ہوا ہے۔

اسی طرح رسول اور نذیر کے الفاظ جہاں بھی قرآن میں آئے ہیں ان سے تمام مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے وہ فرستادگان مراد لیے ہیں جو وحی کے ساتھ مبعوث ہوتے ہیں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے سلسلے میں تواتر علمی و فکری پایا جاتا ہے۔ دو آراء کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

رسول ہمیشہ بشر ہی ہوتا ہے

انسانوں سے اپنی ہدایت پر عمل کروانے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے امر تکوینی سے انہیں اسلام کے راستے پر چلاتا جس طرح کائنات کا سارا نظام چل رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً(۴۸:۵)

ترجمہ: اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔

اس صورت میں انسانوں کے اندر اس راستے اور رویے سے سرمو انحراف کی استعداد ہی نہ ہوتی جو ان کے لیے مقرر کر دیا جاتا لیکن ایسی مخلوق اس نے ملائیکہ کی شکل میں پیدا

کر رکھی ہے جس کے اندر حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرنے اور برائی کا مرتکب ہونے کا ملکہ ہی ودیعت نہیں کیا گیا۔ ہماری سمجھ کے مطابق تمثیلاً یہ بتایا گیا ہے کہ وہ نظام کائنات چلانے کے لیے اپنے اپنے فرائض میں مصروف ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نظم کائنات کو چلانے کے سلسلے میں معاذ اللہ ان کا محتاج ہے یا وہ اپنے امر کے نفاذ کے لیے اسباب و علل اور مادی ذرائع و وسائل کا پابند ہے۔ اگر چہ ہم اس مسئلے کی حقیقت کی کنہ تک پہنچنے کی طاقت و اہلیت ہی نہیں رکھتے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جو کام ملائیکہ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں وہ بھی اس کے امر تکوینی ہی سے ہیں۔ ملائیکہ کی طرف قرآن و حدیث میں جن امور وحوادث اور مخلوق کے اعمال قلم بند کروانے کے تذکرے ہیں، ان کا اس کو خود براہ راست علم ہوتا ہے۔

یہ صورت بھی ہو سکتی تھی کہ انسانوں کے بجائے ملائیکہ کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ لیکن اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اختیار نہیں کیا۔ یہ اس لیے کہ انسان کی زندگی اور ہدایت کے لیے یہ بات اس کی حکمت و مشیت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ ملائیکہ کو یہ فریضہ نہیں سونپتا کہ وہ انسانوں تک خود براہ راست اس کا پیغام ہدایت پہنچائیں۔ ملائیکہ ایک نوری مخلوق خدا کی عنایت کردہ اور بے پناہ قوت کے مالک ہیں۔ وہ نوعی اعتبار سے بنی نوع انسان سے بالکل مختلف ہیں اور ان سے مؤخر الذکر کا الحاق و واسطہ ان ذہنی و حسیاتی صلاحیتوں کی موجودگی میں ممکن ہی نہیں جو انسان کو عطا ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ملائیکہ کا انبیاء و رسول کی حیثیت سے ظہور خود ایک ایسا معجزہ ہوتا ہے جس کے دباؤ کے تحت انسان سے اختیار و ارادہ کی وہ خصوصیت چھن جاتی ہے جو اللہ نے اس کو عطا کر کے اسے ملائیکہ سے ممیز کیا تھا اور افکار و اعمال کے سلسلے میں جوابدہی کا ذمہ دار بنایا تھا۔ اس صورت میں انسان کے لیے ملائیکہ انبیاء کی فراہم کردہ ہدایت سے روگردانی کرنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ نیز وہ تبھی ان کے بنائے ہوئے اعمال خیر انجام دے سکتے تھے جب وہ ملائیکہ کی مماثل ہو جاتے۔ ہم نے ''اسلامی فکر'' کے باب میں مختلف مباحث کے سلسلے میں قرآن سے جو حوالہ جات دیئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بات خالق کائنات وانس کو مطلوب نہ تھی۔

اسی لیے فرمایا:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا(۱۷:۹۴-۹۵)

ترجمہ : اور ان لوگوں کو ایمان لانے سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی نہیں مانع ہوئی مگر یہ چیز کہ انہوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجا۔ کہہ دو، اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر اتارتے۔

ان آیات سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی بات کی متقاضی تھی کہ جو نوع مخلوق اس نے اس کرۂ ارض پر بسا رکھی ہے، انہی میں سے بعض لوگوں کو رسالت کے منصب پر فائز کیا جائے اور انہیں ایک منتخب فرشتے کے ذریعے پیغام حق وحی کیا جائے۔

اسی لیے تمام انبیاء ورسل نوع انسانی ہی سے تعلق رکھتے رہے ہیں البتہ اللہ تعالیٰ بوقت نزول وحی ان حضرات کے اندر ملائکہ سے الحاق کی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ علامہ عبد الرحمان ابن خلدون(۷۳۲ھ تا۸۰۸ھ)اپنی مشہور عالم تصنیف ''مقدمہ'' میں''حقیقت نبوت'' کے عنوان کے تحت انبیاء ورسل کے قلوب پر وحی کی مختلف صورتوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''دیکھئے، وحی کی ہر حالت میں، خواہ کسی قسم کی وحی کیوں نہ ہو، دشواری اور سختی ضرور پائی جاتی تھی جس کی طرف قرآن پاک نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا(۷۳:۵)یعنی عقریب ہم آپ پر ایک بھاری قول، قرآن پاک اتاریں گے یعنی اس کے اترتے وقت آپ سختی محسوس کریں گے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی اترتےوقت تکلیف محسوس فرمایا کرتے تھے اور انتہائی ٹھنڈے دن میں بھی وحی کھل جانے پر آپ کی جبین مبارک پسینے سے شرابور ہو جایا کرتی تھی۔ اس لیے آپ پر غشی کی سی حالت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اور خراٹے نکلنے لگتے تھے''۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی میں جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں بشریت سے جدا ہو کر عالم ملوکیت کی طرف چڑھنا پڑتا ہے۔ پھر جب کلام ربانی کا فیضان ہوتا ہے تو ایک ذات سے دوسری ذات کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے۔ اس انتقال سے طبائع انبیاء سختی و دشواری محسوس فرماتی ہیں۔'' (ترجمہ مقدمہ حصہ اول از مولانا راغب رحمانی دہلوی صفحہ ۳ – ۳۰۱)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نوعی اعتبار سے ملائیکہ اور انسانوں میں بے تکلف ربط و الحاق ممکن نہیں اور اس لحاظ سے اول الذکر عام انسانوں تک ہدایت الٰہی پہنچانے کے لیے وہ فرائض و کردار ادا نہیں کر سکتے جو نوع انسانی سے تعلق رکھنے والے انبیاء و رسل ادا کرتے رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل بعض مواقع پر عرض کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ وہ انسان کو شعور و ارادہ اور تمیز خیر و شر سے نوازے اور اپنی عقل و خرد کی بنیاد پر جہاں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے میں آزاد ہو وہیں اللہ تعالیٰ کو الہ اور قادر مطلق تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں بھی اپنی مرضی کا راستہ چن سکے۔ اسی طرح وہ چاہے تو اپنی انفرادی زندگی کو اللہ کے بتائے ہوئے ڈھب کے مطابق گزارے اور چاہے تو اس سے انحراف کرے۔ دیکھئے آیات (۲۹:۱۸)اور(۱۰۸:۱۰)جن کا حوالہ اسلامی فکر کے باب میں دیا جا چکا ہے۔

پھر وہ اس بات میں بھی حق انتخاب رکھتا ہے کہ اس تمدن و نظام اجتماعی کو اپنائے جو اللہ کا دین دیتا ہے یا اس دائرے میں کافرانہ اور منافی عدل طریقے پر چل کھڑا ہو۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے اس جہان فانی میں اس کی نوع سے تعلق رکھنے والے بعض برگزیدہ انسانوں کا انتخاب کر کے اللہ تعالیٰ ان سب معاملات کے سلسلے میں اپنا پیغام ہدایت اس تاکید کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اسے لازماً اپنایا جائے لیکن اس میں جبر سے کام نہیں لیتا۔ البتہ اس ارضی زندگی کو چھوڑنے کے بعد جہان آخرت میں انسان پوری طرح جوابدہی کا پابند ہے۔ اور اس آزادی واختیار کو صحیح یا غلط طور پر استعمال کرنے کے نتائج سے اسے دوچار ہونا ہو گا۔

ہر نبی اور رسول پر اللہ تعالیٰ نے یہ فریضہ عاید کیا کہ وہ اپنی تمام بشری خصوصیات کے باوجود اسوۂ حسنہ کا اظہار کرتے ہوئے وہی اصول اپنی ذات پر نافذ کرے جن کی تبلیغ واشاعت کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا انسانوں کے لیے یہ بات تبھی مؤثر ہو سکتی ہے اگر وہ انہی کی نوع سے تعلق رکھتا ہو۔ پیغمبر کے ملائیکہ میں سے ہونے کی صورت میں تو وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ اس فرشتے کے لیے تو اپنی توانائیوں کی بنا پر عمل بالوحی آسان ہے لیکن انسان ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے تو وحی کے ذریعے سے دیئے ہوئے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونا محال ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کے لیے انسانوں ہی کو منتخب کیا جو اپنی پیدائش، نشونما، صحت و بیماری، کھانے پینے، رہنے سہنے، ازدواجی زندگی بسر کرنے، اکتساب رزق کی سرگرمیاں ہونے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور بالآخر موت کی آغوش میں چلے جانے کے معاملے میں دوسرے لوگوں کی طرح ہی ہوتے تھے۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ (۱۳:۳۸)

ترجمہ : اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا فرمائیں۔

کافروں کے اعتراضات کا تذکرہ کرتے ہوئے پھر ارشاد ہوا ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ (۲۵:۷)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کیا بات ہے اس رسول کی کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مخاطبین انسان ہی سمجھتے تھے، اور ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس بات کو طعنے اور اعتراض کی بنیاد بناتے تھے کہ بشری حیثیت سے ہمسری کے باوجود یہ شخص رسالت کے دعوے کی بنا پر اپنی برتری منوانا چاہتا ہے۔

البتہ انبیاء ورسل کی برتری کی علامتیں یہ ہوتی تھیں، کہ وہ راست بازی، تقویٰ اور جملہ اخلاقی محاسن کے اعتبار سے جہاں مقام علیا پر فائز ہوتے تھے وہیں خدا کی طرف سے سونپی ہوئی پیغمبرانہ ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرنے میں اپنے شب و روز بسر کرتے اور اللہ

کی طرف سے مقرر کردہ مقصد ہدف حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے اور ان تمام اوصاف حمیدہ میں کوئی بھی ان کا ہمسر دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ان سب حقائق سے انسان کی ذہنی و قلبی بصیرت یہ رہنمائی دینے کے لیے کفایت کرتی ہے کہ رسالت کا ادارہ بھی گویا تخلیق انسان کے عمل کا ایک لازمی حصہ ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل ''وحی'' کے عنوان کے تحت عرض کر چکے ہیں، یہ بات باعث حیرت ہوتی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی کائنات کے ایک حصے میں بسا دیتا جس کی ماہیت و حقیقت سے وہ بے خبر ہوتا اور نہ وہ اپنے انجام و آغاز ہی سے واقف ہوتا لیکن اسے یہ نہ بتاتا کہ تمہاری حیثیت کیا ہے اور تمہیں اس اجنبی مستقر میں زندگی گزارنے کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور یہ کہ تمہارے اندر نیکی اور برائی کے جو رجحانات پائے جاتے ہیں ان کے استعمال میں تمہیں کیا طرز عمل اپنانا چاہیے۔

انسان اپنے چاروں طرف عمل تخلیق و فنا کا تسلسل دیکھتا ہے اور یہ سب کچھ ایک نظم اور واضح قواعد کے تحت ہوتا ہے۔ ایک دور تھا کہ انسان اپنے مشاہدے میں آنے والے نظام شمسی کی فضائے آسمانی پر نظر ڈال کر حیرت زدہ ہوتا اور خالق کائنات کی قدرت سے مرعوب ہو تا تھا۔ لیکن دور حاضر میں جب کہ ایسے متعدد نظام ہائے شمسی کے انکشافات ہو رہے ہیں اور انسان خلاء کی پہنائیوں میں بھی سفر کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے اس مرعوبیت میں اضافے کا مزید سامان فراہم ہو گیا ہے۔ سابقہ ادوار میں انسان اس کائنات کی وسعت کا وہ تصور نہ رکھتا تھا جو آج کا انسان رکھتا ہے۔ اور اس بات کا احساس اس کے اندر شدت اختیار کر گیا ہے کہ وہ جس کرۂ ارض پر آباد ہے، اس کائنات کے اجرام میں اس کی حیثیت صحرا میں ایک ذرہ ریت کے برابر یا سمندر میں ایک قطرۂ آب کے برابر بھی نہیں۔ کہکشاؤں کا سلسلہ ایسا وسیع ہے، جس کا احاطہ نوری سالوں سے پیمائش کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ماہرین فلکیات کے حلقے میں یہ نظریہ بھی گردش کر رہا ہے کہ تخلیقی عمل اس تیز رفتاری سے جاری ہے۔ یہ کائنات ہر طرف رفتار روشنی سے زیادہ تیز رفتاری سے پھیل رہی ہے۔ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ ہر عمل اور واقعہ کسی علت، سبب اور محرک کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایسے نظریات سے اتفاق کرنے والے کیسے اس بات سے

انکار کر سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے اس ہستی کا دست قدرت کام نہیں کر رہا جس کے خالق و مدبر کائنات ہونے کا تصور اسلام دیتا ہے۔ کیا یہ سارا کام جس کا سطور بالا میں تذکرہ ہوا، از خود ہو سکتا ہے یا اس سے کم تر ہستی اس کو انجام دے سکتی ہے؟ قرآن اللہ تعالیٰ کے متعلق کہتا ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ (۲۹:۵۵)

ترجمہ: وہ ہر(کائناتی) دن کے دوران سرگرم عمل ہے۔

اس قدر حیرت انگیز طور پر وسیع و عریض کائنات میں ایک چھوٹے سے کرے پر آباد نہایت محدود علم و فہم اور نہایت قلیل زندگی رکھنے والے ایک مسافر یعنی انسان کے لیے ، رسالت کا ادارہ قائم کر کے اس کائنات کے مالک خالق اور مدبر کا صراط مستقیم کی نشاندہی کر دینا بالکل مطابق عقل و منطق بات ہے۔

لیکن بنی نوع انسان کو اس صراط مستقیم پر چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جبر سے کام نہیں لیا، بلکہ اس کے پیغمبروں نے جنہیں اللہ کی ہدایت اپنے مخاطبین تک پہنچانے اور اس کے اصولوں کو نافذ کرنے کی سعی و جہد کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، اپنے فرائض منصبی کو اس عالم دنیا کے قانون اسباب و مسببات کے تحت انجام دیا۔ اس سلسلے میں قرآن نے متعدد انبیاء ورسل کی جانفشانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہیں ادائیگی فرض کے لیے اپنی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، جن کی جدوجہد کے واقعات پوری صحت کے ساتھ ہمارے علم میں ہیں اور جنہوں نے اپنی دعوت کو تمام مراحل سے گزار کر پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اشاعت ونفاذدین کے لیے اسی نوعیت کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن کا سامنا ہر نئے نظریہ زندگی کو پیش کرنے والے داعی کو کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ کمیت کے اعتبار سے فکری و عملی سطحوں پر آپ کا دائرہ کار جس قدر ہمہ جہتی اور وسیع تھا اسی نسبت سے آپ کو زیادہ دقتوں سے واسطہ پڑا۔ آپ کو اپنے نظریات کی وضاحت اسی طرح کرنا پڑی جس انداز سے دوسرے لوگ افہام و تفہیم کے لیے کرتے ہیں۔ اپنے مخالفین سے اسی طرح نبرد آزما ہونا پڑا جس طرح دوسروں کو ہونا پڑتا ہے۔ آپ کو اپنے مخاطبین کے سامنے اپنے فکر کی تائید میں استدلال سے بھی کام لینا پڑا اور اعدائے دین نے جب تشدد کے

ذریعے آپ کا راستہ روکنے پر اصرار کیا تو آپ کو میدان جنگ میں بھی اترنا پڑا جس کے لیے مادی استطاعت کے مطابق آپ کو معروف طریق پر تیاری کرنا ہوتی تھی۔ ان غزوات میں حضور نے مافوق الفطرت ذرائع سے دشمن پر غلبہ حاصل نہیں کیا جس سے آپ کے عزم و ہمت اور شجاعت اولوالعزمی کا موقع فراہم ہوا۔ آپ کو بدر کا معرکہ بھی پیش آیا جس کے ذریعے سے سامان حرب اور دوسرے ذرائع و وسائل کی شدید قلت کے باوجود قوت ایمانی نے واضح مظاہرہ کیا۔ آپ کو غزوہ احد کے واقعات سے واسطہ پڑا جس میں آپ کے چند رفقاء کے نظم و ضبط سے روگردانی کرنے پر واضح فتح شکست میں تبدیل ہو گئی اور حضور کو اسی طرح زخم برداشت کرنے پڑے جیسے دوسرے لوگوں کو۔ اگر حضور مافوق البشر ہوتے تو آپ کا دفاع ملائیکہ کرتے اور دشمن کے آلات آپ کے جسد مطہر کو کوئی گزند نہ پہنچا سکتے۔ آنحضرت کا دفاع صحابہ رضی اللہ عنہ نے اپنی جانوں کی قربانی پر آمادگی سے کیا اور اسلام اور آپ کے عشق سے مزین آپ ہی کے تربیت یافتہ صحابہ رضی اللہ عنہ نے پتھر اور ریت قسم کی بے جان مادی اشیاء کے ذریعے سے مورچہ بندی کرنے کے بجائے اپنے جسموں کے حصار کی اوٹ میں آپ کو لے لیا۔ لیکن اس کے باوجود حضور زخمی ہو گئے اور اس طرح ان زخموں کی اذیت برداشت کی جس طرح دوسروں نے برداشت کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زخموں کی وجہ سے ہونے والی تکلیف سے مبرا نہیں کیا۔ جنگ خندق میں آپ اسی طرح قلت غذا کی وجہ سے فاقہ کی تکلیف برداشت کرتے ہیں جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہ نے یہ تکلیف اٹھائی۔ لیکن حضور کا صبر و تحمل مؤخر الذکر کے مقابلے میں نہایت نمایاں تھا۔ پھر حضور نے کھدائی کے آلات اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے جانثاروں کے ساتھ خندق کی کھدائی کا خود بھی کام کیا۔ اسی طرح حدیبیہ، فتح مکہ ، حنین اور تبوک کی مہموں میں آپ نے سیرت و کردار، نبوی بصیرت اور بہت سے دوسرے اخلاقی محاسن ہمیشہ کے لیے امت کی رہنمائی کے لیے ظہور میں آئے، تاریخ عالم میں اس کی مثل نہیں ملتی۔ بہرحال ان واقعات کا تفصیلی تذکرہ متعلقہ ابواب میں آئے گا۔ ہم یہاں صرف یہ عرض کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقامت دین کا کام خوارق کے سہارے نہیں کیا بلکہ اس عالم علل و معلولات کے قوانین قدرت کے تحت ہی کیا اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی ساری زندگی کے دوران اپنے پیش کردہ

اخلاقی ضابطوں کو آپ نے ہر قسم کے حالات میں ملحوظ رکھا اور یہ منصب رسالت کی ایک نمایاں خوبی ہے جس سے انبیاء و رسل مزین تھے۔

رسولوں کی امتیازی خصوصیات

مندرجہ ذیل سطور میں ہم انبیاء ورسل کی سیرتوں کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ اس موضوع کا احاطہ کرنے کا ہمیں قطعاً کوئی دعویٰ نہیں۔ رسول کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کو کسی سربراہ حکومت یا عام فہم انداز میں کسی قومی قائد یا سیاسی لیڈر سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی، نہ اسے محض مصلح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان سب لوگوں کے مشاغل، دلچسپیاں اور ان سے لوگوں کی توقعات کسی ایک آدھ گوشہ زندگی تک محدود ہوتی ہیں۔ اس کے بر عکس رسول، نبی یا پیغمبر انسانی فکر اور زندگی کے جملہ شعبوں میں مکمل انقلاب برپا کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کا سب سے اہم اور پہلا فریضہ اپنے مخاطبین کو توحید کا صحیح تصور دینا ہوتا ہے۔ قرآن میں جتنے انبیاء کا ذکر ہے ان کی تبلیغ و دعوت کا نکتہ آغاز ہمیشہ خدا کی وحدانیت کا تصور دینا ہی رہا ہے۔ اس کے ساتھ وہ مثبت طور پر اعلیٰ اخلاق پیدا کرتے اور منفی سطح پر برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سبھی کام عام طور پر رسول کی بعثت سے قبل پائے جانے والے کافرانہ نظام فکر و عمل کے تحت فروغ پانے والے معاشرے کے قائدین و عوام کے عقائد اور رویے کے خلاف ہوتے ہیں۔ اسی لیے اول الذکر کی دعوت مؤخر الذکر عناصر کے غضب کو بھڑکا دیتی ہے ، لیکن قومی قائدین عام طور پر اپنے خیالات کو عوامی رجحان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ عوامی تائید حاصل ہو۔ لیکن انبیاء و رسل میں مندرجہ ذیل خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں

ا۔رسول کی زندگی قبل از بعثت

رسول دعوائے نبوت سے پہلے بھی اونچے کردار کا مالک ہوتا ہے۔ لوگ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ وہ ذاتی حیثیت سے معروف اخلاقی صفات سے متصف ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔ قابل اعتماد ہوتا ہے۔ کسی سے برائی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس کا مزاج معتدل ہوتا ہے، اس لیے اس کی کوئی حرکت کسی کو ناگوار

نہیں گزرتی۔ البتہ بعثت اور نزول وحی سے قبل وہ دین و شریعت کے اصولوں سے واقف نہیں ہوتا، نہ ہی وہ کسی خاص فلسفہ زندگی کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی بھلائیاں اس کی ذات تک محدود ہوتی ہیں۔ لیکن جونہی منصب رسالت پر فائز ہو جاتا ہے تو اللہ کے دین کے اصولوں کی اشاعت کا فریضہ اس پر عائد ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جب وہ منفی طور پر معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں سے لوگوں کو روکتا ہے اور اپنے دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی لوگوں کو دعوت دیتا ہے تو لوگ اس کی اس حرکت پر حیرانگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا رد عمل کچھ اس طرح کا ہوتا ہے یہ شخص حسن اخلاق سے مزین تھا، اب اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ(نعوذ باللہ) الٹی سیدھی اور عجیب و غریب باتیں کرنے لگا ہے جو ہمارے اچنبھے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ وہی باتیں کرے جو ہمارے لیے باعث پسندیدگی ہوں۔ چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے :

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۝ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ(۱۰:۱۵۔۱۶)

ترجمہ : اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو۔ کہہ دو کہ مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو نہ میں اس کو تمہیں سناتا اور نہ وہ اس سے تمہیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

ان دو آیات میں کفار و مشرکین کی اس خواہش کی نشاندہی کی گئی ہے کہ قرآن ہمارے معتقدات اور ہوا و ہوس کے مطابق ہونا چاہیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ حضور سے انہیں یہ

کہلواتا ہے میں تم لوگوں میں (چالیس سالہ) زندگی گزار چکا ہوں۔ مطلب یہ کہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو اور اس دوران تم مجھے امین کہتے رہے۔ مجھے اپنے اختلافات کے سلسلے میں حکم بناتے رہے۔ میری صداقت مسلمہ حیثیت رکھتی ہے، میں ہر قسم کے اخلاق حسنہ سے مزین رہا۔ اب کیا میری یہ سب خصوصیات بدل گئیں اور میں جو قرآن اللہ کی طرف سے لایا ہوں اسے تم مختلف قسم کی کٹھ حجتیاں کر کے اس کا اللہ کی طرف سے میری طرف نازل ہونا تسلیم نہیں کرتے۔

یہاں ہم یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ نبی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی حیات قبل از بعثت کے اعلیٰ اخلاقی محاسن کے حامل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ بھی تسلیم کرتا ہے اور جن لوگوں میں اس نے زندگی بسر کی ہوتی ہے وہ بھی اسے نہیں جھٹلاتے۔

آنحضرت سے قبل جو انبیاء گزرے ہیں ان پر بھی یہ بات چسپاں ہوتی ہے۔ مثلاً جب قوم ثمود کو حضرت صالحعلیہ السلام نے دعوت توحید دی تو انہوں نے جو کچھ کہا، قرآن اسےیوں بیان کرتا ہے :

قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ ھٰذَآ اَتَنْھٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۶۲:۱۱)

ترجمہ : وہ بولے کہ صالح اس سے پہلے تو ہمارے اندر تم بڑی امیدوں کے مرکز تھے۔ کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے!

وہی بات کہ جب تک دین کی اساسات کا اعلان نہیں کیا تھا اور صرف نبی کا حسن اخلاق ان کے سامنے تھا تو وہ اس کے محاسن کا اعتراف کرتے تھے۔ ہم اس موقع پر یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء ورسل قبل از بعثت بھی معروف حسن اخلاق سے آراستہ ہوتے رہے ہیں اور ان کی اپنی اپنی قوم ان کی یہ خصوصیت تسلیم کرتی رہی ہے۔ البتہ قبل از نزول وحی یہ حضرات علیہ السلام دین و شریعت سے واقف نہیں ہوتے۔ چنانچہ سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی(۷:۹۳)

ترجمہ: (کیا اس نے تجھے) جویائے راہ پایا تو راہ نہ دکھائی؟

مولانا محمود الحسن نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:''اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی ''

اس ترجمے پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے حاشیہ پر جو نوٹ لکھا ہے وہ یہ ہے ''جب حضرت جوان ہوئے تو قوم کے مشرکانہ اطوار اور بے ہودہ رسم و راہ سے سخت بے زار تھے اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ زور کے ساتھ موجزن تھا۔ عشق الٰہی کی آگ سینہ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ وصول الی اللہ اور ہدایت خلق کی اس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفس قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا اندر ہی اندر جوش مارتا تھا۔ لیکن کوئی صاف کھلا ہوا اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا جس سے اس عرش و کرسی سے زیادہ وسیع قلب کو تسکین ہوتی۔ اسی جوش طلب اور فرط محبت میں آپ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جاکر مالک کو یاد کرتے۔ اور محبوب حقیقی کو پکارتے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے غار حرا میں فرشتے کو وحی دے کر بھیجا اور وصول الی اللہ اور اصلاح خلق کی تفصیلی راہیں اس پر کھول دیں یعنی دین حق نازل فرمایا '' وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ (۵۲:۴۲)

یہاں ضالاً کے معنی کرتے وقت سورہ''یوسف'' کی آیت'' قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِىْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (۹۵:۱۲)کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔''

مولانا ثناء اللہ(امرتسری)نے اس آیت کا یہ ترجمہ لکھا ہے:''(دینی مسائل کی تفصیل سے) بے خبر پایا تو رہنمائی کی''

پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اپنی'' تفسیر ضیاء القرآن'' میں اس آیت کے یہ معنی بیان کئے ہیں ''اور آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔'' پیر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے علمائے تفسیر کے جو اقوال لکھے ہیں ان میں پہلا یہ ہے: ''ضلالت'' کا لفظ غفلت کے بمعنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى۔

(۵۲:۲۰)لا یغفل میرا رب کسی چیز سے غافل ہوتا ہے اور نہ کسی چیز کو فراموش کرتا ہے۔ مذکورہ آیت میں ضالاً بمعنی غافل مستعمل ہوا ہے۔ یعنی آپ قرآن اور احکام شرعیہ کو پہلے نہیں جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کا علم بھی بخشا اور احکام شرعیہ کی تفصیلات سے بھی آگاہ فرمایا۔ ای لم تکن تدری القرآن والشرائع فهداك الله الی القرآن وشرائع الاسلام۔ ضحاک، شہر بن حوشب وغیرھما سے یہ قول منقول ہے (قرطبیؒ)"

تفسیر جلالین میں لکھا ہے ووجدک ضالا عما انت علیه الآن من الشریعته فهدی ای هداک

ہم نے آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ "تدبر قرآن" سے نقل کیا ہے۔ اس میں اس آیت کی جو تفسیر کی گئی ہے وہ بھی ہم ناظرین کے استفادے کے لیے نقل کیے دیتے ہیں، اگرچہ یہ طوالت کا باعث ہو گی۔

"یہ اس روحانی انعام کا بیان ہے جو آپ پر بعد کے دور میں ہوا۔"

"یہ معلوم ہے کہ آپ کو جو رسوم و روایات خاندان کے بزرگوں سے وراثت میں ملیں ان پر آپ کی سلیم فطرت ایک لمحہ کے لیے بھی مطمئن نہ ہو سکی اور دوسری کوئی ایسی روشنی تھی نہیں جو آپ کے لئے سرمایہ تسکین بن سکتی۔ آسمانی مذاہب کے پیرو جو آپ کے گردو پیش تھے ان کا حال البقرہ، آل عمران اور دوسری مدنی سورتوں سے واضح ہو چکا ہے کہ ان کے عقائد و اعمال اس قدر مسخ ہو چکے تھے کہ کوئی جویائے حقیقت ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں آپ کو ایک شدید قسم کی ذہنی کشمش میں ڈال دیا تھا۔ آپ کی اس کشمکش کو یہاں ووجدک ضالا کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ضال یہاں گمراہ کے معنی میں نہیں بلکہ جویائے راہ کے معنی میں ہے حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں وہ زندگی کے ابتدائی دور میں فطرت کی بدیہات سے کبھی منحرف نہیں ہوتے لیکن فطرت صرف عقائد و اعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ تمام عقائد اور ان کے سارے تضمنات ولوازم کی نہ وہ تشریح کر سکتی ہے اور نہ تمام اعمال و اخلاق کی صحیح صحیح حد بندی اس کے بس میں ہے۔ اس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج ہی رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر

اس کا دل گواہی دے رہا ہے اس کی صفات اور ان صفات کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں؟ اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں؟ زندگی کی ایسی ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری اپنے بعید ترین گوشوں میں بھی خالق کی پسند کے مطابق ہو جائے۔ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں اس وقت تک نہ انسان کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے اور نہ رب کے ساتھ اس کا تعلق ہی استوار ہو سکتا۔ یہی سوالات ہیں جو پوری شدت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر زندگی کے اس دور میں مستولی تھے جس کی طرف ووجدک ضالا کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت نہ ضلالت کی ہے اور نہ اس کو ہدایت سے تعبیر کر سکتے بلکہ صحیح الفاظ میں یہ جستجوئے راہ کی سرگردانی ہے۔ گویا ایک شخص چوراہے پر کھڑا ہو اور فیصلہ نہ کرپا رہا ہو کہ کس سمت میں قدم بڑھائے۔ بعثت سے پہلے غار حرا کی تنہائیوں میں آپ انہیں گتھیوں کو سلجھانے میں گم رہے"۔

مندرجہ بالا وضاحتوں سے جو مختلف مفسرین نے کی ہیں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نزول وحی سے قبل کے دور زندگی میں رسول گمراہی میں مبتلا نہیں ہو تا بلکہ اس کے دل میں صحیح راہ حیات پانے کی خواہش موجزن ہوتی ہے۔ اس مرحلہ حیات کے دوران اس کا معاشرہ بھی اسے خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

۲ -رسالت وہبی منصب ہے نہ کہ اکتسابی

منصب رسالت طلب کرنے سے عطا ہوتا ہے اور نہ یہ کسی قسم کی سعی و جہد سے ملتا ہے۔ جس کو یہ حاصل ہوتا ہے اس کو خود قبل از وقت خبر نہیں ہوتی کہ اسے اس پر فائق کیا جائے گا۔ جس کو اللہ تعالیٰ چاہے اسے ہی یہ مرتبہ عنایت کرتا ہے۔ لیکن یہ چیز یقینی ہے کہ رسالت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب کرتا ہے اور اس حکمت کے مضمنات کا علم اس کے اپنے سوا کسی کو نہیں ہو تا۔ چنانچہ وہ قرآن میں فرماتا ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۲:۱۶)

ترجمہ : وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس غرض سے چن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتے الروح کے ساتھ اس پر بھیجے (یعنی وحی کے ساتھ بھیجے) اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس مجھ سے ڈرو(اور انکار و بد عملی سے باز آ جاؤ)

اس آیت کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر" ترجمان القرآن" سے لیا گیا ہے۔ وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں۔ "قرآن نے جابجا وحی الٰہی کو"الروح" سے تعبیر کیا ہے یہاں آیت میں بھی"الروح" سے مقصود وحی ہے، اور ظاہر ہے کہ وحی کے لیے اس سے بہتر تعبیر نہیں ہو سکتی۔ وہ نظر نہیں آتی، لیکن جس جسم پر اترتی ہے وہ اس سے معمور ہو جاتا ہے، اور اس کے اندر سے اس کی صدائیں اٹھنے لگتی ہیں۔ نیز اس اعتبار سے بھی وہ الروح ہے کہ انسانی سعادت کی زندگی اسی سے قائم ہے۔

صاحب "تدبر قرآن" اسی آیت کی وضاحت کے سلسلے میں لکھتے ہیں "روح سے مراد وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کو روح سے اس لیے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے اس طرح روح و دل کی زندگی وحی الٰہی سے ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ انسان روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔"

یہ بھی فرمایا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ (۶:۱۲۴)اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنا منصب رسالت کس کو بخشے

اسی طرح قرآن میں مختلف سیاق و سباق میں اور دینی اصولوں پر زور دینے کے لیے بہت سے مواقع پر یہ کہا گیا ہے کہ رسالت کے لیے اپنے بندوں میں سے اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت جس کو چاہتا ہے انتخاب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ مرتبہ وہبی ہے۔ اس میں کسی قسم کی اکتسابی سرگرمیوں کو کوئی دخل حاصل نہیں۔

۳۔رسول خود بھی دین کا متبع ہوتا ہے

رسول کا صرف یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ فرشتے کے ذریعے سے اللہ کے دین کی تعلیمات وصول کر کے لوگوں کو سنائے اور بس بلکہ اگر تعصّبات اور ہٹ دھرمی کے پردے ہٹا کر معروضی انداز سے سوچا جائے کہ رسالت کے منصب کے ساتھ جس قدر وسیع ذمہ داریاں وابستہ ہیں اور جنہیں وہ اس دنیا کے حالات کے تحت سرانجام دیتا ہے وہ کسی منصب سے متعلق نہیں ہوتیں۔ ان ذمہ داریوں کی تفصیل تو حضور کے اسوہ حسنہ سے تعلق رکھنے والے باب میں عرض کی جائے گی البتہ ہم یہاں یہ عرض کئے دیتے ہیں کہ حضور کی بعثت کے ابتدائی دور ہی میں سورۃ المزمل میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فرمایا دیا تھا کہ:

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳:۵)

ترجمہ: ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔

یہ بھاری بات کیا تھی؟ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق منصب رسالت سے متعلق بھاری ذمہ داریوں اور فرائض ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس بات کو رسول کے فرائض کے کسی ایک شعبے تک محدود کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ حضور نے دعوت دین کے سلسلے میں جتنے کام بھی کئے ہیں قولا ثقیلا کے مفہوم میں شامل ہیں اور مشکلات و مصائب اور قربانیاں بھی ان کاموں ہی میں شمار ہوں گی جو آپ نے دعوت دین کے سلسلے میں برداشت کیں۔ اس سے ناگزیر طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حضور نے وہ سبھی فرائض انجام دیئے جن کا کلام الٰہی میں حکم دیا گیا تھا۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے جو طویل ہے لیکن ہم اس کا وہ حصہ درج کرتے ہیں جو حضور کے کردار کو قرآن کے مطابق ثابت کرتا ہے :

وعن سعيد بن ہشام قال انطلقت الى عائشة فقلت يا ام المومنين انبئني عن خلق رسول الله صلى عليه وسلم قال الست تقراء القرآن قلت بلى قالت فان خلق نبى صلى الله عليه وسلم كان القرآن

ترجمہ : اور(حضرت) سعد بن ہشام رضی‌اللہ‌عنہ‌راوی ہیں کہ میں (حضرت) عائشہ رضی‌اللہ‌عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا"ام المومنین مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کے متعلق بتایئے۔" انہوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا حضرت عائشہ رضی‌اللہ‌عنہانے فرمایا۔"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن ہی (کے مطابق) تھا۔"

قرآن حضور کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۴:۶۸)

ترجمہ : اور تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو۔

ایک اور جگہ قرآن حضور کی زبان سے یہ کہلواتا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ (۷:۲۰۳)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو میں تو بس اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

اس اتباع وحی ہی کے ذریعے سے حضور کے اندر وہ خلق اور اعلیٰ ترین سیرت و کردار کے اوصاف پیدا ہوئے جن کی گواہی قرآن اور خود اللہ تعالیٰ دے رہا ہے۔ تاریخ انسانی اور دور حاضر کے تجربات بتاتے ہیں کہ نرے زبانی کلامی دعاوی اور خوبصورت نصائح سننے والوں پر کوئی اثر نہیں کرتے جب تک ناصحین خود ان پر عمل پیرا نہ ہوں۔ انبیاء ورسل کی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اور جس دین کو پیش کرتے رہے اس پر مکمل طور پر اور پورے خلوص کے ساتھ ایمان بھی‌لاتے رہے اور تندہی کے ساتھ عمل بھی کرتے رہے۔ قرآن کہتا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ (۲:۲۸۵)

ترجمہ : رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اورمومنین ایمان لائے۔

یہی وجہ تھی کہ حضور صحابہ کی ایک ایسی جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کی اعلیٰ اخلاقی اور عمدہ سیرتوں اور اپنے دین کے اصولوں سے گہری وابستگی کی اور کہیں

کسی معاشرے میں مثال نہیں ملتی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بالوضاحت یہ کہہ دیا کہ رسول کا کردار امت مسلمہ کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی چیز اللہ کی خوشنودی کے حصول اور فلاح اخروی کا باعث ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (۲۱:۳۳)

ترجمہ : اور تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ اس کے لیےجو اللہ کی ملاقات اور روز آخرت کی توقع رکھتے ہیں، اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔

غیر مبہم اور واضح الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا یہ الٰہی حکم اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حضور خود اللہ کے دین کے مثالی متبع تھے۔ آپ کی سیرت میں اللہ کے نازل کردہ دین کے اصول ملکہ راسخہ کے طور پر سمو چکے تھے، لہٰذا وہ معصوم عن الخطا تھے۔

۴۔ رسول ہی تبیین وحی کرتا ہے

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۴۴:۱۶)

ترجمہ : اور ہم نے تم پر قرآن اتارا تا کہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تا کہ وہ غور کریں۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی ہدایت دی:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (۶۷:۵)

ترجمہ: اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔

ان دونوں آیات سے دین کی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے متعلق رسول کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے۔ پہلی آیت میں تبیین یعنی جملہ پہلوؤں سے وضاحت کرنے کی ہدایت ہے۔ یہ وضاحت دو طریق سے ہوئی ہے۔ ایک طریقہ قولی ہے اور دوسرا علمی۔ اس طریقہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطریق احسن ادا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل دونوں کے لیے حدیث اور سنت کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ حدیث و سنت کے متعلق مفصل گفتگو تو اسی عنوان کے تحت ایک الگ باب میں ہو گی، البتہ ہم یہاں یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ دین کے اصولہائے مہمہ کے سلسلے میں تمام وضاحتی حدیثیں متواتر روایات اور عمل سے ہم تک پہنچیں اور ثقاہت اور سند کے اعتبار سے پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔ گزشتہ چودہ صدیوں سے مسلمان انہیں قولاً اور فعلاً نسل در نسل منتقل کرتے آئے ہیں۔ قرآن میں بہت سے شعبوں مثلاً عبادات جیسے نماز، روزہ، حج و غیرہ سیاسی نظام مثلاً شورائیت اولی الامر کا مقام اور حقوق شہریت، معاشی مسئلہ مثلاً زکواۃ صدقات، خیرات اور حقوق العباد کے سلسلے میں مالی ہدایت۔ جہاد اور علمی شعبے میں اجتہاد جیسے مسائل کے متعلق احکامات اور اصولی ہدایات دی گئی ہیں لیکن ان کی تفصیلات نہیں بتائی گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شارع کی حیثیت سے ان سب احکامات کو زیر عمل لانے کے طریقے بتائے۔ اور بتایا ہی نہیں بلکہ ان کا نفاذ کر کے امت کے لیے ان پر عمل پیرا ہونے کے ڈھب کی پوری تصویر کشی کر دی۔ اس طرح بہت سے معاشرتی مسائل جن کا تعلق ازدواجی زندگی، آداب مجلس، اخلاقیات اور تبلیغ دین جیسے معاملات سے ہے۔ ان کے متعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قول و فعل کے ذریعے رہنمائی کی۔

تبیین دین کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی کے تحت جو فریضہ انجام دیا ہے۔اس کی اہمیت اور وزن کا مسلمانوں کو احساس دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جہاں بھی اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے وہیں ساتھ ہی اطاعت رسول کا حکم بھی دیا ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ(النساء۴:۵۹)

اور اسی طرح اتباع رسول کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے قرآن میں دوسرے اسلوب بھی اختیار کئے گئے ہیں بہر حال اس موضوع پر حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور حیات طیبہ سے متعلق باب میں تفصیلی گفتگو ہو گی۔ یہاں ہم صرف اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ تبیین قرآن کی ذمہ داری کی اہمیت ہی کی وجہ سے اتباع رسول کی فرضیت کا قرآن میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں بھی مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ (۵:۶۷)

سے مراد قرآن ہی ہے اور ابلاغ کا مطلب یہ نہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ ایک ڈاکیے سے(نعوذ باللہ) مشابہ تھا۔ یعنی لوگوں سے کہہ دیا کہ تمہارا رب یہ کہتا ہے یا اس نے یہ حکم دیا ہے اور رسالت کا فریضہ ادا ہو گیا۔ ابلاغ کے معنی و مفہوم کی پہلی آیت اور اسی قسم کی دوسری قرآنی آیت کی روشنی میں متعین کرنا ہو گا۔ اور خاص طور پر ان تاکیدی الفاظ کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جو حکم ابلاغ کے بعد وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر آپ نے منزل من اللہ شے یعنی قرآن کو لوگوں تک نہ پہنچایا تو آپ نے حق رسالت ادا نہیں کیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فریضہ ابلاغ میں وہ ساری جدوجہد اور سعی و عمل شامل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاعت دین کے لیے کی۔ پھر اس کے بعد

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ(۵:۶۷)کے الفاظ ابلاغ کے معنی کی وسعت اور گہرائی کو مزید واضح کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ کفار و مشرکین اور اہل کتاب آپ کی جو مخالفت و مزاحمت کریں گے اللہ تعالیٰ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کی حفاظت کرے گا۔ گویا فریضہ ابلاغ ادا کرتے ہوئے جب آپ دین اسلام کے اصولوں اور ان کے مضمرات کی تبیین کریں گے تو کفر اس سے جھلا اٹھے گا اور آپ کو گزند پہنچانے پر کمر بستہ ہو جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اپنی نبوی بصیرت کے ذریعے سے اس صورت حال کا اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے آپ کے حوصلے کو تقویت پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔ اس سے تبیین وحی کی اہمیت کا پورا شعور ہو سکتا ہے۔

رسول کی مربیانہ حیثیت

ابلاغ و تبیین دین کا جو فریضہ رسول کو سونپا جاتا ہے اس میں مومنین کی تربیت کا کام بھی شامل ہوتا ہے۔ اس کو موخر الذکر کی فکری تطہیر و تعمیر بھی کرنا ہوتی ہے، تزکیہ سیرت و کردار بھی کرنا ہوتا ہے۔ دعوتی کام کے لیے انہیں تیار کرنا ہوتا ہے۔ قرآن اور تاریخ گواہ ہیں کہ انبیاء و رسل میں مربیانہ صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اسی تربیت کی قوت کے سہارے رسول کے صحابہ جہاد کرتے اور وہ مشکلات برداشت کرتے ہیں جو کفر و شرک کی تاریکیوں میں لوگوں کو حق کی روشنی دکھانے کی جدوجہد کے دوران ناگزیر طور پر پیش آتی تھیں۔

قرآن حضرت عیسٰیعلیہ السلام کے متعلق کہتا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (آل عمران۳:۵۲۔۵۳)

ترجمہ : پس جب عیسٰی نے ان کی طرف کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں ؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔

جیسا کہ انجیل میں مفصل طور پر مذکور ہے اور ان دو آیات میں اختیار کئے گئےانداز کلام سے ظاہر ہوتا ہے، یہودی فریسیوں اور فقہاء نے حضرت عیسٰی کی دعوت کو مسترد کرنے کے علاوہ قیصر روم کے اعیان و اکابر کو یہ کہہ کر بھی بھڑکایا کہ آپ کی دعوت حکومت کے لیے بھی خطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی حالت پیدا ہو جانے سے شدت مخالفت و عناد اور حکومتی ظلم کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ یہ صورت پیدا ہونے پر صاحب ثروت و اثر طبقہ کے کفر سے بے نیاز ہو کر رسول نے اپنے مادی وسائل سے محروم متبعین سے کہا کہ تم میں سے کون اللہ کے دین کی دعوت میں میرا شریک کار ہونے پر آمادہ ہے۔ یہ اسی تربیت کا اثر تھا جو رسول نے کی تھی کہ پیروان عیسٰی نے عواقب سے بے پروا ہو کر جواب دیا کہ ہم اس جہاد میں آپ کے ساتھ ہیں اور ساتھ ہی ایک بار پھر اپنے ایقان اور اتباع رسول کا اعلان کرتے ہوئے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کیا۔ حواریوں کے اس جوش و استحکام ایمانی کی مثال

دے کر اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور امت سے کار دعوت میں اسی قسم کی ثابت قدمی کا مطالبہ کیا ہے چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (الصف۶۱:۱۴)

ترجمہ : اے ایمان والو !تم اللہ کے انصار بنو جیسا کہ عیسٰی ابن مریم نے دعوت دی حواریوں کو، کون میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں ؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار بنتے ہیں۔

یہ تو خصوصی طور پر حضرت عیسٰی کے تربیت یافتہ حواریوں کا تذکرہ تھا اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل منفرد واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے انبیاء رسل کی مربیانہ کوششوں سے جو اصحاب دعوت دین کے کام کے لیے تیار ہوئے ان کا قرآن میں عمومی تذکرہ کیا گیا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران۳:۱۴۶)

ترجمہ : اور کتنے انبیاء گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کے سبب سے جو انہیں خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو پست ہمت ہوئے نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گٹھنے ٹیکے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد بالسیف پیغمبر اسلام سے قبل مبعوث ہونے والے انبیا اور ان کی امتوں نے بھی کیا۔ اور ان کے لیے ربیون کا لفظ استعمال کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اپنے کردار کے اعتبار سے انبیاء نے ان کی اس حد تک اور اس معیار کی تربیت کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق مستحکم ہو گیا تھا۔ یہ بات انبیاء کی مربیانہ صلاحیت ہی کا نتیجہ تھی کہ اللہ کے دین کی اشاعت اور اس کے دفاع کے لیے ان کے عزائم اس قدر پختہ ہوتے تھے کہ وہ اس راہ میں ہر تکلیف اور مشقت چاہے وہ جس قسم کی بھی ہو، مردانہ وار برداشت کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پست ہمتی اور کمزوری

کی ایک نمایاں صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ اعدائے دین کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیئے جائیں۔ ایسا صرف حالت جنگ ہی کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ زمانہ امن میں بھی اللہ تعالیٰ کے دین کے متبعین کے لیے زیبا نہیں کہ ان قوموں اور گروہوں سے ان کی طاقت سے مرعوب ہو کر یا اس سے کسی قسم کی امیدیں وابستہ کر کے ان سے دبنے لگیں اور مصلحتوں کا بہانہ بنا کر ان کے دست نگر ہو کر زندگی بسر کریں۔ ان آیات سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جو مسلمان انفرادی اور اجتماعی دائروں میں اپنے اصولوں کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی چوٹیں کھانے اور نقصانات برداشت کرنے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں انہیں اللہ تعالیٰ اپنی دوستی کے درجات علیا سے نوازتا ہے۔

لیکن یہ مقالات انبیاء کی تربیتی کوششوں کے اثر کو کماحقہ قبول کرنے ہی ہے حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں کے پاس اللہ کی ہدایت آتی ہے اور وہ اسی کی روشنی میں اللہ کے دین کو قبول کرنے والوں کا تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کریں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ انبیاء کا یہ فیضان تربیت ان کی زندگی تک محدود رہے بلکہ اگر ان کی سنت کو محفوظ رکھا جائے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ ہو تو تربیت کا یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔

قرآن میں جن گروہوں اور جماعتوں کے جہاد بالسیف کا تذکرہ نام لے کر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے ان میں قصہ طالوت و جالوت بھی اہل حق کی تربیت کی نمایاں مثال پیش کرتا ہے۔ گیارہویں صدی "ق م " میں اسرائیلی سیاسی،مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے زبوں حالی کا شکار ہو چکے تھے۔

فلسطینی ان پر اس حد تک غلبہ حاصل کر چکے تھے کہ ان کے بعض علاقوں پر قبضہ کرنے کے علاوہ ان کے مقدس صندوق جس میں تورات اور دوسری اشیاء تھیں وہ بھی چھین کر لے گئے۔ یہ اور بعد میں ان کی بیداری اور قیام بادشاہت اور سیموئیل نبی کے ظہور کے متعلق تورات کے باب سیموئیل میں مختلف و متضاد روایتیں ملتی ہیں لیکن ہم ان سے تعرض کیے بغیر قرآن میں دی گئیں تفصیلات پر ہی انحصار کریں گے اور یہ واضح کریں گے کہ اگرچہ یہود میں بہت تفرقہ بازی تھی اور وہ کسی بات پر جمتے نہ تھے لیکن اس کے باوجود سیموئیل نبی کی اصلاح احوال کی کوششیں ثمر آور ہوئیں اور ایک ایسی جماعت آزمائشوں کی بھٹی سے

گزر کر تیار ہو گئی جس نے فلسطینیوں کو شکست دی، ان کا معروف بہادر سپہ سالار حضرت داؤدعلیہ السلام جو اس وقت نوجوان تھے، کے ہاتھوں مارا گیا اور مقدس صندوق بھی واپس مل گیا۔

یہودیوں کا یہ حال تھا کہ پہلے تو وہ نبی(سیموئیل) سے کہتے تھے کہ ہم پر کوئی حکمران مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اللہ کے راستے میں جنگ کریں:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ (البقرہ۲:۲۴۶)

ترجمہ : کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰعلیہ السلام کے بعد انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ اس نے کہا ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ بولے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے نکالے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان کی قلیل تعداد کے سوا سب منہ موڑ گئے۔

لیکن جو قومیں اور امتیں انتشار میں گرفتار اور انفرادی و اجتماعی کردار کی خوبیوں سے محروم ہو چکی ہوں وہ قدم قدم پر داعی حق کے راستے میں مشکلات پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ جب نبی نے ان پر ایک امیر مقرر کر دیا تو وہ اب اسی کے حسب و نسب اور مالی حیثیت پر اعتراض کرنے لگے، لیکن نبی کی رائے کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور یہ منصب ان کے پاس ۱۰۲۱ سے ۱۰۰۰ ق - م تک رہا جسکے بعد حضرت داؤدؑ بادشاہ بنے۔ قرآن اسی پر کہتا ہے:

وَقَالَ لَهُمۡ نَبِیُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡهُ وَلَمۡ یُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِ ؕ(البقرہ۲:۲۴۷)

ترجمہ : اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو امیر کر دیا ہے وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس سے زیادہ حقدار ہم اس امارت کے ہیں، اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے۔

نبی نے اس اعتراض کا مسکت جواب دیا اور کہا کہ طالوت علم اور شجاعت کی صفات سے متصف ہے اور ایسا ہی شخص اس منصب کا اہل ہے۔ نیز اس کی سربراہی میں تمہیں مقدس صندوق بھی مل جائے گا۔

قرآن میں بیان کئے گئے بعد کے حالات اس بات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ نبی نے تربیت کے ذریعے سے ایسی جماعت پیدا کر لی تھی جو ہر قسم کی آزمائشوں سے گزرنے کے بل بوتا رکھتی تھی لہٰذا معترضین اپنی تمام شرارتوں کے باوجود ناکام ہو گئے چنانچہ طالوت نے امارت اور سپہ سالاری سنبھال لی۔ قرآن کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت سیرت و کردار کی پختگی اور ایمانی استحکام کا قائل تھا، لہٰذا وہ اللہ پر بھروسے کی وجہ سے فوج کے لیے ایسی عددی کثرت کو جن میں غیر تربیت یافتہ اور کم حوصلہ لوگ بھی شامل ہوں، پسند نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے دونوں قسم کے گروہوں کا تعین کرنے کے لیے فوج کے سفر کے دوران ایک آزمائشی معیار مقرر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا سفر نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ طالوت نے اس بات کو پختگی ایمان و عزم کی کسوٹی قرار دے دیا کہ کون راستے میں آنے والی ندی میں سے اول تو پانی پیتا ہی نہیں اگر پیئے گا تو ایک چلو بھر پی لے، اور کون ہے جو جی بھر کر پیتا ہے۔

جو لوگ ایمان کی پختگی سے مزین تھے انہوں نے اول الذکر رویہ اختیار کیا اور جو لوگ اس صفت سے محروم تھے انہوں نے اپنی پوری پیاس بجھائی اگرچہ پہلے زمرے کے لوگ کم تھے، لیکن طالوت انہیں ہی ساتھ لے کر آگے بڑھا جب کہ دوسری قسم کے لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ دشمن کے مقابلے میں ہماری فوج افرادی تعداد میں اس قدر کم ہے کہ کامیابی اور فتح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ۲:۲۴۹)

ترجمہ : پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انہوں نے بتایا کہ اللہ ایک ندی کے ذریعے سے تمہاری جانچ کرنے والے ہے۔ تو جو اس میں سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو بے شک میرا ساتھی ہے مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو انہوں نے اس میں خوب پیا، صرف ان میں سے تھوڑے لوگ اس سے بچے۔ پھر جب طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان پر ثابت قدم رہے دریا پار کر گئے تو یہ لوگ بولے کہ اب ہم میں تو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں جو لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ آخر کار انہیں اللہ سے ملنا ہے انہوں نے للکارا کہ کتنی چھوٹی جماعت رہی ہے جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی۔ اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔

قصص قرآن کے بیان کرنے سے مقصد خداوندی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ نزول وحی کے وقت اور اب بھی یہ کہتے ہیں کہ اس قدر اختصار سے اور بعض اوقات اشارات کے رنگ میں گزشتہ انبیاء و اقوام سے متعلق واقعات کے بیان سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ان قصص کے بیان سے اللہ کا مقصد تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ میں حق و باطل کی کشمکش اور انبیاء و رسل کے انداز دعوت کے فلسفے کو ذہن نشین کرانا ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ نویسی کا طریق اختیار نہیں کیا جاتا، محض تفہیم کا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ زیر نظر واقعہ میں جتنی باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اصول فراموش قومیں اورملتیں انحطاط کی گہری غاروں میں گر جاتی ہیں اور کس طرح انبیاء کی تعلیم و تربیت سے وہ صرف مادی سطح پر ہی ترقی نہیں کرتیں بلکہ اعلیٰ اقدار کو اپنا کر صبر و استقامت اور تزکیہ نفس اور صفائے قلب کے ذریعے مادی نتائج سے بے

پروا ہو کر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بھروسے سے بڑی سے بڑی مہمیں سر کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور عددی قلت اور وسائل کی کمی کے باوجود کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

اس قصے کے بیان کے دوران اور اوپر والی اور درج ذیل آیت میں اہل حق کے طرز فکر میں نبی کی تربیت کے نتائج واضح طور پر نظر آرہے ہیں :

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ(البقرہ۲: ۲۵۰۔۲۵۱)

ترجمہ : اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انہوں نے دعا کی اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے۔ ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافر قوم پر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو شکست دی اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔

تاریخ عالم میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک مسلمانوں کا یہی طرز فکر رہا ہے۔ ایسے ہی لوگ دین کا کام کر سکتے ہیں اور اسی قسم کے افراد تیار کرنا انبیاء و رسل کا اصل فریضہ ہوتا ہے۔

چھٹی اور آخری بات اس آیت میں مومنین کو یہ یاد دہانی کرانے سے تعلق رکھتی ہے کہ بعثت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تم واضح قسم کی بے راہ روی اور گمراہی میں مبتلا تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ذرائع سے جن کا اس آیت میں تذکرہ کیا گیا ہے تمہیں قہر ضلالت سے نکال کر اوج ثریا پر متمکن کر دیا۔ اس سے امت مسلمہ کو یہ بھی سبق ملتا ہے کہ دین کے راہ راست چلن پیش نظر ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نشانیوں پر تدبر کرو، اپنے تزکیے سے غفلت نہ ہو تو قرآن میں بیان شدہ عقائد کو حرز جاں بنانے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرو اور اپنے جملہ معاملات میں بے تدبیری سے نہیں بلکہ حکمت سے کام لو۔

رسول اور قائم شدہ نظام فکر و عمل

انبیاء و رسل چونکہ گمراہی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لیے خدا کی طرف سے پیغام ہدایت لے کر آتے ہیں اور اس ہدایت کے نفاذ و اجراء کے لیے کوشاں ہوتے ہیں لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس معاشرے میں مبعوث ہوں اس میں جاری و ساری معتقدات اور تمدنی حالات مثلاً خالق و مدبر کائنات کا تصور، انسان کی ابتدا و انجام کے متعلق نظریات، سیاسی، معاشی اور معاشرتی شعبہ ہائے زندگی کی تنظیم کے انداز کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد ہی وہ حکمت کے ساتھ اپنے مخاطبین کی بے راہ رویوں کی نشاندہی کر کے انہیں فکرو عمل کے دائروں میں صحیح اور منزل من اللہ دین و شریعت سے آگاہ کریں۔ قرآن میں بیان کردہ قصص الانبیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار وقت ان کی تنقید اور ان کے پیش کردہ دین کے نفاذ کی کوششوں کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتا۔ چنانچہ قرآن بتاتا ہے کہ جہاں بادشاہت تھی وہاں پیغمبر کو اس کی مزاحمت و ظلم کا سامنا کرنا پڑا اور جہاں کوئی طبقہ بر سر اقتدار تھا وہاں اس کی مخالفت کا نشانہ بننا پڑا ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود (بادشاہ) کے ساتھ وجود باری تعالیٰ کے موضوع پر بحث کرتے ہیں اور مؤخر الذکر لاجواب ہو جاتا ہے(۲:۲۵۸)۔ آپ علیہ السلام اپنی قوم کے بتوں کی جنہیں وہ خدائی کا درجہ دیتے تھے، بے بسی ثابت کرتے ہیں تو انہیں آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے(۲۱:۵۱۔۶۸)اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔(۲۹:۲۴)پھر آپ حکم خداوندی کے تحت ہجرت کرتے ہیں۔(۲۱:۷۱)

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت اور قوم کے اعمال خبیثہ سے اجتناب کی ہدایت کرنے پر مؤخر الذکر کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ ہم آپ کو اپنے ملک سے نکال دیں گے۔(۲۶:۱۶۷)

حضرت نوح علیہ السلام سے کہا گیا کہ اپنا دین پیش کرنے سے باز نہ آئیں گے تو ہم آپ کو رجم کر دیں گے(۲۶:۱۱۶)حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے دعوہ خدائی کی تکذیب کی تو وہ اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ میں موسیٰ کو قتل کرتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے رب کو مدد کے لیے کسی طرح بلاتا ہے۔(۴۰:۲۶)

حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی ملک بدر کرنے کی دھمکی دی گئی۔(۷:۸۸)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دعوت دین کے جواب میں جو مظالم ڈھائے گئے وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ تفصیلات حضور کے اسوہ حسنہ اور حیات طیبہ کے باب میں عرض کی جائیں گی۔ البتہ ہم موقع بحث کی نسبت سے یہاں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ پیغمبروں کے ساتھ کفرو شرک کے حاملین اور باطل نظاموں کی طرف سے جو سلوک روا رکھا گیا ہے اس میں معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر اللہ کہتا ہے :

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ (فصلت ۴۱:۴۳)

ترجمہ : وہی باتیں کہی جا رہی ہیں جو تم سے پہلے آنے والے رسولوں سے کہی جا چکی ہیں۔

بعض حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اپنے مخاطبین سے انبیاء علیہم السلام کا اختلاف مذہبی قسم کے مابعد الطبیعات مسائل تک محدود تھا۔ اگرچہ دین اسلام میں یہ مسائل بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سر فہرست توحید کا عقیدہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پیغمبروں نے زمان و مکان اور پیش آمدہ مسائل کے تقاضوں کے مطابق عملی زندگی کی طرف بھی بھرپور توجہ دی۔ اس لیے جیسا کہ ہم سطور بالا میں عرض کر چکے ۔ ہیں، گمراہ قوموں کی طرف سے ان کے سربراہان ہی آگے بڑھ کر ان کی مخالفت کرتے رہے۔ اس لیے کہ اللہ کے نازل کئے گئے دین کے اصول کی زد ان کے اقتدار اور اس سے وابستہ ناجائز مراعات پر پڑتی تھی۔ اگرچہ نبوت کا دروازہ تو مقفل ہو گیا لیکن چونکہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات زندہ ہیں لہٰذا جو بھی صحیح خطوط پر دعوتی کام کرنے کا ارادہ کرے گا۔ اسے اسی طرح کی آزمائشی بھٹی سے گزرنا ہو گا جن سے انبیاء اور ان کے مخلص پیرو گزرتے ہیں۔

اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ حضرات ابراہیم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کا ٹکراؤ وقت کے متمرد بادشاہوں کے ساتھ ہوا۔ فرعون اور اس کے درباریوں نے باہمی مشورے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے جو باتیں کہیں ان میں یہ بات بھی شامل تھی :

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (طٰہٰ ۲۰:۶۳)

ترجمہ : پھر (درباری بولے) یہ دونوں بھائی ضرور جادو گر ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہاری شرف و عظمت کے مالک ہو جائیں۔

ہم نے مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' سے لیا ہے۔ ''ترجمان القرآن ''جلد دوئم کے صفحہ ۲۷ کے نوٹ کے تحت وہ اس کا یہ مفہوم تحریر کرتے ہیں:''انہوں نے آپس میں کہا موسیٰ ہمیں نکال کر ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا تھا'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ گمراہ اقتدار وقت کو انبیاء کی دعوت اسلامی سے ہمیشہ خطرہ محسوس ہوتا رہا ہے۔ قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام (۷:۴۰) ہود علیہ السلام (۷:۴۴) صالح علیہ السلام (۷:۴۰) اور شعیب علیہ السلام (۷:۸۸) کو بھی اصحاب اقتدار طبقات ہی کا سامنا کرنے کا تذکرہ ہے۔ ان میں ان کے حکمران بھی شامل ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ قرآن میں یہ تذکرہ بھی موجود ہے کہ بہت سے انبیاء کو جہاد بالسیف بھی کرنا پڑا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ (آل عمران ۳:۱۴۶)

ترجمہ : اور کتنے انبیاء گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کے سبب سے جو انہیں خدا کی راہ میں پہنچیں تو نہ پست ہمت ہوئے نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے۔

جہاں قرآنی قصص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ میں حق و باطل کی کشمکش جاری رہی ہے وہیں اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ایک کثیر تعداد مومنین یقین محکم سے سرفراز ہو کر دین حق کے لیے جانوں کی بازیاں بھی لگا دیتی تھی اور یہ ضروری نہیں کہ اس کثیر تعداد میں دعوت دین قبول کرنے

والے سبھی مرد، عورتیں اور بچے شامل ہوں۔ اس سے تاریخ عالم میں راہ روان حق کی عددی کثرت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

قرآن کہتا ہے رسولوں کو حق کی پاداش میں قتل بھی کیا گیا جیسا کہ سورہ البقرہ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا گیا:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (البقرہ۲:۸۷)

ترجمہ : پھر کیا تمہارا شیوہ ہی یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کا کوئی رسول ایسی دعوت لے کر آئے جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو تم اس کے مقابلے میں سرکشی کرو۔ اور کسی کو جھٹلاؤ، کسی کو قتل کرو۔

اس کی واضح مثالیں حضرات زکریا اور یحیٰی علیہا السلام کا قتل ہے۔

۷ ۔ رسولوں نے کفر کو ہمیشہ چیلنج دیا ہے

اللہ تعالی نے قرآن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا :

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ(یوسف۱۲:۱۰۸)

ترجمہ :کہہ دو، یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اسی اعلان سے جس یقین و اعتماد اور عزم و حوصلہ کا اظہار ہوتا ہے وہ محتاج بیان و وضاحت نہیں۔ انبیاء و رسل کا اور ان کی سچے دل سے پیروی کرنے والوں کا ہمیشہ یہی مسلک رہا ہے۔

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی جو انبیاء مبعوث ہوئے انہوں نے بھی نہایت جرات اور اللہ تعالی کی رضا کے حصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے شدید خطرات انگیز کئے

لیکن اللہ کا پیغام من و عن اپنے مخاطبین تک پہنچایا۔ حضرت نوحعلیہ السلام نے اپنی قوم سے برملا کہا :

یٰقَوْمِ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْکِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَعَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَکُمْ وَشُرَکَآءَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُنْ اَمْرُکُمْ عَلَیْکُمْ غُمَّۃً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ(یونس۱۰:۷۱)

ترجمہ : اے میری قوم کے لوگو ! اگر تم پر تمہارے اندر میرا ٹکنا اور اللہ کی آیات کی یاد دہانی کرانا گراں ہو گیا ہے تو میں نے بس اللہ پر بھروسہ کیا۔ تم اپنی رائے مجتمع کر لو اور اپنے شرکاء کو بھی ملا لو پھر تمہارے فیصلے میں کوئی تذبذب باقی نہ رہے اور میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :"کیا ممکن ہے کہ محض بناوٹ اور افترا پردازی کی زندگی سے ایسا یقین ابل سکے ؟ کیا ممکن ہے ایک فرد واحد پوری قوم کو اس طرح مقابلہ کی دعوت دے، اور اس کے دل میں ذرا بھی کھٹک موجود ہو کہ اپنے بیان میں سچا نہیں۔"(ترجمان القرآن جلد دوئم۔ صفحہ ۱۲۵)

حضرت ھودعلیہ السلام نے بھی اپنی قوم(عاد) کو اسی طرح کا چیلنج دیا:

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْھِدُ اللّٰہَ وَاشْھَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِہٖ فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ(ھود۱۱:۵۴۔۵۵)

ترجمہ : (ھودعلیہ السلام)نے کہا میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اس کے سوا جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بالکل بری ہوں۔ تو تم سب مل کر میرے خلاف چالیں چل کر دیکھو پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔

اسی طرح جب حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم مدین کو توحید کی دعوت دی، معیشت میں بے راہ روی کو ترک کرنے کو کہا، فساد سے اجتناب کرنے کی تلقین کی، نماز پڑھنے اور بت پرستی ترک کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو قوم نے جواب دیا ہم آپ علیہ السلام کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں اور اگر آپ کی برادری نہ ہوتی تو ہم آپ کو رجم(سنگسار) کر دیتے۔ اس پر حضرت شعیبعلیہ السلام نے کہا:

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ (ھود۱۱:۹۳)

ترجمہ : اے میری قوم کے لوگو ! تم اپنے طور پر جو کر رہے ہو کرو، میں بھی اپنے طور پر کر رہا ہوں۔

معنوی اعتبار سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مخالف اسلام قوتوں کو ایسے ہی الفاظ کہنے کا حکم دیا گیا:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ(ھود۱۱:۱۲۱)

ترجمہ : اور(اے پیغمبر!)جو لوگ ایمان نہیں لاتے(اور دعوت حق کا مقابلہ کر رہے ہیں) ان سے کہہ دو تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، ہم بھی(اپنی جگہ) سرگرم عمل ہیں۔

اس طرح ہر پیغمبر کی دعوتی تاریخ میں اپنے منصب رسالت کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنے کا عزم نظر آئے گا۔ جس طرح ان کے بنیادی اصولوں اور نظریات میں یکسانی پائی جاتی ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا منبع ایک تھا،اسی طرح ان کے ارادے اور استحکام میں بھی کوئی تفاوت نہیں پایا جاتا۔ کفر چاہے مادی اعتبار سے ان کے مقابلے میں جتنا بھی طاقتور ہو وہ اس سے کبھی مرعوب ہوئے ہیں نہ خوفزدہ بلکہ جیسا کہ ابھی بیان کی گئی سب آیات قرآنی سے ظاہر ہے، انہوں نے ہمیشہ کفار کی دھمکیوں اور ان کے مظالم کے جواب میں یہی کہا کہ تم جو جی میں آئے کرو، ہم اپنے دین کی بے کم و کاست تبلیغ بھی کریں گے اور اپنے صحابہ کو ساتھ لے کر اس پر عمل پیرا بھی ہوں گے۔

۸۔رسول کبھی اصولوں پر غیر اسلام سے مصالحت نہیں کرتا

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ سیاسی قائدین، مصلحین اور حکمران اور غیر حکمران جماعتیں بلند بانگ دعاوی لے کر چلتے ہیں، لیکن جہاں انہیں بزعم خود اپنے مفاد کو آگے بڑھانے کا امکان نظر آتا ہو، الٹی سیدھی تاویلیں کر کے اپنے اعلان شدہ اصولوں میں نرمی پیدا کر کے مخالف عناصر سے بھی مصالحت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اسے حقیقت پسندی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ در حقیقت یہ حرکت اپنے نظریات سے انحراف کے ہم معنی اور سیرت و کردار کی کمزوری کی علامت ہوتی ہے لیکن انبیاء و رسل اپنے اصولوں کے معاملے میں کسی

وقتی مصلحت کے تحت کسی سے کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ ان کو اس بات کا کامل یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں جو دین ملا ہے وہ مبنی بر صداقت ہے اور جن لوگوں کے سامنے ہم اس کی دعوت پیش کر رہے ہیں ان کا مفاد اس کی قبولیت ہی سے وابستہ ہے۔ اگر چہ وہ دعوتی کام کی کامیابی اور لوگوں کے راہ راست پر آنے کی شدید تمنا رکھتے ہیں اور لوگوں کی بے راہ رویوں کو دیکھ کر غم میں گھلے جاتے ہیں، لیکن وہ اپنے اصولوں میں کوئی ڈھیل پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو لوگ اللہ کے دین پر ایمان لانے سے گریزاں تھے اور رات دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی کے منصوبے بناتے تھے ان کے معاملے میں بھی سوچ کر کہ وہ اپنی عاقبت کو خراب کر رہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم از راہ ہمدردی بہت غمگین رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کو کہنا پڑا:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء۲۶:۳)

ترجمہ : شاید تم اپنے آپ کو اس فکر میں ہلاک کر کے رہو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے۔

اس کے علاوہ قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ آپ پر ان لوگوں کے راہ ہدایت پر آنے یا نہ آنے کے سلسلے میں کوئی ذمہ داری نہیں ۔ لیکن پیغمبر اپنی سلیم الفطرتی اور نبی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ فرض کی ادائیگی کے شوق و جذبہ کی وجہ سے دین کے فروغ کے لیے بہت بے چین و مضطرب ہوتا ہے۔ لیکن وہ دین کو بلا کم و کاست اس کے منزل من اللہ اصولوں کے ساتھ پھیلانا چاہتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی۔ طرف سے بھی یہی حکم ہوتا ہے کہ دینی فکر و عمل کے معاملے میں غیروں کے نظریات کی طرف جھکاؤ کا قطعاً مظاہرہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ(ھود۱۱:۱۱۲۔۱۱۳)

ترجمہ : پس چاہیے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے تم اور وہ سب جو توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں(اپنی راہ میں) استوار ہو جائے، اور حد سے نہ بڑھو۔ یقین کرو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور ایسا بھی نہ کرنا کہ ظالموں کی طرف جھک پڑو اور آگ تمہیں بھی چھو جائے۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی رفیق نہیں پھر(اس سے بچھڑے تو) کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

ان آیات سے اللہ تعالیٰ کی یہ منشا بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نہ رسول غیر اسلام کی طرف جھک سکتا ہے اور نہ کوئی مسلمان۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم داعیان دین تھےاس لیے ان دونوں آیتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اکٹھے خطاب کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس اصول کی پابندی خاص طور پر ہر اس گروہ مومنین یا جماعتوں پر عاید ہوتی ہے جو دعوت دین کے لیے اٹھیں یا اس کا دعویٰ کریں۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں جو عواقب برآمد ہوں گے، وہ بیان کر دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا فکر و عمل اسلام کے مطابق نہیں، ان سے اصولی سطح پر مصالحانہ رویہ اختیار کرنا دینی نکتہ نظر سے استقامت اور استواری کے مقتضیات کے خلاف ہے۔.

۹ -رسول کا انداز دعوت

مادہ پرست اور حب اقتدار میں گرفتار لوگ تغیر انقلاب کی اساس کسی نہ کسی فرد جماعت، طبقہ یا قوم و نسل سے فراہم کرتے ہیں۔ اس سے وہ اپنے مخالفین یا حمائتیوں میں عصبیت جاہلانہ پیدا کر کے ان کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ دور رواں میں اس کے ساتھ نشرو اشاعت کے ذرائع کی فراوانی کی وجہ سے، حالات و نظریات کی غلط اور دور از کار تاویلات کر کے اپنے زیر اثر حلقوں کے ذہنوں کو مسموم کر دیتے ہیں اور اپنے خیالات و نظریات کے نفاذ کی صورت میں وجود میں آنے والے نظام کی ایک سنہری قسم کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک صدی تک مارکسی کیمونزم کے نظام سے وجود میں آنے والی موعودہ خوبیوں کے سلسلے میں زبانی، تقریری اور تحریری ذرائع سے کرۂ ارض کے طول و عرض میں ایک منظّم قسم کی مہم چلائی جا رہی تھی، لیکن کسی بیرونی مداخلت کے بغیر

اس نظام کا کھو کھلا پن اس طرح طشت از بام ہوا ہے کہ اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ نفرت، بے بنیاد معاشرتی اور معاشی تھیوریوں، تاریخی واقعات کی مسخ شدہ تعبیرات کی بنیاد پر وضع کردہ طبقاتی عناد کو ہوا دینے اور اس کو انتہا تک پہنچانے کا کیا دھرا تھا۔ مزید برآں اس فکر کے اس نظریے نے سطح ارض پر فساد انگیزی کو بے حد فروغ دیا کہ حصول مقصد کے لیے جس قسم کے چاہو ذرائع اختیار کرو۔

لیکن انبیاء و رسل ایسا کوئی راستہ یا حربہ استعمال نہیں کرتے۔ رسول سبز باغ دکھا کر کسی کو اپنے پیچھے نہیں لگاتا۔ بلکہ وہ حصول مقصد کی راہ کی دشواریوں کو واضح کر دیتاہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ(البقرہ۲:۱۵۵)

ترجمہ : بے شک ہم تمہارا امتحان کریں گے، کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدموں کو خوش خبری سنادو۔

اپنے سارے معاملات کو سرانجام دینے کے لیے رسول اور غیر اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کے قائدین کے طرز عمل میں اخلاقی لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ہر پہلو سے اول الذکر کی دیانت و امانت جو وہ اپنے دعوتی کام کے سلسلے میں ملحوظ رکھتا ہے، سلیم الفطرت عناصر کو اس کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیتی ہے کہ وہ اس کی ایک ایک بات کو خوشدلی اور آمادگی قلب کے ساتھ درست تسلیم کرتے اور اس کا اتباع کرتے ہیں۔

رسولوں کے نزدیک''رنگ و بو'' کی تمیز یکسر مسدود ہوتی ہے۔ وہ پورے معاشرے اور انسانیت کو ایک ہی سطح پر دیکھتے ہیں اور ہر قسم کے مصنوعی اور انسانی شرف کا بطلان کرنے والے امتیازات کو کالعدم قرار دیتے ہیں۔ رسول اپنی بعثت کے وقت پورے معاشرے کے مقابلے میں فرد واحد کی حیثیت رکھتا ہے اور آغاز دعوت میں پورے کا پورا معاشرہ پنجے جھاڑ کر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتا ہے، لیکن وہ دشمنی اور عناد کا جواب دشمنی سے نہیں دیتا، بلکہ صرف اس کے الفاظ سے نہیں بلکہ اس کے رویے اور عمل سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ وہ مخالفت کرنے والوں کے ساتھ عمیق ہمدردی رکھتا ہے اور ان کی تمام

زیادتیوں پر صبر کر کے نہایت استقامت اور نرمی کے ساتھ انہیں راہ حق کی طرف بلاتا رہتا ہے۔ ان کی انتہائی قسم کی بد اخلاقی کے جواب میں وہ حسن اخلاق کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتا ہے۔ جب دشمنان دین جارحانہ انداز سے اس پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کے جسم تیروں کی بوچھاڑ سے زخمی کرنے پر اپنا مجموعی زور صرف کر دیتے ہیں اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ سے ان کا دل دعا ہی میں مصروف رہتا ہے کہ وہ ہدایت یاب ہو جائیں۔ البتہ جب دنیا سے ان کی عداوت اس مرحلہ پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ اس کو جڑ پکڑنے سے روکنے کے لیے آخری حد بھی عبور کر جاتے ہیں اور رسول نے حمایت و اتباع دین کے لیے جو انسانی مواد بڑی محنت سے تیار کیا ہوتا ہے اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا واضح عزم کر کے ان کو ان کے گھروں اور دیس سے بھی نکال دیتے ہیں اور اس پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ رسول اور جماعت مومنین کسی اور جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے ہیں تو ان پر افواج لے کر دوڑتے ہیں تو اس وقت رسول حفاظت دین کے لیے قتل پر مجبور ہو جاتا ہے۔ رسول اور مسلمانوں پر جہاد بالسیف کے سلسلے میں بھی قرآن میں بہت سی پابندیاں عاید کی گئی ہیں۔ یہاں ہم نے ان سب باتوں پر اجمالاً گفتگو کی ہے تفصیلات اپنے اپنے موقع پر آئیں گی۔

اللہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دین کے کام کے سلسلے میں واضح ہدایات دی ہیں اور ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یک سرمو بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ فرماتا ہے :

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ (۱۲۵:۱۶)

ترجمہ : اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے۔

لفظ حکمت کے مفہوم پر ہم اس باب میں اس سے قبل گفتگو کر چکے ہیں۔ تاکید مزید کے لیے فرمایا گیا ہے کہ جب تفہیم دین کے لیے ان سے کوئی بحث مباحثہ ہو جائے تو اس میں حسن کلام کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بحث کے دوران عام طور پر گرم گفتاری کا

مظاہرہ ہوتا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان کے اتباع میں مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تبلیغ دین میں حلم، بردباری اور تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے۔ اگر چہ اس طرز عمل کا مخاطبین پر بھی اخلاقی اثر ہوتا ہے لیکن کوئی اثر قبول کرے یا نہ کرے، داعی حق کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مندرجہ بالا حکم خداوندی کا اتباع کرے۔ یہ بات ایک طبعی ملکہ کی حیثیت سے اس کے اندر راسخ ہو چکی ہوتی ہے۔

سورۃ ابرہیم میں اقوام نوح ، عاد اور ثمود کے ساتھ ان کی طرف مبعوث کئے گئے رسولوں کی توحید کے موضوع پر گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ اول الذکر کی طرف یہ منسوب کرتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ (ابراھیم۱۴:۱۳)

ترجمہ اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے یا تمہیں ہماری ملت پر پھر آنا پڑے گا۔

لیکن رسولوں کا موقف یہ بیان کیا گیا ہے:

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ (ابراھیم۱۴:۱۲)

ترجمہ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ رکھیں جب کہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت بخشی اور تم ہمیں جو ایذا بھی پہنچاؤ گے ہم اس پر صبر کریں گے۔

ان دو آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرات نوح ، ھود ، اور صالح نے اپنی اپنی قوم کی طرف سے دی جانے والی کئی قسم کی اذیتیں برداشت کیں، اور پھر ان حضرات کی قومیں انہیں ملک بدر کرنے پر بھی تیار ہو گئیں۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ رسول اپنے دین سے منحرف ہو جائیں اور کفر کا مسلک اپنا لیں۔ لیکن اس کے باوجود رسولوں نے اللہ پر توکل کرنے اور صبر کا راستہ اختیار کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ وہ کسی کو انشراح صدر کے بغیر ایمان لانے پر مجبور تو نہ کرتے تھے لیکن حالات کی عدم مساعدت کے باوجود انہیں فریضہ رسالت

تو بہر صورت ادا کرنا تھا۔ مزید برآں وہ اس کام کو حکمت تبلیغ کے مقتضیات کو ملحوظ رکھ کر انجام دیتے تھے۔ جارحیت کفر کی طرف ہی سے ہوتی تھی۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا :

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (اعراف۷:۱۹۹)

ترجمہ : در گزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

''لفظ عفو جیسا کہ ہم دوسرے مقام پر واضح کر چکے ہیں اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو دل سے معاف کر دینے کے معنی میں نہیں بلکہ مجرد درگزر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ عرف ایسی بات کو کہتے ہیں جو عقل اور فطرت اور معقول لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہو''۔(تدبر قرآن جلد ۳ - صفحہ ۴۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کی ایمان نہ لانے کے معاملے میں ضد اور ہٹ

۱۰ ۔رسول دعوتی کام کا معاوضہ نہیں چاہتا

قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے رسول ہمیشہ یہ اعلان کرتے رہے کہ ہم دین کی دعوت دینے کے لیے جو سعی و جہد کر رہے ہیں اس کو کسی قسم کی دنیوی منفعت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے۔ نہ وہ لوگوں سے تبلیغ دین کے نام پر اعانتیں وصول کر کے اپنے لیے اکتساب رزق کا اہتمام کرتے اور نہ اپنے معیار زندگی کو بلند کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضور سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۲:۱۰۴)

ترجمہ : اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ تو طلب نہیں کر رہے ہو یہ تو بس دنیا والوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔

حضور سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء نے بھی اعلان کیا مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا :

وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (۱۱:۲۹)

ترجمہ : اور میرے ہم قومو !میں اس خدمت پر تم سے کسی مال کا طالب نہیں ہوں۔

حضرت ھود علیہ السلام نے قوم عاد سے فرمایا :

یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ (۵۱:۱۱)

ترجمہ :اے میری قوم کے لوگو !میں اس پر کسی معاوضے کا طالب نہیں ہوں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم ثمود سے فرمایا:

وَمَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ(۱۴۵:۲۶)

ترجمہ اور میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں میرا اجر تو بس عالم کے رب ہی کے ذمے ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے بھی یہی الفاظ(۱۶۴:۲۶)مذکور ہیں اور حضرت شعیب کے یہی الفاظ(۱۸:۲۶)ملیں گے۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قبل از بعثت تجارت کرتے تھے اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن کار نبوت شروع کرنے کے بعد حضور کے معیار زندگی میں تبدیلی آگئی حتیٰ کہ جب سارا عرب دین اسلام کے زیر نگیں آگیا تو آپ کا رہن سہن اور کھانا پینا اسی سطح پر رہا اور حضور نے زندگی کی تمام آسایشوں سے اپنے آپ کو محروم کر رکھا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور کا یہ انداز رہایش دیکھ کر رویا کرتے تھے۔(تفصیلات اسوۂ حسنہ سے متعلق باب میں آئیں گی)

خلفاء راشدین نے بھی آنحضرت کا اتباع کیا جیسا کہ اسلام کی تاریخ کے باب میں مذکور ہو گا۔

حضرت داؤد علیہ السلام بڑی سلطنت کے سربراہ تھے لیکن وہ خزانہ عامرہ سے کچھ لینے کے بجائے اپنے ہاتھ سے محنت کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ چنانچہ حضور کی حدیث ہے:

عن المقدام بن معدي كرب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما اكل احد طعاما قط خيرا من ان يأكل من عمل يديه وان نبى الله داؤد عليه السلام كان به كل من عمل بديه(رواه البخاري)

ترجمہ: مقدام رضی اللہ عنہ بن معدی کرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی نے کبھی اپنے ہاتھ کی محنت سے کمائے ہوئے کھانے سے بہتر کھانا نہیں کھایا۔ اور اللہ تعالیٰ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے کمائی ہوئی روزی کھاتے تھے۔

عن ابو بريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كان زكريا نجارا (رواه مسلم)

ترجمہ :حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زکریا علیہ السلام نجار یعنی بڑھئی تھے۔

مذکورہ قرآنی آیات اور احادیث سے یہ اصول سامنے آتا ہے کہ دعوتی کام کی جدوجہد کے دوران اسلامی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کے اموال کے ذریعے سے مادہ پرستانہ رویہ اختیار کر کے اکتساب رزق کرنا اسلامی تعلیمات اور روایات انبیاء و صلحاء اور ان کے مسلک کے خلاف ہے۔ ہم آیت(۱۵۶:۲)نقل کر چکے ہیں۔ دعوت و اقامت دین کی جدوجہد کے دوران تو مسلمانوں کی جانیں اور اموال اس کام میں کھپ جاتے ہیں لیکن یہ بات ایک لطیفے کی حیثیت رکھتی ہے کہ آج یہ بھی مشاہدے میں آتا ہے کہ نادار اور مالی طور پر بد حال لوگ اسلام کو برپا کرنے کا دعویٰ کرنے والی جماعتوں کے ذریعے سے خوشحال ہو جاتے ہیں۔ مسلمان عوام کے زکوٰۃ و صدقات کے مال کو بے دریغ انداز سے خرچ کرتے ہیں اور ترکے میں خطیر رقوم اور جائداد چھوڑ جاتے ہیں۔ اس طرح اسلام کے نام پر جماعت سازی نے ایک سیاسی و معاشی پیشہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ یہ صورت حال دور رواں کے مادہ پرستانہ نظریات کے اثرات قبول کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ قرآن و حدیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ صرف انبیاء اور ان کے صحابہ کے طرز عمل اور کار دعوت کے انداز پر منطبق نہیں ہوتا بلکہ سبھی وہ لوگ اس کے پابند ہیں جو اقامت دین کے لیے جدوجہد کرنے کے دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم اسلام کی تاریخ کے باب میں عرض کریں گے کہ

آئمہ اکرام اور ہمارے اکابرین نے حضور کے اتباع میں کس معیار کی زندگیاں بسر کیں اور اگر ان کے پاس بذریعہ محنت و تجارت دولت آتی بھی تو وہ اسے راہ خدا میں خرچ کر دیتے تھے نیز حکمرانوں کی طرف سے مالی امداد کی پیشکشوں کو وہ ٹھکرا دیتے تھے۔ لیکن ساری ساری عمریں انہوں نے خدمت دین پر گزار دیں۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سبھی اسلامی تحریکیں یا جماعتیں ایک ہی رہی ہیں۔ دور حاضر میں جو مغربی استعمار کے اثر و نفوذ کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ دعوت دین کا کام کرنے والوں نے اپنی جانوں تک کے نذرانے پیش کیے ہیں۔ بہر حال یہ بحث تفصیلی طور پر اپنے مقام پر آئے گی۔

۱۱۔تمام رسول ایک ہی دین لائے

ہم نے سطور بالا میں متعدد ایسے حوالہ جات دیئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے رسولوں کے پیش کردہ نظریات اور دعوتی کام کے سلسلے میں انہیں جن حالات سے سابقہ پڑا، ان میں یکسانی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جیسا کہ قرآن و حدیث سے ظاہر ہوتا ہے، عقائد و اعمال کے لحاظ سے ان حضرات میں یک رنگی نظر آتی ہے۔ تمام اساسات دین ایک جیسے ہیں۔ دین اسلام کے نظام فکر میں توحید سرفہرست ہے۔ ہر رسول نے سب سے پہلے اسی کو اس کے ایک جیسے مضمرات کے ساتھ پیش کیا۔ ہر رسول نے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور ارتفاقات میں حسن اخلاق اور عدل کی تعلیم دی۔

(تفصیلات ہر موضوع کے عنوان کے تحت آئیں گی) ہر رسول اور اس کے صحابہ نے دعوت دین کے کام میں رات دن ایک کر دیا اور ان کی زندگی کی ترجیحات میں ہمیشہ اس کام کو اولیت کا مقام حاصل رہا۔

چونکہ تمام انبیاء و رسل کے دین کا منبع بھی ایک ہی تھا ان کے دین کے اساسات بھی یکساں تھے اور ان کی سیرت و کردار میں بھی یک رنگی پائی جاتی تھی لہٰذا انہیں ایک امت قرار دیا گیا۔ سورۃ الانبیاء میں متعدد رسولوں کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ(۹۲:۲۱)

ترجمہ: یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔

پھر فرمایا:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ (۲:۲۸۵)

ترجمہ :یہ سب ایمان لائے اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

پہلی آیت میں اللہ نے یہ واضح کر دیا کہ تمام رسول ایک ہی دین سے منسلک ہونے اور اس کے داعی ہونے کی بنا پر ایک گروہ، جماعت یا امت کی حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ ان کے شرف اور مرتبہ علیا کے باوجود وہ لائق پرستش نہیں۔ پرستش اور عبادت صرف میری ہی کی جائے گی۔ یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری تھی کہ تقریباً تمام مذاہب کے پیرؤوں نے انبیاء کو خدائی کا درجہ دے دیا تھا۔ دوسری آیت میں یہ صراحت ہو گئی ہے کہ تمام انبیاء بھی اور ان کے متبعین بھی اللہ، ملائیکہ، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے۔ گویا تمام انبیاء کا بھی ایک دوسرے پر ایمان لانا اور ان کو نبی تسلیم کرنا ضروری ہے اور ان کی امتوں پر بھی ضروری ہے۔ مزید بر آں اسی طرح سب کتابوں پر بھی جن کا ہمیں علم ہے اور جن کا ہمیں علم نہیں ہے، اور فرشتوں پر بھی، کیونکہ رسول پر وحی فرشتے کے ذریعے سے ہی آتی ہے، ایمان لانا ضروری ٹھہرا۔

آنحضرت کی حدیث ہے:

ترجمہ :حضرت ابو ہریرہرضی‌اللہ‌عنہ راوی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عیسٰی‌علیہ‌السلام ابن مریم سے دنیا اور آخرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ انبیاء سوتیلے بھائی ہیں، ان کی مائیں مختلف ہیں لیکن ان کا دین ایک ہی ہے اور(میرے اور عیسٰی) کے درمیان کوئی نبی نہیں۔(متفق علیہ)

ابھی تحریر کیے گئے قرآنی الفاظ اور متفق علیہ حدیث سے دین اسلام کی زمانی اور مکانی عالمگیرت کا واضح تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ جن رسولوں کا قرآن میں تذکرہ ہے صرف انہی پر ایمان لانا واجب نہیں

بلکہ ذہن میں یہ تصور اجاگر کرنا ضروری ہے کہ جن انبیاء کے ناموں کا ہمیں علم بھی نہیں ہے ان پر بھی ہم ایمان لاتے ہیں۔ تمام انبیاء و رسل ایک ہی سلسلے کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ایک تو سابقہ رسولوں کی تعلیمات و کتب یا تو محرف ہو گئیں یا بالکل ہی محفوظ نہ رہ سکیں اور دوسرے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، آثار اور حضور کا لایا ہوا قرآن بالکل محفوظ ہیں اور خدا کے دین کی تکمیل کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا اب اتباع اسی کا ہو گا۔

۱۲ -رسول اور زخارف دنیا

رسول دنیا کی اصلاح کرتا اور برائی کو مٹا کر بھلائی کو رواج دینے کی کوشش کرتاہے لیکن اس دنیا کے زخارف اور چمک دمک میں ملوث نہیں ہوتا۔ وہ اس کے معاملات میں بھرپور حصہ لیتا ہے لیکن تعیش کی زندگی سے دور رہتا ہے۔ اگر اس کو اقتدار بھی مل جائے تو وہ دنیا پرست حکمرانوں کی روش اختیار نہیں کرتا۔ وہ فقرپر قناعت کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے باب میں اس مسئلے پر گفتگو ہو گی لہٰذا ہم یہاں اجمال سے کام لیں گے۔

اس سے قبل ہم حضرات داؤد اور زکریا کے متعلق دو احادیث نقل کر چکے ہیں۔ اول الذکر کو سلطنت کے سلسلے کے کام بھی کرنا ہوتے تھے۔ قرات زبور اور عبادات میں بھی وقت صرف کرنا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بقیہ وقت میں وہ ہاتھ سے محنت کر کے بہت کم رزق حاصل کر سکتے ہوں گے اور ان کو قوت لایموت ہی حاصل ہوتا ہو گا۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام بھی زیادہ وقت دعوتی کام اور عبادت میں صرف کرتے ہوں گے۔ اکتساب رزق کی غرض سے محنت کرنے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہو گا لہٰذا ان کا انداز رہائش بھی فقیرانہ ہی ہو تا ہو گا۔ اسی پر آپ دوسرے انبیاء کی زندگیوں کے معیار کو قیاس کر لیجیے۔

یوں تو اپنی اور مسلمانوں کی مطلوبہ معاشی زندگی کے سلسلے میں آنحضرت سے احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم اسوۂ حسنہ کے ضمن میں بیان کریں گے۔ یہاں ہم ایک حدیث نقل کرتے ہیں:

وعن أبي بريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الهم اجعـل رزق ال محمد قونا وفي رواينه كفافا(متفق علیہ)

ترجمہ :حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اے اللہ آل محمد کو اس قدر رزق دے جو صرف ان کی زندگی کو برقرار رکھ سکے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ بقدر کفایت ان کو ضروریات زندگی عطا کر۔

شارحین حدیث کی رائے میں قوت اور کفایت قریب قریب ہم معنی الفاظ ہیں۔ دونوں الفاظ کو ملانے سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ کھانے پینے کی اتنی مقدار مہیا ہو جو جسمانی قوت کی بحالی حیات اور عبادت کے لیے کفایت کر سکے۔ نیز کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے۔ آل سے علماء نے حضور کے اپنا اہل و عیال بھی مراد لیا اور امت بھی مراد لی ہے۔ بہرحال اس سے زندگی میں سادگی اختیار کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمان دنیا میں اللہ کے دین کو اپنے اوپر نافذ کرنے اور اس کی دعوت دینے کے لیے زندہ رہتا ہے۔ اور یہ بات جس طرح قرآن و حدیث سے ثابت ہوتی ہے اسی طرح تاریخ عروج و زوال امم سے بھی واضح ہوتی ہے کہ تعیش کی زندگی قوموں کی تباہی اور بے ہمتی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن اسلام کو صرف امت یا قوم کی باوقار زندگی ہی مطلوب نہیں بلکہ حیات ملی مطلوب ہے جو دین کے اصولوں کے مطابق گزاری جائے۔

جہاد، جس کے اصطلاحی معنی کی وسعت میں جہاد بالسیف ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کا اہم فریضہ ہے جو جماعت یا قوم اس فریضے کی ادائیگی میں منہمک ہوگی اس کی ترجیحات میں شکم پروری بہر حال نچلے درجے میں جگہ حاصل کرے گی اور ظاہر ہے کہ انبیاء و رسل تو بلا استثنیٰ فریضہ جہاد کو بدرجہ اولی ادا کرنے کے مکلف ہیں لہٰذا ان کے لیے زخارف دنیا پر کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم آثار کے ذریعے سے ثابت کریں گے کہ حضور مال و زر کی کم یا زیادہ، کوئی مقدار اپنے پاس نہیں رہنے دیتے تھے۔ مکی دور میں ابتداء ہی میں وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۹۳:۴)کی بشارت خداوندی کے مطابق مدنی دور کے آخری سالوں میں عام عرب دین کے تابع ہو گیا تھا لیکن حضور کے رہن سہن اور طرز بودو باش میں یک سرمو فرق نہیں آیا۔ یہ بات رسول ہی کے کردار میں بدرجہ اتم دکھائی

دے سکتی ہے اور یا پھر ان لوگوں میں اس کا عکس مشاہدے میں آتا ہے جو حضور کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہوں۔ اسلام کے دائرے سے باہر اس کی کوئی مثال سامنے نہیں آئی۔

اس موقع پر ایک وضاحت کر دینی مناسب ہے۔ دنیا کی حرص اور معیار زندگی کوبلند کرنے کی طمع میں مبتلا لوگ سطور بالا میں بیان کی گئی باتوں سے متوحش ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ تاثر لے سکتے ہیں کہ مسلمان بھوک اور پیاس میں مبتلا ہو کر کمزوری اور بے ہمتی کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ حضور خود غزوات میں بھی شریک ہوتے تھے۔ رات دن ابلاغ دین کا فریضہ بھی ادا کرتے تھے اور پانچ وقتی نمازوں کے علاوہ راتوں کو بھی قیام و سجود میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمان مجاہدین دن کو گھوڑوں کی پیٹھ پر ہوتے تھے اور راتوں کو عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ضروریات زندگی کے معاملے میں اسلام کی تعلیمات، جن کا تفصیلی تذکرہ اسلامی معیشت کی بحث کے سلسلے میں کیا جائے گا، میانہ روی کا درس دیتی ہے۔ البتہ جو حرکات تعیش کی تعریف میں آتی ہیں، اور ان کا تصور ہر صاحب ہوش انسان کے ذہن میں ہوتا ہے، ان سے کلی اجتناب کا حکم ہے۔ اسی طرح شکم سیری کو زندگی کا مقصد بنا لینا دین کی منشا کے خلاف ہے کیونکہ اس سے جہاں جسمانی صحت برباد ہوتی ہے وہیں روحانی انحطاط بھی رونما ہوتا ہے۔ اس رجحان کے پھیلنے سے اجتماعی ماحول مسموم ہو جاتا ہے۔ اور مادہ پرستی کے موجودہ دور میں یہ سب کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے :

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۱۲:۴۷)

ترجمہ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اسی طرح بہرہ مند ہو رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔ دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔

اس سلسلے میں فکر کے اندر توازن پیدا کرنے کے لیے اور کسی قسم کی غلط فہمی اور غلو کا قلع قمع کرنے کے لیے یہ فرما دیا:

يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا‌ ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۚ‌ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ‌ ؕ (۳۲-۳۱:۷)

ترجمہ :اے بنی آدم !ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو۔ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟

مندرجہ بالا آثار کے حوالہ جات مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو واضح کر دیتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں توازن کو برقرار رکھنا اسلامی فکر کا ایک سنہری اصول ہے۔ جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے انہوں نے اپنے پر بعض ایسی پابندیاں عائد کر رکھی ہوتی ہیں جو نبی ہونے کی حیثیت سے انہیں کے ساتھ خاص ہوتی ہیں۔ ان باتوں کا وہ امت کو حکم نہیں دیتے، البتہ مقام عزیمت پر متمکن حضرات ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ان معاملات میں بھی حضور کے نقوش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ ان کا تذکرہ اسلامی تاریخ سے متعلق باب میں کیا جائے گا۔ حضور کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں :

بوریا ممنون خواب راحتش
تخت کسریٰ زیر پائے امتش

لیکن حضور نے بوریے پر سونے کا کسی کو حکم نہیں دیا۔ صرف اپنے اوپر اس کولازم کیا۔

اسی طرح انبیاء و رسل روپیہ پیسہ اور کسی طرح کی دولت جمع نہیں کرتے، لہٰذا کوئی ترکہ بھی نہیں چھوڑتے لیکن مسلمانوں کو اس معاملے میں اپنے اتباع کی ہدایت نہیں کرتے۔ دوسرے حاجتمند لوگ زکوٰۃ و صدقات کا مال حاصل کر سکتے ہیں لیکن پیغمبر یہ مال نہ خود لے سکتے ہیں اور نہ ان کے اہل خاندان۔

۱۳ - وحی و رسالت کے تصور پر عالمی اتفاق

رسولوں پر مشتمل انسانوں کی جس جماعت کا ہم نے اس باب میں تذکرہ کیا ہے وہ چمنستان انسانیت کے گلہائے سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ بھی سبھی مذاہب نے مغلبِ یہی کہا کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ہدایت آئی ہے، اگرچہ اس سلسلے میں اصطلاحات الگ الگ استعمال کی گئی ہوں اور ان اصطلاحات کے ساتھ مختلف تصورات و مفہومات وابستہ کیے گئے ہوں۔ لیکن دنیا کے تمام خطوں اور مذاہب میں ہمیشہ سے کسی نہ کسی نوع انسانی سے ماوراء خالق اور مدبر کائنات ہستی یا ہستیوں کا تصور موجود رہا ہے اور تقریباً سبھی مذاہب کوئی نہ کوئی آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

آج کے دور میں بھی دنیا کے تمام خطوں میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج ہے۔ مادہ پرست خدا ناشناس اور تشکیک و بد ادریت کے حامی دانشور، مختلف علمی شعبوں میں مادہ پرستانہ تصور کائنات و حیات کو ذہن میں رکھ کر تحقیق و مطالعہ کرنے اور سائنسی ایجادات و اختراعات کرنے والوں کے زیراثر اور چرچ کی طرف سے علمی کاوشوں کی مخالفت کی وجہ سے مغرب نے اگرچہ مذہب عیسائیت کو اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی مغربی ممالک کی آبادیاں عقیدۃً مذہب عیسائیت کو ایک نجی مسلک کی حیثیت سے اپنائے ہوئے ہیں۔ اس کے معبد آباد ہیں۔ منکرین مذہب کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہیں۔ انجیل کو اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی نازل شدہ کتاب ہدایت تسلیم کرتے ہیں۔ مارکسی کیمونزم نے نصف صدی تک لٹریچر کے ذریعے سے اور پون صدی تک حکومتی جبر و تشدد کے زور سے مذہب کے تصور کو مٹانے کی کوشش کی لیکن کیمونزم خود تو منہدم ہو گئی البتہ مذہب کسی نہ کسی شکل اور درجے میں موجود رہا۔ گویا وحی اور رسالت پر عالمی اتفاق بدستور پایا جاتا ہے۔

اپنے اپنے مذہب کے بانیوں کے متعلق ہر مذہب کے پیرو یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ قبل اور بعد از بعثت ان کی بلند اخلاقی حیثیت ان کے اپنے اپنے معاشروں میں تسلیم کی جاتی تھی۔ لیکن ان کے پیش کردہ نظریات اور ہدایت کو بعض نے قبول کیا اور بعض نے ضد، ہٹ دھرمی اور اپنے آبائی طریقوں سے چمٹے رہنے کی وجہ سے جھٹلا دیا۔ جیسا کہ ہم نے ''پس منظر'' کے باب میں غیر اسلامی مذاہب کے سلسلے میں معتبر محققین کی تحریروں کے

حوالے دے کر ثابت کیا ہے۔ زمانے نے بانیان مذاہب کی زندگیوں کو محفوظ رہنے دیا اور نہ ان کی تعلیمات کو ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی شکل میں جو کتاب نازل ہوئی اس نے، جیسا کہ ہم اس سے قبل آیت(۲:۲۵۸)کا حوالہ دے کر عرض کر چکے ہیں، اعلان کیا کہ ہم رسولوں میں تفریق نہیں کرتے۔ گویا اصولاً اللہ کی طرف سے مبعوث تمام رسولوں اور ان کی تعلیمات کو بر سرحق تسلیم کرتے ہیں جو اپنے مخاطبین تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان پر نازل کیں۔ البتہ قرآن کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں جس کی بنا ہم کسی کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر سکیں۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن انبیاء و رسل کا قرآن میں تذکرہ ہے، ان کو مستثنیٰ کر کے کسی ایک نبی کے حالات بھی زمانہ بعثت ان کی تعلیمات کا حتمی اور ثقہ ریکارڈ موجود نہیں۔ بعض پیروان مذاہب کو یہ تک معلوم نہیں کہ ان کے پاس مذہبی کتب موجود ہیں وہ کن حضرات پر کس دور میں نازل ہوئیں اور مختلف زبانوں میں ان کے متون میں تغیرو تبدل ہوتے رہے وہ کس بنیاد پر وقوع پذیر ہوئے۔

۱۴۔انسان کی ذمہ داری

اب بنی نوع انسان کو سوچنا یہ ہے کہ کسی قابل عمل، اصلح اور مبنی بر عدل نظام ہدایت کو اپنانے کی کیا ضرورت ہے، اور اس وقت خالق کائنات کی طرف سے نازل شدہ مصدقہ ہدایت کہاں پائی جاتی ہے۔ کون سا دین اور کس پیغمبر کی تعلیمات احوال و ظروف کے اعتبار سے انسانی اجتماعیات کے سلسلہ ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزر کر بلوغت نوع انسانی کے مراحل سے مناسب اور ان کے ذریعے محدود و متحارب انسانی اجتماعی اکائیوں کے بجائے نوع انسانی کو ایک اکائی تصور کر کے منظّم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان اس وقت اپنی پریشانیوں کی وجہ سے کسی عالمی نظام کے اصولوں کا متلاشی ہے اور کبھی لیگ آف نیشنز(League of Nations) اور کبھی یونائیٹڈ نیشنز (United Nations)کی شکل میں حصول مدعا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے لیکن کسی اصلح اصولی بنیاد کے فقدان کی وجہ سے یہ کوششیں حالات کو بہتری کی طرف لے جانے کے بجائے خراب سے خراب تر کیے جارہی ہیں (مفصل گفتگو حالات حاضرہ سے متعلقہ ابواب میں کی جائے گی)نیز یہ

بھی توجہ طلب بات ہے کہ کسی مبعوث من اللہ رسول کا اسوہ اور اس کا پیش کردہ فکر اور قائم کردہ نظام انفرادی و اجتماعی نقشہ اپنی اصلی حالت میں انسانوں کی ہدایت کے لیے اس وقت موجود ہے، اور خالق کائنات کی منشا اور اس ہدایت کو لانے والے کسی رسول کی رہنمائی بالکل واضح اور انسانی زندگی لیے فلاح و عدل پر مبنی لائحہ عمل مہیا کرتی ہے تاکہ اسے انسان اس کی انسانی فطرت سے کلی مطابقت رکھنے والے بنیادی اصولوں میں کوئی تحریف کیے بغیر ہر زمانے کے احوال و ظروف کے تقاضوں کے تحت خود اپنائے اور نافذ کرے ۔ آیت(۲۹:۱۸)کیونکہ اگر اصولوں میں حذف و اضافہ کی کھلی چھٹی اور اختیار دے دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے حق رہنمائی کا بطلان ہو جاتا اور بعثت رسول و دین کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لے لی(آیت۹:۱۵)جس کی ادائیگی اس عالم اسباب و مسببات میں علماء و حقہ کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔

اسلام میں احوال و ظروف اور مقتضیات زمان و مکان کے مطابق دین کے اصولوں کو اپنانے کی جو آزادی دی گئی ہے وہ جوابدہی کے ساتھ مشروط ہے۔ صورت حال یوں نہیں ہے کہ اس چند روزہ آزاد زندگی میں جو چاہو کرو اور اس کے بعد کہانی مکمل ہو گئی۔ اس بات کو عقل سلیم کس طرح قبول کر سکتی ہے کہ اگر اس کائنات میں عدل و توازن کا قانون نافذ ہے تو مکافات عمل کا قانون کلیتاً خارج از امکان ہے۔ مفصل گفتگو تو نفاذ کے باب میں ہو گی البتہ یہاں ہم صرف دو آیات قرآنی کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں:

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ(۲۱:۵۲)

ترجمہ ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گروی ہو گا جو اس نے کی ہو گی۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى(۳۱:۵۳)

ترجمہ :وہ بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے برے کام کیے ہیں ان کے کیے کا اور بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے اچھے کام کیے ہیں، اچھا۔

ان دو جملوں پر جب دوسری قرآنی آیات جزاء و سزا کا اور احادیث کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس زندگی کے بعد باز پرس ہو گی۔ جو لوگ انفرادی و اجتماعی دائروں میں دین کو صرف منہ زبانی نہیں بلکہ جذبہ استسلام کے ساتھ اپنائیں

گے، ان کو اس زندگی میں فلاح و اکرام سے نوازا جائے گا اور اخروی زندگی میں وہ کامرانی سے ہمکنار ہو کر جنت میں جائیں گے، جو انسان کے ارتقاء کی ایک بلند منزل ہے۔ اس کے برعکس جو انکار و بطلان کی راہ اختیار کریں گے وہ آخرت میں اپنی گمراہی کی حقیقت سے آگاہ ہو کر پشیمانی اور نامرادی کے احساس میں مبتلا ہو کر گرفتار عذاب ہو جائیں گے۔

باب ۵

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

پیدائش، خاندان اور بچپن

دین اسلام کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ملک عرب میں بمقام مکہ ہوئی۔ آپ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے جو نسب کے اعتبار سے سارے عرب میں اپنی شجاعت، سخاوت، دولت و ثروت، لسانی فصاحت و بلاغت اور خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے افضل واشرف تسلیم کیا جاتا تھا۔ گویا اس قبیلے کو ملک کے دوسرے قبائل کی قیادت کا مقام حاصل تھا۔ آنحضرت عام الفیل (یمن کے حکمران ابرہہ نے جس سال خانہ کعبہ کو مسمار کرنے اور اس کی مذہبی حیثیت ختم کرنے کی غرض سے مکہ پر حملہ کرنے کے لیے ساٹھ ہزار کا لشکر روانہ کیا، جس کا ہراول ہاتھیوں پر مشتمل تھا) کے دوران بروز پیر بتاریخ بارہ ربیع الاول بمطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء اور بعض کے نزدیک قمری اور شمسی سال کے تطابق میں اختلاف کی وجہ سے ۲۹ اگست ۵۷۰ کو پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرات اسمٰعیل اور ابراہیم علیہما السلام سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی تھا۔ گیارہوں پشت پر آپ کے اجداد میں فہر ہوئے ہیں جنہیں قریش کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ قصی نے پانچویں صدی عیسوی میں قبائل کو متحد کر کے حجاز پر قبضہ کیا اور خانہ کعبہ کو اپنی تولیت میں لے لیا۔

آپ کی والدہ کا نام آمنہ تھا۔ ابھی آپ شکم مادر ہی میں تھے کہ یثرب کے سفر کے دوران جناب عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضور کے دادا عبدالمطلب نے آپ کے سر پر دست شفقت رکھا۔ عبدالمطلب قریش اور مکہ کے سردار ہونے اور خانہ کعبہ سے متعلق سقایتہ

اور رفادۃ کی خدمات انجام دینے کی وجہ سے معاشرے میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے، یہاں تک کہ کعبہ میں ان کے لیے نشست مخصوص تھی۔

اس زمانے میں رواج تھا کہ خوشحال گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں کو دودھ پلانے اور صحرا کی کھلی ہوا میں پرورش دلانے کے لیے صحرائی قبائل کی ایسی عورتوں کے سپرد کر دیتے تھے جن کی چھاتیوں میں دودھ ہوتا تھا۔ چنانچہ حضور اپنی عمر کے ابتدائی پانچ سال بنی سعد بن بکر کے قبیلے میں مائی حلیمہ کی سپرداری میں رہے۔ وہاں سے واپسی پر آپ اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ رہنے لگے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا اور آپ کی عمر چھ برس تھی کہ آپ کی والدہ فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد قدرتی طور پر جناب عبدالمطلب نے حضور کی پرورش و نگہداشت کا ذمہ لے لیا۔ لیکن دو سال بعد ہی آنحضرت اپنے دادا کے سایہ عاطفت سے بھی ان کے انتقال کی وجہ سے محروم ہو گئے۔ ازاں بعد عبدالمطلب کی وصیت کے مطابق آپ اپنے چچا ابو طالب کی کفالت میں آ گئے۔ چچا نے آپ کی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کی اور پدری شفقت کے اظہار میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ والدین کی رحلت کے بعد دور یتیمی میں دادا اور چچا کے دل میں آپ کے لیے محبت و ملاطفت کے جذبات پیدا کر دینے پر اپنی رحمت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳:۷)

ترجمہ : کیا اس نے تجھے یتیم پایا تو ٹھکانا نہ دیا !

جناب ابو طالب نے بعثت نبوت کے آٹھ سال بعد یعنی اپنی عمر کے اختتام تک ہر قسم کے نشیب و فراز میں آپ کی معاونت کی اگرچہ خود اسلام سے مشرف نہیں ہوئے۔ عبدالمطلب کی وفات کے بعد اگرچہ ان کے بیٹوں میں بعض دولت مند تھے لیکن سخاوت اور شاہ خرچی کی اس صفت سے متصف نہ تھے جو ان کے باپ میں پائی جاتی تھی۔ ان میں ابو طالب طبیعت کے سخی تو تھے لیکن ان کے مالی ذرائع کی کمی نے انہیں رفادہ(یعنی زائرین کعبہ کو کھانا کھلانے)کی ذمہ داری سنبھالنے کی اجازت نہ دی۔لہٰذا یہ منصب جو زیادہ اثر وقوت کا باعث بن سکتا تھا بنوامیہ کے ابوسفیان بن حرب کوحاصل ہو گیا اور ابو طالب نے سقامیہ(پانی پلانے) کا کام اپنے پاس رکھا۔ ہو سکتا ہے کہ آبائی مشرکانہ مذہب کے تعصب کے علاوہ سقایہ

کی ذمہ داری بھی ان کے قبول اسلام میں سد راہ ہوئی ہو۔ بہرحال اس بات کا حضور کو بہت قلق تھا، اور اگرچہ آپ نے اپنے چچا کے کان میں کہا کہ آپ علیحدگی میں میرے سامنے اعتراف توحید اور میری رسالت پر ایمان لے آئیں تاکہ میں آپ کی مغفرت کی دعا کر سکوں، لیکن ابو طالب نے انکار کر دیا۔ اور وہ اپنے بھتیجے کے ساتھ انتہائی محبت وانس کا تعلق رکھنے اور اس کی صداقت کے معترف ہونے کے باوجود دولت ایمانی سے محرومی کی حالت ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

شباب سے بعثت نبوت تک

ہم''منصب نبوت'' کے باب میں انبیاء و رسل کی قبل از بعثت کی زندگیوں کے متعلق گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں کی معروضات کو اس ذیلی عنوان کا حصہ تصور کرنا چاہیے یہاں ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے شعوری مرحلے سے لے کر رسالت کے منصب پر سرفراز ہونے تک کی زندگی کے متعلق بعض اصولی باتیں عرض کریں گے جن کی تائید بعض واقعات سے بھی کی جائے گی۔

سابقہ انبیاء کی طرح حضور کی نبوی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی۔ یہ خاصی پختگی کی عمر ہوتی ہے اور اس سے قبل بھی انسان عقل و خرد کی استعداد سے مشرف ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت سے مفکرین و حکماء نے چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل خاصا علمی کام کیا ہے۔ اسی طرح اجتماعی قومی شعبوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے اس عمر سے قبل اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق نمایاں مقامات حاصل کیے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی یہی سنت رہی ہے کہ وہ خلعت نبوت چالیس سال کی عمر میں عطا کرتے رہے ہیں۔ اس میں یہی مصلحت دکھائی دیتی ہے کہ اس عمر تک پہنچنے سے قبل ایک ایسا انسان جو اپنے ارد گرد کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کا رجحان اور صلاحیت رکھتا ہو پختگی ذہن و فکر کے بہت سے مراحل ترقی طے کر چکا ہوتا ہے۔

ہم عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اتنی لمبی عمر بسر کرنے کے باوجود حضور نے نبوی دور کے آغاز سے قبل کبھی کسی مذہب کے متعلق اظہار خیال نہیں کیا۔ نہ تاریخ میں حضور سے کوئی ایسا ایک خطاب بھی منسوب ہے جس سے یہ عیاں ہو کہ آپ لوگوں کے عقائد و نظریات پر

اثرانداز ہونے کے لیے کوشاں رہے ہوں۔ اس دور میں ملک عرب کے لوگ ذہنی سطح پر صرف شاعری اور کثرت سے اشعار یاد کرنے کو ایک مرغوب مشغلہ تصور کرتے تھے۔ اس دائرے میں ان کا ذوق بھی بہت بلند تھا لیکن حضور نے کبھی شعر و شاعری کی طرف بھی خصوصی توجہ نہیں دی۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی روایت بھی نہیں ملتی کہ حضور نے کبھی کسی یہودی یا نصرانی عالم کی مجلس میں شرکت کی ہو جس سے ان مذاہب کے متعلق آپ کو کچھ معلومات حاصل ہوئی ہوں۔ اور اس سے آپ کو تہذیب اخلاق اور حصول علم کے مواقع میسر آئے ہوں۔ ویسے بھی آپ نے ایک امی معاشرے میں زندگی بسر کی اور آپ خود بھی لکھنے پڑھنے سے نابلد تھے اور کسی مذہبی کتاب کا اپنے طور پر مطالعہ کرنے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ نہ عرب میں تصنیف و تالیف کتب کا کوئی رواج تھا۔ وہاں ہر معاملے کے سلسلے میں انفرادی حافظے پرہی اعتماد کیا جاتا تھا۔

بعثت سے قبل آنحضرت نے کوئی جماعت منظّم کی نہ عوامی معاملات میں کبھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نہ حضور نے کبھی قوم کے اندر نمایاں ہونے کی کوشش کی۔ یہ سب کچھ عرض کرنے سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر کو پہنچنے تک انسان کو مرحلہ بلوغت حاصل کیے ہوئے بیس پچّیس سال گزر چکے ہوتے ہیں۔ اور اس سارے عرصے میں ایک ذہین و فطین شخص استعداد تفکر و تدبر سے مالامال ہوتا ہے۔ اور اگر زندگی میں اس کے اندر حصول علم یا قیادت و سربراہی کے عزائم موجود ہوں تو ان کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں حیات فرد کے اس دور میں ہو جاتا ہے۔ حضور کے انداز زندگی میں ایسے کسی قسم کے آثار کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ آپ نے اپنی نبوی زندگی کے تئیس سال کے عرصے میں جو بے مثل کام انجام دیا وہ آپ کے نابغہ روزگار ہونے کی حیثیت سے بلند ترین مقام پر فائز ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اونچی ذہنی و عملی استعداد رکھنے والے لوگوں میں نوجوانی کی عمر ہی میں مقامات علیا کے حصول کی استعدادکے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور وہ اس راستے پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلا :

حضرت امام مالک رحمہ اللہ علیہ نے ۱۱۷ھ میں ۲۴ سال کی عمر میں علوم متداولہ کے حصول کے بعد مجلس درس قائم کی۔ (سیرت ائمہ اربعہ از سید رئیس احمد جعفری صفحہ ۲۴۴)

حضرت امام شافعی کو علماء مدینہ اور امام مالک رحمہ اللہ علیہ ۱۴ ۔ ۱۵ سال کی عمر میں فتویٰ دینے کی اجازت دے چکے تھے۔ (سیرت ائمہ اربعہ از سید رئیس احمد جعفری صفحہ ۳۲۴)

حضرت امام احمد حنبل رحمہ اللہ علیہ نے ۷۹ اھ میں پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ تحصیل علم حدیث شروع کی۔(امام احمد بن حنبل۔ تالیف پروفیسر محمد ابو زہرہ۔ ترجمہ نائب حسین نقوی امروہی صفحہ ۸۰)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ علیہ چودہ برس کی عمر میں ان تمام کتب کو پڑھ چکے تھے جنہیں نصاب فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں سند تدریس وارشاد کو سنبھالا۔(حجتہ البالغہ جلد اول کے متن سے قبل مولانا عبدالرحیم نے شاہ صاحب کی مختصر سوانح عمری لکھی ہے :صفحہ ۵۷ اور ۶۰)

حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ انیس برس کی عمر میں مسند افتاء پر رونق افروز ہو گئے۔(امام ابن تیمیہ از محمد یوسف کو کن عمری صفحہ ۷۲)

یہ چند مثالیں غلامان محمد صلعم کی ہیں۔ مسلمانوں کے حلقے کے باہر بھی یہی صورت ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر چالیس سال کی عمر تک حضور کیوں خاموش رہے اور اس عمر کو پہنچنے پر حضور کی جملہ صلاحیتیں اچانک کیوں اور کس طرح بیدار ہو گئیں۔ سوائے نزول وحی کے اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات حضور کے رسول صادق ہونے کی دلیلوں میں سے ایک ناقابل تردید دلیل ہے۔ آخر عمر کے اس مرحلے پر پہنچ کر آپ نے قرآن جیسی فصیح و بلیغ اور معنوی اعتبار سے بلند ترین مقام رکھنے والی کتاب کس طرح پیش کرنا شروع کر دی۔ ایک مقصد کے لیے سود و زیاں کے کسی خیال سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو کیوں ہمہ تن وقف کر دیا۔ اس کے لیے ہر مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جیسی ذہین خاتون اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے ذہنی طور پر بلند لوگ کیوں آپ کی رسالت پر یقین کامل کے ساتھ ایمان لے آئے۔ اس کے بعد حضور کی جہدوجہد کا مال و انجام دیکھئے جو ہارے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

ہاں ایک بات واضح ہے کہ آپ کی تہذیب نفس کا یہ عالم تھا کہ اپنی چالیس سالہ عمر یک معروف قسم کے جملہ اخلاقیات حسنہ سے مزین رہے ہیں اور کسی قسم کے ایسے اعمال سینہ میں ملوث نہیں ہوئے جو عرب معاشرے میں مروج تھے اور ان کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے۔ حضور کے مزاج میں متانت اور سنجیدگی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ آپ میں دیانت وامانت کی صفت اس حد تک نمایاں اور مسلمہ تھی کہ لوگ حضور کے پاس اپنی امانتیں رکھتے اور آپ ''امین'' کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ میں کذب، فریب یا تصنع کا شائبہ تک نہ پایا جاتا تھا۔ غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور حاجت مند لوگوں کی بقدر وسائل اعانت کرنا آپ کا شیوہ تھا۔ ہر کسی سے گفتگو کرنے کا انداز نہایت شائستہ ہوتا تھا۔ دوسرے کی بات نہایت غور و تحمل سے سنتے اور نہایت مناسب انداز میں جواب دیتے تھے۔

اگرچہ مزاج کے معتدل ہونے اور طبیعت میں تواضع اور انکساری کے رسوخ کی وجہ سے شعلہ مزاج معاشرے میں آپ کی خاموش طبع شخصیت کے لیے کسی مقام علیا کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی لیکن اس کے باوجود عنفوان شباب ہی میں لوگ آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حضور جب تیئس برس کے تھے تو بادوباراں کے ایک طوفان کی وجہ سے خانہ کعبہ جو مکہ کے نشیبی علاقے میں ہے، کی عمارت منہدم ہو گئی۔ اس کی تعمیر کے لیے اسے چار حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصہ قریش کے چار نمایاں قبیلوں کے حوالے کر دیا گیا۔ حضور بھی تعمیر کے اس کام میں حصہ لیتے رہے۔ جب دیواروں کی تعمیر کا کام قد آدم تک پہنچ گیا تو حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کا سوال پیدا ہوا۔ ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ اس کام کو وہ انجام دے۔ اختلاف نے یہ شدت اختیار کرلی کہ تلواروں کے میانوں سے نکل آنے کی نوبت آگئی۔ اس پر لوگوں میں سے سب سے زیادہ عمر رسیدہ ابو امیہ بن مغیرہ المخزومی نے یہ تجویز پیش کی کہ جو شخص کل صبح باب الصفاء کے راستے سب سے پہلے داخل ہو اسے حکم بنا لیا جائے۔ اس تجویز کو سب نے قبول کیا۔ چنانچہ حضور سب سے پہلے داخل ہوئے۔ سب نے کہا کہ یہ شخص قابل اعتماد(الامین) ہے اور اس کے فیصلے کی ہم پابندی کریں گے۔'' چنانچہ حضور نے فرمایا کہ ایک چادر لائی جائے۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اٹھا کر اس زمین پر پھیلائی ہوئی چادر کے درمیان رکھ دیا۔ اس کے بعد چاروں قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ

وہ چادر کے ایک ایک کونے کو پکڑ کر اوپر اٹھائیں۔ جب چادر اس مقام تک پہنچ گئی جہاں حجر اسود کو رکھنا تھا تو آپ نے حجراسود کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس طرح آپ کی حسن تدبیر سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا اور قریش ایک بڑے حادثے سے محفوظ رہے۔

عرب شراب کے رسیا،صنفی بے راہ روی کے شکار اور قمار بازی کے بہت شوقین تھے۔ لیکن آپ عنفوان شباب میں بھی ان میں سے کسی برائی میں ملوث نہیں ہوئے۔ آپ عفت و پاکبازی کے پیکر تھے۔

شرک اور بت پرستی کی وبا تو اپنی انتہائی قبیح صورت میں پھیلی ہوئی تھی، اور گویا قریش کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی شعبہ ہائے زندگی کے جزولانیفک کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی ذریعے سے انہیں مکہ میں مقام بزرگی اور سربراہی حاصل تھا۔ یہی بات ان کی تجارتی سرگرمیوں کے بغیر کسی خطرے کے انجام پانے کا باعث تھی۔ جب دوسرے قبیلوں کے تجارتی قافلے لٹ جاتے تھے تو قریش شمال و جنوب ہر سمت میں کعبے کے متولی ہونے کی وجہ سے آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ پھر یہ کعبے کی تولیت ہی کا نتیجہ تھا کہ حرم مکہ جنگوں سے محفوظ تھا جب کہ بقیہ سارا عرب قبائلی لڑائیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسی طرح وہ سماجی اور معاشرتی حیثیت سے دوسروں سے افضل سمجھے جاتے تھے۔ انہیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ یہ سب سہولتیں اور برتری کی حیثیت انہیں اس وجہ سے حاصل ہے کہ وہ اس گھر کے متولی ہیں جس میں عرب کے سارے بت جمع ہیں۔ لہٰذا بتوں کی پوجا ان کے ہاں ہر قسم کی اہمیت کی مالک تھی۔ لیکن انکشاف حقیقت اور نزول ہدایت سے قبل بھی آنحضرت نے شرک کی ہر شکل و صورت سے اجتناب کیا۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ان کی ابتدائی عمر میں جب کہ آپ اپنےدادا کے زیر کفالت تھے، یہ بات حضور کے مشاہدے میں آتی تھی کہ ان کے دادا ہی اس سارے نظام شرک کے سربراہ ہیں۔ دادا کی وفات کے بعد ان کے چچا ابو طالب بھی شعبہ سقایہ کی ذمہ داری کی وجہ سے بتوں سے معمور خانہ کعبہ سے براہ راست منسلک تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود حضور کا دامن شرک کی آلودگیوں سے سو فیصد پاک رہا۔

حضور اپنے چچا ابو طالب کی پدری شفقت کے جواب میں پسرانہ تابعداری کا رویہ رکھتے تھے۔ ان کے ریوڑ کو چرانے کے لیے جنگل میں لے جاتے تھے اور پوری طرح اس کی نگہداشت کرتے تھے۔ سقایہ کے فرائض کی انجام دہی میں بھی اپنے چچا کی امداد کرتے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں آپ جناب ابو طالب کے ہمراہ تجارتی سفر پر شام تشریف لے گئے۔ سفر ویسے بھی بیدار قوائے ذہنیہ حسیہ رکھنے والوں کے لیے فکری افق کی وسعت کا باعث سمجھا جاتا ہے، لیکن بین الاقوامی سطح کا سفر اس لحاظ سے زیادہ افادیت کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ حضور اسی سفر میں قوم ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات، وادی القریٰ اور مدین جیسی جگہوں سے گزرے۔ کم عمری کے باوجود آپ کی غیر معمولی ذہانت و فطانت سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ اس سفر میں آپ کی فطری ارتقاء کی حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ تجارتی خرید و فروخت اور لین دین کے طریقوں کے نقوش بھی آپ کے ذہن میں مرتسم ہو گئے ہوں گے۔

بیس سال کی عمر کے لگ بھگ آپ نے بعض بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے والے تاجروں کے نمائندے کی حیثیت سے مختلف اطراف میں تجارتی سفر شروع کیے۔ اس حیثیت سے آپ نے جس دیانت و امانت کا مظاہرہ کیا اس کا شہرہ مکہ کے تجارتی حلقوں میں ضرب المثل کے طور پر پھیل گیا، اور آپ کو امین کے نام سے پکارا جانے لگا۔ آپ کے تمام تجارتی سفر نہایت کامیاب اور نفع بخش رہے۔

مکہ کی ایک نہایت شریف بیوہ خاتون نے جن کا اسم گرامی خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد تھا اپنے خاوند کا وسیع کاروبار ورثے میں حاصل کیا ہوا تھا۔ حضور کی دیانت کا شہرہ انہوں نے سن رکھا تھا۔ اگرچہ آپ نوجوانی کی عمر میں تھے لیکن وہ تجارتی معاملات میں آپ کی پختگی ذہن کو بھانپ گئیں۔ چنانچہ ان خاتون نے آپ کو اپنا کاروبار سنبھالنے کی پیشکش کی جسے حضور نے قبول فرمایا۔ آپ نے کام کو اس قدر دیانت، خوش اسلوبی اور خوش معاملگی سے چلایا کہ وہ خاتون آپ سے بہت متاثر ہوئیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نفیسہ نامی ایک خاتون کے ذریعے آنحضرت کو کہلا بھیجا کہ آپ انہیں اپنی زوجیت میں لے لیں۔ حضور نے حسب عادت نفیسہ سے نہایت متانت اور انداز تفکر کے ساتھ چند سوالات کیے۔ جب حضور کو ان

سوالات کے تشفی بخش جوابات ملے تو آپ نے اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس برس اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی چالیس سال تھی۔ یہ رفاقت پندرہ سال قبل از بعثت سے شروع ہوئی اور نبوی دور کے آٹھ سال تک نہایت خوش اسلوبی اور ملاطفت سے جاری رہی جب کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر تریسٹھ برس اور حضور کی عمر اڑتالیس برس تھی۔ اس عرصے میں حضور نے اور کوئی شادی نہیں کی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضور کے تین بیٹے قاسم، طاہر، اور طیب اور چار بیٹیاں زینب رقیہ،ام کلثوم، اور فاطمہ تولد ہوئیں۔ تینوں بیٹے حضور کی بعثت سے قبل ہی خالق حقیقی سے جاملے۔

آثار وحی و رسالت

ہم اس سے پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ قبل از بعثت کی زندگی کے دوران آنحضرت شخصی حیثیت سے اخلاق حسنہ سے مزین تھے۔ آپ کے اندر یہ خوبیاں ذاتی سطح پر پائی جاتی تھیں اور آپ دوسرے لوگوں سے حسن سلوک کا جو رویہ رکھتے تھے وہ کسی تعلیم و تعلم کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ حرکات آپ سے ایک ملکہ راسخہ کے طور پر طبعاً سرزد ہوتی تھیں۔ اجماعی زندگی کی جس قسم کی شکل بھی نافذ تھی اس کے خلاف حضور نے کبھی لب کشائی نہیں کی۔ البتہ معاشرتی اور مذہبی رسومات خبیثہ و سیئہ سے آپ نے اجتناب کیا۔ یہ سب کچھ آپ کے ذاتی طرز عمل کا مظہر تھا۔

کتب تاریخ میں ارد گرد پھیلی ہوئی برائیوں کے متعلق قبل از بعثت آپ کے کسی واضح ذہنی و باطنی رد عمل کے اظہار کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ لیکن عمر عزیز کے چالیس برس تک پہنچنے سے کچھ عرصہ پہلے آپ میں گوشہ نشینی اور عزلت پسندی کے آثار رونما ہوئے۔ اور اس کی عملی صورت یہ تھی کہ آپ آبادی سے نکل کر مکہ کے قریب کی پہاڑیوں کی خاموش فضا میں جا کر تنہائی میں وقفے وقفے سے وقت گزارنے لگے۔ کبھی اپنے گھر تشریف لے آتے اور پھر کچھ روز کے کھانے پینے کا کچھ سامان لے کر گوشہ تنہائی میں چلے جاتے۔ یہ کیفیت بعثت سے کتنا عرصہ قبل آپ پر طاری رہی اس کا تاریخ سے تعین نہیں ہوتا۔ البتہ یہ روایات ملتی ہیں کہ رمضان کے مہینے میں غار حراء ہی میں، جس میں آپ عام طور یہ عزلت کے وقفے

گزارتے تھے، آپ کا زیادہ تر وقت گزرتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دور چند دنوں ہفتوں یا مہینوں پر پھیلا ہوا نہیں تھا بلکہ یہ کچھ سالوں کو محیط تھا۔ آپ کے علم میں کسی رسمی عبادت کی کوئی متعین شکل تو تھی نہیں نہ آپ کی قبل از بعثت کی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہونے کے کوئی آثار مردی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ذہن میں بعض خیالات کا شدید غلبہ ہو گا جو آپ کو اپنے بال بچوں اور شہری آبادی کو چھوڑ کر گوشہ تنہائی میں جا کر غورو فکر پر مجبور کرتا ہوگا۔ حضور کے اس طرز عمل کو ہم ریاضت و ، و مجاہدے کی کسی شکل سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں جس میں آپ اپنی رجحان طبیعت اور طلب ہدایت کی خواہش کے مطابق مصروف رہتے ہوں گے اور جسے آغاز وحی کے سلسلے میں آئندہ نقل کی جانے والی حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث میں تحنث و عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر اس دور کے معاً بعد نزول وحی اور اس دین کے اساسات کے پس منظر میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سے دنیا کو دیا، غور کیا جائے تو انسان اسی نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ آپ کے اندر قدرتی طور پر اخذ ہدایت کی امنگ اور ادراک حقیقت کی خواہش شدت سے پیدا ہو رہی تھی اور وحی کی وصولی کے لیے آپ کے ذہن و قلب اور ساری بشری توانائیوں کو تیار کیا جا رہا تھا۔ ورنہ نہ آپ کسی راہب یا رہبانیت کے کسی مسلک سے بھی وابستہ رہے نہ اس سلسلے میں آپ کے سابقہ طرز عمل میں کسی قسم کی عزلت نشینی کے رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ کا طرز عمل معاشرے میں لوگوں کی عام روش سے مختلف تو تھا، لیکن آپ اس معاشرے میں رہتےہوئے معروف اعلیٰ اخلاقی اقتدار کے متحمل ہونے کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس سے کٹنے اور ترک دنیا کی طرف آپ کی طبیعت کبھی مائل نہیں رہی۔ خلوت گزینی کی خواہش کی یہ کیفیت آپ پر نزول وحی سے متصل کچھ عرصہ پہلے طاری رہی۔ چونکہ اس سلسلے میں حضور نے اظہار خیال نہیں فرمایا اس لیے ہم یقین کے ساتھ متعین طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ کی طبع سلیم دور جاہلیت میں انفرادی، اجتماعی سطح پر جاری و ساری اخلاقی و مذہبی اور معاشرتی برائیوں سے ابا تو کرتی ہو، لیکن چونکہ آپ کے پاس کوئی فکرو زندگی کا لائحہ عمل موجود نہ تھا لہٰذا آپ نے اپنی غیر معمولی ذہانت و بصیرت کی وجہ سے ان معاملات میں الجھنا نا مناسب اور لاحاصل سمجھاہو۔

اس کے علاوہ یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ حضور کو انسانی فکرو حیات کے ایک ایک گوشے کے لیے ایک مکمل و اکمل دین کے ذریعے رہنمائی ملنے والی تھی۔ اب اگر بعثت سے قبل حضور کچھ نظریات پیش کر دیتے تو ان کا اس دین کے اصولوں سے کلی مطابقت رکھنا محال تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ کی قدرت کاملہ حضور کو اس تضاد میں مبتلا ہونے دیتی کہ منصب نبوت سے ملنے سے قبل تو آپ ایک قسم کے نظریات اپنے ذہن سے اختراع کر کے پیش کرتے اور جب یہ منصب مل جاتا تو وحی کے ذریعے سے ملنے والے اصولوں کی اشاعت کا آغاز کر دیتے جو اس سے قبل پیش کیے گئے نظریات سے مختلف ہوتے۔ اس سے دین کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو جاتیں اور حضور کی ذات بھی اس تنقید کا نشانہ بنتی کہ مختلف مراحل زندگی کے دوران آپ متضاد قسم کی باتیں کرتے رہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات اللہ کی مشیت ہی میں نہیں تھی کہ حضور بعثت سے قبل مسائل حیات انسانی کے متعلق کوئی رہنمائی فراہم کرتے۔ البتہ وصول ہدایت سے قبل ذاتی حسن اخلاقی عین اس منصب رسالت کا تقاضا تھا جس پر آپ کو فائز کیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بعثت کے بعد حضور سے کہا کہ لوگوں میں یہ اعلان کریں کہ میں نے اتنی عمر تمہارے درمیان گزاری ہے تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تو کیا اب میں اس بات کے بر سر صداقت نہ ہونے کے باوجود اتنی بڑی کذب بیان کرنے لگوں گا کہ خالق کائنات کی طرف سے مجھ پر وحی کا نزول ہورہا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ(۱۶:۱۰)

ترجمہ : اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

یہ بات حضور کی صداقت پر ایک ایسے برہان قطعی کی حیثیت رکھتی تھی کہ اس کا مکذبین رسالت محمدی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اور آج جو لوگ، خصوصیت کے ساتھ مستشرقین، جو منکرین وحی ہیں اور کہتے ہیں کہ بشمول قرآن حضور نے جو کچھ پیش کیا وہ ان کے اپنے ذہن کی اختراع و تصنیف تھی۔ ان کے اس دعوے کی تغلیط کے لیے یہ بات کافی ہے کہ چالیس برس تک کی خاموشی کے بعد حضور نے دعوتی کام کا آغاز یکلخت غیر معمولی انہماک کے ساتھ کیسے شروع کر دیا جس کے نتائج نہایت محیر العقول ثابت ہوئے۔

غار حراء میں غورو فکر اور گوشہ نشینی کے سطور بالا میں بیان کیے گئے دور میں ایک ایسا روز آیا کہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ایک فرشتہ حضور کے سامنے کھڑا آپ سے کہہ رہا تھا۔"اقـراء" (پڑھو)۔ آنحضرت نے (فرط حیرت میں) جواب دیا"مـا انـا بقـاری" (میں پڑھا لکھا نہیں ہوں) یہ واقعہ اور اس کے بعد کی تفصیلات کے سلسلے میں ایک متفق علیہ حدیث پیش کرنا زیادہ مناسب ہوگا :

عن عائشة قالت أول ما بدی به رسول الله صلی الله علیه واله وسلم من الـوحي الرویا الصابقة في النوم فکان لا یری رویا الا جاءت مثل فلق الصبح ثـم حبـب الیه الخلاء وکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیه وهو التعبد اللیالي ذوات العـد بـــ قبل عن ینزع الی اهله وتیزوب لذ لك ثم یرجع الی خدیجه فیتذ وبالمثلهـا حـتی جاءه الحق وهو فی غار حراء فجاءه الملك فقل اقرء فقال مـا انـا بقـاری ء قـال فاخذ فی فغطني حتی بلغ منی الجهد ارسلني فقال اقرء قلت ما انا بقاری فاخـذ في نغطنی الثالثة حتی بلغ منی الجهدثم ارسلني فقل اقرء باسم ربك الذی خلـق خلق الانسان من علق اقرء وربك الاکرم الذي علم بالقلم علم الانسان ما لـم یعلم فرجع بها رسول الله صلی الله علیه وسلم فدخل علی خد یجة فقال زملوني زملوني فذ حلوه حتی ذهب عنه الروع فقال لخدیجة واخبرها الجز لقد خشـیت علی نفسی فقالت خدیجة کلا واله لا یحذ یک الله ابرا انك لتصل الرحم وتصدق الحدیث وتحمل الکل وتکسب المعد وم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحـق ثم انطلقت به خدیجة الی ورقة بن نوفل ابن عم خدیجة فقالت له یـا ابـن عـم اسمع من ابن اخیك فقال له ورقة یا ابن اخر ما نا تری فاخبره رسول الله صـلی الله علیه وسلم خبر ما رائی فقال له ورقة هذا الناموس الذي انزل الله علی موسی یلیتنی کنت فیها جذ ما یلیتني اکون حیا از یخرجك قومك فقال رسول الله صلی الله علیه أو مخرجی هم قال نعم لم یات رجل قط بمثل ما جئت به الا عـوبی و

ان یدرکنی یومک انصرک نصرا مؤذ را ثم لم ینشب ورقة ان توفی الـوحی (متفق علیہ)

ترجمہ : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ وحی کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس چیز سے ابتداء ہوئی وہ سوتے میں بچے خوابوں کا دیکھنا تھا۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے تھے وہ صبح کی روشنی کی طرح سچی ثابت ہو جاتی۔ پھر آپ کو علیحدگی کا شوقین بنا دیا گیا اور آپ غار حراء میں گوشہ نشینی اختیار کرنے لگے۔ اس میں آپ عبادت میں مشغول رہتے جو متعدد راتوں تک جاری رہتی جب تک آپ کو اہل خانہ کی (خبر لینے) کی خواہش نہ پیدا ہو جاتی، اور اس وقت کے لیے آپ کھانے پینے کا سامان لے جاتے۔ پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس آتے اور اسی طرح سامان خورو و نوش لے آتے۔ حتیٰ کہ غار حرا ہی میں حق آگیا۔ ایک فرشتہ آگیا اس نے کہا"پڑھئے" میں نے کہا "میں پڑھنا نہیں جانتا" حضور فرماتے ہیں کہ اس نے مجھے پکڑا اور مجھے بھینچا حتیٰ کہ مجھے تکلیف ہوئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا۔ پھر کہا"پڑھئے" میں نے کہا"میں نہیں پڑھ سکتا" پھر اس نے مجھے پکڑا اور بھینچا حتیٰ کہ مجھے تکلیف ہوئی۔ پھر چھوڑ دیا پھر اس نے کہا "پڑھئے"میں نے کہا"میں پڑھنا نہیں جانتا" اس نے مجھے پکڑا اور تیسری بار بھینچا حتیٰ کہ مجھے تکلیف ہوئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْـرَاْ وَرَبُّـكَ الْاَكْـرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

ترجمہ : یعنی پڑھ اپنے اس خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے لوتھڑے سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطہ ہے۔ اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کے ساتھ(مکہ)واپس آئے اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور کہا "مجھے کپڑا اوڑھاؤ مجھے کپڑا اوڑھاؤ" ۔(حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) نے کپڑا اوڑھا دیا۔ جب آپ کی خوف کی کیفیت جاتی رہی تو خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بات کی اور واقعہ بتایا اور کہا کہ میں اپنی جان کے متعلق خوفزدہ ہوں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا "ایسا

ہر گز نہیں۔ اللہ کی قسم اللہ آپ کو کبھی پریشانی میں مبتلا نہ کرے گا۔ آپ قرابت داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں، آپ صادق القول ہیں، آپ دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، اور غرباء(پر خرچ کرنے) کے لیے کماتے ہیں، آپ مہمان کی خاطر مدارت کرتے ہیں،اور حقیقی مصائب میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں''۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور کو ورقہ بن نوفل، جو خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھا، کے پاس لے گئیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہانے اس(ورقہ) سے کہا''اے چچا زاد بھائی اپنے بھتیجے کی بات سنو'' ورقہ نے حضور سے کہا''اے میرے بھتیجے آپ نے کیا دیکھا؟'' رسول نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بتایا۔ ورقہ نے آپ سے کہا ''یہ وہی ناموس(فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔ کاش میں اس وقت طاقت ور جوان ہوتا، کاش میں اس وقت زندہ ہو تا جب آپ کی قوم آپ کو(آپ کے شہر) سے نکال دے گی''رسول '' نے سوال کیا کیا میری قوم مجھے شہر سے نکال دے گی؟ ''اس(ورقہ)نے کہا''ہاں۔ جب بھی کوئی شخص اس بات کی مانند(پیغام ہدایت) لے کر آیا جو آپ لائے ہیں تو اس سے دشمنی کی گئی، اگر میں اس وقت زندہ رہا (جب آپ دین حق پیش کریں گے)تو میں پوری قوت کے ساتھ آپ کی حمایت کروں گا''۔ اس کے بعد ورقہ کا انتقال ہوگیا اور وحی(ایک وقفے کے لیے)منقطع ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ آغاز وحی کا یہ واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر نہیں بلکہ حضور ہی سے سن کر بیان کیا ہے۔

یہ بات ذہن میں مستحضر رہنی چاہیے کہ نزول وحی کا معاملہ غیب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی کیفیت کے ادراک کرنے سے عام انسان اپنے قوائے فکریہ وحسیہ کی محدودیتوں کی وجہ سے قاصر ہے ۔ اس کیفیت کا علم صرف صاحب وحی کو ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وصول وحی کے حالات کو مجازی انداز سے انہی الفاظ میں بیان کیا گیا جو انسان کی سمجھ میں آسکتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجتہ البالغہ جلد دوئم میں ''سیرۃ النبی''کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ(ترجمہ)جب غار حراء میں وحی نازل ہوئی تو آپ کے دل میں اس کی طبعاً تشویش پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کی ملکیت کے شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہونے اور آپ کے جملہ قواء پر یکسر ملکیت چھا جانے سے طبیعت پر گھبراہٹ طاری ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا فلسفہ یہ

ہے کہ انسان کی دو حیثیتیں ہیں، بشریت اور ملکیت جب آدمی ظلمات طبیعت کو چھوڑ کر عالم ملکوت کے انوار میں قدم رکھتا ہے تو اس کی ان دونوں حیثیتوں میں کشمکش رونما ہوتی ہے اور بتدریج اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے"۔

مندرجہ بالا حدیث میں حضور پر جو سب سے پہلے وحی مذکور ہے وہ سورہ علق کی پہلی پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وحی کا سلسلہ بند ہو گیا اور اس دور کو فترۃ الوحی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس عرصے کے دوران حضور بہت پریشان رہتے تھے اور وحی کے دوبارہ آنے کا شدت سے انتظار رہتا تھا ۔ یہ طلب ہدایت کی اس شدت کا نتیجہ تھا جو آپ کے اندر قبل از نزول وحی موجود تھی اور جس نے آپ کو گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا۔ اب پہلی وحی نے اس کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

انقطاع وحی کی مدت کا روایات متفرقہ سے تعین نہیں ہو سکا۔ کیونکہ اس وقت ابھی صحابہ کی ایسی جماعت وجود میں نہیں آئی تھی کہ جس نے بعد کے ادوار میں احادیث نبوی کو محفوظ کرنے کا کام کیا۔

البتہ آغاز وحی والی او پر نقل کی گئی حدیث کی شرح میں نواب قطب الدین(شارح مشکوۃ)تحریر کرتے ہیں:

"نیز علامہ ابن حجر لکھتے ہیں :سلسلہ وحی کے منقطع ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سورہ اقراء اوریاایھاالمدثرکے نزول کے درمیان آنحضرت کے پاس حضرت جبرئیل کی آمد کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ بلکہ انقطاع وحی سے مراد نزول قرآن کے سلسلہ کا موقوف ہو جانا ہے۔ اس عرصہ میں حضرت جبرئیل تو آتے رہتے تھے لیکن قرآن نہیں لاتے تھے۔ اور کچھ عرصہ کے لیے نزول وحی کے موقوف ہو جانے میں مصلحت و حکمت یہ تھی کہ ابتدائی مرحلہ پر آنحضرت کے دل میں جو خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور اس خوف و ہراس کی جگہ شوق و انتظار کے جذبات پیدا ہو جائیں"۔

مندرجہ ذیل متفق علیہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقراہ کے بعد سورۃ المدثر کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں :

عن جابر انه سمع رسول یحدث عن فترقه الوحی قال فبینا انا امشی۔ سمعت صوتا من السماء فرجعت بصری فاذا الملك الذی جاء فی بحراء قاعد علی کرسی بین السماء والارض فجثثت منه رعبا حتی هویت الی الارض فجئت اهلی فقلت زملونی زملونی فزملونی فانزل الله تعالی یایها المدثر قم فانذار وربك فکبر وثیابك فطهر والرجز فاهجز تم حمی الوحی وتتابع

ترجمہ : حضرت جابر سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انقطاع وحی کے متعلق بیان کرتے ہوئے سنا۔ حضور نے فرمایا میں چلا جا رہا تھا کہ میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی۔ میں نے اپنی نظر اٹھائی۔ میں نے دیکھا کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حراء میں آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں اس کے رعب میں دب گیا حتیٰ کہ میں زمین پر گر پڑا۔ میں گھر آیا اور کہا کہ مجھے کپڑا اوڑھا دو کپڑا اوڑھا دو چنانچہ مجھے کپڑا اڑھا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں(ترجمہ)اے چادر لپیٹے رکھنے والے ! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب ہی کی کبریائی کی منادی کر اور اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی کو چھوڑ۔ ''اس کے بعد وحی تواتر کے ساتھ آنے لگی۔

علامہ ابن کثیر سورۃ المدثر کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وحی کے ساتھ حضور کو نبوت سے ممتاز کیا گیا اور اس (المدثر) کی وحی سے آپ رسول بنائے گئے۔

آغاز دعوت

المدثر کے نزول کے ساتھ حضور کو مستعدی کے ساتھ دعوت کا آغاز کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ حجتہ البالغہ کے آخری باب میں لکھتے ہیں کہ پھر آپ سے کہا گیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ(۱۵:۹۴)

ترجمہ : تو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے اس کو آشکارا طور پر سنا دو۔ اور:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶:۲۱۴)

ترجمہ : اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ۔

دعوت کے سلسلے کے واقعات اور مختلف مراحل سے گزر کر اس کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی داستان تو ہم ''اسلام تاریخ میں'' کے زیر عنوان الگ باب میں تحریر کریں گے۔ اس باب میں ہم اصولی سطح پر حضور کے اسوہ حسنہ، دین میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ آپ کے منفرد مقام ، آپ کے سیرت و کردار اور آپ کی اس بے مثل مربیانہ صلاحیت پر گفتگو کریں گے جس نے فکر و عمل کے دائروں میں تھوڑے سے عرصے میں وہ افرادی مواد تیار کر لیا جو اقامت دین کے لیے موزوں ثابت ہوا اور جس کے بغیر اس دور میں اس مقصد کا حصول ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔

حضور کی حیات طیبہ کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب ہیں

ادوار کہنہ میں چونکہ کتابت اور تصنیف و تالیف کا کوئی رواج نہ تھا اس لیے انبیاء ورسل، بادشاہوں اور حکمرانوں اور علماء و حکماء کی زندگیوں کے حالات اور ان کے مذاہب وادیان اور افکار و نظریات کو ضبط تحریر میں نہ لایا جا سکتا تھا۔ لوگ قصے کہانیوں کی شکل میں نسلاً تاریخی رودا دوں اور واقعات اور اہم شخصیتوں کے حالات زندگی بیان کرتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ اس سلسلے میں ثقابت و سند کے متعین طریقوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا روایات میں بڑی تیزی سے تحریف ہوتی رہتی تھی۔ ہم نے ''پس منظر'' کے باب میں محققین کی تحریروں کے حوالے دے کر نہ صرف اس دور کی صورت حال پر گفتگو کی ہے بلکہ بعد کے ادوار میں بھی جب کہ کتابت کا رواج ہو گیا تھا اہم شخصیتوں کے حالات زندگی، ان کا مقام و مرتبہ اور ان کی تعلیمات و نظریات کی روایات میں حذف و اضافہ اور معدومیت کی وجہ اور بعض اوقات حادثات زمانہ کی وجہ سے ثقاہت کے پہلو بالکل ناپید ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے جیسا کہ مثلاً گو تم بدھ کے معاملے میں ایسا ہوا کہ ان کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد را جگیری کے مقام پر بدھوں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں بدھا کے نزدیک ترین ساتھی انندا نے جب کہا کہ بدھ انسان ہی تھے تو شور و غوغا اور غیظ و غضب کی کیفیت پیدا ہو گئی اور شرکائے مجلس کہنے لگے کہ وہ تو الوہیت کا مقام رکھتے تھے۔

لیکن حروف و کتابت کی ابتداء بھی سب سے پہلے پتھروں اور معدنیات کے کتبوں پر مختصراً کچھ معلومات کندہ کر دینے سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس ذریعے سے تفصیلات تو محفوظ نہ کی جا سکتی تھیں۔ جن زبانوں اور حروف میں یہ تحریریں ملتی ہیں ان سے نا آشنائی کی وجہ سے انہیں عصر جدید کی کسی زبان میں منتقل کرنے میں خاصی مشکلات پیش آتی ہیں۔

بہت سے بانیان مذاہب و ادیان کے صحیفے یا تو مرور زمانہ سے معدوم ہو گئے یا کسی جنگ میں ضائع ہو گئے جیسے بخت نصر کے حملہ بیت المقدس میں توراۃ جل گئی اور سکندر مقدونی کے حملے میں زرتشت کے صحیفہ "اوستا" نذر آتش ہو گیا۔ ان حالات میں بانیان مذاہب کے حالات کا محفوظ رہنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ان کی وجہ یہ تھی کہ مذاہب و ادیان قبل از اسلام کے نظریات و معتقدات کے بنیادی علم سے ان کے عام پیروان ناواقف ہوتے تھے۔

اس کے بر عکس بعثت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوائل ہی سے اصول ہائے دین سے ہر خاص و عام کو مطلع کرنا حضور کا مقصد اولیں رہا۔ چنانچہ نزول وحی کی ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو فرمایا :

يَٰٓأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَأَنذِرْ (۷۴:۱۔۲)

ترجمہ : اے چادر لپیٹنے والے !اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔

قم اور فانذر کا مفہوم ان کے لغوی معنوں تک محدود نہیں۔ بلکہ قم سے مراد، دعوت کے کام کو مستعدی اور پوری کوشش صرف کر کے کرناہے اور انداز سے مراد اعمال اور ان کے نتائج سے لوگوں کو آگاہ کرنے سے ہے۔ مفسرین نے ان الفاظ سے می مفہوم لیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر نے اس سورہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :

ترجمہ(اللہ تعالیٰ حضور سے فرماتا ہے) کمربستہ اور تیار ہو جاؤ۔ یعنی عزم اور قوی ارادے کے ساتھ کمربستہ اور تیار ہو جاؤ اور لوگوں کو ہماری ذات سے، جہنم سے،ان کی بد اعمالی کی سزا سے ڈراؤ، ان کے کان کھڑے کر دو۔ ان سے غفلت کو دور کر دو۔"

صاحب تدبر قرآن نے یہ مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

قم فانذر۔ یہ اس مہم کا بیان ہے جس کی طرف پچھلی سورۃ میں انا سنلقی علیك قولا ثقیلا(ہم تم پر آگے ایک بھاری ذمہ داری ڈالنے والے ہیں) کے الفاظ سے

اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی کمر بستہ ہو کر اٹھو اور پورے عزم و حوصلہ سے اپنی قوم کوانداز کرو۔ مخالفت و مزاحمت حالات کی نامساعدت اور ماحول کی اجنبیت کی پروا نہ کرو۔''

اس سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ اول روز ہی سے نظریات دین کی اشاعت کا حکم ہو گیا۔ اس سے ان کو کسی ایک شخص یا طبقہ تک محدود رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دین کی تعلیمات ہی پیغمبر اسلام کے فکر اور حضور کی سیرت و کردار کی عکاسی کرتی ہیں، لہٰذا جس طرح دین کے اصول لوگوں میں پھیلے اور انہوں نے ان کو محفوظ کیا، اسی طرح حضور کے اسوۂ حسنہ کے متعلق معلومات بھی دستبرد زمانہ سے کلیتاً محفوظ رہیں۔

حضور کی حیات طیبہ کے ایک ایک گوشے کے سلسلے کی معلومات کو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حرز جاں بنا کر اپنے سینوں میں محفوظ رکھنا اپنے افکارو اعمال کی سمت کو درست رکھنے کی ضمانت سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ واضح ہے۔ قرآن میں اتباع رسول کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور یہ اتباع اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب حضور کی سیرت کا ہر پہلو ایک کھلی کتاب کی طرح امت کے سامنے ہمہ وقت موجود رہے۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہ ایسے تھے جنہوں نے ترغیبات دنیا سے اپنے آپ کو بے نیاز کر کے اور قوت لایموت پر قناعت کر کے قرآن و سنت سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کے لیے اوقات کے بیشتر حصے کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت حضور کی صحبت میں گزارتے تھے۔ پھر وہ اسی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ حضور کے اسوۂ حسنہ کے سلسلے میں اپنی اولاد کو معلومات فراہم کرنا بھی اپنا فریضہ دینی تصور کرتے تھے۔قرن اول کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے بھی قرآن کے ساتھ ساتھ حضور کی حیات طیبہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے رکھا۔

''حدیث''کے باب میں بیان کیا جائے گا کہ اس سلسلے میں کس قدر وسیع پیمانے پر کاوشیں کی گئیں اور صحت کے پیش نظر حضور کی طرف کسی بات یا عمل کو منسوب کرنے میں کس قدر احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ بعد میں اس مقصد نے ''علم اصول الحدیث''کی شکل میں ایک وسیع شعبہ علم کی صورت اختیار کرلی۔

ساری تاریخ اسلامی میں حضور کی حیات طیبہ پر متواتر تصانیف ظاہر ہوتی رہیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ سند اور ثقاہت پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے۔ حضور کی سیرت اور زندگی کے واقعاتی پہلوؤں پر قرآن خاصی روشنی ڈالتا ہے۔حدیث وسنت میں کثیر مواد موجود ہے۔ بے شمار مستند کتب تاریخ بھی مرتب کی گئی ہیں اور مورخ اپنے علمی مرتبے کے مطابق تحقیقی کاوش میں بھی مصروف رہاہے۔ اس طرح مسلمانوں کو آپ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے کے لیے وسیع سے وسیع تر ذہنی افق کی روشنی میسر آجاتی ہے۔

ان سب ذرائع نے حضور کی حیات طیبہ کے متعلق اتنی معلومات فراہم کر دی ہیں جن کی کثرت کی ہمسری کسی دوسری تاریخی شخصیت کی زندگی کا ذخیرہ معلومات نہیں کر سکتا۔ عصر حاضر میں جب کہ کسی نہ کسی پہلو سے اہمیت رکھنے والی شخصیتوں کی سوانح حیات لکھنے کا رواج عام ہو گیا ہے اور ان کے متعلق ذرائع معلومات کی بھی فراوانی ہے، کسی ایک شخص کی زندگی کے جملہ پہلو منصہ شہود پر نہیں آتے اور نہ ان کے ہر عمل اور فکری خصوصیت کو رہنما اصول کا درجہ دیا جا سکتا ہے لیکن چودہ صدیاں بیت گئیں۔معلومات کے لحاظ سے پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ کا کوئی پہلو نابود نہیں ہوا بلکہ اس دوران متواتر اپنوں اور غیروں کی توجہات حضور کے ایک ایک فعل، ایک ایک عمل اور ایک ایک فکری نکتے اور جزیے پر مرکوز رہی ہے اور اس کے مطالعے اور تجزیے کو ان گنت لوگوں نے اپنی زندگیوں کا مقصد بنایا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ حضور کے فرمائے ہوئے ہر لفظ اور زیر عمل لائی ہوئی ہر بات اپنے اندر حکمت وبصیرت کی دولت اور عمل صالح کے لیے راہنمائی کی روشنی رکھتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مرد کامل اور جامع شخصیت کے مالک تھے

اسلام تمام انبیاء و رسل چاہے ہمیں کسی کے متعلق معلومات حاصل ہوں یا نہ ہوں، اصولی طور پر بر سر حق تسلیم کرنے کو جزو ایمان قرار دیتا ہے۔ لیکن جن انبیاء کے متعلق ہمیں قرآن یا ان کے پیروں کے پاس موجود کتابوں کے ذریعے معلومات ملی ہیں، ان کے متعلق باتیں قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں کہ اولاًتو ان میں سے ہر ایک کسی قوم، قبیلہ یا خطہ زمین کے رہنے والوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے۔

قرآن تعین کے ساتھ کہتا ہے:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ (۱۱:۵۰)

ترجمہ : اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ھود کو رسول بنا کر بھیجا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ(۱۱:۲۵)

ترجمہ : اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ(۷:۸۵)

ترجمہ : اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی(۲۰:۴۳)

ترجمہ:(حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے فرمایا) تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق فرمایا:

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ(۳:۴۹)

ترجمہ : اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔

اور تمام سابقہ انبیاء کے متعلق فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ(۳۵:۲۴)

ترجمہ : اور کوئی امت ایسی نہیں جس کے اندر ایک نذیر نہ آیا ہو۔

لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی کہا گیا کہ آپ کو انسانوں کی طرف بھیجا گیا۔ کسی قوم یا خطہ ارض کی تخصیص نہیں کی گئی۔ مثلاً فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا(۳۴:۲۸)

ترجمہ : اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

ایک تو ثانیاً اگرچہ ہر پیغمبر اساسی طور پر ایک ہی دین لایا (دیکھیے ۴۲:۱۳) لیکن ان کی شریعتیں وقت کے حالات و ضروریات کے مطابق تھیں، اس نے تبدیلی احوال وظروف کے تحت اور دوسرے ان کے پیروان دین کی تعلیمات کو محفوظ رکھنے کی عدم صلاحیت کی

وجہ سے انہیں دوام حاصل نہ ہو سکا، اور وہ یا تو نابود ہو گئیں اور یا محرف ہو کر اپنی اصلی شکل و صورت کھو بیٹھیں۔ ثالثاً یہ کہ ہر نبی کوئی نہ کوئی ایک یا زندگی کے کسی محدود دائرے میں فریضہ راہنمائی ادا کرنے میں مصروف رہا۔ اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فکر و عمل کے کسی شعبے کو اپنی تعلیمات و اسوہ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی قوم کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے،حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنوں کا منظر دکھاتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی لائف صرف خاکساری، تواضع، عفوو درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے، حضرت سلیمان کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے، حضرت ایوب علیہ السلام کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے، حضرت یونس علیہ السلام کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی قید و بند میں بھی دعوت حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤد کی سیرت گریہ و بکا، حمد و ستائیں اور دعاؤ زاری کا صحیفہ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام داود علیہ السلام ایوب علیہ السلام اور یونس علیہ السلام یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں''(خطبات مدراس۔۔۔ چوتھا خطبہ)

مطلب یہ کہ

آنکہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس سلسلے میں سرور کائنات کی تربیت کے نتیجے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے اندر رونما ہونے والی بصیرت دینی کی روشنی میں آخری بات کہہ رہی ہیں جس پر معنویت اور حقیقت کے اعتبار سے کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم صحیح مسلم کی ایک حدیث کا متعلقہ حصہ نقل کرتے ہیں:

وعن سعد بن هشام قال انطلقت الى عائشة فقلت يا ام المومنين اتبعني عن خلق رسول الله صلى الله عليه وسلم قالت الست تقراء القرآن قلت بلى قالت فان خلق نبى صلى الله عليه وسلم كان القرآن

ترجمہ : حضرت سعد بن ھشام راوی ہیں کہ میں حضرت عائشہ کے پاس گیا۔ اور میں نے عرض کیا کہ ''ام المومنین مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کے متعلق بتایئے۔ آپ نے فرمایا ''کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا ؟'' میں نے عرض کیا''ہاں''تو آپ نے جواب دیا ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن ہی تھا''۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۴:۶۸)

ترجمہ : اور تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو۔

مطلب یہ کہ حضور نے قرآن کو صرف پیش ہی نہیں کیا اور صرف اس کی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ اس کے اصولوں کو اپنی ذات، اپنے صحابہ اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر بھی نافذ کیا۔

خلق کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس میں حیات انسانی کے سارے احسن پہلو شامل ہیں۔ لغات''الفرائد الدریہ''میں خلق کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں:

Moral character nature Temper Bravery Habit Religion

قرآن دین اسلام کی دعوت کے آغاز، اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنے کے سلسلے کے ہر مرحلے کے لیے رہنمائی اور اس کے ضابطہ فکر و عمل کی تفہیم کے لیے نازل ہوا۔ جب حضور کا کردار کلی طور پر اس سے ہم آہنگ تھا تو آپ کا انسان اور نبی ہونے کی حیثیت سے درجہ کمال و جامعیت پر فائز ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ بالفاظ دیگر جب آنحضرت ایک کامل دین لائے(آیت۵:۳)اور اس دین کے اصولوں کو آپ نے اپنی ذات پر بھی نافذ کیا اور اپنے مخاطبین پر بھی تو آپ کی شخصیت میں صفت کا ملیت کا پایا جانا ضروری تھا۔

حضور ہمہ صفت موصوف تھے۔ آپ کی جوہری خصوصیات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی ہر کوشش بہر حال سعی ناتمام ہی ہوگی۔ انسانی شرف کی متقاضی کوئی خوبی نہیں جو آپ

میں نہ پائی جاتی ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اسوہ حسنہ کی بلا شرط اتباع کی تاکید فرمائی۔ دوسری متعدد آیات کے علاوہ آیات(۵۹:۷)اور(۳۳:۲۱)اس کے علاوہ قرآن میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذکر ہوا ہے ساتھ ہی لازماً اطاعت رسول کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔(دیکھئے آیات ۳:۱۳۲،۴:۸)حضور کے درجات علیا کے متعلق''مقام رسول''کے عنوان کے تحت قرآنی حوالوں کی روشنی میں گفتگو کی جائے گی، یہاں ہم صرف یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کے احکامات و ہدایات کو کلیتاً اپنانے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ کی شخصیت کامل واکمل تھی۔ نیز اس کے بعد بھی جو معروضات پیش کی جائیں گی وہ اسی دعوے کی شہادت فراہم کریں گی۔ اخلاقی محاسن اور اجتماعی انسانی زندگی کی تعمیر میں آپ نے جو کردار ادا کیا، ان کے حوالے سے حضور کا ایک ایک عمل آپ کی رسالت کی تصدیق کرتا ہے، ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جا سکتے کیونکہ اس کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، امام ابن قیم نے اپنی کتاب''زاد المعاد''میں حضور کے اسوہ حسنہ پر کثیر التعداد عنوانات قائم کیے ہیں۔ اسی طرح ''احیاءالعلوم'' میں امام غزالی نے اخلاقی اور تقویٰ سے متعلق بہت سے محاسن پر بحث کی ہے جو حضور ہی کے قرآن و سنت کے ذریعے سے پیش کردہ اصولوں پر مبنی ہیں۔ تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے ناظرین ایسی کتابوں سے رجوع کریں۔ ہم نے تو صرف حضور کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر اصولی گفتگو کی ہے جو ایک سعی ناتمام ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ حضور کی سیرت کی ہر خوبی اپنے علوئے مرتبہ کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ مثلاً اگر احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے حوالے سے بات کی جائے تو کوئی آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ صحابہ بعض اوقات اظہار تعجب کرتے تھے کہ حضور تو اللہ کے رسول ہیں اور آپ کی بخشش یقینی ہے تو پھر آپ عبادات اور دوسرے احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہونے کے معاملے میں اس قدر جانفشانی سے کیوں کام لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر آپ کے عمل کی روشنی میں آپ کے اخلاقی محاسن کے ایک ایک جزیے کا تجزیہ کیا جائے تو آپ ہر پہلو سے درجہ کمال پر متمکن نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے علم و بردباری اور عزیمت و استقلال کو دیکھا جائے تو ان خصوصیات کا حامل

دوسرے انسانوں کے مقابلے میں آپ کا درجہ بہت بلند نظر آئے گا۔ یہی حال حضور کی مربیانہ اور قائدانہ صلاحیتوں کا ہے۔ لادینیت کی تاریخ میں آپ کو ایک مثال ایسی نہیں ملے گی کہ حصول اقتدار کے بعد حکمرانوں نے تعیش و تحکم کی روش سے اجتناب کیا ہو، سارا عرب اسلام کے زیر نگیں آگیا لیکن آپ نے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے معیار زندگی میں یک سرمو تبدیلی نہیں کی۔ علامہ اقبال نے کہا:

بوریا ممنون خواب راحتش
تخت کسریٰ زیر پائے امتش

ہمارا یہ دعویٰ عقیدت مندی پر مبنی نہیں بلکہ واقعات و حقائق شاہد ہیں کہ زندگی کے کسی ایک شعبے میں بھی حضور کے مقام بلند تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔

کا ملیت کے اعتبار سے تاریخ عالم میں حضور کی منفرد حیثیت

یہ متعین کرنا از بس ضروری ہے کہ عالم انسانیت کے لیے کس نوعیت کا کام کسی شخصیت کو تاریخ میں اونچا اور غیر معمولی طور پر اعلیٰ مقام دلوا سکتا ہے۔ اگر کسی نے کسی ایک شعبہ علم میں کوئی ایسا بنیادی کام کیا ہو جس سے اس علم کو فروغ حاصل ہوا ہو، تو اگر چہ وہ کام قابل قدر سمجھا جائے گا، لیکن نوع انسانی کی مجموعی فلاح و بہبود کے لیے اسے ایک معمولی اور جزوی افادیت کا درجہ ہی حاصل ہو گا۔ اسی طرح صرف ایک نظریہ پیش کر دینا نمایاں حیثیت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں جب کہ اس کی افادیت کے تعین کے لیے اسے تجربے کی بھٹی سے گزارا نہ گیا ہو۔

تاریخ عالم میں جتنے بڑے انسان گزرے ہیں ان میں سے عام طور پر ہر ایک کسی نہ کسی ایک خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہے اور اہم شخصیات کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی جدوجہد کر کے کسی سلطنت کا بانی ہو گیا۔ کسی نے فتوحات کیں اوربہترین سپہ سالار کہلانے لگا۔ کسی نے فلسفے کی دنیا میں نام پیدا کیا۔ کوئی قانون کے شعبے میں نمایاں ہو گیا۔ کسی نے بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے،کوئی سخی ہوا۔ کسی نے خدمت خلق کے سلسلے میں اپنی زندگی کھپا دی۔ کسی میں معمول کے اخلاقی محاسن بدرجہ اولیٰ نظر آتے ہیں، کسی نے دشمنوں پر بھی رحم کھایا۔ کسی نے گری قوم کو وقتی طور پر اٹھا دیا، اسے بحران سے نکال لایا۔

کسی نے سوتی ہوئی قوم کو جگانے میں محدود دائرے کے اندر کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دے دیا۔ کسی نے طبعی میدان میں مشاہدات اور تحقیق و تجربات میں زندگی بسر کر دی اور کوئی نظریہ پیش کر دیا۔ اس طرح کے ان گنت جزوی کاموں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ایسے بے شمار لوگوں نے قطع نظر اس بات کے کہ ان کے کارناموں نے اپنی اپنی قوم یا انسانیت کے لیے کوئی مفید کردار ادا کیا یا وقت کے گزرنے کے ساتھ ان کے نتائج سیتہ اظہر من الشمس ہو گئے یا وہ قصہ پارینہ کی حیثیت اختیار کر گئے اور تاریخ میں کوئی نہ کوئی مقام حاصل کر لیا۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اگرچہ ایک دور میں بھی بعض غیر معمولی مقام و مرتبہ رکھنے والی شخصیتوں نے دنیا کے بعض خطوں کی آبادیوں کو شدت سے متاثر کیا اور ان میں اتنی جاذبیت اور کشش تھی کہ صدیاں گزر گئیں لیکن ان کے نام اور ان کی عقیدت بڑی بڑی آبادیوں کے ذہنوں اور سینوں سے محو نہیں ہوئیں۔ لیکن ان کے واقعات زندگی، ان کی سیرتیں اور ان کی تعلیمات تاریخ کے دھندلکے میں گم ہو گئیں اور اب ان کے ساتھ لوگوں کی وابستگی محض تقلیدی و آبا پرستی کی عوامی عادات کی مرہون منت ہے۔ حیات انسان کے فکر و عمل کے دائروں میں وہ شخصیتیں رہنمائی کا کوئی فریضہ ادا نہیں کر سکتیں۔ ان کے سرمایہ علم و فکر اور عمل واسوہ میں وہ سرمایہ ہی موجود نہیں رہا جو حیات انسان کے لیے فلاح و بہبود کی ضمانت مہیا کر سکے۔ اس کے علاوہ تاریخ اور دور حاضر میں ایسی شخصیتیں بھی ابھری ہیں جنہوں نے قومی یا علمی سطحوں پر فکر و عمل کا کوئی ضابطہ پیش کیا ہے لیکن اس کی بنیاد کسی نہ کسی قومی، نسلی، جغرافیائی، لسانی یا طبقاتی عصبیت پر ہے اور اس کو صرف نفرت یا قائم شدہ کسی غیر متوازن نظام کے ردعمل کے طور پر عارضی قبولیت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ اور جب اس کی انتہا پسندی اور یک رخاپن کی کیفیت رنگ لاتی ہے تو وہ نسلِ منسیٰ ہو جاتی ہے۔

تاریخ عالم کے واقعاتی نشیب و فراز کی مجموعی کیفیت پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے۔ آپ کو ملوکانہ نظام کے تحت قائم کی ہوئی بڑی بڑی سلطنتیں نظر آئیں گی۔ بڑے بڑے متمرد آمروں میں سے ہر ایک انا کا ڈنکا بجاتے دکھائی دے گا۔ عظیم سپہ سالاروں اور فاتحین ملکوں اور قوموں کے قائم شدہ نظم کو تہہ وبالا کر کے وسیع خطہ ہائے زمین پر اپنی شان و شوکت کے جھنڈے لہراتے ہوئے چنگیزی طاقت و قوت کا مظاہرہ کر رہے ہوں ہے۔ سطح ارض کے

کئی خطوں میں جنم لینے والی تہذیبیں اور تمدن آپ کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کرائیں گے (دور حاضر کے نمایاں تاریخ دان آرنلڈ جے ٹان بی نے اکیس ایسی تہذیبوں کی نشاندہی کی ہے) رواں صدی میں جرمن نسل پرستی پر مبنی نازی ازم کی تحریک نے آپ کی نظروں کے سامنے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسی طرح آپ نے پون صدی تک طبقاتی بنیاد پر قائم شدہ مارکسی کمیونزم کی شان و شوکت کا مشاہدہ کیا اور اس کا انجام بھی دیکھا۔ پھر آپ مغربی جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کے ظاہر و باطن سے بھی بے خبر نہیں جس کے وجود کا انحصار ان کی پندرہ فیصدی آبادی کی بقیہ دنیا کی پچاسی فیصدی آبادی کے استحصال پر اور جس کے سوچنے والے اذہان اس کے روبہ انحطاط رجحان کے سلسلے میں فکر مند ہیں۔ ہم اس موضوع پر ''مغربی تمدن'' کے باب میں گفتگو کریں گے۔

تاریخ کے صفحات کے ان نقوش پر جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے اور دوسرے ایسے مزید نقوش پر جو آپ کے ذہن میں آئیں غور و تفکر کی نگاہ ڈالیے۔ کیا ان میں سے کسی ایک شخصیت، تمدن اور نظام نے انسان کے لیے مبنی بر عدل انفرادی، اجتماعی تعمیر کا کوئی ہمہ جہتی نقشہ ترکے میں چھوڑا ہے یا مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ مستقبل کے لیے کوئی ایسا کردار ادا کرے گی۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔

لیکن اس کے بر عکس تاریخ عالم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایسی ہے جس نے قرآن اور اپنی سنت کی شکل میں بنی آدم کو فکر و عمل کی وہ مکمل تعلیم دی جو اسے انسان اور اس کے سامنے موجود پر اسرار کائنات کی تخلیق و انجام کے متعلق اس حد تک آگاہی فراہم کرتی ہے جس حد تک اس کی عقلی و حسی قوتیں اس کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ انسانوں کی رہنمائی کے لیے حضور نے اپنے کردار میں تمام خصوصیات و حسنہ سمو دیں جن کا ایک مرد کامل و اکمل کے لیے تصور کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے وہ مکمل فکر پیش کر دیا جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی تعمیر کے لیے کلی افادیت کا حامل ہے اور فکر کی بنیاد پر کثیر تعداد پر مشتمل افراد کی ایک جماعت کو ترتیب دے کر ان کے اندر وہ خصوصیات پیدا کر دینے کے علاوہ جو وہ ان کے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے ایک ایسا نظام اجتماعی بھی تعمیر کر دیا جو عدل پر قائم اور انسانوں کے راہ خیر پر چلنے کے لیے ممد ثابت ہو۔ ہم حضور کی مربیانہ

صلاحیتوں کے متعلق اسی باب میں عرض کر چکے ہیں۔ تاریخ عالم میں پیغمبر اسلام اس مقام پر یکہ و تنہا کھڑے نظر آتے ہیں۔ جس کسی کو اس حقیقت کو قبول کرنے میں تردد ہو وہ تاریخ کی ورق گردانی کرے اور کسی اور شخصیت کا کھوج لگائے جس نے اپنے مقاصد و اہداف مقرر کر کے سو فیصدی اسی محدود مدت میں اپنی زندگی ہی میں حاصل کر لیا ہو۔ افرادی تعمیر اور اجتماعی نظام کو برپا کرنے اور اس نظام کی خصوصیات کے متعلق ہم مختلف ابواب میں گفتگو کریں گے۔ اس کے علاوہ حضور کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی حیات و سیرت طیبہ کے متعلق تمام تفصیلی معلومات آج تک محفوظ ہیں۔ آپ کے تیار کردہ افرادی نمونوں یعنی صحابہ کے حالات بھی کتب تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ جو نظام اجتماعی آپ نے قائم کیا اس کی اساسات و جزئیات پوری صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے ہیں یہ سب کچھ صرف اور صرف نبی اسلام کی مساعی کی مرہون منت ہے اور یہ بات مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق حضور پر انعام الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ ساری کارگزاری ہی کا نتیجہ تھی جس میں سے تیرہ سالہ مکی دور میں چند سو انسانوں کی صفائی اذہان و قلوب اور تزکیہ نفوس کی گئی اور اس کے بعد دس سالہ مدنی دور میں بقیہ سارا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا۔

پھر بات وہیں ختم نہیں ہو گئی۔ بلکہ حضور کے بعد کے ادوار میں کثیر التعداد اور عظیم المرتبت انسانوں نے اس نظام فکر و عمل کے سلسلے کے نظریات کو اپنایا اور انہیں ان کی اصلی حالت قائم رکھنے کے لیے علمی کوششیں بھی کیں، اس کام کے لیے انتہائی قربانیاں بھی پیش کیں، اور جبارین زمانہ کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کی پاداش میں داروسن کو چوما اور زندان کی کوٹھڑیوں کو روشن کیا۔ حق کہنے اور اس پر عمل کرنے کی سزا کے طور پر ان کے اعضاء کو ان کے جسموں سے الگ کیا گیا اور ان کے جنازے بڑی شان و شوکت سے زندان خانوں سے برآمد ہوئے جہاں کلمہ حق کہنے کے جرم میں انہیں محبوس کیا گیا تھا۔ یہ حضرات شمع رسالت ہی کے پروانے تھے اور روحانی قوت اور کردار کی یہ مضبوطی انہوں نے سنت رسول کے ذریعے ہی حاصل کی تھی۔ حضور ہی کے روحانی فیض نے ان کے قلوب و اذہان کو منور کیا تھا۔ ان ساری قربانیوں اور اسوۃ حسنہ کے محرکات میں خشیت اللہ کے علاوہ اور کوئی محرک از قسم خواہش اقتدار و شہرت یا طمع سیم و زر یا مؤسس جماعت و فرقہ بننے کی

ہوس شامل نہ تھی۔ ان حضرات کا سنت رسول کا اتباع کرنا کسی سیاسی رنگ میں نہ تھا بلکہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں حضور کے نقش قدم پر چلنے کے لیے کوشاں رہتے اور تقویٰ وپرہیز گاری میں عزیمت کے مقام پر فائز رہتے تھے۔ حتیٰ کہ رخصتوں سے بھی فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔

یہ سلسلہ اس دور نو آبادیات میں بھی جاری رہا جب مغربی استعمار پرست قوتوں نے سیاسی و فوجی سطح پر مسلمان ممالک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کو اسلام سے بے گانہ کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا اور آج بھی جب کہ ظاہراًمسلمان ممالک آزاد ہیں محمد صلعم کے پیش کردہ دین کے نفاذ کے جرم میں مسلمانوں کے سر قلم ہو رہے ہیں۔ تفصیلات تو حسب موقع عرض کی جائیں گی، یہاں ہم صرف اس نکتہ نظر سے یہ باتیں اجمالاًعرض کر رہے ہیں کہ تاریخ پر جس قدر حضور نے اپنا اثر چھوڑا ہے اس کی ہمسری اور کوئی شخصیت نہیں کر سکی۔

اگرچہ ہمیں اس سلسلے میں کسی غیر کی تائید کی کوئی حاجت نہیں، لیکن ہم ضمناًعرض کر دیں کہ غیروں کے جس گروہ محققین نے بھی کسی شعبے میں تاریخی شخصیتوں کے کردار و اثر پر مواد جمع کیا ہے اس نے تاریخ عالم میں حضور کی مؤثر ترین حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔

مثلاًمائیکل ایچ ہاوٹ نامی ایک امریکی محقق نے اپنے بعض متعلقین کی اعانت سے اس موضوع پر مواد جمع کیا ہے کہ دنیا کی مختلف شخصیتوں نے کس حد تک تاریخ پر اثر ڈالا ہے۔ اس کے بعد اس نے اس اثر کی وسعت کے لحاظ سے ایک سو شخصیتوں کے حالات ترجیحی ترتیب کے لحاظ سے لکھے ہیں۔ کتاب کا نام اس نے The ۱۰۰ a ronking of the most influential person in historyرکھا اور اس کتاب میں اس نے حضور نبی کریم کو سرفہرست مقام دیا۔ اس نے محمد کے عنوان سے کتاب کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے:

My choice of Muhammad to lead the list of the World's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels.

ترجمہ : دنیا کے انتہائی درجے کے بااثر لوگوں کی فہرست میں محمد کو سرفہرست رکھنے کا میرا انتخاب بعض ناظرین کے لیے باعث حیرانی ہو سکتا ہے اور بعض اس سے اختلاف بھی کر سکتے

ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ تاریخ عالم میں واحد شخص ہیں جنہوں نے مذہبی اور دنیوی دونوں سطحوں پر انتہائی کامیابی حاصل کی۔

اس انتخاب پر وہی لوگ حیران ہو سکتے یا اس سے اختلاف کر سکتے ہیں جنہوں نے پیغمبر اسلام کی زندگی، کارناموں اور تاریخ پر حضور کے اثر کا بنظر غائر مطالعہ نہیں کیا، اور نہ انہوں نے مفصل معلومات حاصل کر کے اس مکمل تغیرو انقلاب پر تدبر کیا ہے جو حضور نے برپا کیا ہے اور جس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ اسلامی انقلاب کا مفہوم ہم ''اصلاحی فکر''کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔

لیکن جس محقق نے بھی حضور کی حیات طیبہ اور تاریخ میں حضور کے کردار کا مطالعہ کیا ہے، وہ آپ کے ہمہ جہتی اوصاف حمیدہ مؤثرہ کا قائل ہو گیا ہے۔ ہم اسلام کے متعلق انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے انداز بیان سے اتفاق نہیں کرتے کہ مغربی اہل علم ہر بات کو اپنے مادہ پرستانہ تصورات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے نظریات کے مطابق ہی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے لیے بعض حقائق سے مفر کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ پر ٹینیکا کی جلد ۸ صفحہ ۳۹۶ پر محمد کے تحت تحریر کا ان الفاظ سے آغاز کیا گیا ہے:

"Founder of the religion of and of the Arab Empire, who initiated religious, social, and cultural developments of monumental in the history of mankind.

محمد صلعم مذہب اسلام اور عربی سلطنت کے بانی تھے جنہوں نے بنی نوع انسان کی تاریخ میں مذہبی، معاشرتی اور تمدنی سطحوں پر عظیم الأثر(اور ناقابل فراموش اہمیت)کے ارتقائی رجحانات کی ابتداء کی۔

دراصل حضور، جیسا کہ اس اقتباس میں مذکور ہے، عربی سلطنت کے بانی نہیں تھے بلکہ اسلامی نظام کے داعی و بانی تھے، لیکن ان حضرات کا سوچنے کا اپنا انداز ہے۔ بہرحال یہاں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ غیر بھی تاریخ عالم پر حضور کے مستقبل اور بھاری بھر کم اثر کا اعتراف کرتے ہیں۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ جس شعبہ زندگی کے متعلق بھی تاریخی اہمیت کی شخصیات کے اپنے اپنے مقام و مرتبے تعین کیا جائے گا، حضور اس میں نمایاں مقام کے حامل ہوں گے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ عالمی شہرت یافتہ سب شخصیات کسی نہ کسی ایک شعبے میں قابل ذکر درجہ رکھتی ہیں لیکن آنحضرت ہمہ صفت موصوف اور کاملیت و جامعیت کا بے مثل نمونہ ہیں۔ اور یہ کاملیت اصولوں اور افکار کے پیش کر دینے یا سیرت و کردار اور اخلاق کا عمدہ اور احسن نمونہ پیش کر دینے تک ہی محدود نہیں بلکہ جو کچھ فکری سطح پر پیش کیا اسے پوری کاملیت کے ساتھ انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں پر نافذ بھی کر دیا۔ اور کوئی شعبہ زندگی اس سے مستثنٰی نہیں۔

مثلاً گندن کی مشہور عالم قانونی درسگاہ لنکنزان میں یہ تحقیق کی گئی کہ دور قدیم سے اب تک دنیا میں کون کون سی شخصیتوں کو عظیم قانون دہندوں law givers کا مقام دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں جن چند شخصیتوں پر ان کی نگاہ انتخاب پڑی ان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرام بھی شامل ہے۔ اس بات کی تصدیق ہم نے لنکنزان کی لائبریری میں خود جا کر کی جہاں ایک میز پر تحریری شکل میں ماہرین قانون کی یہ رائے رکھی گئی ہے۔

ہم نے حضور کے مقام و مرتبے کے متعلق سطور بالا میں جو گزارشات کی ہیں اور آئندہ بھی اس کتاب میں جو معروضات پیش کی جائیں گی وہ آپ کے ایک بے مثل مرد کامل واکمل ہونے کا بین ثبوت ہیں۔ تلاش بسیار کے باوجود تاریخ انسانی میں کسی اور شخصیت کے متعلق آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

اصحاب عزیمت کے علاوہ عام مسلمان بھی چاہے وہ اپنی کمزوریوں، اپنے سیاسی و مذہبی رہنماؤں کی نوازشات اور اعدائے اسلام کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی وجہ سے اس وقت انحطاط کے قعر مذلت میں پڑے ہیں، یہی عقیدہ رکھتے اور آس لگائے بیٹھے ہیں کہ ہماری ترقی اور فلاح اسی وقت ممکن ہو گی جب ہم پیغمبر اسلام کے اتباع کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر سکیں گے جیسا کہ ہم اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں۔

بیسویں صدی میں فلسفہ تاریخ کے سب سے بڑے ماہر آرنلڈ جے ٹائن بی نے چودہ جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب مطالعہ تاریخ (Study of History) عالم میں اکیس تہذیبوں کی نشاندہی کی ہے لیکن جو تہذیب زوال پذیر ہوتی ہے اس کا اور اس کے موجدین کا کوئی حامی اور متبع دنیا میں موجود نہیں۔ حال ہی میں مارکسی کمیونزم کا روس اور مشرقی یورپ میں زوال از خود ہی ہو گیا ہے۔ اس پر کسی قدر تفصیل سے آئندہ گفتگو ہو گی لیکن اس نظام کے تحت پون صدی تک زندگی بسر کرنے والے نہ صرف اس نظام کے اصولوں سے برات کا اظہار کر رہے اور اسے اپنے دکھوں کا باعث سمجھتے ہیں بلکہ اس نظام کے موجد مارکس اور اسے قائم کرنے والے لینن کو ہدف و طعن و تشنیع بنا رہے ہیں۔ اظہار نفرت کے طور پر ان کے عقیدت سے بنائے ہوئے مجسّموں کو منہدم ہی نہیں کر رہے بلکہ انکے چہروں کو مسخ اور ان پر سیاہیاں مل رہے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام اور مسلمانوں کی ساری تاریخ کے نشیب و فراز کے دوران ایک یوم کے لیے بھی مسلمان اسلام کی حقانیت اور پیغمبر اسلام کے اسوہ حسنہ کے نوع انسانی کی فلاح کے لیے واحد ذریعہ ہونے کی حیثیت کے عقیدے سے دستبردار نہیں ہوئے۔ اور یہ کوئی اندھا عقیدہ نہیں بلکہ اس دور انحطاط میں بھی اس پر مسلمانوں کے علمی سطح پر قلیل افرادی وسائل کے مطابق تحقیق و مطالعہ کی بنیاد پر لکھا اور پڑھا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے بھی تاریخ میں ایک شخصیت کے حضور سے مشابہ مقام کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ گویا حضور کا فیض تربیت جاری ہے اور ابد تک رہے گا۔ کسی کا اس سے انفرادی و اجتماعی سطح پر فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا ہر متنفس اور قوم و ملت کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس سلسلے میں اللہ نے جبر سے کام نہیں لیا۔

حضور نے دین اسلام کسی مروجہ فکر کے تسلسل میں پیش نہیں کیا

بہت سے مفکرین، حکماء اور سیاسی قائدین کے متعلق یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ وہ فلاں فلاں مکتب فکر یا نظام اجتماعی کے موجد تھے۔ یا وہ فلاں انقلاب کے لیے معنوی غذا مہیا کرنے کے ذمہ دار تھے لیکن جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی عرض کر چکے ہیں تاریخ انسانی ایک استثنیٰ کے سوا کسی ایسی شخصیت کی مثال پیش نہیں کر سکتی جس نے انسان کے فکر و عمل کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مروجہ طریق زندگی سے بالکل مختلف نظریات و

تعلیمات پیش کی ہوں اور انہیں پوری طرح چند سالوں میں نافذ کر دیا ہو۔ عام طور پر ہوتا یہ رہا ہے کہ تاریخ میں کسی قوم یا سوسائٹی کے حالات اور ارتقاء کے رخ اور نوعیت کے مطابق ایک نظریے کو مختلف اہل علم و فکر مراحل ترقی سے گزارتے رہے۔ پھر ایک ایسا شخص ظاہر ہوتا ہے جو اس فکر کو منظّم طور پر ایک فلسفے کے طور پر پیش کر دیتا ہے لیکن ہمیشہ یہی مشاہدے میں آیا ہے کہ ایک تو کسی نظریہ زندگی کا داعی کبھی بھی اس کے نفاذ پر قادر نہیں ہوا اور دوسرے یہ سبھی نظریات یک رخے اور انسان کی مادی زندگی کے کسی ایک گوشے سے متعلق رہے ہیں۔

اس کے بر عکس ہم نے سطور بالا میں جس استثنٰی کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق پیغمبر اسلام سے ہے۔ آپ کی بعثت کے وقت ملک عرب ہی میں نہیں، جہاں آپ پیدا ہوئے، بلکہ سارے کرہ ارض پر کسی ملک میں کوئی ایسا نظام فکرو عمل موجود یا نافذ نہ تھا جو انسان کی تمام روحانی و مادی ضروریات اور اس کی فلاحی مقتضیات کو پورا کرسکے۔ حضور خود امی تھے اور ایک امی معاشرے ہی سے تعلق رکھتے تھے جہاں لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف کا کوئی رواج نہ تھا۔ نہ فکری سطح پر انفرادی و اجتماعی زندگی کے متعلق کوئی نظریات پائے جاتے تھے۔''پس منظر''کے باب میں ہم اس دور کے عربوں کے حالات بیان کر چکے ہیں۔ ملک عرب کے بعض محدود علاقوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کی بستیاں پائی جاتی تھیں لیکن ان کے قیسین رحبان اور احبار اپنے اپنے صحیفوں کی محرف شدہ شکل پر بھی اپنی اجارہ داری رکھتے تھے۔ وہ عرب آبادی میں تبلیغ تو کجا اپنی اجارہ داری قائم رکھنے اور من مانی تاویلات کرنے کا حق محفوظ رکھنے کے لیے خود اپنے اپنے پیروان مذہب سے بھی مذہبی نظریات کو صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان کی مذہبی کتابوں تک امی ہونے اور ان کے مذہبی دائرے میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے رسائی کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا۔ اور اگر آپ ان سے کچھ سن سنا بھی لیتے تو اس کی بنیاد پر یا ان کے نظریات کے تسلسل میں وہ دین نہ پیش کر سکتے تھے جس کے زیر اثر ہمہ گیر انقلاب کے ذریعے سے بالکل ہی نیا تمدن وجود میں آگیا۔

مشرکین مکہ کے قائدین ہر وقت یہی سوچتے رہتے تھے کہ وہ آپ کی شخصیت اور تعلیمات کے مقام و مرتبہ کو کیسے مجروح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اور الزامات کے علاوہ دور حاضر کے مستشرقین کی طرح ایسی افواہیں بھی پھیلاتے تھے کہ آپ قرآن کی آیات خود ہی گھڑتے ہیں اور اس میں بعض دوسرے لوگوں کی مدد بھی شامل ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن ان کے اس افتراء کو یوں بیان کرتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا(۲۵:۴-۵)

ترجمہ :اور کافر کہتے ہیں کہ یہ محض جھوٹ ہے جس کو اس شخص نے گھڑا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں کی مدد کی ہے یہ کہہ کر انہوں نے ظلم اور جھوٹ دونوں باتوں کا ارتکاب کیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں جو اس نے لکھوائے ہیں تو وہ اس کو صبح و شام لکھ کر تعلیم کیے جاتے ہیں۔

اس الزام کو کوئی کودن سے کودن شخص بھی درست تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کی صحت کے خلاف دوسرے دلائل کو تو نظر انداز کیجئے۔ صرف یہی سوچئے کہ قرآن تئیس سال تک نازل ہوتا رہا۔ کیا اس سارے عرصے میں حضور کے ان سارے ذہین اور اجلا صحابہ پر جو رات دن آپ کے قریب ہوتے تھے منکشف نہ ہو سکا کہ یہ کلام وحی کے ذریعے نہیں آتا بلکہ فلاں فلاں اشخاص اس کو اختراع کرتے اور حضور کو سکھاتے ہیں۔ اور پھر وحی کسی غیر متوقع طور پر سفر و حضر، مختلف مجالس اور حجرہ رسول کے علاوہ بعض اوقات ایسے مواقع پر بھی نازل ہوتی تھی جب کبھی حضور سواری کی حالت میں ہوتے تھے۔ اور پھر اگر حضور کسی سے سیکھتے ہی تھے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ تئیس سال تک صحت کے ساتھ اسی ترتیب سے اس کی تلاوت کرتے رہتے، اور ایک دفعہ بھی آپ سے چوک نہ ہوتی، جس ترتیب سے آپ کا تبین وحی کو لکھواتے تھے۔ اور پھر یہ بھی ایک حیران کن اور ان ہونی بات ہے کہ حضور نبوی دور کے سارے عرصے میں مختلف لوگوں سے تصنیف قرآن کے سلسلے میں مدد لیتے رہے لیکن اس کے مضامین میں تضاد کی ایک من ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

بہر حال یہاں ہمارے پیش نظر یہ بیان کرنا ہے کہ کسی قسم کے تعلیم و تعلم، مروجہ نظریات یا غیروں کے اتباع کا دین اسلام کے اصولوں میں کوئی دخل نہ تھا۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس برس کی عمر میں پہنچ کر اچانک قرآن کے اللہ کی طرف سے نزول کا دعویٰ کر دیا۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور تعلیمات کی عمدگی سے سلیم الفطرت لوگ متاثر ہونا شروع ہو گئے اور ضدی، ہٹ دھرم اور مراعات یافتہ طبقہ سراسیمگی کے عالم میں مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح کر دی جو سب مخاطبین پیغمبر کے علم میں تھی اور جس کو وہ جھٹلا نہیں سکتے تھے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ(۴۸:۲۹)

ترجمہ :اور تم اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے مین میکھ نکالتے۔

یہ سورۃ العنکبوت مکی ہے(صرف ابتدائی گیارہ آیات مدنی ہیں)ہم نے ابھی جوآیت نقل کی ہے مکہ میں نازل ہوئی اور اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ جو بات اس میں بیان کی گئی ہے وہ خلاف واقعہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے کسی سابقہ مذہب کے نظریات سے کوئی استفادہ نہ کر سکتے تھے جس سے کسی کے ذہن میں یہ گمان پیدا ہونے کا امکان ہو کہ حضور نے ان معلومات کی بنیاد پر یا اس کے تسلسل میں دین اسلام پیش کیا۔ ہاں یہ ہمارا ایمان ہے کہ دین اسلام کی دعوت حضرت آدم سے شروع ہوئی اور سارے کرۂ ارض کی اقوام کی طرف جو انبیاء آتے رہے وہ ایک ہی سلسلے کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن حضور پر براہ راست وحی کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے کسی نبی کی تعلیم نہیں پہنچی۔ ورنہ حضور بعثت سے قبل ہی اس پر عمل اور اس کی تبلیغ کر دیتے۔ مسئلہ زیر نظر کے سلسلے میں مندرجہ ذیل آیت بھی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۵۲:۴۲)

ترجمہ : اور اس طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں ہے۔ نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور جانتے تھے کہ ایمان کیاہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نوع انسانی کے لیے آخری پیغام ہدایت لے کر آئے

جیسا کہ ہم اس سے قبل بعض مباحث کے دوران اشارات کر چکے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم یا خطہ زمین کی طرف پیغام ہدایت لے کر مبعوث نہیں ہوئے بلکہ آپ کا لایا ہوا دین جملہ بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (۲۸:۳۴)

ترجمہ : اور ہم نے تم کو سب لوگوں کے واسطے بھیجا ہے۔

حضور کو بھی حکم دیا کہ آپ اعلان کریں کہ اے نوع انسانی!میں تم سب کی طرف بھیجا گیا ہوں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا(۱۵۸:۷)

ترجمہ :کہہ دو، اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔

اس آیت میں کسی قوم کو نہیں بلکہ نوعی حیثیت سے تمام انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور تاکید مزید کے طور پر کہا گیا ہے کہ میں تم سب کے لیے ہدایت لے کر مبعوث ہوا ہوں۔ اسی طرح قرآن میں جگہ جگہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور دین اسلام کا تعلق الناس یعنی تمام بنی نوع انسان سے جوڑا گیا ہے اور اس کے علاوہ عالمین کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن کے متعلق کہا گیا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ(۸۷:۳۸)

ترجمہ : یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام دنیا کے لیے نصیحت ہے۔

حضور کی حدیث ہے:

كان كل نبى يبعث الى قومه وبعثت الى الناس عامة(بخاری)

ترجمہ : ہر نبی اپنی قوم کی طرف سے مبعوث کیا گیا تھا لیکن میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

ہم ''اسلامی فکر'' کے باب میں ''ایک غلط فہمی کا ازالہ'' کے بغلی عنوان کے تحت آیت(۲:۱۴۳)کا حوالہ دے کر اس امت مسلمہ کے امت وسطیٰ ہونے کی وضاحت کر چکے ہیں جس سے یہی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ دین اسلام سارے عالم کے لیے ہے اور اسی طرح حضور کی بعثت بھی ساری نسلی انسانی کے لیے تھی۔

مزید برآں یہ بات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ قرآن نے اہل کتاب کو، یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ جس حالت میں ان کی کتب نازل ہوئی تھیں وہ بر سرحق تھیں، یہ دعوت دی کہ اب چونکہ دین مکمل حالت میں نازل ہو چکا ہے، لہٰذا تم اسے قبول کرو۔ اس سے سابقہ انبیاء کی تکذیب نہیں بلکہ تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ(۴:۴۷)

ترجمہ: اے وہ لوگو کہ تمہیں کتاب دی گئی تھی! جو کتاب ہم نے (پیغمبر اسلام پر) نازل کی ہے، اور جو اس کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے، جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے، اس پر ایمان لاؤ۔

ظاہر ہے کہ اہل کتاب عرب کے جغرافیائی حدود تک محدود نہ تھے بلکہ دوسرے ممالک میں بھی آباد تھے۔ لہٰذا قرآن کی دعوت عالمگیر تھی۔ اسی طرح حضور نے قیصر و کسریٰ اور ملک عرب کے ارد گرد دوسرے ممالک کے حکمرانوں کے پاس اسلامی دعوت کو قبول کرنے کے پیغامات بھیجے جو اس دعوت کی عالمگیری کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔

لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں

حضور کی بعثت کے ساتھ وہ تمام شرائط پوری ہو گئیں جو بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارسال ہدایت کے اتمام کے لیے ضروری تھیں۔

اولاً یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا کامل اکمل ہے(۵:۳) اور اس مسئلے پر ہم ''اسلامی فکر'' کے باب میں بحث کر چکے ہیں۔

ثانیاً ہم اس سے پہلے بھی اشارات کر چکے ہیں اور آئندہ بھی مفصل مباحث آئیں گی کہ آنحضرت نے خود اپنی ذات پر دین اسلام کو پوری طرح نافذ کر کے اور اس کی بنیاد پر ایک نظام اجتماعی قائم کر کے عملاً دین کی وضاحت کر دی ہے۔ اس سے متعلق تفصیلات نہ اب تک محو ہوئی ہیں اور نہ آئندہ ہوں گی۔

ثالثاً اس دین کو صفحہ ارض سے نہ مٹنا ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی تحریف یا حذف واضافہ ہو گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کے بقا کی ضمانت فراہم کر دی ہے اور جس بات کے مبنی بر حقیقت ہونے کا ثبوت گزشتہ چودہ صدیوں کی تاریخ نے فراہم کر دیا ہے۔

رابعًا اس دین کے اصولوں اطلاق وانطباق انسانی زندگی کے ہر دور میں اور احوال وظروف کے ہر تغیر کے باوجود ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد الطبیعیاتی مسائل کے سلسلے کے عقائد مبنی بر حقیقت (اس پر پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے اور آئندہ بھی ہو گی) اور انسان کی عملی و فکری زندگی سے تعلق رکھنے والے اصول انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور بدلتے ہوئے حالات میں اس دین کے متبعین کو اجتہاد کا اختیار بھی دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ جمود کی ہر قسم کی الایشوں سے پاک ہے۔

اس صورت حال میں کسی نئی نبوت اور نئے دین کی کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ اصل ضرورت دین اسلام پر پیرا ہونے کی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (۳۳:۴۰)

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔

حضور کے آخری رسول اور نبی ہونے میں گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔ اس سلسلے میں بہت سی احادیث بھی مروی ہیں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے:

ترجمہ: یہ آیت نص ہے اس امر پر کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور جب نبی ہی نہیں تو رسول کہاں؟ رسالت تو نبوت سے بھی خاص چیز ہے۔ ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں۔ متواتر احادیث سے بھی حضور کا ختم النبیین ہونا ثابت ہے۔ بہت صحابہ سے یہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ مسند احمد میں ہے: حضور فرماتے بہت سے ہیں، میری مثال نبیوں میں ایسی ہے جیسے کسی شخص نے بہت اچھا اور پورا مکان بنایا لیکن اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی جہاں کچھ نہ رکھا۔ لوگ اسے چاروں طرف سے دیکھتے بھالتے اور اس کی بناوٹ سے خوش ہوتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ کیا اچھا ہوتا اس اینٹ کی جگہ بھی پر کر لی جاتی پس میں نبیوں میں اسی اینٹ کی جگہ ہوں۔ امام ترمذی بھی اس حدیث کو لائے ہیں اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔ مسند احمد میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رسالت اور نبوت ختم ہو گئی۔ میرے بعد نہ کوئی رسول ہے نہ نبی۔ صحابہ پر یہ بات گراں گزری تو آپ نے فرمایا لیکن خوشخبریاں دینے والے۔ صحابہ نے پوچھا خوشخبریاں دینے والے کون

ہیں؟ فرمایا مسلمانوں کے خواب جو نبوت کے اجزاء میں سے ایک جز ہیں۔ یہ حدیث بھی ترمذی شریف میں ہے۔اور امام ترمذی اسے صحیح غریب کہتے ہیں۔ محل والی حدیث ابوداؤد طیالس میں بھی ہے۔اس کے آخر میں یہ ہے کہ میں اس اینٹ کی جگہ ہوں مجھ سے انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام ختم کیے گئے۔اسے بخاری و مسلم اور ترمذی بھی لائے ہیں۔ مسند کی اس حدیث کی سند میں ہے کہ میں آیا اور اس خالی اینٹ کی جگہ پر کر دی۔ سند میں ہے میرے بعد نبوت نہیں.....''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مربیانہ حیثیت

دین اسلام کے اپنی اصلی حالت میں کسی ردوبدل کے بغیر زندہ رہنے، اور اس کے قابل عمل ہونے کے تصور کے دوام میں تبلیغ واشاعت دین کی مساعی کے علاوہ، حضور نبی کریم صلعم کی مربیانہ صلاحیت کو بہت بڑا دخل حاصل ہے۔ نبی اسلام صلعم نے اس دین کی خوبیوں کے مجسم نمونے پیدا کر دیئے جنہیں ہم صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جن کے وجود نے ناقابل تردید حد تک اس حقیقت کو پایہ ثبوت تک پہنچادیا کہ اس دین کے پاس انفرادی واجتماعی تعمیر کے ایسے اصول موجود ہیں جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی ضمانت مہیا کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں ہوا کہ صرف حضور کی سیرت کو محفوظ کیا گیا ہو بلکہ صحابہ کی ایک کثیر تعداد کی زندگیوں اور دین کے ساتھ ان کی وابستگی کے حالات بھی صفحات تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ دور حاضر میں اپنی ساری نامرادیوں کے باوجود مسلمان جب نبی اسلام کے اسوہ حسنہ کی کاملیت و جامعیت کے ساتھ صحابہ کے دین کی حمایت میں مثالی کردار، اور ایک بلند پایہ تمدن کی تعمیر کے لیے ان کے عالی مرتبت افرادی مواد ہونے کی حیثیت کا تصور کرتے ہیں تو بیرونی اور اندرونی اعدائے اسلام کی خناسی، وسوسہ اندازیوں کے علی الرغم دین کی حقانیت ان کے دلوں میں جمی رہتی ہے۔ یہ آنحضرت کی مربیانہ صلاحیت کا کمال ہے۔

ہم ''پس منظر'' کے باب میں زمانہ قبل از ظہور اسلام عربوں کی اخلاقی اور معاشرتی بے راہ رویوں کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ ہیں۔ جس قوم کی تاریخ میں جنگ وجدل، ترشی و سختی طغیانی وسنگدلی کے بدترین مظاہر پائے جاتے تھے، جس کے افراد میں اپنے متعلقین کے ساتھ مبنی بر ظلم بدسلوکی ایک معمول کا رویہ تھا جو قوم لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتی تھی اور کوئی قانون و قاعدہ ان کا ہاتھ نہ پکڑ سکتا تھا، جو اپنے باپوں کی بیواؤں کو اپنے گھر میں ڈال لیتے تھے، جو مزاج کے اکھڑ ہونے کی وجہ سے آداب مجلس سے ناآشنا تھے، ڈاکہ زنی ان کے ہاں ایک پیشہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ جن کے ہاں تعلیم و تعلم کا کوئی دستور نہ تھا، حضور کی تربیت سے خلق کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو گئے۔ ترحماء بینھم کے مجسّمے بن گئے۔ اسلام کے پیش کردہ تصویر تقویٰ کے پیکر نظر آنے لگے۔ دنیا

بھر کے لیے معلمین اخلاق کا کردار ادا کرنے لگے۔ اور احتسابی اور خود شناسی جیسی لطیف ذہنی و قلبی کاوشوں میں مصروف ہو گئے اور شعبہ علم و عرفان میں نوع انسانی کے معلم بن کر ابھرے۔ تفصیلات ''اسلام تاریخ میں'' کے زیر عنوان باب میں عرض جائے گی۔

کون اس بات کی تردید کر سکتا ہے کہ یہ اور دوسرے بہت سے نتائج حسنہ نبی امی کی صرف چند سالہ مربیانہ کاوشوں کا ثمر تھا اور مدون و منضبط تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس عظیم اور ہمہ جہتی تغیر و انقلاب کو بروئے کار لانے میں متعدد نسلوں پر پھیلی ہوئی محنت یا سینکڑوں ہزاروں حکماء کی علمی و فلسفیانہ کاوشوں کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا بلکہ قرآن کی چند آیات اور حضور کے چند کلمات کے اندر کلی روحانی انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ اس لیے قائدین مشرکین مکہ کہتے تھے کہ نعوذ باللہ یہ شخص ساحر ہے۔

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ(۱۰:۲)

ترجمہ: اور کافروں نے کہا بے شک یہ ایک کھلا ہوا جادو گر ہے۔

وہ حیران ہوتے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے حضور کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی سیرتوں میں بھی ہمہ جہتی تبدیلی کس طرح رونما ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چشم فلک نے آج تک انبیاء و رسل کے حلقہ اثر سے باہر ایسی صورت حال کبھی نہیں دیکھی۔

آداب مجلس کے سلسلے میں عربوں کی یہ حالت تھی کہ قبل از تربیت وہ حضور کے حجرے کے باہر کھڑے ہو کر آپ کا نام لے کر بلند آواز سے بلاتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کہا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ(۴۹:۴)

ترجمہ: بے شک جو لوگ تم کو حجرہ کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ رکھنے والے نہیں ہیں۔

اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے اور بغیر کسی مدرسے میں تعلیم حاصل کیے حالت یہ ہو گئی کہ حضور اگر کسی کو بلاتے تھے تو وہ کہتا تھا لبیک، حاضر ہوں یا رسول اللہ۔ آپ کی ایک عادت مبارکہ تھی کہ جب کسی بات کو دوران خطاب خصوصیت سے ذہن نشین کرانا ہوتا تھا تو آپ حاضرین سے ایسا سوال کرتے تھے جس کا جواب حاضرین جانتے ہوتے تھے۔ لیکن مومنین اپنا جواب دینے کے بجائے کہتے ''''اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں'' اس طرح کی ان گنت مثالیں دی جا سکتی ہیں اور موقع کی ضرورت کے مطابق آئندہ دی جائیں گی۔ عرض

کرنے سے یہاں مقصد یہ ہے کہ حضور نے چند برسوں میں اپنے زیر تربیت لوگوں کے زمین و آسمان بدل ڈالے۔

یہی واقعہ معاملات محمد یعنی اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل کے فہم وادراک کے سلسلے میں رونما ہوا۔ ایک طرف تو خلافت راشدہ کے مثالی نظام کو دیکھیے اور دوسری طرف ان مناظر کو نظروں کے سامنے لائیے جب یہی عرب قبول اسلام کے بعد دنیا کی دو سپر طاقتوں کے حکمرانوں کے درباروں میں مرعوبیت کے کسی معمولی سے معمولی احساس کے بغیر جاتے تھے اور ان سے سفارتی معاملات پر گفتگو کر کے جب لوٹتے تھے تو ان حکمرانوں اور ان کے درباریوں کو حیرانگی میں مبتلا کر کے آتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی

''منصب رسالت'' کے باب میں ہم دین کے پھیلانے کے سلسلے میں انبیاء ورسل کی ذمہ داریوں اور کردار پر مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پر مذکور ذمہ داریوں کو بطریق احسن ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ حضور کو حکم اور تسلی دیتا ہے کہ آپ اس استقامت کے ساتھ دعوتی کام میں مصروف رہیں کہ ہم آپ پر نگران ہیں اور آپ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا(۵۲:۴۸)

ترجمہ: (پس تو اپنے کام میں لگا رہ) اور اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق صبر کیے جا، کچھ شک نہیں کہ تو ہمارے سامنے ہے۔

حضور کا مقام اور مرتبے اور دین کے لیے آپ نے جو کام کیا، کسی پہلو سے بھی اس کا احاطہ کرنا انسان کے بس میں نہیں لہٰذا ہم حضور کے متعلق جو کچھ بھی اور جہاں کہیں بھی اس کتاب میں لکھیں گے اسے ایک کوشش ناتمام ہی تصور کیا جائے۔ موضوع زیر نظر کے سلسلے میں یہاں صرف ایک جھلک ہی دکھائی جا سکتی ہے۔ اسلام کے متعلق اس سے پہلے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اور اس کے بعد بھی جو کچھ لکھا جائے گا وہ آپ کے کارہائے نمایاں کا عکس ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا فرض منصبی دین کی دعوت کے کام کو سرانجام دینا تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے جو سعی وجہد کی اس کی ہمہ جہتی تفصیلات کے لیے ایک دفتر بیکراں درکار ہے۔ لہٰذا یہاں جو کچھ بیان کیا جائے گا اس کی حیثیت آپ کے منصب کی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر جزوی روشنی

ڈالنے کے مترادف ہو گی۔ ان ذمہ داریوں کا تعلق دین کو لوگوں تک پہنچا دینے سے ہو گا۔ بہت سے دوسرے پہلو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیے جائیں گے۔

رسول کا اولین فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جس دین کو پیش کرتا ہے اس کا خود پوری یکسوئی کے ساتھ اتباع کرتا ہے اور درج آیت میں حضور نے اپنے متعلق یہ وضاحت کی ہے کہ میں خود اتباع کرتا ہوں اور صرف اور صرف اس کے اصولوں کو اپناتا ہوں:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ(۴۶:۹)

ترجمہ: میں تو صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور سے دو باتوں کا اعلان کروایا ہے۔ ایک وہ جو اوپر بیان ہوئی، یہ کہ میں جو کچھ پیش کرتا ہوں اس پر خود بھی عمل پیرا ہوں اور دوسرے تم لوگوں کو دین کے احکامات کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرنے کے عواقب سے ڈرانے اور متنبہ کرنے والا ہوں۔

نیز آپ کی ذمہ داریوں میں یہ کام بھی شامل ہے کہ مخاطبین کو اصول دین سمجھائیں۔ اگرچہ اس میں یہ فریضہ شامل نہیں ہے کہ لوگوں کو زبردستی اپنی بات منوائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۭ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ(۸۸:۲۱-۲۲)

ترجمہ: تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر ہو۔

وہی ایمان معتبر اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول ہے جو پوری آمادگی قلب کے ساتھ لایا جائے۔ اس لیے حضور سے کہہ دیا گیا کہ دین کو دلائل کے ساتھ پیش کر دینے کے بعد اگر کوئی اسے قبول نہیں کرتا تو آپ پر اس کے کفر کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ آیت ۲۲ میں حضور کو تسلی دینے کا پہلو بھی شامل ہے۔ دین سے لوگوں کے اعراض پر حضور بہت پریشان اور کبیدہ خاطر ہوتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ آپ پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ آپ ان کے دلوں میں دین کو زبردستی اتار دیں اور اگر نہ مانیں تو اس کو (معاذ اللہ) آپ کی کسی قسم کی نااہلی پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

ہاں! یہ ذمہ داری آنحضرت پر ڈالی گئی ہے کہ مخاطبین کے دلوں کی گہرائیوں میں قرآن کی تعلیمات کو اتارنے کی کوشش کریں ان کی تعمیر سیرت کے لیے اپنی استعداد کی قوتوں کو استعمال کریں، ان کا تزکیہ نفس

کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں اور انہیں یہ درس دیں کہ اپنی روش کو چاہے وہ دین کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتی ہو، حکمت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں۔ اور حضور نے یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (۳:۱۶۴)

ترجمہ: یہ اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت میں پانچ باتیں بیان کی گئی ہیں جو گہرے غور وخوض کی مستحق ہیں اور ان کا اطلاق ہر شخص پر اس کی فکری استعداد اور ایمانی کیفیت کے مطابق ہوتا ہے۔ پہلی بات اولین مخاطبین اسلام سے جنہوں نے دین کو بقیہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری سے عہد برآ ہونا تھا، کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ تم لوگوں کو ہدایت خداوندی سے مشرف کرنے کے لیے تم ہی میں سے ایک انسان بطور رسول مبعوث کیا گیا جو تمہاری زبان، معاشرت، خوبیوں اور برائیوں کو سمجھتا ہے۔ تمہاری نفسیات سے واقف ہے۔ تمہارے مسائل سے شناسائی رکھتا ہے۔ اور اس طرح وہ تمہیں اصول دین اچھی طرح سمجھا سکتا ہے اور تم آسانی سے سمجھ سکتے ہو۔ یہ گویا ان پر اللہ کا احسان تھا جس کے تحت اس نے ان کے لیے آخری مکمل اور ہمیشہ تک زندہ رہنے والے دین کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی۔

دوسری بات اللہ کی آیات کی طرف متوجہ کرنے سے متعلق ہے جو توحید کا ثبوت فراہم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے دین کی حقانیت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کرنے کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یہاں آیات سے مراد قرآنی آیات نہیں ہیں کیونکہ قرآنی تعلیم کا تو ذکر آگے آرہا ہے اور ضمیر بھی اللہ کی طرف پلٹتی ہے۔ آیات سے یہاں مراد انفس وآفاق کے دائروں میں خدا کی قدرت کاملہ کے مظاہرات ہیں جن کا قرآن میں جابجا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور سمع وبصر کی صلاحیتوں اور استعدادوں کے ذریعے غور تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے تجربے، مشاہدے اور تدبیر کی راہیں کھلتی ہیں اور انسان علم وبصیرت کی روشنی حاصل کرتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ تزکیہ نفس کا وہ اہم کام انجام دینے سے تعلق رکھتی ہے جو مومنوں کی تربیت کا اصل مقصود ومتمنا ہے۔ اس کام پر ہی تطہیر کردار اور تعمیر سیرت کا انحصار ہے۔ اسی کے ذریعے انسان کے زمین وآسمان بدل سکتے ہیں۔ اگر یہ کام نہ کیا جائے تو اسلام سے وابستگی محض زبانی جمع خرچ کی حیثیت اختیار کر جاتی۔

اسلامی معاشرے میں افراد کا تزکیہ نفس جس نسبت سے ہوگا اسی نسبت سے اس کو اصلاح یافتہ اسلامی معاشرہ کہا جاسکے گا۔ یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ لوگوں سے کچھ نظریات پر اتفاق حاصل کر لینا اتنا مشکل کام نہیں کیونکہ نظریات عام طور پر ان کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں اور ان کا تعلق سوچ سے ہوتا ہے۔ لیکن تزکیہ نفس انسان قلبی طور پر بہت سی مرغوب عادات و مفادات ترک کرنے کا ذریعہ ہے اور مثبت طور پر اپنی زندگی کو ایک مخصوص ضابطے کے مطابق ڈھالنے کا تقاضا کرتا ہے۔ حضور نے یہ کام اس حد تک انجام دیا جو آج تک اور آج کے بعد رہتی دنیا تک بنی نوع انسان کے لیے مینارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے اور حضور کا یہی وہ کارنامہ تھا جس کے ذریعے سے آپ ایک پاکباز معاشرہ ترتیب دینے میں کامیاب ہوئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے فکر و عمل کے دونوں دائروں میں انسانوں کے اندر انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فکری ٹیڑھ کے علاوہ نفسانی خواہشات انسانوں کو ایسے ایسے چوکوں اور راستے پر لیے پھرتی ہیں جو ان کو پستی کی انتہا تک گرا دیتے ہیں۔ قرآن میں حضرت یوسف اور بعض مفسرین کے نزدیک عزیز مصر کی بیوی کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ (۵۳:۱۲)

ترجمہ: نفس تو برائیوں ہی کی راہ سمجھانے والا ہے مگر جب میرا رب رحم فرمائے۔

دنیا کی فتنہ سامانیاں زیادہ تر نفس پرستی ہی کی مرہون منت ہوتی ہیں۔

اس آیت میں حضور کے جس چوتھے منصب اور کارنامے کا اللہ تعالیٰ نے تذکر فرمایا ہے۔ وہ حضور کا مسلمانوں اور قرآن کے صحیح فہم سے آگاہ کرنا ہے۔ تفصیلات تو "قرآن" کے زیر عنوان باب میں بیان کی جائیں گی، یہاں ہم صرف یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن صفحہ ارض پر ایک منفرد کتاب ہے کہ جو نبی نوع انسان کو اس کے مقصد وجود سے آگاہ کرتی اور اسے فکر و عمل کی تمام جہتوں کے سلسلہ میں رشد و فلاح کے حصول کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ وضاحت و بلاغت کی خوبیوں کے علاوہ اس میں معنوی سطح پر اعجاز و ایجاز کی جو گہرائیاں پائی جاتی ہیں ان کی تفہیم و کا تبین کا فریضہ بھی حضور نے انجام دیا اور اس خوبی سے انجام دیا کہ چند سالوں میں ایک امی قوم کے اندر مفسرین و مضمین قرآن کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر دی جن کی عقدہ کشائیوں سے آج تک اجلہ مفسرین قرآن مستفید ہو رہے ہیں۔ مزید برآں آپ نے ہر مسلمان کو اس کی سمجھ کے درجے کے مطابق قرآن سمجھایا۔ اس کے فہم کو صرف ذہین طبقے یا کسی محدود حلقے ہی کی اجارہ داری میں نہیں دیا۔ حضور کی صلاحیت کار اور مسلمانوں کا قرآن کے ساتھ شغف کا یہ عالم تھا کہ جوں جوں وحی کے ذریعے سے قرآن کی

آیات نازل ہوتی جاتی تھیں، موجودہ ذرائع نشر واشاعت اور نقل و عمل کی عدم موجودگی کے باوجود وہ عرب کے کونے کونے میں مسلمانوں تک پہنچتی جاتی تھیں اور حفاظ انہیں اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ حفاظ دور حاضر کی طرح کے حفاظ نہ ہوتے تھے بلکہ حفظ کرنے کے ساتھ وہ فہم قرآن میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے۔

پانچویں بات تعلیم حکمت ہے۔ حکمت کا لفظ اپنے اندر معانی کا بحر ز خار رکھتا ہے۔ اس کا اطلاق انسان کے اندر پائی جانے والی عقل و دانش اور فہم و فراست کی مجموعی استعداد پر ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسان پیش آمدہ مسائل کے مالہ ماعلیہ کے متعلق سوچتا ہے اور اس سے عہد برآء ہونے کے لیے راہ عمل تجویز کرتا ہے۔ حکمت کا پرتو جس طرح انفرادی عقل و قلب پر پڑتا ہے اسی طرح اجتماعی ضمیر پر بھی پڑتا ہے۔ جو ھیئت اجتماعیہ اس نعمت سے محروم ہو اس کے فلاح و ترقی کے دروازے مسدود ہو جاتے ہیں۔

یہ آیت اقامت دین کا کام کرنے کے سلسلے میں رہنمائی کا ذریعہ ہے وہیں نفاظ دین کا کام کرنے کے مدعیوں کی سرگرمیوں کے برسر حق ہونے یا نہ ہونے کے لیے کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس نکتہ نظر سے ہم نفاذ دین کے عنوان کے تحت گفتگو کریں گے۔

یہاں ہم حکمت کے مفہوم کے سلسلے میں امام شافعی کی تصنیف ''الرسالہ'' سے ''سنت رسول'' مصنفہ شیخ مصطفیٰ السباعی میں دیا گیا ایک اقتباس درج کرتے ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں:

''اللہ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے اس سے مراد قرآن ہے اور جس حکمت کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں میں نے اپنے دیار کے اہل علم سے یہی سنا ہے کہ وہ سنت ہے۔ حکمت کا ذکر جگہ جگہ کتاب کے ذکر کے بعد آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنے اس احسان کو بیان فرمایا ہے کہ انہیں رسول کے ذریعے سے کتاب و حکمت سکھائی جا رہی ہے۔ یہاں حکمت سے سنت رسول کے علاوہ کچھ اور مراد لینا ممکن نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے منصب نبوی میں تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت کو بھی جمع کیا ہے اور دوسری طرف نبی کی اطاعت اور اس کے اتباع امر کو فرض قرار دیا ہے اب کتاب اللہ کے علاوہ جو شئے فرضیت کا مقام حاصل کر سکتی ہے وہ صرف سنت رسول ہے اور یہی دوسرے لفظوں میں ''الحکمہ'' ہے۔ چنانچہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا تذکرہ ایک ساتھ کیا ہے''

حضور قانون اسباب و مسببات کے تحت منفرد انقلاب لائے

نہ قرآن کہتا ہے، نہ حضور نبی کریم صلعم نے یہ دعویٰ کیا اور نہ صحابہ آئمہ، سلف و خلف اور علماء حقہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ داعی اسلام نے جو ہمہ جہتی انقلاب اتنے قلیل عرصے میں برپا کیا، کسی معجزے یا خارق کے زیر اثر تھا۔ اس کے برعکس آنحضرت نے یہ کام اس عالم اراضی میں جاری و ساری قانون علل و معلولات کے تحت انجام دیا۔ جب حضور پر پہلی وحی کا نزول ہوا تو بشری مقتضیات کے تحت آپ پر ہیئت اور خوف کی کیفیت طاری ہو گئی، جیسا کہ ہم اس سے قبل حضرت عائشہ سے مروی حدیث نقل کر کے بیان کر چکے ہیں۔ اس کے بعد جب آغاز دعوت کا حکم ہوا (آیات ۵: ۹۴ اور ۲۶: ۲۱۴) اور حضور نے قریش کو جمع کر کے دعوت اسلام دی تو وہ سب کے سب منتشر ہو گئے اور آپ کے چچا ابو لہب نے آپ کو مخاطب کر کے ناروا کلمات کہے۔ آغاز میں صرف حضور کے چند قریب ترین افراد خانہ نے اسلام قبول کیا۔

تفصیلات تو ''اسلام تاریخ میں'' کے زیر عنوان باب میں آئیں گی یہاں ہم یہ عرض کر دیں کہ علم اور ہراساں کرنے کا اور غلط افواہیں اڑانے کا کوئی حربہ نہیں جو قائدین قریش نے حضور کے خلاف استعمال نہ کیا ہو۔ حضور کو اور مسلمانوں کو وہ سب ایذائیں دی گئیں جو دے سکتے تھے۔ لیکن آنحضرت ہر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جو آپ کو میسر تھا، نامساعد حالات میں دعوت کا کام جاری رکھتے تھے۔ لوگ ٹھٹھا مذاق بھی کرتے تھے، جسمانی ایذائیں بھی دیتے تھے۔ ساحر بھی کہتے تھے کاہن اور شاعر بھی کہتے تھے اور دیوانگی کا طعنہ بھی دیتے تھے۔ کلی معاشرتی اور تجارتی مقاطعہ کر کے درہ بنی ہاشم میں تین سال تک بند کر کے حضور کو اور حضور کے اقربا اور مسلمانوں کو فقر و فاقہ میں بھی مبتلا کیا گیا۔

سفر طائف میں آنحضرت پر پتھروں کی بارش برسائی گئی۔ دعوتی کام کے سلسلے میں آنحضرت اور مسلمانوں کو اپنے آبائی گھر بار اور کاروبار وغیرہ کو خیر باد کہہ کر ہجرت کرنا پڑی۔ بے سروسامانی کے عالم میں جہاد بالسیف کرنا پڑا۔ یاد رہے کہ حضور کے تمام غزوات قلیل ذرائع اور ناکافی سامان حرب کے ساتھ لڑے گئے۔ حضور پر جہاں دوسرے اعتراضات کیے جاتے تھے وہاں معجزے بھی طلب کیے جاتے تھے لیکن ان ساری صعوبتوں، تکلیفوں اور اذیتوں کے باوجود جو حضور اور مسلمانوں کی جماعت کو برداشت کرنا پڑیں کوئی معجزہ یا خرق عادت واقعہ ظہور میں نہ آیا جس سے حضور کا قانون اسباب و مسیات سے ہٹ کر دفاع ہو سکتا تھا۔ حضرت جبرئیل بھی آتے تھے۔

قرآن بھی نازل ہو رہا تھا اللہ تعالیٰ آپ کو مستقبل میں کامیابی کی بشارت بھی دیتا تھا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۹۳: ۴)

ترجمہ: اور بعد کا دور تیرے لیے پہلے سے بہتر ہو گا۔

لیکن خوارق کے ذریعے اسے دین پھیلانا منظور ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ اسوۂ رسول صلعم کے ذریعے ابدالآباد تک کے لیے یہ بات واضح کرنا چاہتا تھا کہ اقامت دین کا کام کن مراحل سے گزر کر کیا جا سکتا ہے۔ خوارق کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اور اس میں ایک واضح مصلحت ہے۔ اگر حضور دعوت و اقامت دین کا کام معجزات و خوارق کے سہارے انجام دیتے تو آپ کے بعد مسلمانوں پر یہ ذمہ داری کیسے عائد کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کام کو اپنی سعی و جہد سے اور جانوں کی قربانی دے کر کریں۔ حضور کے بعد دعوت کے کام کو اور اپنے اعمال کو اسوہ حسنہ رسول کے مطابق انجام دینے کا حکم ہے۔ اگر رسول صلعم کی کامیابی کو معجزات سے مشروط کر دیا جاتا تو مسلمان بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ حضور کو تو معجزات کی معاونت حاصل تھی۔ اب ہم جدوجہد کے ذریعے اس کام کو کیسے کر سکتے ہیں۔ بہر حال دین کا غلط تصور رکھنے والے کفار حضور سے خوارق کا تقاضا کرتے تھے لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف تھی۔ چنانچہ فرمایا:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۰:۱۷-۹۳)

ترجمہ: اور کہتے ہیں ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دو یا تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جائے تو پھر تم اس کے بیچ بیچ میں نہریں نہ دوڑا دو۔ یا تم ہم پر آسمان سے ٹکڑے نہ گرا دو جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو۔ یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے لا کھڑا کرو یا تمہارے پاس سونے کا کوئی گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی ماننے کے نہیں جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جسے ہم پڑھیں۔ کہہ دو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول ہوں۔

کفار کے مطالبات خوارق کے متعلق قرآن میں اور بھی آیتیں ہیں۔ ہم نے ان میں سے درج بالا ایسی آیات نقل کی ہیں جن میں معجزات و خوارق کے بہت سے مطالبات یکجا جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ہر دور کے مادہ

پرستوں اور محسوسات کے امیروں کا اپنا اپنا انداز گفتگو ہے۔ اس دور کے امی عربی اپنی مادہ پرستانہ ذہنیت کا ایسے الفاظ میں اظہار کرتے تھے اور موجودہ دور کے مادہ پرست، جو اپنے علم و عرفان اور عقل و دانش پر بہت نازاں ہیں، دوسرے انداز میں ایسی باتیں کرتے ہیں جو بنیادی طور پر اسی ذہنیت غمازی کرتی ہیں۔ مطالبات خوارق واضح ہیں۔ ہم ناظرین کی توجہ ان کے جواب کی طرف منعطف کروانا چاہتے ہیں۔ کس قدر معنی خیز جواب ہے۔ حضور سے اللہ کہتا ہے کہ انہیں کہہ دو کہ میں تو بشر ہی ہوں اور اللہ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھ میں ان معجزات کو ظہور میں لانے کی قدرت نہیں۔

حضور کی بعثت سے قبل پیغمبروں کے ذریعے جو معجزات ظہور پذیر ہوتے رہے، ان کے متعلق ''معجزات'' کے عنوان کے تحت الگ سے گفتگو کی جائے گی۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضور کو معراج یا اسراء کا معجزہ دیا گیا۔ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حضور کی بعثت سے قبل جن انبیاء و رسل کو معجزات دیئے گئے وہ کفار اور اعدائے دین کے سامنے بطور اتمام حجت کے ظہور پذیر ہوئے۔ لیکن قرآن گواہ ہے کہ ان کے بعد بھی وہ اپنی کٹھ حجتیوں میں مصروف رہے اور دکھانے والے پیغمبر کو ساحر کہتے رہے۔ حضرت موسیٰ کے معجزات کے نتیجے میں فرعون نے دین اسلام قبول نہ کیا اور حضرت عیسیٰ کے معجزات پر انہیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معجزات راہ ہدایت قبول کرنے کا ذریعہ ثابت نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ کہ ادیان قبل از بعثت محمد صلعم مکمل اور ابدی طور پر اپنانے کے لیے نہیں تھے۔ وہ انسانی سمجھ اور سوچ کے مختلف منازل ارتقاء کے حسب حال نازل کیے گئے تھے۔ لیکن بعثت محمد صلعم کے ساتھ انسان مرحلہ بلوغت میں داخل ہو گیا۔ اس نے اب اسی کی فکری استعدادوں ہی سے خطاب کیا۔ چنانچہ قرآن میں سینکڑوں مرتبہ عقل و خرد تفکر و تعقل اور تدبر و تعلم کی انسانی استعدادوں کو بیدار کرنے اور ان سے استفادہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ جہاں تک معراج و اسراء کے واقعہ تعلق ہے، اس کا کسی کو علی الاعلان مشاہدہ نہیں کرایا گیا بلکہ اس کی اپنی نوعیت کے لحاظ سے وہی حیثیت سے جو وحی کی ہے۔ نزول وحی پر بھی حضور کے دعوے پر اعتماد کے نتیجے میں ایمان لانا ہوتا ہے اور معراج و اسراء کو بھی حضور کے ارشاد کی بنیاد پر ہی برسر حق تسلیم کرنا ہوتا ہے۔

باقی رہ گیا یہ مسئلہ کہ معراج و اسراء کا مقصد کیا تھا، تو قرآن نے اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط (۱:۱۷)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک جس کے ارد گرد کو ہم نے برکت بخشی تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔

گویا یہ سفر کرانے کا مقصد دعوت کے کار عظیم میں روحانی قوت فراہم کرنے کے لیے حضور پر حقیقت کی اس حد تک پردہ کشائی کرنا تھا جس حد تک پردہ کشائی کرنا تھا جس حد تک اللہ تعالیٰ مناسب سمجھتا تھا۔ مفسرین نے اس موضوع پر بہت بحثیں کی ہیں اور مسلمانوں میں تحقیق و مطالعہ کا جو شوق رہا ہے اس کے پیش نظر یہ بات قابل اعتراض نہیں بلکہ یہاں ان بحثوں کو نقل کرنا باعث طوالت ہوگا۔ دوسرے قرآن میں بیان کردہ مقصد معراج و اسراء پر سب کا اتفاق ہے۔ یہ سفر چاہے روحانی طور پر کرایا گیا ہو یا جسمانی طور پر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خدا اپنے مقصد مشیت میں کبھی ناکام نہیں سکتا۔ وہ جو باتیں حضور کے علم میں لانا چاہتا تھا اور جن حقیقتوں کا مشاہدہ کروانا چاہتا تھا اس نے کروادیا، چاہے جسم خاکی کے ساتھ یا روحانی سطح پر۔

جو حضرات اب یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ سائنسی ترقی کے ذریعے انسان خلاء میں پہنچ گیا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ حضور کو اس سفر میں نہ لے جاسکتا تھا، ان کا یہ کہنا واقعہ کی نوعیت اور تمثیل کی موزونیت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ سائنس کی ترقی انسانی محسوسات و مشاہدات کی دنیا تک محدود ہے اور اس واقعہ کا تعلق اللہ کی لامحدود قدرت کاملہ سے ہے جو زمان و مکان کی اور قوانین اسباب و مسببات کی محدودتیوں کی پابندی سے آزاد ہے۔

اعدائے اسلام نے سب سے زیادہ حضور کی ذات کو ہدف مخالفت بنایا

دشمن ہمیشہ اس اثاثے پر زور دار حملہ کرتا ہے جو اس کے مخالف فریق کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی ہو۔ اس دنیا میں اسلام سے متعلق دو چیزیں اہمیت کے لحاظ سے سر فہرست ہیں۔ ایک پیغمبر اسلام کی ذات اور دوسرے قرآن۔ مخالفین نے قرون اولیٰ میں بھی ان اثاثوں کو خصوصی مخالفت کا ہدف بنایا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں بھی ایسا ہی ہوا اور آج بھی یہی صورت ہے۔ قرآن کے سلسلے میں تو متعلقہ باب میں گفتگو ہوگی یہاں ہم حضور کے مقام علیا کو گرانے کی ناکام کوششوں کا تذکرہ کریں گے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، کوہ صفا پر جب حضور نے قریش کو خطاب کر کے اپنی بعثت سے آگاہ کیا اور انہیں صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی تلقین کی تو انہوں نے حضور کی دعوت کو نظر انداز کیا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ(۲۱:۲)

ترجمہ: ان کے رب کی طرف سے جو تازہ یاد دہانی بھی ان کے پاس آئی ہے یہ اس کو بس مذاق کرتے ہوئے سنتے ہیں۔

لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ دعوت اسلام پر بعض لوگ لبیک کہہ رہے ہیں تو انہوں نے بعض شاعروں مثلاً ابو سفیان بن حارث، عمرو بن العاص، عبداللہ بن زبیر وغیرہ سے کہا کہ حضور کے خلاف اشعار کہہ کر ان کی تشہیر کریں۔ اور حضور کی اہانت کرنے میں کسی ہرزہ سرائی سے گریز نہ کریں۔ عرب معاشرے میں شاعروں کا بہت اونچا مقام حاصل تھا اور ان کا کلام ان کو متاثر کرنے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

جب یہ حربہ بھی کامیاب ہوتا نظر نہ آیا تو قائدین قریش نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص پریشان قسم کی خوابیں دیکھتا ہے اور جس کلام کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ قرار دیتا ہے فی الحقیقت اسے خود گھڑتا ہے۔ اور عام شاعروں جیسی بے سروپا باتیں کرتا ہے۔ قرآن نے ان کی ان باتوں کو یوں بیان کیا ہے:

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ(۲۱:۵)

ترجمہ: بلکہ انہوں نے کہا یہ تو خواب پریشاں ہیں بلکہ اس کو انہوں نے گھڑ لیا ہے بلکہ یہ ایک شاعر ہیں۔

جب دیکھا کہ یہ کلام اپنی فصاحت و بلاغت اور اپنی معنوی بلندی کے لحاظ سے حضور جیسے ہی شخص کی طرف سے منسوب کیا جا سکتا ہے تو کہا کہ یہ کلام آپ بعض دوسرے لوگوں کی اعانت سے وضع کرتے ہیں۔ قرآن ان کے ان الزامات کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۛ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا(۲۵:۴-۵)

ترجمہ: اور کافر کہتے ہیں کہ یہ محض جھوٹ ہے جو کہ اس شخص نے گھڑا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ظلم اور جھوٹ دونوں باتوں کا ارتکاب کیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں جو اس نے لکھوائے ہیں تو وہ اس کو صبح و شام لکھ کر تعلیم کیے جاتے ہیں۔

یعنی جس شخص کو کل تک بالاتفاق امین اور صدق وصفا کا پیکر کہتے تھے اس کو (نعوذ باللہ) ہر قسم کی جعلسازی، کذب اور افترا کا مرتکب قرار دے رہے ہیں اور ان الزامات کو اہل مکہ اور باہر سے آنے والے لوگوں تک پہنچانے کی حتی المقدور پوری کوشش کر رہے ہیں۔ حضور جو تعلیمات دے رہے تھے ان کا تو ان کے پاس دلائل کی بنیاد پر کوئی توڑ نہ تھا۔ لہٰذا وہ اس بات کی سعی وجہد میں مصروف رہتے تھے کہ حضور کے کردار کو داغدار ثابت کیا جائے۔ اس خیال خام میں مبتلا تھے کہ اس حربے سے آپ کے پیش کردہ نظریات پر کوئی کان نہیں دھرے گا، اور نہ آپ کی طرف سے کسی کو رغبت ہو گی۔

جوں جوں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے اکابرین قریش کی تلملاہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جہاں تک اسلام قبول کر لینے والوں کا تعلق تھا ان کے ایمان وایقان کی کیفیت دیکھ کر وہ اس بات سے تو مایوس ہو چکے تھے کہ ان کو ان اصولوں سے بد ظن جا سکتا ہے جن پر یہ ایمان لے آئے ہیں۔ لہٰذا وہ ان اصولوں کے پیش کرنے والے کی شخصیت کی عظمت کو مجروح کر کے ان کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنے کے لیے حضور کو سحر زدہ بھی قرار دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ آپ عقلی توازن کھو چکے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا(۸:۲۵)

ترجمہ: اور ان ظالموں نے کہا کہ تم تو بس ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے لگ لیے۔

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضور کو طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بھی بنایا جاتا تھا تاکہ لوگ یہ تاثر لیں کہ ایک بے مایہ کمزور اور بے آسرا شخص کے اتنے عالی مقام پر فائز ہونے کے حق میں ہم کس طرح تسلیم کر لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہے حضور کو (نعوذ باللہ) ہلکا شخص قرار دینے کے لیے یہ بھی کہتے تھے، جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ(۳۱:۴۳)

ترجمہ: اور انہوں نے اعتراض کیا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔

دو بستیوں سے مراد مکہ اور طائف کے شہر ہیں۔ مشرکین مکہ یہ کہہ کر لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ حضور دنیوی اعتبار سے اکابرین میں شمار نہیں ہوتے پھر قرآن (یا نبوت) کے نزول کے لیے کیا انہیں ہی نامزد کیا جاتا تھا؟

اس کے علاوہ حضور کو دیوانہ بھی قرار دیتے تھے:

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ(۱۵:۶)

ترجمہ: اور یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر قرآن اترا ہے، تم تو دیوانے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کو اس طعنے کی تردید کے لیے کہنا پڑا:

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ(۶۸:۲)

ترجمہ: تم اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔

اس سے قبل ہم آیت ۱۰:۲ کا حوالہ دے کر بیان کر چکے ہیں مشرکین مکہ حضور کو ساحر بھی کہتے تھے۔

غرض یہ کہ بااثر اشخاص نے حضور کو بعثت کے بعد ہر اس ذہنی پستی میں مبتلا ہونے کا طعنہ دیا اور اس کی تشہیر کی جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ اس مقام علیا پر فائز ہونے کے قابل نہیں جس پر متمکن ہونے کا آپ دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ جو کوئی پیغمبر اسلام کے قریب جاتا تھا وہ آپ کے اخلاق حسنہ، عقل و دانش اور تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوتا اور آپ کے پیش کردہ دین پر اس پختگی سے جم جاتا کہ مشرکین و کفار مکہ کے انتہائی ظلم و ستم کے باوجود حق سے یکسر موانحراف کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا۔

حضور کا صبر و عزم

انسانی صبر و عزم کے علامتیں یہ ہیں کہ انسان حالات کی نامساعدت اور ناسازگاری، مخالفین کے ظلم و ستم اور جادہ منزل کے نشیب و فراز کے علی الرغم ثابت قدمی، اپنے اصولوں اور اخلاقی اقدار سے وابستگی اور حوصلے کی بلندی قائم رکھے اور اپنے ارادوں اور مقاصد و اہداف میں کوئی تزلزل و رجحان مصالحت اور نرمی نہ پیدا ہونے دے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری نبوی زندگی گواہ ہے کہ حضور میں یہ تمام علامات بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ اس بات کی شہادت حضور کے متعلق اس سے قبل کیے گئے تذکروں میں بھی ملتی ہے اور آئندہ کی جانے والی گزارشات سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آگیا یا حضور کی اجتہادی بصیرت نے جس بات کو حق سمجھا حضور دشمنان اسلام کے مظالم اور مخالفتوں سے بے پرواہو کر ان پر چٹان کی طرح جم جاتے تھے۔ عام لوگوں کی نگاہوں میں حالات کی ناسازگاری انتہا تک پہنچ جاتی تھی لیکن حضور کے دعوتی طرز عمل میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ ہر قسم کے حالات میں خلق نبوی بھی یکساں حالت میں رہتا تھا۔ مخالفین کی درشتیوں، ناروا سلوک اور اخلاق سوز حرکات کا جواب حسن اخلاق اور ان کے حق میں اس دعا سے دیتے تھے کہ خدا انہیں قبول ہدایت کی توفیق دے۔ ساری زیادتیوں کے باوجود مخالفین کے خلاف غصہ اور غضب کے جذبات کا کبھی اظہار نہیں ہوا بلکہ ہمدردی اور حسن سلوک کا اظہار ہوتا تھا۔

جن جن واقعات کے سلسلے میں حضور کی خصوصیات نمایاں ہوتی تھی ان کا تذکرہ ''اسلام تاریخ می'' کے عنوان کے تحت کیا جائے گا۔ یہاں ہم ان کا ذکر یہ ظاہر کرنے کے لیے کر رہے ہیں کہ دعوتی کام میں حضور کا عزم اس قدر پختہ تھا کہ آپ کی راہ ں کسی قسم کی ذاتی انا، مصیبتوں سے محفوظ رہنے کا اہتمام اور تکلیف کا سامنا کرنے سے گھبرانے کے کسی خیال کو مزاحم نہ ہونے دیتے تھے۔ مزید برآں صبر، عزم اور استقامت کی خصوصیات کا نتیجہ تھا کہ آپ پر کسی حالت میں بھی پریشانی غالب نہ آتی تھی۔ اللہ کی رحمت پر بھروسہ آپ کی سیرت کے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کو اس حالت میں بھی جب کہ مادی اعتبار سے دشمن کی برتری اور اپنی کمزوریاں اظہر من الشمس ہوتی تھیں، کبھی مایوسی و پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کا مؤثر ابلاغ اور اسے جامہ عمل کا عزم اس قدر پختہ تھا کہ آپ کسی مشکل اور مزاحمت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آپ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی عنایات کے طالب اور پرامید رہتے تھے۔

مسلمانوں کی طرف تفہیم دین اور اصلاح اعمال کے نکتہ نظر سے خصوصی توجہ دینا ایک قدرتی بات تھی، لیکن دشمنوں سے بھی ہمدردی و برتری اور ان کو حکیمانہ انداز سے سمجھانے بجھانے میں آپ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ مؤخر الذکر کے ساتھ ایسا سلوک اور رویہ روا رکھتے تھے جیسے ان لوگوں نے حضور کی نہ کبھی مخالفت کی اور نہ کبھی ان سے کوئی برا رویہ اختیار کیا۔ بنی نوع انسان کو راہ راست پر لانے کا مصمم ارادہ دوسروں کی ہر قبیح سے قبیح حرکت کو نظر انداز کرنے کا باعث ہوتا تھا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور کے حوصلے میں بے مثل وسعت پیدا کر دی تھی۔ حضور کی سیرت کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے حضور کی حیات اتنے واقعات سے معمور ہے جس کا یہاں احاطہ نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے الفاظ میں لکھنے کے بجائے ہم یہاں مولانا سید سلیمان ندوی کے (خطبات مدراس) کے خطبہ نمبر ۲ میں سے مولانا ہی کے الفاظ میں چند واقعات پر مشتمل اقتباس پیش کرتے ہیں جو انہوں نے یکجا کر دیئے ہیں۔ واقعات تواتر کے ساتھ کتب حدیث و تاریخ میں روایت ہوتے چلے آ رہے ہیں:

''ابو سفیان کون ہے ! وہ جو بدر، احد، خندق وغیرہ لڑائیوں کا سرغنہ تھا جس نے کتنے مسلمانوں کو تہ تیغ کرایا، جس نے کتنی دفعہ حضور سرور عالم کے قتل کا فیصلہ کیا جو ہر قدم پر اسلام کا سخت ترین دشمن ثابت ہوا۔ لیکن فتح مکہ سے پہلے جب حضرت عباس کے ساتھ آپ کے سامنے آتا ہے تو گو اس کا جرم اس کے قتل کا مشورہ دیتا ہے، مگر رحمت عالم کا عفو عام ابو سفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں، محمد رسول اللہ انتقام کے جذبے سے بالاتر ہیں، پھر حضور نہ صرف اس کو معاف فرماتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ من دخل دار ابی سفیان کان امنا (جو ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی امن ہے۔'')

''ہندہ'' ابو سفیان کی بیوی وہ ہے جو احد کے معرکے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی تھی۔ وہ جو حضور کے سب سے محبوب چچا اور اسلام کے ہیرو حضرت حمزہ کی لاش کے ساتھ بے ادبی کرتی ہے۔ ان کے سینہ کو چاک کرتی ہے، ان کے کان ناک کٹ کر ہار بناتی ہے۔ کلیجہ کو نکال کر چبانا چاہتی ہے۔ لڑائی کے بعد اس منظر کو دیکھا اگر آپ بیتاب ہو جاتے ہیں۔ وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آتی ہے اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی۔ لیکن حضور پھر بھی کوئی تعرض نہیں فرماتے ہیں اور یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تم نے یہ کیوں کیا عفو عام کی اس معجزانہ مثال کو دیکھ کر وہ پکار اٹھتی ہے: ''اے محمد ! آج سے پہلے تمہارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے مجھے نفرت نہ تھی، لیکن آج تمہارے خیمے سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے۔''

''وحشی حضرت حمزہ کا قاتل، فتح طائف کے بعد بھاگ کر کہیں چلا جاتا ہے، اور جب وہ مقام بھی فتح ہو جاتا ہے تو دوسری جائے پناہ نہیں ملتی، لوگ کہتے ہیں وحشی تم نے ابھی محمد کو پہچانا نہیں، تمہارے لیے خود محمد کے آستانہ سے بڑھ کر کوئی دوسری جائے امن نہیں۔ وحشی حاضر ہو جاتا ہے، حضور دیکھتے ہیں، آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔

پیارے کی شہادت کا منظر سامنے آ جاتا ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، قاتل سامنے موجود ہے، مگر صرف یہ ارشاد ہوتا ہے، وحشی جاؤ میرے سامنے نہ آیا کرو، کہ شہید پاکا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''

''عکرمہ اسلام، مسلمانوں اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن یعنی ابو جہل کے بیٹے تھے، جس نے آپ کو سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائیں، وہ خود بھی اسلام کے خلاف لڑائیاں لڑ چکے تھے، مکہ جب فتح ہوا تو ان کو اپنے اور اپنے خاندان کے تمام جرم یاد تھے۔ وہ بھاگ کر یمن چلے گئے۔ ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان چکی تھیں۔ وہ خود یمن گئیں عکرمہ کو تسلی دی

اور ان کو لے کر مدینہ آئیں۔ حضور کو انکی آمد کی خبر ہوتی ہے تو ان کے خیر مقدم کے لیے اس تیزی سے اٹھتے ہیں کہ جسم مبارک پر چادر تک نہیں رہتی۔ پھر جوش مسرت میں فرماتے ہیں مرحبا بالراکب المهاجر (اے مہاجر سوار تمہارا آنا مبارک۔) غور کرو! مبارک کس کو دی جارہی ہے۔ یہ خوشی کس کے آنے پر ہے۔ یہ معافی نامہ کس کو عطا ہو رہا ہے۔ اس کو، جس کے باپ نے آپ کو مکہ میں سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائیں، جس نے آپ کے جسم مبارک پر نجاست ڈلوائی۔ جس نے بحالت نماز آپ پر حملہ کرنا چاہا، جس نے آپ کے گلے میں چادر ڈال کر آپ کو پھانس دینی چاہی۔ جس نے دارالندوہ میں آپ کے قتل کا مشورہ دیا۔ جس نے بدر کا معرکہ برپا کیا اور ہر قسم کی صلح کی تدبیر کو برہم کیا۔ آج اسی کی جسمانی یادگار کی آمد پر یہ مسرت اور شادمانی ہے۔"

"ہبار بن الاسود وہ شخص ہے جو ایک حیثیت سے حضرت کی صاحبزادی حضرت زینب کا قتل ہے، اور کئی شرارتوں کا مرتکب ہو چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھاگ کر ایران چلا جائے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا در دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے یا رسول اللہ! میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا، لیکن پھر مجھے حضور کا رحم و کرم اور عفو و حلم یاد آیا۔ میں حاضر ہوں۔ میرے جرائم کی جو اطلاعیں آپ کو ملی ہیں وہ سب درست ہیں۔ اتنا سنتے ہی آپ کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور دوست اور دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔"

"عمیر بن وہب بدر کے بعد ایک قریشی رئیس کی سازش سے اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آتا ہے۔ اور اس تاک میں رہتا ہے کہ موقع پا کر نعوذ باللہ آپ کا کام تمام کر دے، کہ ناگاہ وہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ آپ کے پاس لایا جاتا ہے۔ اس کا گناہ ثابت ہو جاتا ہے۔ مگر وہ رہا کر دیا جاتا ہے"

"صفوان بن امیہ یعنی، وہ رئیس جس نے عمیر کو آپ کے قتل کے لیے بھیجا تھا اور جس نے عمیر سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم اس مہم میں مارے گئے تو تمہارے اہل و عیال اور قرضہ کا میں ذمہ دار ہوں۔ فتح مکہ کے بعد وہ ڈر کے جدہ بھاگ جاتا ہے۔ کہ سمندر کے راستے سے یمن چلا جائے۔ وہی عمیر خدمت نبوی میں آکر عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ! صفوان اپنے قبیلہ کا رئیس ڈر کی وجہ سے بھاگ گیا ہے کہ اپنے کو سمندر میں ڈال دے۔ ارشاد ہوتا ہے اس کو امان ہے۔ عمیر دوبارہ گزارش کرتے ہیں کہ اس امان کی کوئی نشانی مرحمت ہو کہ اس کو یقین آئے۔ آپ اپنے عمامہ اٹھا کر دے دیتے ہیں۔ عمیر یہ عمامہ لے کر صفوان کے پاس پہنچتے ہیں۔ صفوان کہتا ہے مجھے محمد کے پاس جانے میں اپنی جان کا خوف ہے۔ وہ عمیر جو زہر میں تلوار بجھا کر محمد رسول اللہ کو مارنے گئے تھے ، صفوان سے کہتے ہیں "اے صفوان ابھی تم کو محمد کے حلم اور عفو کا حال معلوم نہیں "صفوان آستانہ نبوی پر حاضر

ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے کہا گیا ہے کہ تم نے مجھے امان دی ہے ؟ کیا یہ سچ ہے ؟ ارشاد ہوتا ہے سچ ہے۔ پھر کہتا ہے۔ لیکن میں تمہارا دین ابھی قبول نہیں کروں گا۔ مجھے دو مہینے جینے کی مہلت دو۔ آپ فرماتے ہیں تمہیں دو نہیں چار مہینے کی مہلت ہے لیکن یہ مہلت ختم بھی نہیں ہونے پاتی کہ دفعتاً اس کے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے اور وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔''

''آپ خیبر جاتے ہیں جو یہودی قوت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ شہر فتح ہوتا ہے۔ ایک یہودیہ دعوت کرتی ہے۔ آپ بلا پس و پیش منظور فرماتے ہیں۔ یہودیہ جو گوشت پیش کرتی ہے اس میں زہر ملا ہوتا ہے، آپ گوشت کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہیں کہ آپ کو اطلاع ہو جاتی ہے۔ یہودیہ بلائی جاتی ہے۔ وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتی ہے۔ لیکن رحمت عالم کے دربار سے اسے کوئی سزا نہیں ملتی۔ حالانکہ اس زہر کا اثر آپ کو اس کے بعد عمر بھر محسوس ہوتا رہا۔''

''غزوہ نجد سے واپسی کے وقت آپ تنہا ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے۔ آپ کی تلوار درخت سے لٹک رہی ہے۔ صحابہ ادھر ادھر درختوں کے سایہ میں لیے ہوئے ہیں، کوئی پاس نہیں ہے، ایک بدو تاک میں رہتا ہے۔ وہ اس وقت سیدھا آپ کے پاس آتا ہے۔ درخت سے آپ کی تلوار اتارتا ہے۔ پھر نیام سے باہر کھینچتا ہے کہ آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ تلوار ہلا کر پوچھتا ہے ''محمد! تناؤاب کون تم کو مجھ سے بچا سکتا ہے'' ایک پر اطمینان صدا آتی ہے ''اللہ'' اس غیر متوقع جواب کو سن کر وہ مرعوب ہو جاتا ہے۔ تلوار نیام میں کر لیتا ہے۔ صحابہ آجاتے ہیں۔ بدو بیٹھ جاتا ہے اور آپ اس سے کوئی تعرض نہیں فرماتے۔''

''ایک دفعہ ایک اور کافر گرفتار ہو کر آتا ہے۔ یہ قتل کے لیے آپ کی گھات میں تھا۔ وہ سامنے پہنچتا ہے تو آپ کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ آپ اس کو تسلی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں اگر تم قتل کرنا چاہتے بھی تب بھی نہیں کر سکتے تھے۔ غزوہ مکہ میں اسی آدمیوں کا دستہ گرفتار ہوا۔ جو جبل تنعیم سے اتر کر آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو خبر ہوئی تو فرمایا ان کو چھوڑ دو۔''

''دوستو! طائف کو جانتے ہو وہ طائف جس نے مکہ کے عہد ستم میں آپ کو پناہ نہیں دی۔ جس نے آپ کی بات بھی سننی نہیں چاہی۔ جہاں کے رئیس عبد یالیل کے خاندان سے آپ سے استہزاء کیا، بازاریوں کو اشارہ کیا کہ وہ آپ کی ہنسی اڑائیں، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور دو رویہ کھڑے ہو گئے اور جب آپ بیچ سے گزرے تو دونوں طرف سے پتھر برسائے یہاں تک کہ پائے مبارک زخمی ہو گئے۔ دونوں جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ جب آپ تھک کر بیٹھ جاتے تو یہ شریر آپ کا بازو پکڑ کا اٹھا دیتے۔ جب آپ چلنے لگتے تو پھر

پتھر برساتے۔ آنحضرت کو اس دن اس قدر تکلیف پہنچی تھی کہ نو برس کے بعد جب حضرت عائشہ نے ایک دن دریافت کیا کہ یارسول اللہ! تمام عمر میں آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کونسا آیا، تو آپ نے اسی طائف کا حوالہ دیا تھا۔ ۸ھ میں مسلمانوں کی فوج اسی طائف کا محاصرہ کرتی ہے، ایک مدت تک محاصرہ جاری رہتا ہے، قلعہ نہیں فتح ہوتا، بہت سے مسلمان شہید ہوتے ہیں آپ واپسی کا ارادہ کرتے ہیں، پر جوش مسلمان نہیں مانتے، طائف پر بددعا کرنے کی درخواست کرتے ہیں، آپ ہاتھ اٹھاتے ہیں، مگر کیا فرماتے ہیں، خداوندا! طائف کو ہدایت کر اور اس کو اسلام کے آستانہ پر جھکا۔'' دوستو! یہ کس شہر کے حق میں دعائے خیر ہے، وہی شہر جس نے آپ پر پتھر برسائے تھے، آپ کو زخمی کیا تھا اور آپ کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا۔''

''احد کے غزوہ میں دشمن حملہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ آپ نرغہ اعداء میں ہوتے ہیں، آپ پر پتھر، تیر اور تلوار کے وار ہو رہے ہیں۔ دندان مبارک شہید ہوتا ہے، خود کی لڑیاں سر مبارک میں گڑ جاتی ہیں، چہرہ مبارک خون سے رنگین ہوتا ہے، اس حالت میں بھی آپ کی زبان پر یہ الفاظ آتے ہیں وہ قوم کیسے نجات پائے گی جو اپنے پیغمبر کو قتل کے درپے ہے۔ خداوندا!! میری قوم کو ہدایت کر کہ وہ جانتی نہیں ہ''۔ یہ ہے اپنے دشمن کو پیار کر کے زیتونی وعظ پر عمل جو صرف شاعرانہ فقرہ نہیں، بلکہ عمل کا خطرناک نمونہ ہے۔''

''وہی ابن عبد یالیل جس کے خاندان نے طائف میں آپ کے ساتھ یہ ظلم کیے تھے، جب طائف کا وفد لے کر مدینہ آتا ہے تو آنحضرت صلعم اس کو اپنی مقدس مسجد میں خیمہ گاڑ کر اتارتے ہیں، ہر روز نماز عشاء کے بعد اس سے ملاقات کو جاتے ہیں، اور اپنی رنج بھری مکہ کی داستان سناتے ہیں۔ کس کو؟ اس کو جس نے آپ پر پتھر برسائے تھے اور آپ کو ذلیل کیا تھا! یہ ہے، تو اپنے دشمن کو پیار کر اور معاف کر۔

''مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، اسی حرم کے صحن میں آپ کو گالیاں دی گئیں، آپ پر نجاستیں پھینکی گئیں، آپ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی۔ قریش کے تمام سردار مفتوحانہ کھڑے تھے۔ ان میں وہ تھے جو اسلام کے مٹانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ وہ بھی تھے جو آپ کو جھٹلایا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جو آپ کی ہجو کہا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آپ پر پتھر پھینکے تھے، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، آپ پر تلواریں چلائی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آپ کے عزیزوں کا خون ناحق کیا تھا، ان کے سینے چاک کئے تھے، اور ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے۔ وہ بھی تھے جو غریب و بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ ان

کے سینوں پر اپنی جفاکاری کی آتشیں مہریں لگاتے تھے۔ان کو جلتی ہوئی ریتوں پر لٹاتے تھے، دہکتے کوئلوں سے ان کے جسم کو داغتے تھے۔ نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے۔

آج یہ سب مجرم سرنگوں سامنے تھے۔ پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں محمد رسول اللہ کے اشارے کی منتظر تھیں۔ دفعتہً زبان مبارک کھلتی ہے۔ سوال ہوتا ہے، ''قریش! بتاؤ میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟'' جواب ملتا ہے ''محمد تو ہمارا شریف بھائی اور شریف بھتیجا ہے''۔

ارشاد ہوتا ہے۔ ''آج میں وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا کہ لا تثریب علیکم الیوم آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں۔ اذھبوا وانتم الطلقاء جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

''یہ ہے دشمن کو پیار کرنا، اور معاف کرنا، یہ ہے اسلام کے پیغمبر کا عملی نمونہ اور عملی تعلیم، جو صرف خوش بیانیوں اور شیریں زبانیوں تک محدود نہیں، بلکہ دنیا میں واقعہ اور عمل بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔''

(خطبات مدراس صفحات ۱۳۳تا۱۴۰)

آپ کے اسوہ حسنہ کی ایک نمایاں خصوصیت

ادوار سابقہ اور دور جدید میں مختلف سلطنتوں کے بانیوں، مختلف شعبہ ہائے علم میں نمایاں مقام رکھنے والوں، معلمین اخلاق، فلاسفہ اور مختلف تحریکوں کے داعیوں کی زندگیوں کی میراث پر غور کیجئے۔ کسی کی ذاتی زندگی کے لائق اتباع ہونے پر زور نہیں دیا جائے گا۔ کسی کی کشور کشائی نمایاں ہوگی، کسی کا کوئی علمی کارنامہ خراج تحسین وصول کرے گا، کسی کے سیاسی خیالات قابل توجہ سمجھے جائیں گے۔ لیکن پیغمبر اسلام کی یہ خصوصیت بھی بے مثل ہے کہ حضور کا اسوہ حسنہ بھی اسی سطح کی اہمیت رکھتا ہے جس سطح کی اہمیت دین اسلام کے اصولوں کو حاصل ہے۔ دنیا کے ہر کام سے مشکل کام یہ ہے کہ انسان ان تمام اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرے جو وہ پیش کر رہا ہو، خصوصاً جب کہ وہ اصول زندگی کے کسی گوشے کو نظر انداز نہ کرتے ہوں۔ بڑے بڑے داعیان حق وانصاف اور عدل وفلاح انسانیت اپنی زندگیوں کو ظاہری چمک دمک رکھنے والے دعاوی کرنے میں بسر کر دیتے ہیں لیکن اگر ان کی سیرتوں پر گفتگو کی جائے تو وہ اس پر احتجاج کرتے ہیں کہ یہ ہمارے نجی اور ذاتی معاملات ہیں، انہیں زیر بحث لانے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں۔ جب یہ لوگ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں، تب بھی ان کے سیاسی، سماجی، علمی یا اور کسی کام کا جو انہوں نے انجام دیا ہو تذکرہ ہوتا ہے لیکن ان کے ذاتی محاسن قابل توجہ ہی نہیں سمجھے جاتے۔ اور نہ ان کے ذاتی حالات ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے

قرآن ہی میں کہہ دیا کہ حضور کا اسوہ مسلمانوں کے لیے قابل اتباع ہے (۲۱:۳۳)۔ ظاہر ہے کہ جب حضور کی سیرت قابل اتباع ہے تو اس کے ہر پہلو پر گفتگو کرنے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بقیہ ساری دنیا کو بھی حق دے دیا کہ آپ کی حیات طیبہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ یہ امر یقینی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم تعصب، تحفظات اور غیر اسلامی نظریات کو بطور کسوٹی استعمال کیے بغیر اور معروضی انداز سے حضور کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرے گا تو وہ یقیناً آپ کے پیش کردہ دین کی حقانیت پر مطمئن ہو جائے گا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، آنحضرت کی حیات طیبہ کے مکمل حالات محفوظ ہیں لہٰذا اس کا مطالعہ کرنے کی پوری سہولت موجود ہے۔

بے مثال بلندی کردار اور اس کی جاذبیت کی وجہ سے حضور کی شخصیت کے محاسن کو اعدائے اسلام اپنے اپنے حلقوں میں منکشف ہونے سے روکنے کے لیے ہمیشہ سے کوشاں رہے ہیں۔ تاریکی میں ڈوبا ہوا یورپ جب مغربی و مشرقی سمتوں سے مسلمانوں کے مراکز سے روشنی حاصل کر کے بیدار ہوا تو ان کے پڑھے لکھے اور تاریخ سے آشنا حلقوں کو جو صرف عیسائی پادریوں پر مشتمل تھا، سب سے پہلے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں پیغمبر اسلام کی سیرت سے روشناسی یورپ میں اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضور کے خلاف کذب و افتراء کی بنیاد پر بے سر و پا الزامات کی تشہیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس بات کو ہم ''مستشرقین'' کے باب میں یورپی مصنفین ذہنی کی کتابوں سے حوالے دے کر ثابت کریں گے۔ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بعض مسلمانوں جیسے ناموں سے موسوم ضمیر فروش افراد کو، جو فی الحقیقت اسلام سے منحرف اور مرتد ہو چکے ہوتے ہیں، سیم و زر کا لالچ دے کر ان سے حضور کے خلاف اہانتی کتب لکھوائی جا رہی ہیں اور اس غلیظ حرکت کا آزادی اظہار رائے کے اصول کی اوٹ میں دفاع کیا جا رہا ہے۔ یہ بات باعث حیرت ہے کہ ایک بدکردار یا فاحشہ عورت بھی اپنے خلاف کسی توہین آمیز بات کی بنیاد پر اپنی حیثیت عرفی کے مجروح ہونے کی بنیاد پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے لیکن پیغمبر اسلام جن کے صفحہ ارض پر اس وقت ایک ارب معتقدین موجود ہیں ان کی توہین کرنے کی حرکت کرنا آزادی اظہار کے زمرے میں شمار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس پر ہمیں کسی سے شکوہ نہیں کرنا چاہیے، یہ صورت ہم مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے ظہور میں آ رہی ہے۔

کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ آج بھی دشمنان اسلام نے حضور کی شخصیت کی عظمت کے احساس کے تحت اسلام کی حقانیت کو داغدار کرنے کے لیے نبی کریم صلعم کو ہدف طعن و تشنیع بنا رکھا ہے۔ اور حضور کی سیرت

کے اصل خدوخال کو پردہ فضا میں رکھنے کے لیے ہر ناجائز حرکت میں مصروف ہیں۔ یہ حضور کی مثالی اور عظیم المقام سیرت و کردار سے انتہائی مرعوبیت ہے۔

حضور کی بصیرت وتدبر

یوں تو تاریخ عالم میں احسن و اصلح اصولوں کی بنیاد پر کسی معاشرے میں فکر و عمل کے دائروں میں ہمہ جہتی انقلاب برپا کرنے کی واحد مثال حضور نے فراہم کی ہے لیکن اس کام کو تیئیس سال کے قلیل عرصہ میں انجام کو پہنچادینا تاریخ عالم سے آشنا لوگوں کے لیے ایک حیرت انگیز معجزہ ہے۔ جزوی انقلابات اور حیات انسان کے محدود دائرے میں فکری و تمدنی سطحوں پر برپا کرنے کی جو مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں ان کو بروئے کار لانے میں طویل مدتیں حتیٰ کہ صدیاں تک بھی صرف ہوتی رہی ہیں اور اس میں بے شمار اذہان نے کام کیا ہے۔ آج کا مغربی تمدن آپ کے سامنے ہے۔ اس کی تعمیر میں متعدد صدیاں لگیں اور ساری کاوشوں کے نتیجے میں اصولی و فکری سطح پر صرف مادہ پرستانہ تصور زندگی وجود میں آیا۔ اگر اس نظام فکر کے سرمائے، انسان اور اس کائنات کی تخلیق وابتداء اور اس کے انجام کے متعلق نظریات تلاش کرنا چاہیں تو آپ کو لاادریت کے نظریے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دنیا میں انسان کے کردار کے متعلق بھی یہ فکری ڈھانچہ خاموش ہے اور اگر کہتا ہے تو یہ کہہ کر کہ یہ اتفاقاً وجود میں آگیا ہے اور سطح ارض پر چند سال گزار کر ہر انسان نسیاً منسیاً ہو جائے گا، اور اس کے اختیار وارادہ، عقل و دانش اور دوسری سب خصوصیات آخر کار بے نتیجہ ثابت ہوں گی۔ اگر آپ اخلاقی اقدار کے متعلق سوال کریں تو جواب ملے گا کہ یہ انفرادی و قومی مفاد کے تابع ہیں اور ان کے متعلق کوئی بلند تصور قائم کرنا نظریاتی خام خیالی کے ہم معنی ہے جس کے لیے (Utopia) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی سیاست، معیشت، معاشرت، اور بین الاقوامی معاملات کسی اور فکری و اخلاقی قانون اور قاعدے کے پابند نہیں بلکہ جو بات کسی قوم کو یا اس کے اندر کے برسر اقتدار طبقے کے مفاد میں ہو وہی حق ہے۔

ان اشارات کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کیا جائے تو یہی حقیقت سامنے آئے گی کہ یہ تمدن انسان کو مثبت طور پر زندگی کا اچھا یا برا، کوئی نظام فراہم نہیں کرتا۔ اسی پر دوسرے غیر اسلامی نظاموں اور تمدنوں کو قیاس کر لیجئے۔

اس کے برعکس دین اسلام مکمل ہے پھر یہ بھی فرمایا:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (۱۷:۸۹)

ترجمہ: اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں طرح طرح سے ہر قسم کی حکمت کی باتیں بیان کی ہیں۔

صاحب تدبر قرآن اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تعریف کے معنی یہاں ایک ایک حقیقت کو مختلف اسالیب اور گوناگوں پیرایوں سے بیان کرنا ہے۔ اور ''ضرب المثل'' سے مراد حکمت اور معرفت کی بات کہنا ہے، عربی میں اس مفہوم کے لیے اس محاورہ کا استعمال معروف ہے''

''مولانا شبیر احمد عثمانی ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

''یعنی ان کی خیر خواہی کے لیے عجیب و غریب مضامین بار بار مختلف پیرایوں میں قسم قسم کے عنوانوں سے بیان کیے جاتے ہیں''

مولانا ابوالکلام آزاد نے یوں تشریح کی ہے:

''ہم نے قرآن میں عبرت و مواعظت کی تمام باتیں دہرا دہرا کر بیان کر دیں۔''

گویا اس بات پر ہمارے مفسرین حضرات کا اتفاق ہے کہ اس آیت سے یہی مراد ہے کہ فکر و عمل کے دائروں میں انسان کی ہدایت کے لیے ہم نے قرآن میں سب کچھ بیان کر دیا۔

اس سے قبل بھی ہم اس سلسلے میں لکھ چکے ہیں اور آئندہ بھی حتی المقدور دین اسلام کے ایک مکمل ضابطہ فکر و عمل ہونے کے متعلق ہم اپنی گذارشات پیش کریں گے۔ یہاں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام فکری و عملی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نازل کیے ہوئے اس مکمل نظام کو لوگوں تک پہنچانے، انہیں اس کی تعلیمات ذہن نشین کرانے، اسے عملی جامہ پہنانے کا یہ سارا کام حضور کے سپرد کیا گیا۔ اس کام کی مشکلات کا ایسے اصحاب علم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جو تہذیبوں اور تمدنوں کی تعمیر اور افراد کی تربیت کے کام کی نوعیت سے آگاہ ہیں اور اس پر انہوں نے تفکر و تدبر کیا ہے۔ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت و تدبر کی بلندی کی واضح علامت ہے کہ اس مکمل دین کو تیئیس سال کے قلیل عرصے میں پوری طرح برپا کر دیا اور انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر ایک پورا نظام تمدن وجود میں لے آئے۔ اور اس نظام کے اصول آج بھی محفوظ ہیں۔ دور رواں میں اس کے نفاذ کے راستے کی داخلی و خارجی رکاوٹیں تو موزوں مقام پر عرض کی جائیں گی لیکن اس حقیقت کو جھٹلانا، چمکتے سورج کے وجود کے اعتراف سے اعراض کرنے کے مترادف ہے کہ مسلمانان عالم اپنی موجودہ نامرادیوں کے باجود اپنے سینوں میں اسے اپنانے کی آرزو پال رہے ہیں۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دنیا میں جاری و ساری قانون علل و معلولات کو پیش نظر رکھ کر اگر بات کی

جائے تو یہ صورت حالات پیغمبر اسلام کی صلاحیت کار اور آپ کی نبوی بصیرت اور تدبر کی مرہون منت ہے۔ کسی نے آج تک اپنے فکر کو اس قدر وضاحت و تبیین کے ساتھ پیش نہیں کیا جس قدر وضاحت تبیین کے ساتھ حضور نے پیش کیا۔

قلیل نبوی دور میں جو مکمل کامیابی سے ہمکنار ہوا، حضور کو متواتر مخالفتوں، مزاحمتوں اور بعثت نبوی سے قبل رائج عقائد و اقدار کے حاملین کی دشمنیوں سے عمدہ برآ ہونا پڑا۔ ہر موقعہ پر آپ کی ابھی بیان کی گئی خصوصیات نے اپنی جوہری برتری کا مظاہرہ کیا۔ سارے نبوی دور میں قدم قدم پر حضور کی حکیمانہ بصیرت عیاں ہوتی رہی اور ہر معاملے میں حضور کا تدبر آپ کی دور بینی اور ژرف نگاہی کی نشاندہی کرتا ہے۔

اگرچہ ہر صبح کو طلوع ہونے والا سورج حضور کے لیے کوئی نہ کوئی مشکل، کوئی نہ کوئی مخالفانہ رکاوٹ اور اعدائے اسلام کی کوئی نہ کوئی سازش لے کر طلوع ہوتا تھا، لیکن بعض مراحل ایسے آئے جو تاریخی اعتبار سے بہت نمایاں ہیں۔ ان مواقع پر نبی کریم صلعم کی بصیرت اور دوراندیشی کا کمال نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔

ہم مسلمانوں کی یہ عادت اور انداز تفکر بہت پختہ ہو گیا ہے کہ ہم حضور کو پیش آنے والے واقعات اور ان کے سلسلے میں آپ کے حکیمانہ طرز عمل کو حضور کی حیات طیبہ کے معمول کے واقعات تصور کر کے ان پر تدبر کیے بغیر انہیں پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں، ان سے نہ خود سبق حاصل کرتے ہیں اور نہ حضور کی حیات طیبہ کے بیان کے دوران ان کی حکمتوں کی روشنی سے مستفید ہوتے ہیں۔ کچھ اس قسم کا تاثر عام ہے کہ یہ سب باتیں نبی کریم صلعم سے مخصوص تھیں اور صحابہ کرام ہی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ پیش آمدہ مسائل و مشکلات میں آپ کا ساتھ دیں۔ ہم تو صرف تحسین کے کلمات ادا کرنے کے مکلف ہیں اور نفاذ دین کا کام ہماری ذمہ داریوں میں شامل نہیں جس کے لیے اسوۂ حسنہ رسول سے استفادہ کی ضرورت ہو۔

ویسے تو حضور کا ہر فعل آپ کی حکمت و تدبر کی بھرپور عکاسی کرتا تھا لیکن ہم مثال کے طور پر چند واقعات پیش کرتے ہیں:

مشرکین مکہ ابتدائے بعثت نبوی کے دور میں اس غلط فہمی میں جتلا تھے کہ حضور اکابرین قریش میں شمار ہی نہیں ہوتے لہٰذا آپ کی بات کون سنے گا۔ اس کے بعد جب بعض سلیم الطبع لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو قریش نے جہاں حضور کو نشانہ اذیت بنایا وہیں مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ حربہ استعمال کرنے سے حضور بددل اور مسلمان خوفزدہ ہو جائیں گے۔ لیکن جب یہ طریق مخالفت بھی بے سود ثابت ہوا تو

اکابرین قریش خود خوف و پریشانی میں مبتلا ہو گئے اور اپنے انداز فکر و عمل پر حضور کے کردار کو قیاس کر کے انہوں نے تحریص کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ عتبہ بن ربیعہ کو حضور کے پاس بھیجا گیا۔ اس نے آپ کو نہایت نرمی سے بھتیجا کہہ کر خطاب کیا اور آپ کی نجابت اور شریف النسب ہونے کی تعریف کر کے کہا کہ آپ نے ہمارے آباؤ اجداد اور ہمارے معبودوں کو برابھلا کہا ہے اور ہم میں افتراق کے بیج بو دیئے ہیں۔ اس بحران کو ختم کرنے کے لیے ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر آپ دولت چاہیں تو ہم اس کی کثیر تعداد آپ کے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں اور اگر آپ عزت و منصب چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا سربراہ یا بادشاہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ لیکن حضور نے ان تجاویز سے تعرض ہی نہیں کیا بلکہ سورۃ حم السجدہ کی ابتدائی آٹھ آیات تلاوت فرمائیں۔ اور عتبہ سے کہا کہ اب تم اپنا راستہ متعین کر لو۔(یہ ابن ہشام میں بیان کردہ واقعہ کا خلاصہ ہے)

اس واقعہ سے جہاں کہ اعدائے اسلام سے سے گفتگو کرنے میں اظہار قطانت ہوتا ہے وہیں حضور کی بصیرت اور اقامت دین کے کام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی صحیح نہج کے واضح تصور کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ آپ نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ محض حصول اقتدار ودولت اقامت دین کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اور عتبہ کی تجویز کو معمولی سی اہمیت دیئے بغیر اس کے سامنے دین کی دعوت پیش کر دی۔ یہ وہ دور تھا کہ جب حضور اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی ایذاء رسانیاں نکتہ عروج پر تھیں اور حضرت ابو بکر صدیق بھی کسی ایسی جگہ کی تلاش میں مصروف ہو گئے تھے جہاں وہ ہجرت کر کے تشریف لے جاتے۔ مصلحت کوشوں اور دلدادگان حکمت عملی کے لیےدین کو برپا کرنے کے لائحہ عمل کے سلسلے میں یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے۔

اسی دوران ایسا وقت آگیاکہ مکہ میں جماعت مسلمین کے لیے جینا مشکل ہو گیا لیکن مسلمانوں کی پختگی ایمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دین کے معاملات میں نہ کسی قسم کی مداہنت کا خیال دل میں لا سکتے تھے اور کفار و مشرکین کی طرف سے زیادہ سے زیادہ ایذاء رسانی بھی انہیں جادہ مستقیم سے معمولی سے انحراف پر آمادہ نہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا بعض مسلمانوں نے حضور سے ہجرت کی اجازت طلب کی۔ حضور کبھی حبشہ کے حکمران نجاشی سے نہ ملے تھے،

لیکن اس کے حالات سن کر آپ کی نبوی بصیرت نے یہی راہنمائی کی کہ جو لوگ مکہ چھوڑنا چاہیں وہ ہجرت کر کے حبشہ چلے جائیں۔ اور بھی ممالک تھے جہاں اہل مکہ جاتے رہتے تھے لیکن حضور نے ان میں سے کسی کا انتخاب نہیں کیا بلکہ متعین طور پر حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی حالانکہ شاہ حبشہ مسلمان نہ تھا اور قریش مکہ سے اس کا تجارتی معاہدہ تھا۔ لیکن حضور کی رائے درست ثابت ہوئی اور باوجود یہ کہ اہل مکہ نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ پر مشتمل وفد تحائف کے ساتھ نجاشی کے پاس بھیجا، لیکن نجاشی نے مسلمان مہاجرین کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اور انہیں عزت کا مقام دیا۔

مشرکین مکہ صرف مسلمانوں کو ایذاء ہی نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی یہ بھی کوشش تھی کہ وہ کسی اور جگہ ہجرت کر کے پناہ بھی حاصل نہ کر سکیں۔ جب وہ کہیں جاتے تو مشرکین مکہ انہیں گرفتار کرنے کے لیے ان کا تعاقب کرتے۔ ظلم و ستم کی اسی زمانے کے دوران مشیت خداوندی کے تحت حضور مدینہ میں ایک مرکز ہدایت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ کی تدبیری صلاحیت سے ہر وہ مسلمان جو مدینہ کو ہجرت کرنا چاہتا تھا اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن پیغمبر، جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ سے بھی ظاہر ہے، اپنے مستقر کو حکم خداوندی کے بغیر چھوڑنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ لہٰذا مکہ میں حضرات ابو بکر صدیق و علی ہی حضور کی معیت میں رہ گئے۔

اب مشرکین مکہ کا غیظ و غضب پوری شدت سے بھڑک اٹھا اور مختلف قریشی قبائل نے متحد ہو کر حضور کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اگر چہ مشرکین مکہ نے حضور کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا، لیکن حضور حضرت ابوبکر صدیق کی معیت میں مدینہ روانہ ہو گئے۔ آپ اس محاصرے کے باوجود کس طرح اپنے گھر سے باہر تشریف لائے، یہ بات ایک معمے کی حیثیت رکھتی ہے جو حل نہیں ہو سکا۔ اور اس طرح ہجرت کا وہ عظیم واقعہ رونما ہوا جس کی تکمیل پیغمبر اسلام کی حیرت انگیز منصوبہ بندی کے ذریعے سے بغیر کسی اتلاف جان کے تکمیل کو پہنچا۔ اس کے بعد دین اسلام کے ایک اجتماعی نظام تمدن کی حیثیت سے برپا ہونے کے کام کا آغاز ہو گیا۔

مدینہ پہنچنے پر وہاں کی نہایت پیچیدہ سیاسی صورتحال اور متعدد مختاصم گروہوں کی موجودگی کے باوجود حضور اپنی بے مثل مدبرانہ صلاحیت کو بروئے کار لا کر ''میثاق مدینہ''کی شکل میں ایک نظم قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے علاوہ ملکہ سے جو صحابہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے وہ تو اپنا سب کچھ قربان کر کے بے دست و پا مدینہ پہنچے تھے۔ ان کی معیشت کا فوری انتظام مواخات کے نظام کے ذریعے کیا گیا۔

ان سب تفصیلات پر اور مدنی دور میں حضور کی تدبیر نے تمام مشکلات پر قابو پا کر جو نظام قائم کیا اس سلسلے میں آئندہ مختلف ابواب میں روشنی ڈالی جائے گی۔

یہاں ہم اجمالاًیہ تذکرہ کریں گے کہ مدنی دور حضور کی نبوی زندگی کے دس سالوں پر مشتمل ہے اور اس مختصر مدت میں وہ کارنامہ انجام دیا گیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ ہجرت کے بعد مدینہ کی حیثیت عرب کے تمام مخالف قبائل کے سمندر میں ایک چھوٹے سے جزیرے کی تھی۔ قریش ہی ملک عرب میں سب قبائل کی نظروں میں برتری کا مقام رکھتے تھے، اگر چہ معروف معنوں میں وہ کسی منظّم سیاسی نظام کے سربراہ نہ تھے۔ لیکن ہجرت کے بعد ان کی نفسیات اس شکاری سے مشابہ ہو گئی تھی جس کے ہاتھ سے اس کا شکار جاتا رہا ہو۔ لہٰذا اب وہ اس سرگرمی میں منہمک ہو گئے کہ مختلف عناصر کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ متحد ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ دین کو ختم کرنے کے لیے کوشش کریں۔ خود مدینہ کے اندر یہودی اور منافقین مار آستین کی حیثیت سے موجود تھے اور قریش مکہ سے خفیہ رابطہ رکھتے تھے۔

بہت بڑے خطرات کا حضور نے جس طرح مقابلہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر کو پھیلایا، نیز اس کے مطابق کثیر تعداد میں لوگوں کی تربیت کی، اور زندگی کے ایک ہمہ نظام کو بھی معرض وجود میں لائے، یہ بھی کام عظیم صلاحیتوں کے متقاضی تھے۔ یہ سب کا رہائے نمایاں حضور نے بیک وقت اور متوازی طور پر کیے۔ یہ نہیں کہا کہ فلاں کام سے فارغ ہو کر فلاں دوسرا کام انجام دیں گے۔ نتیجۃً ایک ایسے امی معاشرے کو، جو ابتدائی تمدنی انداز سے نا آشنا ہونے کے علاوہ کسی مرکزی نظام سے بھی محروم تھا دیکھتے ہی دیکھتے اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کا امام اور معلم بن کر ابھرے۔

دین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام

اللہ تعالیٰ نے بالوضاحت دین میں پیغمبر اسلام کے مقام و مرتبے اور کردار کو بیان کر دیا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی التباس نہیں۔ اس سلسلے میں حضور کی بہت سی احادیث بھی منقول ہیں۔ دین میں آنحضرت کے کردار اور مقام و مرتبے کے واضح تصویر کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ سارا دین حضور ہی لائے اور آپ ہی نے اسے دنیا تک پہنچایا۔ جس کی جس قدر اہمیت ہو اسی نسبت سے اس کے درجے اور کو واضح کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس کی ذات باعث نزاع نہ بن جائے۔ قرآن میں صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کے وجود کے اثبات کے لیے دلائل دیئے گئے ہیں اور تفصیل کے ساتھ اس صفات کو ہمارے فہم کے درجے کے مطابق بیان کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد حضور کا مقام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بالتفصیل اور مختلف انداز میں حضور کے مقام و مرتبے کے متعلق گفتگو کی ہے۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کی غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ جس طرح کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اٹکل اور اندازوں سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق رائے قائم کرے اسی طرح کسی کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ حضور کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرے جو منشائے خداوندی اور فرمودات نبوی کے مطابق نہ ہو۔ یہ مسئلہ بہت نازک ہے اور اس میں بہت احتیاط کی ضروت ہے۔ علامہ اقبال نے ''ارمغان حجاز''کو ''حضور رسالت''کا عنوان دیا ہے اس کی ابتداء میں یہ شعر لکھا ہے:

دب کا ہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

جو لوگ قوالیوں اور گانے بجانے کے ذریعے حضور کا ادب ملحوظ رکھے بغیر غلو اور شور و غوغا کے انداز میں آپ کی شان میں بزعم خود نعتیں پڑھتے اور ایسی مجلسیں منعقد کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، انہیں اپنی اس حرکت پر غور کرنا چاہیے کہ کیا دین میں حضور کو جو مقام حاصل ہے اسے وہ مجروح تو نہیں کر رہے۔ اس طرح مساجد میں پیشہ ور مولوی جس انداز

سے گانے کے رنگ میں درود و سلام کے نام سے مجالس منعقد کرتے ہیں انہیں سوچنا چاہیے کہ آثار رسول و صحابہؓ میں اس کا کوئی جواز موجود ہے۔ کیا قرن اولیٰ میں یا آئمہ سلف کے دور میں ایسا کیا گیا ہے۔ یہ حضور کے احترام و ادب کا مسئلہ ہے۔

ہجری میں غزوہ احزاب(یا خندق)پیش آیا۔ اس میں قریش مکہ خیبر کے یہودیوں سے تعاون سے عرب کے تقریباً تمام قابل ذکر قبائل پر مشتمل ہر قسم کے اسلحہ سے لیس فوج لے کر مدینہ پر چڑھ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب کے مدینہ میں بے سرو سامانی کی حالت میں بیٹھے ہوئے مسلمان صفحہ ارض سے نیست و نابود ہو گے(العیاذ باللہ)لیکن انہیں بے نیل و مرام واپس جانا پڑا۔ لیکن ظاہر ہے کہ دشمن کے پر عناد جذبات اور اس کی کثرت میں تو کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں مسلمانان مدینہ مادی نکتہ نظر سے افرادی اور اسلحی قوت کے اعتبار سے بہت کمزور حالت میں تھے۔ ان حالات کے پس منظر میں یہاں ہم ایک حدیث بیان کر کے پیغمبر اسلام کے تدبر کی ایک مثال پیش کرتے ہیں:

وعن سلیمان بن مرد قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین اجلی الاحزاب عنه الان نفرد هم ولا یغزون نحن لیسر الیهم (بخاری)

اور حضرت سلیمان ابن مردؓ کہتے ہیں کہ جب دشمن کا متحدہ لشکر(احزاب)بھاگ گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب وہ(یعنی دشمن)ہم پر حملہ نہ کر سکیں گے اب ان پر حملہ کریں گے اور ان کی طرف (حملہ آور ہو کر) جائیں گے۔

چنانچہ اس کے بعد کسی نے مدینہ پر حملہ نہیں کیا۔

اسلام میں سنجیدگی و متانت اور تقویٰ و عبادت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

اسی طرح نماز کے دوران خشوع و خضوع پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جن مذاہب کے پیروسنکھ اور ناقوس وغیرہ بجاتے ہیں ان میں دراصل ان لوازمات عبادت کی ضرورت تھی نہیں ہوتی جن کا اسلام مطالبہ کرتا ہے۔ مشرکین مکہ دوران عبادت سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے تھے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ (۸ : ۳۵)

اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز بجانے سیٹی اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مساجد میں شور شغب برپا کرنا دین کی روح کے منافی ہے چاہے اس کی جو بھی صورت ہو۔ قرآن میں حضور کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنے پر خصوصی زور دیا گیا ہے جیسا کہ قرآنی حوالہ جات دے کر وضاحت کی جائے گی اس سے ناگزیر طور پر نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حضور کا نام لے کر بھی شور مچانا حضور کی شان میں جن گستاخی کے مترادف ہے۔

صاحب تدبر قرآن اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص دین کا ذوق رکھتا ہو تو بہت سی بدعتوں کو ان کی ظاہری ہیت ہی سے پہچانا جاتا ہے کہ ان خرافات کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تعزیہ داری کی رسوم، مزاروں پر ہونے والی خرافات اور متصوفین کی مجالس کی حرکتیں ایسی چیزیں نہیں ہیں جن لغویات کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی علمی کاوش کی ضرورت ہو۔''

حضور کے مقام کے معاملے میں دو گروہ قرآنی تعلیمات سے انحراف کے مرتکب ہو رہے ہیں ایک گروہ منکرین حدیث کا ہے جن کے موقف سے یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا کام صرف یہ تھا کہ وہ ہم تک قرآن پہنچا جاتے، اب ہم جانیں اور قرآن(نعوذ باللہ من ذالک)دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو حضور کی طرف غیب دانیاور دوسری مشرکانہ صفات منسوب کرتے ہیں اور اس طرح وہ آپ سے اپنے عشق کااظہار کرکے سادہ لوگوں کے جذبات سے کھیلتے اور انہیں گمراہ کرتے ہیں۔ اگر وہ حقیقتاً عشاق رسول ہوں تو قرآن اور حضور کے فرمودات سے یک سر مو انحراف نہ کریں۔

قرآن میں حضور کے مقام کے متعلق بہت مواد موجود ہے۔ اسی طرح اس سلسلے میں بہت سی احادیث بھی مروی ہیں۔ لیکن یہ سارا مواد اس کتاب میں نہیں سما سکتا، الہٰذا ہم چند ایسی قرآنی آیات اور احادیث نقل کریں گے جن سے دین میں حضور کے مقام و مرتبے کے متعلق وضاحت ہو جائے۔ ویسے اس موضوع پر''منصب رسالت''کے باب میں بعض باتیں عرض کی جا چکی ہیں۔ الہٰذا بہتر ہے کہ ان معروضات کو ذہن مستحضر کر لیا جائے۔ آئندہ سطور میں ہم قرآن و حدیث سے بعض حوالے دے کر خصوصی طور پر دین میں حضور کے مقام پر روشنی ڈالیں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالی نے حضور کو یہ اعزاز بخشا کہ

آپ کے ذریعے وہ صحیفہ ہدایت تمام جہان والوں کی طرف بھیجا جو ان کے لیے حق و باطل اور برواثم کے راستے واضح کردے۔ گویا حق کی راہ کی نشاندہی کر دے۔ اور راہ ہدایت پر چلنے کے عواقب سے متنبہ کر دے۔ چنانچہ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا(۱:۲۵)

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تا کہ وہ اہل عالم کو ہوشیار کر دینے والا ہے۔

دوسرے یہ کہ درج ذیل آیات حضور کی ہر بات کو اللہ کی طرف سے منسوب کرتی ہیں اور یہ بات واضح کی جاتی ہے کہ پیغمبر اپنی ذاتی خواہش کے اتباع کے نتیجے میں کوئی بات نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہے جو ہم اپنے صاحب قوت و کردار فرشتے یعنی جبرئیلؑ کے ذریعے اس کو وحی کرتے ہیں:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۙ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰی(۵۳:۳-۶)

اور وہ اپنے جی سے نہیں بولتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے اس کو ایک مضبوط قوتوں والے عقل و کردار توانا نے تعلیم دی ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان آیات کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:

''کوئی کام تو کیا ایک حرف بھی آپ کے ذہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا جو خواہش نفس پر مبنی ہو۔ بلکہ آپ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں وحی متلو کو''قرآن''اور وحی غیر متلو کو''حدیث''کہا جاتا ہے۔''

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے غیر مشروط حکم دیا کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لایا جائے۔ یہی بات لوگوں کی بھلائی کا ذریعہ ثابت ہو گی:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ(۴۷:۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے اور ایمان لائے اس چیز پر جو محمد پر نازل کی گئی اور وہی حق ہے ان کے رب کی جانب سے اللہ نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال سنوار دیا۔

چوتھے یہ کہ صرف ایمان لانا ہی کافی نہیں بلکہ اتباع رسول بھی ضروری ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن میں جس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات کی اتباع کی تاکید کی ہے ساتھ ہی لازماً حضور کے اتباع کا حکم بھی دیا ہے اس لیے کہ ہمارے سامنے تو رسول اللہ ہی کا اسوہ ہے اور ہم نے آپ ہی کے قول و فعل کو براہ راست دیکھا اور معلوم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ(۲۴:۵۴)

ان سے کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم اعراض کروگے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری ہے جو اس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گئےاور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔

اطاعت خدا و رسول کے علاوہ تاکید مزید سے کہا گیا ہے کہ ہدایت اور راہ یابی کا انحصار اطاعت رسول پر ہے(جن کا اسوہ سب کے سامنے ہے)۔

پھر کہا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ(۸:۲۰)

اے ایمان والو!اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہر پہلو سے اور ہر انداز تکلم اختیار کر کے اطاعت و اتباع رسول کا حکم دیا ہے۔ تاکہ اس سلسلے میں کوئی شک و التباس میں گرفتار نہ ہو اور وسوسے پیدا کرنے اور دین کی تعلیمات سے انحراف کی راہیں تلاش کرنے والوں کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہ

رہے۔ اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ صرف اور صرف حضور ہی بالذات مطاع ہیں۔ چنانچہ یہ بھی فرمایا:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (۵۹:۷)

اور رسول جو تمہیں دے اس کو لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں

"اگرچہ اس کا ایک خاص محل ہے لیکن اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے وہ بالکل عام ہو گا۔ یعنی زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے ہر حکم کی بے چون و چرا کی تعمیل کی جائے گی اس لیے کہ رسول کی حیثیت جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہے۔"

مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا ہے:"یعنی مال و جائداد وغیرہ جس طرح پیغمبر اللہ کے حکم سے تقسیم کرے اسے بخوشی ورغبت سے قبول کرو۔ جو ملے لے لو،جس سے رو کے رک جاؤ۔ اور اسی طرح اس کے تمام احکام اور اوامرو نواہی کی پابندی رکھو۔"

غور کیجئے کہ اللہ نے حضور کے اتباع پر کس طرح زور دیا ہے اور اپنی محبت کو حضور کی اطاعت پر منحصر قرار دیا ہے۔ حضور سے کہا ہے کہ یہ اعلان کر دیں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ (۳:۳۱)

کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔

مندرجہ ذیل آیت سے نماز وزکوٰۃ کے ساتھ ساتھ مجرد اطاعت رسول ہی کی تلقین کو کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ اطاعت رسول اللہ کی اطاعت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہوسکتی:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ(۲۴:۵۶)

ترجمہ : اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پررحم کیا جائے۔

اس سے قبل ہم نے جو فقرہ لکھا ہے اس کی بنیاد یہ آیت فراہم کرتی ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ(۴ :۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

پانچویں بات یہ کہ دنیا میں رائج تمام مذاہب وادیان کے پیروان نے اپنے اپنے مذاہب کے بانیوں اور بزرگوں کو الوہیت کا مقام دے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام میں اس صورت حال کے رونما ہونے کے تمام راستے مسدود کر دیئے جس طرح قرآن میں حضور نبی کریم صلعم کا مقام بلند کرنے کو نمایاں کیا گیا ہے اسی طرح قرآن میں جگہ جگہ حسب موقع حضور کو اپنا بندہ عبد بشر اور رجل کہہ کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے یہ امکان ہی نہیں چھوڑا کہ وہ حضور کی طرف الوہیت کی کوئی صفت منسوب کر سکیں۔

اور بھی قرآن میں بہت سی آیات ہیں جو مسلمانوں کے اندر اس تصور کی راہ پانے کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ ذیل میں ہم ایسی چند آیات درج کرتے ہیں:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳:۷۹)

کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوت فیصلہ اور منصب نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو یہ دعوت دے کہ لوگو !اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ لوگو !اللہ والے بنو، بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو۔

چھٹی یہ کہ آخرت کی جزاء و سزا کا فیصلہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی ساجھی نہیں۔ غزوہ احد کے سلسلے میں گفتگو کے دوران کفار کے لیے جزا و سزا کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ حضور سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ(۳:۱۲۸)

تمہیں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں خدا ان کی توبہ قبول کرے یا انہیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ حضور سے یہ اعلان بھی کرواتا ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (۷ : ۱۸۸)

کہہ دو، اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ مگر جو اللہ چاہیے۔

نیز قرآن کے حتمی طور پر اللہ ہی کی طرف سے نازل ہونے کا بھی اعلان کروایا:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ)۱۵:۱۰(

اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے متوقع ہیں، کہتے ہیں اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس سے ترمیم کرو۔

قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ(۱۰ :۱۵)

کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہو جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

مشرکین مکہ بھی مختلف غلط باتیں حضور سے منسوب کر کے قرآن کو آپ ہی کی تصنیف کردہ کتاب قرار دیتے تھے، اور آج کل بھی مستشرقین دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضور ہی اس کے مصنف تھے۔ درج بالا آیت اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ حضور کو اس میں کوئی ترمیم یا ردو بدل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا، جیسا کہ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ قرآن میں حضور کچھ تبدیلیاں کر کے ان کے معتقدات کے لیے گنجائش پیدا کر دیں تو وہ مصالحت کے لیے تیار ہیں۔ ان کی اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا گیا۔

ساتویں یہ کہ حضور کے اللہ کی طرف سے اور خود آپ کے اپنی احادیث میں بیان کروہ مقام میں غلو کرنے سے واضح طور پر روکا گیا ہے۔ اس بیماری میں سارے ہی مذاہب کے پیرو مبتلا رہے ہیں۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن میں بار بار مختلف مواقع پر حضور کو اپنا انتہائی برگزیدہ بندہ اور رسول قرار دیا ہے جن کی اتباع پر انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول اور دنیوی واخروی فلاح و

کامیابی منحصر ہے بار بار حضور ہی کو حکم دیا ہے کہ وہ دنیا پر یہ واضح کر دیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت اقتدار اعلیٰ اور صفات میں ساجھی ہونے کا قطعاً کوئی دعویٰ نہیں رکھتے، بلکہ یہ خود بھی اسی طرح اس کی رحمت کے خواستگار ہیں جس طرح اس کے دوسرے بندوں کو ہونا چاہیے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۲۰ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۲۱ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۲۲ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ (۷۲:۲۰-۲۳)

کہہ دو کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراؤں گا، کہہ دو کہ میں نہ تمہارے لیے کسی ضرر پر کوئی اختیار رکھتا نہ کسی نفع پر کہہ دو، مجھے اللہ سے کوئی پناہ دینے والا نہیں بنے گا اور نہ میں اس کے سوا کوئی لجایا سکوں گا پس اللہ کی طرف سے پہنچا دینا اور اس کے پیغاموں کی ادائیگی ہے،

مسلمانوں کو ان آیات قرآنی روشنی میں ان مراکز کی حیثیت کا تعین کرنا چاہیے جہاں بیٹھ کر طمع سیم و زر میں مبتلا اور سادہ لوح مسلمانوں پر اپنا بے بنیاد بزرگانہ اثر جمانے کے خواہشمند، اللہ اور رسول کے نمائندے بن کر دنیا اور آخرت کی فلاح کے تحفے بانٹتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے پیغمبر اپنے متعلق کیا فرما رہے ہیں اور یہ لوگ اپنے مقام و مرتبے کے متعلق کیا تاثر دیتے ہیں۔

حضور کی ایک حدیث ہے:

وعن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تطروني كما اطرت النصارى بن مريم فائما أنا عبده فقولو عبد الله ورسوله(متفق علیہ)

اور حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مدح و توصیف میں حد سے تجاوز نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم یعنی حضرت عیسیٰ کی مدح و تعریف میں مبالغہ و غلو کیا ہے۔ میں خدا کا بندہ ہوں لہٰذا تم مجھے خدا کا بندہ اور رسول کہو۔

حضور کی ایک اور حدیث:

وعن ام علاء الأنصاريه قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم والله لا ادرى وانا رسول الله ما يفعل بي ولا بكم(بخاری)

ترجمہ : حضرت ام العلاء انصاریہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"اللہ کی قسم میں باوجود اللہ کا رسول ہونے کے نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معالمہ ہو گا اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہو گا۔"

حضور کی درج ذیل حدیث کا مسلمانوں کے ایک طبقے کی عرسوں، قبر پرستیوں اور بزرگوں کی قبروں پر جاکر نذر و نیاز دینے اور جانوروں تک کو وہاں لے کر ان بزرگوں کے نام پر ذبح کرنے سے متعلق حرکات کو ذہن میں رکھ کر مطالعہ کیجئے:

وعن عطاء بن يسار قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اللّٰهُمَّ لا تجعل قبری وثنا يعبد اشتد غضب الله على قوم اتخذوا قبور انبياء هم مساجد(رواہ مالک مرسلا)

اور حضرت عطاء بن ابن سیارؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیہ انداز میں فرمایا کہ اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی عبادت کی جائے حضور نے مزید فرمایا جن لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا ان پر اللہ کا غضب شدت کے ساتھ نازل ہوا۔

آٹھویں یہ کہ زمانہ قدیم سے بعض لوگ انبیاء اور بزرگوں کی غیب دانی اور خوارق و معجزات پر قادر ہونے کے قائل رہے ہیں۔ اللہ اور رسول نے اسلام میں اس عقیدے کا بھی واضح الفاظ میں قلع قمع کر دیا۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ حضور کو حکم دیتا ہے کہ وہ یہ اعلان کر دیں:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۵۰:۶)

کہہ دو، میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعویٰ کرتا میں کوئی فرشتہ ہوں میں تو صرف اس وحی کی

پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے کہہ دو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ کیا تم غور نہیں کرتے ؟

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے:

''اس آیت میں منصب رسالت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یعنی جو شخص جو مدعی نبوت ہو، اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدورات الہیہ کے خزانے اس کے قبضہ میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمایش کی جائے وہ ضرور ہی کر دکھلائے۔ یا تمام معلومات غیبیہ و شہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو، اس کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم پوچھو وہ فوراً بتلا دیا کرے یا نوع بشر کے علاوہ وہ کوئی اور نوع ہے لوازم و خواص بشریہ سے اپنی برات کا ثبوت پیش کرے۔ جب ان باتوں میں سے وہ کسی چیز کا مدعی نہیں تو فرمائشی معجزات اس سے طلب کرنا یا از راہ تعنت و عناد اس قسم کا سوال کرنا کہ ''قیامت کب آئے گی'' یا یہ کہنا کہ، یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں خرید و فروخت کے لیے جاتے ہیں''اور انہی امور کومعیار تصدیق و تکذیب ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔''

حضور علم غیب کو اپنی طرف منسوب کرنے سے منع فرماتے تھے۔ یہ بات درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

عن الربیع بنت معوذ بن عفراء قالت جاء النبي صلى الله عليه وسلم قد خل حين بنى على فجلس على فراشى كجلسگ منى خجعلت جويريات لنا يضربن بالدف ويند بن من قتل من ابانى يوم بدر اذ قالت اهد اهن وفينا نبى يعلم ما في غد فقال دعى هذه فقولي بالذي كنت تقولين(رواہ البخاری)

ترجمہ : حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے میں جب کہ میں رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر آئی، ہمارے گھر تشریف لائے اور میرے بستر پر بیٹھ گئے جس طرح تم(یعنی مخاطب)بیٹھے ہوئے ہو۔ ہمارے خاندان کی چھوٹی بچیاں دف بجا رہی تھیں اور غزوہ بدر میں شہید ہونے والے ہمارے بزرگوں کی خوبیاں بیان کر رہی تھیں۔(اسی دوران) ان بچیوں میں سے ایک نے کہا کہ ہمارے درمیان ایک نبی

جو کل وقوع پذیر ہونے والی بات کو جانتے ہیں۔ حضور نے یہ سن کر فرمایا"اس بات کو چھوڑ دو بلکہ وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔"

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ(۵۹:۶)

اور غیب کی کنجیاں اس کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ(۶۵:۲۷)

کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے۔

حضرت نوحؑ کی رسالت، ان کی قوم کے متمردانہ طرز عمل اور ان کے نتیجے میں آنے والے طوفان کے چڑھاؤ اور اتار کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ حضور سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ آپ ان غیب کی باتوں کو نہ جانتے تھے، ان سے آپ کو ہم نے آگاہ کیا۔ اس کا مطلب ہے غیب کی جو باتیں اللہ رسول کو بتانا چاہتا ہے بتا دیتا ہے، رسول ان باتوں کو خود نہیں جان سکتا۔ چنانچہ فرمایا:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا(۴۹:۱۱)

یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سے سنا رہے ہیں اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی۔

پیر کرم شاہ الازہری اپنی تفسیر"ضیاء القرآن"میں اس آیت کی ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

"اگرچہ نوح علیہ السلام کے نام سے لوگ آگاہ تھے اور ان کے احوال کی بھی کچھ کچھ انہیں خبر تھی۔ لیکن وہ سب ظن و گمان کے تراشیدہ افسانے تھے۔ حقیقت حال سے کوئی واقف نہ تھا۔ اے میرے نبی! تمہیں بھی ان کے صحیح حالات کا علم نہ تھا اور تیری قوم بھی جاہل اور ان پڑھ تھی۔ اس غیب کو ہم نے آپ پر بذریعہ وحی منکشف فرمایا۔"

اسی طرح اوپر بیان کی گئی آیت کے تحت پیر صاحب قرطبیؒ سے ایک اقتباس دے کر اس کا یہ ترجمہ لکھتے ہیں:

"یعنی غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور علم غیب تک پہنچنے کے ذریعے بھی اسی کے دست قدرت میں ہیں، کوئی ان کا مالک نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ جس کو غیب کا علم دینا چاہتا ہے، دے دیتا ہے اور جس کو محروم رکھنا چاہتا ہے اسے محروم کر دیتا ہے اور امور غیب پر آگاہی صرف رسولوں کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے جن پر علوم غیب کا فیضان فرمایا جاتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اہل علم کے مابین، اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ وہ جس کو جتنا علم دینا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کو جتنا علم غیب دے دیا گیا اس کے لیے غیبت کی صورت تو ختم ہو گئی۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ صرف رسولوں ہی کو علم غیب عطا ہوتا ہے۔ رسولوں کو غیب کی باتوں سے اللہ تعالیٰ آگاہ کرتا ہے۔ انہیں بھی یہ علم اتنا ہی حاصل ہوتا ہے۔ اپنے اس علم میں سے وہ اللہ کے حکم کے تحت جتنا علم غیب اپنے مخاطبین پر ظاہر کرنا چاہیں ظاہر کر دیتے ہیں۔ مثلاً اللہ کی صفات، تخلیق آدم، معاد ملائیکہ اور دوسری جن غیب کی باتوں کا قرآن میں تذکرہ اور جس حد تک تذکرہ ہے اس کا تو ہم جیسے عام لوگوں کو بھی علم حاصل ہے، اس سے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ہم غیب کا علم ذاتی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ یہی حال انبیاء ورسول کا ہے۔ اب حضور کو معراج کی جو سعادت نصیب ہوئی، اس کے سلسلے میں قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو حقیقت کا کتنا اور کس حصے کا علم عطا کیا۔ اگر کوئی ہے دعویٰ کرے کہ حقیقت کل کا علم آپ کو دے دیا گیا تھا تو اس کو اس بات کا سامنا کرنا پڑے گا کہ اس صورت میں تو خدا اور رسول میں علم کے لحاظ سے یکسانی پیدا ہو گئی(نعوذ باللہ من ذالک)اس صورت میں حضور(اور ساری مخلوقات) کے متعلق قرآن میں متعدد مواقع پر یہ تذکرہ کہ آپ علم غیب نہ جانتے تھے کے کیا معنی باقی رہ جاتے ہیں سو بہتر یہی ہے کہ ایسے معاملات میں کھوج کرید نہ کی جائے اور جن الفاظ میں ایسی باتوں کے

متعلق خدا اور رسول نے گفتگو کی ہے انہی پر اکتفا کیا جائے ۔۔۔ اور مسلمانوں میں اشتقاق و افتراق اور مخاصمتوں کے بیج نہ بوئے جائیں۔

نویں بات یہ کہ حضور کو مجلس آداب کے اعتبار سے عزت و تکریم اور تعظیم و تشریف کا بالذات استحقاق حاصل ہے۔ بعض لوگوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ حضور کے احکامات کی پابندی ایک اسلامی حکومت کے اولوالامر کی اطاعت ہی کے ہم معنی ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلامی حکومت کے اولوالامر کو حضور کی اطاعت کرنی چاہیے اور آپ کے اسوہ حسنہ کے اتباع کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا چاہیے، لیکن اس سے آپ کو رسول اور شارع ہونے کا جو خصوصی مقام حاصل ہے، اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ حضور از روئے حق اور از روئے حکم خداوندی غیر مشروط طور پر تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں، اس معاملے میں اور کوئی آپ کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ دوسرے لوگ اسی نسبت سے تکریم کا درجہ رکھتے ہیں جس نسبت سے وہ حضور کا اتباع کریں گے اور مقام تقویٰ پر فائز ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ حضور کے متعلق فرماتا ہے:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ(۲۴:۶۳)

تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں سے اچھی طرح باخبر رہا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جایا کرتے رہے ہیں۔ پس وہ لوگ جو اس کے حکم سے گریز کرتے رہے ہیں اس بات سے ڈریں کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے یا ان کو ایک درد ناک عذاب آپکڑے۔

پھر فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ

كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ(۴۹:۱-۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور رسول کے سامنے اپنی رائے مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ مبادا تمہارے اعمال ڈھے جائیں اور تم کو احساس بھی نہ ہو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ نبی کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں وہی ہیں جنکے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کی افزایش کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

بے شک تم کو جو لوگ حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ رکھنے والے نہیں۔

اور بھی بہت سی قرآنی آیات ہیں جن میں حضور کے مقامات علیا بیان کئے گئے ہیں اور آنحضرت کو خصوصی تکریم و احترام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ بالکل بدیہی ہے اور وہ یہ کہ حضور بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا مکمل اور آخری دین لائے۔ خود اس پر عمل کیا اور دوسروں کی تربیت کر کے ان کو اس پر عمل پیرا ہونے کے قابل بنایا۔ آپ معصوم عن الخطاء تھے اور تقویٰ کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ لہٰذا آپ عزت و تکریم کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس طرح میرا دین مقدس ہے اسی طرح اس دین کو دنیا تک پہنچانے والے کی بھی تقدیس کی جائے۔ بعض لوگ حضور کو ایک لیڈر، مصلح یا قومی قائد سمجھتے اور کہتے ہیں۔ یہ ان کی بھول اور سطح بینی کی علامت ہونے کے علاوہ اجتماعی معاملات میں ایسے لوگوں کے کردار (Role) سے بھی بے خبری کی دلیل ہے۔ ان سب لوگوں کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس محدود دائرہ کار میں ان میں سے ہر ایک کے پاس کوئی صحیح اور افادیت عامہ کی ضمانت مہیا کرنے والا فکر موجود

ہو۔ دوسرے ان لوگوں کی مساعی مقاصد کے تابع ہوتی ہیں۔ تیسرے یہ بھی عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے وہ جن باتوں کی لوگوں کو تلقین کرتے ہیں انہیں اپنی ذات پر نافذ نہیں کرتے۔

ہر معاملے میں حضورﷺ کا رد عمل دینی حکمت کے مطابق ہوتا ہے

بنیادی طور پر حضور کی طبیعت میں حلم شفقت، توازن، رحم دلی، عفو درگزر، اور اسی قبیل کے دوسرے محاسن بدرجہ اتم پائے جاتے تھے، اور رات دن ان خصوصیات کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دین کے معاملے میں غیرت اور اس کو قائم کرنے کے معاملے میں عزم واثق بھی آپ کے مزاج میں ملکات راسخہ کی حیثیت رکھتے تھے، اور یہ مقام رسالت کا لازمی تقاضا تھا۔ معافی و درگزر کے واقعات سے آنحضرت کی حیات طیبہ لبریز ہے، لیکن بعض اوقات دین کا مفاد سختی کا متقاضی ہو تا تھا تو کبھی کبھار اس تقاضے کے تحت حضور کو ایسا فیصلہ اور اقدام کرنا پڑتا تھا جس سے اعدائے دین کے عزائم سینہ کا قلع قمع کیا جاسکے۔ یہ فیصلے کبھی غصے، غضب اور نفرت کے احساسات کے تحت نہ ہوتے تھے بلکہ اس کے محرکات مفادات دین ہی فراہم کرتے تھے۔

یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ آنحضرت دشمنان دین کی ماضی کی حرکات خبیثہ کا بدلہ عام طور پر نہیں لیا کرتے تھے، بلکہ عفوو درگزر سے کام لیتے تھے، جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر مشرکین مکہ کے ساتھ سلوک سے واضح ہے۔ البتہ جو لوگ اسلام کو نیست و نابود کرنے کے رواں دوریں منصوبے بناتے اور اقدامات کرتے تھے، یا ان کی حرکات سے عیاں ہو جاتا تھا کہ وہ بالا رادہ دین اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے تیاریوں اور سازشوں میں مصروف ہیں تو ان کے ایسے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے حضور متحرک ہو جاتے تھے۔ تفصیلات تو بعد میں آئیں گی۔ حالیہ گفتگو کے حوالے سے ہم عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ مدینہ میں قبائل یہود سے جو سلوک کیا گیا وہ ان کی بار بار مخالف اسلام حرکات میں ملوث ہونے، اعدائے دین سے خفیہ ساز باز کرنے اور حلیفانہ معاہدے کے باوجود مدینے میں بیٹھ کر دین اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے پر روا رکھا گیا۔ اسی طرح جب قیصر روم

نے حضور کی دعوت اسلام کے خلاف اقدام کرنے کے لیے عرب کی سرحدوں پر فوجیں جمع کرنا شروع کیں تو جنگ موتہ اور غزوہ تبوک پیش آئے۔

بہر حال حضور آخری رسول تھے۔ آپ کے بعد بنی نوع انسان کی طرف کوئی اور پیغمبر پیغام خداوندی نہیں لانے والا تھا۔ حضور ہی نے دین کو مکمل صورت میں پیش کرنا اور قائم کرنا تھا۔ چنانچہ حضور کسی کے غیر حقیقت پسندانہ اور ابلہ نما رجحانات کے پابند نہ ہو سکتے تھے۔ بعض لوگ مذہب کے غلط تصور کے زیراثر کچھ اس قسم کی رائے رکھتے ہیں کہ جس کا عمل کے دائرے میں یہ مطلب ہے کہ حضور اپنے متبعین کو لے کر بیٹھ جاتے اور تسبیح کے دانے چلاتے رہتے۔ اسلام کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہ دین انسان کو زندگی کا پورا لائحہ عمل دیتا ہے۔ اس نے حیات انسانی میں پورا کردار (Role) ادا کرتا ہے۔ اس نے بنی نوع انسان کی رہنمائی کرنی ہے۔ یہ ایک پورے کا پورا تمدن اور نظام زندگی وجود میں لاتا ہے۔ جس طرح حضور اپنے ذاتی طرز عمل میں نمونہ تھے اسی طرح جو نظام آپ نے حکم خداوندی کے تحت قائم کیا اس نے بھی رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے ایک نمونہ فراہم کرنا تھا۔ لہٰذا زندگی میں جس قدر اور جس جس نوعیت کے نشیب و فراز آتے ہیں ان سے حضور نے عہدہ برآ ہونا تھا۔ اس سلسلے میں سبھی قسم کے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات قطعی ہے کہ جو صورت بھی پیش آئی اس سے نمٹنے کے لیے حضور نے اسلام کے اصولوں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

جہاں تک نفس کا تعلق ہے وہ پوری طرح حضور کی گرفت (Control) میں تھا اور اس پر حضور کو مکمل اختیار حاصل تھا (۵۳ : ۲ – ۳)اوراس پر حضور کو مکمل اختیار حاصل تھا۔ ہر معاملے کا فیصلہ جذبات کے تحت نہیں بلکہ دین کے ضابطہ اخلاق کی روشنی میں اس کے مالہ وما علیہ پر پورے غورو خوض کے بعد کیا جاتا تھا۔ آپ نے اپنی ذات کے حوالے سے کبھی کسی کے خلاف منتقمانہ کارروائی نہیں کی۔ بلکہ جن لوگوں نے آپ کو دشمنی مخالفت اور ایذا رسانی کا ہدف بنایا انہیں معاف کرتے رہنا حضور کا معمول تھا۔ قرآن کی رو سے آپ معلم حکمت(۳ : ۱۶۴)تھے لہٰذا اقامت دین کے لیے سعی و جہد کے دوران آپ کا رویہ ہمیشہ حکیمانہ بصیرت سے عبارت ہوتا تھا۔ آپ نے اپنی حیات طیبہ کے نبوی دور میں انتہائی

قسم کی مصیبتوں، تکالیف اور مخالفتوں اور سازشوں کا سامنا کیا، لیکن آپ سکون قلب و ذہن سے کبھی محروم نہیں ہوئے۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس امر کی شہادت دیتا ہے۔ کسی ایک ایسے واقعے کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی کہ حضور نے کبھی کسی سے جھلا کر بات کی ہو یا کسی نازک اور مشکل موقعہ پر آپ پر گھبراہٹ اور سراسیمگی کی کیفیت طاری ہوئی ہو، آپ کی طبیعت میں مستقلاً ٹھہراؤ کی حالت طاری رہی۔ اسی لیے آپ کے کسی فیصلے یا کسی ایک واقعے کے رد عمل کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حضور کی معمول کی روش سے ہٹا ہوا یا حکمت نبوی کی صحیح عکاسی نہیں کرتا تھا۔

حضور کے اوصاف حمیدہ اور کارناموں کا مجموعی تصور قائم کیا جائے

حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں ہم حضور کے اسوہ حسنہ کی ایک جھلک ہی دکھا سکے ہیں۔ آپ کے محاسن کا تحریرو تصنیف کے ذریعے احاطہ کرنا انسانی مقدرت سے ماورا ہے۔ دوسرے ہم نے یہاں اپنی معروضات کو آنحضرت کی بعض ذاتی خصوصیات تک ہی محدود رکھا ہے۔ حضور کے دعوتی کام کی تفصیلات آئندہ ابواب میں بیان ہوں گی اور وہ واقعات بھی دراصل آپ ہی کی سیرت کا حصہ ہیں۔ آپ کی شخصیت کو اپنی اپنی وسعت صلاحیت کے مطابق سمجھنے اور اس کا شعور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حضور نے جس انداز سے دعوتی کام کیا اس سے متعلق جتنی معلومات حاصل کرنی ممکن ہوں ان کا تخصص کیا جائے اور یہ رائے بھی قائم کی جائے کہ آپ کس حد تک اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ اس نظریے اور ارادے سے تحقیق مطالعہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان کے لیے جس حد تک بھی ہو سکے بیک وقت آپ کی خصوصیات کا ایک مجموعی تصور اپنے ذہن میں اجاگر کرنے اور مستحضر کرنے کی کوشش کرے۔ حضور کی ایک ایک بات، ایک ایک ارشاد، ایک ایک فعل و حرکت، ایک ایک نظریے، ایک ایک کارنامے، ایک ایک اخلاقی خصوصیت کو الگ الگ ذہن میں اور ان کا مجموعی تصور قائم نہ کرنے سے حضور کی عظمت کا شعور پیدا ہو سکتا اور نہ دین اسلام ہی کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

حضور نے دعوتی کام کے اول روز ہی سے حکمت دینی کے تقاضوں کے مطابق اور ایک کہنہ مشق داعی کے انداز میں دین کو پیش کرنا شروع کیا۔ اگر دور رواں میں اجتماعی سطح

پر کام کرنے کے طریقوں کو ذہن میں رکھ کر بات کی جائے تو کہنا پڑے گا کہ حضور بعثت اور دعوتی کام کے آغاز سے قبل ہی کسی تنظیم سے وابستہ رہے نہ حضور پڑھے لکھے تھے اور نہ تحریکوں اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ یا فلسفے سے آگاہی رکھتے تھے۔ لیکن آغاز کار سے لے کر تکمیل دین کے مرحلے اور اس دنیا سے رخصت ہونے کے آخری لمحے تک آپ نے ایک ہی سطح کی پختگی ذہن و فکر اور اپنے مقاصد و اہداف میں ایک ہی سطح کی دلچسپی اور ان کے حصول کے لیے ایک ہی سطح کے انہماک کا مظاہرہ کیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دعوت کے ابتدائی مرحلے میں تو آپ کی روش میں ایک مبتدی میں پائی جانے والی نا تجربہ کاری کی علامتوں کے نشانات ملتے ہیں لیکن تحریک کے مختلف مراحل سے گزرنے اور گرم و سرد چشیدہ ہونے اور اپنی جدوجہد کے نشیب و فراز کے مشاہدات کے بعد آپ میں پختگی اور استقامت کی خوبیاں پیدا ہو گئیں۔

اگر دیدہ وا سے مشاہدہ کیا جائے اور فکر رسا سے تدبر کیا جائے تو حضور کے سارے نبوی دور میں آپ کا کردار نظری و عملی یکسوئی و ہمواری کا مظاہرہ کرتا ہوا دکھائی دے گا۔

کوئی تبدیلی نہیں کرنا پڑی، کسی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، غیر اسلام سے کوئی مصلحت نہیں کی، کوئی نزدیک کا راستہ (Short Cut) نہیں اپنایا، حکمت عملی کے غیر اسلامی تصور سے پوری طرح گریز کیا گیا اور دور ابتلاء و آزمائش اور فتح و کامرانی کے مواقع پر اخلاقی و روش عام میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ سفر طائف کے دکھ اور احد میں زخموں سے نڈھال ہو کر بھی اپنے اور دین کے اعداء کے لیے دہن مبارک سے دعا کے کلمات ہی نکلے اور فتح مکہ کے موقع پر ماضی کے بدترین دشمنوں کے لیے بھی جنہوں نے دوسری اذیت رسانیوں کے علاوہ قتل کا اجتماعی منصوبہ بنایا تھا لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء (آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سبھی آزاد ہو) کے الفاظ فرمائے۔

حضور کے متعلق جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اس کی حیثیت دوسرے مذاہب اور یونانی تمدن، جس سے تکلف کے ساتھ مغرب کے عقل پرست اہل علم نے پندرہ صدیوں سے تاریخی انقطاع کے باوجود تہذیبی رشتہ جوڑ لیا ہے، کے دیو مالائی (Mythological) قصوں کی

نہیں ہے۔ بلکہ ان کی صحت کی بنیاد روایات متواترہ اور تحقیق و تفحص کی کاوشوں نے فراہم کی ہے۔

باب ۶

قرآن

چند معلومات:

نزول قرآن کے ساتھ ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم پانچویں باب میں ''بعثت رسالت''کے بغلی عنوان کے تحت نزول وحی کے آغاز کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ اور وحی کے باب میں بنی نوع انسان کے لیے وحی کے واحد ذریعہ ہدایت ہونے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔

نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہونے کے متعلق محمد بن اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ سترہ رمضان المبارک کو آپؐ منصب رسالت پر فائز ہوئے۔ اس اعتبار سے بعثت کے وقت آپؐ کی عمر شریف چالیس سال اور چھ ماہ کی تھی۔ حافظ عسقلانیؒ نے فتح الباری میں اس قول کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ غار حرا کا اعتکاف آپؐ رمضان ہی میں فرماتے تھے۔(''عظمت قرآن کریم ''مصنفہ حافظ محمد یونس صفحہ ۱۷)

قرآن ہی میں ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ(۱۸۵:۲)

ترجمہ : رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ۔

آیت کا ترجمہ ہم نے تدبر قرآن سے لیا ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے''ترجمان القرآن''میں یہ ترجمہ کیا ہے:''یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کا نزول(شروع)ہوا۔

وہ انسانوں کے لیے رہنما ہے۔ ہدایت کی روشن صداقتیں رکھتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہے"۔

قرآن تیس پاروں میں تقسیم ہے۔ اس کی سورتوں کی تعداد ۱۱۴ ہے جن میں سے ۸۷ مکی سورتیں ہیں اور ۲۷ مدنی۔

قرآن "تھوڑا تھوڑا ۲۲ سال(ہجری ۵ ماہ اور ۱۴ دن کے عرصہ میں نازل ہوا۔"

(عظمت قرآن کریم صفحہ۱۱) تدریجی نزول یعنی تھوڑا تھوڑا نازل کیے جانے کی حکمت پر اسی باب میں گفتگو ہوگی۔

عظمت قرآن کریم ہی کے مصنف صفحہ ۵۹ پر جلال الدین سیوطی کی تصنیف الاتقان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قرآن کی آیات کی تعداد ۶۲۳۶ اور الفاظ کی تعداد ۷۷۴۳۹ ہے۔ گویا اگر معمول کی طرز کتابت اور مروجہ کتابی اسلوبی سے قرآن کا متن لکھا جائے تو یہ دو اڑھائی سو صفحات میں سما جائے گا۔ اس طرح یہ ضخیم کتاب نہیں لیکن اس میں حکمت خداوندی نے اتنے مضامین شامل کر دیئے ہیں کہ صرف اس کا یہی ایک پہلو اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ خالق ہی کا کلام ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس موضوع کو آئندہ زیر بحث لایا جائے گا۔

قرآن کی زبان:

قرآن عربی زبان میں ہے اور اسی زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ کے قلب پر انہی الفاظ میں نازل کیا گیا جن الفاظ پر آج یہ مشتمل ہے۔ جس قسم کی عربی میں یہ نازل کیا گیا اس کی توضیح اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۙ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶:۱۹۲-۱۹۵)

ترجمہ : اور بیشک یہ نہایت اہتمام سے خداوند عالم کا اتارا ہوا ہے اس کو تمہارے قلب پر امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے تاکہ تم لوگوں کو آگاہ کر دینے والوں میں سے بنو۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے "تاریخ ارض القرآن" میں لکھا ہے:

''مبین کے لغوی معنی ہیں ظاہر کرنے والا، واضح کر دینے والا، کھولنے والا۔ اگر مفسرین نے ان آیتوں میں''مبین''کے یہی لغوی معنی مراد لیے ہیں یعنی قرآن ایسی زبان میں اتارا گیا جو نہایت فصیح ہے، مطالب کھل جاتے ہیں، معانی واضح ہو جاتے ہیں، سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں آتی۔ ''ارض القرآن''جلد اول کے اثنائے تحریر میں خیال آیا کہ مبین سے یہاں مراد اس کے لغوی معنی نہیں بلکہ یہ لفظ بطور علم کے ہے اوپر گزر چکا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت بھی عربی زبان مختلف بولیوں اور لہجوں میں منقسم تھی، ان میں جو فصیح ترین اور شیریں ترین تھی اس کا نام لسان عربی مبین تھا۔''

زبان عربی کی ترقی و ارتقاء کے تاریخی پس منظر سے عام طور پر ناواقفیت کی وجہ سے یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ زبان زمانہ قبول از اسلام کے امی عربوں تک ہی محدود تھی۔ یہی امی اس میں فصاحت و بلاغت کے وہ جوہر پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے جن سے یہ زبان مزین ہے۔ شعور عام (Common Sense) اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ جن لغوی باریکیوں اور خواص سے یہ زبان مالا مال ہے اور اس میں پیچیدہ اور جامع خیالات کے اظہار کے لیے جو صلاحیت پائی جاتی ہے وہ ان صحرا نشینوں ہی کی جدت طبع اور ادبی ذوق کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی ہو، اور اس کا کوئی تمدنی اور تاریخی پس منظر نہ ہو۔ تاریخ لسانیات سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ کسی زبان میں وسعت اور تمول (Richness)مصنوعی طور پر اور محض ذہنی ورزش سے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ خصوصیات اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہیں جب اس زبان کو کسی بلند تمدنی ماحول میں فکری و علمی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔

صاحب ''تاریخ ارض القرآن''نے اپنی تصنیف میں تفصیل کے ساتھ محققانہ انداز میں مختلف پہلوؤں سے عربوں کی قبل از اسلام تاریخ کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں ان کی زبان کی قدامت اور ان ملکوں اور وسیع علاقوں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں اہم سامیہ جن کا اصل مسکن عرب تھا، دریائی طوفان کی شکل میں ملک عرب سے نکل کر مختلف اطراف میں پھیل کر سلطنتیں بھی قائم کرتی ہیں اور ان کی زبان بھی پھیلتی اورارتقائی منازل طے کرتی رہی۔ لیکن اس کتاب کے مندرجات و مباحث اس قدر رابط و تواتر رکھتے ہیں کہ اس میں

سے اگر اقتباسات دیئے بھی جائیں تو وہ باعث طوالت ہونے کے اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر اپنی افادیت کھو بیٹھیں گے۔ لہٰذا ہم یہاں اپنے ناظرین کو یہی مشورہ دیں گے کہ جو حضرات مسئلہ زیر نظر کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ اس کتاب سے رجوع کریں البتہ ہم یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے ''ترجمان القرآن'' سے اس موضوع سے متعلق ان کے رشحات قلم میں سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جو ناظرین کو عربی کی قدامت و وسعت کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد دے گا۔ یہ اقتباس عربی کی قدامت و وسعت کی اب تک کی تحقیقات کے نچوڑ کی حیثیت رکھتا ہے:

''۔۔۔۔۔۔۔عربی علم وادب کی تاریخ اس عہد سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے جو عہد عام طور پر سمجھ لیا گیا تھا۔ کیونکہ اگر حضرت موسیٰؑ سے پہلے سفر ایوبؑ جیسی نظم عربی میں لکھی جا سکتی تھی تو یقیناًعبرانی ادب کی نشود نما سے صدہا سال پہلے علم ادب پوری طرح ترقی یافتہ ہو چکا تھا۔ بلاشبہ سفر ایوب کی عربی وہ عربی نہ ہو گی جو نزول قرآن کے وقت بولی جاتی تھی۔ یقیناًعربی کی کوئی ابتدائی شکل ہوگی جس کی اخوات ہمیں آرامی، کلدانی اور آشوری کتبات کے الفاظ و اسماء میں نظر آ رہی ہیں اور قدیم مصر بھی اس کی جھلک سے خالی نہیں۔ تاہم وہ عربی زبان ہی ہوگی، اور اسی عربی نے موجودہ عربی
کے تمام عناصر و مواد بہم پہنچائے ہوں گے۔''

''اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت کی عربی اگرچہ صحرائیوں کی عربی تھی، لیکن زبان کی نوعیت بول رہی ہے کہ یہ صحرائی قبائل کی پروردہ نہیں ہو سکتی۔ اتنی وسیع، اتنی ہمہ گیر، اتنی دقیقہ سنج، اس درجہ متول زبان، ضروری ہے کہ صدیوں کی متوارث اور مسلسل ادبی زندگی سے ظہور پذیر ہوئی ہو۔ جو زبان قرآن کے معانی و دقائق کی متحمل ہوگئی، کیونکر ممکن ہے کہ اسے غیر متمدن قبائل کی ایک بدوی زبان تسلیم کر لیا جائے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے جس عربی میں امروالقیس نے اشعار کہے ہیں اس عربی کی لغوی تاریخ اس سے بہت زیادہ قدیم اور بات زیادہ متمدن ہونی چاہیے
جتنی اس وقت تک سمجھی گئی ہے۔

" گزشتہ صدی تک عربی کی لغوی تاریخ کا یہ مسئلہ ایک لاینحل مسئلہ سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ بعض محققین نے مجبور ہو کر یہ رائے قائم کر لی تھی کہ زبانوں کی تخلیق اور نشوونما کا اسے ایک فوری تحول تسلیم کر لینا چاہیے۔ لیکن اب اثری تحقیقات کے آخر میں مواد نے بحث و تعلیل کا ایک نیا میدان پیدا کر دیا ہے اور عربی نسل اور عربی زبان کی تاریخ بالکل نئی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔ یہ زبان جس پر زندگی و خلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی، در اصل مدنی نشوونما کے اتنے مرحلوں سے گزر چکی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس صف میں اس کی شریک نہیں۔ شمیری اور اکادی اقوام کا تمدن، نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری لغات کے عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج و احاطہ، کلدانی اور سریانی کا ادبی تمول، دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل و تکمیل کے مختلف مرحلے تھے، اور اس نے آگے چل کر چوتھی صدی قبل مسیح کی عربی کا بھیس اختیار کیا۔ جو زبان حضارۃ و تمدن کی اتنی بھٹیوں میں سے پک کر نکلی ہو ظاہر ہے کہ اس کے اسماء و مصادر کسی مفلسی اور خام زبان کے اسماء و مصادر نہیں ہو سکتے۔"

(ترجمان القرآن جلد دوئم صفحہ ۴۸۷)

مولانا موصوف نے مزید شواہد بھی پیش کیے ہیں لیکن ہم خوف طوالت سے انہیں نظر انداز کر رہے ہیں۔

قرآن کی جامعیت:

قرآن میں نظریات کی اس قدر وسعت اور موضوعات و مضامین کی اتنی کثرت ہے کہ کوئی ایک شخص ہر پہلو سے ان کا احاطہ نہیں کر سکتا، نہ کوئی انسان کی مرتب کردہ کتاب چاہیے وہ جس قدر ضخیم ہو، قرآن کی کلی وضاحت کا حق ادا کر سکتی ہے۔ قرآن کی ایک ایک آیت پر کئی پہلوؤں سے گفتگو کی جا سکتی ہے اور کی گئی ہے۔ کوئی لفظ جملہ یا آیت فالتو یا غیر ضروری نہیں ہے، اور غور و تدبر کرنے والا ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات کو زیر بحث لاتے وقت ہر آیت کو استعمال کرے۔ لیکن کسی مصنف کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی تصنیف میں قرآن کی تمام آیات کو سمو سکے۔ لہٰذا اس سلسلے میں حوالوں کی محدود تعداد پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قرآن اسلوب تذکیر اور انداز بیان کے اعتبار سے ایک بے مثل اور یکتاکتاب ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان یہ باتیں ذہن میں رکھے کہ اس کے مضامین کا نزول اللہ کی طرف سے کن کن مواقع پر اور دعوت اسلامی کے کن کن مراحل اور کیسی کیسی ضرورتوں کے تحت ہوا۔ قرآن پر تفکر کرنے اور اسلامی روح کی تفہیم کے لیے یہ موضوع انتہائی اہم اور سبق آموز ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کتاب کا مقصد نزول کیا ہے؟ نیز یہ باتیں بھی قابل غور و توجہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان سے اس کتاب کو کس مصرف میں لانے کا مطالبہ کرتا ہے؟ اس کی تعلیمات محدود قسم کی مذہبی رسوم عبادت و رہبانیت پر مشتمل ہیں یا اس کا دائرہ اثر انسان کی تمام فکری و عملی ضرورتوں کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے؟ اور پھر یہ کہ کیا آج تک اس نے انسانوں کے ذہنوں میں محض کچھ خیالی (Utopian) تمنائیں اور آرزوئیں ہی پیدا کی ہیں یا اپنی پیش کردہ رہنمائی کو عمل کی دنیا میں رائج کیا اور ایک مخصوص تمدن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنا جو جغرافیائی، نسلی، لسانی اور طبقاتی عصبیتوں کو نظر انداز کر کے انسانی فلاح و تشریف کا ضامن ثابت ہوا؟ جن لوگوں نے قرآن کے اصولوں کو اپنایا ان کی سیرت و کردار کا معیار کیا رہا ہے، اور اتباع قرآن نے ان کو کن اخلاقی محاسن سے مزین کر دیا ؟ کیا اس کی تعلیمات اسی مخصوص دور کے لیے تھیں یا ان کے اندر ابدی افادیت کا جوہر موجود ہے؟ اس نے محکم اساسات پر مبنی کن نظریات کی بنیاد پر کائنات اور ان کی پر اسرار ابتداء وانتہا کی گتھی سلجھانے کے لیے ظن و تخمین اوراٹکل و توہم پرستی کے ذرائع کے بجائے محکم دلائل اور یقینیات کی اساسات مہیا کیں؟ کیا اس کے پاس دور حاضر کے مادہ پرستانہ تصور حیات کے پیدا کردہ گھمبیر مسائل اور لاینحل پیچیدگیوں کا کوئی حل موجود ہے؟

ہم نے اس سے قبل بھی ان سوالات اور ان سے متعلقہ مسائل کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب میں گفتگو کی ہے اور آئندہ کے ابواب میں بھی اپنی دانست کے مطابق موزوں تواتر کے ساتھ ان کو زیر بحث لایا جائے گا۔

فہم قرآن کیلئے سنت و حیات طیبہ رسول صلی علیہ وسلم کا مطالعہ ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ جب بھی بندوں کی طرف اپنا پیغام ہدایت بھیجتا ہے تو اس کے ابلاغ کے لیے اپنے بندوں ہی میں سے ایک رسول منتخب کرتا ہے۔ اس کا اخلاق اس پیغام ہدایت کے مطابق ہوتا ہے، وہ اس پر عمل پیرا ہو کر تبیین دین کرتا اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات سبھی اہل علم پر واضح ہے کہ جب تک کسی فلسفہ، زندگی اور نظام تمدن کے اصولوں کی تفصیل اور اس کے عملی مضمرات کی وضاحت نہ کی جائے مخاطبین کے ذہنوں میں اس کا واضح تصور پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ اس کو جامہ عمل پہنانے میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔ انسانوں کے پیش کردہ نظام ہائے حیات بھی چاہے وہ نامکمل ہی کیوں نہ ہوں، اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ دور رواں میں یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جو بھی نظریہ زندگی پیش کیا گیا ہے کہ اس کی حمایت و توضیح میں کثیر لٹریچر منصہ شہود پر آیا ہے۔ ماضی قریب میں اس کی نمایاں مثل مارکسی کیمونزم فراہم کرتی ہے۔ مارکس نے اپنے پیش کردہ فلسفہ معیشت و معاشرت کے حق میں ایک ضخیم کتاب ''سرمایہ'' (Das Capital)کے نام سے لکھی علامہ اقبال نے فرمایا:

نیست پیغمبروے دارد کتاب

وہ خود تو اسے جامہ عمل پہنانے کے لیے اولین قدم بھی نہ اٹھا سکا اور نہ اس کے لیے اس نے اس قسم کی کوئی تکلیف برداشت کی جو انقلابی کام کرنے والوں کے لیے عام طور پر ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ مغربی دنیا کی آبادی کا ایک کثیر حصہ قلیل المقدار طبقہ کی استحصالی سرگرمیوں کا بری طرح شکار ہو رہا تھا لہٰذا مادہ پرستانہ تصور زندگی کے بہت سے حامی اہل علم نے مارکس کے نظریے کی وضاحت کرنے کے سلسلے میں اپنی دماغی توانائیاں صرف کیں اور اس کی تبیین کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اسی اثناء میں لینن نے روس میں کیمونسٹ تحریک کی سربراہی کی۔ اس نے انقلابی جدوجہد کے مختلف مراحل میں موقع و معاملات کے مطابق تحریکی تقاضوں کو ہمیشہ تحریری شکل میں واضح کیا۔

قرآن کے متعلق ہم سطور بالا میں قرآن ہی کی آیات کا حوالہ دے کر یہ تذکرہ کر چکے ہیں کہ یہ ''لسان عربی مبین''میں نازل کیا گیا۔ اس سے یہ مراد ہے کہ ہر شخص اپنی ذہنی و علمی استطاعت کے مطابق اس سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ کتاب نہ تو حیات انسانی کے محض کسی جزوی تصور کو پیش کرتی ہے اور نہ کسی ایک شعبہ زندگی سے متعلق ہے، بلکہ یہ اس حد تک مکمل ہے کہ اس نے انسان کے کسی شعبہ فکر و عمل کو اپنے دائرہ تعلیمات سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ چنانچہ فرمایا:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ(۶:۳۸)

ترجمہ:ہم نے نوشتہ میں کوئی بات بھی فروگزاشت نہیں کی۔

اور:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ(۱۷:۸۹)

ترجمہ: اور ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی حکمت کی باتیں بار بار لوٹا کر بیان کیں(کہ لوگ سمجھیں بوجھیں۔)

صاحب''تدبر قرآن''تشریحاً لکھتے ہیں:

''تصریف، کے معنی یہاں ایک ایک حقیقت کو مختلف اسلوبوں میں گوناگوں پیرایوں سے بیان کرنا ہے اور ''ضرب المثل''سے مراد حکمت و معرفت کی بات کہنا ہے، عربی میں اس مفہوم کے لیے اس محاورہ کا استعمال معروف ہے''۔

ایسی کتاب سے علماء و حکماء کو اسلامی تمدن کے زمانی سفر کے دوران اہم ترین ضرورتوں کے لیے مسائل مہمہ کا استنباط کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جن سے ایک عام ذہنی سطح کا انسان تو اپنی استعداد علمی کے مطابق ہی انتفاع کر سکتا ہے لیکن علمی قیادت پر فائز افراد ان کی گہرائی تک پہنچ کر ملت کی اعلیٰ نظری و علمی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ہر سطح کے لوگوں کے لیے قرآن کا منبع ہدایت ہونا اس کا ایک بہت نمایاں اور قابل توجہ اعجاز ہے۔ ہم یہ بات محض فکری و عقلی اور علمی وتحقیقی نکتہ نظر سے عرض کر رہے ہیں۔ ہم قرآن کے کسی ''باطنی''قسم کے معانی کے قطعاً قائل نہیں۔ نہ

حضورؐ نے اس قسم کا کوئی اشارہ دیا اور نہ صحابہؓ میں قرآن کے کسی ''باطنی''معانی کا کوئی تصور پایا جاتا تھا۔

اس قدر وسعت و جامعیت کی حامل کتاب جس کی ضخامت بھی انسانوں کی سہولت کے لیے بھاری بھر کم نہیں رکھی گئی بلکہ اکثر معاملات میں اصولی رہنمائی اور بعض معاملات میں کسی قدر تفصیلی رہنمائی پر مشتمل ہے، پیغمبر کو مبین کتاب کی حیثیت دینا ایک لازمی امر تھا۔ شارع علیہ السلام ہی کی تشریحات اور وضاحتوں کی روشنی میں علماءو حکماء اسلام، جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے ایک حرکی اسلامی تمدن کی فکری و علمی ضرورتوں کے لیے قرآن سے استفادہ کر کے رہنمائی مہیا کر سکتے ہیں۔ اگرچہ''تفسیر قرآن بالقرآن''کے طریقے سے بھی مفسرین قرآن متفق ہیں لیکن کسی نے بھی اس بات سے انکار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبین قرآن ہونے کی حیثیت کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قرآن کی تبیین کروانے کی ضرورت تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں میں شامل کیا ہے جیسا کہ اس کے بعد دی گئی آیات(۱۶:۴۴)سے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاحب وحیؐ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنا یا نہ کرنا مخاطبین کی صوابدید پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ قرآن میں جگہ جگہ موقع و محل کے مطابق اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ رسول کا اتباع فرض عین ہے۔ جس جگہ بھی قرآن میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کے اتباع کا تذکرہ ہے ساتھ ہی لازماً اتباع رسولؐ کا حکم ہے۔ اور بعض موقعوں پر محض اطاعت رسولؐ ہی کا ذکر ہے مثلاً(۵۹:۷)اور (۲۴:۵۶)۔ یہ اس لیے کہ رسولؐ اللہ کے احکامات کے اتباع کے سوا اور کسی بات کی تلقین کر ہی نہیں سکتا۔ قرآن پیغمبرؐ سے کہلواتا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ(۷:۲۰۳)

ترجمہ:میں تو بس اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

ہم باب۵ بعنوان محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں"دین میں حضور کا مقام"کے بغلی عنوان کے تحت متعدد ایسی آیات کا حوالہ دے چکے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتباع رسول فرضیت بیان کی گئی اس کے علاوہ بھی قرآن میں دیکھئے۔

آیات(۱۳۲:۳) - (۵۴:۲۴) - (۲۰:۸) - (۱۳:۴۸) - (۹۲:۵) - (۱:۸) - (۴۶:۸) - (۳۶:۳۳) - (۱۲:۶۴)جن میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا ایک ساتھ ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ اتباع و اطاعت رسولؐ کی یہ بار بار کی تاکید اس وجہ سے ہے کہ حضورؐ کو مبین قرآن کے مقام پر فائز کیا گیا تھا۔ اور اس مقام کی ذمہ داریاں بہت وسیع الاثر ہیں۔

تبیین قرآن کے متعلق حضور کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ(۱۶:۴۴)

ترجمہ:اور تجھ پر الذکر(یعنی قرآن)نازل کیا تاکہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے، وہ ان پر واضح کردے نیز اس لیے کہ وہ غورو فکر کریں۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضورؐ کی تبیین کے بعد مسلمانوں کی قوت تفکر کو معطل نہیں ہو جانا، بلکہ احوال و ظروف کے تغیر و تبدل کے تحت قرآن و سنت کی روشنی میں وہ اپنے قوائے فکریہ کو اجتہاد کرنے کے لیے استعمال میں لاتے رہیں گے۔

دین کے سلسلے میں حضورؐ کے ان فرائض اور ذمہ داریوں کی روشنی میں انسان اس نتیجے پر ناگزیر طور پر پہنچتا ہے کہ فہم قرآن کے لیے حضورؐ کی سنت اور حیات طیبہ کا بغور مطالعہ کرنا ازحد ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ فکری سطح پر قرآن کے پیش کردہ دین کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کی امامت و نفاذ کے لیے لائحہ عمل کا تعین کیا جا سکتاہے۔

آنحضرتؐ نے تفہیم و تبیین قرآن کا جو فریضہ انجام دیا ہے وہ قولی بھی تھا اور عملی بھی۔ قولی سطح پر حضورؐ مسلمانوں کو انفرادی حیثیت سے بھی ہر ایک کے ذہنی درجے کے مطابق دین کے اصول اور عبادت کے طریقے سکھاتے تھے، خطبات کے ذریعے بھی اس کام کو انجام دیتے تھے اور مسجد نبوی میں جو نشستیں ہوتی تھیں ان میں بھی ہر قسم کے پیش آمدہ مسائل پر موقع کی مناسبت کے لحاظ سے گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ ان سب ذرائع تبلیغ سے صحابہؓ

بھر پور فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس سلسلے میں مفصل گفتگو تو"حدیث وسنت" کے باب ہوگی یہاں ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ ان ساری صورتوں کے ذریعے حضورؐ کے جو فرمودات صحابہ نے سنے وہ بھی محفوظ ہیں۔ ان کی صحت کے تعین کے متعلق اتنا کثیر تحقیقی کام ہوا ہے جسے کوئی اہل علم اپنی ساری زندگی کی توجہ کا مرکز بنا کر بھی کلی طور پر اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا۔

جہاں تک وضاحت قرآن کے متعلق حضورؐ کی عملی کاوشوں کا تعلق ہے، آپ کی ہر حرکت چاہے وہ نشست و برخواست سے متعلق ہو، خوردونوش سے ہو، دوسروں سے میل ملاقات سے ہو، تبلیغ دین سے ہو، عبادات سے ہو، غیروں سے معاملہ اور معاہدات کرنے سے ہو، جنگ و صلح سے ہو، ازواجی زندگی سے ہو، اخلاقیات سے ہو، زہد و تقویٰ سے ہو، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عدالتی معاملات سے ہو، سابقہ اسلامی دعوتوں سے ہو، ان اور دوسرے تمام معاملات کے متعلق آپ کا عمل ہمیشہ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہو تا تھا۔ اس لحاظ سے قرآن کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جس پر حضورؐ نے خود عمل نہ کیا ہو اور مسلمانوں پر اپنی سنت کو قصداًظاہر نہ کر دیا ہو۔

قول و عمل کے ذریعے حضورؐ کا تعلیم کتاب کا یہی طریقہ جو قرآن کے تفہیم کے لیے سب سے زیادہ موثر ہے اور جس سے صرف نظر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے ہاں خدا ناشناس اور مادہ پرستی پر مبنی مغربی نظریات کے نفوذ نے ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو یا تو سرے سے دین سے کوئی واقفیت ہی نہیں رکھتا اور اگر انہیں کچھ معلومات حاصل بھی ہیں تو ان کا منبع مستشرقین کی اسلام کے متعلق تصنیفات ہیں جن میں اسلام کو مغربی فکر کی کسوٹی پر پرکھ کر لکھا جاتا ہے۔ ان کی بنیاد پر اسلام کے متعلق تشکیل نظریات کرنے سے کج فہمی کی بیماری میں مبتلا ہونا ناگزیر ہے۔ ایسے لوگ یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر فہم قرآن حضورؐ کی سنت پر منحصر ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ قرآن نامکمل ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ قرآن ہی میں جیسا کہ ہم کثرت سے حوالہ جات دے کر واضح کر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار اتباع رسولؐ، رسولؐ کے تبیین قرآن کے سلسلے میں فریضے اور رسولؐ کے صرف اور صرف اللہ سے موصول ہونے والی ہدایت پر عمل پیرا

ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان الفاظ میں بات کرنا قطعاً مناسب نہیں کہ قرآن نامکمل ہے بلکہ اتباع رسولؐ اور قرآن کے سلسلے میں حضورؐ کے مبین ہونے کی حیثیت قرآنی اصولوں اور تعلیمات میں شامل ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنت و حیات رسولؐ کا مطالعہ اور فہم قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری اور لابدی ہے۔ یہ قرآن ہی کا دیا ہوا درس ہے۔ کسی نے اس کو انفرادی یا فرقوی عصبیت کی تحریک سے ایجاد یا اختراع نہیں کیا۔ اول روز ہی سے صحابہؓ اس کے قائل تھے اور اس پر عمل پیرا تھے۔ ان کے بعد آئمہ سلف اور علماء حقہ بالاتفاق اس نظریے کو تھامے رہے۔ اور آج بھی مسلمانوں کا سواد اعظم نظریاتی اعتبار سے اسی پر کاربند ہے۔

اس ضمن میں ہم امت انبیاء و رسل کی ایک اور نمایاں خداداد خصوصیت کا تذکرہ بھی کر دینا چاہتے ہیں۔ غیر اسلامی تحریکوں کے قائدین اپنا سیاسی کام اس وقت شروع کرتے ہیں جب وہ اپنی بساط کی حد تک اپنے نظریات کا مطالعہ اور ترتیب کلی طور پر کر لیتے ہیں، ورنہ ان کے پاس اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کرنے کے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ لیکن انبیاء ورسل کا معاملہ اس سے بالکل مختلف رہا ہے۔ وہ اپنی بعثت کے وقت ہی سے دعوت کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ حضورؐ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات پر مشتمل وحی سے، جیسا کہ ہم ابن کثیر سے حوالہ دے کر عرض کر چکے ہیں، منصب نبوت پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد سورہ المدثر نازل ہوئی اور اس میں حکم ہوا "قم فاند ر" چنانچہ بلا تاخیر حضورؐ نے تبلیغ دین کا آغاز کر دیا ۔۔۔۔۔ اگرچہ دین کے اصول اور احکامات تو ان کے نزول کے موقع پر ہی پیش کیے گئے، لیکن آغاز دعوت دین میں رسولؐ کا طرز عمل اور آپؐ کے دعوت عزم کی یہ حالت تھی جیسے انہیں دین کی روح سے آگاہ کر دیا گیا ہو۔ کوہ صفا پر قریش سے پہلا خطاب آپؐ کے دینی نکتہ نظر سے پختگی ذہن کی واضح علامت ہے۔ کفار و مشرکین کے ظلم و تعدی کے مقابلے میں اول روز سے صبرو تحمل کا وہ مظاہرہ کیا گیا جو انبیاء ہی کی خصوصیت ہے اور جو قرآنی تعلیمات کا تقاضا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آغاز کار ہی سے جب کہ قرآن ابھی پورا نازل بھی نہ ہوا تھا یہ طرز عمل کس طرح اختیار کیا جا سکا۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس رہنمائی کا نتیجہ ہے جسے ''وحی خفی''کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ حضورؐ کے کام کی نگرانی، آپؐ کی حفاظت اور آپؐ کو استقامت کی توفیق عطا کرتا تھا:

چنانچہ فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا(۵۲:۴۸)

ترجمہ: اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

مولانا شبیراحمد عثمانی اس آیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''یعنی صبر و استقامت کے ساتھ اپنے رب کے حکم تکوینی و تشریعی کا انتظار کیجئے جو آپ کے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا، اور آپؐ کو مخالفین کی طرف سے کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔ کیونکہ آپؐ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری زیر حفاظت ہیں۔''

یہ مکی سورہ الطور کی آیت ہے۔

اللہ کی طرف سے حکم تبلیغ و دعوت کے اول روز ہی سے حضورؐ کی طرف سے دعوتی کام کا آغاز ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس وقت تک قرآن کے نزول کا چند آیات تک محدود ہونا بھی ثابت شدہ معاملہ ہے۔ اس مرحلے سے حضورؐ کی پختگی ذہن و فکر اور دعوت کام کی مشکلات کی برداشت کی قوت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان حقائق سے یہی رہنمائی ملتی ہے کہ حضورؐ کے اتباع کا فریضہ نبوی دور کے اول روز ہی سے مسلمان پر عائد ہو جاتا ہے۔ اور شارع دین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسئلے کا یہ پہلو بہت دلچسپ ہے کہ حضورؐ نے جس کتاب سے خود ہدایت حاصل کی(۹۳:۷)دنیا کے سامنے اس کی وضاحت کا قولاً و عملاًافریضہ ادا کرنا بھی آپؐ ہی کوسونپا گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حضورؐ قبل از بعثت راہ ہدایت سے بے خبر تھے، اگرچہ اس کو جاننے کی آپ میں تڑپ پائی جاتی تھی۔ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا۔ نزول وحی کے آغاز کے ساتھ ہی حضورؐ نے دعوت کا کام شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ آپؐ اپنا فریضہ بحسن و خوبی ادا کر رہے ہیں:

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ(۴۲:۵۲)

ترجمہ : نہ تم جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ پر راہنمائی کررہے ہو۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دعوت کے آغاز سے اس کی تکمیل تک وحی کی بنیاد پر تنہا حضورؐ ہی نے تمام اصول دین پیش کیے۔ اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں۔ البتہ سیاسی، انتظامی اور جنگ و صلح کی قسم کے معاملات میں آپؐ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کے تحت صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ یہ بات خصوصاً مادہ پرستوں اور منکرین وحی کی توجہ کے قابل ہے کہ ایک امی بلاشرکت غیرے کس طرح ایک احسن واصلح تمدن اور نظام زندگی کے اصول فراہم کر کے انہیں چند برسوں میں ایک امی معاشرے کے اندر قائم کر دیتا ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔۔۔۔۔۔۔(سورہ اور آیت نمبر درج نہیں

ترجمہ:اے عقل و خرد کی روشنی رکھنے والو! یہ بات تمہیں دعوت فکر دیتی ہے۔

قرآن فہمی کے لیے علمی استعداد کی ضرورت:

فہم قرآن کے لیے ضروری ہے کہ اس کے معانی و مفہوم کی گہرائی اور وسعت کے پیش نظر اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔ مختلف موضوعات جن پر اس کتاب میں بحث و گفتگو کی گئی ہے ان پر تفکر و تدبر کیا جائے۔ دراصل یہ ایک مختصر، مدلل اور کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے پر از معنی صحیفہ ہے جس نے اپنی بلاغت اور جامعیت کی وجہ سے حیات نوع انسان کے لیے فکرو عمل کے تمام گوشوں اور جہتوں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ یہ نہیں سکتا کہ کوئی فرد، چاہے وہ علمی اور ذہنی طور پر بزعم خود جتنا بھی باصلاحیت ہو، فقط سرسری طور پر پڑھ کر اس کے تمام مضامین کو اس کے جملہ مضمرات اور حکمتوں کے ساتھ کلیتاً سمجھ جائے اور اس پر تنقید کا حق حاصل کر لے۔

دنیا میں کوئی شعبہ علم ایسا نہیں ہے کہ اس کا فہم دوسرے تمام علوم سے کلی صرف نظر کر کے حاصل کیا جا سکے۔ اسی طرح قرآن کو سمجھنے کے لیے بھی بعض امدادی معلومات حاصل کرنا ضروری ہیں۔ اس ضمن میں حضورؐ ہی کے دور حیات میں مختلف دعوت مراحل کے دوران جس جس پس منظر میں اس کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے ان کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔ اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے حصے وقتی افادیت ہی رکھتے تھے، بلکہ ان کا اطلاق ہر دور کے اس نوعیت کے واقعات و احوال پر ہوتا رہے گا۔ اس لحاظ سے دور حاضر کے حوالے سے اس کے مضامین کے مالہ، و ماعلیہ کا شعور حاصل کرنے کے لیے آج کے پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ دور حاضر کے انسان کے ذہن میں اسی صورت میں قرآن کی حقانیت کے سلسلے میں اعتماد پیدا ہو سکتا ہے جب اس کو یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ کتاب اس کے ان مسائل کو حل کر سکتی ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ سرگرداں ہے۔ انسانی زندگی کے عملی حالات فکری الجھنوں اور قابل حل مسائل کو نظر انداز کر کے قرآن کامطالعہ کرنا ایک سعی لا حاصل اور خلاء میں مطالعہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ کتاب صرف انسان کے مادی اور محسوسات سے تعلق رکھنے والے مسائل ہی سے بحث نہیں کرتی بلکہ ان ما بعد الطبیعیاتی سوالات کے بھی مدلل جوابات فراہم کرتی ہے جو فلسفے کی دنیا میں ہمیشہ سے زیر بحث اور موضوع فکر بنے رہے ہیں۔ اور اب ماضی قریب کے زمانے سے سائنس نے بھی اس دائرے میں اپنی کوششیں تیز تر کر دی ہیں، اگرچہ ہم وحی کے باب میں مغربی اہل علم اور علامہ اقبال کی تحریروں کے حوالے دے کر واضح کر چکے ہیں کہ یہ معاملات سائنس کی دسترس سے باہر ہیں، اور یہ کہ اس کے پاس ان کا شعور و ادراک حاصل کرنے کے لیے تحقیق کرنے کے وسائل ہی موجود نہیں۔

لیکن اس صورت حال کے باوجود جس نے بھی ان مسائل کے متعلق اسلام کے موقف کو سمجھنا ہو اسے اس شعبے میں انسان کی بے بسی اور اس کی وجوہ سے واقفیت پیدا کرنا ہو گی۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل پر گفتگو محض بیکار ذہنی ورزش کی حیثیت نہیں رکھتی البتہ ان کا

تعلق ادراک حقیقت سے ہے جو انسانی عقل و خرد اور تحقیقی و مشاہداتی قوتوں کی دسترس سے ماورا ہے۔ لیکن ان کے متعلق کوئی نہ کوئی عقیدہ رکھنے پر انسان ہمیشہ مجبور ہوا ہے چاہے وہ عقیدہ مثبت ہو یا منفی۔ مثبت عقیدہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ ہم نے''وحی''کے عنوان سے جو باب سپرد قلم کیا ہے اس میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ فلسفہ اور سائنس دونوں حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مغربی تمدن جس کو اس وقت دنیا میں علمی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطحوں پر غلبہ حاصل ہے منفی رویہ اپنا کر دہریت اور لا ادریت کے منفی عقائد اپنائے ہیں۔ اور انسان کے دنیوی اعمال کے حسن و قبح کے سلسلے میں جواب دہی کا انکار کر کے استعمار، استحصالی، ظلم و عدوان اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے استحقاق پر یکسو ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کرہ ارض اس وقت جنم کدہ بن چکا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو تو مغربی تمدن کے عنوان کے تحت ہوگی۔ یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چاہے انسان ما بعد الطبیعیاتی مسائل کے سلسلے میں منفی مؤقف اختیار کرے یا مثبت، اس کے رویے میں اس کا واضح اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ان ماورائے عقل مسائل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں وہ جہالت اور ابلہ فریبی کا شکار ہونے کی وجہ سے ایسی رائے رکھتے ہیں۔

اسی طرح مثبت رویہ اختیار کرنے والوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ جو انسان سے فروتر مخلوق یا اجرام فلکی یا وہمی ہستیوں کو جن کا مادی وجود ناپید ہوتا ہے، اس کائنات میں خدا اور الہہ کا مقام دے دیتا ہے اور ان میں دو سرا گروہ ان ادیان پر مشتمل جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کا قائل ہے۔ اس گروہ میں صرف اسلام کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ خالص توحید پر اپنے سارے فکر کی عمارت تعمیر کرتا ہے اور اس میں کسی آمیزش یا کسی کے ساجھے کو گوارا نہیں کرتا۔(توحید پر مستقل باب میں گفتگو کی جائے گی)۔

قرآن کی تعلیمات کی بنیاد توحید ہے اور اسی سے وحی، رسالت، تخلیق و تدبیر کائنات اور معاد کے تصورات کے علاوہ صفحہ ارض پر انسان کی زندگی کے طرز عمل کے تعین کے سلسلے میں سوتے پھوٹتے ہیں۔ ہم''اسلامی فکر''کے باب میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلام نبی

نوع انسان کو دنیوی زندگی بھر پور طور پر گزارنے کے لیے مکمل اصولی رہنمائی فراہم کرتا اور ایک نظام عدل کے تحت مخصوص تمدن وجود میں لاتا ہے۔

جس کتاب میں یہ سارے مضامین جمع ہوں اس کو سرسری طور پر پڑھ لینے سے اپنے آپ کو اس کے مرتبے اور مقام کے متعلق قطعی رائے قائم کرنے اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے کا اہل سمجھ بیٹھنا علمی مذاق کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے برعکس ایسے مقصد کے حصول کے لیے خاصی ابتدائی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے ہم اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں کہ قرآن ہر ذہنی سطح کے انسان کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے بشرطیکہ اس کا مطالعہ طلب ہدایت کے لیے کیا جائے اور اس دوران اپنے ذہنی مقام کو ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن اگر اس کے پیش کردہ اصولوں کو سمجھنا مطلوب ہو اور انسانی فکروحیات کے لیے قرآن کے پیش کردہ نقشے (Scheme) کا تصور حاصل کرنا پیش نظر ہو اور اس کی تعلیمات کی مرکزی روح کا علم حاصل کرنے کی خواہش ہو یا اس کا تنقیدی مطالعہ کرنا مطلوب ہو تو ایسے مقاصد کے لیے بعض شرائط کا پورا کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح ہر صنف علم کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کی وسعت کی نسبت سے اس کے مختلف درجوں اور سطحوں کو ذہن کی گرفت میں لانے کے لیے پوری کی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اقتصادیات کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں یا محض اس کا سرسری مطالعہ رکھتے ہوں لیکن اس سرمایہ علم کے ساتھ آپ قومی اور بین الاقوامی معیشت کے پیچیدہ ترین مسائل کو سمجھنے یا ان کا حل پیش کرنے کی تمنا اور آرزو کرنے لگیں۔ جب ایک موضوع کو سمجھنے کے لیے خاص علمی استعداد کی ضرورت ہوتی ہے تو ایک پورے کے پورے نظریہ زندگی کے مالہ، وما علیہ کا ادراک حاصل کرنے اور اس کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے لیے تو اور بھی زیادہ علمی استعداد درکار ہوگی۔

قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کی تین قسمیں:

تین طرح کا نکتہ نظر رکھنے والے لوگ قرآن کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

ایک وہ جو مومن و مسلمان ہوں اور اس تصور کے ساتھ کہ قرآن منزل من اللہ کتاب ہے اور اپنی علمی سطح کے مطابق اس کی تعلیمات سے روشناس ہونا چاہیں۔ وہ اس سے

جو کچھ اخذ کرتے ہیں اس پر عمل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں اور کھوج کرید میں نہیں پڑتے، اور غیب کی باتیں جو اور جتنی قرآن میں مذکور ہیں اپنی سمجھ کے مطابق ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ وہ اس نظریے کو بصمیم قلب قبول کرتے ہیں کہ غیب کی باتوں کی کنہ تک ہماری عقل و حسیات کی رسائی نہیں ہے جیسا کہ بڑے بڑے فلسفیوں کی بھی نہ ہو سکی۔ وہ یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ ایسی باتیں انسانی سمجھ کی حد تک اس لیے بتا دی گئی ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں سوالات ابھرتے ہیں اور جو کچھ بتا دیا گیا ہے ہماری رہنمائی کے لیے اکتفا کرتا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اگرچہ مومن ہوں لیکن مزید اطمینان کے لیے اور طلب ہدایت کی غرض سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنا چاہیں اور اس کے اصولوں کا ادراک حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہو۔ یا وہ غیر مسلم ہوں لیکن تلاش حق کی غرض سے قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیں اور علمی ذوق سے نا آشنا نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا اسی طرح مطالعہ کریں جیسے ہم نے سطور بالا میں عرض کیا ہے، اور جیسے کسی شعبہ علم کے منتہی کرتے ہیں۔ ایسے رویے سے اجتناب کرنے اور محض سنی سنائی باتوں یا سرسری طور پر مستشرقین یا غیر ثقہ مصنّفین کی کچھ کتابیں پڑھ کر قرآن کی تعلیمات کے سلسلے میں حکم کے مقام پر اپنے آپ کو فائز تصور کر لینا علمی ذوق کے منافی ہے۔

تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو طلب ہدایت کے قرآن کا مطالعہ نہیں کرتے، بلکہ محض معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں کس قسم کے نظریات شامل ہیں۔ وہ ان نظریات کو اپنے مخصوص نظریات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں چاہے ان دونوں میں کوئی قدر مشترک موجود ہی نہ ہو، اور ان کے نظریات اور قرآن کی تعلیمات کی روح میں تضاد عظیم پایا جاتا ہو۔ ان کے اندر حق و باطل میں تمیز کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ ان کو یا تو اس بات کا محض شوق ہوتا ہے کہ وہ مختلف مذاہب وادیان یا نظام ہائے فکر کے متعلق معلومات حاصل کریں اور یا وہ اس سلسلے میں پیشہ ورانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اپنا فرض منصبی سمجھ کر قرآن کا بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ مطالعہ کر لیتے ہیں۔ یہ طرز عمل زیادہ تر مستشرقین نے اپنا رکھا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر اپنے آپ کو دانشوروں میں شمار کرتے ہیں، اور ان کی کسی نظام زندگی یا دین و مذہب سے کوئی وابستگی نہیں ہوتی، نہ وہ طلب ہدایت کے متمنی ہوتے

ہیں۔ بلکہ وہ ہدایت کے کسی تصور کے قائل ہی نہیں ہوتے، اس لیے کہ وہ انسانی زندگی کو کسی انجام سے دوچار ہونے کے تصور کو قدامت پرستی اور کہنہ خیالی کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ موت کے ساتھ جب ختم ہی ہو جانا ہے تو بروائم اور بھلائی و برائی اور نیکی و بدی چہ معنی دارد۔ نیز یہ تشکیلی مسلک (Skepticism) کے مرض میں بھی مبتلا ہوتے ہیں چیمبر ڈکشنری میں (Intellectual) کا یہ مطلب لکھا ہوا ہے:

ترجمہ:''بہتر عقل و خرد اور روشن خیال کا مالک ایسا شخص جو اکثر اوقات عمل کے سلسلے میں عقل و خرد پر مبنی خیالات کے متعلق شک و ریب کا اظہار کرتا ہو۔''

لہٰذا یہ لوگ زندگی کے کسی ایک مسلک سے منسلک نہیں ہوتے جو انہیں استقرار فکر و عمل کی توفیق بخشے۔ ان کے فکر کی سرحدیں سنکیت (Cynism) سے بھی جاملتی ہیں۔

یہ لوگ جب قرآن کا مطالعہ اور اس پر اظہار رائے کرتے ہیں تو ان کے خیالات پر ان کی اس ذہنیت کی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ قرآن کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی تصانیف قرآن کی صحیح ترجمانی کر سکتی ہے۔(مستشرقین کے باب میں حوالوں کے ساتھ ان کا تفصیلی تذکرہ ہو گا)

جو جس نیت سے قرآن کا مطالعہ کرتا اس کے مطابق وہ یا تو اس سے ہدایت پاتا یا راہ راست سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے اور اسی نکتہ نظر سے قرآن خودکہتا ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ(۲۶:۲)

ترجمہ : اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔

قرآن کے ہر اصول پر اس کی مجموعی تعلیمات کے پس منظر میں غور کرنا چاہیے:

قرآن فہمی کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگر اس کا کوئی اصول پوری طرح ذہن کی گرفت میں نہ آئے یا کوئی اشکال پیدا ہو یا قاری کا ذہن کسی بات سے اختلاف محسوس کرتا ہو تو سارے کے سارے قرآن سے بدظن یا اس کے کلام الٰہی ہونے کی حیثیت

کے بارے میں شک وریب میں مبتلا نہ ہو جانا چاہیے۔ بلکہ اس سلسلے میں مزید غور و تفکر کرنا چاہیے۔ وہ تاریخی پس منظر معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس میں وہ اصول یا حکم نازل ہوا۔ اس سے متعلق احادیث تلاش کرنی چاہئیں۔ ان صحابہؓ کے آثار کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو تفسیر قرآن میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے اشکال دور کرنے کے بہت سے راستے ہیں۔ قرآن کی تفسیر سے تعلق رکھنے والا اس قدر مواد موجود ہے کہ دنیا کی اور کسی کتاب یا صحیفے کے متعلق اتنا مواد دستیاب نہیں ہے۔

مسلمانوں میں مغربی علمی تفوق کے باعث جس طبقے نے لادینی اور مادہ پرستانہ نکتہ نظر اپنا لیا ہے وہ احساس کمتری کی وجہ سے قرآن کے پیش کردہ اصولوں اور اسلام کی تاریخ کے واقعات کو مغربی تفکر سے ہم آہنگ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں کہ انسانی فکر کی بنیاد پر وضع شدہ اصول تو آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ ایک نظریے کی آج دھوم مچی ہوئی ہے تو کل وہ غلط ثابت ہو کر متروک ہو جاتاہے۔اگرآپ اس کے دور مقبولیت میں اسلام کے اصولوں کو اس کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کریں تو اس کے متروک ہونے پر آپ کا کیا موٴقف ہو گا؟

ایک دور تھا کہ مارکسی اشتراکیت کا کذب اور پروپیگنڈے کے زور پر طوطی بول رہا تھا۔البتہ مسلمانوں کے سواد اعظم نے اسے کبھی بھی برسر حق تسلیم نہیں کیا۔ علامہ اقبال نے اب سے ساٹھ سال قبل اس کے مرکزہ فکر کو مردود قرار دیتے ہوئے فرمایا:

رنگ وبو از تن نہ گیرو جان پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دین آں پیغمبر حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اُساس

(جاوید نامہ صحفہ ٦٩)

"پیغمبر حق ناشناس" سے مراد کارل مارکس ہے۔

جاوید نامہ ہی میں علامہ نے سید جلال الدین افغانیؒ کی زبان سے محکمات عالم قرآنی بیان کروا کر اشتراکی روس کو انہی کی طرف سے پیغام دلوایا جس میں سید افغانی نے اشتراکیت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا:

منزل و مقصود قرآں دیگر است رسم و آئین مسلماں دیگر است

(۸۷)

اور پھر اشتراکی روس کو یہ دعوت دی:

داستان کہنہ شستی باب باب فکر را روشن کن از ام الکتاب

(صفحہ ۸۸)

''جاوید نامہ''کی تخلیق کا دور ایسا تھا کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا اور ان کے اکثر ممالک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلمان کے حوالے سے کہا:

درد دل او آتش سو زندہ نیست مصطفی در سینہ روزہ نیست

(صفحہ ۸۷)

لیکن اس زمانہ انحطاط میں بھی قرآن فہمی ہی کا اعجاز تھا کہ مسلمانوں کے ایک اہل علم و حکمت نے اشتراکی روس کو جس کی انقلابی روش کی وجہ سے ایک دنیا مرعوب تھی، مخاطب کرتے ہوئے تمسک بالقرآن کی دعوت دی۔ اس کتاب کی مجموعی تعلیمات اور نظام فکر کی محک پر کھ کر اشتراکی روس کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ تم اساس محکم سے محروم ہو:

اے کہ می خواہی نظام عالی جستہ ادرا اساس محکمے ؟

(صفحہ ۸۸)

لیکن مسلمانوں ہی میں بعض ایسے اشتراکی ایجنٹ پائے جاتے رہے ہیں جو نہ اسلام کو سمجھتے تھے اور نہ اشتراکیت کو۔ انہوں نے اشتراکیت کو مطابق اسلام قرار دینا شروع کر دیا۔ اب جب کہ اشتراکیت پوری طرح رسوا ہو کر منہدم ہو چکی ہے کیا ایسے مسلمانوں کے نزدیک اب اسلام کے اصولوں میں تبدیلی آجائے گی؟ یعنی پہلے اسلام میں اشتراکی اصول شامل تھے لیکن اب وہ ان سے مبرا ہے ؟ (اشتراکیت کے متعلق الگ باب میں تفصیلی گفتگو ہوگی) در حقیقت اسلام کے مجموعی نقشے میں اشتراکیت یا اشتمالیت کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں۔

اسلام کو کسی اجنبی فکر یا نظریے کی نہ کبھی تاریخ میں پہلے تائید کی ضرورت تھی نہ اب ہے۔ اس کے اپنے ابدی مستقل اور محکم اصول ہیں اور قرآن ان کی واضح الفاظ میں صراحت کرتا ہے۔

لہٰذا قرآن کا ہر اصول چاہے وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، کائنات کے کسی پہلو سے متعلق ہو اور فکر و نظر کے کسی گوشے پر روشنی ڈالتا ہو، اس کتاب کے مجموعہ نظریات سے بندھا ہوا اور منسلک ہے۔ اس لیے قرآن فہمی کا صحیح طریق یہی ہے کہ اس کے کسی اصول کے متعلق اس کے مجموعی نقشے سے الگ کر کے نہ سوچا جائے۔ اعدائے اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے اور آج کل میں اس میں زیادہ شدت آگئی ہے کہ وہ کسی نہ کسی ایک اسلامی اصول کو مجموعی اسلامی فکر سے الگ کر کے نشانہ تنقید و مخالفت بناتے ہیں، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ مغربی معاشرے میں جگہ نہیں پا سکتے لہٰذا اس معاشرے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ان سے اجنبیت محسوس ہونے کے علاوہ وحشت بھی ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی معاشرے کے لیے وہی موزوں ہوتے ہیں اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک کیمونسٹ معاشرے میں آزادی اظہار رائے یا جمہوری اداروں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی یا ایسے تمدن میں جہاں اختلاط مردوزن معمول کی صورت اختیار کر جائے اس کے نتائج بد ان کے معاشرے میں معمولات کی حیثیت اختیار کر جائیں، شرم و حیا کی تمام قدریں معدوم ہو جائیں، شراب خوری ان کی محفلوں، تہواروں، خوشی و غم کے مواقع اور غذا کا جزو لاینفک بن جائے،

چوری اور لوٹ مار کا موقع ملنے پر ساری کی ساری آبادیاں اس میں ملوث ہو جائیں تو اسلامی حدود کی اس کی عدلیہ میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اس معاشرے کے افراد جب اس قسم کے جرائم کے سلسلے میں اسلامی حدود ک کا تصور کرتے ہیں تو ان پر کپکپی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، حالانکہ ان سے کوئی بھی یہ مطالبہ نہیں کر رہا کہ ان حدود اسلامی کو وہ اپنے قوانین عدلیہ کا حصہ بنائیں۔ بلکہ ایک اسلامی معاشرے میں بھی ان حدود کا نفاذ ایک خاص اصلاحی کام کے نتائج کے پس منظر میں ہو سکتا ہے۔ تفصیلات اسلامی عدلیہ کے باب میں آئیں گی۔ یہاں یہ بات ہم نے مثال کے طور پر عرض کی۔ اہل مغرب اور مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے مستغربین کی اس سلسلے میں وحشت اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسرے قرآنی اصولوں کی طرح مسئلہ حدود کو بھی اسلامی معاشرے کی مجموعی ساخت سے الگ کر کے ان پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ ہراسلامی اصول، حکم، قاعدے یا قانون کی مصلحت

واہمیت اسی صورت میں ذہن نشین ہو سکتی ہے جب کہ اسے اسلامی تعلیمات کے مجموعی نقشے میں اس کو موزوں جگہ پر رکھ کراس پر تدبر کیا جائے۔

اس طرز فکر کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بعض مغربی فکر سے مرعوب اور اسلامی فکر کے معاملے میں احساس کمتری میں مبتلا مسلمان بھی بعض اسلامی اصولوں کے معاملے میں معذرتانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام جن معیارات و اقدار کا درس دیتا ہے ان کے تحت ہمیں صاف طور پر واضح الفاظ میں اسلام کے اصولوں کی، جیسے کہ وہ قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے ہیں، حقانیت کا اعتراف کرنا چاہیے۔ تکلف سے اور غیروں کے ساتھ فکری مصالحت کی نیت سے دو از کار تاویلات سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمیں برملا اور بلا خوف لومتہ لائم اس بات کا اعلان کرنا چاہیے کہ اسلام کے اصول مبنی بر حق، دائم اور ابدی افادیت کے حامل ہیں، اور مغربی فکر چونکہ اساسی طور پر اسلام سے مختلف ہے لہٰذا ان دونوں میں جزوی یا کلی مماثلت کی راہیں تلاش کرنا کار عبث ہے۔ (البتہ کون سے اور کس نوعیت کے علوم ساری انسانیت کی مشترک ملکیت ہوتے ہیں اور ان سے استفادہ کرنے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے، یہ بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ ناظرین کو فکری و نظری اصولوں اور انسانی تحقیق و تجربہ سے وجود میں آنے والے علوم کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔)

قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلامی کو جس انداز سے چلایا اور قرآن کی رہنمائی میں جس درجے کی کامیابی تک اسے پہنچایا وہ قرآن کے ترتیب و انداز نزول کی حکمتوں کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ واضح ذریعہ ہے۔ یہ تدریجی طریق نزول ہی تھا جس کی وجہ سے دعوت کے ہر مرحلے پر اور مسلمانوں کی تعمیر سیرت اور تزکیہ نفس کی ہر ضرورت کے لیے مناسب مواقع پر متعلقہ حصہ قرآن نازل ہوتا تھا۔ اگر چہ اس انداز نزول کے لیے بہت سے دلائل پیش کیے گئے ہیں، لیکن اس کی حکمتیں روز روشن کی طرح حضورؐ کے اسوۂ حسنہ، آپؐ کی حیات طیبہ، تربیت صحابہ اور دین کی دعوت کی رفتار ترقی کے مشاہدے سے واضح ہو جاتی ہیں۔

آپ غور فرمایئے کہ اولین وحی کے موقع پر جب کہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں اگر حضورؐ کے ہاتھ میں پورا قرآن دے دیا جاتا جس میں ظاہر ہے تمام تشریعی احکامات موجود ہوتے اور تمام عبادات کے بجا لانے کی تلقین بھی ہوتی تو ایک ایسے معاشرے میں جو توحید کے عدم اعتقاد میں مبتلا تھا، جو وحی و رسالت کے تصور پر کوئی یقین نہ رکھتا تھا، جو جوابدہی اعمال یعنی معاد کے وقوع کو تمسخر کا موضوع تصور کرتا تھا، شرک کی بدترین صورتوں میں ملوث تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضورؐ کو مقام رسالت پر فائز ہونے کا اہل تصور کرنے ہی سے گریزاں تھا، اگر ایسے لوگوں کے سامنے یکلخت وہ سارے احکامات پیش کر دیئے جاتے تو عملاً ان کے نفاذ اور فکری طور پر ان کی قبولیت کے کیا امکانات ہو سکتے تھے۔ حضورؐ کہاں سے اور قرآن کے کس نظریے کو پیش کر کے دعوت کا آغاز کرتے؟ اس کے علاوہ قرآن میں تو ان بہت سے واقعات کا تذکرہ ہے اور جہاد بالسیف سے متعلق احکامات بھی ہیں جو مستقبل میں دعوت کے مختلف مراحل میں پیش آنے والے تھے۔ کیا ان سب باتوں کے متعلق پیشگی احکامات اور وضاحتیں دے دی جائیں؟ کیا یہ صورت قرین مصلحت اور دعوتی کام کے تقاضوں کے مطابق تھی؟ کیا اس سے مخاطبین کے اذہان الجھنوں کا شکار نہ ہو جاتے؟ اور پھر کیا حضورؐ کی بشری حیثیت کے اور امی ہونے کی حالت کے پیش نظر یہ بات ممکن تھی کہ قرآن کے سارے اصول اور دعوتی کام کے سارے مراحل اور نشیب و فراز بیک وقت حضورؐ کے ذہن کی گرفت میں آجاتے؟

قرآن کو بتدریج نازل کرنے اور ایک وقت میں عام طور پر پانچ آیات یا چند آیات کے نزول پر اکتفا کرنے پر جب حضورؐ کے طرز عمل میں دعوتی کام کو بڑھانے کے بے پناہ شوق کے پیش نظر اضطراب کی کیفیت دیکھی گئی اور آپ کے طرز عمل میں قرآن کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اخذ کرنے کی خواہش کا اظہار ہوا تو اللہ تعالی نے فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (۱۱۴:۲۰)

ترجمہ: پس تم قرآن کے لیے اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے سے پہلے جاری نہ کرو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب میرے علم میں فراوانی فرما۔

کفار مشرکین یہ طعنہ دیتے اور طنز کرتے تھے کہ حضورؐ کو سارا قرآن یک بارگی کیوں عنایت نہیں کیا جاتا۔ ایسا کیوں ہے کہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اس کا نزول ہو رہا ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود دیا اور ساتھ ہی حضورؐ کو اپنے دعوتی کام میں جو سہولت میسر آنا تھی اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا اور مخاطبین کو اسے اپنے اذہان کی گرفت میں لینے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں جو آسانی محسوس ہونا تھی اس کو بھی واضح کر دیا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۳۲:۲۵)

ترجمہ: اور ان کافروں نے کہا کہ اس کے اوپر پورا قرآن ایک ہی کیوں نہیں اتار دیا گیا؟ ہم نے ایسا ہی کیا تا کہ اس کے ذریعے سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو بتدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔

صاحب تدبر قرآن نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ امر ملحوظ رہے کہ آسمانی صحائف میں سے کوئی صحیفہ بھی بیک وقت نہیں نازل ہوا ہے۔ جن لوگوں نے یہ خیال کیا ہے، ان کا خیال ان صحائف سے بے خبری پر مبنی ہے۔ تو راۃ بھی پوری کی پوری بیک دفعہ نازل نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ اس کے صرف احکام عشرہ نازل ہوئے ہیں جو الواح میں لکھ کر حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئے۔ لیکن توراۃ صرف احکام عشرہ ہی پر تو مشتمل نہیں ہے اس میں تو شریعت موسوی کے تمام احکام و قوانین ہیں جو حضرت موسیٰ کی پوری زندگی میں درجہ بدرجہ نازل ہوئے۔ ان میں سے بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے متعلق زبور اور توراۃ دونوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کی ہجرت سے پہلے نازل ہوئے ہیں بہت سے احکام دریا کے عبور کرنے کے بعد یا صحرائے سینا کی زندگی کے دور میں نازل ہوئے ہیں اسی طرح انجیل تمام تر سیدنا مسیحؑ کے مواعظ حکمت پر مشتمل ہے جو مختلف مواقع پر حسب اقتضائے حالات، آپ پر نازل ہوئے اور آپ نے اپنی قوم کو انذار کیا۔ یہی حال زبور کا ہے۔ یہ حضرت داؤدؑ کی منظوم مناجاتوں اور تلقینات پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً آپ پر القا ہوئیں۔ مابین الدفتین نازل ہوئیں۔ آخر ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ حضرات انبیاءؑ کوئی مصنف نہیں تھے کہ پوری پوری کتابیں لکھ کر ایک ہی دفعہ

لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیں وہ داعی، معلم اور مزکی ہوتے تھے۔ انہیں ایک پوری مریض قوم کا علاج و تزکیہ کرنا ہوتا تھا۔ ان کے اس فرض منصبی کا فطری اور قدرتی تقاضا یہ تھا کہ وہ اس اصلاح کی راہ میں تدریج کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں اور ہر قدم پر ضرورت کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی حاصل ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے علماء اہل کتاب بھی اپنی کتابوں میں سے کسی کتاب کے بیک وقعہ نازل ہونے کے مدعی نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو اس کا دعویٰ خود اس کتاب کی تصریحات کے صریح خلاف ہے۔ ہمارے مفسرین یہ بات جو لکھتے ہیں کہ تورات، زبور اور انجیل بیک دفعہ نازل ہوئی ہیں یہ صحیح نہیں ہے"۔

یہ گویا سنت اللہ ہے کہ دعوت دین کی مصلحتوں کے زاویہ نگاہ سے اور خود رسول اور مسلمانوں کے اذہان میں دین کے اصولوں کا رسوخ پیدا کرنے کے لیے صحیفہ آسمانی کو بتدریج نازل کیا جائے۔

قرآن میں تکرار کا مسئلہ اور اس کے متعلق غلط فہمی

جب کسی قوم، ملت یا تمدن سے وابستہ اہل علم اور عوام اپنے علم، نظریات، اقدار اور عملی روش کا رشتہ اپنے بنیادی فکر سے منقطع کر لیں، اور مخالف قوتیں بھی متواتر کوشاں ہوں کہ ان کے اذہان میں الجھاؤ اور تشکیک کے امراض پیدا کیے جائیں تو ان کے اپنے اندر بھی ایسے عناصر کا ظہور بعید ازقیاس نہیں ہوتا جو اپنے اساسی فکر کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں۔ امت مسلمہ کے فکر و نظر اور عمل و کردار کے تمام شعبوں کی تعمیر قرآن و سنت کی بنیاد پر ہونی چاہیے، اور یہی مسلمانوں کی آرزو لیکن اس آرزو پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ان اساسات کے متعلق دین کی روح سے ناواقف لوگوں میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں اور ایسے لوگ بڑی بے تکلفی اور جسارت کے ساتھ قرآن و حدیث کو تنقید و اعتراضات کا ہدف بناتے ہیں۔ قرآن کے متعلق جو شکوک پیدا کیے جا رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں تکرار پایا جاتا ہے یعنی ایک ہی بات کو بعض صورتوں میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔

ہم اللہ اور انسانوں کے کلام میں کسی شائبہ مماثلت کے تصور کے بغیر یہ عرض کریں گے کہ یہ ایک غیر متنازع حقیقت ہے کہ آج تک جس شخص نے بھی کوئی انقلابی نظریہ پیش کیا ہے یا کسی مقصد کے حصول کے لیے کوئی تحریک شروع ہوئی ہے تو نظریہ اور تحریک کے بنیادی اصولوں پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ یہ آئے دن کے دیکھنے اور مشاہدے کی بات ہے۔ آپ شہرت یافتہ شخصیات کی علمی تخلیقات کا یا مختلف تحریکوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے آپ مرکزی مقاصد و نظریات کے اعادے کا سامنا کریں گے۔ کسی کو بھی خلاء سے واسطہ نہیں ہوتا۔ ہر ایک کے مخاطبین انسان ہی ہوتے ہیں جن کے اذہان میں پہلے سے کچھ نظریات جمے ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی نئی بات سمجھائی ہی نہیں جا سکتی اور نہ ان سے قبول کروائی جا سکتی ہے جب تک اس کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں سے وضاحت نہ کی جائے۔ اور پھر اگر نئے پیش کردہ نظریات کے انسانی زندگی پر نفاذ کے لیے بھرپور کوشش کی جائے اور اس کا کچھ چرچا بھی ہو جائے اور لوگوں کی معتدبہ تعداد کی طرف سے اسے درجہ قبولیت بھی حاصل ہونا شروع ہو جائے تو بہت سے عناصر اس کے متعلق مختلف النوع سوالات اٹھانا اور وضاحتیں شروع کر دیتے ہیں۔ داعی شخص یا جماعت کو ان لوگوں سے گریز کرنے کے بجائے ان سب کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایسے حلقے بھی ہوتے ہیں جن کے مفادات پر ان نظریات کی مخالفانہ زد پڑتی ہے اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو طلب ہدایت کے لئے سوالات کرتے ہیں۔ بات کو مؤثر طریق سے بیان کرنے اور ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کئی دفعہ بعض مسلمات اور مقدمات کا اعادہ کرنا پڑتا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ مسلمات و مقدمات ہمیشہ ایک ہی قسم کے الفاظ اور ایک ہی قسم کے سیاق و سباق میں بیان کیے جائیں۔ لیکن بہرحال ان میں مماثلت کا پہلو تو ہوتا ہی ہے۔ اس لیے ان کے ایک سے زیادہ مرتبہ بیان پر ان کی ضرورت کے متعلق تدبر نہ کرنے والوں میں یہ کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ تکرار کی صورت ہے۔ وقفے وقفے سے انہیں بعض ضروری باتوں کی یاد دہانی ہو جاتی ہے تاکہ وہ ان کے اذہان پر مضبوطی کے ساتھ مرتسم ہو جائیں۔ اور یہ انداز تکرار کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ اسلوب تفہیم میں شمار ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ جن لوگوں نے عملی جدوجہد نہیں کی بلکہ صرف تحریری پر کوئی نیا فلسفہ زندگی پیش کیا ہے اس کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لیے انہوں نے بھی جو تصانیف تخلیق کی ہیں ان میں اپنے اساسی نظریات کو ہمیشہ مختلف انداز و اسالیب بتکرار بیان کیا ہے۔ کوئی نظریہ زندگی محض ایک دفعہ بیان کر دینے سے اور اس تضمنات کو سرے سے نظر انداز کر کے مخاطبین پر واضح نہیں ہو جاتا۔ لوگوں سے ان کے سابقہ اور آباؤ اجداد سے ورثے میں ملے ہوئے خیالات ترک کروا کر نئے نظریات منوانا کوئی ایسا کام نہیں جو سرسری طور پر ایک آدھ بیان دے کر انجام دیا جا سکتا ہو اس کے لیے صبر آزما محنت کرنا پڑتی ہے اور کئی جہتوں سے اپنے پیش کردہ نظریات کی وضاحت کرنا پڑتی ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں مستحضر رہنی چاہیے کہ اکثر اوقات انسانی زندگی سے متعلق تحریکیں اور فلسفے اس کے کسی ایک آدھ گوشے سے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً دور حاضر میں مادہ پرستانہ انداز تفکر کی بنا پر توجہات زندگی کے اقتصادی پہلو پر مر تک ہو گئی ہیں۔ اکثر تحریکیں اس مقصد کے تحت ابھر رہی ہیں اور اسی شعبہ زندگی کو سیاسی جدوجہد کا محور بنایا جا رہا ہے۔ لیکن جو افراد اور جماعتیں اس محدود مقصد کے لیے کام کرتے ہیں وہ صرف معاشی موضوع ہی پر گفتگو کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ انہیں بھی اس سے متعلقہ دوسرے بہت سے موضوعات زیر بحث لانے ہوتے ہیں، اگرچہ وہ اپنے اصل مقصد کو ہر وقت اجاگر کرتے رہتے اور اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھتے ہیں۔

لیکن قرآن کسی ایک شعبہ زندگی سے متعلق ہی رہنمائی نہیں دیتا۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری فکری و عملی اور انفرادی و اجتماعی زندگی پر اس کے تمام گوشوں اور جہتوں کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتا اور ان میں ربط قائم رکھتا ہے۔ ایک گوشہ زندگی دوسرے کا معاون ہوتا ہے لہٰذا جب ایک کو زیر بحث لایا جاتا ہے تو دوسرے کا حوالہ بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے اگرچہ اس پر اس سے قبل روشنی ڈالی جا چکی ہو۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ کوئی نئی تحریک یا انوکھے نظریے کا حال نہیں بلکہ اس میں پیش کردہ نظام فکر و عمل کی تاریخ حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اقوام اور زمانوں کی ضروریات کے مطابق شریعتیں اور ایک ہی جیسے اساسی نظریات اپنے انبیاء و رسل کے ذریعے

بھیجتا رہا ہے تا آنکہ انسان کے درجہ بلوغت تک پہنچنے پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قرآن کی شکل میں مکمل دین جسے ابد تک زندہ رہنا ہے، بھیج دیا گیا۔ یہ کتاب جہاں مابعد الطبیعیاتی مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جو اولاد آدم کی متجسانہ توجہات کا موضوع بنے رہے ہیں اور اپنی ادرا کی توانائیوں کی محدودیت کے مطابق جن کے عدم شعور کی وجہ سے انسان مختلف قسم کی بے راہ رویوں اور توہم پرستیوں کا شکار ہوتا رہا ہے، وہیں ارضی زندگی گزارنے کے لیے بھی صراط مستقیم کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے جملہ مباحث میں یہ ان دونوں میں ربط و تعلق قائم رکھتی ہے اور ساری کتاب میں ان دونوں دائروں سے متعلق نظریات کا تذکرہ اور ان کی وضاحت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔نیز ان کے تاریخی پس منظر کو بھی سابقہ انبیاء و رسل کے حوالوں کے ذریعے قارئین کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا جاتا۔

اس لیے قرآن میں حضور سے کہلوایا گیا:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (۹:۴۶)

ترجمہ : ان سے کہو کہ میں کوئی پہلا رسول تو نہیں ہوں۔

ہم ''منصب رسالت''کے باب میں آیت کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو ایک امت (یا ملت) قرار دیا ہے۔ یعنی تمام انبیاء و رسل ایک ہی سلسلے کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی دعوتوں میں ایک رنگی پائی جاتی تھی۔

مزید بر آں آیات (۷:۱۳) اور (۳۵ : ۲۴) کے حوالے دے کر یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ حضور کی بعثت سے قبل ہر قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ اس کے اسلام کی زمانی و مکانی عالمگیریت کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔

گویا اسلام کی ایک تاریخ ہے، لہٰذا ضروری ہوا کہ قرآن میں جس حد تک اس کتاب کے مضامین کا تقاضا ہو اس کے مطابق اس تاریخ سے حوالے دے کر انبیاء و رسل کی دعوتوں، مخاطبین کے رد عمل اور اس رد عمل کے عواقب کا تذکرہ کیا جائے۔ تاکہ موجودہ مخاطبین اس سے موعظت و عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ سابقہ انبیاء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا :

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (۱۲ : ۱۱۱)

ترجمہ: ان کی سرگزشت میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔

اگر ہم ناظرین کو قرآن کے مضامین کی نوعیت کے متعلق، سطور بالا میں، اجمالی بیان کے باجود، ایک تصور فراہم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو اس سے یہ قرینہ واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے گا کہ اتنے کثیر التعداد مضامین پر مشتمل کتاب میں جب یہ سب مضامین ایک مربوط نظام کے طور پر پیش کیے جائیں گے تو ان کی وضاحت کے سلسلے میں ایک موضوع کے بیان کے دوران دوسرے موضوع یا موضوعات کا مختلف اسالیب سے حوالہ دینا ایک قدرتی امر ہے ورنہ بہت سی جگہوں پر باتیں نامکمل رہ جائیں گی۔ اس سے یہ سمجھنا کہ یہ غیر ضروری تکرار ہے قرآن کے مضامین پر عدم تدبر کی دلیل ہے اور پھر یہ بھی غور طلب بات ہے کہ اگر قرآن میں (معاذاللہ) نامناسب حد تک تکرار ہے تو موضوعات کی اتنی کثیر تعداد میں اس نسبتاً چھوٹی سی کتاب میں کیسے سما گئی۔ یہ قرآن کا ایک واضح اعجاز ہے اور یہ خصوصیت اسے کلام الٰہی ہونے کی حیثیت ہی سے میسر آ سکتی ہے کہ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی انسان کو اچھے طور پر زندگی گزارنے کی ہے۔

مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں یہ بات بہت توجہ چاہتی ہے کہ قرآن بیک وقت تصنیف و تالیف کی ہوئی کتاب نہیں بلکہ مختلف ضرورتوں اور سوالات کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی نازل ہوتی تھی وہ حضور خطبات کی شکل میں مخاطبین کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ ہر وحی کے الفاظ کے لیے قرآن میں موقع و مقام کا حضور تعین فرما کر کاتب وحی کو ہدایت دیتے تھے کہ اسے ضبط تحریر میں لے آیا جائے۔ ہر وحی کے الفاظ کا تعین مقام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ موضوع اور مناسبت کے اعتبار سے وہی مقام موزوں ہو تا تھا۔

مسئلہ تکرار کے متعلق غلط اور بے سروپا اعتراض یا اشکال کی علت کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ انسانی عادت ہے کہ جو شخص کسی چیز یا مسئلے کو اہم سمجھتا ہے اس کا تذکرہ اس کے ذہن میں کسی گہرائی کے باعث نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس کو مذکورہ بات سے دلچسپی نہ ہو، بلکہ وہ اپنی ذہنی ساخت کی وجہ سے اس سے بدکتا ہو، اسے

کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہ ہو تو اس بات کو مختلف جہتوں سے واضح کرنے کا عمل اس پر گراں گزرتا ہے دور رواں میں حاضر و موجود اور فوری اور مادی نفع و نقصان کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن مابعد الطبیعیاتی مسائل جن کا وجود باری تعالیٰ، کائنات کی ابتدا و انتہا، انسان کے مقصد وجود اور اس کے حشر وغیرہ قسم کے معاملات متعلق ہے اور جو دائرہ محسوسات کے اندر نہیں آتے ایران محسوسات کی ان سے دلچسپی تقریباً ناپید ہو گئی ہے۔ مادہ پرستانہ انداز فکر نے انسانوں میں مغلیات سے اس قدر عقلی و مزاجی وابستگی پیدا کر دی ہے کہ وہ روحانیات و علویات پر توجہ صرف کرنا تضیع اوقات سمجھنے لگے ہیں۔ اس وجہ سے جب قرآن مختلف جہتوں سے وجود باری تعالیٰ حیات و ممات، معاد، اخلاقیات وغیرہ کے حوالے سے تربیت ازبان اور تزکیہ نفس پر زور دیتا ہے تو ایسے ذہن اپنی مخصوص ساخت کی وجہ سے اس قسم کی گفتگو سے متوحش ہوتے۔ انہی لوگوں کے متعلق قرآن نے کہا:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ(۳۰:۷)

ترجمہ : وہ اس دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل ہی بے خبر ہیں۔

ایسے لوگ جب قرآن میں ان موضوعات کا مختلف جہتوں سے تذکرہ دیکھتے ہیں تو نفس مسئلہ پر تو کم توجہ دیتے ہیں البتہ دوراز کار اعتراضات اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن ان باتوں پر زیادہ زور دیتا اور انفس، آفاق اور عقل و خرد کی توانائیوں سے استشہاد کر کے انہیں نئے نئے اسلوب سے بیان کرتا ہے۔ اس طرح وہ انسانوں کے انداز تفکر و تدبر کی تعمیر کرتا اور ان احکام کو جامعہ عمل پہنانے کے لیے ان کے اندر وہ صوابدیدی ذہن تشکیل دیتا ہے جو اسلامی تمدن کو وجود میں لانے سے متعلق ہیں۔ ایسے احکامات کو عام طور پر اجمالی طور پر اور اصولوں کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے اور ان کا نفاذ زمانی و مکانی احوال و ظروف کے مطابق امت کو اپنے اجتہادات کے مطابق کرنا ہوتا ہے۔ وہ اجتہادات اس صورت میں دینی روح کے مطابق ہوں گے جب ان اعتقادات کو امت کے افراد کے ذہنوں میں رسوخ حاصل ہو گا۔ جن کا تعلق کائنات اور انسان کی تخلیق و انجام سے ہے۔

قرآن میں کسی ایک ہی فریضے کا تذکرہ اس لیے بھی بار بار آتا ہے کہ ایک تو اس کا حکم دینا مقصود ہوتا ہے، اور دوسرے اس کے متعلق موقع و محل کے مطابق ہدایات دینا اور تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ میں اس کے کردار (Role) کو واضح کرنا پیش نظر ہوتا ہے مثلاً قرآن میں صلوۃ (نماز) کا کئی بار ذکر آیا ہے، لیکن اس کی اہمیت پر زور دینے کے علاوہ اکثر مواقع پر اس کی وجہ تذکرہ بعض اوقات تاکید (Emphasis) کے ایک جیسے الفاظ میں کیا جاتا اور بعض اوقات تذکرے کی غایت کوئی مخصوص وضاحت ہوتی ہے۔ تفصیلی گفتگو تو متعلقہ باب میں ہو گی۔ جہاں ہم صرف چند آیات کا حوالہ درج کر کے نماز کے ذکر کے سلسلے میں اشارات پر اکتفا کریں گے۔

آیت (۳۱:۱۴) میں حضور سے کہا گیا ہے کہ مومنوں کو قیام نماز کی تلقین کریں۔

آیت (۵ : ۶) میں نماز کے لیے وضو کا طریقہ اور جن جن حالتوں میں تیمم کیا جا سکتا ہے اور جس طرح کیا جائے گا اس کا تذکرہ ہے۔

آیت (۴ : ۴۳) میں (شراب کے) نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے (اس وقت تک ابھی حرمت شراب کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، بلکہ اس حکم کی قبولت کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا جا رہا تھا)

آیت (۴ : ۱۰۱) میں سفر اور جہاد کی حالت میں قصر کرنے کے سلسلے میں نماز کا ذکر ہوا ہے۔

آیت (۴ :۱۰۲) حالت جنگ میں نماز باجماعت ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

آیات (۱۷ : ۷۸)، (۱۳۰:۲۰)،(۴۰:۵۰) میں طلوع و غروب آفتاب اور دن رات کے حوالے سے نماز کے اوقات کا تذکرہ ہے جن کا تعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقات کے لحاظ سے کیا۔

آیت (۲۹ :۴۵) میں نماز کا اس حیثیت سے تذکرہ ہے کہ یہ برائیوں سے روکتی ہے۔

اسی طرح دوسرے معاملات میں آیات سے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کسی بات کو کیوں اور کس مقصد کے تحت دہرایا گیا

ہے۔ تفہیم و صراحت کے لیے اور مختلف سیاق و سباق میں ایک اصول، عقیدے، حکم، مسئلے اور قصص الانبیاء و اقوام سابقہ کو قرآن میں ایک سے زیادہ مرتبہ بیان کرنے کا کسی نے آج انکشاف نہیں کیا بلکہ اس حقیقت اور اس کی غایت کو قرآن نے خود ہی بیان کر دیا ہوا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۰۵:۶)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تا کہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جانا چاہیں۔

اوپر والا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی نے ''تدبر قرآن'' میں کیا ہے۔ ''تصریف آیات''کے معنی کے متعلق مفسرین کے اتفاق کو واضح کرنے کے لیے ہم مولانا ابوالکلام آزاد کا''ترجمان القرآن''میں کیا ہوا ترجمہ بھی درج کیے دیتے ہیں:

''اور (دیکھو) اس طرح ہم گوناگوں طریقوں سے آیتیں بیان کرتے ہیں (تاکہ حجت تمام ہو جائے) اور تاکہ وہ بول اٹھیں، تم نے (بیان حق میں کوئی کمی نہیں کی،سب کچھ) پڑھ سنایا۔ نیز اس لیے کہ جو لوگ جاننے والے ہیں ان کے لیے (دلائل حق) روشن کر دیں۔''

اسی طرح ''جامع البیان فی تفسیر القرآن''میں نصرف الآیات کا ترجمہ بینھا و نکرھا یعنی ہم اس کی وضاحت کرتے اور بار بار کرتے ہیں، لکھا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸ : ۵۴)

ترجمہ : اور دیکھو ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لیے ہر طرح کی مثالیں لوٹا لوٹا کر بیان کر دیں۔ مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

اوپر والا ترجمہ کر کے مولانا ابو الکلام تشریحاً یہ لکھتے ہیں:

''قرآن کا یہ اسلوب کیوں ہوا کہ ایک ہی مطلب بار بار دہرایا جاتا ہے اور مختلف موقعوں پر اور مختلف شکلوں میں ایک ہی بات لوٹ لوٹ کر آتی ہے ؟ ایسا نہ ہوا کہ ہماری علمی کتابوں کی طرح ضبط و ترتیب کے مطابق تمام مطالب مدون کر دیئے ؟''

''قرآن خود اس بات کو جا بجا آیتوں، مثالوں اور نصیحتوں کی ''تعریف'' سے تعبیر کرتا ہے، یعنی لوٹا لوٹا کر بیان کرنے سے۔ چنانچہ یہاں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور ان مقامات پر پر غور کرنے سے اس کے اسلوب بیان کی علت واضح ہو جاتی ہے۔''

''سورۃ اسرائیل کی آیت (۴۱) میں گزر چکا ہے: ولقد صرفنا في هـذا القـران ليذ كروا۔ یعنی قرآن کے مطالب کا لوٹ لوٹ کر بیان میں آنا اس لیے ہے کہ تذکیر و موعظت کا ذریعہ ہو۔ پس معلوم ہوا، اس اسلوب بیان کی علت تذکیر ہے۔ اس پر غور کرتے جاؤ قرآن کے اسلوب بیان کے سارے بھید کھلتے جائیں گے۔ قرآن کا مقصد تذکیر تھا۔ اور تذکیر کا مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ اسلوب بیان ایک واعظ و خطیب کی موعظت کا ہو۔ ایک فلسفی کے درس کا نہ ہو۔''

قرآن کو حضور کی تصنیف قرار دینے والوں کی تردید

وحی کو ناممکن الصدور قرار دینے والے مستشرقین اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یا کسی کی اعانت سے تصنیف کیا۔ اول تو ہم عرض کر چکے ہیں کہ قرآن معروف معنوں میں تصنیف ہے ہی نہیں۔ لیکن اگر ان لوگوں کو اس کے تصنیف شدہ کتاب پر اصرار ہے تو انہیں سوچنا چاہیے کہ جن لوگوں کو تحقیق و مطالعہ اور لائبریریوں کی تمام سہولتیں میسر ہیں اور وہ دنیوی علوم سے بھی بہرہ وافر رکھتے ہیں انہیں بھی کوئی کتاب تصنیف کرنے کے لیے، چاہے اس کا کچھ بھی معیار ہو، یکسوئی، سکون اور طمانیت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ غوروخوض اور تفکر و تدبر کر سکیں۔ پھر وہ اپنی تحریروں کے لیے نقشے بناتے ہیں اور ان پر مزید غورو فکر کر کے ترمیم و تنطیف کرتے اور خیالات کی تنظیم اور لسانی معیار کے سلسلے میں محنت کرتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ دوسرے اہل علم سے مشورے اور تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ بڑے بڑے صاحب قلم اور انشاء پرداز محض زبان دانی

(Semantic)کے ماہرین کی خدمات حاصل کرتے ہیں کہ وہ ان کی تصانیف پر لسانی صحت کے حوالے سے نظر ثانی کر دیں۔ ان کو اپنی تصانیف میں پیش کردہ مختلف موضوعات و نظریات سے متعلقہ لٹریچر دیکھنا ہوتا ہے، واقعات کی ثقہ کتب سے توثیق کرنا ہوتی ہے۔ سیاسی معالمات کے سلسلے میں قابل اعتماد سیاسی مفکرین کی تخلیقات سے رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اقتصادی مسائل پر ماہرین اقتصادیات کی تھیوریوں کا بنظر عمیق مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ غرضیکہ کوئی ایسی کتاب تصنیف کرنے کے لیے جو علمی حلقوں میں قابل اعتناء بھی جا سکے بڑی جانفشانی اور یکسوئی سے محنت کرنا پڑتی ہے۔

اب آپ سوچیں کہ قرآن کس قدر کثیر التعداد و مسائل پر گفتگو کرتا ہے۔ بہت سی باتیں ہم گزشتہ صفحات میں عرض کر چکے ہیں اور آئندہ بھی بہت سے ایسے مسائل کی نشاندہی اور وضاحت ہو گی جس پر قرآن نے راہنمائی فراہم کی ہے۔ اس کے بعد غور کیجئے کہ حضور نے ان میں سے کس موضوع پر تحقیق و مطالعہ کیا، کہاں ہے معلومات حاصل کیں، کس سے مشورہ کیا اور کس سے قرآن میں پیش کردہ مابعد الطبیعیاتی فلسفے اور اصول ہائے حیات کے متعلق استمدار کی۔

پھر آپ حضور کے تیرہ سالہ مکی دور کا دعوتی کام، اس کے رد عمل اور جن حالات سے آپ کو سابقہ پڑا، اس کا جائزہ لیجئے۔ تقریباً دو تہائی قرآن اس زمانے میں نازل ہوا۔ دعوت کے کام کے آغاز سے لے کر ہجرت کے روز تک ایک دن بھی چین سے آپ اعدائے اسلام کے ظلم و جور کے بغیر نہیں گزرا۔ حضور بھی متواتر نشانہ ستم بنے رہے اور جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کو انسانیت سوز ایذاؤں کا ہدف بنایا گیا حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے پہلے حبشہ اور بعد میں مدینہ کی طرف اپنا گھر بار اور چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حضور خود ایذاؤں کو تحمل و بردباری سے برداشت کرتے تھے لیکن صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تکالیف اور جس قسم کے عذابوں سے وہ گزر رہے تھے، آپ کے لیے وہ انتہائی کلفت کا باعث ہوتے تھے۔

(واقعات کسی قدر تفصیل سے باب بعنوان''اسلام تاریخ میں''میں بیان کیے جائیں گے) ایک لمحہ چین سے نہ گزرتا تھا، اگرچہ آپ جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک مبحث کے

دوران عرض کر چکے ہیں، بردباری و استقلال اور عزم و ہمت کا پیکر ہونے کی وجہ سے گھبراہٹ یا پریشانی کا اظہار اور حالات کی ناسازگاری کا کبھی شکوہ نہ کرتے تھے۔ آپ کی مستقل مزاجی مسلمانوں کے لیے صبر و حوصلہ کا باعث ہوتی تھی۔ آپ کو اپنے مقصد کی صداقت پر رسول اللہ ہونے کی حیثیت سے مکمل اور ناقابل تزلزل اعتماد تھا۔ آغاز دعوت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتا دیا تھا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۹۳:۴)

ترجمہ: اور بعد کا دور تیرے لیے پہلے سے بہتر ہوگا۔

صاحب تدبر قرآن اس آیت کی وضاحت کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''یہاں ''آخرۃ''اور''اولی''کے الفاظ میں دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عام مفہوم یعنی دعوت کے دور آخر اور دور اول یا اس کے حاضر و مستقبل کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔''

مقام تفکر ہے کہ کیا ایسے حالات میں ان اصول ہائے مہمہ کی بنیاد پر تصنیف و تالیف کا کام کیا جا سکتا ہے جن پر قرآن کے مکی دور کا حصہ مشتمل ہے۔ دراصل اسی دور میں ان عقائد و تعلیمات کا نزول ہوا جنہیں امت مسلمہ کے ان کائناتی تصورات کی تعمیر کرنا تھی جو ان کے تمدن کی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جو ان کے تزکیہ نفس، صفائی قلب اور تعمیر سیرت کا اصل ذریعہ ہیں۔ ان نظریات میں سے کسی ایک پر بھی تفکر و تدبر کے بعد اظہار رائے کرنا غیر معمولی وقت نظر کی متقاضی ہے۔ لیکن قرآن میں مکی دور ہی میں ان تمام نظریات کا ایک مکمل مربوط تصور پیش کر دیا گیا جو تمام ان مابعد الطبیعیاتی مسائل کو محیط ہے جن پر زمانہ قدیم سے آج تک عظیم فلاسفہ طبع آزمائی فرماتے رہے ہیں۔ اس کائناتی فلسفہ کے اصول گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران ان بلند پایہ علماء و حکماء کی ذہنی کاوشوں کا مرکز بنے رہے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور میں دنیا کی علمی رہنمائی کی ہے۔ کیا انسانی عقل یہ بات باور کر سکتی ہے کہ اسی معاشرے میں پرورش پانے والا ایک امی انسان کسی قسم کے علمی پس منظر کے بغیر یکلخت از خود ایسے ادق مسائل پیش کرنا شروع کر دے جو پردہ غیب کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں؟ اسی دوران سابقہ انبیاء ان کی امتوں اور جبارین وقت عبرت انگیز

تاریخی واقعات بھی بیان کیے گئے جن کی حقانیت کو آج تک کوئی چیلنج کر سکا۔ قرآن میں ایسے تاریخی حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا تذکرہ تو تاریخ نویسی کی نیت سے نہیں کیا گیا بلکہ عبرت آموزی کے نکتہ نظر سے کیا گیا تھا لیکن آثاریات (Archaeology) کے دور حاضر کی تحقیقات نے انہیں مبنی بر حقیقت پایا ہے اگر چہ نزول قرآن کے وقت وہ کسی تاریخ کی کتاب میں درج تھے اور نہ ایسی تاریخ کی کوئی کتاب اس وقت مو جود تھی۔

انہی تعلیمات و نظریات کے ذریعے اسی دور ابتلاؤ آزمایش اور مشکلات عظیم کے علی الرغم ایک معتدبہ انسانوں کی جماعت کو تربیت دے کر اس قابل بنایا گیا کہ وہ اسلامی تمدن کی بنیاد کا کام دیں اور تاریخ انسانی کے دھارے کا رخ بدل دیں۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں حضور کو اپنے وصال تک صرف دس سال کا عرصہ ملا۔ اس دور میں، جو قوموں، ملتوں اور تمدنوں کی تعمیر کے لیے ایک لمحے کی حیثیت رکھتا ہے، عبادات، معاملات، ارتفاقات، سیاست، معاشرت، قوانین جنگ و صلح، غرض یہ کہ ایک مکمل تمدن کو تشکیل دینے کے سلسلے کے تمام اصول قرآن کے تقریباً ایک تہائی حصے میں وحی کے ذریعے نازل ہوئے اور حضور نے اپنے اجتہاد اور وحی خفی کے ذریعے موصول ہونے والے احکامات کی روشنی میں ان تمام اصولوں کو تبیین و وضاحت کی اور مسلمانوں کے اذہان و قلوب میں پیوست کر کے ان کی سیرت و کردار کی ایسی تعمیر کی جس کی مثال انسانی تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی۔ کیا یہ سب اصول وضع کرنا اور ان کو نافذ کرنا فرد واحد کے لیے ممکن ہے ؟ یہ سبھی اصول ابدی صداقت و افادیت کے حامل ہیں اور اس دور میں دنیا کے کسی حصے میں ان کا ہلکا سا تصور بھی نہ پایا جاتا تھا۔ اس سارے کام پر اس صورت حالات کے پس منظر میں غور کیجئے جس کا حضور کو اندرونی سازشوں اور قریش مکہ کی سربراہی میں سارے عرب کے ساتھ جنگ و جدل کی شکل میں سامنا تھا۔

یہ سب باتیں اس امر کی ناقابل تردید تائید کرتی ہیں کہ قرآن جس کی رہنمائی میں حضور نے سطور بالا میں اشارۃً پیش کیا گیا دعوتی کام پایہ تکمیل تک پہنچایا، حضور کا تصنیف کردہ نہ ہو سکتا تھا بلکہ اس خالق کائنات وانس کی طرف سے نازل کردہ تھا جو انسانی فطرت کو تخلیق کرنے والا ہے۔ ابھی ہم نے یہ جو بات عرض کی ہے کہ اسلام اور قرآن کے سبھی

اصول ''فرد واحد ''وضع نہ کر سکتا تھا تو یہ بات خصوصی توجہ کے قابل ہے۔ قرآن و سنت میں پیش کردہ سبھی اصول و نظریات صرف اور صرف پیغمبر اسلام کے ذریعے انسان تک پہنچے۔ اس کام میں اجلہ صحابہؓ کا بھی ذرہ برابر دخل نہ تھا۔ مؤخر الذکر اور دوسرے سبھی مسلمانوں کا کام امنا وصدقنا کہہ کر حضور کی ہر بات پر چاہے وہ وحی قرآنی ہو یا حضور کی قولی و عملی حدیث و سنت، عمل کرنا تھا۔ اصول کے معاملے میں حضور کسی کے ساتھ کوئی مشورہ نہ کرتے تھے۔ اگرچہ ان اصولوں کے نفاق کے معاملے میں جب اللہ اور اس کا رسول مناسب سمجھتے تھے، مشورہ ہوتا تھا۔ حضور یہ مشورہ اللہ کے حکم کے تحت کرتے تھے، اور مسلمانوں کو اپنے امور و معالمات کو احسن طریق پر چلانے کی تربیت دینے کے لیے آپ اس کے پابند تھے۔ (۳ : ۱۵۹) مشاورۃ کی صورتوں کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔

قرآن کو حضور کی تصنیف قرار دینے کا مشغلہ مستشرقین ہی نے نہیں اپنا رکھا، بلکہ اس معاملے میں انہوں نے کفار و مشرکین مکہ کی تقلید کی ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنے کی ناکام کوشش اور غیر مسلموں کے دلوں میں قرآن کا درجہ کرنے کے لیے مؤخر الذکر یہ کہتے ہیں کہ حضور کسی سے سیکھ کر قرآن کی آیات لکھواتے ہیں۔ چنانچہ قرآن ہی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶ : ۱۰۳)

ترجمہ: اور ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک انسان سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے، اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔

قرآن نے دلیل محکم کے ساتھ اس کذب و افتراء کی قلعی کھول دی۔

اور پھر یہ سوچنے کی بات ہے کہ جس شخص نے حضور کو (نعوذ باللہ) قرآن سکھایا اس نے خود اسے تصنیف کر نے کیوں نہ نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

نیز اس الزام کو مضحکہ خیز قرار دینے کے لیے یہی بات کفایت کرتی ہے کہ حضور کے صحابہؓ دعوت کے آغاز سے حضور کے وصال تک ہر لمحہ آپ کی معیت میں رہتے تھے۔

آپ کی ہر ایک بات کو توجہ سے سنا جاتا تھا، آپ کی ہر حرکت کو بغور دیکھا اور سینوں میں محفوظ کیا جاتا تھا۔ آپ کی کوئی بات یا حرکت اخفا میں نہیں ہوتی تھی۔ کسی کے ساتھ آپ خفیہ ملاقات نہ کرتے تھے۔ آپ کے ہر قول و فعل کو دوسروں تک پہنچانا صحابہؓ کا فرض تصور کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ جب آپ اپنے گھر میں ہوتے تھے تو اہل خانہ کے کسی فرد پر یہ پابندی نہیں تھی کہ حضور کے کسی قول و فعل کو اخفا میں رکھے۔ تو کیا یہی ایک بات صحابہ میں سے کسی ایک کو بھی معلوم نہ ہو سکی کہ حضور قرآن کی آیات کسی عجمی سے سیکھتے ہیں اور اسے وحی الٰہی قرار دے کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کبھی گھر میں، کبھی مسجد میں، کبھی سفر کے دوران، کبھی ایسی حالت میں جب آپ کسی جانور پر سوار ہوتے تھے، غرض یہ کہ مختلف حالتوں اور ماحول میں نازل ہوتا تھا۔ کیا وہ شخص جس کے متعلق یہ کذب بیانی کی جاتی تھی کہ وہ حضور کو سکھاتا ہے، سائے کی طرح ہر وقت آپ کے ساتھ رہتا تھا؟

پھر یہ بات کیسے ممکن ہو گئی کہ تیئیس سال کے دوران آپ کسی دوسرے شخص سے قرآن کی عبارات سیکھتے رہے لیکن ایک تو اس میں ایک جگہ بھی تضاد بیانی نہیں اور دوسرے جس ترتیب سے حضور کاتبین وحی کو قرآن املا کرواتے تھے اسی ترتیب سے سارے نبوی دور میں اس کی تلاوت فرماتے رہے جب کہ آپ خود کتابت شدہ قرآن کو پڑھ نہ سکتے تھے۔ اس حقیقت کو نبوی معجزے کے علاوہ اور کسی بات کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے ؟

مزید برآں جب حضور یہودی اور عیسائی افراد یا وفود سے گفتگو کرتے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے تو بلا تکلف ان کے سامنے قرآن سے حوالے دے کر زیر بحث مسائل پر اسلام کا مؤقف واضح فرماتے تھے۔ کیا ایک سکھایا پڑھایا ہوا انسان محض اپنے حافظے کی بنیاد پر ایسا کر سکتا ہے، خصوصاً جب کہ یہ سکھانے پڑھانے کا عمل چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں سالہا سال کے عرصے میں پھیلا ہوا ہو؟

یہ بات بہت اہمیت کی مالک ہے کہ اللہ تعالیٰ خود قرآن ہی میں ان کفار و مشرکین کو جن میں بڑے بڑے شعراء جو نادر الکلامی میں شہرہ رکھتے تھے اور ایسے لوگ بھی جو مختلف اجتماعات، تہواروں اور حج کے موقع پر اپنی تقاریر کے دوران فصاحت و بلاغت کے جوہر

دکھاتے تھے شامل تھے، چیلنج دیا کہ تم میرے نبی کو کہتے ہو کہ آپ نے اس قرآن کو گھڑ لیا ہے تو اگر تم کچے ہو تو اس قرآن کی ایک سورہ کی ماند ایک عبارت لکھ کر پیش کرو:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (۱۰ :۳۸)

ترجمہ : کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے گھڑ لیا ہے ؟ ان سے کہو کہ تو تم لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو۔

جو چیلنج کی دور میں قریش کو دیا گیا تھا جو لسانی فصاحت بلاغت کے سلسلے میں سارے ملک عرب میں سب سے اونچا مقام رکھتے تھے، لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن کی تعلیمات اور اس کی لسانی فصاحت و بلاغت سے وہ اس قدر مرعوب تھے کہ انہوں نے اس چیلنج کو قبول کرنے کی کبھی جرات نہ کی چاہے بعد میں انہیں ہزیمت ہی سے دوچار ہونا پڑتا ۔ لبید شعرا جاہلیت میں بہت بلند درجے کا مالک تھا۔ اسلام لانے کے بعد اس نے شاعری ترک کر دی۔ کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگا مابعد القرآن۔ (کیا قرآن کے بعد اس کی گنجائش ہے؟)

ایک اور اہم بات جو قرآن کے من جانب اللہ ہونے اور حضور کی تصنیف نہ ہونے کے ثبوت میں دلیل محکم کے طور پر کہی جا سکتی ہے وہ قرآن کو باقاعدگی حضور کی ہدایت کے مطابق ضبط تحریر میں لانے اور حدیث کو حضور کی حیات طیبہ کے دوران باضابطہ طور پر لکھنے سے اجتناب کرنے سے متعلق ہے۔ قرآنی آیات بھی حضور کے دہن مبارک سے نکلتی تھیں اور احادیث کا بھی وہی منبع تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن اور حدیث کو الگ الگ رکھا گیا؟ پوری کوشش کی گئی اور احتیاط کا پہلو توجہ سے اختیار کیا گیا کہ قرآن میں حضور کی طرف سے ایک فقرہ یا جملہ بھی شامل نہ ہو جائے۔ اگر قرآن بھی حضور کی تصنیف تھی اور حدیث تو حضور ہی کے فرمودات پر مسلمہ طور پر مشتمل ہے تو ان کو یکجا کر دینے میں کونسی مصلحت مانع تھی؟ (حضور کی زندگی میں حفاظت حدیث و سنت کس طرح ہوئی،''اس کے متعلق ''حدیث وسنت''کے باب میں گفتگو کی جائے گی)

امیت رسول صلعم

مستشرقین چونکہ حضور کو مصنف قرآن قرار دیتے ہیں اور وحی کا انکار کرتے ہیں لہٰذا انہیں یہ دقت پیش آتی ہے کہ اگر حضور کو پڑھا لکھا نہ کہا جائے تو ان کی طرف تصنیف قرآن کیسے منسوب کی جا سکتی ہے۔

قرآن سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں حضور کو الرسول النبی الامی یعنی فی امی رسول کہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لفظ امی کی یہ توضیح کرتے ہیں:

''عربی میں امی ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو۔ لکھنے پڑھنے اور علم و فن کی باتوں سے آشنا نہ ہوا ہو۔ چنانچہ عرب کے باشندے بھی امی کہلائے کیونکہ تعلیم و تربیت سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔''

''پیغمبر اسلام کو بھی ''الامی''فرمایا: کیونکہ ظاہری تعلیم و تربیت کا ان پر سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔ جو کچھ تھا سرچشمہ وحی کا فیضان تھا۔'' (ترجمان القرآن جلد دوئم صفحہ ۳۸-۳۹)

صاحب تدبر قرآن نے آل عمران کی آیت ۲۰ کی وضاحت کے سلسلے میں لکھا ہے:

''امی، مدرسی و کتابی تعلیم و تعلم سے نا آشنا کو کہتے ہیں۔ امیین کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اسی پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''نبی امی''کا لقب استعمال ہوا ہے۔''

''جامع البیان فی تفسیر القرآن''میں آیت (۷ : ۱۵۷) کے سلسلے میں امی کا مفہوم ہے یہ لکھا ہے:

الذی لا یکتب ولا یقراء یعنی وہ شخص جو نہ لکھ سکتا ہو نہ پڑھ سکتا ہو۔

یوسف علی نے اپنی تفسیر میں آیت (۳ : ۲۰) کے ترجمے میں امی کا ترجمہ (Unlearned) کیا ہے اور (۷ : ۱۵۷) میں (Unlettered) کیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی حضور کی معروف قسم کی تعلیم یعنی لکھنے پڑھنے سے نا آشنا ہونے کی قوی دلیل ہے کہ آپ نے قرآن کا ایک لفظ بھی کبھی اپنے دست مبارک نہیں لکھا اگر حضور لکھنا جانتے تو نزول وحی کے وقت نازل ہونے والی آیات کبھی تو خود تحریر فرماتے۔ ہمیشہ یہی طریقہ رہا کہ جب وحی آتی تو کسی نہ کسی کاتب وحی کو بلایا جاتا۔ ان کی تعداد چالیس بتائی جاتی ہے اور ان کے نام تاریخ کی کتب میں بصراحت درج ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ پہلی وحی کے موقع پر جب حضرت جبریلؑ نے حضور سے کہا اقراء (پڑھئے) تو آپ نے جواب دیا ما انا بقاری (میں نہیں پڑھ سکتا)۔

قرآن حضور کے معروف قسم کی تعلیم و معلم سے لا تعلق ہونے کا یوں تذکرہ کرتا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۲۹ : ۴۸)

ترجمہ: اور تم تو اس سے پہلے نہ کوئی پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے مین میکھ نکالتے۔

ویسے لغت الفوائد الدریہ میں بھی امی کا ترجمہ (Illiterate) کیا گیا ہے۔

بعض مستشرقین کا یہ مؤقف ہے کہ حضور نے بعثت کے بعد لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

پروفیسر الفرڈ گام اپنی تصنیف اسلام میں لکھتا ہے:

"In passage of the Quran it seems to be implied that However an Muhammad not read till later in life early tradition says that he himself wrote on the day that the treaty was made at Hudaybia, and it is not at all likely that the prophet was content to rely on his associates to read a letter or, in his early days, a bill of lading. It is a poor compliment to call him the illiterate prophet, as some of his follows do." (Page ۵۷).

اس اقتباس میں لکھی ہوئی سب باتیں غلط اور خلاف حقیقت ہیں۔ قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں جس میں بالواسطہ طور پر حضور کے آخری عمر میں پڑھنا لکھنا سیکھنے کا ذکر ہو۔ یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے کہ حضور نے صلح حدیبیہ کا عہد نامہ اپنے دست مبارک سے لکھا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ حضور خطوط کے مندرجات اور کاروباری مال کی بلٹیوں (میں مال

کی تفصیلات) کے بارے میں دوسروں پر کیسے اعتماد کر سکتے تھے۔ دیکھئے ایک طرف تو ان بلٹیوں کے خود پڑھنے کا تذکرہ کرتا ہے جو بعثت سے قبل حضور کی تجارتی زندگی سے متعلق تھیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے اپنے ان دعاوی کی تائید میں ایک حوالہ نہیں دیا، حالانکہ اپنی علمی زندگی کے دوران وہ بہت سی مغربی اور مسلمان ممالک کی یونیورسٹیوں سے منسلک رہا ہے اور عربی اور اسلامی علوم کا اس کی خصوصی توجہ کے مراکز بنے رہے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مغربی مدعیان علم و عرفان محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن بذریعہ وحی وجود میں نہیں آیا بلکہ پیغمبر اسلام نے خود مرتب کیا، کیسی بے سروپا باتیں کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اور یہ لوگ اکثر اوقات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم یہ کتب مسلمان دانشوروں کے لیے لکھ رہے ہیں۔

ان میں سے بعض کا یہ طریقہ ہے کہ وہ وحی کا نام لیتے ہیں لیکن اس کو بھی حضوری کی تخلیق قرار دے کر گفتگو کرتے ہیں۔ مثلاً ایک فرانسیسی ماہر عمرانیات مستشرق مکسم راڈ نسن (Maxime Rodinson) نے اسلام اور سرمایہ داری کے نام

سے جو تصنیف شائع کی ہے اس میں وہ لکھتا ہے:

"Muhammad set up the authority of the monotheistic Revelation, which for him was reasonable, rational and unassailable, enjoying moreover, the prestige of its association with the great civilized states, with the world of culture, writings, books and scholars. He took up again, in order to defend it, the apologia of judaism and christianity, the themes of which, as developed by learned writers reached him by way of oral tradition. He naturally adopted the language of his opponents and their way of thinking...."(Page ۹۱).

مصنف نے غیر واضح الفاظ میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ نبی اسلام نے وقت کے مذہبی اور علمی رجحانات سے زبانی رابطہ کر کے اور بڑی بڑی مہذب ریاستوں کی ہمسری حاصل کرنے کے لیے (اپنی پیش کردہ) توحیدی وحی کا مقام متعین کیا۔ حضور کے دعوتی کام کی تاریخ سے ایسے تاثرات ملتے ہیں نہ ان کا نشان پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی علمی ثبوت (Authority) کے بغیر اپنے عزائم فاسدہ کے حصول کے لیے جو جی میں آئے اسلام

سے منسوب کر کے لکھے چلے جاتے ہیں، اور ان کی کتب لاکھوں کی تعداد میں دنیا کے کونے کونے میں پہنچتی ہیں اور غیر مسلموں کو اسلام کا تصور دینے کے علاوہ ان انگریزی خواندہ مسلمانوں کے اذہان کو جو اسلام کی اصل تعلیمات سے بے خبر ہوتے ہیں، مسموم کرتے ہیں۔

لیکن ایسی تحریروں سے علمی سطح پر ان کی مشکل حل نہیں ہوتی۔ اس سے قبل ہم نے حضور کے لکھنے اور پڑھنے کے فن سے نا آشنا ہونے کے ثبوت میں جو شواہد پیش کیے ہیں، اس کے علاوہ اوپر والی آیت (۲۹ : ۴۸) نازل ہوئی تو بعثت نبوت اور نزول قرآن کے آغاز کے بعد ہی ہوئی تھی اور یہ آیت کہتی ہے کہ نزول قرآن سے قبل آپ نے کوئی کتاب پڑھی اور نہ لکھی۔ تو گویا قرآن کی تصنیف آپ کے بس میں نہ تھی۔ اور پھر اذ الارتاب المبطلون کے الفاظ پر بھی غور کیجئے۔ ان الفاظ سے یہی مراد ہے کہ اگر آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہوتے تو یہ لوگ تصنیف و تالیف قرآن کے سلسلے میں شکوک و شبہات پیدا کر سکتے تھے ، لیکن کے لکھے پڑھے نہ ہونے کی وجہ سے اب وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

ایک اہم تاریخی واقعہ یاد کیجئے۔ صلح حدیبیہ ۶ھ میں ہوئی۔ جب معاہدہ صلح حدیبیہ لکھا جا رہا تھا تو حضرت علیؓ نے، جو معاہدہ لکھ رہے تھے، محمد کے ساتھ رسول اللہ لکھ دیا اس پر سہیل بن عمرو، نے جو قریش مکہ کی طرف سے ان کے نمائندے کی حیثیت سے معاہدہ کر رہا تھا، کہا کہ اگر ہم محمد کو رسول تسلیم کر لیں تو جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے آپ نے کہا کہ ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دیے جائیں۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا: ''میں تو یہ جسارت نہیں کر سکتا۔'' حضور نے فرمایا مجھے بتاؤ رسول اللہ کے الفاظ کون سے ہیں، میں خود مٹاتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اگر حضوربعثت کے انیس برس بعد تک جب کہ معائدہ حدیبیہ ہوا، الفاظ کی شناخت تک نہیں کر سکتے تھے تو آپ نے لکھنا پڑھنا کب سیکھا۔ اس واقعہ کے چار سال بعد حضور کا وصال ہو گیا۔

اس طرح کی باتیں اختراع کر کے مستشرقین سچائی اور دیانت کا منہ چڑاتے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہے کہ کوئی بے پڑھا لکھا انسان قرآن جیسی اونچے پائے کی کتاب جس کی تعمیل میں تیئیس سال صرف ہو گئے، کس طرح اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکتا ہے، اور وہ معمولی سے معمولی تضاد سے بھی بالکل مبرا ہو۔ موضوعات کی ضرورت کے مطابق جگہ جگہ

انبیاء سابقہ کا تذکرہ ہے لیکن ان میں بھی مختلف تذکروں میں زبانی بعد کے باوجود کوئی نظریاتی یا واقعاتی تضاد نہیں۔ اوامر و نواہی میں کوئی تفاوت نہیں۔ ان سب حقائق کی روشنی میں عقل سلیم کا مالک اور قبول حق کا رجحان رکھنے والا ہر انسان اسی نتیجے میں پہنچتا ہے کہ یہ سب کچھ فیضان الٰہی کا نتیجہ تھا۔ محض انسانی قدرت و استعداد اس درجہ کمال کو حاصل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۸۲ : ۴)

ترجمہ: کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہو تا تو اس میں وہ بڑا اختلاف پاتے۔

منکرین وحی غلط باتیں گھڑتے ہیں لیکن بات بنتی نہیں۔ البتہ اصل صورت حال سے ناواقف لوگ چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ان کی اس مہم سے وسوسوں، مغالطوں اور شک وریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اپنی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے مشرکین مکہ کے پیش نظر بھی یہی مقصد تھا اور گیارہویں صدی عیسویں سے پادری اور مستشرقین اسی مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں ہیں۔ (تفصیلات اور حوالہ جات ''مستشرقین'' کے باب میں دی جائیں گی) گویا یہ سب مذموم کاوشیں مادہ پرستوں کی طرف سے نظریہ وحی کے بطلان کے لیے اور عیسائی پادریوں کی طرف سے قرآن کی من جانب اللہ ہونے کی تردید میں کی جا رہی ہیں۔ قرآن تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہے (۱۵ : ۹) مسلمان داخلی و خارجی نظریاتی حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے اندر جتنی دفاعی استعداد پیدا کریں گے ان کے ایمان اسی نسبت سے محفوظ رہیں گے۔ اور یہ کام منفی ذرائع سے نہیں بلکہ مثبت قسم کے تعمیری کام سے ہو گا۔

قرآن میں محکمات و متشابہات

قرآن کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (۳:۷)

ترجمہ: وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو دراصل کتاب (اور اس میں بنیاد) کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تو جو علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں اور یاد دہانی تو اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔

سابقہ مباحث میں جہاں کہیں بھی موضوع کی مناسبت سے ضرورت محسوس ہوئی ہے ہم یہ بیان کرتے رہے ہیں کہ قرآن میں حیات انسانی کے لیے مکمل دستور العمل بھی دیا گیا ہے جس میں عبادات، اخلاقیات، معاملات ارتفادات و معیشت، سیاسیات معاشرت، بین الاقوامی اور صلح و جنگ کے قوانین اور بہت سے اوامرو نواہی دیے گئے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی ساری مضمرات و تضمنات کے ساتھ انسان کی ذہنی گرفت میں آسکتی ہیں اور وہ ان پر عمل پیرا ہونے میں کوئی دقت محسوس نہیں کر سکتاکہ ان باتوں کے علاوہ مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بھی اس حد تک روشنی گئی ہے جس حد تک وہ انسانی ذہن کی گرفت میں آسکتے ہیں، تاکہ اس کی اس متجسانہ خواہش کی تسکین ہو جائے جس کے لیے فلاسفہ ہمیشہ سے بے نتیجہ ذہنی کاوشیں کرتے رہے اور انبیاء و رسل کی دعوتوں سے انحراف کرنے والے مختلف قسم کی گمراہیوں اور توہم پرستیوں میں بتلا ہوتے رہے۔

پہلی قسم کے معاملات کو درج بالا آیت میں محکمات کہا گیا ہے اور دوسری کو متشابہات۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر ضروری اور اہمیت کی مالک ہیں۔ قرآن میں کوئی چیز فالتو اور بلا ضرورت بیان نہیں کی گئی۔ جن باتوں کو قرآن میں متشابہات کے زمرے میں رکھا گیا ہے وہ خلاف عقل نہیں اور نہ قاری کو کسی شک و شبہ یا ذہنی مخمصے میں ڈالتی ہیں بشرطیکہ

حقیقت پسندی سے کام لیا جائے۔ ان کا تعلق انسان اور اس کی روح کی تخلیق(۳:۶) (۱۷: ۸۵) کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے مراحل تخلیق (۱:۶) (۵۴:۷) (۱ : ۷) اور اس عالم کے انجام کے سلسلے میں پیدا ہونے والے سوالات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اپنے رسول کے ذریعے ان باتوں کے متعلق اطلاع دے دی کہ میں تمہارا اور اس ساری کائنات کا خالق و مدبر(۱۰ : ۳)، (۲۵:۲) ہوں، میری طرف ہی سب کو واپس آنا ہے (۱۰ :۴)، میں تمہاری ہدایت کے لیے وحی کے ذریعے اپنے چنے ہوئے ان بندوں کی طرف جنہیں میں رسول اور نبی کہتا ہوں، زندگی کا لائحہ عمل بھیجتا ہوں(۱ : ۳۶)۔ یہ دنیا کارگاہ امتحان و آزمائیش ہے (۲ : ۱۵۵) اور اس کے بعد مکافات عمل کے لیے معاد کا انعقاد ہو گا اور وہاں اعمال کی جزاء و سزا (۳ :۳۰) دی جائے گی۔

انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کا احاطہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کو کسی چیز کی تخلیق، اس میں تغیر و تبدل، اس کے وجود کو ختم کرنے کے لیے کسی قسم کی محنت و کاوش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تدبیر کائنات میں اسے کسی کی مدد کی حاجت نہیں۔ ہم اس کے کاموں، اور اس کے لامتناہی اختیارات کو زیر غور لانے سے بھی عاجز ہیں، کیونکہ محدود قوتوں اور استعدادوں کی مالک مخلوق کے ذہن میں لامتناہی قوتوں کی مالک ہستی کی ذات اور اس کی صفات نہیں سما سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹی سے آیت میں اپنے لامحدود اختیارات کو یوں بیان کیا ہے:

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۴۰:۱۶)

ترجمہ : جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کوئی چیز پیدا کریں تو اس کے سوا ہمیں کچھ کہنا نہیں ہوتا کہ کہہ دیتے ہیں"ہو جاؤ" اور بس وہ ہو جاتا ہے۔

ہم نے اس آیت کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے"ترجمان القرآن" سے نقل کیا ہے اور انہی کی وضاحت ذیل میں درج کرتے ہیں:

"وہ کسی چیز کے ظہور میں لانے کے لیے نہ تو کسی سروسامان کا محتاج ہے نہ کسی دوسری ہستی کی موجودگی کا۔ صرف اس کا ارادہ ہی ہر طرح کی علت ہے۔ ہر طرح کا سروسامان ہے، ہر طرح کا مواد ہے وہ جب چاہتا ہے کہ ایک چیز ظہور میں آ جائے تو بس

اس کا جی چاہتا ہے سب کچھ ہو جائے تو جونہی اس کی مشیت کا فیصلہ ہوا، ہر چیز ظہور میں آگئی۔"

"یاد رہے کہ "ان یقول له کن" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عربی کا لفظ (کن) جوک اور ن سے مرکب ہے، بولنے میں آتا ہے۔ یا کلمہ خطاب و امر کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ چیزیں وجود میں آجاتی ہیں بلکہ صاف مطلب یہ ہے کہ صرف اس کا ارادہ تخلیق کے لیے کافی ہے۔ اور اس کی قدرت کا یہ حال ہے کہ جس بات کا حکم دے دیتا ہے، وہ حکم کے مطابق ظہور میں آجاتی ہے۔ وہ اپنے ارادہ و حکم کے نفاذ میں کسی دوسری کا محتاج نہیں۔"

اس صورت حال کو تصور میں لائیں اور پھر سوچیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور حکمتوں کے بیان کے لیے قرآن کی اصطلاح تشابہات کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ہو سکتا تھا۔

تشابہات کے سلسلے میں ان سب باتوں میں کوئی بھی بات خلاف عقل و دانش، شعور عام (Common Sense) اور عدل و انصاف کے تقاضوں کے مخالف نہیں۔ البتہ حسیات اور غورو تفکر کی جو محدود صلاحیتیں انسان کو دی گئیں ہیں اور جس نوعیت کی ہماری عنصری ساخت ہے ان کے تحت ہم اس بات سے عاجز ہیں کہ تشابہات کے ذریعے بیان کیے ہوئے حقائق کا ہم کلی ادراک کر سکیں چنانچہ فرمایا:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷ : ۸۵)

ترجمہ: اور تمہیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے۔

اس لیے ہمیں ان کا اس قدر تصور اور علم دے دیا گیا ہے جس کو ہم تصوراتی اور عقلی گرفت میں لا سکتے ہیں اور وہ مطلوبہ کائناتی نظریہ قائم کرنے اور خالق و مخلوق کا تعلق سمجھنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے اذہان کی سطح اور معیار کے مطابق تمثیلات کے ذریعے ہمیں ان باتوں سے آگاہ کر دیا گیا ہے تاکہ ہمیں ان باتوں کے جوابات مل جائیں جو ہمارے اذہان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن عقل و خرد کی کاوشوں اور منطقی استدلالات کی وساطت سے ہم ان کا کوئی جواب نہیں پا سکے۔ بے داغ کردار اور اخلاق حسنہ سے مزین پیغمبروں کے ذریعے عالم غیب کے یہ حقائق جان لینے کے بعد انسان اپنے اور اس کائنات کے

وجود میں آنے اور اس کے انجام کے متعلق مطمئن ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اس کے اندر طلب ہدایت کی تڑپ پائی جاتی ہو۔

اسے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ایک اخلاقی بنیاد بھی مہیا ہو جاتی ہے جو اسے دوسرے حیوانوں سے ممیز کرتی ہے، اور اس کے سفر زندگی کا رخ بھی متعین ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر یہ اخلاقی بنیاد مہیا ہونے کی کوئی صورت نہیں، ویسے قرآن میں اخلاقیات کا درس تفصیلاً دے دیا گیا ہے اور وہ محکمات کے زمرے میں آتے ہیں۔ توحید اور معاد کے تصورات ان کے لیے قوت محرکہ فراہم کرتے ہیں۔

آیئے اب ہم محکمات و متشابہات کے فرق کے استدلال کا ایمانیات کے حوالے سے جائزہ لیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم وحی کے تصور اور رسالت کے منصب کو بر سرحق سمجھتے ہیں تو ہر اس بات پر ہمیں ایمان لانا پڑے گا جو رسول بیان کرتا ہے کیونکہ رسول اور ہم میں یہی فرق کہ ایک تو اس کا بذریعہ وحی خالق کائنات وانس سے تعلق ہے، اور یہ بات ہمیں میسر نہیں، اور دوسرے اپنے سارے معاشرے میں وہ قبل از بعثت بھی اپنی صداقت و دیانت اور سیرت و کردار کی وجہ سے مسلمہ طور پر ممتاز حیثیت کا مالک ہوتا ہے جیسا کہ ہم ''منصب رسالت'' کے باب میں عرض کر چکے ہیں لہٰذا چالیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس کے دعوائے نبوت اور اس کی بیان کردہ غیب کی باتوں کو جھٹلانے کے لیے کسی کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا، خصوصاً جب کہ وہ اپنے اخلاق حمیدہ کا بھی بدستور مظاہرہ کرتا رہے اور اس کی روش اس بات کی واضح شہادت فراہم کرتی ہو کہ بعثت کے بعد اس میں ہوس اقتدار، خواہش سیم و زر اور اپنے پیش کردہ اصولوں سے معمولی سا انحراف کرنے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی اگرچہ اس کو انتہائی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس کے برعکس اس نے اپنی ساری زندگی اور توانائیاں دعوتی کام کی نذر کر دیں۔ جہاں تک محکمات کا تعلق ہے ان کی حقانیت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے تحت اس نے جو نظام و تمدن برپا کیا ہے وہ عدل پر قائم ہے یا نہیں جس میں انسانوں کی انفرادی و اجتماعی فلاح اور ان کی خودی و تقویٰ کی نمود و پرورش کی ضمانت مہیا ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ محکمات کا شعور و ادراک کرنا انسان کی قوت مدرکہ کے دائرے میں آتا ہے، لیکن متشابہات کو بھی یونہی بیان نہیں کر دیا گیا بلکہ قرآن میں ان کے برسر حق ہونے پر دلائل دیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ لیکن قرآن اور رسول نے ہمیں اس کے وجود کا یقین اس کی صفات اور انفس و آفاق کی نشانیوں کی شہادت کے ذریعے سے دلایا ہے۔ قرآن کا ایک اچھا خاصا حصہ توحید کے موضوع پر مشتمل ہے اور اس میں عقل و دانش انسانی کو استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسی طرح وحی و رسالت کے مسائل ہیں جن پر ہم قرآن کی آیات اور دوسرے حوالہ جات کی روشنی میں گفتگو کر چکے ہیں۔ پھر قیامت و معاد اور جزاء و سزا کا تصور ہے۔ انسان کو عدل وانصاف کا واضح شعور رکھنے کی بنا پر اس مسئلے کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ ہم ''اسلامی فکر'' کے باب میں مسئلہ ارتقاء کی بحث کے سلسلے میں اس خیال کے خلاف عقل ودانش ہونے کے پہلو کو واضح کر چکے ہیں کہ چند سالہ ارضی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی انسان کی منازل ارتقاء کا سلسلہ بھی تمام ہو جائے گا۔ (مزید گفتگو معاد کے عنوان کے تحت ہوگی)

اگر قرآن کی اصطلاحات ''محکمات و متشابہات'' کے مفہوم کو ذہن کر لیا جائے تو انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ متشابہات محکمات کو روبہ عمل لانے کے لیے اساس کا کام دیتی ہیں اور مؤخر الذکر کے بغیر اول الذکر انسانی زندگی کے حوالے سے ایک بے نتیجہ ذہنی کاوش ہے۔ اس لیے اس بحث کے آغاز میں جو آیت قرآنی نقل کی گئی ہے اس میں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ قرآن اور اسلام کے معاملے میں جویان فتنہ کی روش یہ ہے کہ وہ متشابہات کو اپنے عزائم بد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور محکمات سے ان کا تعین جوڑنے کے بجائے انہیں الگ کر کے (In Isolation) مرکز توجہ بنا کر ان کی حقیقت تک نہ پہنچ سکتے کو وسوسے پھیلانے کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی ان لوگوں کا انکشاف نہیں کہ متشابہات کی حقیقت اور کنہ کو سمجھنا اور اس کا ادراک کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی واضح کر دیا ہے۔ البتہ یہ خلاف عقل نہیں بلکہ انسان کو جس ذریعے کی عقل و فہم

اور حسیات عطا کی گئی ہیں وہ انکی پہنچ سے ماورا ہیں۔ ٹیڑھے ذہن کے لوگ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر یہ صورت ہے تو ان کے تذکرے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ فکری توانائی تو بخشی ہے کہ وہ ان معاملات کے سلسلے میں مجسم سوال بنا رہے، لیکن ان کی حقیقت اس کی رسائی سے باہر ہے۔ دوسرے ان کے متعلق کوئی نہ کوئی مثبت یا منفی نظریہ قائم کیے بغیر وہ اپنی ارضی زندگی کو سرے سے استوار کرہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اسلام اس کو مثبت نظریہ دیتا ہے کیونکہ اسی صورت میں حیات انسانی کو فطرت کے مطابق منظّم کیا جا سکتا ہے۔ منفی نظریے سے فساد ہی پھیلتا ہے۔

ملحد، دہریے اور لاادریت کی بیماری میں مبتلا مستشرقین متشابہات پر بہت توجہ دیتے ہیں اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ جن کے دل میں کجی ہے وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اسلام کی جملہ تعلیمات ایک کل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر ایک اصول و نظریے کا ہر دوسرے اصول اور نظریے سے تعلق ہے۔

حضور کی حدیث ہے:

وعن عائشة قالت تلا رسول الله صلى الله عليه وسلم هو الذي انزل عليك الكتاب منه ايات محكمات وقراء الى وما يذكر الا اولوا الألباب قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذا رايت وعند مسلم رايتم الذين يتبعون ما تشابه منه فاؤلك الذ ين سماهم الله فاحذروهم (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت قرآنی پڑھی جو شروع ہوتی ہے۔ هو الذى انزل عليك الكتاب منه محكمات (سے) وما يذكر الا اولا البـاب (تک) حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تو دیکھے اور مسلم میں ہے کہ جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو ان آیات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جو متشابہات میں کے پیچھے پڑتے ہیں (تو سمجھو) کہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو مسموم کر دیا ہے اور ان سے دور رہو۔ (اس میں مذکور قرآنی آیت (۳:۷) ہے) جہاں محکمات کا صحیح تصور قائم کرنے کے لیے ان پر غوروتدبر کرنا اور اپنی عقل و خرد کی تمام قوتیں صرف کرنا ضروری ہے تاکہ انہیں اس طرح جامہ عمل

پہنایا جائے جس طرح حضور کے اسوہ حسنہ سے رہنمائی ملتی ہے۔ وہیں متشابہات سے متعلقہ آیات کو نکتہ نظر سے نہیں پڑھنا چاہیے کہ یہ تو ہماری سمجھ سے بالا ہیں لہٰذا ان پر غور و تدبر کی ضرورت نہیں۔ یہ طرز عمل بالکل غلط ہو گا۔ صحیح زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ہم ان کی حقیقت تک تو نہیں پہنچ سکتے لیکن جس مقصد اور جن الفاظ میں انہیں بیان کیا گیا ہے ان پر اپنے عقائد کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لیے پورا تفکر کیا جانا چاہیے۔ مثلاً اگر توحید و معاد کے متعلق غلط تصورات قائم کر لیے جائیں تو دوسری گمراہیوں کے علاوہ شرک میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے، جیسا کہ پیشہ ور مذہبی طبقہ نے اپنی روش سے ثابت کر رکھا ہے اور جیسا کہ مادہ پرستوں نے اپنی عارضی و تفوق کی وجہ سے انکار توحید و معاد کر کے دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ (ان موضوعات پر متعلقہ ابواب میں تفصیلی گفتگو ہو گی) لہٰذا محکمات و متشابہات دونوں ہی یکساں توجہ کے مستحق ہیں، اگرچہ ان پر تدبر کرنے کے دوران ذہنی طرز عمل مختلف ہو گا جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

قرآن فہمی کے راستے کی رکاوٹیں

ہم مختلف مواقع پر عرض کر چکے ہیں کہ قرآن بھی محفوظ ہے، حضور کا اسوہ حسنہ بھی محفوظ ہے۔ لہٰذا اسلام کے اصول واضح ہیں ان میں کسی قسم کا التباس یا الجھاؤ نہیں ہم امت مسلمہ کی حیثیت سے اگرچہ اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم جس طرح اجتماعی سطح پر انتشار کا شکار ہیں، اسی طرح ذہنی و فکری طور پر بھی تفرقہ بازی اور پراگندگی کی زد میں ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ اصولوں اور اساسات دین کو نظر انداز کر کے ہم رات دن فروعات پر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے کے مشغلے میں مصروف ہیں، نوبت بایں جا رسید کہ بعض پیشہ ور لوگ سنگدلی کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ اگر کہیں مسلمانوں کی کوئی آبادی معمول کی رسم اور بے روح صوم و صلوۃ امن و چین کے ماحول میں ادا بھی کر رہے ہوں تو وہ وہاں بھی پہنچ کر ان کو افتراق و مخالفت اور دھڑے بندیوں اور فرقہ سازیوں پر اکسا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مسلمان تضحیک اغیار کا ہدف بنتے ہیں اور دوسری طرف ان کے اپنے اندر کے بعض لوگ دین کی تعلیمات اور مسلمانوں کے طرز عمل میں امتیاز نہ کرنے کی

وجہ سے دین سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہنگامہ آرائیوں میں اصول دین یا دوسرے لفظوں میں قرآن و سنت کی طرف متوجہ ہونے کی کسے فرصت ہو سکتی ہے۔ قوموں، ملتوں اور تمدنوں کی تاریخ عروج و زوال اس بات کی شاہد ہے کہ اپنے اپنے نظریات و مقاصد کے مطابق جب ان کے پیش نظر اصول ہائے صمہ کا نفاذ ہوتا ہے تو انہیں فروعی مسائل کو وجہ تشتت وافتراق بنانے کی فرصت ہی نہیں ہوتی، لیکن وہ اپنے ادوار انحطاط میں مؤخر الذکر مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اول الذکر مشغلہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو کر متروک ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضور کی حدیث ہے:

عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المراء في القـرآن كفر(رواه ابوداود واحمد)

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کے مطلب کے سلسلے میں جھگڑنا کفر ہے۔

ہمارے اندر دین کے نام پر جو جھگڑے برپا ہیں ان کی حیثیت کے متعلق اس حدیث کی روشنی میں رائے قائم کرنی چاہیے۔

سیاسی سطح پر مسلمانان عالم اس وقت پچاس سے زیادہ ریاستوں میں منقسم ہیں۔ اور ایک ریاست بھی ایسی نہیں جہاں اسلام فکر و نظام کے دائروں میں نافذ ہو، نہ ہی ان میں اشتراک عمل ہے، نہ ہی ان میں کوئی ایسی ریاست ہے جو بڑی طاقتوں کے اثر و نفوذ سے آزاد ہو۔

ہماری اس زبوں حالی کے متعلق توجیہات پیش کی جاتی ہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال کی وجہ اسلام کے ساتھ زبانی وابستگی کے باوجود فکر و عمل کے دائروں میں قرآن و سنت سے ہماری بے رخی اور ہمارا انحراف ہے۔ حدیث و سنت کے متعلق تو ہم الگ باب میں گفتگو کریں گئے ، یہاں ہم فہم قرآن کے بارے میں ہمیں جو رکاوٹیں در پیش ہیں ان کی وضاحت کر رہے ہیں۔

قرآن کے ہر طالب علم کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے ذہن کو اس بارے میں صاف کر لے یہ کتاب دوسری مذہبی کتابوں کی طرح رسمی عبادات، پوجا پاٹ اور توہم پرستی

پر مبنی کائناتی تصورات پر مشتمل نہیں ہے۔ نہ ہی حصول تقدس کے لیے بے سوچے سمجھے تلاوت کرنے کے لیے ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ ایک تدریج کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی دعوتی ضروریات اور اس سلسلے کے مختلف مراحل کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوتی رہی، حتیٰ کہ اس کی تکمیل کے ساتھ اقامت دین کا کام بھی مکمل ہو گیا۔ اس کام کا سب سے پہلا مرحلہ جیسا کہ مکی سورتوں کے مضامین سے ظاہر و باہر ہے، نظریہ توحید کی بنیاد پر اور اپنے اعمال کی جوابدہی کے تصور کے تحت کی تعمیر فکرونظر اور تزکیہ نفس سے متعلق ہے۔ جوں جوں یہ کام آگے بڑھتا گیا ایک پورے تمدن کو وجود میں لانے کے کام میں پیش رفت ہوتی ہو گی۔ یہ ایک نہایت طویل اور صبر آزما جدوجہد تھی جس کے دوران حضور کو بہت سے نشیب و فراز سے واسطہ پڑا۔ ہر مرحلے پر قرآن کے مختلف اجزاء نازل ہوتے رہے اور حضور ان کی تبیین اور اپنے اجتہاد اور صحابہ کے مشورے کے ذریعے ان اجزائے قرآن کی وساطت سے موصول ہونے والے احکامات کو نافذ کرتے رہے۔

اس صورت حالات کا نتیجہ تھا کہ قرآنی احکامات اور مسلمانوں کے اعمال میں موافقت کی وجہ سے اس دور کے مسلمان، اس صحیفہ آسمانی کی تعلیمات کی روح اور ان کی غایت کو پوری طرح سمجھ لیتے تھے، حالانکہ وہ ایک امی معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن قرآن کے متعلق ہمارا نکتہ نظر بالکل مختلف ہے۔ ہم اس کو اس مقصد کے لیے استعمال ہی نہیں کر رہے جس مقصد کے لیے یہ نازل کیا گیا تھا۔ نہ اس مقصد کا ہمارے اذہان میں کوئی شعور ہے۔ حالانکہ اگر قرآن کی تعلیمات کے تعلیم و تعلم کا صحیح طریق سے انتظام کیا جائے تو حضور نے جس طرح ہمارے سامنے اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے سے قرآنی تعلیمات کی عملاً تصویر کشی کر دی ہے اس سے ہمارے لیے اس کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ قرآن و سنت سے حصول ہدایت کا طریق کار بھی متعین کر دیا گیا ہے۔ قرآن ہر مسلمان کی پہنچ میں ہے۔ پانچ وقت نماز کے لیے مسجدوں میں محلّہ دار اجتماع اور درس قرآن کے علاوہ ہفتے میں ایک بار خطبہ جمعہ کا فریضہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا کر مسلمان عوام میں چاہے وہ تعلیم یافتہ ہوں، نرے خواندہ ہوں یا لکھنے پڑھنے سے نابلد ہوں، ہر ایک کی ذہنی استعداد کے مطابق قرآن کی تعلیمات کا شعور پیدا

کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ عام طور پر قرآن ہی کو خطبات جمعہ میں نظر انداز کیا جاتا ہے اور اگر کوئی قرآنی آیت پڑھی بھی جاتی ہے تو اس کو پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ اس سے سامعین کوئی استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خطیب حضرات نے خود جن دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہوتی ہے وہاں کے نصاب کی بنیاد قرآن نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور ہی چیزوں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ایسی مباحث تکمیل کے ساتھ اپنے اپنے موقع پر آئیں گی، یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن فہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ، ان عوامل نے فراہم کر رکھی ہے جس کا ہم نے سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے، اور ان کا نچوڑ یہ ہے کہ ہم قرآن کی طرف وہ توجہ نہیں دے رہے جس کا وہ مستحق ہے، حالانکہ وہ فہم دین کے لیے اسوۂ رسول کی روشنی میں اسلام کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے درج ذیل رباعی میں مسلمانوں کی مجبوری اور طرز عمل کی یوں صراحت کی ہے:

بہ بند صوفی وملا اسیری
حیات از حکمت قرآن نگری
بایاتش ترا کاری جزایں نیست
کہ از ''یٰسین'' او آسان بمیری

ارمغان حجاز صفحہ ۱۰۱

ہم نے اس سے قبل قرآن کے تدریجی نزول اور اس کی حکمتوں پر جو گفتگوئیں کی ہیں ان سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی، اور اس سے یہی منطقی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فہم قرآن کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کو اس کے تابع کرنے کا ارادہ کیا جائے، اور اس نے اس ارضی زندگی میں جس مقصد و منزل کی نشاندہی کی ہے اس کے حصول کے لیے کوشاں ہوا جائے۔ اس سعی و جہد کے دوران ہی ہر مرحلہ سفر پر جب ہم رہنمائی کے لیے قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے تو اس کی تعلیمات کی اصل حکمتیں ہم پر منکشف ہوتی جائیں گی۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ زندگی کے کسی مسئلے سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے مناسب فکر اسی وقت ذہن میں پیدا ہوتا ہے جس وقت انسان

اس مسئلے کو حل کرنے کا عزم رکھتا ہو اور اس کے لیے عملی اقدام کرے گھر میں بیٹھے بیٹھے مسائل حیات کے اسرار سے آگاہی ناممکن ہوتی ہے۔ ہم اول تو قرآن کو سمجھ سوچ کر پڑھتے ہی نہیں اور جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے۔

''قرآن مجید میں واضح طور پر آیات میں غورو فکر اور تفکروتدبر کو ضروری قرار دیا ہے اور اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس میں محض حصول برکت و ثواب کی خاطر تلاوت کا کوئی تصور بھی نہیں پایا جاتا'' (مبادی تدبر حدیث صفحہ ۱۲۸)

اور اگر کوئی اس کے الفاظ کے معنی جان کر اس کی تلاوت کرتا بھی ہے تو اس کی حکمتیں اور اس کے اسرار اس لیے اس کے ذہن پر مرتسم نہیں ہوتے کیونکہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنا اور اس زندگی کو مجموعی طور پر اس کے نظام فکر کے سانچے میں ڈھالنے کا ارادہ نہ پیش نظر ہوتا ہے اور نہ ہی اس بات پر اس نکتہ نظر سے غورو فکر کیا جاتا ہے کہ آخر یہ کتاب ہم سے مطالبہ کیا کرتی ہے، اور اس میں کونسی خصوصی صفت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہم اسے تقدس کا عظیم مرتبہ دیتے ہیں۔

فکری و عملی جمود کی اس کیفیت میں ہم مغربی لادینی اور مادہ پرستانہ فکر کے عالمگیر ریلے کی زد میں آچکے ہیں۔ اس کے اثرات اس قدر وسیع دائرے میں ہمارے اندر پھیل چکے ہیں کہ ان کے لیے ہم الگ سے مستقل بحث کریں گے۔ سردست ہم یہی عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ سارے مسلمان ممالک کی درسگاہوں میں مغربی فکر کی بنیاد پر مرتب کردہ علوم کی تدریس ہو رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بقول علامہ اقبال

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

(بانگ در اصفحہ ۲۳۳)

ہمارے لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے مغربی ممالک کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کی عظیم اکثریت صرف اس کے فکر ہی کو نہیں اپناتی بلکہ ان کی سیاست اور معاشرت سے بری طرح مرعوب و متاثر ہوتی ہے اور اپنی بقیہ زندگی کے دوران ان کے اقدار کی برتری کے گن گاتی

رہتی ہے۔ ایسا ذہن رکھنے والے عناصر کو ہماری سیاست، تعلیم گاہوں اور حکومتی انتظامیہ کے روح رواں ہونے کا موقع میسر آتا ہے (جو غیر تعلیم یافتہ وڈیرے زمین دار اور صنعتکار اپنی مال و دولت کے سہارے سیاست و حکومت میں دخیل ہوتے ہیں، وہ تو فکری لحاظ سے بالکل غیر مؤثر ہوتے ہیں) ان کے ذہنوں میں دین کا تو کوئی واضح تصور نہیں ہوتا، البتہ وہ مغربی ذرائع سے یہ فکر حاصل کرتے ہیں کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے لہٰذا یہ اسی طرح قابل رد ہے جس طرح مغربی دنیا میں مذہب کو عملی زندگی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ان عناصر کے ہاتھوں میں جیسے ہمارے دوسرے اجتماعی معاملات چلانے کا اختیار ہے، اسی طرح نظام تعلیم کو تشکیل دینے کا اختیار ہے۔ یہ لوگ وہاں سے کج ذہن تو بن کر آتے ہیں لیکن وہاں کی تعلیم گاہوں میں مدرسین جس محنت اور یکسوئی سے اپنے اپنے شعبہ علم میں کام کرتے ہیں انکا کوئی اثر قبول کر کے نہیں آتے۔ لہٰذا ہماری درس گاہیں مغربی معیارات کے حوالے سے بھی روز بروز زیادہ سے زیادہ ابتری کا شکار ہو رہی ہیں اور تعلیمی سطح دور غلامی کی سطح سے بھی نیچے گر گئی ہے۔

عوامی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر یہ دعویٰ کر دیا جاتا ہے کہ درسگاہوں میں دینی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب تک نظام تعلیم کی تعمیر قرآن کے اصولوں پر نہ ہو محض اسلامیات کے ایک پیریڈ سے اصلاح فکر و کردار کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔

ان حالات میں ہمارا نظام تعلیم بھی فہم قرآن کے راستے کی ایک نمایاں رکاوٹ ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ہمارے ہاں کے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ صوم و صلوۃ کے بھی پابند ہیں، لیکن ذہن چونکہ اسلامی فکر سے خالی ہیں اور مغربی افکار کی جس بھٹی سے وہ اپنے زمانہ حصول تعلیم کے دوران گزرے ہوئے ہوتے ہیں اس کے زہریلے اثرات کو زائل کرنے کے مساجد میں بھی کوئی انتظامات نہیں ہوتے لہٰذا ان سے اسلام کی طرف راغب ہونے اور اسلام کے اصولوں کے معاملے میں درجہ یقین حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ بعض لوگ قرآن بھی پڑھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو دین و دنیا کی تقسیم کے تصور کے تحت حصول ثواب کی غرض سے قرآن کے معنی سمجھے بغیر ایسا کرتے ہیں، لیکن جو قلیل تعداد تراجم و تفاسیر قرآن کی مدد بھی حاصل کرتی ہے وہ ان سے اپنی فکری ساخت اور تعلیمی

پس منظر کی وجہ سے، نیز ان وجوہ سے جن کا تذکرہ ہم اسی باب میں جگہ جگہ قرآن فہمی کی شرائط کی صورت میں کر چکے ہیں، اس کوشش سے اسلامی ذہن بنانے کے سلسلے میں استفادہ نہیں کر سکتی۔ آپ تصور کیجیئے کہ اگر ایک برتن پہلے ہی شراب سے بھرا ہوا ہے تو آپ اس میں دودھ کیسے ڈال سکتے ہیں، جب تک اسے شراب سے خالی نہ کر لیں۔ یہ ایک عمومی صورت حالات ہے۔ اس میں مستثنیات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال ہم اس بحث کو محض مایوسی اور تاریکی کا تصور (Note of disappointment) دے کر یہیں ختم نہیں کرنا چاہتے۔ اس لیے کہ چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے اور مخالفانہ سازشوں، جن میں اپنے اور غیر شامل ہیں، کے ان طوفانوں میں امید کی کرنیں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک دور میں علامہ اقبالؒ نے ہندوستانی مسلمانوں کے حوالے سے دعا کی تھی:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے کہ تیرا فیض ہو عام اے ساقی

(بال جبریل صفحہ ۱۷)

اور پھر یہ امید افزا بات بھی کہی تھی:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(بال جبریل صفحہ ۹۰)

زمانہ ہوتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی تغیرات سے عبارت ہے۔ اب ہم مسلمانان عالم کے حوالے سے کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ استعماری و استحصالی طاقتیں، جن کا سرغنہ امریکہ اب دنیا کی واحد سپر طاقت رہ گیا ہے، اپنے وسیع ذرائع نشر واشاعت اور سیاسی، معاشی اور حربی غلبے کی وجہ سے مسلمان ممالک کی حب اقتدار سے آلودہ قیادتوں اور حکمرانوں سے گٹھ جوڑ کر کے نفاذ اسلام کی ہر آواز کو دبانے اور اسلام کی دعوت دینے والی ہر ایسی جماعت کو جس سے انہیں خطرہ محسوس ہو، کچلنے کے لیے کوشاں ہیں، لیکن مراکش سے انڈونیشیا اور فلپائن تک کسی نہ کسی درجے میں ہر مسلمان ملک میں قرآنی تعلیمات کی طرف رغبت کے آثار نظر آ

رہے ہیں۔ تفصیلی گفتگو ''نفاذ اسلام'' کے باب میں ہوگی البتہ یہاں ہم یہ عرض کر دیں کہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر معروضی انداز میں رائے قائم کرنا ہو گی کہ نفاذ اسلام کے لیے کس قدر افرادی قوت تیار ہو رہی ہے اور اعدائے اسلام کیسے، کن اور کس کس قدر وسائل کو بروئے کار لا کر اس کو کچلنے کے لیے کوشاں ہیں۔ لیکن جب ہم بدروحنین کے معرکوں اور غزوات خندق و تبوک کو ذہن میں لاتے ہیں تو جذباتی ہوتے ہیں اور مادی وسائل کی موزوں اہمیت سے انکار کیے بغیر علامہ کے اس خیال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

(بال جبریل)

نظریات کی بلندی و توازن اور کردار کی پختگی میں بے پناہ قوت ہوتی ہے، اور ضروری نہیں کہ اس دائرے میں ہر فیصلے کا مدار ظاہری و مادی قوت پر ہی ہو۔ فقر کی طاقت کا مظاہرہ اسلام کے قرن اول میں دیکھئے اور مادی طور پر فلک بوس نظاموں کا اپنے اندرونی کھوکھلے پن کی وجہ سے کیمونسٹ روس کے انہدام میں ملاحظہ فرمایئے۔ ان مظاہر کی تشخیص کے لیے قرآنی فلسفہ تاریخ میں غوطہ زنی کی ضرورت ہے۔ ہم اس سے قبل جاوید نامہ سے علامہ اقبال کے کلام سے حوالہ دے چکے ہیں کہ انہوں نے اب سے ساٹھ سال قبل اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ کیمونسٹ نظام کی اساس ناپختہ ہے۔

قرآن کہتا:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۲۴۹:۲)

ترجمہ: کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔

صبر کا مفہوم یہاں بہت وسیع ہے غلبے اور ترقی کے لیے خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تو ہم فہم قرآن میں رکاوٹوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ جہاں مسلمانوں میں مغربیت سے مرعوب اور ان کے افکار کی بھونڈی شکل کو اپنانے والا طبقہ ایک انتہا تک چلا گیا ہے وہیں ایک دوسرا طبقہ ایسا بھی ہے جو دوسرے مذاہب کے ترک دنیا، رہبانیت اور محسوس و مجسم چیزوں کے آگے سر عبودیت جھکانے کے سلسلے کے عقاید سے دوسروں کو متاثر کرنے کے سلسلے میں دوسری انتہاؤں تک چلا گیا ہے حالانکہ خود وہ حرص دولت و دنیا میں از سرتاپا ڈوبا ہوا ہے۔ وہ قرآن کو منزل من اللہ مانتے ہیں، توحید کا زبانی اقرار کرتے ہیں، حضور کی رسالت کو تسلیم کرتے ہیں اور آپ سے عشق کے مدعی ہیں۔ لیکن عملاً نہ قرآن کو منبع ہدایت سمجھتے ہیں، نہ اسوۂ رسول پر تفکر کرتے ہیں، نہ صحابہؓ کے طرز عمل کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، مسلمان عوام کی ایک بڑی تعداد پیشہ ور۔ دنیا پرست فقر کے جھوٹے دعوے دار اور قرآن و سنت کے علم سے یکسر نا آشنا سجادہ نشینوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں جو انہیں یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کی اللہ اور رسول تک رسائی ہے اور وہ جہاں عالم بالا میں پہنچ کر ان کی دنیوی حاجات کو پورا کروا سکتے ہیں، وہیں آخرت میں ان کے گناہوں کی معافی بھی دلوا سکتے ہیں۔ ان کا یہ کاروبار د را ثناً چلتا ہے۔ ہر پیر کا بیٹا بھی پیر ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی طرف من گھڑت کرامتیں منسوب کر رکھی ہیں اور ان کی قبروں پر لوگ طلب حاجات کے لیے جاتے ہیں۔ یہ خرقہ ئے سالوس کے اندر چھپے ہوئے مہاجن اپنے مریدوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لیے انہیں یہ کہتے ہیں کہ تم ان پڑھ ہو،لہٰذا قرآن و سنت کے نام پر کسی کی بات پر کان نہ دھرنا چاہیے کیونکہ یہ لوگ"وہابی" ہونے کی وجہ سے تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ ہر وہ شخص جو اسلامی فکر کو قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کرے، ان لوگوں کے نزدیک وہابی ہے۔ ان لوگوں کی اس روش نے مسلمانوں کے اندر ان تمام اوصاف کا قلع قمع کر دیا ہے تو اسلامی فکر و کردار کی تعمیر کے وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی صورت حال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

بال جبریل صفحہ ۷۰

ایسے لوگوں سے آپ قرآن رسول، صحابہؓ، آئمہ، اربعہ اور خصوصیت سے حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے حوالے سے جتنی بھی باتیں کریں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاجت روا سمجھنے کو شرک قرار دیتا ہے، حضور نے اپنی حیات طیبہ کے دوران بھی کہا کہ میں خود دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا محتاج اور خواستگار ہوں اور لوگوں کے ساتھ آخرت میں ان کے اعمال کے مطابق معاملہ ہو گا اور آپ نے دعا کی کہ یا اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا کہ لوگ اس کی عبادت کرنے لگیں۔ (ہم یہ حدیث اس سے قبل نقل کر چکے ہیں) صحابہؓ کرام کبھی کوئی حاجت لے کر حضور کی قبر پر نہیں گئے، یہاں تک کہ جب حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں قحط سالی ہوئی تو حضور کی قبر پر جانے کے بجائے حضرت عمرؓ مسلمانوں کو میدان میں لے گئے اور حضرت عباسؓ کو امام بنا کر بارگاہ خداوندی میں بارش کے لیے دعا کی۔ پھر یہ کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ یا حضرت عبد القادر جیلانیؒ نے کوئی گدی نہیں کی، نہ لوگوں سے نذرانے قبول کیے۔ (ان نذرانوں کو علامہ اقبال نے سود (ربو) سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ ہم اس سے قبل ان کے کلام سے حوالہ دے چکے ہیں۔ دیکھئے باب ٦ ''اسلامی فکر'' کے بغلی عنوان ''اسلام میں کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں'') ۔ لیکن یہ لوگ آپ کی ایک نہ سنیں گے۔

یہ پیر لوگ اپنے مریدوں کے سامنے یہ دعویٰ کرنے کی بھی جسارت اور حضور کی بے ادبی کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آتے ہیں، حالانکہ کسی صحابیؓ تک نے بھی کبھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اب تو یہ اس قدر جری شرک پر اصرار کرنے لگے ہیں کہ لوگوں کو عرسوں کے موقعوں پر اپنے آباد اجداد کی قبروں پر چڑھاوے کے طور پر اسی طرح جانور ذبح کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جس طرح مشرکین مکہ بتوں کے نام پر جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو جلوس کی شکل میں جانوروں کو ساتھ لے کر برہنہ پا ناچتے ہوئے عرسوں پر جاتے دیکھا ہے۔

ہم نے ان باتوں کا یہ ظاہر کرنے کے لیے تذکرہ کیا ہے کہ ان کے ذریعے سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد قرآن سے اپنا واسطہ عملاً منقطع کر چکی ہے۔ انہیں شرک کے خلاف قرآن سے دور اور چاہے جتنے بھی حوالے دو، وہ متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ اس صورت

حال کا اس کے سوا کوئی علاج دکھائی نہیں دیتا کہ معاشرے کے اندر مثبت طور پر قرآن کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔

یہ کام تو بے لوث قسم کے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی نام نہاد مذہبی جماعتیں جب اقتدار کی وجہ سے شرک کے مسئلے پر اس لیے اظہار خیال نہیں کر سکتیں، کیونکہ اس سے انتخابات میں رائے دہندگان میں مخالفانہ اثر مرتب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ انہوں نے تو چھکڑے کو گھوڑے کے آگے جو تنے کا مسلک اپنا رکھا ہے کہ پہلے اقتدار حاصل کر لیں پھر نظریات قرآن کی اشاعت کا کام کریں گے۔ لیکن این خیال است او محال است و جنوب است

قرآن و سنت پر تفکر کرنے والوں اور رات دن نفاذ دین کے مسئلے کو اپنی ذہنی کاوشوں کا محور بنانے والوں کی بات تو الگ ہے۔ وہ انفرادی سطح پر اپنی ذہنی کاوش کے مطابق قرآن کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہی جماعتیں اور معاشرے فہم قرآن کی نعمت سے مستفید ہو سکتے ہیں جو دین کو اپنانے کی شاہراہ پر چل کھڑے ہوں اور انہیں مختلف مراحل سعی و جہد کے دوران رہنمائی کے لیے قرآن سے رجوع کرنا پڑے۔ اس وقت بحیثیت مجموعی اجتماعی لحاظ سے ہماری جو حالت ہے اس کے پس منظر میں ہمارا اور قرآن کا کوئی جوڑ نہیں۔ مفصل بحث تو اسلام کی تاریخ اور نفاذ اسلام سے متعلقہ ابواب میں کی جائے گی یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں اسرار قرآن اسی جماعت افراد پر منکشف ہو سکتے ہیں جنہیں ان کی ضرورت پیش آئے۔ ہم جب اپنی زندگیوں کو قرآن کے مطابق ڈھالنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو فہم قرآن کی خواہش و طلب کیسے پیدا ہو گی۔

آپ ہاتھی کے سامنے گوشت ڈھیر کر دیں اور شیر کے سامنے گھاس اور سبزی کا انبار لگا دیں، تو دونوں بھوکوں مرجائیں گے لیکن ان چیزوں سے پیٹ نہ بھریں گے، بلکہ انہیں چکھیں گے بھی نہیں۔ اس لیے کہ ان کے اندر غذا کی حیثیت سے ان کی طلب ہی نہیں پائی جاتی۔ ان سے غذائیت حاصل کرنے کے لیے ان کا نظام ہضم بنا ہی نہیں۔ بعینہ قرآن کے متعلق یہی حالت ہماری ہے۔ قرآن ان لوگوں کی سمجھ میں آ سکتا ہے اور وہی اس کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتے ہیں جنہیں اپنی زندگی گزارنے کے لیے اس کی ضرورت ہو،

اور وہ اس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دل کی پوری آمادگی کے ساتھ سرگرم عمل ہوں۔ اس کے برعکس ہمارے اذہان و قلوب ایسی ساخت اختیار کر چکے ہیں کہ ان میں حالات موجودہ قرآن کی تعلیمات سما ہی نہیں سکتیں۔ ہم ان تعلیمات کو اپنے اجتماعی ڈھانچے میں اس طرح جذب نہیں کر سکتے جس طرح شیر گھاس کو اور ہاتھی گوشت کو اپنے نظام ہضم کے ذریعے سے اپنا اپنا جزو بدن نہیں بنا سکتے۔ حالانکہ دونوں اشیاء میں غذائیت موجود ہے اور جو جو حیوانات انہیں اپنے اپنے نظام ہضم کے مطابق استعمال کرتے ہیں وہ ان سے غذائیت حاصل کرتے ہیں۔

یہ تو مادی سطح کی ایک مثال ہے، لیکن معنوی اعتبار سے بات کی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارا موجودہ فکر، مزاج اور طرز زندگی قرآن سے مطابقت نہیں رکھتے لہٰذا اس کتاب کو سمجھنے میں دقتیں پیش آ رہی ہیں، اور آئے دن یہ روح فرسا بات مشاہدے میں آ رہی ہے کہ جو رفقاء سفر ہی نہیں اور مغربی فکر ان کا اوڑھنا بچھوتا ہے، وہ اسلام کے متعلق دور ازکار باتیں کر کے مسلمانوں کے دماغوں میں مزید الجھاؤ پیدا کر رہے ہیں اور ان کے لیے فہم قرآن کے راستے میں رکاوٹ کا موجب بن رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۙ وَّاتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۙ وَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖ(۳۳:۱ – ۴)

ترجمہ: اے نبی، اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جارہی ہے، بے شک اللہ ان تمام چیزوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے۔ اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کافرانہ نظریات اور اسلامی فکر ایک جگہ جمع ہو سکتے اور نہ ان میں مصالحت ہو سکتی ہے۔ ایک صاحب دانش انسان اللہ تعالیٰ کے انداز کلام سے

اس معاملے اور قاعدے کی اہمیت کو سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے اندر ایسا جو طبقہ پیدا ہو چکا ہے اور خیال کرتا ہے یا مسلمانوں کو باور کراتا ہے کہ مغربی فکر کے ساتھ اسلامی فکر بھی چل سکتا ہے وہ تفہیم قرآن کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کو ہمارے ذرائع ابلاغ میں اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کا موقعہ مل جاتا ہے اور ایسے ہی لوگ زیادہ تر ہماری اونچے درجے کی تعلیم گاہوں میں مدرسین کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا تفہیم قرآن کی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے جو ابھی نقل کی گئی آیات میں واضح کر دیا گیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ کفر کے فکری غلبے سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، تم قرآن کے راستے پر چلو ہم تمہاری مدد کریں گے۔

حفاظت قرآن

عالمی انسانی تاریخ کی بعثت اسلام سے قبل یہ مستقل روایت رہی ہے کہ کسی مذہب کے پیرو، جنہیں اپنی مذہبی کتابوں کے منزل من اللہ یا کسی آسمانی یا ماورا انسان ہستی کی طرف سے نازل ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اپنی مقدس کتاب کو تحریف اور حذف و اضافہ سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ ہم اس سلسلے میں ''پس منظر'' کے باب میں گفتگو کر چکے ہیں۔ بعثت اسلام کے بعد بھی بعض مذاہب قبل از اسلام کے پیروان کو بعض مصلحتوں کے تحت اپنی مذہبی کتب کے متون میں ردوبدل کرنا پڑی ہے۔

یہ مقام صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ یہ جن الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر بذریعہ وحی نازل ہوا، بعینہ انہی الفاظ میں حضور ہی کی حیات طیبہ کے دوران کسی معمولی سے معمولی تغیر کے بغیر محفوظ کر لیا گیا۔ جوں جوں اس کی آیات نازل ہوتی جاتی تھیں ایک تو یہ حضور کے قلب و ذہن پر ثبت ہوتا جاتا تھا، دوسرے جب آپ اسے صحابہؓ تک پہنچا دیتے تھے تو ان میں سے بہت سے حضرات اسے حفظ کر لیتے تھے، تیسرے کچھ صحابہؓ اسے ضبط تحریر میں لے آتے تھے اور چوتھے آپ خود کا تبین وحی میں سے کسی کو بلا کر لکھوا لیتے تھے اور پھر کاتب سے فرماتے تھے کہ وہ حضور کو سنائے تاکہ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو آپ اس کی تصحیح فرما دیں۔

پانچویں حضور خود اور صحابہؓ اس کو رات دن میں کئی بار اپنی نمازوں اور نوافل میں بھی پڑھتے تھے اور ویسے بھی اس کی تلاوت کرتے تھے۔ ان سب باتوں نے اسباب کے اعتبار سے قرآن کی حفاظت کی ضمانت فراہم کر دی اور اس میں کسی تحریف اور حذف اضافہ کے امکان کو بھی ختم کر دیا۔ چنانچہ صدیوں کے زمانی و جغرافیائی بعد کے باوجود سب مسلمان کسی معمولی سے اختلاف کے بغیر قرآن کے ایک ہی متن پر متفق ہیں اور یہ تواتر کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

اس کے علاوہ ہم قرآن کی آیت (۹:۱۵) کا ایک سے زیادہ مرتبہ حوالہ دے کر اس سے قبل یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اس کے ذریعے دین اسلام کی حفاظت کا خود ذمہ لے رکھا ہے۔ اللہ کی طرف سے نازل کیے ہوئے کسی اور صحیفے میں اس قسم کی ضمانت کی نشاندی نہیں کی جاسکتی۔

اس دور میں کاغذ ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا، نہ ہی اس کا کوئی تصور تھا۔ شروع میں لکھنے کے لیے صرف رق (چمڑے کے ٹکڑے) ہی استعمال کیے جاتے تھے مگر بعد میں غیب (کھجور کی شاخیں) طفہ (پتھر کی سلیٹیں) کیف (بکری یا اونٹ کے شانے کی چوڑی ہڈی) قتب (پالان کی لکڑی) وغیرہ اشیاء بھی لکھنے کے لیے استعمال ہونے لگیں۔'' (''عظمت قرآن کریم'' از حافظ محمد یونس۔ مطبوعہ شعبہ دعوت وارشاد۔ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد - صفحہ ۹۲)

اس تصنیف میں تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے:

''روضتہ الاحباب میں ہے کہ ''چالیس صحابہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کتابت وحی پر معمور اور مقرر تھے۔ ان میں مشہور حضرات یہ ہیں:''

حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ عمرؓ فین خطاب۔ عثمانؓ بن عفان۔ علیؓ تبن ابی طالب۔ زیدؓ بن ثابت۔ عبد اللہ بن مسعودؓ۔ زبیرؓ بن عوام — خالدؓ مین سعید۔ حنظلہؓ بن ربیع۔ علاءؓ۔ خالدؓ بن ولید۔ عبد اللہؓ بن رواحہ۔ محمدؓ فین مسلمہ۔ عبد اللہؓ بن عبد اللہ۔ مغیرہؓ مین شعبہ۔ عبد اللہؓ بن عمرو بن العاص۔ معاویہؓ بن ابی سفیان۔ جہمؓ بن صلت۔ عبداللہؓ بن ارقم۔ معیقیت زہریؓ۔ ثابتؓ

بن قیس بن شماس۔ حذیفہؓ مین یمان -عامرؓ ضبن فہیرہ۔ عبداللہؓ بن ابی سرح۔ سعیدؓ بن جبیر۔ بانؓ بن سعید۔'' (صفحہ ۹۲)

اس کے بعد صاحب تصنیف لکھتے ہیں:

''قرآن کریم حضور کے سامنے پورے کا پورا جمع کیا گیا اور آپ کی موجودگی میں لکھا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب بھی قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا تھا آپ کسی کاتب کو بلا کر نازل شدہ حصے کی کتابت کا حکم دیتے تھے، اور اس آیت یا سورۃ کا اصل مقام بھی متعین فرما دیا کرتے تھے۔''

''مذکورہ کاتبوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور آپ کے پاس موجود رہتا تھا۔ وہ بغیر کسی کمی، زیادتی، نقص اور تغیر و تبدل کے فوراً لکھ لیا کرتے تھے۔''

(صفحہ ۹۲)

حضور کے ضبط قرآن کے اس طریقے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ چنانچہ حلب کی کلیئہ شرعیہ کے شعبئہ حدیث و تاریخ کے مشہور استاذ علامہ محمد راغب الطباخ (متوفی ۱۳۷۰ھ) کی تصنیف ''الثقافۃ الاسلامیہ'' جس کا اردو ترجمہ مولانا افتخار احمد بلخی نے ''تاریخ افکار و علوم اسلامی'' کے نام سے کیا ہے، میں تحریر ہے کہ علامہ سیوطی نے ''اتقان'' میں حاکم کی ''مستدرک'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ زید بن ثابتؓ کی روایت ہے کہ:

''کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نولف القرآن من الرقاع''

ترجمہ: زید بن ثابت نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن مجید کو رقاع (چرمی پرزوں) سے جمع کیا کرتے تھے۔

بیہقی کہتے ہیں کہ ممکن ہے اس سے مراد متفرق آیات کا رسول کے حکم سے ان کی سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دے کر جمع کیا جانا ہو جہاں پر ان آیات کو ہونا چاہیے تھا۔ (جلد اول صفحہ ۱۱۶)

اسی تصنیف میں تحریر ہے:

''۔۔۔اگرچہ مکمل قرآن ایک جگہ کسی کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع نہیں کیا گیا تھا، جیسا کہ اس کی تفصیل آئے گی، لیکن وہاں پر متعدد صحابہؓ ایسے تھے

جو تمام قرآن کے حافظ تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری (کتاب فضائل صحابہ) میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے جس میں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ تم قرآن چار اشخاص سے پڑھا کرو۔ سب سے پہلا نام حضور نے عبداللہ بن مسعودؓ کا لیا۔ پھر سالمؓ مولی ابی حذیفہؓ کا پھر ابیؓ بن کعبؓ کا اور پھر معاذؓ بن جبل کا۔"

"نیز بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید کو چار شخصوں نے جمع کیا تھا، سب کے سب انصار تھے، ابیؓ بن کعب معاذؓ بن جبل، ابوزیدؓ اور زید بن ثابتؓ رضی اللہ عنھم۔ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ ابو زیدؓ کون؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "میرے ایک چچا۔" (صفحہ ۱۱۰)

اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ حضور کے تھوڑا عرصہ (بعض روایات میں ۸۱ دن) قبل قرآن کی تکمیل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ موجودہ کتابی شکل تکمیل سے قبل دی ہی نہ جا سکتی تھی۔ لیکن جوں جوں اس کا نزول ہوتا جاتا تھا، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، حضور ہر وحی شدہ آیات کے مقام کا تعین فرماتے جاتے تھے۔ اس کا صحابہؓ کو ہر وقت علم ہوتا رہتا تھا اور وہ یکساں ترتیب سے نمازوں اور تلاوت کے دوران اسے پڑھتے ان میں سے بہت حفظ کرتے جاتے تھے۔ یہ بات بذات خود فیضان ربی کے تحت حضور کی صلاحیت کی ایک عظیم علامت ہے۔ حضور اور صحابہؓ کا قرآن کو کثرت سے تلاوت کرنا اس بات کو مستلزم ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب کے علاوہ سورتوں کی ترتیب بھی حضور نے مقرر کر دی تھی۔ آپ قیام لیل کے دوران ایک ایک رکعت میں متعدد سورتیں تلاوت کرتے تھے، ظاہر ہے کہ سورتوں کی ترتیب کا تعین آپ نے خود فرما دیا ہو گا۔

ویسے قرآن کا اللہ تعالیٰ کو ایک کتاب ہونا ہی منظور تھا۔

چنانچہ دوران نزول قرآن اس کے لیے جگہ جگہ کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا، اور کتاب اسی چیز کو کہا جا سکتا ہے جو بین الدفتین ہو۔ قرآن مکی دور ہی کی ایک سورۃ میں یوں کہتا ہے:

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۷:۲)

ترجمہ: یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ تو اس کے باعث تمہارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ تاکہ تم اس کے ذریعے سے لوگوں کو ہوشیار کر دو اور یہ اہل ایمان کے لیے یاد دہانی ہے۔

مکہ میں نازل کی گئی ایک دوسری سورت میں فرمایا:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶ : ۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لیے اتاری ہے کہ تم ان پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جس میں وہ مختلف ہو گئے ہیں اور یہ ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

گویا مکی دور ہی میں یہ تصور دے دیا گیا تھا کہ یہ جو دستور ہدایت تدریج کے ساتھ نازل کیا جا رہا ہے، اسے ایک کتاب کی شکل اختیار کرنا ہے اور ہم تھوڑی تھوڑی تعداد میں جو آیات نازل کر رہے ہیں وہ اس کتاب کا اجزاء ہی ہیں جو حسب موقع وحی کر رہے ہیں۔

حضور کی زندگی ہی میں قرآن کے مکمل طور پر لکھے جانے کے متعلق ''عظمت قرآن کریم'' کے مصنف مندرجہ ذیل شواہد پیش کرتے ہیں:

''ایک سفر میں مکہ و مدینہ کے درمیان ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کیا کہ میرے قرآن کا ایک جزء گم ہو گیا ہے '' (بحوالہ کتاب المصاحف ابن ابی داؤد ص ۱۸)

''ایک حدیث میں ہے:''

''حضور صلی اللہ علیہ سلم نے قرآن کو دشمنوں کے ملک میں لے جانے سے منع فرمایا ۔ ''بحوالہ بخاری کتاب الجہاد''

''بعض جلیل القدر صحابہؓ نے کئی بار قرآن پاک لکھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے چار مرتبہ لکھا۔ حضرت عائشہ نے اپنے آزاد کردہ غلام ابو یونس سے قرآن لکھوایا۔ '' (بحوالہ ترمذی۔ باب فضائل القرآن۔ کتاب المصاحف لابن داؤد عظمت . قرآن کریم صفحہ ۶۰)

''عبداللہ بن رافعؓ کہتے ہیں، میں نے حضرت ام سلمہؓ زوجہ رسول کے لیے قرآن لکھا۔ ''ایضاً (عظمت قرآن کریم صفحہ ٦١)

''حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ میں نے پورا قرآن رسول اللہ کے سامنے پڑھا۔'' (عظمت قرآن کریم صفحہ ٦٢ - ٦٣ بحوالہ بخاری کتاب التفسیر)

''احادیث سے ثابت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری بیماری میں بستر پر لیٹے لیٹے ستر سورتیں تلاوت فرمائیں۔ ان میں سب سے لمبی سات سورتیں بھی شامل تھیں۔ اس تاریخی شہادت نے ولیم میور جیسے مخالف کو بھی یہ اقرار کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ''اس میں شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سورتوں کو عبادات میں استعمال کر کے ان کی شکل اور غالباً ان کی ترتیب بھی مقرر کردی تھی۔ '' (لائف آف محمد) مصنفہ (لارڈ ولیم میور) (عظمت قرآن کریم صفحہ ٦٣)

''تاریخ افکار و علوم اسلامی میں ابوبکر باقلانی کا مندرجہ ذیل اقتباس واضح ہے: ''

''ابو بکر باقلانی نے کہا ہے کہ وہ سارا قرآن جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور جس کے لکھنے اور ثبت کرنے کا اس نے حکم دیا اور جسے منسوخ نہیں کیا اور جس کی تلاوت نزول کے بعد نہیں اٹھائی گئی، یہی ہے جو مابین الدفتین (دود فتیوں کے درمیان) ہمارے ہاتھوں میں ہے جو ذرہ برابر بھی کمی یا زیادتی کیے بغیر مصحف عثمانی میں ثبت ہوا اور یہ کہ اس کی ترتیب اور اس کا نظم دونوں ٹھیک ٹھیک اسی طریقے پر ثبت ہیں، جسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اور جس کے مطابق اس کے رسول نے آیات و سورہ کو مرتب کیا، اس میں نہ کسی مؤخر کو مقدم اور نہ کسی مقدم کو مؤخر کیا گیا اور امت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سورہ کی آیات اور ان کے مقامات کو محفوظ کر لیا ہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے (امت نے) نفس قرات اور خود تلاوت محفوظ کر لی ہے۔'' (جلد اول صفحہ ١٧٥)

حفظ و جمع قرآن کے سلسلے میں ہم نے سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا ہے درج ذیل آیت سے اس کی توثیق ہوتی ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (٧٥ : ١٦ – ١٧)

ترجمہ: اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ۔ ہمارے ذمے ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا۔

صاحب "تدبر قرآن" لفظ جمع کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"لفظ جمع یہاں ایک جامع لفظ ہے۔ اس سے مراد اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سینہ مبارک میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا بھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں، کسی ترتیب سے آپ جمع کرائیں۔ چنانچہ اس رہنمائی کی روشنی میں آپ نے الگ الگ سورتوں میں، ان کے مواقع کے تعین کے ساتھ، جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی۔"

اب تک کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت حضور کی طرف سے قرآن پورے کا پورا، بغیر کمی بیشی کے اپنی اصلی حالت میں امت کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو خالق و مدبر کائنات اور وحی کے ذریعے منبع رشد و ہدایت نہیں بھی مانتے اور ہر معاملے میں اسباب و مسببات کے تصور سے بندھے ہوئے ہیں، وہ بھی اگر حفاظت قرآن کے متعلق سطور بالا میں پیش کیے گئے واقعات کا بغور مطالعہ کریں گے تو ان کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن کی صحت کو کئی ذرائع سے یقینی بنایا گیا۔ اور ان سبھی ذرائع میں متن کے سلسلے میں یکسانی پائی جاتی تھی۔ یعنی حضور فرض نمازوں اور قیام لیل کے دوران خود بھی قرآن پڑھتے رہے، صحابہؓ کو بھی سکھاتے پڑھاتے رہے۔ صحابہؓ آپ سے سن کر از خود بھی قرآن کو لکھتے رہے، سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ نے اسے حفظ کیا اور اس کی سارے ملک میں مزید برآں اشاعت کی۔ ہر وحی کے فوراً بعد حضور کا تبین وحی سے اسے ضبط تحریر میں لے آتے تھے۔ حضور کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان تمام ذرائع کے درمیان قرآن کے متن کے متعلق ایک لفظ کے سلسلے میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اس دور میں طباعت، اشاعت کتب کی ایسی سہولتیں تو میسر نہ تھیں جو آج کل دستیاب ہیں۔ لہٰذا دستبرد زمانہ سے قرآن کو محفوظ رکھنے کے لیے خلفائے راشدین نے جو اقدامات کیے ان کی تفصیل ہم سطور ذیل میں عرض کریں گے۔

حضور کے بعد جمع قرآن کے سلسلے میں یہ حدیث بہت اہمیت رکھتی ہے:

وعن زيد بن ثابت قال ارسل الى ابوبكر مقتل اهل اليمامة فاذ اعمر بن الخطاب عنده قال ابو بكر ان عمر اتاني فقال ان القتل قد استخر يوم اليمامة بقراء القرآن وانى اخشى ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فيذ هب كثير من القران واني ارى ان تامر بجمع القرآن قلت لعمر كيف تفعل شيئا لم يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال عمر هذا والله خير فلم يذل عمر يراجعنى حتى شرح الله صدرى لذالك وراثيت فى ذلك الذى رأى عمرقال زيد قال ابوبكر انك رجل شاب عاقل لا انتهمك وقد كنت تكتب الوحى قال زيد قال الرسول الله صلى الله عليه وسلم فتتبع القرآن فاجمعه لو كلفونى نقل جبل من الجبال ما كان اثقل على مما امرني به من جمع القرآن قال قلت كيف تفعلون شيئا لم يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم قال هو والله خير فلم يذل ابوبكر يراجعنى حتى فتتبعت شرح الله صدري للذى شرح صدر ر ابى بكر و عمر القرآن اجمعه من العسب والنحاف وصد ورالرجال حتى وجدت اخر سورة التوبة مع ابى خذيمة الانصارى لم اجدها مع احد غيره لقد جائكم رسول من انفسكم حتى خاتمة براة فكانت الصحف عند ابى بكر حتى توفاه الله ثم عند عمر حيونه ثم عند حفصه بنت عمر (رواہ بخاری)

ترجمہ: زید بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ یمامہ کے قتل کے زمانے میں حضرت ابو بکرؓ نے مجھے بلا بھیجا جب میں گیا تو دیکھا کہ حضرت عمر بن خطابؓ ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ عمرؓ میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ "جنگ یمامہ میں قرآن کے قاریوں (یعنی حفاظ) کے شہادت کا معاملہ بہت گرم ہو گیا (یعنی بہت سے حفاظ قرآن شہید ہو گئے) اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر قرآن کے قاری مختلف جنگوں میں اسی طرح شہید

ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ضائع نہ ہو جائے۔ اور میری رائے ہے کہ آپ جمع قرآن (یعنی بین الد فتین لانے) کا حکم دے دیں۔ ''میں نے عمرؓ سے کہا کہ ''آپ وہ بات کیسے کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی۔ تو عمرؓ نے کہا کہ اللہ کی قسم ایسا کرنا بہتر ہے۔ اور وہ عمرؓ مجھ سے اس معاملے میں گفتگو کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ نے میرا سینہ، اس معاملے میں کھول دیا، اور میں عمرؓ کی رائے سے متفق ہو گیا۔ ''زیدؓ کہتے ہیں ''حضرت ابو بکر نے کہا تم جواں سال شخص ہو، عظمند ہو، تم پر کوئی (جھوٹ کی) تہمت نہیں اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتے تھے۔ پس تم کا قرآن تتبع کرو، اور اس کو جمع کرو (یعنی کتابی شکل دے دو)۔ (زید کہتے ہیں) اللہ کی قسم اگر پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو منتقل کرنے کا کام سپرد کیا جاتا تو مجھے وہ اتنا بوجھل معلوم نہ ہوتا جتنا مجھے جمع قرآن کا کام جس کا مجھے حکم دیا گیا تھا بھاری معلوم ہوا۔ میں نے کہا آپ (لوگ) اس کام کو کیسے کر سکتے ہیں۔ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ انہوں نے (یعنی حضرت ابو بکرؓ نے) کہا ''اللہ کی قسم اس میں بہتری ہے، ابو بکرؓ مجھ سے متواتر اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے (یعنی دلائل دیتے رہے) حتیٰ کہ اللہ نے میرا سینہ بھی اس معاملے میں کھول دیا تھا۔ میں نے کھجور کی شاخوں، سفید پتھروں اور لوگوں کے سینوں سے پوری تندہی سے قرآن جو جمع کیا (یعنی مصحف کی صورت دے دی) حتیٰ کہ سورۃ توبہ کا آخری حصہ یعنی قد جاءکم رسول من انفسکم خاتمہ سورہ براۃ (اس سورۃ کو توبہ اور براۃ دونوں نام دیتے جاتے ہیں) تک ابی حذیفہ انصاریؓ کے پاس پایا اور یہ ان کے سوا اور کسی کے پاس نہ پایا۔ یہ صفحات (قرآن) حضرت ابو بکرؓ کے پاس رہے حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا اللہ کے حکم سے۔ پھر (اس کے بعد) حضرت عمرؓ کے پاس رہے اور ان کی زندگی تک، پھر حفصہ بنت عمرؓ کے پاس رہے۔

متذکرہ بالا حدیث ان حالات پر مکمل روشنی ڈالتی ہے جن میں جمع قرآن کا یہ کام کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ حضور کے دور رسالت اور بعد کے ادوار کے دوران میں حضرت عمرؓ کی اسلام کے معاملے میں دور اندیشیوں سے بھری پڑی ہے۔ فتنہ مانعین زکوٰۃ وارتداد کے دوران مسیلمہ کذاب نے ایک لاکھ کا لشکر جمع کر لیا۔ اس کے مقابلے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ رسول نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی سربراہی میں تیرہ ہزار کا لشکر روانہ

کیا۔ لڑائی میں مرکز خلافت کی فوج سے تعلق رکھنے والے جو حضرات شہید ہوئے ان میں تقریباً پانچ صد حفاظ قرآن شامل تھے۔ (''تاریخ افکار و علوم اسلامی'' جلد اول صفحہ ۱۲۰)۔ (تفصیلات باب بعنوان ''اسلام تاریخ میں'' میں بیان ہوں گی) حضرت عمرؓ کو جو ہمہ تن اور ہمہ وقت مفاد اسلام کے لیے غورو تفکر میں مصروف رہنے تھے، اندیشہ لاحق ہوا کہ اس طرح وقت کے گزرنے اور مختلف جنگوں میں حفاظ کے شہید ہونے سے ان کی تعداد کم ہوتی گئی تو کہیں سابقہ مذاہب کے صحیفوں کی طرح قرآن کے کچھ حصے ضائع نہ جائیں۔ چنانچہ انہوںؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے جو اس وقت خلیفہ تھے، قرآن کو باقاعدہ ایک مصحف کی سرکاری طور پر شکل دینے کے متعلق بات کی جیسا کہ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''امروز ہر کہ قرآن می خواند از طوائف مسلمین، منت فاروقؓ در گردن اوست''

(آج مسلمانوں میں جو بھی قرآن پڑھتا ہے، حضرت فاروق اعظمؓ کا احسان اس کی گردن پر ہے۔) (عظمت قرآن کریم صفحہ ۱۰۲)

اس حدیث کے آخری حصہ سے ظاہر ہوتا حضرت زید بن ثابتؓ نے جمع قرآن کا جو کام کیا تھا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، اس کے نتیجے میں جو مصحف وجود میں آیا، اس کی اشاعت نہیں کی گئی۔ نہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ اس کا متن بعینہٖ وہی تھا جس کی ہر جگہ مسلمان تلاوت کر رہے تھے۔ امام ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ ''خلیفہ اول کے عہد میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں لوگوں کے پاس بکثرت قرآن نہ ہوں۔'' (''عظمت قرآن کریم'' صفحہ ۱۰۱ بحوالہ کتاب الفصل الملل والنحل جلد دوم)۔ وہ پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ پھر حضرت عمرؓ اور اس کے بعد حضرت حفصہ کی تحویل میں رہا، حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں ۲۵ ھ میں مسلمانوں کے مختلف علاقوں کے لیے ایک قرات کے مطابق قرآن کے نسخے تیار کروائے جنہیں مصاحف امصار سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جو حضرت صدیق اکبرؓ کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے جمع کردہ قرآن کے مطابق تھے۔ لیکن اس سارے عرصے میں قرآن کی قراتوں میں (یالہجوں) میں اختلاف کے باوجود اس کتاب کے متعلق

مسلمانوں میں الفاظ معنی کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ لہجوں کا تفاوت تو دنیا کی ہر زبان میں ہوتا ہے۔

متن حدیث میں ''صحف'' کا لفظ جمع کے صیغہ میں ہے۔ یہ واضح کر دینا مناسب ہو گا کہ اس کا واحد صحیفہ ہے جس کا مطلب کتاب کا ورق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں موجودہ دور جیسی جلد بندی کا رواج نہ ہو سکتا تھا کیونکہ لکھنے وغیرہ کا کام، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، چمڑے کے ٹکڑوں یا درخت کی چھال کی قسم کی چیزوں پر ہوتا تھا نہ کہ آج کل کی طرح کے کاغذ پر۔ اس لیے کتاب کی مجموعی ضخامت کا بڑھ جانا ضروری ہو تا تھا۔ اندریں حالات جو کچھ لکھا گیا ہو گا وہ اس قسم کے مختلف یا ایک ہی قسم کی کسی ایک چیز کے ٹکڑوں پر لکھا گیا ہو گا، جو تحریر کو قبول کر سکے۔ لہٰذا انہیں الگ الگ اوراق ہی کہا جا سکتا ہے اگرچہ ان کو ترتیب سے دھاگوں وغیرہ سے منسلک کر دیا گیا ہوگا۔ جہاں تک قرآن کی کتابی شکل کا تعلق ہے، اس کے لیے ''مصحف'' کا لفظ استعمال ہو گا اور اس کی جمع مصاحف ہے۔ الفاظ سطور ذیل میں آتے رہیں گے۔

جہاں تک حضرت عمرؓ کی تحریک پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں جمع قرآن کا تعلق ہے ہم ''تاریخ افکار و علوم اسلامی'' جلد اول سے اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں چند آئمہ کے حوالے سے اس کام کو انجام دینے کے طریق کی وضاحت ہوتی ہے:

ابن ابی داؤد نے اپنی مسند سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ (مسجد نبوی میں) آئے اور (اعلان) فرمایا کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی قرآن حاصل کیا ہو وہ لے کر آئے اور وہ لوگ قرآن کو صحیفوں پر اور تختیوں پر اور کھجور کے درخت کی چھالوں پر لکھ لیا کرتے تھے اور وہ (عمرؓ) کسی شخص کی تحریر قبول نہیں کرتے تھے تا وقتیکہ دو گواہ اس پر گواہی نہ دے دیتے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زید بن ثابتؓ صرف تحریر کے پائے جانے پر اکتفا نہ کرتے تھے تا وقتیکہ کوئی شخص شہادت نہ دیتا جس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر حاصل کیا ہو باوجودیکہ زید بن ثابتؓ خود حافظ تھے اور زید بن ثابتؓ کا یہ عمل انتہائی احتیاط کی بنا پر تھا۔''

''نیز ابن ابی داؤد نے ہشام بن عروہ کے واسطہ سے روایت کی ہے کہ (ہشام) کے والد نے بیان کیا کہ ابو بکر صدیقؓ نے عمرؓ اور زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ مسجد نبوی کے دروازے پر بیٹھ جائیں اور جب کوئی شخص کتاب اللہ کی کسی آیت پر دو گواہ لے آئے تب اس کو لکھیں۔''

''سخاری نے اپنی کتاب ''جمال القراء'' میں لکھا ہے کہ (کسی آیت پر دو شاہدوں کی شہادت سے) مراد یہ ہے کہ وہ دونوں اس بات کی گواہی دیں کہ وہ مکتوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا، یا مراد یہ ہے کہ وہ دونوں اس بات کی گواہی دیں کہ یہ ان وجوہ میں سے ہے جن پر قرآن کا نزول ہوا۔''

''ابو شامتہ (متوفی ۶۶۵ھ) بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کے مد نظر یہ تھا کہ قرآن بعینہ اسی اصل سے لکھا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ضبط تحریر میں آیا نہ کہ مجرد حفظ پر اعتماد کیا جائے، نیز ابو شامتہ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے سورہ توبہ کے آخری حصہ میں زید بن ثابتؓ نے کہا کہ میں نے اس کو ابو خزیمہؓ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں پایا یعنی اس کو اس کے سوا کسی اور کے پاس لکھا ہوا نہ پایا کیونکہ وہ بغیر کتابت کے صرف حفظ پر اکتفا نہ کرتے تھے۔ (صفحات ۱۱۸ – ۱۱۹)

حضرت ابو بکر صدیقؓ اگرچہ خود حافظ قرآن تھے، لیکن انہوں نے اس کام کی ذمہ داری کو اپنے تک محدود نہیں رکھا، جب کہ حضور کی تربیت اور اسلام کے نظام شورائیت کے مطابق اس سے عام مسلمانوں کو وابستہ کیا۔

ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً عرض کر چکے ہیں کہ جس طرح ہر زبان میں ہوتا ہے، مختلف قبائل عرب کے درمیان عربی زبان میں قرات اور لہجے کا اختلاف تھا۔ ہم اسی باب میں اس سے قبل قرآن کی زبان کے بغلی عنوان کے تحت سید سلیمان ندوی کی محققانہ کتاب تاریخ ارض القرآن کا تذکرہ کر کے اس سے حوالہ بھی دے چکے ہیں۔ اسی کتاب ہے ہم عرب کے مختلف علاقوں میں قرات، لہجے اور لغات میں اختلاف کے متعلق مختصراً اقتباسات پیش کرتے ہیں:

''اتنا محقق طور سے ثابت ہے اور کئی بار اس کا اعادہ بھی ہو چکا ہے کہ عرب کی دو بڑی تقسیمیں ہیں، ان میں باہم متعدد امور میں امتیاز اور تفریق ہے۔ اہل عرب اس کی قومی تقسیم کرتے ہیں، یعنی بنو قحطان اور بنو اسماعیل۔ اور علمائے یورپ نے اس کی جغرافیائی حدبندی کی ہے یعنی جنوبی اور شمالی۔ بنو قحطان جنوبی عرب کے باشندے ہیں، اور بنو اسمٰعیل کا مسکن شمالی عرب ہے، عربی زبان بھی ان دو شاخوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ شمالی (اسماعیلی) اور جنوبی (قحطانی) عربی زبانوں میں متعدد حیثیتوں سے اختلاف ہے۔ پھر یہ دو شاخیں بھی چند اور چھوٹے چھوٹے شعبوں میں منقسم ہیں۔'' (صفحہ ۳۵۰)

اس کے بعد ادبی تحریروں اور کتابت سے بہت سے حوالے دے کر مصنف مذکور کہتے ہیں:

''شمالی عرب کے مختلف قبائل میں لہجہ، تلفظ اور الفاظ کی حرکات میں اختلاف تھا۔ چنانچہ اوائل عہد اسلام تک یہ اختلافات موجود تھے، اس وقت بھی شعراء عرب کے وہ قصائد اور اشعار موجود ہیں جو اسلام سے پہلے سو برس کے اندر لکھے گئے۔ قرآن کی زبان میں جو قرآن میں مستعمل ہوئی ہے نیز اس عہد کے شعراء کے کلام میں مستعمل ہے اور اگلے قدیم شعرائے جاہلیت کی زبان میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ ہم قرآن کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ بلاپس و پیش کر سکتے ہیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام کے حل کرنے کے لیے قدم قدم پر لغت کی ضرورت پیش آتی ہے۔'' (صفحات ۳۵۴ – ۳۵۵)

سانی سطح پر اس صورت حال ہی کی وجہ تھی کہ اللہ اور اس کے رسول نے مسلمانوں کو قرآن کی تلاوت کی سات قراتوں میں اجازت دی (اس سے معنی و مفہوم قرآن میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا)۔ اس سلسلے میں حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ صحیح مسلم میں حدیث منقول ہے۔ دراصل حضور ہمیشہ امت کے لیے آسانی چاہتے تھے۔ قرآن کی تلاوت کے لیے عوام پر یکلخت زور دینا کہ وہ اپنی اپنی قرات ولہجہ ترک کر کے اسے قریش کے لہجہ و لغت کے مطابق پڑھیں، ان پر بہت گراں گزرتا تھا۔ لیکن جیسا کہ آئندہ کی سطور میں واضح ہو گا کہ جب لوگ دین سے مانوس ہو گئے اور ضرورت لاحق ہوئی تو حضرت عثمانؓ

نے اپنے دور خلافت میں مسلمانوں کو ایک قرات پر متفق کر لیا۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو جو حضور کے طرز عمل کی وضاحت کرتی ہے۔

وعن ابن مسعود قال سمعت و جلا قراء وسمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقراء خلافها فجئت به النبى صلى الله عليه وسلم فاخبرته فعرفت في وجهه الكراهية فقال كلا كما . ن فلا تختلفوا فان من كان قبلكم اختلفوا فهلكوا (بخاری)

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرات کرتے سنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مختلف طریق سے قرات کرتے سنا۔ چنانچہ میں اس شخص کو نبی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا اور صورت واقعہ بیان کی۔ میں نے اس پر حضور کے چہرۂ مبارک پر کراہت دیکھی۔ پھر حضور نے فرمایا۔ تم دونوں ہی ٹھیک (پڑھتے) ہو۔ آپس میں اختلاف نہ کرو۔ تم سے پہلے جن (امتوں نے) اختلافات کیسے وہ ہلاک ہو گئے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار خلافت میں بہت سی آبادیاں اور علاقے اسلام کے زیر نگیں آگئے۔ اسی دوران صحابہ کرامؓ نے جگہ جگہ جا کر قرآن کی اشاعت کی۔ سات قراتوں میں قرآن کی تلاوت کا مسئلہ جب تک ملک عرب کی حدود تک محدود تھا تب تک تو اس میں کوئی اختلاف کی شکل رونما نہیں ہوئی، لیکن قرآن کے دور دراز علاقوں میں پہنچنے پر مختلف قراتوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں لہجوں کے متعلق اشکالات رونما ہوئے اور حضرت عثمانؓ تک اختلافات کی خبریں پہنچنا شروع ہوئیں۔ چنانچہ ہم اس سلسلے میں صحیح بخاری کی روایت نقل کرتے ہیں:

وعن انس ابن مالک ان حذيفه بن اليمان قدم على عثمان وكان يغازى اهل الشام في فتح ارمينية واذ ريائي جان مع ابل العراق فافزع حزيفة اختلافهم في القراة فقال حذيفة يا امير المومنين ادرک هذه الامت قبل ان يختلفوا في الكتاب اختلاف اليهود والنصارى فارسل عثمان الى حفصة ان ارسلى الينا باالصحف ننسخها في المصاحف ثم نردها اليك فارسلت بها حفصة الى عثمان فامر زيد بن ثابت وعبد الله بن الزبير وسعيد بن العاص وعبد الله بن الحارث

بن هشام فنسخوها في المصاحف وقال عثمان للرهط القريشيين الثلاثة اذ اختلفتم انتم وزيد بن ثابت فی شی من القرآن فاكتبوه بلسان قريش فانما نزل بلسانهم ففعلو حتى اذ انسخوا الصحف في مصاحف رد عثمان الصحف الى حفصة وارسل الى كل افق بمصحف مما نسخوا وامربا سواه من القرآن في كل او مصحف ان يحرق قال بن شهاب فاخبرني خارجة بن زيد بن ثابت انه سمع زيد بن ثابت قال فقدت اية من الأحزاب حين نسخنا مع خذيمة بن ثابت الانصاري من المصحف قد كنت اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرا بها فلنسمناها فوجد ناها المومنين رجال صد قواما عاهد وا الله عليه فالحقناها في سورتها في المصحف (رواه بخاری)

ترجمہ: اور حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ بن الیمان حضرت عثمانؓ کے پاس آئے جب کہ آپؓ (یعنی حضرت عثمانؓ) اہالیان شام و عراق کے لیے آرمینیہ اور آذربائیجان کی فتوحات کے لیے سامان جنگ کا انتظام فرما رہے تھے۔ حضرت حذیفہ قرآن کی قرات کے بارے میں لوگوں کے اختلاف کے بارے میں مضطرب تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا یا امیرالمومنین اس امت کے متعلق سوچیں اور کوئی راستہ نکالیے قبل اس کے کہ لوگ قرآن کے متعلق یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات میں پڑ جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس کسی کو بھیجا کہ وہ ان صحیفوں کو جو (حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں) ہم نے لکھے تھے بھیج دیں، بعد میں ہم آپ کو واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے۔ حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ عبد اللہ بن زبیرؓ سعید بن عاصؓ اور عبداللہ بن حارث بن ہشامؓ کو حکم دیا کہ اور انہوں نے ان صحیفوں کو مصاحف میں نقل کیا۔ حضرت عثمانؓ نے تینوں قریشی حضرات سے کہا کہ اگر آپ اور زید بن ثابتؓ کے درمیان اختلاف ہو جائے تو قرآن کو قرات قریش کے مطابق لکھو کیونکہ قرآن قریش کی زبان (لہجے) میں نازل ہوا تھا۔ ان سب نے اس پر عمل کیا اور جب صحیفوں کو مصاحف میں نقل کر لیا گیا تو حضرت عثمانؓ سے انہیں حضرت حفصہؓ کو واپس بھیج دیا۔ اور ایک ایک مصحف ان مصاحف میں سے جو لکھے گئے تھے (اسلامی مملکت میں) ہر طرف بھیج دیا اور حکم دیا کہ ان

مصاحف کے علاوہ ہر مہینے یا مصحف کو جس پر قرآن لکھا ہو، جلا دیا جائے۔ حضرت ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ مجھے خارجہ بن زید بن ثابتؓ نے بتایا کہ میں نے زید بن ثابت سے سنا کہ سورہ احزاب میں سے ایک آیت (ان قواعد و شرائط کے مطابق جو مقرر کیے گئے تھے) نہیں مل رہی تھی جب کہ ہم (حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں قرآن لکھ رہے تھے) حالانکہ ہم نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ (یاد رہے کہ زید بن ثابتؓ خود حافظ قرآن تھے) ہم نے اس کو تلاش کیا تو ہمیں وہ خذیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی (اور وہ تھی) من المومنین رجال صدقوا ما عاھد و اللہ علیہ ۔ چنانچہ ہم نے اس کو مصحف میں اس کی سورۃ میں شامل کر دیا۔

اوپر بیان کی گئیں حضرات زید بن ثابتؓ اور انس بن مالکؓ کی دونوں حدیثوں سے خلفائے راشدین کے زمانے میں سرکاری طور پر، اور مسلمانوں کے مشورے سے پورے احتیاط کے ساتھ ، جس طرح قرآن کو مرکزی اقتدار کی طرف سے ضبط تحریر لایا گیا اور یہ یقین حاصل کرنے کے بعد کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و علیہ وسلم نے جو امت کو دیا تھا کہ اس سے ایک لفظ کی بھی تحریف نہیں ہوئی، سلطنت اسلامیہ میں سے پھیلا دیا گیا۔ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ اس سے قبل بھی معنی و متن قرآن میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ صرف قراتوں اور لہجوں کا اختلاف تھا۔ اب حضرت عثمانؓ کے مصحف نے اس کو بھی ختم کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے نسخے کو مصحف ام کہا جاتا ہے۔

حضرت عثمانؓ نے اس اقدام کا فیصلہ مسلمانوں کے پچاس ہزار کے مجمع کے مشورے اور اتفاق کے ساتھ کیا۔ (بحوالہ مظاہر حق جدید جلد دوم از علامہ نواب محمد قطب الدین خان دہلوی صفحہ ۴۶۲)

ہر سال رمضان کے مہینے میں تراویح میں لاکھوں حفاظ قرآن سناتے ہیں—— تراویح ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے نفل نماز کی شکل میں عبادت کے علاوہ سال میں ایک بار مسلمانوں کو اجتماعی طور پر ایک متعین مہینے میں پورا قرآن سننے اور اس پر غوروتفکر کر کے اس کے اصولوں اور اس کی تعلیمات اذہان میں تازہ کرنے کا موقع میسر آ جاتا ہے۔ نماز تراویح کا تو یہی مقصد ہے، یہ اور بات ہے کہ جس طرح ہم دوسرے معاملات میں اسلامی

تعلیمات سے روگردانی کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں اسی طرح تراویح کے اصل فوائد سے بھی بہرہ ور نہیں ہو رہے۔ بہرحال ایسے مسائل تو اپنے اپنے مقام پر زیر بحث آئیں گے، یہاں ہم ناظرین کی توجہ اس محیر العقول واقعے پر تفکر کرنے کی طرف دلانا چاہتے ہیں جو پورے کے پورے قرآن کو کلی صحت کے ساتھ انسانی ذہنی میں ثبت و محفوظ ہو جانے سے متعلق ہے۔ دنیا کی کسی دوسری کتاب میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

قرآن کی اس معجز نما خصوصیت کے وزن کو کم کرنے کے لیے بعض اغیار یہ کہتے ہیں کہ قرآن حفظ کرنے والوں کے اذہان کند ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اسلامی تاریخ میں بے شمار ذہن و فطین اور اجلہ علماء حافظ قرآن گزرے ہیں، مثلاً امام ابن تیمیہؒ امام ابن قیمؒ شیخ احمد سرھندی مجدد الف ثانیؒ حافظ ابن کثیرؒ حافظ ابن حجرؒ، حافظ سیوطیؒ، حافظ سخاویؒ خطیب بغدادیؒ، امام ذھبیؒ، امام ابن جوزیؒ ایسے حفاظ قرآن کا شمار نہیں ہو سکتا جو کبار علماء سمجھے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اعلیٰ پائے کی بہت سی کتب کا مصنف تھا۔ قرآن حفظ کرنے والوں کو بلید الذہن ہونے کا طعنہ دینے والے ان زعما کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟

اگر آپ کو دوران تقریر تحریر یا گفتگو کسی کتاب سے اقتباس یا حوالہ دینا پڑے تو آپ کو اس کتاب میں سے پڑھ کر اسے نقل کرنا ہو گا۔ لیکن قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ حافظ قرآن نہ ہونے کے باوجود بلا تکلف مختلف موضوعات کے سلسلے میں اپنے حافظے کی بنیاد پر حوالے دیتے چلے جائیں۔ اور یہ حوالے محض ترجمانی ہی پر مشتمل نہ ہوں بلکہ لفظ بلفظ قرآنی متن کے مطابق ہوں گے۔

جس طرح ہمارے ہاں شیوخ علماء کہلانے والوں کی کثرت کے موجود ہمارے لیے دین کو اپنانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی اسی طرح حفاظ قرآن کی کثرت دینی رجحان پیدا کرنے میں مد ثابت نہیں ہو رہی۔ مخالف اسلام قوتوں کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے۔ اسلام کے قرن اول میں قراء جہاں جہاد میں حصہ لیتے تھے وہیں تبلیغ دین کا کام بھی پوری تندہی کے ساتھ انجام دیتے تھے، اس لیے کہ وہ تفکرو تدبر فی القرآن کرتے تھے اور قرآن کے اصول و کلیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی امکانات کی جو تبیین کی اور اصول کلیات قرآنی کے سلسلے کی تفصیلات و جزئیات کے متعلق جو رہنمائی فرمائی، جس کو ہم

سنت رسول کے اصطلاحی نام سے جانتے ہیں، اس سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے۔ حفظ قرآن سے ان کا مقصد خود قرآن کو سمجھنا، اس سے ہدایت حاصل کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچاتا ہو تا تھا۔ وہ قرآن کی ہدایت کے مطابق اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے تفکر، تذکر، تفقہ، تعقل اور تدبر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے تھے۔ قرآن کو حفظ کرنا مقصود بالذات نہیں سمجھتے تھے۔ اس کتاب میں بار بار کہا گیا ہے افلا تعقلون (تو کیا تم سمجھتے نہیں) لـو کانو یفقھون (کاش وہ سمجھتے ہوتے) ولا ھـم یـذکرون (کافروں کے متعلق کہا کہ وہ یاد دہانی حاصل کرتے) کذلک نفصل الایت لقوم یتفکرون (۲۴:۱۰)۔ (اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔) افلا یند برون القـرآن (۸۲:۴۔) (اور کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے) قرآن میں ایسی باتیں بار بار کہی گئی ہیں۔ اصل مقصود قرآن کو سمجھنا، اس پر عمل پیرا ہونا اور حتی المقدور اس کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اسے حفظ کرنا ان مقاصد کے حصول میں بہت سہولت پیدا کر دیتا ہے۔

انفرادی ذمہ داری سے تو کوئی اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔ قرآن میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کو اپنا بوجھ اٹھانا ہو گا، اپنے اعمال کی خود جوابدہی کرنا ہو گی اور قیامت کے روز ہر ایک کو اکیلے اکیلے اپنا حساب دینا ہو گا۔ (تفصیلی گفتگو ''معاد'' کے عنوان کے تحت ہو گی) لیکن اجتماعی زندگی کی ساخت کو بھی فرد کے فکرو سیرت کی تعمیر کے سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں ہر معاملے میں اسلام کے نظریات اور غایتوں سے ہٹ کر سوچ کے کچھ انداز پختگی کا مقام حاصل کر گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ ہے کہ بغیر جانے بوجھے قرآن کو زبانی یاد کر لینا ہی بالذات مقصود و مطلوب ہے۔ اسی ڈگر پر ہر کوئی چل رہا ہے۔ ہمارے جملہ انفرادی و اجتماعی معاملات میں ایسے انداز فکر میں بہت سے عوامل کو دخل حاصل ہے۔ ان کا تجزیہ اپنے اپنے مقام پر اس سے قبل بھی کیا گیا ہے اور آئندہ بھی کیا جائے گا۔

حضور کی طرف سے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی تلقین

محض حصول ثواب کے لیے قرآن کو بے سوچے سمجھے پڑھنے کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ ہم بار بار عرض کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن اپنے مخصوص انداز میں انسانوں کے فکر و عمل کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ یہ کام قرآن کو سمجھے بغیر تو انجام نہیں پا سکتا۔ ابھی ہم سطور بالا میں عرض کر چکے ہیں کہ فہم قرآن حاصل کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کتاب اللہ میں متعدد الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تاکہ یہ بات طرح مسلمانوں کے اذہان پر مرتسم ہو جائے۔ اسی طرح حضور سے بھی بہت سی احادیث مروی ہیں جن میں قرآن کو سمجھنے اور اس کے مضامین پر غورو تفکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ہم چند احادیث نقل کرتے ہیں:

عن عثمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عثمانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں بہتر شخص وہ ہے جس نے خود قرآن کی تعلیم حاصل کی اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا مطلب پورے شعور کے ساتھ کسی بات کو اپنے ذہن میں پیوست کرنا ہی ہو سکتا ہے، محض بے سوچے سمجھے الفاظ کو زبان سے دہرانا تو نہیں ہو سکتا۔

پھر فرمایا:

وعن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لم یفقہ من قراء القرآن فی اقل من ثلاث (مشکواۃ بحوالہ ترندی۔ ابوداؤدواری)

ترجمہ: اور عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کر لیا اس نے اس کو اچھی طرح سے اپنے ذہن نشین نہیں کیا۔

اس حدیث میں قرآن کی مکمل قرات کے لیے کم سے کم مدت تین دن فرمائی گئی ہے۔ اس سے زیادہ اپنے حالات اور تفہیم قرآن کی موزونیت کے اعتبار سے چاہے جتنا وقت بھی صرف ہو جائے۔ بعض صحابہؓ ایک دو آیات کو لے لیتے تھے اور جب تک ان کی حکمتوں کو غورو تفکر کر کے سمجھ نہ لیتے اور انہیں جامہ عمل نہ پہنا لیتے آگے نہ بڑھتے تھے۔ یہ

بحث بہت طوالت کا باعث ہو گی۔ یہاں ہم تفقہ فی القرآن پر گفتگو کر رہے ہیں اور اس حدیث سے عیاں ہے کہ تلاوت قرآن کے دوران اس پہلو کو اصل مقصد کے طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔

قرات قرآن کے طریقے کے متعلق رہنمائی فرماتے ہوئے حضور نے ارشاد فرمایا:

وعن حذيفة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أقراء القرآن بلحون العرب واصواتها واياكم ولحون اهل ولحوناهل الكتابين وسيجى بعدى قوم يرجعون بالقران ترجيع الغناء والنوح لا يجاوز حناجرهم مفتونة قلوبهم وقلوب الذين يعجبهم شانهم (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی، و زرین)

ترجمہ : حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کو عرب کے لحن اور آوازوں کے مطابق پڑھو۔ اور خبردار عشق کے سفلی جذبات کے زیر اثر گانے والوں اور اہل کتاب کے طرز پر گانے والوں کی طرح نہ پڑھو۔ میرے بعد ایک جماعت پیدا ہو گی جو قرآن راگ اور نوحہ کی طرح (تصنع کے ساتھ) پڑھے گی۔ قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور ان کے اپنے دل اور ان کے پڑھنے کے انداز سے خوش ہونے والوں کے دل فتنہ (اور گمراہی) میں مبتلا ہو جائیں گے۔

ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اپنا سارا زور و قوت گانے اور راگ رنگ کے انداز میں قرات قرآن کرنے میں صرف کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں سے داد وصول کریں وہ نہ خود قرآن کے مفہوم کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے سامعین تعلیمات قرآن سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ لوگ قاری کی سریلی آواز پر ہی سر دھنتے رہتے ہیں۔ حضور نے اس حدیث میں مثالیں دے کر فرمایا کہ قرآن ایسے طریقوں سے نہیں بلکہ ایسے طریقوں سے پڑھنا چاہیے تاکہ وہ تمہارے حلق سے نیچے اتر کر دل کی گہرائیوں تک پہنچ جائے جو قرات قرآن کا اصل مقصد ہے۔

پھر فرمایا:

عن بريدة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من قراء القرآن يتاكل به الناس جاء يوم القيامة وجهه عظم ليس عليه لحم (مشکواۃ بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لوگوں سے کھانے (پینے) کے لیے قرآن پڑھا وہ قیامت کے روز اس حالت میں آئے گا کہ اس کے منہ پر صرف ہڈی ہو گی گوشت نہ ہو گا۔

ہمارے معاشرے میں مختلف مذہبی قسم کے اداروں سے تعلق رکھنے والے افراد سے کھانے اور زرنقد کے عوض غمی خوشی کے مواقع پر قرآن پڑھوانے کی رسم معمول کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ جیسا کہ درج بالا حدیث میں ظاہر ہے کہ حضور نے اس طریقے کی شدید مذمت کی ہے۔ عقل عالم کے مطابق بھی معاوضہ دے کر کسی قسم کی دوسروں سے عبادت کروانا ایک ابلہانہ حرکت ہے۔ اور اس طرح قرآن پڑھوانا اس مقدس کتاب کی توہین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایسے مقاصد کے لیے نازل نہیں کیا، نہ حضورؐ، صحابہ کرامؓ اور علماء سلف و صالحین نے اس کو ان مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ قرآن میں جگہ جگہ اس کے مقاصد نزول کا تذکرہ کیا ہے اور ہم اس کتاب میں اس سلسلے میں حوالہ جات دیتے آ رہے ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک آیت کا حوالہ دینے پر اکتفا کریں گے:

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ(۱۲:۱)

ترجمہ: یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا تا کہ تم سمجھو۔

مطلب بالکل عیاں ہے۔ ظاہر ہے کہ سمجھنے سے مراد اس کے اصولوں کو اپنے ذہن نشین کرنا، ان پر غورو فکر کرنا اور اس کے نتیجے میں اس کی فراہم کردہ ہدایت پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ مقصد کسی کو معاوضہ دے کر، اس سے پڑھوا لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن سے اس قسم کا سلوک کرنے کا قرآن میں کہیں تذکرہ ہے اور نہ حدیث نبوی میں۔ مسلمانوں نے یہ اور اس قسم کے دوسرے طریقے غیر مذاہب سے در آمد کیے ہیں۔

باب ۷

حدیث و سنت

اگرچہ حدیث اور سنت میں فرق ہے، لیکن بنیادی طور پر دونوں کا تعلق دین کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے قول اور فعل کے ذریعے راہنمائی فراہم کرنے سے ہے۔ چونکہ بنی نوع انسان کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کی حیثیت سے حضورؐ کے اس فرض منصبی کا تعلق وضاحت و تبیین قرآن سے بھی ہے، اور اس کے اصول و کلیات کے جزئیات و تفصیلات کو عملی جامہ پہنانے سے بھی لہٰذا اس لحاظ سے یہ سارے دین کو محیط ہے اور اس کا کوئی شعبہ ان کے دائرہ اثر سے باہر نہیں۔ ہم تک دین کو حضور ہی نے بلاشرکت غیرے پہنچایا۔ اس سے قبل ''منصب رسالت'' اور ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان کے تحت جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ ناظرین کے پیش نظر رہنا چاہیے، اس لیے کہ دین میں حدیث و سنت کی اہمیت اور کردار کو سمجھنے کے لیے ان ابواب میں قرآن وحدیث سے حوالوں کی بنیاد پر پیش کردہ نظریات مد ثابت ہوں گے۔ یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری طوالت کا باعث ہو گا۔

سنت اور حدیث کا فرق

سنت کے لغوی معنی شاہراہ کے ہیں۔ اصطلاح میں سنت پیغمبرؐ اسلام کے اس عمل کو کہا جاتا ہے جو ہم تک امت کے عملی تواتر سے پہنچا ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی کہتے ہیں:

> ''جہاں تک سنت کا تعلق ہے اس کو، جیسے آگے وضاحت ہو گی،
> تواتر کا درجہ حاصل اور یہ تواتر قولی نہیں بلکہ عملی ہے۔''
>
> (''مبادی تدبر حدیث''صفحہ ۶۱)

ایک اور جگہ اسی کتاب میں فرماتے ہیں:

''سنت کی بنیاد حدیث پر نہیں ہے، جن میں صدق و کذب، دونوں کا احتمال ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا بلکہ امت کے عملی تواتر پر ہے۔'' (صفحہ ۲۸)

ایسے اعمال حضورؐ نے صحابہؓ کے سامنے انجام دیئے اور اس سے یہ مقصد واضح طور پر حضورؐ کے پیش نظر رہا کہ یہ لوگ ان کے مالہ اور ما علیہ کو پوری طرح سمجھ جائیں۔ ایسی بہت سی روایات ملتی ہیں کہ آپؐ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے، بلکہ اس سلسلے میں نگرانی فرماتے تھے، کہ صحابہؓ ان اعمال کو اسی طرح انجام دیں جس طرح آپؐ نے حکم دیا یا رہنمائی کی ہو۔ دوسری طرف، جیسا کہ اسی باب میں عرض کیا جائے گا، صحابہ کرامؓ بھی حضورؐ کی ایک ایک حرکت اور آپ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ، کا پوری توجہ سے مشاہدہ کرتے اور غور سے سنتے تھے۔ دونوں طرف سے اس احتیاط اور توجہ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آپؐ کے تمام اعمال یکسانی سے صحابہؓ نے اپنا لیے۔ صحابہؓ سے یہ اعمال جنہیں سنت کا اصطلاحی نام دیا جاتا ہے تابعین نے اخذ کیے۔ تابعین کا طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ وہ ہر صحابی کو اس وجہ سے بڑی قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ انہوں نے حضورؐ کی صحبت کی سعادت حاصل کی اور دین کو براہ راست آپؐ سے سیکھا۔ تابعین کا یہ شوق اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ سینکڑوں کوس کا سفر کر کے سنت رسولؐ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی صحابی سے ملاقات کرنے کے لیے جاتے تھے۔ انکے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے اور ان سے دین کی مہمات کا سنت نبویؐ کی روشنی میں علم حاصل کرتے۔ تابعین اور صحابہؓ کا رابطہ پہلی صدی ہجری کے آخری عشرہ تک کسی نہ کسی درجے میں قائم رہا دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ تابعین اور صحابہؓ کی ہمعصری کا دور پہلی صدی ہجری کے بیشتر حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً اجلہ صحابہ میں سے جو حدیث و سنت کا علم حضورؐ سے براہ راست حاصل کر کے بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کا سلسلے میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ حضرت انسؓ بن مالک ۹۳ھ اور سائب بن یزیدؓ ۹۱ھ میں فوت ہوئے۔

جہاں تک تابعین کا تعلق ہے مثال کے طور پر عطاء بن ابی رباحؒ ۱۱۴ھ میں، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ ۱۰۵ھ میں طاؤس بن کسانؒ ۱۰۴ھ قتادہ ۱۳۶ھ علقمہ ۱۰۴ھ شعبیؒ ۱۰۵ھ میں

امام زہری ۱۲۴ھ میں فوت ہوئے۔ ہم نے یہاں چند صحابہؓ اور تابعین کے اسمائے گرامی لکھے ہیں۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جہاں صحابہؓ کی کثیر تعداد نے حضورؐ کی صحبت کے نتیجے میں عبادات وغیرہ کے طریقے سیکھے وہیں علمی مذاق اور تفقہ فی الدین کا اسلوب بھی سیکھا اسی طرح ان سے بھی بہت زیادہ کثیر تعداد میں تابعین نے صحابہؓ سے سنت کا علم حاصل کیا اور اسے متاع گرانمایہ کے طور پر محفوظ کیا۔ خلافت راشدہ کے دور میں صحابہ کرام مصر، شام، عراق اور جن جن علاقوں میں اسلام پہنچتا گیا پھیل گئے اور مرجع خلاق کی حیثیت اختیار کرتے گئے۔ عام آبادیوں میں تو فرائض و واجبات اور عبادیات دین کی تبلیغ جاری رہتی تھی، لیکن جن لوگوں میں علمی ذوق پایا جاتا تھا وہ صحابہؓ سے فہم قرآن و سنت کے اصول و اسالیب کی تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور یہی جماعت تھی جو اسلامی تاریخ میں تابعین کے نام سے موسوم ہوئی۔ انہوں نے صحابہؓ سے سنت نبویؐ کے متعلق معلومات حاصل کر کے انہیں تبع تابعین کی طرف منتقل کیا۔

تبع تابعین نے بھی سنت و حدیث کی پوری تندہی کے ساتھ اشاعت کی۔ اسی دوران یہ صورت پیدا ہو گئی کہ اگرچہ سنت رسولؐ تو تواتر عملی کے تحت بالکل واضح اور اظہر من الشمس کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن مختلف مکاتب فکر، جن کی ابتداء امت میں سیاسی اختلافات کی وجہ سے ہوئی، کے وجود میں آنے سے علم حدیث کے شعبے میں بہت تحقیقی اور مطالعاتی کام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری کے نصف سے احادیث کے سلسلے میں بہت سے اصناف تحقیق مثلاً صحت سند، فن اسماء الرجال، جرح و تعدیل اور روایت و درایت کے مختلف اصطلاحی ناموں سے وجود میں آ گئے۔ یہ سب اصناف علم آپس میں درحقیقت ایک دوسرے سے منسلک ہیں ،لیکن علوم حدیث کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ اس کے سلسلے میں محدثین کو بہت سی اصطلاحیں وضع کرنا پڑیں۔

یہ ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حدیث کا تعلق قولی روایات سے ہے، اس میں تواتر عملی جیسی صورت نہیں ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جائے گا متعدد وجوہ سے بعض حلقوں نے اپنے مسالک و عقائد کے جواز کی تائید کے لیے موضوع احادیث پھیلا دیں۔ علماء حقہ نے یہ دیکھ کر علم حدیث میں جانچ پھٹک کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور اس کاوش کو ایک باقاعدہ

علم کا درجہ دے دیا۔ اس کے برعکس سنت کا معاملہ تو واضح تھا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس کا تعلق حضورؐ کے عمل سے ہے جو تواتر کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا اور اس کی صحت کو درجہ یقین حاصل ہے۔ قرآن کو سنت رسولؐ سے ملا کر دین کی مکمل عمارت وجود میں آتی ہے۔ قرآن دین کے جملہ اصول و کلیات سے عبارت ہے اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، حضورؐ نے انہیں عملی جامہ پہنا کر دین کے سارے پہلوؤں کو اجاگر کر دیا۔ مثلاً قرآن میں اگر چہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کا بار بار تذکرہ ہے لیکن ان کی تفصیلات کہ انہیں کس طرح عملی جامہ پہنانا ہے موجود نہیں۔ اسی طرح حج کا حکم تو دیا گیا، لیکن مناسک حج کے متعلق مکمل رہنمائی نہیں دی گئی۔ اس طرح سیاسی معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور آداب مجلس کے متعلق احکامات ہیں، لیکن اگر انہیں زیر عمل لانے کے لیے عملی نمونہ سامنے نہ ہو تو امت ان پر عمل پیرا نہ ہو سکتی تھی۔ جیسا کہ گزشتہ ابواب میں قرآن سے حوالے دے کر واضح کیا گیا ان سب معاملات میں توضیح و تبیین کا کام حضورؐ ہی کے فرائض منصبی میں شامل تھا اور اسی کے لیے سنت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اجمالاً پیش کیے گئے احکام ربی کی تفصیلات اور طریق ادائیگی کو بھی قرآن میں شامل کیا جاتا تو یہ ایک ایسی ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرلیتا جسے سنبھالنا امت کے لیے مشکل ہو جاتا اور دوسرے جس طرح وضاحت احکامات پر عمل کر کے دکھا دینے سے مؤثر طور پر کی جاسکتی ہے تحریری شکل میں ہر ذہنی سطح کے لوگوں کے لیے مؤثر نہیں ہوتی۔ اور تیسرے سنت رسولؐ سے اصول دین کی حقیقت پسندی ظاہر ہوتی ہے، لیکن محض کتابی شکل میں انہیں پیش کر دینے سے یہ محض ایک خیالی و تصوراتی (Utopian) باتیں دکھائی دیتیں۔ سنت رسول پوری طرح محفوظ ہے اور اس کو قولاً روایت شدہ احادیث سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

بعض لوگ بے خبری کی وجہ سے یا مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنے کی معاندانہ کوشش کی نیت سے ایک تو سنت و حدیث کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور دوسرے نہ وہ حدیث کی جمع و تدوین کے سلسلے میں محدثین نے جو جانفشانیاں اور علمی کاوشیں کی ہیں انہیں پیش نظر رکھتے ہیں، تیسرے مستشرقین سنت کو بھی حدیث کے زمرے میں شامل کر کے اس خلاف واقعہ بات کو بڑے زور سے مشتہر کرتے ہیں کہ تدوین حدیث کا کام دوسری

تیسری صدی ہجری میں کیا گیا۔ اس سے پہلے اس صنف علم کے سلسلے میں محض حافظے سے کام لیا گیا جو حفاظت حدیث کا قابل اعتماد ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ حضور کی شخصیت کے بلند تصور (Image) کو مجروح کرنے کی ناکام کوشش ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۲۰ کے صفحہ ۶۲۷ پر Study of History (تاریخ کا مطالعہ) کے عنوان کے تحت لکھے گئے مقالے میں تحریر ہے:

"Teachings of Muhammad not included in the Quran came to be regarded after his death as authoritative tradition left behind by him. All his sayings and actions were therefore carefully treasured and ultimately came to form in combination with the Quran, the foundation for the body of Muslim law (Shariah) common to all Muslim communities. These traditions (Hadith) were transmitted orally for several generations, until they were written down, in the 8th and 9th centuries. The resultant collections were only partly historical, as myths and inventions crept into them".

ترجمہ: محمدؐ کی وہ تعلیمات جو قرآن میں شامل نہیں تھیں، آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی چھوڑی ہوئی روایات قابل اتباع احکامات کے طور پر تسلیم کی جانے لگیں، لہٰذا آپؐ کے تمام اقوال و افعال احتیاط کے ساتھ محفوظ کیے گئے، اور آخر کار وہ قرآن کے ساتھ مل کر مسلم قانون (شریعت) کی بنیاد قرار پائے جو تمام مسلم اقوام کے درمیان مشترک تھے۔ یہ روایات (حدیث) زبانی طور پر متعدد نسلوں کے دوران منتقل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ وہ آٹھویں اور نویں صدی میں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔ اس کے نتیجے میں جو مجموعے وجود میں آئے وہ جزوی طور پر تاریخی (ثقاہت) کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ خیالی اور فرضی قصے اور وضع شدہ چیزیں ان میں نفوذ کر گئیں۔

اس مختصر سے اقتباس میں پیغمبرؐ اسلام، قرآن اور حدیث کے متعلق جو گفتگو کی گئی ہے اسلام کی تعلیمات اور تاریخ میں ان کے سفر سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اس کے بین السطور میں چھپی ہوئی غلط فہمی یا معاملے کو عمداً توڑ موڑ کر پیش کرنے کی حرکت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ لیکن بے خبر یا مغربی مصنّفین سے مرعوب لوگ چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسلام کے متعلق ایسی ذو معنی اور مبہم تحریروں سے اسلام کے متعلق غلط تاثر لے لیتے ہیں، اور علمی دائرے میں تحقیقی اور مطالعاتی انداز سے نابلد ہونے کی وجہ سے وسوسوں میں مبتلا ہو

جاتے ہیں۔ اسلام کے متعلق مستشرقین اور دوسرے مغربی مصنّفین کی تحریروں کا جائزہ تو ایک الگ باب میں لیا جائے گا یہاں ہم زیر بحث موضوع کی نسبت سے درج بالا اقتباس کے متعلق چند نکات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اولاً آغاز ہی میں بات یوں کی گئی ہے کہ جیسے قرآن حضورؐ ہی کے کلام پر مشتمل ہے۔ حالانکہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

ثانیاً یہ کہنا بھی مبنی بر دروغ ہے کہ حضورؐ کی ''روایات'' کا اتباع آپؐ کی وفات کے بعد کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ بعثت کے اول روز ہی سے آپؐ کے قول و فعل کا اتباع اہل ایمان کے لیے واجب تھا۔

ثانیاً، جیسا کہ اسی باب میں آئندہ بالوضاحت اور ثقہ حوالہ جات کی بنیاد پر بیان جائے گا جس چیز کو روایات (Traditions) کہا گیا ہے وہ صرف حدیث ہی پر مشتمل نہ تھیں بلکہ اس میں اہم ترین اور سوفیصد واضح عنصر سنت کا ہے، جو گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران عملی تواتر سے امت تک پہنچتی رہی ہے اور جس میں التباس اور غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تصنیف ''مبادی تدبر حدیث'' میں لکھا ہے:

--------قرآن سنت ہی سے واضح ہوتا ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الا اني اوتيت القرآن ومثله معـه (سنن ابی داؤد۔ کتاب السنتہ، باب ٦) (آگاہ رہو کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور اسی کے مانند اس کے ساتھ اور بھی) پس جس طریقے سے قرآن واجب ہے اسی طریقے سے سنت بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے بھیجا کہ قرآن مجید مبہم نہ رہے، بلکہ مجسم اور کامل شکل میں لوگوں کے سامنے آجائے اور آپؐ نے عملاً ایسا کر دیا۔ (صفحات ۲۴۔ ۲۷)

رابعاً یہ کہنا بھی غلط ہے کہ حضورؐ کی چھوڑی ہوئی روایات متعدد نسلوں تک زبانی منتقل ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں بھی ابھی وضاحت کی جائے گی۔

خامساً، خیالی قصے (Myths) اور وضع شدہ چیزیں (Inventions) سنت میں نہیں گھس سکے، احادیث میں بعض عناصر نے موضوع احادیث شامل کر دیں لیکن محدثین کی عظیم کاوشوں نے حدیث کو اس خارجی عنصر سے پاک کر دیا۔ اور اس سلسلے میں مزید تحقیق و تدبر

کا دروازہ اصولاً مقفل نہیں ہے۔ لیکن علمی استعداد و صلاحیت اس کام کو ہاتھ میں لینے کی اولین شرط ہے۔ صدر اول میں اس دائرے میں جو شاندار کام ہوا اور جس طرح عظیم المرتبت شخصیات نے اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف کیں اس کا تذکرہ آگے بھی آئے گا اور اس سے قبل بھی اس سلسلے میں بعض معروضات پیش کی جا چکی ہیں۔

تو یہاں بات اوپر درج کیے گئے اقتباس کے متعلق ہو رہی تھی۔ انسائیکلو پیڈیا کے جس مقالے سے یہ اقتباس لیا گیا ہے وہ یونیورسٹی کالج آف ویلز کے تاریخ کے ایک اونچے درجے کے پروفیسر ایڈ مانڈبی فرائڈ (Edmond B. Fryde) اور اس کتاب کے ایک ایڈیٹر نے مل کر لکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مغربی فکر کی اساسات سے اپنے اذہان کو آزاد کر کے جہاں اسلام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہیں وہ مغرب کے مادہ پرستانہ تصور کی کسوٹی کو ہمہ وقت پیش نظر رکھتے ہیں۔ ورنہ کسی دائرہ المعارف میں لکھنے کے لیے تحقیقی استعداد اور پیش نظر مسئلے کے عمیق فہم، لابدی شرائط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہو نہیں سکتا کہ اسلام میں سنت کے مقام و مرتبے کو کوئی محقق نظر انداز کر دے۔ لیکن اس اقتباس میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس تحریر کو اسلام کی صحیح عکاسی یا ترجمانی کرنے کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر چہ اس صورت حالات کے متعلق تفصیلی گفتگو تو متعلقہ ابواب میں آئے گی، لیکن یہاں موقع کی مناسبت سے ہم یہ عرض کر دیں کہ یہ مسلمانوں کی علمی انحطاط کی علامت ہے کہ ہم میں سے ایک طبقہ دین کو سمجھنے کے لیے مادہ پرستانہ تصور کائنات و حیات کے حاملین پر انحصار کرتا ہے، حالانکہ ان کے فکر میں خدا، وحی اور رسالت کے عقائد کو کوئی مقام ہی حاصل نہیں۔ لہٰذا اسلام کے متعلق ان کی کوئی بات کس طرح قول فیصل کی حیثیت رکھ سکتی ہے۔

مغربی تسلط کی وجہ سے چونکہ ہمارے اندر ایک مغرب زدہ طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو مغرب سے درآمد شدہ ہر نظریے کو قبول کرنے پر آمادہ رہتا ہے لہٰذا اس قلیل التعداد طبقے کے ذہنوں میں یہ خلش پائی جاتی ہے کہ حدیث دین میں وہ حیثیت نہیں رکھتی جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ دراصل یہ نکتہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حدیث کے سلسلے میں مسلمانوں نے ایک مخصوص انداز و احتیاط کے ساتھ حضور کی حیات طیبہ کے دوران ہی پوری

توجہ اور کاوش کے ساتھ اہتمام کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن اسے قرآن کی طرح نزول وحی کے ابتدائی دور میں باقاعدہ طور پر ضبط تحریر و حفظ میں لانے سے اس لیے گریز کیا گیا تاکہ احادیث نبویؐ قرآن کی عبارتوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں۔ لیکن امت کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کہ ذرائع کتابت و تحریر کے اس وقت کے حالات کے علی الرغم قرآن بھی کسی قسم کے خارجی اختلاط سے محفوظ رہا اور احادیث نبویؐ بھی ضائع نہ ہوئیں۔ حفاظت و تدوین حدیث کے سلسلے کے اقدامات ایک بہت طولانی داستان کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی تفصیلات اس کتاب کے ایک باب میں نہیں سما سکتیں۔ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک تحریری خطاب میں نہایت خوبی سے اس مسئلے پر روشنی ڈالی اور اس کے کثیر التعداد پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے۔ اگرچہ اس خطاب کو یہاں نقل کرنا طوالت کا باعث ہو گا لیکن اس میں علمی معلومات کی کثرت اور زیر نظر موضوع کی اہمیت کے نکتہ نظر سے افادیت کا پہلو غالب ہے۔ لہٰذا ہم اس سے اقتباسات دینے کے بجائے اس کو کلیتاً نقل کر رہے ہیں۔

تحفظ و تدوین حدیث و سنت کے متعلق سید سلیمان ندویؒ کی ایک تحریر:

اس باب میں تمام دنیا متفق ہے کہ اس حیثیت سے اسلام نے اپنے پیغمبر کی اور نہ صرف اپنے پیغمبر کی بلکہ ہر اس چیز کی اور اس شخص کی جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی حضرتؐ کی ذات مبارک سے تھا، جس طرح حفاظت کی ہے، وہ عالم کے لیے مایۂ حیرت ہے، ان لوگوں کو جو آنحضرت صلعم کے اقوال، افعال اور متعلقات زندگی کی روایت، تحریر اور تدوین کا فرض انجام دیتے تھے، راویان حدیث و روایت یا محدثین اور ارباب سیر کہتے ہیں، جن میں صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، اور بعد کے چوتھی صدی ہجری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ جب تمام سرمایہ روایت، تحریری صورت میں آگیا تو ان تمام راویوں کے نام و نشان، تاریخ زندگی، اخلاق و عادات کو بھی قید تحریر میں لایا گیا جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعہ احوال کا نام اسماء الرجال ہے، مشہور جرمن ڈاکٹر اسپرنگر جو ۱۸۵۴ء اور اس کے بعد تک ہندوستان کے علمی و تعلیمی صیغہ سے متعلق تھے، اور بنگال ایشاٹک سوسائٹی کے سکریٹری تھے، اور ان کے عہد میں خود ان کی محنت سے واقدی کی مغازی، وان کریمر کی اڈیٹر شپ میں ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی اور صحابہ کرامؓ کے حالات میں حافظ ابن حجر کی اصابہ

فی احوال الصحابہ طبع ہوئی، اور جنہوں نے جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے اور اس کے کثیر التعداد پہلوؤں کو سمیٹ لیا کہ وہ پہلے یورپین شخص ہیں جس نے خاص ابتدائی عربی ماخذوں سے ''لائف آف محمد'' لکھی اور لہٰذا ہم اس سے اقتباسات دینے کے بجائے اسے کلیتاً نقل کر رہے ہیں۔ اور مخالفانہ لکھی ہے، وہ بھی اصابہ کے انگریزی مقدمہ مطبوعہ کلکتہ۱۸۵۳ء،۱۸۵۴ء میں لکھتے ہیں،

''کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو۔''

صحابہ کرام کی تعداد حیات نبویؐ کے اخیر سال حجتہ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ تھی،ان میں گیارہ ہزار آدمی ایسے ہیں جن کے نام و نشان آج تحریری صورت میں تاریخ کے اوراق میں جو خاص انہی کے حالات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے موجود ہیں، کہ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک نے کم و بیش آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال و واقعات میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دوسروں تک پہنچایا ہے۔ یعنی جنہوں نے روایت کی خدمت انجام دی ہے، اور یہی سبب ان کی تاریخی زندگی کا ہے،

۱۱ھ میں آنحضرت صلعم نے وفات پائی، اور تقریباً ۴۰ھ تک اکابر صحابہؓ عالم وجود میں رونق افزا رہے، ۶۰ھ تک اصاغر صحابہؓ کی، جو عہد نبوت میں کم سن تھے، خاصی تعداد موجود تھی اور صدی کے ختم ہوتے تک اس نور نبوت کا تقریباً ہر چراغ گل ہو گیا تھا، ہر شہر میں سب سے آخر وفات پانے والے صحابیوں کے نام اور سال وفات یہ ہیں

شمار	اسم گرامی	نام شہر	سال وفات
۱	ابوامامہ باہلیؓ	شام	۸۶ھ
۲	عبد اللہؓ بن حارث بن جزاء	مصر	۸۶ھ

۳	عبد اللہؓ بن ابی اوفی	کوفہ	۸۷ھ
۴	۴ سائبؓ بن یزید	مدینہ	۹۱ھ
۵	انسؓ بن مالک	بصرہ	۹۳ھ

حضرت انسؓ بن مالک جنہوں نے اس فہرست میں سب سے آخری جگہ پائی ہے، وہ آنحضرت صلعم کے خادم خاص تھے، دس برس تک متصل آنحضرت صلعم کی خدمت میں رہے ہیں وہ ۹۳ھ میں وفات پاتے ہیں۔

تابعینؒ یعنی صحابہؓ کے تلامذہ کا دور اھ کے آغاز سے اس طرح شروع ہوتا ہے کہ گویا وہ پیدا ہو چکے تھے، مگر آنحضرت کی زیارت سے محروم رہے، یا بہت بچے تھے اور آنحضرت صلعم کا فیض نہ حاصل کر سکے، چنانچہ عبدالرحمٰن بن حارث تابعیؒ تقریباً ۳ھ میں، قیس بن ابی حازمؒ ۴ھ میں، سعیدؒ بن مسیب ۱۴ ھ میں پیدا ہو چکے تھے، یہ دکھانے کے لیے کہ صحابہؓ کے بعد گروہ در گروہ تابعین جو دنیا اسلام کے گوشہ گوشہ میں پھیلے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقائع و حالات اور احکام و قضایا کی تعلیم و تبلیغ اور اشاعت میں مصروف تھے، ان کی مجموعی تعداد کیا ہو گئی، میں صرف ایک مدینہ کے تابعین کی تعداد ابن سعد کے حوالہ سے بتاتا ہوں طبقہ اولی یعنی ان تابعیوں کی تعداد جنہوں نے بڑے بڑے صحابہؓ کو دیکھا تھا اور ان سے واقعات و مسائل سنے تھے، ۱۳۹ ہے۔ طبقہ دوم یعنی وہ تابعین جنہوں نے مدینہ میں عام صحابیوں کو دیکھا اور ان سے سنا ۱۲۹ ہیں۔ طبقہ سوم کے وہ تابعین جنہوں نے متعدد یا کسی ایک صحابی کو دیکھا اور ان سے سنا ۸۷ ہیں، اس طرح تابعین کی کل تعداد ۳۵۵ ہے، یہ تعداد صرف ایک شہر کی ہے، اس سے مکہ معظمہ، طائف، بصرہ، کوفہ، دمشق، یمن، مصر، وغیرہ کے تابعیوں کا اندازہ لگاؤ جو اپنے اپنے شہروں میں صحابہ کرامؓ کے تلمذ کا شرف رکھتے تھے، اور جن کے روزوشب کا مشغلہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی اشاعت و تبلیغ تھی، اس اہتمام کو خیال کرو کہ ہر صحابیؓ سے جو کچھ روایتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا شمار کر لیا گیا اور وہ گن لی گئیں، اس سے اندازہ کرو کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کے حالات و اقوال کی فراہمی میں کس قدر بلیغ اہتمام کیا گیا ہے، صحابہ کرامؓ میں سے جن اصحاب کی سب سے زیادہ روایتیں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱	حضرت ابو ہریرہؓ	۵۳۷۴	۵۹ھ
۲	حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۲۶۶۰	۲۸ھ
۳	حضرت عائشہ صدیقہؓ	۲۲۱۰	۵۸ھ
۴	حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۱۶۳۰	۷۳ھ
۵	حضرت جابر بن عبد اللہؓ	۱۵۶۰	۷۸ھ
۶	حضرت انس بن مالکؓ	۱۲۸۶	۹۳ھ
۷	حضرت ابو سعید خدریؓ	۱۱۷۰	۷۴ھ

یہی وہ لوگ ہیں جن کی روایت آج سیرت نبویؐ کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں، ان کی وفات کی تاریخوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ ان کی وفات کے سال اس قدر متاخر ہیں کہ ان سے فیض اٹھانے اور ان کی روایتوں کو حفظ اور تدوین کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہو گی، انہی باتوں کی واقفیت اور آگاہی کا نام اس زمانہ میں علم تھا اور وہ دینی اور دنیادی دونوں عزتوں کا ذریعہ تھیں، اس لیے ہزاروں صحابہؓ نے جو کچھ دیکھا اور جانا تھا، آنحضرتؐ کے حکم ''بالغواعنی'' مجھ سے جو کچھ سنو اور دیکھو اس کی اشاعت کرو یا ''فلیبلغ الشاھد الغائب (جو مجھے دیکھ رہے ہیں اور مجھ سے سن رہے ہیں وہ ان کو مطلع کر دیں، جو اس سے محروم رہے ہیں) کے مطابق وہ سب اپنی اپنی اولادوں، عزیزوں، دوستوں، اور ملنے والوں کو سناتے اور بتاتے رہتے تھے، یہی ان کی زندگی کا کام اور یہی ان کے روزوشب کا مشغلہ تھا، اس لیے صحابہؓ کے بعد فوراً ہی دوسری نوجوان پود ان معلومات کی حفاظت کے لیے کھڑی ہو گئی، ان میں سے ہر ایک کو ہر واقعہ کا لفظ لفظ یاد کرنا پڑتا تھا، ان کو دہرانا پڑتا تھا، اور حرفاً حرفاً

محفوظ رکھنا پڑتا تھا، آنحضرت صلعم نے جہاں اپنے اقوال اور افعال کی اشاعت کی تاکید کی تھی وہاں یہ بھی تہدید کر دی تھی کہ جو کوئی میرے متعلق قصداً کوئی غلط یا جھوٹ بات بیان کرے گا، اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا'' اس اعلان کا یہ اثر تھا کہ بڑے بڑے صحابہؓ روایت کرتے وقت کانپنے لگتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک دفعہ آنحضرت صلعم کی کوئی بات نقل کی، تو چہرے کا رنگ بدل گیا، تھرا گئے، پھر کہا حضورؐ نے ایسا ہی فرمایا تھا، یا اسی کے قریب قریب فرمایا تھا۔''

عربوں کا حافظہ فطرۃً نہایت قوی تھا، وہ سینکڑوں شعر کے قصیدے زبانی یاد رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فطرت کا قاعدہ یہ ہے کہ جس قوت سے جس قدر کام لیا جائے اسی قدر زیادہ اس کو ترقی ہوتی ہے، صحابہؓ اور تابعینؒ نے قوت حفظ کو معراج کمال تک پہنچایا، وہ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک حدیث کو اس طرح زبانی سن کر یاد کرتے تھے جیسے آج مسلمان قرآن مجید یاد کرتے ہیں، ایک ایک محدث کئی کئی ہزار اور کئی کئی لاکھ حدیثیں زبانی یاد کرتا تھا، اور یاد رکھتا تھا، اور گو بعد میں لوگ اپنی یادداشت کے لیے لکھ بھی لیتے تھے مگر جب تک وہ زبانی یاد نہ رکھتے، اہل علم کی نگاہوں میں ان کی عزت نہیں ہوتی تھی، اور وہ خود اپنی تحریری یادداشتوں کو عیب کی طرح چھپاتے تھے، تاکہ لوگ ایسا نہ سمجھیں کہ ان کو یہ چیزیں یاد نہیں ہیں۔

دوستو! بعض اورینٹیلسٹ اسکالرس، اور بعض پڑھے لکھے مشنریوں نے جن میں سب سے آگے سرولیم میور اور گولڈ زیر ہیں، اس بنا پر کہ روایات نبویؐ کی تحریر و تدوین کا کام آنحضرت صلعم کی وفات کے ۹۰ برس بعد شروع ہوا ان کی صحت اور وثوق میں شک پیدا کرنا چاہا ہے، مگر ہم نے جس طرح اوپر بتفصیل آپ کے سامنے پوری روداد رکھی ہے اور بتایا ہے کہ صحابہؓ کسی طرح واقعات یاد رکھتے تھے، کس طرح احتیاط برتتے تھے، کس طرح آنے والی نسلوں کو وہ امانت سپرد کرتے تھے، اس سے خود اندازہ ہو گا کہ گو وہ روایات تحریری صورت میں بہت بعد کو آئی ہوں تاہم ان کی صحت اور وثوق میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

صحابہؓ نے اپنی معلومات کو عموماً تین اسباب سے قید تحریر میں لانا مناسب نہیں سمجھا۔

۱۔ ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے علاوہ کسی اور چیز کو کتاب کی صورت میں رکھنے کی ممانعت کر دی تھی، اور فرمایا تھا کہ قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ نہ لکھو لا تکتبوا عنی غیر القرآن اور یہ اس لیے تھا کہ عام لوگوں کو قرآن اور غیر قرآن میں باہمی التباس نہ ہو جائے، چنانچہ جب قرآن مسلمانوں میں پوری طرح محفوظ ہو گیا تو آخر میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ کو احادیث کی تحریر کی اجازت دے دی، اس پر بھی اکثر صحابہؓ ان کو قید تحریر میں لانے سے اخیردم تک احتیاط برتتے رہے۔

۲۔ صحابہؓ کو ڈر تھا کہ وقائع کے تحریری صورت میں آجانے کے بعد لوگوں کو پھر ان کے ساتھ وہ اعتنا، توجہ اور مشغولیت باقی نہیں رہے گی اور لوگ تحریری مجموعہ کے موجود رہنے کے سبب سے ان کے حفظ اور زبانی یاد رکھنے کی محنت سے جی چرائیں گئے، یہ ڈر بالکل صحیح ثابت ہوا، چنانچہ جیسے جیسے سفینوں کا علم بڑھتا گیا، سینوں کا علم گھٹتا گیا، نیز اسی سلسلہ میں ان کو یہ بھی خیال تھا کہ ہر کس وناکس کتاب کے مجموعہ کو ہاتھ میں لے کر عالم بننے کا دعویٰ کر بیٹھے گا، چنانچہ یہ بھی ہوا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ابھی تک عرب میں کسی واقعہ کو لکھ کر اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا، لوگ اس کو اپنی کمزوری کا اعلان خیال کرتے تھے۔ اس لیے کوئی چیز تحریر بھی کر لیتے تھے تو اس کو چھپائے رکھتے تھے۔

محدثین کا خیال تھا کہ زبانی یادداشت تحریری یادداشت سے زیادہ محفوظ صورت ہے، یادداشت کو دوسروں کے تصرف سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا، ہر وقت خطرہ رہتا کے کوئی اس میں کمی بیشی نہ کر دے مگر جو نقوش دلوں کی لوحوں پر کندہ ہو جاتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔

آج پہلی دفعہ آپ کی مجلس میں، اور سب سے پہلے آپ کی مجلس میں اس حقیقت کو آشکارا کیا جاتا ہے، کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ سو برس یا نوے برس تک وقائع واقوال نبوی کا دفتر صرف زبانی روایتوں تک محدود رہا، اس غلط فہم کا اصلی سبب یہ ہے کہ احادیث و اخبار نبویؐ کی پہلی کتاب امام مالکؒ کی موطا اور مغازی و سیرت میں ابن اسحاقؒ کی کتاب المغازی

سمجھی جاتی ہے، یہ دونوں بزرگوار ہم عصر تھے، اور ان کی وفات بہ ترتیب ۱۷۹ھ اور ۱۵۱ھ میں ہوئی، اس لیے اخبار و سیر کی سب سے پہلی تدوین کا زمانہ دوسری صدی ہجری کا اوائل سمجھا جاتا ہے، حالانکہ عمرؒ بن عبدالعزیز نے ۱۰۱ھ میں وفات پائی، وہ خود بڑے عالم تھے، مدینہ کے امیر بھی رہ چکے تھے۔ ۹۹ھ میں خلیفہ ہوئے، انہوں نے اپنی خلافت کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے قاضی ابو بکر محمد بن عمرو بن حزم کو جو حدیث و خبر کے بڑے امام تھے، فرمان بھیجا کہ آنحضرت صلعم کے سنن و اخبار کی تحریر و تدوین کا کام شروع کردو کیونکہ مجھے رفتہ رفتہ علم کے گم ہو جانے کا ڈر ہو رہا ہے۔ یہ واقعہ تعلیقات بخاری، موطا اور مسند دارمی وغیرہ میں مذکور ہے، چنانچہ اس فرمان کی تعمیل کی گئی اور اخبار و احادیث و سنن دفاتر میں لکھ کر دارالخلافہ میں آئے اور ان کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجی گئیں (مختصر جامع بیان العلم ابن عبد البر صفحہ ۳۸ مطبوعہ مصر)۔

ابو بکر بن محمد عمرو بن حزم کا انتخاب اس کام کے لیے اس لیے ہوا کہ وہ خود امام تھے، مدینتہ العلم مدینہ منورہ میں قاضی وقت تھے،لیکن اس کے علاوہ اس لیے بھی یہ انتخاب موزوں تھا کہ ان کی خالہ عمرہ، حضرت عائشہؓ کی سب سے بڑی شاگرد تھیں، اور ان کی روایتیں جو حضرت عائشہؓ سے تھیں ان کا سرمایہ ابو بکر بن حزم کے پاس پہلے سے جمع تھا، چنانچہ حضرت عمربن عبد العزیزؒ نے ان کو خاص عمرہ کی روایوں کی تدوین کے متعلق بھی حکم دیا تھا۔

عہد نبوی کا تحریری سرمایہ

آگے بڑھ کر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ عہد نبویؐ ہی میں اخبار وسیر احکام و سنن کا تحریری سرمایہ جمع ہونا شروع ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر آپ نے ایک خطبہ دیا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ ابو شاہؓ ایک یمنی صحابی کی درخواست پر آپ نے یہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالہ کرنے کا حکم دیا، (باب کتابتہ العلم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین عالم کے نام جو خطوط روانہ کیے وہ لکھے ہوئے تھے، دس پندرہ برس ہوئے کہ مصر میں آپ کا وہ خط جو مقوقس شاہ مصر کے نام آپ نے بھیجا تھا ایک عیسائی گرجے کی کسی کتاب کی جلد میں لگا ہوا ملا ہے، گمان کیا جاتا ہے کہ بعینہٖ وہی نامہ ہے جو آپؐ نے لکھوایا تھا، اس کے فوٹو عام

طور سے ملتے ہیں، یہ پرانے عربی خط میں ہے، اور اس کی بعینہٖ وہی عبارت ہے۔ اور مہر میں نام کے وہی الفاظ اور صورت تحریر ہے، جس طرح حدیثوں میں بیان آیا ہے۔

یہ اسلامی روایات کی صداقت کی کتنی بڑی دلیل ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو حدیث یاد نہیں۔ مجھ سے زیادہ ان کے پاس حدیثوں کا سرمایہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلعم سے جو کچھ سنتے اس کو لکھتے جاتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (بخاری باب کتابتہ العلم) ابوداؤد اور مسند ابن حنبل میں ہے کہ بعض لوگوں نے عبداللہؓ بن عمروؓ سے کہا کہ آنحضرت صلعم کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوش رہتے ہیں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو، عبد اللہؓ بن عمرو نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے، حق نکلتا ہے'' (ابوداؤد جلد ۲، صفحہ ۷۷) عبداللہ بن عمروؓ نے اپنے اس مجموعہ کا نام صادقہ رکھا تھا، (ابن سعد ج ۲ قسم ۲ ص ۱۲۵) اور کہا کرتے تھے مجھے اپنی زندگی کی آرزو صرف دو چیزوں نے پیدا کر دی ہے، جن میں ایک یہ صادقہ ہے اور صادقہ وہ صحیفہ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا ہے۔ (دارمی ۲۹) مجاہد کہتے ہیں کہ ہم نے عبداللہؓ عمرو صحابی کے پاس ایک کتاب رکھی دیکھی۔ دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا یہ صادقہ ہے جس میں ، میں نے خود آنحضرت صلعم سے سنا کہ جس میں میرے اور آپ کے درمیان کوئی دوسرا نہیں ہے۔ (ابن سعد ۲ - ۲ — ۱۲۵) صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے مدینہ آنے کے کچھ مدت بعد مسلمانوں کی مردم شماری کرائی اور ان کے نام لکھوائے تو پندرہ سو ہوئے باب (الجہاد زکٰوۃ) کے احکام، مختلف چیزوں پر زکٰوۃ اور اس زکٰوۃ کی مختلف شرحیں جو پورے دو صفحوں میں ہیں، ان کو لکھوا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء کو بھیجا تھا، اور وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ابو بکر بن عمرو بن حزم کے خاندان میں متعدد اشخاص کے پاس موجود تھیں (دار قطنی کتاب الزکٰوۃ ۲۰۹) زکٰوۃ کے محصلین کے پاس دیگر تحریری ہدایتیں بھی موجود تھیں، (دار قطنی ۲۰۴) حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جو ان کی تلوار کے نیام میں پڑا رہتا تھا۔ اس میں متعدد حدیثیں متعلقہ احکام قلمبند تھیں اور انہوں نے اس کو لوگوں

کی درخواست پر دکھایا (بخاری ۲ صفحہ ۱۰۸۴ و ۱۰۲۰) حدیبیہ میں جو صلح نامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار قریش کے درمیان حضرت علیؓ نے لکھا تھا اس کی ایک نقل قریش نے لے لی، اور ایک آنحضرت نے اپنے پاس رکھی (ابن سعد مغازی ص ۷۱) عمروؓ بن حزم کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر لکھوا کر حوالہ کی جس میں فرائض، صدقات، دیات، وغیرہ کے متعلق بہت سی ہدایتیں تھیں (کنز العمال ۳۷ صفحہ ۱۸۶) عبداللہ بن الحکیم کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ پہنچا جس میں مردہ جانورکے بارے میں حکم درج تھا۔ وائلؓ بن حجر صحابی جب بارگاہ نبوی سے اپنے وطن حضر موت جانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خاص طور پر ایک نامہ لکھوا کر دیا، جس میں نماز، روزہ، ربو، شراب اور دیگر احکام تھے، (طبرانی صغیر صفحہ ۲۴۲) ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے مجمع سے پوچھا کہ کسی کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کی دیت میں بیوی کو کیا دلایا؟

ضحاک بن سفیان نے کھڑے ہو کر کہا، مجھے معلوم ہے، آنحضرت صلعم نے ہم کو یہ لکھوا کر بھیجا تھا۔

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے اپنے عہد خلافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے متعلق صدقات کی تلاش کے لیے اہل مدینہ کے پاس قاصد بھیجا تو عمرو بن حزم کے ہاں مل گیا (دار قطنی ۴۵۱) آپ نے اہل یمن کو جو احکام لکھوا کر بھجوائے تھے، ان میں یہ مسئلے تھے ، قرآن صرف پاکی کی حالت میں چھوا جائے، غلام خریدنے سے پہلے آزاد نہیں کیا جا سکتا اور نکاح سے پہلے تین طلاق نہیں (دارمی صفحہ ۲۹۳) حضرت معاذ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھ کر غالباً یمن سے یہ دریافت کیا کہ کیا سبزیوں میں زکوٰۃ ہے؟ آپ نے تحریری جواب دیا کہ سبزیوں پر زکوٰۃ نہیں (دار قطنی صفحہ ۴۵) مروان نے خطبہ میں بیان کیا کہ مکہ حرم ہے، رافعؓ بن خدیج صحابی نے پکار کر کہا ''اور مدینہ بھی حرم ہے اور یہ حکم میرے پاس لکھا ہوا ہے اگر تم چاہو تو تم کو پڑھ کر سناؤں'' (ابن حنبل ج ۴، ص ۱۴۱) ضحاک بن قیس نے نعمانؓ بن بشیر صحابی کو لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ کے سوا اور کون سی سورہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے جواب لکھا کہ

هل اتاک حضرت عمرؓ نے عتبہ بن فرقد کو خط لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حریر پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم ۲ - ۳۰۷)

یہ وہ احکام و مسائل ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف لوگوں کو لکھوا کر دیے یا بجھوائے، ہمارے پاس ایسے شواہد بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑے بڑے صحابہ احکام و سنن کو کتابی صورت میں لائے یا لانا چاہا، حضرت ابو بکرؓ نے ایک مجموعہ اپنے زمانہ خلافت میں مرتب کیا پھر اس کو پسند نہ کیا، اور مٹا دیا (تذکرۃ الحفاظ) حضرت عمرؓ نے اس مسئلہ پر اپنے زمانہ خلافت میں غور کیا اور بہت کچھ سوچتے رہے مگر پھر ہمت نہ کی، ابھی آپ سن چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ایک نسخہ لکھا تھا جس میں آپ کے ملفوظات تھے۔ مختلف لوگ اس کو دیکھنے آتے تھے، اور وہ اس کو دکھاتے تھے، (ترمذی ۵۸۶) حضرت علیؓ کے فتاویٰ کا بڑا حصہ لکھا ہوا حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں لایا گیا (مسلم مقدمہ) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایتوں کے مختلف تحریری مجموعے تھے۔ اہل طائف میں سے کچھ لوگ ان کا ایک مجموعہ ان کو پڑھ کر سنانے کے لیے لائے (کتاب العلل ترمذی صفحہ ۶۹۱) سعید بن جبیر انکی روایتوں کو لکھا کرتے تھے (دارمی ۶۹) عبد اللہ بن عمروؓ کا صحیفہ صادقہ ان کے پوتے عمرو بن شعیب کی پاس موجود تھا (ترمذی ۶۱، ۱۱۳) اور یہ بیچارے اس لے ضعیف سمجھے جاتے تھے کہ وہ اپنے دادا کی کتاب دیکھ کر روایت کرتے ہیں، خود حافظ نہیں ہیں۔ (تہذیب ج ۱، ص ۳۱۶) حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایتوں کا دوسرا مجموعہ سلیمان بن قیس لشکری نے تیار کیا تھا، اور ابوالزبیر، ابوسفیان، اور شعبی نے جو ائمہ حدیث میں ہیں اور تابعی ہیں، حضرت جابرؓ کے صحیفہ کو ان سے سنا۔ (تہذیب ج ۶ ص ۲۱۱) سمرہؓ بن جندب صحابی سے ان کے بیٹے سلیمان روایتوں کا ایک نسخہ روایت کرتے ہیں، اور ان سے ان کے بیٹے حبیب (تہذیب التہذیب ۴ – ۱۹۸)

حضرت ابو ہریرہ جن سے زیادہ صحابہؓ میں کوئی حافظ حدیث نہ تھا، ان کی روایتوں کا کچھ مجموعہ ہمام بن منبہ نے تیار کیا تھا جو صحیفہ ہمام کے نام سے احادیث میں مشہور ہے، اس کو امام ابن حنبل نے مسند جلد ۲ میں صفحہ ۳۱۲ سے صفحہ ۳۱۸ تک نقل کیا ہے، بشیر ابن نہیک نے حضرت ابو ہریرہؓ سے ان کی روایتوں کا مجموعہ لکھا، اور پھر اس کی روایت کی ان

سے اجازت لی (کتاب العلل ترمذی ۶۹۱، دارمی ۶۸) حضرت ابو ہریرہؓ ایک دفعہ ایک صاحب کو اپنے مستقر پر بلا کر لائے اور دکھایا کہ یہ اوراق میرے مرویات ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ وہ ان کے ہاتھ کے نہیں بلکہ کسی اور کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے (فتح الباری جلد ص ۱۸۴، ۱۸۵)

حضرت انسؓ دوسرے صحابی ہیں جن سے بکثرت روایتیں ہیں۔ وہ خود اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ میرے بچو علم کو تحریر کی قید و بند میں لاؤ (دارمی ۶۸) ابان ان کے شاگرد ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی روایتیں قید تحریر میں لایا کرتے تھے، (دارمی) سلمٰی ایک خاتون کہتی ہیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو دیکھا کہ وہ ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام سے آنحضرت کے کارنامے لکھا کرتے تھے (ابن سعد ۲ قسم ۲ ص۱۴۳)

واقدی سیرت نبوی کے ابتدائی مصنّفین میں سے ایک سے بیان کرتا ہے کہ منذر بن سادی رئیس عمان کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط بھیجا تھا وہ ابن عباسؓ کی کتابوں کے ساتھ میں نے دیکھا (زاد المعاد ۲ – ۵۷) غزوۂ بدر کا مفصل حال عروہ بن زبیر نے لکھا کر خلیفہ عبدالملک کو بھیجا تھا، (طبری ۱۲۸۵)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے اور ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کا اذن عام تھا۔ ان کو شکایت تھی کہ لوگ میرے پاس آکر سن جاتے ہیں اور پھر اس کو جاکر لکھ لیتے ہیں اور میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کے کے لکھنے کو حلال نہیں مانتا (دارمی) سعید بن جبیر تابعی کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے رات کو روایتیں سنتا تھا تو پالان پر لکھتا تھا، صبح کو پھر اس کو صاف کر لیتا تھا (دارمی ۴۹) براءؓ بن عازب صحابی کے پاس لوگ بیٹھ کر ان کی روایتوں کو لکھا کرتے تھے (دارمی) نافع جو حضرت ابن عمر کی خدمت میں ۳۰ برس رہے تھے، وہ اپنے سامنے لوگوں کو لکھوایا کرتے تھے (دارمی) عبداللہ ابن مسعودؓ کے صاحبزادہ عبدالرحمان ایک کتاب نکال لائے اور قسم کھا کر کہا یہ خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے (جامع ۱۷) سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ ہم لوگوں میں بعض باتوں میں

اختلاف ہوتا تھا تو ان کو لکھتے تھے، پھر حضرت ابن عمرؓ کے پاس اس یاد داشت کو چھپا کر لاتے تھے ان سے پوچھتے تھے اگر ان کو اس کا پتہ چل جاتا تو بس ہمارے ان کے درمیان فیصلہ ہی تھا (جامع ۳۳) اسود تابعی کہتے ہیں کہ مجھ کو اور علقمہ کو ایک صحیفہ مل گیا۔ اس کو لے کر ہم حضرت ابن عمرؓ کے پاس آئے تو انہوں نے مٹا دیا (جامع) حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی تھے ان کو بھی روایتوں کو تحریر میں لانے سے انکار تھا، تو مروان نے یہ تدبیر کی کہ ان کو سامنے بٹھایا اور پردہ کے پیچھے کاتب مقرر کیے کہ وہ جو بولتے جائیں یہ لکھتے جائیں۔ حضرت معاویہؓ نے بھی ان کی ایک حدیث اسی طرح لکھوائی تھی لیکن وہ تاڑ گئے اور زبردستی مٹوا دی۔ (احمد ۵، ص۱۸۶)

حضرات ! شاید آپ ٹھوس واقعات اور اشخاص کے نام سنتے سنتے گھبرا اٹھے ہوں، لیکن اطمینان رکھیے کہ اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے صاف اور سیدھا راستہ نظر آ رہا ہے۔ میں نے ان اقتباسات اور حوالوں میں یہ دکھایا ہے کہ تحریری سرمایہ ہی اگر دنیا میں قابل وثوق ہو سکتا ہے، تو خود عہد نبویؐ میں صحابہؓ نے اپنے ہاتھوں سے اس کو جمع کیا اور پچھلوں کے لیے یادگار چھوڑا، اور پچھلوں نے اس کو اپنی کتابوں میں داخل کر لیا اب ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صحابہؓ ہی کی زندگی میں تابعین نے ان کے تمام مرویات، واقعات اور حالات کو ایک ایک سے پوچھ کر ایک ایک کے دروازے پر جا کر بوڑھے جوان، مرد، عورت سب سے تحقیق کر کے ہمارے لیے فراہم کر دیا تھا۔ محمد بن شہاب زہری، ہشام بن عروہ، قیس بن ابی حازم، عطاء بن ابی رباح، سعید بن جبیر، ابو الفرناد، وغیرہ سینکڑوں تابعین ہیں جنہوں نے دیوانہ وار ایک ایک گوشہ سے دانہ دانہ جمع کیا، اور ہمارے سامنے اس کا انبار لگا دیا۔ شہاب زہری نے ''جو حدیث و سیرت کے بڑے امام ہیں'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک چیز کو لکھا۔ ابوالزناد کہتے ہیں کہ ہم صرف حلال و حرام لکھتے رہتے تھے۔ اور زہری جو کچھ سنتے تھے وہ سب لکھتے جاتے تھے۔ ابن کیسان کہتے ہیں کہ میں اور زہری طلب علم میں ساتھ تھے۔ میں نے کہا کہ میں سنن لکھوں گا چنانچہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تھا، سب لکھا، زہری نے کہا صحابہؓ سے جو کچھ متعلق ہے وہ بھی لکھو کہ وہ بھی سنت ہے۔ میں نے کہا وہ سنت نہیں، چنانچہ میں نے نہیں لکھا انہوں نے لکھا۔ نتیجہ یہ

ہوا کہ وہ کامیاب ہوئے اور میں برباد ہو گیا (ابن سعد ۲، قسم ۲ - صفحہ ۱۳۵) ان امور کو قید تحریر میں لانے والے سینکڑوں تابعی تھے جن میں سے ایک امام زہری ہیں، صرف انکی تحریوں کا انبار اتنا تھا کہ ولید بن یزید کے قتل کے بعد زہری کا یہ دفتر جانوروں پر بار کر کے خزانے سے لائے گئے تھے۔

امام زہری ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ میں وفات پائی، وہ نسبۂ قریشی تھے، انہوں نے جس محنت، کاوش اور استقصا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اقوال جمع کیے اس کا اندازہ مؤرخین کے اس بیان سے کرو کہ ''وہ مدینہ منورہ کے ایک ایک انصاری کے گھر جاتے، جوان، بڈھے، عورت، مرد جو مل جاتا یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جا کر آنحضرت کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلم بند کرتے (تہذیب، ترجمہ زہری) اس زمانہ میں بکثرت صحابہؓ زندہ تھے، زہری کے تلامذہ کی فہرست نہایت طویل ہے، اور یہ کل کے کل روزوشب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کی جمع و ترتیب، تعلیم و تدریس اور نشر و اشاعت میں مشغول تھے، یہی ان کی زندگی کا کام تھا، اس کے سوا دنیا کے ہر کام سے وہ کنارہ کش ہو گئے تھے۔

غلط فہمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث و سیر کی تدوین و تحریر کا کام تابعین نے شروع کیا، اور تابعین ان کو کہتے ہیں جنہوں نے صحابہؓ کو دیکھا اور ان سے فیض پایا، اور صحابہؓ کا زمانہ سو برس تک تقریباً رہا تو گویا تابعین کا عہد سو برس کے بعد شروع ہوا اور اس طرح گویا تدوین و تحریر کے سلسلہ کا آغاز سو برس کے بعد ہوا، حالانکہ یہ تمام تر غلط ہے تابعین ان کو کہتے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلعم کی زیارت کا شرف حاصل نہیں کیا اور صحابہؓ کی زیارت کی اور ان سے مستفید ہوئے عام اس سے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوں مگر زیارت کا موقع نہ ملا ہو، یا عہد نبوی کے آخر میں پیدا ہوئے، اس لیے آپ سے فیضیاب نہ ہوئے، یا آپ کی وفات ربیع الاول ۱۱ھ کے بعد پیدا ہوئے، وہ سب تابعین میں داخل ہیں، اس طرح دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ تابعین کا عہد خود آپ کی زندگی ہی میں اور کم سے کم یہ کہ ۱۱ھ سے شروع ہو گیا تھا، اس لیے ۱۱ھ سے جو کام شروع ہوا اس کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ تابعین نے اس کام کا آغاز کیا۔ تابعین کا

کارنامہ شروع ہونے کے لیے ایک ایک صحابی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی ضرورت نہیں اور نہ سو برس کا زمانہ گزارنے کی حاجت ہے، وہ تو تابعیت کا آخری عہد ہے جس کے بعد تابعیت کے شرف کا خاتمہ ہوتا ہے، کیونکہ صحابہؓ کے وجود کا خاتمہ ہو گیا، جن کے دیدار کے شرف سے لوگ تابعی بنتے تھے، الغرض اس تفصیل سے ثابت ہو گا کہ یہ کہنا کس درجہ دھوکا ہے کہ مسلمانوں میں اخبار و سیر کی ترتیب کا کام سو برس کے بعد شروع ہوا۔

مسلمانوں میں اخبار و سیر اور احکام و سنن کی ترتیب اور تدوین کے در حقیقت تین دور ہیں، اول جب ہر شخص نے صرف اپنی ذاتی معلومات کو یکجا کیا، دوسرا دور وہ آیا جب ہر شہر کی معلومات ایک جگہ فراہم کی گئیں۔ تیسرا دور وہ تھا جب تمام دنیائے اسلام کی معلومات اکٹھا کی گئیں اور ان کو موجودہ کتابوں کی صورت میں جمع کیا گیا، پہلا دور غالباً ۱۰۰ھ تک قائم رہا، دوسرا دور ۱۵۰ھ تک رہا، اور تیسرا دور ۱۵۰ھ سے تیسری صدی کے کچھ دنوں بعد تک قائم رہا۔ پہلا دور صحابہؓ اور اکابر تابعین کا تھا، دوسرا دور تبع تابعین کا اور تیسرا دور امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام احمد بن حنبل وغیرہ کا تھا۔ پہلے دور کا تمام سرمایہ دوسرے دور کی کتابوں میں ہے، اور دوسرے دور کی کتابوں کا تمام مواد تیسرے دور کی کتابوں میں کھپا دیا گیا ہے اور دوسرے اور تیسرے دور کی کتابوں کا سرمایہ آج ہزاروں اوراق میں ہمارے پاس موجود ہے، اور دنیا کی تاریخ کا سب سے گراں بہا سرمایہ اور معتبر و مستند ذخیرہ ہے جس سے زیادہ مستند اور معتبر دنیا کی تاریخ کے خزانہ میں کوئی اور ذخیرہ نہیں۔

حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کے بقول ''اس قسم کی زبانی روایتوں کے قلمبند کرنے کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آیا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ کیا جاتا ہے، کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کرلی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور اقتباسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑے زمانہ کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی اکثر یورپین تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔''

"لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا، اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام درمیانی راویوں کے نام بہ ترتیب بیان کیے جائیں، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے، کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا چال چلن کیا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا نکتہ رس؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل تھا، لیکن سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے۔ راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے حالات دریافت کیے، انہی تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن ایجاد کیا جس کی بدولت کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔"

یہ تو صرف روایت کے متعلق تھا۔ اصول تنقید اور درایت یعنی عقلی حیثیت سے روایتوں کے پرکھنے کے اصول و قواعد الگ ترتیب دیے اور بتایا کہ کیونکر اس حیثیت سے روایتوں کی تصحیح یا تغلیط کی جا سکتی ہے، راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعات آج اسلام کے مفاخر میں ہیں۔ راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے، جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی اور ان کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں ان کو مل سکتا تھا۔ امام وکیع بڑے محدث تھے لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے، اس بناء پر وہ خود ان سے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے راوی کو ضرور ملا لیتے یعنی اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے۔ مسعودی ایک محدث ہیں۔ ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انہوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی۔ یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے، صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں،

انہوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا۔ کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانت داری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے۔"

اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کچا، پکا صحیح اور غلط قوی اور ضعیف، قابل قبول اور ناقابل قبول روایتوں کا انبار آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے، اور آج بھی اسی اصول کے مطابق ہر ایک واقعے کی پوری تنقید کی جا سکتی ہے اور کھرے کھوٹے کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ حضرات! ان خشک تحقیقات میں میں نے آپ کا بڑا وقت لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا تاریخی پہلو اب بڑی حد تک آپ کے سامنے آگیا ہو گا، اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور واقعات کا جو سرمایہ فراہم ہوا اس کے کیا کیا ماخذ قرار پائے اور اس کو کس کس طرح ترتیب دیا گیا، سیرت مبارکہ کا سب سے اہم، سب سے مستند سب سے زیادہ صحیح تو وہ حصہ ہے جس کا ماخذ خود قرآن پاک ہے، جس کی صحت اور معتبری میں دوست کیا دشمن بھی شک نہ کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تمام ضروری اجزاء قبل نبوت کی زندگی، یتیمی، غربت، تلاش حق، نبوت، وحی، اعلان و تبلیغ، معراج، مخالفین کی دشمنی، ہجرت، لڑائیاں، وقائع، اخلاق، سب اس میں موجود ہیں، اور اس سے زیادہ معتبر تاریخی سیرت دنیا کے پردہ پر کوئی موجود نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا ماخذ احادیث ہیں جو ایک لاکھ کے قریب ہیں جن میں صحیح الگ، کمزور الگ اور جعلی الگ ہیں، صحاح ستہ کا سرمایہ ہے جس کا ایک ایک واقعہ تولا اور پرکھا ہوا ہے، مسانید ہیں، جن میں سب سے ضخیم امام ابن حنبل کا مسند ہے جو چھ جلدوں میں ہے اور ان میں سے ہر جلد کی ضخامت مصر کے بڑے باریک صفحہ کے ٹائپ میں پانچ پانچ سو صفحوں سے کم نہ ہو گی۔ اس میں ایک ایک صحابی کی روایتیں الگ الگ ہیں، ان مجموعوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور تعلیمات سب کچھ ملے جلے ہیں۔

۳۔ تیسرا ماخذ مغازی یعنی وہ کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف غزوات اور لڑائیوں کا حال، اور ضمناً اور واقعات بھی موجود ہیں۔ ان میں مغازی عروہ بن زبیر المتوفی ۹۴ھ، مغازی زہری المتوفی ۱۲۴، مغازی موسیٰ ابن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ، مغازی ابن اسحاق المتوفی ۱۵۰ھ، مغازی زیاد بکائی المتوفی ۱۸۳، مغازی واقدی المتوفی ۲۰۷ھ وغیرہ قدیم ہیں۔

۴۔ چوتھا ماخذ عام تاریخ کی کتابیں ہیں جن کا پہلا حصہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح پر ہے، ان میں سے زیادہ معتبر طبقات ابن سعد اور تاریخ الرسل و الملوک امام ابو جعفر طبری، تاریخ صغیر و کبیر، امام بخاری، تاریخ ابن حبان اور تاریخ ابن ابی خشیمہ بغدادی المتوفی ۲۹۹ھ وغیرہ ہیں۔

۵ -آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور روحانی کارناموں کا الگ دفتر ہے جن کو کتب دلائل کہتے ہیں۔ مثلاً دلائل النبوت ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ، دلائل النبوت ابو اسحاق حربی المتوفی ۲۵۵ھ، دلائل امام بیہقی المتوفی ۲۳۰ھ، دلائل ابونعیم اصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ، دلائل مستغفری المتوفی ۴۴۲ھ، دلائل ابوالقاسم اسمٰعیل اصفہانی المتوفی ۵۳۵ھ اور سب سے زیادہ مبسوط کتاب اس فن میں امام سیوطی کی خصائص کبریٰ ہے۔

۶۔ پانچواں ماخذ کتب شمائل ہیں یعنی وہ کتابیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اخلاق و عادات اور فضائل و معمولات زندگی پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی اور سب سے مشہور کتاب امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ، کی کتاب الشمائل ہے، جس کی بڑے بڑے علماء نے بیسیوں شرحیں لکھی ہیں اور سب سے ضخیم اور بڑی کتاب اس فن کی کتاب الشفافی حقوق المصطفے قاضی عیاض کی اور اس کی شرح نسیم الریاض شہاب خفاجی کی ہے۔ اس فن کی دوسری کتابیں شمائل النبی ابو العباس مستغفری المتوفی ۴۳۲ھ اور شمائل النور الساطع ابن المقری غرناطی المتوفی ۵۵۲ھ اور سفر السعادہ مجد الدین فیروز آبادی المتوفی۸۱۷ھ کی ہیں۔

۷۔ اس سے الگ وہ کتابیں ہیں جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات میں ہیں۔ جن میں ان شہروں کے عام حالات کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامی حالات اور ان مقامات کے نام و نشان ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق ہے۔

اس قسم کی کتابوں میں سب سے قدیم اخبار مکہ للازرقی المتوفی ۲۲۳ھ، اخبار مدینہ عمر بن شبہ المتوفی ۲۶۲ھ، اخبار مکہ فاکہی، اخبار مدینہ ابن زبالہ وغیرہ ہیں۔

حضرات ! میں نے سیرت مبارکہ کے تاریخی سرمایہ کا جو نقشہ آپ کے سامنے خطبہ میں پیش کیا ہے اس سے موافق و مخالف ہر ایک کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ سیرت محمدی کی تاریخی حیثیت کیا ہے، صرف اس زبانی حفظ اور تحریری یادداشت ہی پر محدثین سلف اور خلفائے اسلام نے قناعت نہیں کی بلکہ اس فن کے بڑے بڑے اماموں کے لیے مغازی کی تعلیم کی غرض سے درسگاہوں اور مسجدوں میں حلقے قائم کیے۔ حضرت قتادہؓ انصاری صحابی تھے۔ ان کے پوتے عاصم بن عمر جو مغازی کے امام تھے اور جنہوں نے ۱۲۱ھ میں وفات پائی ہے۔ خلفیہ عمر بنؒ عبد العزیز کے حکم سے پایہ تخت دمشق کی جامع مسجد میں بیٹھ کر اس کے درس دیتے تھے (تہذیب) غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر اس وقت تک، ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، ہر زبان میں آپ کے واقعات، حالات اور ارشادات میں جو کتابیں لکھی گئیں، ان کا اندازہ کئی ہزار سے زیادہ ہو گا، اردو کا تحریری ذخیرہ سو دو سو برس سے زیادہ کا نہیں، اس میں بھی ٹھوس تصنیف کا عہد ۱۸۵۷ء کے پس و پیش سے شروع ہوتا ہے، تاہم اس وقت تک کئی سو چھوٹی بڑی کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں۔

مسلمانوں کو چھوڑو کہ ان کا تو دین وایمان ہی اس سرکار کی عقیدت و غلامی ہے، دشمنوں کے کیمپ میں آؤ، ہندوستان میں ہندوؤں نے، سکھوں نے، عیسائیوں نے، برھمن سماجیوں نے آپ کی سیرتیں لکھی ہیں۔ یورپ جس کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت نہیں، وہاں بھی مشنری کی خدمت کے لیے یا علمی ذوق، یا تاریخ عالم کی تکمیل کے لیے لائف آف محمد پر کتابیں لکھی گئیں۔ آج غالباً ۱۶۔۱۷ برس پہلے دمشق کے ایک علمی رسالہ المقتبس میں شمار چھپا تھا کہ اس وقت تک یورپ کی مختلف زبانوں میں پیغمبر اسلام کے متعلق ۱۳ سو کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد اس عہد کی اور کتابوں کو ملاؤ تو یہ شمار کہاں تک پہنچے گا۔ انگریزی زبان میں پروفیسر مارگولیس جو اوکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر ہیں، کوز آف دی نیشنز کے سلسلہ میں چھپی ہے۔ زیادہ زہریلی کوئی کتاب سیرت

نبوی پر انگریزی میں نہیں لکھی گئی۔ اس میں اس شخص نے ہر واقعے کے متعلق انتہائی سند بہم پہنچا کر اس کو بگاڑ کر دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے، تاہم وہ اپنے مقدمہ میں اس حقیقت کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔

The biographers of the Prophet Mohammad form a long series it is impossible to end but in which it would be honourable to find a place.

ترجمہ: ''محمد کے سوانح نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا ناممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت ہے''

جان ڈیون پورٹ صاحب نے ۱۸۷۰ء میں انگریزی میں سب سے زیادہ ہمدردانہ کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن لکھی ہے اس کتاب کو وہ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مصنّفین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے وقائع عمری محمد کے وقائع عمری سے زیادہ تر مفصل اور سچے ہوں۔''

ریورنڈ با سورتھ اسمتھ (Baswarthsmith) فیلو آف ٹرینٹی کالج آکسفورڈ نے محمڈ اینڈ محمڈ نزم'' کے نام سے رائل انسٹیٹیوشن آف گریٹ برٹین میں جو لیکچر دیے تھے اور جو کتاب کی صورت میں چھپے ہیں ان میں ریورنڈ موصوف نے نہایت خوبی سے کہا ہے۔

''جو کچھ عام طور پر مذہب کی ابتداء نا معلوم ہونے کی نسبت صحیح ہے وہی بدقسمتی سے ان تین مذہبوں اور ان کے بانیوں کی نسبت بھی صحیح ہے جن کو ہم کسی بہتر نام موجود نہ ہونے کے سبب سے تاریخی کہتے ہیں۔ ہم مذہب کے اولین اور ابتدائی کارکنوں کی نسبت بہت کم اور ان کی نسبت جنہوں نے ان کی محنتوں میں بعد کو اپنی محنتیں ملائیں، شاید زیادہ جانتے ہیں، ہم زرتشت اور کنفیوشس کے متعلق اس سے کم جانتے ہیں جو سولن اور سقراط کے متعلق جانتے ہیں۔ موسیٰ اور بودھ کے متعلق اس سے کم واقف ہیں۔ جو ہم ایمبراس (Ambrase)اور سیزر کے متعلق جانتے ہیں۔ ہم در حقیقت مسیح کی زندگی کے ٹکڑے میں سے ٹکڑا جانتے ہیں۔ ان تیس برسوں کی حقیقت سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جس نے تین سال کے لیے راستہ تیار کیا۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اس نے دنیا کی ایک تہائی کو زندہ کیا ہے اور شاید اور بہت زیادہ کرے۔ ایک ''آئیڈیل لائف'' جو بہت دور بھی ہے اور قریب بھی،

ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی لیکن اس کا کتنا حصہ ہے جو ہم جانتے ہی نہیں۔ ہم مسیح کی ماں، مسیح کی خانگی زندگی، ان کے ابتدائی احباب ان کے ساتھ ان کے تعلقات۔ ان کے روحانی مشن کے تدریجی طلوع یا یک بیک ظہور کی نسبت ہم کیا جانتے ہیں؟ ان کی نسبت کتنے سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے، یہاں دھندلا پن اور راز نہیں ہے، ہم تاریخ رکھتے ہیں، ہم محمد کے متعلق اس قدر جانتے ہیں جس قدر لیوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں۔ میتھالوجی، فرضی افسانے اور مافوق الفطرت واقعات، ابتدائی عرب مصنّفین میں نہیں یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو، یہاں پورے دن کی روشنی ہے، جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔ (ص ۱۴ - ۱۵ - ۱۸۸۹ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بیان میں مسلمانوں نے ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھیں، اور لکھ رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کتاب دوسرے انبیاءؑ کی سیرتوں کے مقابلہ میں زیادہ صاف، زیادہ معتبر اور زیادہ تاریخی ہے۔ سیرت و اخبار نبوی کی ابتدائی کتابیں، ہر مصنف سے سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص نے سن کر اور پڑھ کر اور ان کا ہر ایک حرف سمجھ کر دوسروں تک پہنچایا۔ حدیث کی پہلی کتاب مؤطا کو اس کے مصنف امام مالکؒ سے ۶۰۰ آدمیوں نے سنا جن میں سلاطین زمانہ، علماء، فقہا، حکماء، ادباء اور صوفیاء، ہر طبقہ کے آدمی تھے، امام بخاری کی تصنیف جامع صحیح کو صرف ان کے ایک شاگرد فربری سے ساٹھ ہزار آدمیوں نے سنا۔ اس احتیاط، اور استناد، اور اس اہتمام سے بتاؤ، کس شارع یا بانی دین کی سیرت واخبار کا مجموعہ مرتب ہوا، اور یہ تاریخیت محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کے حصہ میں آئی؟

”اللھم صلّ علیہ وسلم“

اس مقالے سے منکرین حدیث و سنت اور مستشرقین کے اس ادعا کا مکمل طور پر بطلان ہو جاتا ہے کہ حدیث و سنت نبوی کو دوسری تیسری صدی ہجری میں ضبط تحریر میں

لایا گیا لہٰذا ان کی ثقاہت محل نظر ہے اور انہیں دین پر عمل پیرا ہونے کی بنیاد بنانا مناسب نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر حضور نبی کریم کے اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو قرآن پر عمل پیرا ہونا نا ممکنات میں سے ہے جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے۔ حضور کے مقام کو تسلیم کرنا ہمارے لیے کوئی اختیاری معاملہ نہیں، بلکہ قرآن میں آپ کے مرتبے اور ذہنی حیثیت کا بار بار اللہ تعالیٰ نے خود تذکرہ کیا ہے۔ ہم مختلف ابواب میں اس سے قبل قرآن سے بعض حوالے دے چکے ہیں، لیکن وہ مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں پورے قرآنی مواد سے روشناسی کے لیے اگر قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے ان آیات کو ذہن میں محفوظ کر لیا جائے یا صفحہ قرطاس پر رقم کر لیا جائے تو حضور کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام عطا کیا ہے، اس کا ہمہ جہتی تصور قائم کرنے میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔

یہ بات خصوصی طور پر ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ظاہر ہو کر نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں دین عطا کیا ہے اور دین کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز حضور کے مرتبہ رسالت کا صحیح تصور قائم کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور صفات کے متعلق ہمیں حضور ہی کی وساطت سے معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اور آپ ہی نے اپنے قول و عمل کے ذریعے سے اپنی عبدیت کا بے مثل مظاہرہ کر کے تصور توحید کو اصول دین میں سر فہرست رکھنے کا درس دیا۔

وضع حدیث کا فتنہ اور اس کا سدباب

یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اساسات و اصول دین کی کلی وضاحت قرآن اور سنت متواترہ سے ہو جاتی ہے۔ قرآن میں کسی ایک لفظ یا شوشے تک کی تحریف کرنا تو کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کی وجوہات و شواہد ''قرآن'' کے باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ سنت میں کسی قسم کا تغیر اس کے تواتر عملی کی خصوصیت کی وجہ سے مشکل تھا۔ البتہ قولی احادیث میں بعض تاریخی حالات کے زیر اثر موضوع احادیث کو عارضی طور پر دخل حاصل ہو گیا۔ اس کی ابتداء حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے مابین اختلافات اور جنگ و جدل سے پیدا شدہ فرقوی مناقشت سے ہوئی۔ محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وضع احادیث کی ابتداء اہل تشیع کی طرف سے ہوئی اور ان میں روافض اس معاملے میں پیش پیش تھے۔

شیخ مصطفیٰ السباعی اپنی تصنیف ''سنت رسول'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت عثمانؓ کے آخری زمانۂ خلافت اور حضرت علیؓ کے پورے عہد خلافت میں جو سیاسی اختلافات رونما ہوئے وہی حدیث میں کذب و وضع کے اصلی اسباب ہیں۔ اوپر ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ سب سے پہلے اس کام کی جرات شیعہ حضرات نے کی۔ چونکہ عراق ان کا مرکز تھا اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلا مقام تھا جہاں حدیثیں وضع کی گئیں۔ اس حقیقت کی طرف بعض ائمہ نے اشارہ کیا ہے۔ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہمارے یہاں سے جو حدیث ایک بالشت لمبی نکلتی ہے، عراق سے واپس آکر اسی حدیث کا طول ایک گز ہو جاتا ہے۔'' امام مالکؒ فرماتے تھے کہ ''عراق ٹکسال ہے، جہاں حدیثیں سکے کی طرح ڈھال کر ملک میں رائج کر دی جاتی ہیں۔'' (ترجمہ ملک غلام علی۔ صفحہ ۷۷)

آگے چل کر یہی مصنف لکھتے ہیں:

''کم و بیش تمام سیاسی گروہ آنحضور کی طرف سے جھوٹ منسوب کرنے کی گندگی میں ملوث تھے، لیکن شیعہ یا روافض اس معاملے میں سب سے پیش پیش تھے۔ امام مالکؒ سے شیعہ کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ نہ ان سے بات چیت کرو اور نہ ان سے حدیث روایت کیا کرو۔ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں کہ میں ہر شخص سے حدیث سنتا اور قبول کر لیتا ہوں سوائے رافضہ کے، اس لیے کہ یہ لوگ حدیث گھڑ کر اس کو دین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ حماد بن سلمہ نے فرمایا کہ مجھ سے ایک رافضی سردار نے کہا کہ ہم جب کہیں اکٹھے ہوئے اور کوئی چیز پسند آجاتی تو اسے حدیث بنا کر مشہور کر دیتے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے رافضہ سے زیادہ جھوٹے لوگ نہیں دیکھے (الباعث الحثیت ص ۱۰۹ سنت رسول صفحہ ۷۸۔)

سباعی کہتے ہیں:

''ایک طرف تو یہ لوگ تھے، دوسری طرف فرقہ اہل سنت کے جاہل عوام تھے جو ان سے دست و گریبان ہو گئے، اور افسوس کہ انہیں ہتھکنڈوں کے ساتھ جو شیعہ استعمال کرتے تھے۔ ادھر جھوٹ کو تقویت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا تو ادھر سے بھی اس کا

جواب جھوٹ ہی کے ذریعے دیا گیا اگرچہ اس دوسرے گروہ کا جھوٹ اول الذکر سے محدود اور بہت ہی کم تھا۔ سنت رسول صفحہ ۸۲

''اسی طرح معاویہؓ اور بنی امیہ کے طرف داروں نے بھی اپنی حمایت میں کچھ حدیثیں گھڑیں۔'' (''سنت رسول'' صفحہ ۸۳)

''اسی طرح عباسیوں کے مؤیدین نے بھی اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لیے جھوٹی حدیثوں کا سہارا لیا۔

وضع حدیث کے سلسلے میں زنادقہ کی کارکردگیوں کے پیچھے بھی سیاسی محرکات ہی کام کر رہے ہوتے تھے۔ یہ لوگ عام طور پر ایسے عناصر پر مشتمل ہوتے تھے جن کے دلوں میں غلبہ و ترقی اسلام کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ وہ حضور کے مقام کو مجروح کرنے اور مسلمانوں کے عقائد میں فساد پیدا کرنے اور ان کی جمعیت میں انتشار پیدا کرنے کے درپے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے خلاف علماء و محدثین کے علاوہ مسلمان حکمران بھی حرکت میں آئے اور جن کے خلاف وضع حدیث کا جرم ثابت ہو گیا یا انہوں نے خود ہی اعتراف کر لیا انہیں کڑی سزائیں دی گئیں۔ اس سے ایک تو زنادقہ کی حرکات کی حوصلہ شکنی ہوئی اور دوسرے ان کی وضع کردہ بے شمار احادیث کی اصلیت واضح ہو گئی۔

واضعین حدیث میں مبتدعین نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں بہت سے عناصر شامل تھے جنکے اپنے اپنے مخصوص عزائم و مقاصد ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض اصحاب اقتدار کی کسی خواہش کا جواز پیدا کرنے کے لیے حدیث گھڑ کر انہیں سنا دیتے تھے، بعض اپنے کسی فرقوی مسلک کے حق میں حدیث وضع کر لیتے تھے، کچھ دوسرے لوگ یہ مشغلہ اس لیے اختیار کر لیتے تھے کہ وہ محدث کہلا سکیں، جو مسلمان معاشرے میں اعلیٰ مرتبے اور مقام کی علامت تصور ہوتی تھی۔ کچھ سادہ لوح علماء بزعم خود خلوص کے ساتھ عوام کو قرآن اور عبادت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے حضور کی طرف کسی اپنے ہی قول کو منسوب کر دیتے تھے۔ مثلاً کہہ دیا کہ فلاں قرآنی سورت کی تلاوت باعث بخشش ہوتی ہے۔ فلاں وظیفہ ذریعہ نجات اخروی ہے۔ قرآن کی فلاں آیات کا پڑھنا دنیوی رزق میں اضافے کا باعث بنے گا وغیرہ وغیرہ۔ ایسی باتیں دین کی

روح کے سراسر منافی ہیں، ان سے قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ایسی باتوں سے دین کا مجموعی تصور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ نیز جب یہ حرکت مندرجہ ذیل مشہور، متواتر اور تمام کتب حدیث میں پائی جانے والی حدیث کے خلاف ہے تو کسی منطق و استدلال سے بھی اسے بر سرحق ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے حضور نے فرمایا:

ان کذب علی لیس ککذب علی احد ومن کذب علي متعمـدا فلیتبـواء مقعده من النار

ترجمہ: میری طرف جھوٹی بات منسوب کرنا ایسا نہیں جیسے کسی اور کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا ہوتا ہے۔ جس نے مجھ پر بہتان باندھا اسے آگ میں اپنی جگہ متعین کر لینی چاہیے۔

موضوع احادیث کو پھیلانے کی کوشش میں پیشہ ور اور قصہ گو واعظین و خطباء نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے مسلمان عوام کے مزاجوں میں اس قدر ٹیڑھ پیدا کر دیا ہے کہ لوگ سنجیدہ اور مبنی بر قرآن و سنت اصول دین سننے کے بجائے قصے کہانیوں، کرامتوں، خرق عادت اور اسرائیلیات سے اخذ کردہ واقعات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، اور جو واعظ ان کی اس خواہش کو جس قدر بلند آوازی اور اظہار جوش سے پورا کرے، اسے اسی نسبت سے عوامی پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فہم دین کے راستے کی رکاوٹوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ذہنوں پر اس بات کا زیادہ اثر مرتب ہوتا ہے جو حضور کے حوالے سے بیان کی جائے۔ لہٰذا پیشہ ور واعظین موضوع احادیث کا زیادہ سہارا لیتے رہے ہیں۔

قرآن و سنت کے ذریعے اساسات دین تو گزشتہ چودہ صدیوں سے اپنی اصل حالت میں قائم و دائم ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کوئی رخنہ اندازی نہیں ہو سکی۔ البتہ فروعات کے معاملے میں فرقہ پرستیوں کی وجہ سے ضد اور ہٹ دھرمی میں گرفتار لوگوں نے بھی مسائل کے سلسلے میں موضوع حدیثیں بیان کرنے سے گریز نہیں کیا۔ حالانکہ ان مسائل میں صحابہ کے درمیان بھی اختلاف تھے مثلاً آمین بالجہر، خلف الامام وغیرہ۔ (اختلافات بین المسلمین کے باب میں مفصل گفتگو ہوگی) ان معاملات میں بھی اپنی اپنی بات پر بلاضرورت زور دینے کے

لیے حدیثیں وضع کرلی گئی ہیں۔ حالانکہ آئمہ سلف خصوصاً آئمہ اربعہ کبھی ایک طریقے کو اپنا لیتے تھے اور کبھی دوسرے کو۔وہ ایسے اختلافات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

لیکن وضع حدیث کے اس فتنے سے متوحش کر اسلام کی حقانیت کے سلسلے میں نہ کسی وسوسے میں گرفتار ہونے کی ضرورت ہے اورنہ انکار حدیث کے لیے کوئی جواز پیدا ہوتا ہے۔ محدثین نے عظیم کاوش اور زبردست جدو جہد کرکے ذخیرۂ حدیث کو اس فتنے کے اثرات سے پاک کر دیا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی سلطنت کی وسعت کے نتیجے میں قرآن اور اس کے کلیات کی وضاحت کے سلسلے میں حضور کی سنت تو ہر جگہ ایک ہی شکل و صورت میں پہنچی، لیکن بعض معاملات میں آپ نے ہمیشہ ایک جیسا رویہ نہیں اپنایا، بلکہ مختلف اوقات میں مختلف طریقےاپنائے مثلاً حضور نے آمین بالجہر کہی بھی ہے اور نہیں بھی، کبھی حضور نے رکوع میں جاتے ہوئے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کی ہے اور کبھی نہیں کی۔ اس طرح جلسۂ استراحت کا معاملہ ہے۔ آپ نے ایسا کیا بھی ہے اور نہیں بھی کیا۔ اس قسم کے بہت سے فروعی مسائل ہیں جن میں اوقات مختلفہ میں حضور کا عمل مختلف رہا ہے۔ جس صحابی نے حضور کو جو عمل کرتے دیکھا اسے بیان کر دیا۔ ایسے مسائل میں اپنی تحقیق یا علم کے مطابق جو شخص جو طریقہ بھی اختیار کرلے اس سے حرج کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ البتہ فرائض و واجبات میں چونکہ اختلافات ہیں ہی نہیں اس لیے انہیں موضوع بحث و مناقشہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً نماز کے جتنے ارکان ہیں وہ متفق علیہ ہیں۔ لہٰذا ان کی ادائیگی سے نماز ہو جاتی ہے۔ یہی حال دوسرے فرائض و واجبات کا ہے۔

اب ہوا یہ کہ خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ صحابہؓ بھی مدینہ سے مختلف مقامات کی طرف منتقل ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس قرآن کے علاوہ حضور کے قولی اور عملی احادیث و سنن کا ذخیرہ موجود تھا جو صحابہؓ جہاں گئے ان کی روایت کردہ احادیث اس محدود علاقے میں گردش کرنے لگیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، مختلف وجوہ سے متعدد بے راہ حلقوں اور افراد نے اپنے اپنے مؤقف میں استحکام پیدا کرنے کے لیے حضور کی طرف موضوع احادیث منسوب کر دیں۔ یہ بات ہم پھر دہراتے ہیں

کہ ان احادیث کا تعلق دین کے اصولوں اور کلیات سے نہ تھا اور دین کا تصور اور اس کے فرائض و واجبات کی ادائیگی کے سلسلے میں مسلمانوں میں ہر جگہ یکسانی پائی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ موضوع احادیث انتشار اور فتنہ پروری کا باعث بھی ہو رہی تھیں، دوسرے علماء حقہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ حضور کی طرف غلط باتیں منسوب کی جائیں اور تیسرے اب حالات یہ تقاضا کر رہے تھے کہ حضور کی سنن و احادیث کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔ لہٰذا اس کام کو سرانجام دینے کے لیے محدثین نے جو کاوشیں کیں ان کے نتیجے میں ایک نہایت وسیع شعبہ علم وجود میں آگیا جس کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں۔ محد ثین نے اپنی تحقیق کے پہلے مرحلے میں جہاں سے اور جس ذریعے سے کوئی حدیث ملی احتیاط کے ایک محدود درجے کو ملحوظ رکھتے ہوئے لے لی۔ اس طرح ہر محدث کے پاس اس مرحلہ کاوش کے دوران ہزاروں لاکھوں احادیث جمع ہو گئیں۔ حدیثوں کی تعداد کی اس کثرت کی ایک وجہ تو موضوع اور ضعیف احادیث کی موجودگی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک ایک صحیح، ضعیف یا موضوع حدیث جہاں مختلف ذرائع اور اسناد سے دستیاب ہوتی تھیں وہیں کوئی راوی اسے باللفظ روایت کرتا تھا اور کوئی بالمعنی، لیکن ہر روایت کو الگ الگ سینے میں محفوظ کیا جاتا یا ضبط تحریر میں لایا جاتا۔ اس طرح ابتدائی طور پر جمع شدہ احادیث کی تعداد بہت بڑھ جاتی تھی۔ اس صورت حال سے لاعلمی کی وجہ سے بعض مذبذبین اور معترضین یا تو لاعلمی کی وجہ سے اور یا کتب حدیث اور محدثین کے مقام کو گرانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ لاکھوں جمع شدہ حدیثوں سے چند ہزار صحیح حدیثوں کا چھانٹنا امر محال ہے۔ واقعی یہ مشکل کام تھا، لیکن محدثین حضرات نے محنت شاقہ سے اس مہم کو سر کیا۔ ایک تو یہ لوگ ذہانت اور قوت حفظ میں درجۂ کمال تک پہنچے ہوئے تھے اور دوسرے ان کا حصول علم و معرفت کے شوق کا یہ عالم تھا کہ طویل سفر کر کے ایک ایک محدث نے سینکڑوں نامور علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے حصول فیض علمی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ تیسرے انہوں نے دنیوی سہولتوں اور خواہشات نفس کو دبا کر اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ چوتھے ردو قبول حدیث کے لیے باقاعدہ ایسے اصول اور کسوٹیاں وضع کیں جو ان کے درمیان سنداول تھیں اور جو صحیح کو غلط سے ممیز کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوتی تھیں۔

اس سلسلے میں پانچویں بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حدیث کی کتاب کے مصنف کا اپنا اپنا مخصوص معیار صحت حدیث ہو تا تھا۔ لہٰذا اس کا انتخاب اس معیار کے مطابق ہوتا تھا۔ ضروری نہیں کہ جو احادیث اس نے ترک کر دی ہیں ان میں سے ہر حدیث موضوع ہو۔ اس طرح یہ کام متعین قواعد و ضوابط کی روشنی میں کیا گیا۔

ہم نہایت اختصار کے ساتھ وہ معیارات بیان کریں گے جن کو پیش نظر رکھ کر محدثین حدیث کی صحت، اس کے درجے اور اس کے موضوع ہونے کی حیثیت کا تعین کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسوٹی پر محدثین نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور ان کی وضاحت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لیکن ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ اجمال ہی سے کام لینا ہو گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جس کی طرف توجہ دی گئی وہ یہ تھی کہ آیا زیر نظر حدیث کسی پہلو سے قرآن کی کسی تعلیم یا اس کے کسی اصول سے تو نہیں ٹکراتی۔ صاحب ''مبادی تدبر حدیث'' نے خطیب بغدادی کی تصنیف ''کتاب الکفایہ فی علم الروایتہ'' کے صفحہ ۴۳۰ سے یہ حدیث نقل کی ہے:

عن ابی بریرة عن النبي صلی الله علیه وسلم انه قال سیاتیکم عنی احادیث مختلفة فما جاء کم موافقا لکتاب الله و سنتی فهو فی وما جاءکم مخالفا لکتاب الله تعالی و سنتی فلیس منی (صفحات۶۷۔۶۸)

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ عنقریب تمہارے سامنے مجھ سے منسوب ایسی روایتیں آئیں گی جو باہمد گر متناسب ہوں گی تو جو کتاب اللہ اور میری سنت کے مطابق ہوں وہ تو مجھ سے ہیں اور جو کتاب اللہ اور میری سنت کے مخالف ہوں وہ مجھ سے نہیں ہیں۔

اسی حدیث سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ حدیث کو پرکھنے کی دوسری کسوٹی سنن متواترہ ہیں۔ حضور کی جس سنت پر امت کا ہمیشہ سے عمل رہا ہے اور وہ جانی بوجھی ہوئی ہے، اس کے خلاف جو حدیث بھی پیش کی گئی وہ قابل رد ہو گی۔ تیسرے محدثین حضرات نے حدیث کی صحت و سقم کا فیصلہ کرنے کے لیے اسناد کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ صحابہؓ کی

صفت تعدیل چونکہ مسلمہ حیثیت رکھتی تھی اس لیے قرن اول میں جو صحابی بھی حدیث بیان کر دیتا ہے اسے ''کلھم عدول'' کے مطابق قبول کرنے میں کسی کو ہچکچاہٹ نہ ہوتی تھی۔ ان کی صداقت کی توثیق اللہ اور رسول دونوں نے کی ہے۔

لیکن اس دور فتن کے بعد جس کا اجمالاً تذکرہ کیا جا چکا ہے اور جس میں عبداللہ بن سباء جیسے لوگوں نے اپنی یہودیانہ اسلام دشمنی کے باعث مسلمانوں میں تفرقے پیدا کرنے کے لیے آل رسول کی محبت میں غلو اور حضرت علیؓ کی الوہیت کے نظریات کی نشر و اشاعت شروع کر دی، چنانچہ علماء حقہ کسی ایسے فرد سے جس کی ثقاہت پر انہیں یقین نہ ہو حدیث سننے سے گریزاں ہونے لگے۔ لہٰذا دوسری کسوٹیوں کے علاوہ ہر حدیث کی اسناد کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ حدیث کے حضور تک پہنچنے کے سلسلے کے تمام راویوں کی امانت، دیانت، اخلاق، دین سے وابستگی، قوت حفظ، بدعت سے دوری حتیٰ کہ دینی نکتہ نظر سے ان کی زندگی کے جملہ حالات کا تتبع کیا جاتا تھا۔ اس طرح جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کا ایک وسیع الاثر علم وجود میں آگیا، اور تقریباً پانچ لاکھ راویوں کی زندگیوں کے حالات ضبط تحریر میں آگئے۔ یہ محدثین کا اتنا عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ اس طرح ہر راوی حدیث پر کڑی نقد و جرح کی جاتی تھی۔

اس سلسلے میں ''امام عبداللہ بن مبارکؒ کو یہ کہنا پڑا کہ۔۔۔۔ ''اسناد دین کے لوازم میں سے ہے، اگر یہ نہ ہوتی تو جس کے جی میں جو آتا کر گزرتا'' اور حضرت ابن سیرینؒ یہ تاکید کیا کرتے کہ۔۔۔۔ ''یہ حدیث دین ہے، تو دیکھو کہ اپنے دین کو کس سے حاصل کر رہے ہو'' اسی بنا پر امام ثوریؒ نے ایک موقع پر یہ کہا تھا کہ''۔۔۔۔''مطلب یہ کہ وہ ایک ایسی قوت ہے جس کے ذریعے محدث حق میں لائے ہوئے باطل کو چھانٹ کر پھینک دیتا ہے۔'' (تاریخ افکار و علوم اسلامی حصہ اول صفحہ ۴۰۶)

چوتھی کسوٹی جس پر اجلہ علماء حدیث کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ دین کے اصولوں اور احکامات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والوں اور ان پر رات دن تفکرو تدبر کرنے والوں کے اندر ایک ایسا ذوق پرورش پالیتا اور پروان چڑھتا ہے کہ ان کی حس معرفت فوراً محسوس کر

لیتی ہے کہ فلاں حدیث جو بیان کی گئی ہے معنی والفاظ کے لحاظ سے حضور کے فرمودات میں سے نہیں ہو سکتی۔

شیخ مصطفیٰ السباعی لکھتے ہیں:

''ابن دقیق العبد لکھتے ہیں کہ بعض اوقات محدثین کسی حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ حدیث کے الفاظ کی بنا پر کرتے ہیں، موصوف کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر حدیث کے الفاظ کی کثرت ممارست کے سبب اتنا قوی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ بادی نظر یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ نبی کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں'' (سنت رسول صفحہ ۱۲۰۔ ۱۲۱)

صاحب ''مبادی تدبر حدیث'' نے خطیب بغدادی کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور کی نبوی بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ کبار محدثین میں یہ صلاحیت بھی پیدا ہو جائے گی، کہ وہ آپ کے کلام کو اپنے ذوق و وجدان کے ذریعے پہچان جائیں:

عن ابی حمید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا سمعتم الحدیث عني تنکرہ قلوبکم وتلین لہ اشعار کم وابشارکم وترون انہ منکم قریب فا انا اولاکم بہ واذا سمعتم الحدیث عني تنکرہ قلوبکم تنفر منہ اشعار کم وابشارکم وترون انہ منکم بعید فانا ابعد کم منہ (صفحہ ۵۸ – ۵۹) بحوالہ کتاب الکفایہ فی علم الروایہ ص ۴۳۰)

ترجمہ : ابوحمید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی روایت سنو جس سے تمہارے دل آشنائی محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور تن بدن اس سے اثر پذیر ہوں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے دلوں سے قریب ہے تو میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ قریب ہوں، اور جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی بات سنو جس سے تمہارے دل اجنبیت محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور جسم اس کی ناگواری محسوس کریں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے مزاج سے دور ہے تو میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔''

آگے چل کر کتاب الکفایہ ہی سے یہ نقل کرتے ہیں:

العبد بن مسلم فرماتے ہیں:

''سمعت الأوزاعي يقول كنا نسمع الحديث ونعرضه على اصحابنا كما نعرض الررهم الزائف فما عرفوا منه اخذ ناه ومانكروا منه تركناه'' (صفحہ ٦٠)

ترجمہ : میں نے اوزاعیؒ کو کہتے سنا ہے کہ ہم حدیث سن کر اپنے اصحاب کے سامنے اس طرح پیش کرتے تھے جس طرح کھوٹے اور کھرے درہم، تو جن کو وہ کھرا قرار دیتے ان کو تو ہم قبول کر لیتے اور جن کو وہ کھوٹا محسوس کرتے ان کو ہم چھوڑ دیتے۔''

اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ منکرین حدیث اور مستشرقین یہ جو تاثر دیتے ہیں کہ محدثین کے سامنے جو کوئی جس قسم کی حدیث پیش کر دیتا اس پر وہ گرے پڑتے تھے، بالکل غلط ہے۔ اوپر دیے گئے حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کبار محدثین اپنے ذوق دینی کو استعمال کرتے تھے۔ ادیان و مذاہب کے دائرے میں دانشوری (Intellectulism)کا یہ اظہار اور پیغمبر اسلام کی طرف سے اسکی اجازت صرف دین اسلام ہی کا حصہ ہے۔

حدیث کے صحیح یا موضوع ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے محدثین نے ہر وقت کاوشیں کی ہیں۔ خبث باطن کے مرض میں مبتلا لوگ جوں جوں موضوع احادیث کی نشر و اشاعت کرتے جاتے تھے، اسی رفتار سے محدثین ایسی حدیثوں کو چھانٹتے جاتے تھے۔ چنانچہ صاحب ''الثقافت الاسلامیہ'' اس سلسلے میں ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جلال الدین سیوطی نے ''تاریخ الخلفاء'' میں ہارون الرشید کے تذکرہ میں ابن عساکر کے حوالے سے ابن علیہ کی یہ روایت ذکر کی ہے ہارون الرشید کے پاس ایک واضح حدیث زندیق لایا گیا، ہارون نے اس کے قتل کا حکم دے دیا، اس بے دین نے کہا کہ میری گردن مارنے کا حکم کیوں صادر کیا جا رہا ہے ؟ تو ہارون نے جواب دیا کہ بندگان خدا کو تیرے شر سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن وہ ہزاروں روایتیں کہاں جائیں گی جنہیں میں نے گھڑ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کر کے پھیلا دی ہیں، جن میں ایک حرف بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے۔ تو

ہارون الرشید نے جواب دیا کہ ''دشمن خدا ! تو ہے کس خوش فہمی میں؟ تجھ کو ابو اسحاق الفزاری اور عبداللہ بن مبارک کا بھی علم ہے؟ کہ وہ دونوں موضوعات کی چھان بین کر رہے ہیں اور وہ تیری ان روایتوں کا ایک ایک حرف نکال پھینکیں گے۔'' (تاریخ افکار و علوم اسلامی جلد اول صفحہ ۴۴۱)

ہارون الرشید کا اس واضع حدیث کو قتل کرنا بالکل جائز تھا۔ ہر تمدن اور معاشرے کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں، اور اس کا خیرو شر کا اپنا اپنا معیار ہوتا ہے۔ اس کی اقدار اور اساسات جن پر اس کی فکری و اجتماعی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اپنی منفرد خصوصیات رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کے معاشرے کی اقدار و اساسات کے ماخذ قرآن و سنت ہیں۔ اگر ان کے سلسلے میں فتنہ انگیزی کی جائے گی تو وہ گویا اسی معاشرے کے حال ہی کے نکتہ نظر سے نہیں بلکہ مستقبل کے نکتہ نظر سے بھی اس کی جڑ سے بنیاد اکھاڑ دینے کے مترادف ہو گی، لہٰذا اس کے لیے انتہائی سزا نہایت ضروری ہے۔

امہات حدیث اور ان کے مرتب ہونے تک کے ارتقائی مراحل

تحفظ حدیث کے متعلق جو کچھ سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے اس سے تدوین حدیث کے تصور کی طرف ظاہر ہونے والے رجحان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ابتدائے بعثت دین میں لکھائی پڑھائی کا انتہائی طور پر کم رواج ہونے کی وجہ سے اس اندیشے کے تحت کہ قرآن میں حدیث کی آمیزش نہ ہو جائے کیونکہ قرآن اور حدیث دونوں ہی الفاظ حضور کے دہن مبارک سے ادا ہوتے تھے۔ حدیث کی ضبط تحریر میں لانے کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ اگرچہ اس کی کھلی ممانعت نہ تھی جیسا کہ عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کی صادقہ کے متعلق تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس احتیاط میں کچھ ایسا توازن محسوس ہوتا ہے جس کے ذریعے قرآن کسی آمیزش سے کلیتاً پاک رہا اور حدیث بھی محفوظ رہی۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ایک تدریج کے ساتھ قرآن بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ اور ایک لغت اور لہجے کے مطابق مصحف عثمانی کی شکل میں سارے عالم اسلام میں پھیل گیا۔ اب ایک طرف تو قرآن نے لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد میں نمایاں اضافے کی وجہ سے اس دور کے انداز تحریر کے مطابق کتابی شکل اختیار کر لی اور دوسری طرف حفاظ کی تعداد بھی روز افزوں

ہوتی گئی۔ لہٰذا اب ایسا مرحلہ آگیا کہ جس پیمانے اور جس کثرت سے بھی احادیث لکھی جائیں ان کے قرآن کے متن میں راہ پانے کا کوئی خدشہ باقی نہ رہا تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''جامع بیان العلم و فضلہ'' میں لکھا ہے کہ عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ تدوین حدیث کے بارے میں بہت غور و فکر کرتے اور ایک ماہ تک استخارہ کرتے رہے، لیکن بالآخر انہوں نے اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا۔ لیکن مصحف عثمانی کی تیاری اور پھیلاؤ کے بعد بہت سے لوگوں نے ان احادیث کو تحریری شکل میں جمع کرنا شروع کر دیا جو انہیں اپنے اپنے علاقے میں دستیاب ہو سکتی تھیں۔

اس کے بعد حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے پہلی صدی ہجری کے اواخر میں اپنے دور خلافت میں باقاعدہ طور پر سرکاری سطح پر مختلف اطراف سلطنت میں احکامات جاری کیے کہ جس کے پاس احادیث ہوں وہ انہیں جمع کر کے دارالخلافہ میں بھیج دے۔ چنانچہ صاحب ''الثقافتہ الاسلامیہ'' لکھتے ہیں:

''اور مفاتیح السنتہ میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ابوبکربن محمد بن خرم کو بتاکید لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمان انصاریہ (متوفیہ ۹۸ھ) اور قاسم بن محمد ابو بکر (متوفی ۱۰۶ھ) کے سرمایہ حدیث کو لکھ کر ان (حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز) کے پاس بھیج دیں۔ اور اس طرح انہوں (حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز) نے تمام بڑے اسلامی شہروں کے حکام کو لکھا اور حجاز و شام کے ایک عالم اور مشہور امام محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری مدنی بھی ان لوگوں میں سے ایک ہیں جن کے پاس عمرؒ بن عبد العزیز نے جمع حدیث سے متعلق مکتوب ارسال فرمایا تھا۔''

مندرجہ بالا اقتباس کے سلسلے میں مترجم کا ایک فٹ نوٹ ہے۔''چنانچہ علامہ ذہبی اور حفظ ابن عبدالبر کے بیان کے بموجب اسلامی مملکت کے اطراف و جوانب سے احادیث و سنن کے دفاتر مرتب ہو کر دار الخلافہ (دمشق) آئے اور خلیفہ عمرؒ بن عبد العزیز نے ان کی نقلیں مملکت کے گوشے گوشے میں بھیجیں، چنانچہ سعد بن ابراہیم روایت کرتے ہیں کہ ہم کو عمرؒ بن عبد العزیز نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا اور ہم نے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھیں

اور انہوں (عمرؒ بن عبد العزیز) نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی، وہاں وہاں ہر جگہ ایک ایک مجموعہ بھیجا۔"

"خلیفہ عمرؒ بن عبدالعزیز کے اس فرمان کی تعمیل میں صرف امام زہری نے جو تحریری سرمایہ جمع کیا تھا اس کے بارے میں علامہ ذہبی معمر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ زہری کی حدیثوں کے مجموعے کئی اونٹوں پر بار کیے گئے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کے اطراف سے اس سرکاری فرمان کی تعمیل میں کتنا بڑا تحریری ذخیرہ جمع ہوا ہو گا۔ " تاریخ افکار و علوم اسلامی جلد اول ۳۸۳ – ۳۸۴)

آگے چل کر یہی مصنف لکھتے ہیں:

۔۔۔"الرسالہ المستطرفہ فی کتب المشرقت" مصنفہ علامہ عبدالحی کتانی (متوفی ۱۳۴۵ھ) میں مذکور ہے کہ سب سے پہلے حدیث کی تدوین کرنے والے ابو بکر محمد بن مسلم ابن شہاب زہری مدنی ہیں، جنہوں نے یہ کام پہلی صدی ہجری کے آخری دور میں حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے حکم پر کیا تھا جیسا کہ "حلیۃ الاولیا" (ابو نعیم اصفہانی) میں سلیمان بن داؤد سے مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے حدیث کی تدوین کی، وہ ابن شہاب زہری ہیں۔ اور خود ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ اس علم کو میرے کرنے سے پہلے کسی نے مدون نہیں کیا تھا۔ (صفحات ۳۸۴ - ۳۸۵)

اس سے قبل ہم سید سلیمان ندوی کا جو مقالہ اول تا آخر درج کر چکے ہیں اس میں انہوں نے بھی مختصراً امام زہری کی جمع حدیث کے سلسلے کی کاوشوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان سب روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو جمع حدیث کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد عبد الملک بن جریج (متوفی ۱۵۰ھ)، ابن صبیح (متوفی ۱۶۰ھ)، امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ)، ابو عمر عبد الرحمان بن عمرو الاوزاعی (متوفی ۱۵۷ھ) اور ابو عبداللہ سفیان بن سعید ثوری (متوفی ۱۶۰ھ) نے بالترتیب مکہ، بصرہ، مدینہ، خراسان، شام اور کوفہ میں تصنیف و تبویب حدیث کا کام کیا۔

ہم نے صرف چند اصحاب کا تذکرہ کیا ہے، ان کے علاوہ بہت سے دوسرے حضرات تابعین اور تبع تابعین نے کتب حدیث مرتب کیں۔ یہ دور بھی جمع تدوین حدیث کے سلسلے میں محدثین کی سرگرمیوں کے لحاظ سے بہت نمایاں ہے۔

''سفانتہ الاسلامیہ'' کے فاضل مترجم نے ایک فٹ نوٹ میں بیان کیا ہے کہ صاحب ''الرسالہ المستطرفہ'' نے ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضور کے زمانۂ حیات سے تدوین و تبویب حدیث کے زمانے کو تین مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

چنانچہ ابن حجر کہتے ہیں:

اعلم ان اثار النبي صلى الله عليه وسلم لـم تكـن في عصر الصـحابته وكبار التابعين مدونته في الجوامع ولا مرتبته -----

ترجمہ : جاننا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار صحابہ اور تابعین کے زمانے میں جوامع میں مدون نہ تھے اور نہ مرتب تھے۔

پھر آگے فرماتے ہیں:

ثم حدث فی اخر عصر التابعين تد وين الآثار وبتويب الاخبار

ترجمہ : پھر تابعین کے آخری دور میں آثار کی تدوین اور اخبار کی تبویب کا کام شروع ہوا۔

اور پھر یہ چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

وكانو .الصنفون كل باب على حدة الى ان قام كبار اهل الطبقة الثانيه في منتصف القرن الثاني فد وانو الاحكام

ترجمہ : اور یہ حضرات ہر باب سے متعلق علیحدہ علیحدہ تصنیف کیا کرتے یہاں تک کہ بڑے بڑے علماء دوسری صدی ہجری کے درمیانی زمانے میں اٹھے اور احکام کی تدوین کی'' (''تاریخ افکار و علوم اسلامی'' حصہ اول صفحہ ۳۹۴)

دوسری صدی ہجری کے آخری حصہ کے بعد مسانید کی تالیف کا کثرت سے سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ علامہ کتانی مقدمہ فتح الباری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شاید ہی کوئی ایسا حافظ الحدیث امام ہو، جس نے حدیث النبی پر مشتمل ایک مسند نہ لکھی ہو۔'' (تاریخ افکار و علوم اسلامی حصہ اول صفحہ ۳۹۴)

علامہ کتانی نے بعض حضرات کے نام دیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

عبید اللہ بن موسیٰ بغدادی (متوفی ۲۱۳ھ) مسدد بن مسرہد بسری (متوفی ۲۲۸ھ) اسد بن موسیٰ الاموی (متوفی ۲۱۲ھ) نعیم بن حماد الخزاعی نزیل مصر (متوفی ۲۲۹ھ) ابو خشیمہ زہیر بن حرب (متوفی ۲۳۴ھ) امام احمد بن حنبلؒ (متوفی ۲۴۱ھ) اسحاق بن راہویہ (متوفی ۲۳۸ھ) عثمان بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۹ھ) احمد بن منیع (متوفی ۲۴۴ھ) احمد بن عمرو بن عبدالخالق بصری ابو بکر ابزار (متوفی ۲۹۲ھ) ابو بکر عبداللہ بن شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) وغیرہ

شیخ مصطفیٰ السباعی کے مطابق ''مسند حدیث کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جس میں موضوع سے قطع نظر ایک صحابی کی مرویات کو ایک باب میں جمع کر دیا جائے۔''

(سنت رسول صفحہ ۱۴۸)

پھر کہتے ہیں: ''اصحاب مسانید نے اقوال صحابہ و تابعین کو چھوڑ کر صرف احادیث کو اپنے مسندات میں لیا ہے۔ لیکن احادیث میں صحیح و غیر صحیح کا امتیاز قائم نہیں رکھا۔ چنانچہ طالب حدیث کا ان میں سے صحیح احادیث کا چھانٹنا بڑا مشکل کام ہے اور فن حدیث پر عبور حاصل کیے بغیر یہ کام عملاً محال ہے۔ حدیث کے ایک طالب علم کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اس معاملے میں ائمہ حدیث سے رجوع کرے ورنہ حدیث اس کے لیے مجہول الحال رہے گی۔ اس صورت میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاری (۲۵۶ھ) کو جو کہ اس دور کے امام حدیث اور مجدد سنت ہیں، ایک نئے اسلوب تالیف پر آمادہ کر دیا اور وہ یہ تھا کہ صرف صحیح احادیث کا انتخاب تیار کیا جائے چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''الجامع الصحیح'' اسی اصول پر مرتب کی۔ ان کے ہم عصر اور ان کے شاگرد رشید امام مسلم بن حجاج قشیری نے بھی اسی طرح کی ایک کتاب تالیف کی۔ ان دونوں اماموں نے عام طالبان حدیث کے لیے صحیح احادیث تک رسائی کا رستہ ہموار کر دیا۔ علماء حدیث ان دو کتب اور موطاء امام مالکؒ کو طبقہ اولیٰ کی کتب حدیث قرار دیتے ہیں۔ اسی نہج پر بعد میں بہت سی کتابیں جمع کی گئیں جن میں سے اہم ترین سنن ابی داؤد – (۲۷۵ھ) نسائی (۳۰۳ھ) جامع ترمذی (۲۹۷ھ) اور سنن ابن ماجہ (۲۷۳ھ) ہیں۔ انہیں طبقہ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان چھ کتابوں کو محدثین کی اصطلاح میں ''صحاح ستہ'' کہا جاتا ہے۔ ان چھ ائمہ نے اپنے سے پہلے کی کتب حدیث کی اکثر روایتوں کو اپنے ہاں لے لیا ہے'' (سنت رسول صفحات ۱۴۸ – ۱۴۹)

صاحب ''مبادی تدبر حدیث'' لکھتے ہیں:

''کسی فن کی امہات کے معنی یہ ہیں کہ اس فن میں جن کتابوں کو مرکزی اور اصولی حیثیت حاصل ہے، جو گویا اس فن کی تمام کتابوں کی ماں ہیں کہ جن کے بغیر کام ہو نہیں سکتا، ان کا نظرانداز کرنا قطعی ناممکن ہوتا ہے ۔۔۔۔بہر حال عمر بھر کے مطالعہ اور غورو فکر کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ حدیث کی امہات تین ہیں:

۱۔ مؤطا امام مالک

۲۔ صحیح امام بخاریؒ

۳۔ صحیح امام مسلمؒ

ہمارے نزدیک اگر کسی کی ان تینوں پر تدبر کی نظر ہے تو گویا اس کی حدیث کے اصل بنیادی ذخیرے پر نظر ہے'' (صفحہ ۱۴۶)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجتہ اللہ البالغہ جلد اول کے باب ''طبقات کتب الحدیث'' میں رقم فرما ہیں:

فا الطبقة الاولى منحصرة بالا ستقراء في ثلاثت كتب المؤطا وصحيح البخاري وصحيح مسلم قال الشافعي اصح الكتب بعد كتاب الله مؤطا مالک (قال ذلك قبل جمع صحيح الامام البخارى والا فان صحيح الباري اصح الكتاب الحديث من غير استثناء)'' (صفحہ ۲۸۱)

ترجمہ : ہمارے تفحص و تحقیق کے مطابق طبقہ اولیٰ میں تین کتابیں شامل ہیں : مؤطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم، امام شافعیؒ نے یہ بات صحیح بخاری کی تدوین سے قبل کہی۔ یقیناً صحیح بخاری بغیر کسی استثنیٰ کے کتب حدیث میں سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے)

پھر صحیحین کے متعلق فرماتے ہیں:

''اما الصحيحن فقد اتفق المحدثون على أن جميع ما فيها من المتصل المفوع صحيح بالقطع وانهما متواتران الى مصنفيهما وانه كل من يهون أمرهما فهو مبتدع منبع غير سبيل المومنين''(صفحہ ۲۸۲)

ترجمہ : جہاں تک صحیحین کا تعلق ہے ان کے متعلق محدثین کا اتفاق ہے کہ ان دونوں میں جتنی احادیث ہیں وہ قطعی طور پر متصل الاسناد مرفوع ہیں۔ ان دونوں کتب کی احادیث ان دونوں مصنّفین سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور اس بات پر بھی علماء کا اتفاق ہے کہ ان کے مقام کو گرانے والا بدعتی ہے اور مومنوں کے راستے کی اتباع نہیں کر رہا۔

آگے چل کر شاہ صاحبؒ طبقہ ثانی کی ان کتب حدیث پر تبصرہ کرتے ہیں جن کا ہم اس سے قبل تذکرہ کر چکے ہیں:

ترجمہ : طبقہ ثانی میں وہ کتب شامل ہیں جو موطا اور صحیحین کے مرتبہ تک تو نہیں پہنچ سکتیں۔ لیکن ان کے قریب ہیں۔ ان کے مصنف ثقاہت و عدالت اور فنون حدیث کے معاملے میں حفظ و تبحر کے سلسلے میں مشہور تھے۔ اور اپنی کتابوں کی صحت کے متعلق اپنے اوپر جو شرائط عائد کی تھیں ان میں تساہل سے کام نہیں لیا۔ ان کے بعد ان کتابوں کو درجہ قبولیت حاصل ہوا ۔۔۔ اور مناسب ہے کہ مسند احمد کو اس طبقہ کی صف میں شامل کیا جائے۔ اس لیے کہ امام احمد نے اس کو صحیح اور سقیم کو جاننے کا معیار قرار دیا ہے اور کہا ہے: جو کچھ اس (یعنی مسنداحمد) میں نہیں ہے اس کو قبول نہ کیا جائے۔ (صفحہ ۲۸۳)

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے طبقات ثالث رابع اور خامس کا تذکرہ کر کے ان پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ طبقات زمانی اعتبار سے متعین نہیں کیے گئے بلکہ احادیث کی صحت و ضعف کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ جن لوگوں کے اپنے ذہن الجھے ہوئے ہوں اور وہ علمی ذوق سے محروم ہونے کے علاوہ علم حدیث کی تاریخ اور اس میں مختلف قسم کا کردار ادا کرنے والوں کی کاوشوں اور حرکات کی تحقیق و تجزیہ کرنے کی توفیق سے محروم ہیں وہ جو کچھ بھی کہتے رہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ شارع علیہ السلام کے قول و عمل کے سلسلے میں محدثین نے جو جانفشانیاں کی ہیں اور جس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے وہ تاریخ عالم میں علمی سطح پر بے مثل حیثیت کی مالک ہیں۔

علم حدیث وسنت کے ساتھ گہرا لگاؤ قرون اولیٰ ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ ہر دور میں کبار علماء حدیث کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ ان حضرات نے اپنے اپنے ذوق علمی کے مطابق

اس موضوع پر بے شمار کتب تصنیف کی ہیں۔ صحاح ستہ کی اتنی شرحیں مختلف انداز سے لکھی گئی ہیں جن کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ان سب کے حوالوں کو ایک ایک تصنیف میں بھی سمو دیا گیا ہے۔ علماء حدیث نے مختلف النوع مقاصد و اغراض علمی کو پیش نظر رکھ کر تصانیف و تالیفات کے انبار لگا دیے ہیں۔ ساری تاریخ اسلامی میں سنت و حدیث کے ساتھ امت کے سواد اعظم کے شغف کی یہ شدت دین میں شارع علیہ السلام کے قول و عمل کے درجہ اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بے شمار علماء حقہ گزرے ہیں جنہوں نے درس و تدریس کے ذریعے بھی بڑے پیمانے پر سنت و حدیث کے علم و اہمیت سے لوگوں کو روشناس کرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مثلاً ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری میں مسلمان ہر لحاظ سے ضلالت و گمراہی اور انحطاط کی گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے۔ اس دور میں شیخ عبدالحق دہلویؒ نے احیاء سنت و حدیث کے لیے انتھک محنت کی۔ نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مدرسہ رحیمیہ میں جو ان کے والد محترم نے قائم کیا تھا، حدیث و سنت کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جس میں غیر ممالک کے طلباء بھی شریک ہوتے تھے۔ درس و تدریس حدیث وسنت کا کام سرانجام دینے والے حضرات بھی درج ذیل حدیث کی مصداق واقعات علیا کے مالک تصور ہوتے ہیں:

وعن ابن مسعود قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم نضر الله امرا سمع منا شيئا فبلغه كما سمعه فرب مبلغ اوعى له من سامع (مشکوۃ بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ، ودار می عن ابی الدرداء)

ترجمہ: ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ خدا اس شخص کو خوش رکھے جو مجھ سے کوئی بات سنے اور اسے اسی طرح جیسے سُنا تھا (دوسروں تک) پہنچا دے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو بات پہنچائی جاتی ہے وہ سن کر پہنچانے والے کے مقابلے میں اسے بہتر طور پر کہتا ہے۔

یہ حدیث صرف صحابہ ہی کے عمل کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کا اطلاق عمومی ہے۔ نشر و اشاعت حدیث کا فریضہ ہر اس شخص پر عائد ہوتا ہے جو اسے جانتا اور سمجھتا ہو۔

دوسری صدی کے بعد کے مشہور محدثین کے اسماء گرامی

ہم نے صفحات بالا میں دوسری صدی ہجری تک حدیث سنت کی تدوین و تبویب کے سلسلے میں بعض تفصیلات عرض کی ہیں لیکن یہ کتاب ادوار ما بعد کے محدثین کی تفصیلات کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس کے لیے ایک مستقل کتاب ہی کفایت کر سکتی ہے۔ لہٰذا ناظرین کو بعد کی صدیوں میں علم حدیث کے سلسلے میں کام کی ایک جھلک دکھانے کے لیے ہم صدی وار اہم محد ثین کے ناموں کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں۔

صاحب ''الثقافۃ الاسلامیہ'' عماد حنبلی کی ''شذرات الذہب'' کے حوالے سے لکھتے ہیں :''

تیسری صدی ہجری کے مشہور ترین محدثین

اب آتی ہے تیسری صدی ہجری، تو اس میں سب سے زیادہ جو مشہور محدثین گزرے ہیں ان میں سے چند کے اسماء شذرات الذہب سے اخذ کر کے درج ذیل ہیں۔

۱۔ نضر بن شمیل متوفی ۲۰۳ھ	۲۔ ابو داؤد طیالسی متوفی ۲۰۴ھ
۳۔ عبد الرزاق بن حمام متوفی ۲۱۱ھ	۴۔ عبداللہ بن سلمہ القعنی متوفی ۲۲۱ھ
۵۔ یحییٰ بن معین متوفی ۲۳۳ھ	۶۔ ابو بکر بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ
۷۔ اسحاق بن راہویہ متوفی ۲۳۸ھ	۸۔ احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ
۹۔ عبد الحمید بن حمید متوفی ۲۴۹ھ	۱۰۔ محمد بن اسماعیل البخاری متوفی ۲۵۲ھ
۱۱۔ مسلم بن الحجاج متوفی ۲۶۱ھ	۱۲۔ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ
۱۳۔ ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ	۱۴۔ محمد بن عیسی ترمذی متوفی ۲۷۹ھ
۱۵۔ ابو بکرا لبزاز متوفی ۲۹۲ھ	۱۶۔ محمد بن اسماعیل الاسماعیلی متوفی ۲۹۵ھ

چوتھی صدی ہجری کے محدثین

اور چوتھی صدی ہجری کے مشہور ترین محدثین و حفاظ میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ احمد بن شعیب النسائی متوفی ۳۰۳ھ
۲۔ محمد بن اسحاق بن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ
۳۔ عبداللہ بن محمد اسفرائینی متوفی ۳۱۸ھ
۴۔ عبد الرحمان بن ابن حاتم متوفی ۳۲۷ھ
۵۔ عبد اللہ بن عدی متوفی ۳۶۵ھ
۶۔ ابو بکر احمد الاسماعیل متوفی ۳۷۱ھ
۷۔ علی بن عمر دار قطنی متوفی ۳۸۵ھ
۸۔ حمید بن ابراہیم الخطابی متوفی ۳۸۸ھ
۹۔ ابو عبد اللہ بن مندہ محمد بن اسحاق متوفی ۳۹۵ھ

پانچویں صدی ہجری کے محدثین

اور پانچویں صدی کے مشہور ترین محدثین و حفاظ میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ احمد بن محمد المالینی متوفی ۴۰۹ھ
۲۔ عبد الغنی بن سعید المصری متوفی ۴۰۹ھ
۳۔ ابو بکر بن مردویہ متوفی ۴۱۰ھ
۴۔ احمد بن محمد البرقانی متوفی ۴۲۵ھ
۵۔ احمد بن عبداللہ ابو نعیم اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ
۶۔ علی بن احمد بن حزم متوفی ۴۵۷ھ
۷۔ احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ
۸۔ احمد بن ثابت الخطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ

۹۔ ابو عمر یوسف بن عبد البر قرطبیؒ متوفی ۴۶۳ھ

۱۰۔ عبد الرحمان بن مندہ متوفی ۴۷۰ھ ۱۱۔ علی بن نصر بن ماکولا متوفی ۴۸۷ھ

چھٹی صدی ہجری کے محدثین

اور چھٹی صدی کے مشہور ترین محدثین میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ ابوبکر محمد السمعانی متوفی ۵۱۰ھ ۲۔ ابو علی حسین بن سکرۃ الاندلسی متوفی ۵۱۴ھ

۳۔ حسین بن مسعود البغوی متوفی ۵۱۲ھ ۴۔ عبد الوہاب الانماطی متوفی ۵۳۸ھ

۵۔ قاضی عیاض اندلسی متوفی ۵۴۴ھ ۶۔ قاضی ابو بکربن عربی متوفی ۵۴۶ھ

۷۔ ابو سعید عبد الکریم سمعانی متوفی ۵۶۲ھ ۸۔ ابو القاسم علی بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ

۹۔ ابو طاہر احمد بن محمد السلفی متوفی ۵۷۲ھ ۱۰۔ عبد الحق الا شبیلی متوفی ۵۸۱ھ

۱۱۔ عبد الرحمان السہیلی اندلسی متوفی ۵۸۱ھ ۱۲۔ عبدالرحمان الجوزی البکری متوفی ۵۹۷ھ

ساتویں صدی ہجری کے محدثین

اور ساتویں صدی ہجری کے مشہور ترین محدثین یہ ہیں۔

۱۔ عبد القادر الرہاوی متوفی ۶۱۲ ھ ۲۔ ابو بکر محمد بن عبد الغنی بن نقطہ متوفی ۶۲۹ھ

۳۔ عبد الرحمان الحرانی متوفی ۶۴۳ھ ۴۔ ابو عمر و عثمان بن صلاح متوفی ۶۴۳ھ

۵۔ محمد بن عبد الواحد المقدسی متوفی ۶۴۳ھ ۶۔ محمدبن محمود النجار بغدادی متوفی ۶۴۳ھ

۷۔ یوسف بن خلیل نزیل حلب متوفی ۶۴۸ھ ۸۔ عبد العظیم المنذری متوفی ۶۵۶ھ

۹۔ عبدالرحمان ابو شامہ متوفی ۶۶۵ھ ۱۰۔ ابو الحسن علی بن احمد الفخرا لبلجی متوفی ۶۹۰ھ

آٹھویں صدی ہجری کے محدثین

اور آٹھویں صدی ہجری کے مشہور ترین محد ثین یہ ہیں۔

۱۔ عبد المومن خلف الادمیاطی متوفی ۷۰۵ھ ۲۔ احمد بن تیمیہ الحرانی متوفی ۷۲۸ھ

۳۔ ابو الفتح محمد بن سید الناس متوفی ۷۳۴ھ ۴۔ عبد الکریم بن عبد النور الحلبی متوفی ۷۳۵ھ

۵۔ قاسم بن محمد البرزالی متوفی ۷۳۹ھ ۶۔ ابو الحجاج یوسف المزی متوفی ۷۴۲ھ

۷۔ محمد بن احمد بن قدامہ المقدسی متوفی ۷۴۴ھ ۸۔ محمد بن احمد الذہبی متوفی ۷۴۸ھ

۹۔ مغلطای بن قلیج متوفی ۷۶۲ھ ۱۰۔ اسماعیل بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ

۱۱۔ محمد بن رافع متوفی ۷۷۴ ھ

نویں صدی ہجری کے محدثین

اور نویں صدی ہجری کے مشہور ترین محدثین یہ ہیں۔

۱۔ سراج الدین عمربن الملقلن متوفی ۸۰۴ھ ۲۔ سراج الدین عمر بلقینی متوفی ۸۰۵ھ

۳۔ زین الدین عبدالرحیم العراقی متوفی ۸۰۶ھ ۴۔ نور الدین علی الھیثمی متوفی ۸۰۷ھ

۵۔ علاء الدین احمد بن حجی متوفی ۸۱۶ھ ۶۔ ولی الدین احمد العراقی متوفی ۸۲۶ھ

۷۔ تقی الدین محمد بن احمد الفاسی متوفی ۸۳۲ھ ۸۔ شمس الدین محمد بن محمد الجزری متوفی ۸۳۳ھ

۹۔ البرھان ابراہیم بن محمد الحلی متوفی ۸۴۱ھ ۱۰۔ شمس الدین محمد بن ابی بکر ناصر متوفی ۸۴۲ھ

۱۱۔ شہاب احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ ۱۲۔ احمد بن الشمنی متوفی ۸۷۲ھ

دسویں صدی ہجری کے محدثین

اور دسویں صدی ہجری کے مشہور ترین محدثین یہ ہیں۔

۱۔ محمد بن عبد الرحمان السخاوی متوفی ۹۰۲ھ ۲۔ الجلال عبد الرحمان السیوطی متوفی ۹۱۱ھ

۳۔ عبد العزیز بن عمر بن فھد متوفی ۹۲ھ ۴۔ احمد بن قسطلانی متوفی ۹۲۳ھ

۵۔ تقی الدین ابو بکر البلا طسی متوفی ۹۲۶ھ ۶۔ زین الدین عمر بن احمد الشماع الحلبی متوفی ۹۳۶ھ

۷۔ عبد الرحمان بن علی الربیع الزبیدی متوفی ۹۴۴ھ ۸۔ عبد العزیز فہد المکی متوفی ۹۵۴ھ

۹۔ احمد بن محمد بن حجر الھیثمی متوفی ۹۷۳ھ ۱۰۔ النجم محمد بن احمد الغیطبی متوفی ۹۸۴ھ

۱۱۔ الطاھر بن الحسین الاھدل متوفی ۹۹۸ھ

(تاریخ افکار و علوم اسلامی جلد اول صفحات ۴۲۴-۴۳۷)

دسویں صدی ہجری کے بعد محدثین کے ظہور کا سلسلہ رک نہیں گیا بلکہ حدیث کے ساتھ علماء کی دلچسپی برقرار رہی۔ چنانچہ محدث بلاد مغربیہ علامہ شیخ محمد عبدالحي کتانی (متوفی ۱۳۴۵ھ) اپنی کتاب ''فہرس الفہارس والاثبات'' جلد اول ص ۴۶ پر لکھتے ہیں۔

''جس کی تاریخ پر نظر ہے اور جس کے سامنے ماضی کی علمی رفتار ہے، اور جس نے نویں صدی ہجری سے لے کر عہد حاضر تک کی شامی، مصری، یمنی، ہندی، اور مغربی علماء کے حالات سے متعلق وسیع معلومات بہم پہنچائی ہیں اس پر یہ بات مخفی نہ ہو گی کہ اخیر

زمانوں کا کوئی دور ایسے افراد خالی نہیں رہا ہے جو ان کم سے کم اوصاف و شرائط تک سے تہی دامن ہوں، جن سے متصف ہونے کے بعد ہی کسی پر حافظ الحدیث کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔'' (تاریخ افکار و علوم اسلامی جلد اوال ص ۴۲۸)

اقسام حدیث

احادیث نبوی پر پر غور فکر کرنے اور انہیں زیر عمل لانے کے سلسلے میں ان کی نوعیت پر تفکر کر لینا بھی ضروری ہے۔ بعض احادیث حضور کے ایسے قول و عمل پر مشتمل ہیں جو دین و شریعت کے ابدی اصولوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونا واجب ہے۔ بعض ایسی ہیں کہ وہ وقتی حالات و مصالح کے تحت حضور کے احکامات و ہدایات کو ظاہر کرتی ہیں کچھ دوسری ایسی ہیں جو حضور کی ذاتی عادات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہر قسم کی حدیث عمل واتباع کے لحاظ سے اپنی مخصوص حیثیت کی مالک ہوتی ہے۔ اس مسئلے کی نزاکت واہمیت کے پیش نظر ہم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ''حجتہ اللہ البالغہ'' سے اقتباس پیش کرتے ہیں:

جلد اول کی ساتویں بحث کے تحت باب بعنوان ''بیان اقسام علوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم''میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

ترجمہ: جان لو کہ جو حدیثیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے روایت کی اور کتب حدیث میں مدون کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک قسم تو تبلیغ رسالت سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

ترجمہ: (جو کچھ رسول تمہیں دے یعنی حکم کرے وہ لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز رہو) (الحشر ۷)

ایسی حدیثوں میں معاد (آخرت) اور عالم ملکوت کے عجائبات کے متعلق معلومات ہیں۔ ان کا تعلق وحی سے ہے ان کا تعلق حضور کے اجتہاد سے نہیں ہے اور ان احادیث کا تعلق شرعی احکامات و عبادات کے نظم وارکان اور ارتفاقات امور تمدن و معاشرت سے ہے جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے۔ اور ان میں سے بعض کا تعلق وحی سے ہے اور بعض

کا اجتہاد نبوی سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد وحی کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی رائے کو خطاء پر جمے رہنے سے بچا رکھا ہے۔ یہ ضروری نہیں جیسا کہ سمجھا گیا ہے کہ آپ کا اجتہاد نصوص آیات قرآنی سے مستنبط کیا گیا ہو۔ بلکہ اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شریعت کے مقاصد اور اس کے تیسر اور احکام کے قوانین اور غایات سے آگاہ کر دیا تھا۔ آپ نے وحی کے سلسلے کے مقاصد اس قانون کے ذریعے سے واضح کر دیے اور اسی قبیل سے احکام مرسلہ اور مصالح مطلقہ ہیں جن کا تعین نہیں کیا گیا اور ان کی حدود بیان نہیں کی گئیں جیسے اخلاق فاضلہ اور اعمال فاسدہ ۔ ان کا بیشتر تعلق اجتہاد سے ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو ارتفاقات کے اصول تعلیم دے دیئے۔ ان میں سے آپ نے حکمت کا استنباط کیا اور کلیہ مقرر کیا اور ان کا تعلق اعمال حسنہ اور محنت و انتظامی خوبیوں سے ہے اور میں سمجھتا ہوں ان میں سے بعض کا تعلق وحی سے ہے اور بعض کا نبوی اجتہاد سے اور ان قوانین کا بیان پہلے بھی گزرچکا ہے اور یہ قسم حدیث ایسی ہے جس کی وضاحت اور معنی ہم آئندہ بھی بیان کریں گے۔

ان دو اقسام حدیث میں سے دوسرا تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں ۔۔۔اس کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ میں بشر ہوں، میں جب تمہیں دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اس کو اختیار کر لو، اور جب میں اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو یاد رکھو کہ میں بشر ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی ایک مثال کھجور کے نر کا مادہ کو پیوند لگانا ہے جس سے حضور نے منع فرمایا لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ تو حضور نے فرمایا یہ کوئی دینی حکم تو نہ تھا یہ میرا گمان تھا اس پر تم میرا مواخذہ نہ کرو۔ لیکن جب میں اللہ کی طرف سے کوئی بات بیان کروں تو اس پر پوری طرح عمل پیرا ہو جاؤ کیونکہ میں اللہ کی طرف غلط بات منسوب نہیں کرتا مثلاً آپ نے طب کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ اسی رائے کے زمرے میں آتا ہے۔ اور حضور کا یہ قول بھی اسی نوعیت کا ہے کہ ایسا سیاہ رنگ کا گھوڑا پالا کرو جس کی پیشانی پر سفید رنگ کا داغ ہو۔ اس کا تعلق حضور کے تجربے سے ہے۔ یہی حیثیت حضور کے ان افعال کی ہے جو آپ نے عادتاً انجام دیے لیکن ان کا عبادات سے کوئی واسطہ نہ تھا یا کوئی حرکت اتفاقاً آپ سے سرزد ہوئی نہ کہ قصداً اور ایسی باتیں بھی اس قبیل سے ہیں جو

آنحضرت نے قوم کی موافقت میں فرمائیں جیسے حدیث ام زرع اور حدیث خرافہ ایسی تمام باتیں سنت و حدیث کی حیثیت رکھتیں ہیں جن کی پابندی ہم پر لازم نہیں۔

ایک مرتبہ افراد کا ایک گروہ حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس آیا۔ وہ ان سے کہنے لگا کر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنایئے۔ حضرت زید نے کہا : میں حضور کا ہمسایہ تھا۔ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو مجھے بلا لیا جاتا۔ اور میں حضور کے لیے اس کو لکھتا اور حضور کا معمول یہ تھا کہ جب ہم دنیا کی باتیں کرتے تو آپ ہمارے ساتھ وہی باتیں کرتے، جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اسی کا تذکرہ کرتے، جب اشیاء خوردونوش کا موضوع چھڑتا تو آپ اس میں بھی شریک ہو جاتے۔ تو کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سب باتوں کو تمہارے سامنے بیان کر دوں؟ زیدؓ کا مطلب یہ تھا کہ میں ان تمام امور کے تذکرے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہ گویا انکار سوالیہ تھا۔

انہی امور میں آپ کے وہ قول و عمل بھی شامل ہیں جو آپ کسی روز کسی جزوی مصلحت کے تحت فرماتے یا کرتے لیکن ساری امت پر اس کا اتباع لازم نہیں اور اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی سربراہ فوج اپنے دستوں کو میدان جنگ میں ترتیب دے یا کوئی علامت متعین کرے تاکہ اپنے اور دشمن میں تمیز کی جاسکے-----

----اور بہت سے حضور کے ایسے احکام ہیں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ جو دشمن کے کسی شخص کو قتل کرے وہ مقتول کے سامان حرب کا مالک ہو گا۔ اور اسی طرح کے وقتی اور خصوصی احکامات بھی ابدی اتباع کی حیثیت نہیں رکھتے جن کا تعلق مقدمات کے فیصلوں سے ہے اور اس معاملے میں حالات کے مطابق مختلف ثبوتوں اور حلفوں پر انحصار کرتے تھے۔ اور حضرت علیؓ سے آپ کا ارشاد کہ موقع کا گواہ وہ کچھ دیکھ سکتا ہے جو غائب نہیں دیکھ سکتا۔ (صفحات ۲۸ – ۲۸۲)

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید وضاحتیں کی ہیں۔ لیکن ان سب کو یہاں نقل کرنا طوالت کا باعث ہو گا۔ اس مبحث کا اصولی حصہ درج کر دیا گیا ہے۔

ہم اس بات کا تذکرہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ عشق و عزیمت کے اپنی خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے بے شمار بزرگان دین گزرے ہیں جنہوں نے جہاں واجبات و فرائض

کو زیر عمل لانے کا پورا انتظام کیا وہیں اپنی تمام حرکات و سکنات معمولات اورنشست و برخاست میں حضور کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ انہی لوگوں میں خود شاہ ولی اللہ بھی شامل ہیں۔ لیکن اوپر کی بحث اصولی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات و نصوص کی اہمیت کا صحیح اور درست تصور قائم کیا جائے۔ اور ہر معاملے میں شارع علیہ السلام کی غایات کا فہم حاصل کیا جائے۔ نصوص میں قرآن و سنت کی طرف غلط مطالب و معانی اور مقاصد منسوب کرنا جو حضور کے پیش نظر نہ تھے دین میں غلط فہمیوں کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔

ہم نے اس سے قبل بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حدیث کے اقسام کے متعلق جو تحریر پیش کی ہے وہ تنہا شاہ صاحبؒ کی رائے پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ نظریہ صحابہؓ اور خلفائے راشدین کے دور سے چلا آ رہا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی اساس خود حضور ہی کے فرمودات اور طرز عمل سے فراہم کی ہے۔ صحابہؓ مزاج شناس رسول تھے اور حضور کی صحبت اور تربیت نے ان کے اندر یہ ذوق اور صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ وہ تبلیغ رسالت سے متعلق احکامات کو آپ کے اس قول و عمل سے ممیّز کر سکیں جن کی کوئی دینی اور شرعی حکم کی حیثیت نہ تھی۔ مؤخر الذکر کے متعلق چند مثالیں دی جا چکی ہیں۔ اس بات میں عدم فہم کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن میں سے بعض تو صاف کی جا چکی ہیں اور بعض کے متعلق آئندہ کے مباحث کے دوران متعلقہ ابواب میں گفتگو کی جائے گی۔

اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے کہ ثقاہت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس قدر تفصیل کے ساتھ حضور کی حیات طیبہ کے سلسلے کے جملہ واقعات کو کتب حدیث و تاریخ میں محفوظ کیا گیا ہے اس کی مثل دور قدیم سے آج تک کی کسی اور شخصیت کے حوالے سے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔صحابہؓ نے حضور کو جو کچھ فرماتے سنا اور کرتے دیکھا، اس کو بیان کر دیا۔ یہ دراصل آپ کی پرکشش، انتہائی طور پر جاذبیت کی حامل اور حسن اخلاق و کردار سے مزین زندگی کا اعجاز تھا کہ صحابہ کے دلوں میں آپ کے لیے عشق و احترام کے ایسے جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے آنحضرت کی ایک ایک بات اور ایک ایک

حرکت میں انہیں ادائے دلبری اور محبوبیت کا جلوہ نظر آتا تھا۔ علامہ اقبال نے غالباً حضور کے متعلق صحابہؓ ہی کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

عین ممکن ہے کہ علامہ نے یہ شعر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حضور کے متعلق اس جملے سے کہ کان وخلقه قران سے اثر (Inspiration) قبول کر کے کہا ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اس بات کا احساس تھا کہ آپ کے قول و عمل کے کون سے پہلو تبلیغ رسالت سے متعلق ہیں اور کونسی باتیں حضور سے عادتاً سرزد ہوتی ہیں جیسا کہ حجتہ البالغہ سے دیے گئے اقتباس میں حضرت زیدؓ بن ثابت کی تصریح سے واضح ہوتا ہے۔ آنحضرت کی فیض تربیت نے صحابہؓ کے اندر ایک طرف عشق و مستی اور دوسری طرف تفکر و تدبر کی کیفیات میں ایک حسین قسم کا توازن و امتزاج پیدا کر دیا تھا، اور اسی سے بعد میں آنے والے کبار ائمہ، جن کی علمی رفعت کی ایک دنیا قائل ہے، فکری و روحانی غذا حاصل کرتے ہیں۔

باب ۸

توحید

دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی پہلی شرط

ایک متفق علیہ حدیث ہے:

وعن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بنى الاسلام على خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمد اعبده ورسوله واقام الصلوة وايتاء الزكوة والحج وصوم رمضان

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی اساس پانچ باتوں پر ہے۔ (پہلی یہ کہ) اس بات کا اقرار کیا جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ (دوسرے) قیام نماز۔ (تیسرے) ادائیگی زکوۃ اور (چوتھے) حج کرنا اور (پانچویں) رمضان کے روزے رکھنا۔

دائرہ اسلام میں داخل ہونے اور اس دین کو اپنی زندگی کے لائحہ عمل کے طور پر اپنانے کے لئے سب سے پہلے اس حدیث کے مطابق دو جملوں کو مبنی بر حق تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک تو ہے لا الٰہ الا اللہ اور دوسرا ہے محمداً عبدہ ورسولہ۔ ان دونوں سے مل کر وہ کلمہ تشکیل پاتا ہے جس کے برسر حق ہونے کے زبانی اقرار اور قلبی توثیق کے بعد انسان حقیقتاً حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کلمے کو شارع علیہ السلام نے گویا اسلام کی عمارت کی بنیاد کی حیثیت اول قرار دیا ہے۔ باقی جن چار چیزوں کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہے ان کی تفصیل تو اپنے اپنے مقام پر آئے گی، اس باب میں ہم اس کلمے کے حوالے سے توحید

کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔ اگر اس کے الفاظ کی جامعیت اور ان کے غیر مبہم انداز پر غورو تفکر کیا جائے تو اسلام کے تصور توحید اور دین کی عمارت کی اساس کو سمجھنے کے لئے یہ کلمہ کفایت کرتا ہے۔ لفظ الٰہ تکوینی و تشریعی اختیارات کی کلی اور ہمہ جہتی ملکیت کے تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کہنے پر انسان کی طرف سے قطعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس اختیار کلی میں ہر کسی کی ہر قسم کی شرکت کی نفی ہو جاتی ہے۔

اس کلمے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو خصوصیات وضاحت کے ساتھ بیان ہو گئی ہیں۔ محمداً عبدہ ورسولہ میں آپ کی عبدیت کو آپ کے منصب رسالت سے پہلے بیان کردیا گیا ہے۔ اس میں ایک بہت اہم نکتہ اور اصول مضمر ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلام سے قبل تمام مذاہب و ادیان کے پیشواؤں اور بانیوں کی طرف سے منصب الوہیت منسوب کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہم نے ''پس منظر'' کے باب میں مثالیں دے کر عرض کیا ہے۔ یا تو وہ الہ مطلق تصور کرلئے گئے اوریا وہ اللہ کے ساجھی اور اولاد قرار دے دیئے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمہ میں ہی جو اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کی اولین شرط ہے، یہ واضح کردیا کہ رسالت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود حضور کے نوعی اعتبار سے بشر اور اللہ کا بندہ اور عبد ہونے کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ افضل البشر تو ہیں ہی لیکن الوہیت کی کسی معمولی سے معمولی صفت سے بھی آپ متصف نہیں۔ اس سے حضور کی طرف الوہیت کی نسبت کرنے کا دروازہ پوری طرح مسدود کر دیا گیا۔ البتہ آپ کے مقام رسالت کو پوری وضاحت کے ساتھ اسی کلمہ میں بیان کر دیا گیا، اور آپ کی رسالت کے اقرار کو اسی طرح شرط ایمان کی حیثیت دے دی گئی جس طرح اللہ تعالیٰ کے الٰہ ہونے کو دی گئی۔ اگر اللہ تعالیٰ کو الٰہ مطلق مان بھی لیا جائے لیکن حضور کی رسالت کو تسلیم نہ کیا جائے تو اللہ کی بارگاہ میں ایسا ایمان قابل قبول نہیں۔ یہ ایک عظیم اعزاز ہے جس کے سلسلے میں کوئی دوسرا آپ کا ہمسر نہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کا اس کی شان الوہیت میں کوئی ساجھی و شریک نہیں، اسی طرح رسول اور شارع ہونے کی حیثیت سے اس دین میں جو آپ پر نازل ہوا حضور کا مقام یکتا ہے۔ آپ کے اس مقام کو قرآن میں موکد کردیا گیا ہے۔ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے اور

آئندہ صفحات میں اس کی مزید وضاحت کی جائے گی۔ اگر تفکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کلمے میں حضور کی عبدیت اور رسالت کے بیان سے بھی نظریہ توحید ہی اجاگر ہوتا ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان کے لئے مکمل اور آخری شکل میں اساسات دین دے کر مبعوث کیا گیا اور اس دین کی فکری اور عملی تشریح کا منصب بھی آپ ہی کو سونپا گیا۔ لیکن اس عظیم مرتبے اور مقام کے باوجود کلمے ہی میں اس بات کی توضیح کر دی گئی کہ آپ اسی کے بندے اور رسول ہیں۔ گویا اس تعلق میں اور کسی ہستی کا عمل دخل نہیں اور حضور خدا تعالیٰ کے بندوں ہی کے زمرے میں شامل ہیں اور اس کے رسول ہونے کی حیثیت سے بعینہٖ وہی پیغام لوگوں تک پہنچایا جو ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس میں آپ کو کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ لفظ عبدیت میں کامل استسلام اور پابندی احکامات الٰہی کا مفہوم بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ہم اس سے قبل قرآن و حدیث سے حوالے دے کر حضور کے اس مقام کے مالہ و ماعلیہ کی توضیح کر چکے ہیں۔ یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حضور کی عبدیت کو دائرہ اسلام کی شرط کا جزو بنانے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب و ادیان کے پیروان کے رویے کے برعکس آج تک دین اسلام میں علمی سطح پر یہ مسئلہ کبھی زیر بحث ہی نہیں آیا کہ آیا حضور کو اختیارات و صفات باری تعالیٰ میں سے معمولی سے معمولی حصہ بھی ملا نہیں۔ اسلام کا سواد اعظم ہمیشہ ہی حضور کی عبدیت پر متفق رہا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں وجہ اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے لئے متذکرہ صدر کلمہ کا اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کرنے کی شرط ہی ہے۔ اس سے ہر مسلمان کے اندر یہ پختہ احساس و شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی الوہیت کے مقام پر فائز ہیں اور ہمارے پیغمبر کا مقام واقعتاً جتنا بھی بلند و ارفع ہے لیکن آپ اس کے عبد اور بندے ہی ہیں، اور انہیں اس کی الوہیت میں معمولی سے معمولی شراکت کا مرتبہ بھی حاصل نہیں اور اس رفعت و مقام بلند جس پر حضور فائز ہیں کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے اختیارات الوہیت میں دخیل نہیں ہو سکتے تو کوئی اس نوعیت کے کسی اختیار کے حامل ہونے کا کیسے مدعی ہو سکتا ہے۔

اس کلمے کی بدولت مسلمانوں میں پائے جانے والے وہ نام نہاد مذہبی رہنما بھی، جو ملت مسلمہ میں مار آستین کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جو اپنے مادی مفادات کی خاطر سادہ لوح لوگوں اور بعض پڑھے لکھے جہلاء کے ضعیف العقیدہ ہونے کے مرض سے فائدہ اٹھا کر اور ان کے دنیوی طمع و لالچ پر مبنی خواہشات کے حصول کے امکانات کا سراب دکھا کر ان سے مشرکانہ حرکات کرواتے ہیں، توحید کے اصول کی حقانیت سے علی الاعلان انکار کرنے کی جرات نہیں کرسکتے اور اپنی مجرمانہ حرکات کی پردہ پوشی کے لئے انہوں نے باب الحیل واکر رکھا ہے، جس سے وہ اپنے اپنے حلقے کے بے خبر لوگوں کو چکمے دیتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ مشرکین مکہ سے ملتا جلتا ہے جس پر اس مبحث میں آئندہ روشنی ڈالی جائے گی۔

تمام انبیاء نے دعوت کا آغاز عقیدۂ توحید پیش کرنے کے ساتھ کیا

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کرچکے ہیں، کہ ہم نے تمام قوموں اور ملتوں کی طرف انبیاء و رسل بھیجے۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی اور دعوت کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے۔ ان حضرات نے ہمیشہ دعوت کی ابتداء توحید کا عقیدہ پیش کرنے سے کی۔ اس عقیدے کی زد چونکہ بادشاہوں اور آمروں کے باطل حق مطلق العنانی و قانون سازی پر اور حکمران طبقوں اور مذہبی رہنماؤں کے مفادات پر پڑتی تھی، لہٰذا انہوں نے متحد ہو کر انبیاء و رسول کی مخالفت کی اور انہیں طرح طرح کی ایذاؤں اور صعوبتوں کا نشانہ بنایا۔ لیکن کوئی ایک رسول یا نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس نے توحید کے سلسلے میں اپنے موقف سے ذرہ برابر انحراف کر کے معمولی سے معمولی پیمانے پر بھی اس معاملے میں مصالحت کی ہو۔ تمام انبیاء نے زمان و مکان کے بعد اور تحریری دستاویزات کے عدم موجودگی کی وجہ سے ایک دوسرے کے حالات اور نظریات سے لاعلمی کے باوجود توحید کا ایک ہی تصور پیش کیا۔ مثلاً قرآن حضرت نوحؑ کے متعلق کہتا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ
(۷:۵۹-۶۰)

ترجمہ: ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میرے ہم قومو ! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں، میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کے تسلط سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا کہ ہم تم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔

آگے چل کر اسی سورہ میں حضرت ھودؑ کی دعوت توحید کا تذکرہ ہے:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ (۷: ۶۵-۶۶)

ترجمہ: اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے ان کو دعوت دی، اے میرے ہم قومو ! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں کیا تم ڈرتے نہیں ؟ اس کی قوم کے بڑوں نے، جنہوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔

اسی طرح قوم ثمود کو حضرت صالحؑ نے صرف اللہ ہی کے الٰہ ہونے کی دعوت دی

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ؔۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ (۷:۷۳)

ترجمہ: اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو ! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

انہی الفاظ میں حضرت شعیبؑ نے قوم مدین کو دعوت توحید دی(۷:۸۵)

حضرت عیسیٰؑ کی طرف قرآن یہ الفاظ منسوب کرتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۵۱:۲)

ترجمہ :بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، تمہارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کا قرآن میں بار بار دعوت توحید کے سلسلے میں تذکرہ آتا ہے۔ دونوں ہی نے طاغی اور جبار حکمرانوں اور مشرک اقوام کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا

اعلان کیا۔ یہی مسئلہ ان کے دعوتی اصولوں میں سرفہرست تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت توحید کے سلسلے میں دوسری سورتوں کے علاوہ خصوصی طور پر سورۂ بقرہ، آل عمران اور انعام دیکھئے اور حضرت موسیٰؑ کی ''ضرب کلیمی'' کا مشاہدہ خصوصیت کے ساتھ اعراف، یونس، طہ، اور شعراء کی سورتوں میں کیجئے۔ اگر غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد تصور توحید ہی ہے اور اسی سے اسلام کے تمام اصولوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اور یہی مسئلہ ہے جو کفار و مشرکین اور ان کے حکمرانوں اور صاحب اقتدار طبقات کے جاہلانہ غیظ و غضب کو ابھارتا رہا ہے، اور انہیں مضمرات کے خوف سے انھوں نے انبیا علیہم السلام کو ظلم و تعدی کا نشانہ بنایا (۷۸:۱۰) ہم ''منصب رسالت'' کے باب میں ''رسول کے قائم شدہ نظام فکر و عمل'' کے ضمنی عنوان کے تحت رسولوں کی دعوت کے سلسلے میں کفار و مشرکین کے رد عمل کے متعلق قرآنی حوالے دے چکے ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے داعیان حق کے خلاف ایذ دہی کی مختلف صورتوں اور ملک بدر کرنے کے منصوبے بنائے۔ (۲۶ : ۱۶۷) جابر و ظالم حکمرانوں نے رسولوں کو رجم اور قتل کرنے تک کے ارادے کئے جنہیں مشیت خداوندی نے ناکامی سے ہمکنار کیا۔ (۴۰ : ۲۶) ، (۲۶ : ۱۱۶) انہیں دہکتی آگ میں بھی ڈالا گیا (۲۱ : ۶۸) ، (۲۹ : ۲۴)

قرآن میں اللہ تعالیٰ انبیاء و رسول کے یہ قصص محض اس لئے بیان نہیں کرتا کہ لوگ انؑ کی جانفشانیوں اور قربانیوں پر ان کی تحسین کرنے ہی پر اکتفا کریں، بلکہ اس سے قرآن ہی کے مطابق انسانوں کے لئے عبرت آموزی کا سامان فراہم کرنا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

لَقَدۡ كَانَ فِيۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ ؕ (۱۲:۱۱۱)

ترجمہ: ان کی سرگزشتوں میں اہل علم کے لئے بڑا سامان عبرت ہے۔

اس عبرت کے ذریعے بہت سے مقاصد کا حصول پیش نظر ہے۔ پہلا مقصد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ دین اسلام عقیدہ توحید کے ساتھ بشر اوّل کے زمین پر بسنے کے وقت سے چلا آرہا ہے، اور اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی نوع انسانی کی عمر۔ دوسرا مقصد اس بات کی وضاحت پر مشتمل ہے کہ اس کے اساسی اصول، جن میں توحید

سرفہرست ہے، ہمیشہ یکساں رہے ہیں۔ تیسرے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ انسانی میں حق و باطل کی کشمکش ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور دین حق کا علم بلند کرنے والوں اور اس کے نفاذ کی جدوجہد کرنے والوں کو یہ کبھی نہیں سوچنا چاہئے کہ وہ عالمی تاریخ میں پہلی بار اس آزمائش میں ڈالے گئے ہیں کہ دین کی خاطر صعوبتیں برداشت کریں۔ چوتھا مقصد یہ ہے کہ یہ بات آشکارا ہو جائے کہ دعوت و نفاذ دین کا راستہ کانٹوں سے اٹا پڑا ہے، یہ پھولوں کی سیج کے مشابہ نہیں ہے۔ اس سفر کے دوران گھر بار بھی لٹانا پڑتا ہے، تمام آسایشوں کو تجنا پڑتا ہے، اپنی جانوں تک کے نذرانے پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا ہوتا ہے، جبارین وقت سے پنجہ آزمائی کرنا ہوتی ہے۔ اورتاریخ اسلام بیان کرنے کا پانچواں مقصد یہ ہے کہ جس قسم کے حالات بھی ہوں اور جس قدر ہولناک مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑے، اسلام کے اصولوں اور ان کے حصول کے لئے انبیاء و رسل کے علم کےذریعے سے پیش کردہ طریق کار سے نہ روگردانی کرنی چاہئے اور نہ ان کے سلسلے میں کوئی مصالحت کرنی یا قریب کا راستہ (Short Cut) اختیار کرنا چاہئے۔ اگر اس آخری اصول کی پابندی نہ ہوتی تو اعلان توحید کے ساتھ جماعت انبیاء و رسل اور ان کے متبعین پر صعوبتوں کے جو پہاڑ ٹوٹ پڑتے تھے ان کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ عقیدہ توحید کے ان مضمرات کا بیان جن سے کفرو شرک آج بھی تلملا اٹھتا اور ادوار ماضی میں بھی تلملا اٹھتا تھا، اسی باب میں کیا جائے گا۔

توحید کے حق میں قرآنی انداز استدلال

اسلام نے توحید کے عقیدے کی طرف ایک بلا دلیل یا اذعانی اصول (Dogma) کے طور پر دعوت نہیں دی جیسا کہ مادہ پرست تاثر دیتے ہیں، اور بے خبر لوگ ان کے اس غلط دعوے کو قبول کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، بلکہ اس نے انفس و آفاق سے اس کے حق میں استشہاد و استدلال کیا ہے۔ ایک مطلقاً بالا تر ہستی اور اس کائنات کی خالق قوت کا تصور مختلف صورتوں میں اس کرہ ارض کی آبادی کے ذہنوں پر ہمیشہ ہی چھایا رہا ہے۔ البتہ

جہاں انبیاء و رسل کی تعلیمات کا غلبہ یا اثر ہوتا ہے، وہاں اس ہستی کی صفات کا تصور واضح ہوتا ہے، اور جہاں کفر کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی شرک کا دور دورہ ہوتا ہے وہاں اس ہستی کی صفات کا تصور دھندلا یا انسانی شعور سے یہ لا تعلق ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی فطرت یا اس کی باطنی دنیا سے اس کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے۔

ا۔ انفسی استدلال

اگرچہ تفصیلی بحث تو بعد میں آئے گی، لیکن ہم یہاں مجملاً عرض کردیں کہ مغرب کی مادہ پرست دنیا میں جس وسیع پیمانے پر انکار وجود باری تعالیٰ کے متعلق لٹریچر شائع ہوا ہے کسی ایک شعبہ علم میں ان کے ہاں اتنا فکری مواد وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہر شعبہ علم سے دہریت (Atheism) کے حق میں استشہاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہاں تک کہ اس نکتہ نظر کو تقویت پہنچانے کے لئے انہیں مرتب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تصور کو اجتماعی زندگی سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کی عوام آباد کلیساؤں میں جانے سے باز نہیں آئی۔ عوامی اذہان و شعور سے اللہ کے تصور کو چاہے وہ اسلامی نکتہ نظر سے مسخ شدہ ہے، محو کرنے کی جس قدر علمی سعی و جہد مغربی تمدن میں کی گئی ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اسی تمدن کی ایک شاخ مارکسی کمیونزم کی شکل میں پھوٹی۔ اس نظام نے (غلط) استدلال کے ذریعے سے، اور بجبر بھی خدا کے انکار پر لوگوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کےانہدام کے ساتھ ہی عبادت گاہیں عوام سے معمور ہو گئیں۔آخر یہ کونسا باطنی اور فطری رجحان ہے جو انسان کو ایک بالاتر ہستی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بوقت پریشانی ہر متنفس ان مادہ پرستانہ اور خدا ناشناس نظاموں کے تحت رہتے ہوئے بھی بے ساختہ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا ہے۔ قرآن ایسے لوگوں ہی کی حالت کی یوں تصویر کشی کرتا ہے:

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (٦ : ٦٣ – ٦٤)

ترجمہ: ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے جبکہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے ؟ کہہ دو اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے۔ اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔

اسی بات کو قرآن ایک اور انداز سے بیان کرتا ہے:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ (۳۹:۸)

ترجمہ: اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے، اس کی طرف متوجہ ہو کر، پھر جب وہ اپنی طرف سے اس کو فضل بخش دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لئے پہلے پکارتا رہا تھا۔

اسی کو اسلام میں فطرت کی آواز کہا گیا ہے لیکن مغربی مادہ پرستانہ فکر خوف کو اس جذبے کا محرک قرار دیتا ہے جو انسان کی توہین کرنے کے ہم معنی اور اس کی جملہ صلاحیتوں کو بیکار قرار دینے کے مترادف ہے۔ قرآن میں تخلیق آدم کے موقعہ پر اس کو جو مقام عطا کیا گیا اس کی صراحت کے سلسلے میں یہ بھی فرمایا گیا:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ(۷:۱۷۲)

ترجمہ: اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ۔۔ ان کی پیٹھوں سے ۔۔۔۔ ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لئے کہا کہ مبادا قیامت کو تم غور کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

اس آیت کے ذریعے یہ بتلانا مقصود ہے کہ فطرت صحیحہ کا رجحان قبولیت توحید کی طرف ہی ہوتا ہے۔ لیکن جس درجے میں اس کو مسخ کردیا جائے تو ظاہر ہے کہ اسے توحید کی طرف راغب کرنے کے لئے اتنی ہی دقت پیش آتی ہے۔ قرآن میں مختلف اقوام اور انبیاء و رسل کے قصص سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جن معاشروں میں تعدد الٰہ کے عقائد آباؤ

اجداد کی تقلید جامد سے ظہور میں آتے ہیں اور اس معاملے میں تفاخر و تعصب کی شدت پائی جاتی ہے ۔ ان کی فطرت میں اس قدر فساد پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دعوت حق کی طرف توجہ دینے ہی کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ورنہ اگر وہ غوروتدبر پر آمادہ ہو جائیں اور دعوت حق کے مالہ وماعلیہ پر تفکر کرنے کی طرف راغب ہو جائیں تو لازماً ان کے باطن سے قبولیت توحید کے حق میں تائیدی اصرار کی آواز اٹھتی محسوس ہوگی۔

مندرجہ بالا آیت میں مجازی انداز سے اسی بات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انسانی روح کے متعلق اس کی ارضی زندگی سے قبل اور اس کے بعد آخرت میں پیش آنے والے حالات چونکہ زمان و مکان کی موجودہ صورتحال سے مختلف کیفیات رکھتے ہیں اور انسانی خرد اور محسوسات کی گرفت سے ماورا ہیں۔ لہٰذا انہیں تمثیلاً ہی پیش کیا گیا ہے۔ مقصد ان کی ماہیت کو سمجھانا نہیں بلکہ انسان کے ذہن میں اس کائنات اور نوع انسانی سے متعلق جو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، اور جن کے الٹے سیدھے جوابات گھڑنے سے انسانی فکر اور زندگی کے معاملات میں فساد پیدا ہوتا ہے ان کے اس حد تک مبنی بر حقیقت جوابات فراہم کرنا ہے جس سے انسانی ذہن کے لئے یک سوئی اور اطمینان کا سامان مہیا ہو جائے، اور غیب میں پوشیدہ ان اسرار کو انسان اپنی عقل و خرد کے ذریعے معلوم کرنے میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کرے جن تک اس کی رسائی محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

یہ کہہ کر کہ عقیدۂ توحید کو قبول کرنے کا رجحان انسان کے اندر فطرتاً پایا جاتا ہے، انسان کے شرف کو نمایاں کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی خلقت اس نوعیت کی ہے کہ اس کا باطن کشمکش حق و باطل کی آماجگاہ ہے اور تخریب آسان ہی نہیں بلکہ خود بھی وجود پذیر ہو جاتی ہے، اور اس کے مقابلے میں تعمیر سعی و جہد چاہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر آپ ایک عمارت کی حفاظت اور نگہداشت نہ کریں تو وہ از خود موسمی اثرات کے تحت مائل بہ تخریب ہو جائے گی، اور اگر اس کو مسمار کرنے کی عملاً کوشش کریں گے تو اس میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ اس کے برعکس عمارت کی تعبیر کے لئے کثیر محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محدود معنوں میں اس مثال کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے۔ ضرر رساں ماحول اور تربیت کا اثر تو اس پر از خود ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن اس کے عہد الست، جس کا اس آیت میں تذکرہ

ہے، کا اس کی فطرت کے اندر یہ اثر ہوتا ہے کہ قبولیت توحید کی طرف اس کے رجحان میں اس قدر شدت ہوتی ہے کہ اگر آبائی اور ماحولیاتی آلودگیوں سے اس کے اندر ضد اور ہٹ دھرمی نہ پیدا ہو جائے تو وہ دعوت توحید کی طرف اس طرح لپکتا ہے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ توحید اور اس کے مضمرات کی قبولیت انسان کو غبار راہ سے کیمیا بنا دیتی ہے۔ اس حیرت انگیز تغیر کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں کہ تصور توحید فطرت انسانی سے ہم آہنگی رکھتا اور اس سے انحراف موجب فساد ہوتا ہے۔ عہد الست سے پیدا شدہ اس فطری خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ انسان جب اپنے حیات و ممات کے مسائل پر غور کرتا ہے اور اس کائنات کی وسعت اور اس کے مظاہر پر نظر دوڑانے کے علاوہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز میں بے بسی کے عنصر کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے تو اس کی قوتِ فکریہ ناگزیر طور پر اس طرف مائل ہوتی ہے کہ لازماً ان ساری باتوں اور معاملات پر کوئی قوت مدبرہ حکمرانی کر رہی ہے جو اس کے اپنے احاطہ اختیار سے ماورا ہیں۔ لیکن چونکہ ان معاملات کی حقیقت پردہ غیب میں پنہاں ہے لہٰذا اس کے لئے وحی پر انحصار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر وہ وحی سے فائدہ نہ اٹھائے تو اس جبلی طلب کی پیاس کو بجھانے کے لئے وہ بے نتیجہ صحرا نوردی میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور انتہائی کاوش کے باوجود اس کا سراغ نہ پانے پر بھی اس تلاش حقیقت کی سرگرمیوں سے دستبردار نہیں ہوتا۔ اگر تدبر سے کام لیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنا ناگزیر ہے کہ یہ طلب اسی عہد الست کے اثرات کے ہم معنی ہے جو انسان کے باطن پر چھایا ہوا ہے۔

مسئلہ الہیات پر انسانی غور و تدبر کی جس قدر تاریخ بھی ہمیں دستیاب ہے اس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ توحید کے علاوہ اس سلسلے میں انسانوں نے جتنے گمراہ کن نظریات بھی اپنائے ہیں ان میں رب الاربابی کا تصور کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ کار فرما رہا ہے۔ قرآن کی مخاطب اول قوم نے اگرچہ کائنات اور زندگی کے معاملات کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرکے ہر شعبے پر کسی نہ کسی بت کی کارفرمائی تسلیم کر رکھی تھی، لیکن جیسا کہ ہم شرک کے عنوان کے تحت قرآنی حوالوں سے ثابت کریں گے وہ ان سب پر چھائی ہوئی خدا کی ہستی کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ ہندوستان میں کوئی ایسی صنف مخلوق نہیں جس کی

چوکھٹ پر سجدۂ عبودیت بجا نہ لایا گیا ہو۔ لیکن، جیسا کہ ہم ''پس منظر'' کے باب میں بیان کر چکے ہیں، ہستی باری تعالیٰ کو بھی اس تنزیہی درجہ کمال تک پہنچایا جاتا رہا کہ معاملہ تعطیل تک جا پہنچا۔ چین میں آبا پرستی کے ساتھ ایک بالاتر ہستی کے وجود کا تصور بھی چلتا رہا۔ اسی باب میں سقراط کے دعوتی حالات لکھتے ہوئے ہم تذکرہ کر چکے ہیں کہ یونان میں ایک رب الاربابی نظریہ پایا جاتا تھا، لیکن سقراط کیونکہ بے آمیز توحید کا قائل تھا اور یونانی دیوتاؤں کا منکر تھا لہٰذا اسے سزائے موت کا سامنا کرنا پڑا۔

ان سب رجحانات سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ انسان کے اندر اس کائنات پر چھائی ہوئی ایک اعلیٰ صفات سے متصف اور انسانی ذہن و تصور میں نہ آسکنے والی اور ہر قسم کی تعبیرات سے بالا اور ماورا ہستی کے تصور کی آواز اٹھتی رہی ہے، اور یہ اسی عہد الست کی صدائے بازگشت ہے جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت قرآنی میں کیا گیا ہے۔ لیکن اس ہستی کی صفات کا اس حد تک تصور جس کا انسانی فہم متحمل ہو سکتا ہے صرف وحی ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔

انسان اگر معمولی سا غور و فکر کرے تو یہ بات واضح طور پر ابھر کر اسکے ذہن میں آجائے گی کہ اس کا اپنا وجود ایک نہایت پیچیدہ اور گھمبیر کائنات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا جسمانی ڈھانچہ اور باطنی دنیا دونوں ہی محیر العقول خصوصیات کی حامل ہیں، جن کی بناوٹ اور استعدادوں کو وجود میں لانے میں انسان کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ نہ ہی وہ اپنی تمام فلسفیانہ اور سائنسی کاوشوں کے ذریعے ان کے معرض وجود میں آنے کی کنہ سے آشنا ہو سکتا ہے۔ وہ صرف ایک امر واقعہ کی حیثیت سے یہ جانتا ہے کہ اس کی شخصیت کے وجود میں آنے کی ابتداء ایک مرد اور ایک عورت کے جنسی تعامل کے نتیجے میں ہوئی اور اس کا ذریعہ ایک نطفہ (Sperm)جو رحم مادر میں بنے ہوئے بیضے (Ovum) پر مرد کے مادۂ حیات کی شکل میں پانی کی بظاہر ایک حقیر حیثیت میں ٹپکا دیا جاتا ہے۔ اسی سے جنین اور اس کے مختلف مدارج ترقی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو عام طور پر نو ماہ تک رحم مادر میں جاری رہتا ہے۔ علم الجنین (Embryology) میں ابتدائی حالت جنین کو (Embryo) اور جب اس کے اعضاء کا

نقشہ واضح ہو جاتا ہے تو اس کو (Foetus) کہتے ہیں۔ اس ترقی کے مدارج کو قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک الگ جگہ فرمایا:

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۵:۲۲)

ترجمہ: (اس بات پر غور کرو) ہم نے تمہیں (کس چیز سے) پیدا کیا ؟ مٹی سے ، پھر (تمہاری پیدائش کا سلسلہ کس طرح جاری ہوا ؟) اس طرح کہ پہلے نطفہ ہوتا ہے۔ پھر ''علقہ'' بنتا ہے (یعنی جونک کی طرح کی ایک چیز) پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کا ایک ٹکڑا۔ اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ تم پر (اپنی قدرت کی کار فرمائیاں) واضح کردیں۔ پھر دیکھو جس نطفہ کو ہم چاہتے ہیں (تکمیل تک پہنچائیں) اسے عورت کے رحم میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔

رحم مادر میں جنین کی حفاظت کے لئے اس کو تین پردوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ (۶:۳۹)

یہ آیات اس دور میں نازل ہوئیں جب عرب تو عرب دنیا کے کسی گوشے میں مسئلہ جنین اور مکمل انسان تک اس کی ترقی کے بارے میں نہ کوئی تجسّس پایا جاتا تھا، نہ کسی کو کوئی معلومات حاصل تھیں اور نہ ایسی معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ موجود تھا۔ صرف کسی تجرباتی مشاہدے کے بغیر ارسطو کے کچھ ظنی خیالات یونانی علوم کی ان کتب میں پائے جاتے تھے جو رومیوں کے زیر تحویل الماریوں میں مقفل و مدفون تھیں اور جن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جارہا تھا۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے ان کی تصنیف کے صدیوں بعد انہیں اس قصر گمنامی سے نکالا۔ لیکن نزول قرآن کے وقت ان سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ زمانہ حال کی سائنسی تحقیقات کے بعد اب جنین کے متعلق ارسطو کے خیالات کی کوئی وقعت نہیں رہی اور نہ وہ حقیقت پر مبنی پائے گئے ہیں۔

ہم جب بھی کسی شعبہ علم و سائنس کے بارے میں قرآن سے حوالہ دیتے ہیں تو قرآن میں مذکور ایسے موضوعات کے متعلق ناظرین کے اس نقطہ نظر کی صحت کی خاطر یہ واضح

کرتے چلے آرہے ہیں کہ کتاب اللہ کسی خاص تکنیکی شعبہ علم کی کتاب نہیں بلکہ جہاں بھی علمی و سائنسی موضوعات کے متعلق اشارات کئے گئے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور انفس و آفاق سے اس کی توحید کے حق میں استشہاد مقصود ہوتا ہے۔ یہی صورت علم الجنین (Embryology)کے متعلق درج بالا آیات کی ہے۔

سائنسی سطح پر یہ علم ماضی قریب کی پیداوار ہے اور اس کا کوئی انکشاف قرآنی بیان سے متصادم نہیں ہوا بلکہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نزول کے بعد زمانی کے باوجود (۳) میں دی گئیں مکی آیات اور (۱) میں دی گئی مدنی آیات میں کوئی تفاوت نہیں حالانکہ قرآن ایک رسول امی پر نازل کیا جارہا تھا۔ دونوں کو ملا کر ان پر غور کرنے سے معلومات کا دائرہ وسعت اختیار کر جاتا ہے۔ ان آیات میں رحم مادر میں انسانی جنین کے جن مراحل ترقی کا تذکرہ ہے سائنس نے ان کا انکشاف نہایت حساس آلات کی وساطت سے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے زمانے پر پھیلے ہوئے طویل تجربات کے بعد کیا ہے۔ قرآن نے ان کی خبر قدرت الٰہی کے حوالے سے تیرہ صدیاں قبل دے دی تھی۔ یہ بات ان متعدد شواہد میں سے ہے جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ قرآن حضور کا تصنیف کردہ نہیں جیسا کہ مستشرقین کہتے ہیں بلکہ اس خالق کائنات و انس کا نازل کیا ہوا ہے جس نے حیوانی و انسانی تخلیق کا ایک محیر العقول طریقہ متعین کیا۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جنین کے مراحل ترقی کے از خود معلوم کرنے کا حضور کے پاس کونسا ذریعہ تھا۔

آیات (۱) اور (۳) میں جنین کے حوالے سے انسان کے وجود میں آنے کے جو مراحل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت ان آیات ہی سے ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہیں:

روح کے استثنیٰ کے ساتھ جو امر ربی سے وجود میں آتی ہے جسم انسانی سے متعلق ہر شے کے خلیات تخم رجال واناث سمیت منبع مٹی ہی ہے۔

پھر کہا کہ نطفہ رجال (Sperm) قرار مکین یعنی متعین مقام جو بیضہ اناث ہے میں جما دیا جاتا ہے۔ اب جنین کے درجات ترقی کا آغاز ہو گیا۔

اس میں تبدیلی و تغیر ہوا تو اس نے وہ شکل اختیار کی جسے قرآن علقہ کہتا ہے۔

''علقہ'' سے ''مضغہ'' وجود میں آتا ہے جسے گوشت کا ٹکڑا کہہ سکتے ہیں، جس میں نہ کوئی ہڈی ہے اور نہ اس کی کوئی خاص شکل و صورت۔

ازاں بعد اس ٹکڑۂ گوشت میں ہڈیاں (عظماً) نمودار ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ان ہڈیوں پر گوشت اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے انسانی ڈیل ڈول بننا شروع ہو جاتا ہے۔

مزید ترقی و نمو سے انسان وجود میں آجاتا ہے۔ جسے خلقاً آخر کہا گیا ہے۔

(مولانا ابوالکلام آزاد نے سائنسی علم الجنین کے مطالعہ کے بعد ''ترجمان القرآن'' میں سورۃ المومنون کے آخر میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ دلچسپی رکھنے والے ناظرین اس سے رجوع کر سکتے ہیں)

جہاں تک نمبر (۲) پر دی ہوئی آیت کا تعلق ہے اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بھی بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات سے مطابقت رکھتا ہے اور اس سے قبل یہ بات کسی کے علم میں نہ تھی۔ جنین میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ایک نہایت ہی نازک اور حساس شے پر وارد ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے اسے تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تاریکیوں یعنی پردوں میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ آج تک مفسرین ان تین پردوں سے بطن، رحم اور مشیمہ (مشیمہ کو سائنسی اصطلاح میں Placenta کہا جاتا ہے) مراد لیتے رہے ہیں۔ لیکن آیت مذکورہ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین پردوں کا وجود ماں کے پیٹ کے اندر جنین سے متعلق ہوتا ہے۔

اس کے بارے میں آج کے تحقیقی نتائج کو امریکہ میں نارتھ کیرولینا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ٹی ڈبلیو سیڈلر (T.W.Sadler) نے اپنی تصنیف (Longman's Medical Embryology) میں بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق جنین کے بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے اس کے اردگرد کے پردے (جنہیں قرآن نے ظلمات کہا ہے) بھی بدلتے رہتے ہیں، لیکن تعداد میں یہ مستقلاً تین ہی رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سیڈلر کہتا ہے کہ جب جنس اناث کا بیضہ (Ovum) اور جنس رجال کا تخم (Sperm)مل جاتے ہیں اور Fertilized Ovum رحم مادر (Uterus) کی طرف بڑھتا ہے تو اس وقت رحم کی تین تہیں ہوتی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

ا۔ اندرونی جھلی جسے Endometrum کہتے ہیں۔

2۔ درمیانی گوشت والی جھلی جسے Myometrum کہتے ہیں۔

3۔ بیرونی تہ جسے Pesimetrum کہتے ہیں۔

رحم مادر میں جنینی بچہ دانی (Blastocyst) جن جھلیوں میں ملفوف ہوتی ہے ان میں بتدریج تبدیلیاں ہوتی رہتی اور انہیں طبّی اصطلاح میں یہ نام دیئے جاتے ہیں:

1-Compact Layer

2-Spongy Layer

3-Basal Layer

اس طرح جب Blastocyst کی افزائش شروع ہوتی ہے تو تیسرے سے آٹھویں ہفتے کے دوران جسے Embryonic Period کہتے ہیں، ایسی تین تہیں وجود میں آجاتی ہیں، جنہیں Germ Layersکہا جاتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

1- Ectoderm

2-Mesoderm

3- Endoderm

ان کے وجود میں آنے کے بعد جنین Foetus کہلاتا ہے اور اعضا کی تشکیل کا آغاز ہوتا ہے۔

جب رحم مادر میں انسان کے قوائے جسمانی و باطنی مکمل ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد کے مراحل کے متعلق قرآن بیان کرتا ہے:

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ (۵:۲۲)

ترجمہ: پھر تم کو ہم ایک بچے کی شکل میں برآمد کرتے ہیں۔ پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض پہلے ہی مرجاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچتے ہیں تا آنکہ وہ کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔

پھر فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً ؕ (۳۰:۵۴)

ترجمہ: اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔

استقرار حمل سے لیکر ارذل العمر تک انسان جن مراحل سے گزرتا ہے اس میں واضح طور پر ایک حکیم و کارساز اور مافوق الادراک ہستی کی تخلیقی و مدبرانہ قوت کی کار فرمائی سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس نمود اور نشوونما میں انسان کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ کسی اور ایسی ہستی کو جس کا وہ اپنی عقل و خرد اور حواس کے ذریعے ادراک کر سکے۔

اس حیات ارضی کے دوران اپنے علم و دانش اور کشور کشائیوں کے اظہار کے بعد انسان کو بلا ارادہ و اختیار طبعی طور پر موت کی آغوش میں چلے جانا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَیِّتُوْنَ (۲۳:۱۵)

ترجمہ : پھر تم ان سب کے بعد لازماً مرنے والے ہو۔

قرآن متعدد پیرایوں میں انسان کی اس داستان حیات کو اللہ تعالیٰ کی توحید کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے، تاکہ اصحاب عقل و دانش اس پر غورو تدبر کریں اور سوچیں کہ انسانی زندگی کے تمام مراحل کا سلسلہ اور اس کا انجام ایک ایسی ہستی ہی کے اختیار و ارادے کے تحت وقوع پذیر ہو سکتا ہے جس کی صفات کا تصور قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ سمجھنا عقلی دیوالیہ پن کے مترادف ہے کہ بشری زندگی کا یہ نشود ارتقاء از خود ہی ظہور میں آتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان کا باطن بھی ایک کائنات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی تمام تر ذہنی کاوشوں کے باوجود انسان آج تک اس کی حقیقت کا سراغ نہیں لگا سکا، اور اس میں جو مختلف

لطائف پائے جاتے ہیں اپنے طور پر ان پر باہمی تعلق، کردار اور افراد کے طرز عمل پر ان کے اثرات کا تعین نہیں کر سکا۔ یوں تو علم الفضیات کے نام سے اس شعبہ علم پر فکری کاوش کے آثار یونانی دور عروج میں بھی ملتے ہیں، لیکن مغرب میں انیسویں صدی سے اس کو موضوع تحقیق و مطالعہ بنا کر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ مغرب میں اس پر زیادہ تر کام تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کی مد میں ہوا ہے۔ اس طرح اس کا تعلق انسان کی فطری نفسیات سے نہیں بلکہ طب سے قائم ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر تحقیق کی تحریک، ان اعصابی و نفسیاتی امراض نے فراہم کی جو مادہ پرستانہ نظام فکر و عمل کے نفاذ کے نتیجے میں وہاں کے شہریوں میں بڑے پیمانے پر رونما ہوئیں۔ ان حالات میں اس شعبہ علم کے سلسلے میں جو تحقیق کی گئی ہے، معاشرتی زندگی سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا ہم ''مغربی تمدن'' کے زیر عنوان باب میں اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔ البتہ ہم اشارتہً عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اس علمی شعبے سے متعلق حلقے انتہائی الجھاؤ (Confusion)کا شکار ہیں۔ گزشتہ ایک صدی سے مغرب کے علمی دائروں میں اس کا بہت چرچا ہے اور بقیہ دنیا مقلدانہ طور پر اس کے علم کے سلسلے میں استعمال ہونے والی اصطلاحات اور ان سے منسوب معانی و مطالب کو مسلمات کی حیثیت دے رہی ہے، حالانکہ مغرب ہی میں اس علم کے پیش کردہ مختلف قسم کے اور متضاد نظریات کو ہدف تنقید بنایا جارہا ہے۔ علم تحلیل نفسی کے ماہرین میں سرفہرست سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) (۱۸۵۶تا۱۹۳۹) کا نام آتا ہے۔ وہ انسان کی باطنی اور نفسیاتی کیفیات کا منبع اس کے اندر پائے جانے والے جنسی رجحانات کو قرار دیتا ہے۔ اس کی اس فکری اساس کو جسے وہ ان گنت مریضوں کے نفسیاتی تجزیئے سے اخذ کردہ قرار دیتا ہے، اس کے اپنے ساتھیوں نے مسترد کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں میں الفرڈ ایڈلر (Alfred Adler) (۱۸۷۵ءتا۱۹۶۱ء) نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے فرائڈ سے علیحدگی اختیار کرکے نفسیات انسانی کے متعلق اپنے اپنے الگ نظریات پیش کئے۔ اس علم کے متعلق ایک ناقد رابرٹ ڈاؤنز (Robert Downs) لکھتا ہے:

"Of all branches of learning, it is generally conceded that psychology is most mystical and obscure, the least susceptible of scientific proof of any of the sciences. In the

nature of things, the elusiveness and unpredictability are inescapable, because the psychologist is dealing with the most mysterious of natural phenomenon: the mind of man ..... thus the storm of controversy that has raged around Sigmund Freud and psychoanalysis for over sixty years". (Books that Changed the World: Page 174).

ترجمہ: یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ تمام علمی شعبوں میں علم النفسیات سب سے زیادہ پراسرار، غیر واضح اور سائنسی علوم میں سب سے کم درجے میں (اپنے نظریات کے) ثبوت کی گنجائش رکھنے والا ہے۔ معاملے کی نوعیت کے پیش نظر اس کے گرفت اور پیشین گوئی کے دائرے میں نہ آنے کی حیثیت ناگزیر ہے، اس وجہ سے کہ ماہر نفسیات انتہائی پر اسرار مظہر فطرت سے معاملہ کرتا ہے یعنی انسانی باطن سے— (اسی نے) گزشتہ ساٹھ سالوں سے سگمنڈ فرائڈ اور علم تحلیل نفسی اختلاف کے طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔

ہم مغرب میں کی جانے والی تحقیقی و علمی کاوشوں کی تحقیر نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ انسانی باطن اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایک اتھاہ سمندر کی حیثیت رکھتا ہے جس کا استقصاء امر محال کے زمرے میں آتا ہے۔ اس طرح یہ صورتحال بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ خود انسان جو ہماری آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا ہے اور خود ہی اپنے متعلق تحقیق و مطالعہ کر رہا ہے، اگرچہ اپنی ہی ظاہری و باطنی حقیقت سے بے خبر ہے، کسی اندھے اور اتفاقاً رونما ہونے والے محض مادی سطح پر، عمل ارتقا کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی مخلوق کا وجود چشم بینا اور عقل سلیم رکھنے والوں کے لئے کھلی شہادت پیش کرتا ہے کہ اس کی خالق اختیار مطلق رکھنے والی وہ ہستی ہی ہو سکتی ہے جسے ہم اللہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس نے عمداً ایک متعین مقصد اور اسلوب کے تحت اس کی اور دوسری انواع مخلوق کی تخلیق کی ہے اور ان میں سے ہر ایک کی خصوصیات اس کی مشیت کے تابع ہیں۔ آپ ان خصوصیات کا مطالعہ کر سکتے ہیں، لیکن ان میں کوئی ردو بدل نہیں کر سکتے۔ الا آنکہ اپنی مشیت ہی کے تحت اس نے ان کی زندگی کے اختیاری دائرے میں ان کو اپنے طرز عمل میں ردوبدل کا اختیار دے رکھا ہو۔

انسان کی باطنی اور ظاہری زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے مغرب میں کاوشیں ہوئی ہیں۔ ان کے ثمر آور نہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہاں کی برائی کو پنپنے کا موقع دیا جاتا ہے اس کے بعد جب اس کے نتائج بد سامنے آتے ہیں تو اصل برائی کی طرف توجہ دیئے بغیر اس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ علم نفسیات کے نام سے تحلیل نفسی کے سلسلے میں جو کام وہاں ہو رہا ہے اس کے ذریعے انسان کی طبعی حالت کو پیش نظر رکھ کر اس کے باطن کا مطالعہ نہیں ہو رہا، بلکہ وہاں کی معاشرتی زندگی میں جو کجیاں پیدا ہو چکی ہیں ان کے نتیجے میں جو اثرات بد افراد کی نفسیات پر مرتب ہوئے ہیں ان پر غورو تفکر کیا جا رہا ہے، لیکن اصل محرکات کی طرف چونکہ مناسب توجہ نہیں دی جارہی، اور ان کا قلع قمع کرنا اب کسی کے بس میں نہیں رہا، اس لئے یہ علم الجھاؤ کی نذر ہو گیا ہے۔ نیز مغربی ماہرین علم نفسیات نے انسان کے مرتبے کو گرا دیا ہے۔ جو برائیاں ان کے نظریات اور معاشرے کی پیدا کردہ ہیں انہیں انہوں نے انسانی فطرت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ ہر شعبہ علم و عمل میں مغرب کا طرز عمل ہے، جس نے زندگی کے کسی ایک جزو یا پہلو کے متعلق جو بات زور شور اور تجربات واستدلال کے ساتھ پیش کردی ہے۔ اسے ہی وقتی طور پر خراج تحسین و آفرین سے نواز دیا گیا۔ یہی حال انسانی باطن سے متعلق علم نفسیات کا ہے۔ کسی نے کہہ دیا انسانی نفسیات کا محور اس کے صنفی میلانات ہیں، کسی نے یہ تھیوری پیش کردی کہ یہ محور انسان کے اندر پائے جانے والے احساسات کمتری و برتری نے فراہم کیا ہے۔ کسی نے انسان کی داخلی کائنات کا مرکزی نکتہ اس کے اس رجحان کو قرار دے دیا کہ وہ یا تو اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتا ہے یعنی Introvert ہوتا ہے اور یا اس کی جملہ توجیہات اپنے سے باہر کی دنیا میں جذب ہو جاتی ہیں اور وہ (Extrovet)ہو جاتا ہے۔ محدود اور یک رخے نظریات مغربی تمدن کے پیدا کردہ انسانی نمونوں کے کسی ایک پہلو کو زیر غور لانے کا نتیجہ ہیں۔ اور انسانی فطرت کی اصل سے صرف نظر کرنے کے ہم معنی ہیں۔

اس طرز عمل کے بر عکس اسلام قرآن و سنت کے ذریعے فطری حالت کو ملحوظ رکھ کر انسانی باطن کے متعلق اس کی قوت و استعداد ادراک کے مطابق اپنی معلومات فراہم کرتا ہے جن کی بنا پر وہ اپنے فکر و عمل کی سمت متعین کر سکے۔ اس کے بعد علمی سطح پر تحقیق و مطالعہ کے لئے ہر کوئی آزاد ہے۔ اس تحقیق و مطالعہ کا مظاہرہ ہر صنف علم میں مسلمانوں نے اپنے دور عروج کے دوران بھر پور طریقے سے کیا۔ اسلام انسانی باطن کے علو مرتبہ کے بہت سے مظاہر بیان کر کے انہیں توحید کی ایک علامت قرار دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ ہی یہ قدرت رکھتا ہے کہ ان اعلیٰ خصوصیات کی حامل مخلوق کو تخلیق کرے۔ پیغمبر اسلام پر جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی اس میں قلم اور علم دانوں کا تذکرہ ہے۔ (دیکھئے باب بعنوان ''وحی'') انسانوں کی قلم کے ذریعے ایک دوسرے کے خیالات سے مطلع ہونے کی صلاحیت اور حصول علم و استعداد پر غورو تدبر کیا جائے تو یہ ان کی نوعی درجے کی بلندی کی ایک واضح علامت نظر آئے گی۔ اس معاملے میں تمام دوسری انواع میں انسان منفرد ہے۔ انسان جہالت کو فطرتاً پسند نہیں کرتا۔ وہ ہمہ وقت اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا خواہش‌مند رہتا ہے۔ وہ اگر وحی کی روشنی سے محروم بھی ہو تب بھی اپنی زندگی کو بہتر طریق پر گزارنے کے ڈھب کا علم حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ یہ بات اس کے لئے حصول علم کے لئے قوت محرکہ کا کام دیتی ہے۔ علم کا نافع و ضار ہونے کا انحصار اس کے مقاصد پر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں۔ ہم یہاں یہ بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حصول علم کی استعداد بذات خود اس کی نوعی فضیلت کا باعث ہے۔

انسان کی قوت بیانیہ یعنی اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی واضح الفاظ میں استطاعت بھی اس کی ایک قابل توجہ خصوصیت ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵:۱ – ۴)

ترجمہ :خدائے رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو گویائی سکھائی۔

گویائی کی انسانی استعداد کو دنیا میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ دوسرے جانداروں سے انسان کو ممیّز کرنے کے لئے اسے حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ گویا قوت نطق سے نوازا جانا

ایک بہت بڑا اعزاز ہے اور آیات اللہ میں سے ایک آیت ہے کہ بظاہر مادی اعضاء کے ذریعے سے انسان ایسی قوت بیانیہ رکھتا ہے جو اس کی بے شمار صلاحیتوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ جوہر اس کی معاشرتی زندگی گزارنے کے سلسلے میں ایک نہایت اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی زندگی وقوع میں آنی ممکن ہی نہیں جب تک افہام و تفہیم کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور یہ بات اسی خصوصیت گویائی ہی سے ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اس کے استعمال کے لئے انسان کے اندر غورو تفکر اور عقل و خرد جیسے اثاثوں کا ہونا بھی ضروری ٹھہرا جو بیان کے لئے مواد فراہم کریں۔

چنانچہ عقل و خرد سے نوازا جانا بھی بلا شرکت غیرے تمام مخلوق میں انسان ہی کا حصہ ہے۔ عقل و خرد کے تمام تعلقات اور وہ سارے کام جو اس کی روشنی میں کئے جائیں گے ''حکمت'' کے دائرے میں شامل ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ(۲:۲۶۹)

ترجمہ اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔ مگر یاد دہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

اس سے قبل ہم ''منصب رسالت'' کے باب میں آیت قرآنی (۳ :۱۶۴) نقل کرکے یہ واضح کرچکے ہیں کہ پیغمبر کا کام دین سکھانے کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم دینا بھی ہے۔ حکمت کا مفہوم عقل و خرد اور دانائی کے معانی سے وسیع تر ہے۔ اس سے مراد یہ لی جاسکتی ہے کہ تفکر و تعقل کی بلند ترین توانائیوں کو امور کلی کو سرانجام دینے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس سے اس دعوے کے حق بجانب ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ اگر مناسب انتظام کیا جائے تو انسان کے اندر خصوصیات حکمت اخذ کرنے کی استعداد بھی پائی جاتی ہے اور اس کے باطن میں اسے حاصل کرنے کا داعیہ بھی موجود ہے۔ انسانی شرف کی یہ بھی ایک علامت ہے کہ اس میں فطرتاً حصول علم کی استطاعت پائی جاتی ہے۔ قرآن کا کہنا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۶ : ۷۸)

ترجمہ :اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لئے سمع و بصر اور دل بنائے تاکہ تم شکر گزار بنو۔

اس آیت میں سمع، بصر اور دل جسمانی اعضا کی حیثیت سے بیان نہیں ہوئے، کیونکہ شکم مادر سے نکلنے کے وقت تو یہ موجود ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق بیان علم سے جوڑا گیا ہے، اور ان کا تذکرہ ذرائع حصول علم کے طور پر کیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی پیدائش کے وقت تم کچھ جانتے اور سمجھتے نہ تھے۔ خدا تعالیٰ نے علم کے ذرائع اور سمجھنے والے دل تم کو دیئے جو بذات خود بھی بڑی نعمتیں ہیں اور لاکھوں نعمتوں سے متمتع ہونے کے وسائل ہیں۔ اگر آنکھ، کان، عقل وغیرہ نہ ہو تو ساری ترقیات کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ جوں جوں آدمی کا بچہ بڑا ہوتا ہے اس کی علمی اور عملی قوتیں بتدریج بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کی شکر گزاری یہ تھی کہ ان قوتوں کو مولیٰ کی اطاعت میں خرچ کرتے، اور حق شناسی میں سمجھ بوجھ سے کام لیتے۔ نہ یہ کہ بجائے احسان ماننے کے الٹے بغاوت پر کمر بستہ ہو جائیں۔ اور منعم حقیقی کو چھوڑ کر اینٹ پتھروں کی پرستش کرنے لگیں۔" (صفحہ ۳۵۷)

ایک اور جگہ قرآن نہایت خوبصورت انداز میں انسانی فطرت میں خیروشر کے پائے جانے کے انتہائی وسیع امکانات کا تذکرہ کرتا ہے۔ قدرت الٰہی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَۃَ ؕ (۳۲:۷ – ۹)

ترجمہ :جس نے جو چیز بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے۔ اس نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔

اس آیت میں ساری کائنات کی حسن و خوبی کے علاوہ خاص طور پر انسان کی تخلیق اور اس کی نوع کے تسلسل حیات کے انتظام اور اس کو سنوارنے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا پر تو ڈالا۔ یعنی اس کے اندر ایسی خوبیاں اخذ

کرنے کی صلاحیت پیدا کردی جو اسے ہمہ جہتی طور پر حسن اخلاق سے مزین کر سکیں۔ اسلام میں خلق تمام انفرادی اور اجتماعی سطح کی خوبیوں کو محیط ہے۔ جن کی تفصیل قرآن و سنت میں ملتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان باطنی پاکیزگی حاصل کرنے کا بھی اختیار رکھتا ہے۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا کہ اعمال کے مبنی بر اصلاح ہونے کا انحصار نیت پر ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے:

حدثنا الحميدى قال حدثنا سفيان قال حدثنا يحي بن سعيد الانصاري قال اخبرنى محمد بن ابراهيم التيمي أنه سمع علقمه بن وقاص بن الليثى يقول سمعت عمر من الخطاب رضى الله عنه على المنبر يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول انما الاعمال بالنيات و انما لامرى ما نوى فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها او إلى امرأة ينكحها فهجرته إلى ما هاجر اليه

ترجمہ: حمیدی نے ہم سے بیان کیا، کہا، ہم سے سفیان نے بیان کیا، کہا، ہم سے یحیٰی بن سعید انصاری نے بیان کیا، محمد بن ابراہیم تیمی نے ہمیں خبر دی، انہوں نے علقمہ بن وقاص یلثی سے سنا، وہ کہتے تھے میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ممبر پر (خطبہ کے دوران) فرماتے سنا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اعمال (کی جزا) کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جو وہ نیت کرے۔ اگر کسی نے دنیا چاہنے کی نیت سے ہجرت کی یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اس کی طرف ہے جسے حاصل کرنے کیلئے اس نے ہجرت کی۔

اسلام کی رو سے کوئی متنفس گناہ کا بوجھ لے کر شکم مادر سے بر آمد ہوتا ہے نہ اس کے باطن میں فاسد رجحانات پیدائش سے قبل ہی جاگزیں ہو چکے ہوتے ہیں، جیسا کہ علی الترتیب عیسائیت اور مغربی علم نفسیات کے ماہرین کے حلقوں کا خیال ہے۔ انسان کے اندر برائی اور اچھائی کا ظہور اس کارگاہ حیات میں اس کے فکر اور اعمال کی نوعیت کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۫ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۹۵:۴-۶)

ترجمہ: کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا، پھر ہم نے اس کو ادنی درجے میں ڈال دیا جب کہ وہ خود گرنے والا بنا بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے۔

ان آیات قرآنی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو بے داغ فطرت حسنہ لیکر آتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ ایمان لے آئے یعنی فکر صحیحہ کو اپنا لے اور عمل صالحہ کرے، یعنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس ضابطے کے تحت گزارے جو خالق کائنات نے پیغمبرؐ کے ذریعے نازل کیا ہے تو کامران ہو گا اور اگر ان سے انحراف کرے گا اور کج روی اختیار کرے گا تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق گمراہی کی پستیوں میں گر جائے گا۔ سیرت و کردار کی بلندی و پستی کی یہ صورتیں، جو انسان کے باطن و ظاہر میں پیدا کر دی گئی ہیں کسی بالاتر اور صاحب قدرت ہستی کے وجود کی نشاندہی کرتی ہیں، زندگی کے میکا نکی تصویر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اس کامرانی اور نامرادی کے دائرے میں انسان کی باطنی کیفیات کے توازن اور عدم توازن کی تمام صورتیں بھی شامل ہیں۔ اس وقت صفحہ ارض پر مادہ پرستی کی جو رو چلی ہوئی ہے اس سے جو خطہ زمین جس قدر متاثر ہے اسی نسبت سے اس کے افراد کی شخصیتوں اور نفسیات میں عدم توازن کی کیفیات پیدا ہو رہی ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کیلئے اس وقت جڑوں اور تنے کی طرف توجہ دینے کے بجائے شاخوں اور پتوں کی تراش خراش کی جارہی ہے۔ جو بالکل بے سود اور غیر نتیجہ ثابت ہورہی ہے۔

انسان کی باطنی کیفیات، یا دور حاضر کی زیادہ مقبول اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفسیاتی ساخت (Psychological Set up) کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجتہ اللہ البالغہ جلد دوئم میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ''المقامات والاحوال'' کے زیر عنوان بحث کی ہے۔ یہ بحث طویل ہے اور اسے یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں۔ ہم اس کا ملخص پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

اعلم ان في الانسان ثلاث لطائف تسمى بالعقل والقلب ، والنفس ، دل على ذلك النقل والعقل ، والتجربه واتفاق العقلاء - اما النقل فقدورو في القرآن العظيم ان في ذلك لايات لقوم يعقلون

ترجمہ: جان لو کہ انسان میں تین لطائف (یعنی غیر مادی باطنی استعدادیں) ہیں جنہیں عقل، قلب اور نفس سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پر نقل ، عقل ، تجربہ اور عقلاء کا اتفاق دلالت کرتے ہیں۔ جہاں تک نقل کا تعلق ہے۔ قرآن عظیم میں ہے :بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں۔''

ورد حكايته عن اہل النار:

اور اہل نار کا یہ اعتراف بیان ہوا:

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (سورۃ الملک : ۱۰)

''اگر ہم سننے والے یا سمجھنے والے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں سے نہ بنتے۔''

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم دين المرء عقله ومن لا عقل لا دين له وقل افلح من رزق لبا''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان کا دین اس کی عقل (کے مطابق) ہے۔ جو عقل استعمال نہیں کرے گا۔ دین (کے فہم) سے محروم رہے گا۔ '' اور حضورؐ نے فرمایا : وہ فلاح پا گیا جس کو عقل عطا ہوئی۔

ورد في القرآن العظيم: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (سورۃ الانفال: ۲۴)

قرآن عظیم میں ہے:

''اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے۔''

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (۳۷:۵۰)

بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی یاد دہانی ہے جن کے پاس دل ہو یا وہ بات سننے کے لئے کان لگائیں، متوجہ ہو کر۔

وفي الحديث "الا ان فی الجسد مضغته اذا صلحت صلح الجسد و اذا فسد فسد الجسد الأوهی القلب"

اور حدیث میں آیا ہے "خبردار ! جسم (انسانی) میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب اس کی اصلاح ہو جاتی ہے تو جسم (یہاں مراد حیات انسانی) کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور جب اس میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو جسم میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ خبردار ! یہ قلب ہے۔"

"و ورد في الحديث "النفس قتمنی و تشتهي الفرج يصدق ذلک و يكذبه'

"ويعلم من تتبع مواضع الاستعمال ان العقل هو نشيء الذي يدرك به الانسان ملا يدرك بالحواس ، ولن القلب هو الشيء الذی به يجب الانسان، ويبغض، ويختار و يعزم وان النفس هو الشي الذي به يشمی الانسان ما يستلذه من المطاعم والمشارب والمناكح"

"اور حدیث میں وارد ہوا ہے" نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے۔ اور (انسان کے) قوائے شہوانی اس کی موافقت کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ جو کوئی (ان تینوں یعنی عقل، قلب اور نفس) کے مواقع استعمال کی چھان بین کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ عقل ہی انسان کو ان باتوں کے ادراک کی طرف رہنمائی کرتی ہے جنہیں حواس معلوم نہیں کرسکتے۔ اور قلب ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان محبت، بغض، پسند اور عزم کا اظہار کرتا ہے۔ نفس وہ ہے جو طلب لذائذ، جیسے کھانا پینا اور بیویوں کی خواہش پیدا کرتا ہے

قرآن و حدیث سے عقل ، قلب اور نفس کے تین لطائف کے وجود کے متعلق استشہاد کرنے اور ان کے کردار کا تذکرہ کرنے کے بعد انسان کے باطن میں ان تینوں لطائف کے باہمی تعلق کی مختلف صورتوں اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے انسانی رویے اور کردار پر مفصل بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں یہ تینوں جن کا اوپر تذکرہ ہوا انسان کے اندر اعضائے رئیسہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کے افعال کا منبع ہیں۔ ان کے درمیان آپس میں معاونت کا تعلق ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان کے معاونین بھی ہوتے ہیں، جنہیں یہ بوقت ضرورت طلب کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کی باہمی معاونت کا تعلق ہے وہ

وضاحت کرتے ہیں کہ دماغ کا کام موافق و ناموافق واقعات و حالات کا اور مجردات کا ادراک ہے اور قلب میں اس کے رد عمل کے طور پر غصے، غضب اور حب قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اول الذکر اپنا کام نہ کرے تو موخر الذکر بھی اپنا کام نہ کر سکے گا۔ اسی طرح قلب، جسے اعضاء انسانی میں تصرف کا اختیار ہے، اگر اپنا فرض ادا کرنے کے ناقابل ہو تو کھانے پینے اور منا کح کے معاملات کی طرف انسان کا مزاج مائل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی حال عقل و نفس کے تعلق کا ہے۔ اگر نفس پر عقل کی گرفت نہ ہو تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے اور انسان کو ایسی وادیوں میں لئے پھرتا ہے جن میں تباہی اور ٹوٹے کے سوا اور کچھ دستیاب نہیں ہوتا۔

اس بحث کے مرکزی الفاظ یہ ہیں:

ان فعل کل واحد من هذه الثلاثته لا یتم الا بعونته من الآخرین

ان تینوں (لطائف) میں سے کوئی بھی دوسروں کی اعانت کے بغیر اپنا کام نہیں کر سکتا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ان لطائف میں سے کسی ایک میں بھی خلل واقع ہو جائے تو وہ تمام قویٰ اور صفات جن کا اسے منبع قرار دیا گیا ہے، اختلال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا اثر دوسرے لطائف بھی قبول کرتے ہیں۔

اوپر ان لطائف کے معاونین کا جو تذکرہ ہوا ہے اس کے متعلق شاہ ولی اللہؒ فرماتے:

اگر حواس فراہمی مواد کا کام نہ کریں تو عقل ادراک سے عاجز آجاتی ہے۔ کیونکہ تمام اکتسابات (عقلی) بدیہات سے اخذ ہوتے ہیں اور بدیہات محسوسات کی فرع ہیں۔ اگر ان تمام اعضا کی صحت بحال نہ ہو جن پر قلب و دماغ کی صحت موقوف ہے تو ان کی صحت برقرار نہیں رہ سکتی اور نہ وہ اپنے افعال کو سرانجام دے سکتے ہیں۔

ان اعضائے رئیسہ اور ان کے معاونین کی صحت، عدم صحت اور ان کے باہمی تعلق اور تعامل سے انسان کی مختلف باطنی کیفیات اور سیرت و کردار کے نمونے ظہور میں آتے ہیں۔ ان میں جب افراط و تفریط کی صورت پیدا ہوتی ہے تو مزاج انسانی میں اختلال کی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی مختلف شکلوں پر شاہ صاحب نے بحث کی ہے۔ ان کو اعتدال پر قائم رکھنے اور انسان کے اندر باطنی توازن پیدا کرنے کے لئے وہ لکھتے ہیں:

جب انسان کتاب اللہ اور جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبیین قرآن کے سلسلے میں فرمایا اس پر اپنی تمام قلبی اور نفسی قواء کے اتباع کے ساتھ اس پر ایمان لاتا ہے، پھر جس طرح حق عبودیت ادا کرنے کا حق ہے اس میں مصروف ہو جاتا ہے، ذکر بالسان اور تفکر بالقلب کرتا ہے اور اس کے اعضا (شرعی اصولوں کے مطابق) متادب ہو جاتے ہیں اور مدت مدید تک اس پر جم جاتے ہیں تو ان لطائف ثلاثہ میں سے ہر ایک (اللہ کی) فرمانبرداری میں سے حصہ پاتا ہے۔ اور یہ بات اس خشک درخت کے مشابہ ہے جسے بہت سے پانی سے سینچا جائے اور یہ پانی اس کی تمام شاخوں اور پتوں میں داخل ہو جائے اور اس (درخت)میں سے پھول اور پھل نمودار ہو جائیں۔ پس اسی طرح خصوصیت عبودیت ان تینوں لطائف میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کی گھٹیا صفات طبعیہ کو اعلیٰ درجے کی صفات ملکیہ میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے ان لطائف ثلاثہ کو اعتدال پر قائم اور فساد سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں وہ خصوصیات و مقامات گنوائے ہیں جن کا اختیار کرنا ضروری ہے لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ صراحت کردی ہے کہ انکا شمار مشکل ہے۔ اس موقع پر مزید تفصیلات میں جانا طوالت کا باعث ہوگا۔ یہاں ہم ان حقائق کی روشنی میں جو انسان کی باطنی دنیا کے متعلق بیان کئے گئے صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دنیا بھی اپنے رنگ میں ایک کائنات کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن اس انفسی دنیا سے بھی توحید کے حق میں استشہاد کرتا ہے۔ اس کی وسعت اور گہرائی کی حقیقت سے آج تک کوئی آشنا نہ ہو سکا، اور یہ اسی خالق و مدبر کائنات کی خلاقی کا مظہر ہو سکتی ہے جسے ہم اللہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

۲ -آفاقی استدلال

انفسی نشانیوں کے علاوہ قرآن توحید کے عقیدے کے حق میں آفاقی مظاہرات سے بھی استشہاد کرتا ہے۔ انسان کے سامنے اپنی بو قلمونیوں کے ساتھ ایسی کائنات موجود ہے جس کی وسعت اور اس میں جاری و ساری حکمتوں کے مشاہدے اور احساس کی وجہ سے وہ ہمیشہ مرعوب رہا ہے اور آج بھی مرعوب ہے۔ اس کائنات کے مختلف گوشوں کے درمیان ایک ربط کا پایا جانا کسی ذی فہم اور چشم بینا رکھنے والے انسان سے اوجھل نہیں، اور اس بات سے

بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن قوانین و قواعد کی بنیاد پر یہ نظم کائنات چل رہا ہے انسان کا ان کے بنانے اور مرتب کرنے میں کوئی دخل نہیں اور نہ وہ ان کا کلی اوراک رکھتا ہے۔ نہ ہی وہ اپنے ذاتی علم و کاوش کے ذریعے اس کائنات کی حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔ وہ صرف محدود پیمانے پر اس کے بعض مظاہرات کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اسے عقل و خرد اور تجربے کی جو قوتیں عطا ہوئی ہیں انہیں استعمال میں لاکر وہ ان سے متعلقہ قوانین کا جن کا وہ خود خالق نہیں ہے، کھوج لگانے کی سعی و جہد کرتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر شدت سے یہ خواہش بھی موجود رہتی ہے کہ وہ ان تمام مظاہرات کے خالق اور محرک اول کا پتہ چلا سکے۔

اس بات پر عمومی اتفاق پایا جاتا ہے کہ اس دنیا میں اسباب و مسببات کا قانون نافذ ہے۔ اس سے کوئی حالت اور کوئی واقعہ مستثنیٰ نہیں۔ لیکن اس کے متوازی حالات و واقعات کی ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے موجود ہیں جن میں اسباب و علل کے سلسلے میں کوئی مخفی ہاتھ کام کر رہا ہوتا ہے۔ عالم نباتات کو لیجئے، ایک چھوٹی سی چیز بیج کی شکل میں ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ اس کو زمین میں دبا دیتے ہیں تو وہ پھٹتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ (۹۵:۶)

ترجمہ: بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔

ایک کونپل کو زمین کے اوپر کی طرف سطح زمین کو پھاڑ کر نکالتا ہے اور دوسری شاخ کو زمین کے اندر نچلی جانب جنم دیتا ہے۔ اگرچہ بیج کا دانہ ایک چھوٹی سی چیز ہوتا ہے، لیکن اس سے اگنے والی نباتاتی پیداوار کبھی تو ایک پودے کی حد تک ترقی کرتی ہے اور کبھی ایک تناور درخت بن جاتی ہے۔ اس بات کا انحصار اس نباتی نوع پر ہے جس سے وہ بیج تعلق رکھتا ہے۔ لیکن صفحہ ارض پر لاکھوں قسم کی نباتی انواع میں سے ہر ایک اپنی اپنی شکل و صورت اور خواص الگ رکھتی ہے اور دوسرے اگرچہ ہر ایک میں نشوونما اور نمود و ترقی کا عمل پایا جاتا ہے، لیکن ان میں سے کسی میں بھی حیوانی حسیات میں سے ایک حس بھی نہیں پائی جاتی۔ ترقی کا عمل ہر ایک نوع (Species) میں اوسطاً ایک معلوم مدت تک جاری رہتا ہے، اور پھر انحطاط کے دور میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو کسی استعمال میں نہ لایا جائے تو اسی

زمین سے جس سے اگا تھا، تعلق رکھنے کے باوجود گل سڑ جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون ہے جو اس چھوٹے سے بیج کے دانے کو پھاڑتا ہے، پھر اس میں سے از خود فضا میں پورا پودا یا درخت نمودار ہو جاتا ہے اور زمین کے اندر جڑوں کا جال بچھا دیتا ہے۔ اگر کوئی ایسی مخفی ہستی نہیں جو اس سارے عمل کے لیے قوت محرکہ فراہم کرتی ہے تو اسباب و مسببیات کا قانون تو غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ابلہ صفت یہ کہہ دے سبب اور علت کی ضرورت ہی نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ چھوٹا سا بیج درخت اگا کر لکڑی فراہم کرنے تک کے عمل تک کسی قوت محرکہ کا محتاج نہیں تو اس لکڑی کو استعمال میں لاکر کرسی میز قسم کی اشیا کیوں از خود وجود میں نہیں آجاتیں؟ اس مرحلے پر انسان کو خود ایک تخلیقی عمل کیوں کرنا پڑتا ہے؟ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ موخر الذکر عمل سیدھا سادھا اور بیج سے درخت بننے تک کا عمل نہایت پیچیدہ اور نازک قسم کی کاری گری کا متقاضی ہے جس پر قادر ہونے کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ہم مختصراً بیان کردیں کہ دنیائے نباتات میں بیج کے کونپل اور جڑ کی شکل اختیار کرنے کے ساتھ ہی یہ دونوں حصے اپنا اپنا عمل شروع کر دیتے ہیں جو پودے اور درخت ـــــ جو بھی صورت ہو ـــــ کی نشوونما کا باعث بنتا ہے۔ جڑیں نوع نبات کی ضرورت کے مطابق زمین سے پانی اور نمکیات کی شکل میں غذا جذب کریں گی اور ایک غذائی مرکب (Solution)بنا کر فضا میں لہراتے ہوئے پودے کی طرف منتقل کریں گی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگرچہ ایک ہی زمین پر کئی قسم کے پودے، درخت اگے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کی جڑیں وہی نمکیات جذب کریں گی جن کی اس کو ضرورت ہوگی۔ غیر ضروری نمکیات کو، اگرچہ وہ موجود ہوں، رد کر دیں گی۔ اسی اثنا میں پورے درخت کے فضائی حصے کے پتوں پر سورج کی روشنی اور حرارت پڑتی ہے تو وہ دو کام کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان پتوں میں سے جب نمی بخارات کی شکل میں خارج ہوتی ہے تو ان میں خلا پیدا ہو جاتا ہے جو جڑوں کے جذب کئے ہوئے مذکورہ غذائی مرکب کو اپنی طرف کھینچنے کا باعث بنتا ہے۔ اس سے یہ مرکب تنے اور شاخوں پر قدرتی طور پر بنی ہوئی نالیوں کے ذریعے پتوں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سورج کی حرارت اور روشنی جس نے پتوں میں موجود پانی کے ایک حصے کو

بخارات بنا کر اڑانے کے بعد خلا پیدا کیا تھا اس مرکب میں کیمیائی تغیرات کر کے اسے متعلقہ پودے یا درخت کی نشوو نما کے لئے موزوں غذا کی شکل دے دیتی ہے۔ وہ غذا سارے پودے یا درخت کے حصے میں پھیل کر اس کو ترقی دیتی اور اس کی انتہائی جسامت تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ پھر انہی پودوں اور درختوں پر ایسے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ بعض انواع پر ایسے پھول اگتے ہیں جن کے اندر نر (Stamens) اور مادہ (Pistils) کے حصے شامل ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے تعامل سے پھل پیدا ہوتے ہیں اور وہی بیج فراہم کرتے ہیں۔ بعض دوسری انواع ایسی ہیں کہ نر اور مادہ پھول الگ الگ درختوں پر نمودار ہوتے ہیں اور نر پھولوں کا سفوف مختلف مکھیوں اور ہوا کے ذریعے مادہ پھولوں تک پہنچ جاتا ہے اور موخر الذکر پر پھل لگتا ہے۔ علم النباتات (Botany) کی یہ تحقیقات اپنی تفصیلات کے ساتھ دور حاضر میں ہوئی ہیں، لیکن قرآن نے آج سے چودہ سو برس پہلے توحید کی علامات کے طور پر جو باتیں کیں، اور جو اس دور میں کسی کو معلوم نہ تھیں، ان میں یہ بھی ہے کہ:

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (۱۳:۳)

ترجمہ: اور ہر قسم کے پھلوں میں دو دو زوج (نر اور مادہ) پیدا کئے۔

نباتاتی پیداوار کے لئے پانی اسی طرح ضروری ہے جیسے ذی حیات انواع کے لئے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا جس طرح انتظام کیا اور انسانوں کے لئے خوراک پیدا کرنے کے سلسلے میں اس کی جو اہمیت ہے اسے قرآن نے چند لفظوں میں بیان کر دیا۔ یہ انتظام بھی سوچنے والوں کیلئے اللہ کے مدبر کائنات ہونے کی ایک بڑی نمایاں علامت ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۴۸ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۴۹ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ (۳۰:۴۸ – ۵۰)

ترجمہ: اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو، پس وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر اللہ ان کو پھیلا دیتا ہے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے، اور ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو

مینہ کو ان کے بیچ سے نکلتے ہوئے۔ پس جب وہ اس کو نازل کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے تو وہ یکایک خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ اس کے نازل کئے جانے سے قبل، اس خوشی سے پہلے، بالکل مایوس تھے۔ پس رحمت الٰہی کے آثار کو دیکھو، وہ کس طرح زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مردہ ہو جانے کے بعد!

اپنی شان ربوبیت کی مزید وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پیداوار کے اگانے کیلئے جہاں بارش براہ راست پودوں کو سینچتی ہے وہیں یہ زمین کے پیٹ میں پانی کے خزانے جمع کرنے کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ پانی کے ان خزانوں سے جہاں انسان کنوؤں اور چشموں کی شکل میں اپنی ذات کے لئے استفادہ کرتا ہے وہیں اسے فصلوں کی آبپاشی کے لئے بھی استعمال کرتا ہے اور باغات اگاتا ہے۔ یہ زمینی پیداوار انسان کی خوراک مہیا کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۙ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۳:۱۸۔۲۰)

ترجمہ: اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازے کے ساتھ۔ پس اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، اور ہم اس کو واپس لینے پر قادر ہیں۔ پس ہم نے اس سے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے۔ تمہارے لئے ان میں بہت سے میوے ہیں جن سے لذت اندوز بھی ہوتے ہو اور اپنی غذا کا سامان بھی کرتے ہو۔ اور وہ درخت بھی اگایا جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ روغن اور سالن کے ساتھ اگتا ہے۔

پھر حیوانات اور چوپائیوں کی دنیا کا جائزہ لیجئے، یہ کس طرح اس زمین پر زندگی کے مجموعی نظام سے مربوط ہیں۔ خالق کائنات کے قائم کردہ ضابطہ ربوبیت میں ان کا جو مقام ہے اسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ(۲۳:۲۱–۲۲)

ترجمہ: اور تمہارے لئے چوپائیوں میں بھی بڑا درس آموزی کا سامان ہے۔ ہم ان چیزوں کے اندر سے، جو ان کے پیٹوں میں ہیں، تمہیں (خوش ذائقہ دودھ) پلاتے ہیں اور تمہارے لئے ان میں دوسرے بھی بہت سے فوائد ہیں اور ان میں سے تم اپنی غذا کا سامان بھی حاصل کرتے ہو۔ اور ان پر سواری بھی کرتے ہو۔

انسانی معاشرتی نظم میں ذرائع نقل و حمل کی بھی ایک خاص اہمیت ہے۔ چنانچہ ان آیات میں جہاں اس سلسلے میں چوپایوں کی افادیت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہیں اجمالاً سمندری سفر کی طرف اشارہ کر کے اصحاب دانش پر واضح کر دیا کہ جہاں بار برداری کے جانور کام نہیں دے سکتے وہاں ہم نے یہ قانون مقرر کر دیا کہ کشتیاں اور جہاز یہ کام کر سکیں کیونکہ کرۂ ارض پر بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے درمیان سمندر حائل ہے۔

اساسات پر مبنی یہ وہ نقشہ انضباط (Scheme) ہے جو ایک مربوط شکل میں صفحہ ارض پر جاری و ساری ہے۔ ہمیں اس بات کا دعویٰ نہیں کہ ہماری طرف سے بیان کردہ یہ خاکہ (Projetion) ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس کے برعکس قرآن و حدیث کی بنیاد پر اور بھی بہت سے پہلوؤں سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اسلام نے علم کے حصول اور اس میں تحقیق و مطالعہ کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ ہم ''اسلام میں علم کے مقام'' اور اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق ابواب میں عرض کریں گے، دنیا کی علمی سربراہی کا مقام ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے پاس رہا۔ مسلمان علماء و محققین نے بے شمار اصناف علم کے سلسلے میں تحقیقی کام کیا۔ اس کے بعد یہ شمع علم و تحقیق مغرب نے سنبھالی اور بے شک گزشتہ چند صدیوں سے وہاں علمی و تحقیقی سرگرمی کا دور دورہ ہے۔ تاریخ عالم بتاتی ہے کہ ہر تمدن کی بناوٹ میں علمی کاوشیں ہی اہم ترین عنصر کا کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس تحقیق و مطالعہ سے جو نتائج فکری سطح پر برآمد کئے جائیں وہ دنیا میں خیر کو پھیلائیں یا فساد برپا کرنے کا موجب ہوں۔ یہ موضوع تو اپنے مقام پر زیر بحث آئے گا، البتہ ہم نے صفحہ ارض پر ایک مربوط نظام کی موجودگی سے متعلق جو گفتگو کی ہے، اس کے حوالے سے اشارتاً یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ دور حاضر کی تحقیق کے مطابق ایسی باتوں کا بھی انکشاف ہوا ہے کہ نمکیات، معدنیات، گیسوں، پانی، نباتات، حیوانات، انسان، سمندر سطح زمین کے اوپر والی فضا اور سورج کی حرارت اور روشنی یہ اور دوسری بہت سی چیزیں مل کر اس کرۂ ارض پر موجودات کے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک خاص توازن ہے۔ مثلاً اگر سورج سے توانائی زمین کو نہ پہنچے یا اس میں کمی بیشی ہو جائے تو زندگی ایک لمحہ کے لئے بھی برقرار نہیں رہ سکتی۔ پودے نمکیات اور پانی زمین کے پیٹ سے حاصل کرتے ہیں اور سورج کی حرارت اور روشنی کے ذریعے سے جو کیمیائی عمل ہوتا ہے اس کی بنا پر وہ آکسیجن فضا میں اگلتے ہیں۔ حیوانی زندگی کی، بشمول انسان، بقا کے لئے آکسیجن

ضروری ہے۔ غذائی نباتات کے ذریعے انسانوں کو حیاتین(Vitamins)اور دوسرے بہت سے نمکیات ملتے ہیں جو ان کی صحت کو بحال رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ زمینی پیداوار کا ایک بہت بڑا حصہ جنگلات اور غیر غذائی فصلوں پر مشتمل ہے۔ ان کے پتے گل سڑ کر کھاد کی شکل اختیار کر کے زمین کو نمکیات وغیرہ واپس کر دیتے ہیں۔ یہاں تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ جدید تحقیقات زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے پانی، نمکیات، گیسوں وغیرہ کی گردش(Cycle) کے متعلق سابقہ معلومات میں اضافہ کر کے بہت کچھ منصہ شہود پر لائی ہے، لیکن مغربی مادہ پرست دانشور اس سارے نظم کو از خود وجود میں آنے اور بغیر کسی محرک کے بتکلف تراشیدہ عمل ارتقاء کا نتیجہ قرار دینے اور خدا تعالیٰ کے انکار یا اس کے وجود کے متعلق شک وشبہ کا اظہار کرنے پر مصر ہیں۔ یہ بات وہ خود بیان کرتے ہیں کہ کائنات کا نظم عام طور پر اور ارضی زندگی کے تمام مظاہر خاص طور پر ایسے عناصر کے مرہون منت ہیں جن کی بقا کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ لیکن وہ یہ بدیہی بات تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر یہ سارا نظم کسی صاحب قدرت مدبر اور حکیم ہستی ہی کے امر سے وجود میں آیا اور قائم رہ سکتا ہے جس کا مقام و مرتبہ ہمارے حواس کے ادراک سے ماورا ہے۔

اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ مجموعی نظم کائنات کا یہ ایک معمولی سا جزو ہے، جس کی حیثیت سمندر میں ایک قطرۂ آب اور ریگستان میں ایک ذرۂ ریت کے برابر بھی نہ ہوگی، جو انسانی تحقیق و گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی استعداد تخلیق لامتناہی ہے۔ منکرین خدا یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس محدود جزو کائنات جس کا ہم نہایت حساس آلات کے ذریعے مشاہدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں صرف اسی سے متعلق اجرام فلکی کے درمیانی فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ ان میں سے بعض کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ (Second) کی رفتار سے سفر کر کے ہم تک کئی ارب(Billion) برسوں کے بعد پہنچتی ہے۔ اس فاصلے کے لئے ہمارے پاس میلوں کے حساب سے شمار کے لئے اعداد ہی نہیں ہیں۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار کے ساتھ ہر سمت میں پھیل رہی ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کی وسعت اور اس کے ہماری شماریاتی استعداد سے ماورا ہونے کی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا(۱۰۹:۱۸)

ترجمہ: کہہ دو اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کیلئے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اس کی مانند اور سمندر ملا دیں۔

یہاں، 'کلمت' میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ہر نوعیت کی تخلیقات اور مظاہر شامل ہیں۔ چاہے وہ ہمارے مشاہدے اور ادراک کی گرفت میں آتے ہیں یا نہیں۔ مقام حیرت ہے کہ معمولی معمولی واقعات اور معاملات کے وقوع پذیر ہونے میں تو محرکات اور اسباب و علل کا کھوج لگانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس اتنے عظیم کارخانہ قدرت کے بغیر کسی خالق کے از خود وجود میں آنے اور بغیر کسی مدبر و منتظم کی منصوبہ بندی اور قدرت کاملہ کے رواں دواں رہنے کا دعویٰ کیا جارہا ہے۔ اس سے مغربی مادہ پرستانہ فکر کے اندر پائے جانے والے بہت سے تضادات میں سے ایک نمایاں تضاد کی نشاندہی ہوتی ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ آسمانوں اور زمین یعنی کائنات کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ از خود وجود میں نہیں آگئی۔ پھر اتنے بڑے کارخانہ قدرت جس کی وسعت کا آج تک اندازہ بھی نہ لگایا جاسکا اور اگر اس کے مختلف ستاروں کے فاصلوں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو کسی زبان میں ایسا کوئی عدد ہی موجود نہیں جسے استعمال کر کے یہ کہا جاسکے کہ فلاں فلاں ستاروں کے درمیان یا زمین کے درمیان یا زمین سے فلاں دور دراز ستارے کا فاصلہ اتنے میل ہے۔ بلکہ یہ فاصلے نوری سالوں کے حساب سے مذکور ہوتے ہیں، اور وہ نوری سال بھی اربوں اور کھربوں سے تجاوز کر جاتے ہیں اور پھر ان اجرام فلکی اور ان کہکشاؤں کی تعداد بھی اربوں سے متجاوز ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے متعین مدار پر چل رہا ہے۔ کسی کا یہ کہہ دینا کہ اس نظم کو کوئی وجود میں لانے والا ہے اور نہ اس کو چلانے والا، انسانی عقل و دانش کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

قرآن واضح الفاظ میں اعلان کرتا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ (۱۰:۳)

ترجمہ: بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، پھر وہ معاملات کا انتظام سنبھالے عرش پر متمکن ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' میں اس آیت کی درج ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے، اس کی جامعیت کی وجہ سے ہم اسے یہاں بعینہٖ نقل کر دیتے ہیں:

''یہاں ہم چاہتے ہیں، وہ تمام اشارات جمع کر دیں، جو آسمان و زمین کی ابتدائی پیدائش کے بارے میں جا بجا کئے گئے ہیں۔

(۱)۔ آسمان و زمین کی پیدائش ایک ایسے مادہ سے ہوئی جسے قرآن ''دخان'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے: ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ(۴۱:۱۱)''دخان'' کے معنی دھوئیں کے ہیں یا ایسی بھاپ جو اوپر چڑھتی ہو۔

(۲) یہ مادۂ دخانیہ ابتدا میں ملا ہوا تھا، الگ الگ نہ تھا۔ پھر اس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کر دیئے گئے۔ اور ان سے اجرام سماویہ کی پیدائش ظہور میں آئی: اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ(۲۱:۳۰)

(۳) یہ تمام کائنات بیک وقت ظہور میں نہیں آگئی بلکہ تخلیق کے مختلف دور یکے بعد دیگرے طاری ہوئے۔ یہ دور چھ تھے جیسا کہ آیت زیر بحث میں ہے۔

(۴) سات آسمانوں کی تکمیل دو دوروں میں ہوئی: فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ(۴۱:۱۲)

(۵) زمین کی پیدائش دو دوروں میں ہوئی: قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ(۴۱:۹)

(۶) زمین کی سطح کی درستگی، اور پہاڑوں کی نمود، اور قوت نشو نما کی تکمیل بھی دو دوروں میں ہوئی۔ اور اس طرح یہ چار دور ہوئے: وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ(۴۱:۱۰)

(۷) تمام اجسام حیہ (یعنی نباتات و حیوانات) کی پیدائش پانی سے ہوئی: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ(۲۱:۳۰)

(۸) انسان کے وجود پر بھی یکے بعد دیگرے مختلف حالتیں گزری ہیں: وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا(۷۱:۱۴)

ان تمام اشارات کا ماحصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مادۂ دخانی تھا، پھر اس میں انقسام ہوا یعنی بہت سے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر ہر ٹکڑے نے ایک کرہ کی شکل اختیار کر لی۔ اور اسی کے ایک ٹکڑے سے زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی ایسی تبدیلی واقعہ ہوئی کہ دخانیت نے مائیت شکل اختیار کر لی۔ یعنی پانی پیدا ہو گیا۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہوئے۔ پھر پہاڑوں کے سلسلے نمایاں ہوئے۔ پھر زندگی کا نمو شروع ہوا اور نباتات ظہور میں آگئیں۔

موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرۂ ارضی کی ابتدائی نشود نما کے جو نظریے تسلیم کر لئے گئے ہیں، یہ اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو ان بنیادوں پر شرح و تفصیل کی بڑی بڑی عمارتیں اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہو گا۔ یہ نظریے کتنے ہی مستند تسلیم کر لئے گئے ہوں، لیکن پھر بھی نظریے ہیں، اور نظریات جزم و یقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس سے کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجمل اور متحمل اشارات کی تفسیر کی جائے۔

فرض کرو کہ آج ہم نے دخان اور دخان کی اقسام کا مطلب اسی روشنی میں آراستہ کر دیا جو وقت کے نظریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن کل کو کیا کریں گے اگر ان نظریوں کی جگہ دوسرے نظریے پیدا ہو گئے؟ صاف بات یہی ہے کہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے، جس کی حقیقت ہم اپنے علم و ادراک کے ذریعے معلوم نہیں کر سکتے۔ اور قرآن کا مقصود ان اشارات سے تخلیق عالم کی شرح و تحقیق نہیں ہے، خدا کی قدرت و حکمت کی طرف انسان کو توجہ دلانا ہے۔''

اللہ کے اپنی قدرت کے ذریعے موجودات کو عدم سے وجود میں لانے، کائنات کی تخلیق کرنے اور اس کو بغیر کسی رخنہ و بے ترتیبی کے ہماری آنکھوں کے سامنے ایک نظم کے تحت اپنے تکوینی احکامات کے تحت رواں دواں رکھنے کی حقیقتوں کو مغرب کے مادہ پرست بغیر کسی دلیل کے مسترد کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ سائنس اور فلسفہ دونوں دائروں میں شدید مخمصوں اور تشکیک کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کی عظیم اکثریت اب لاادریت (Agnosticism) کو دانشوری کی علامت سمجھتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی جہالت کو علم کے ہم معنی قرار دے دے۔

اللہ کے وجود کے متعلق مغرب کا فکری الجھاؤ

مغربی تمدن کے پیدا کردہ سبھی دانشور اور فلاسفہ جو داعیان دہریت (Atheism) کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے ہیں اس تضاد میں مبتلا ہیں۔ ہم طوالت سے بچنے کے لیے اس کے نمائندے کی حیثیت سے برٹرینڈ رسل، جس کا اس سے قبل بھی تذکرہ ہو چکا ہے، کے طرز فکر پر مجمل گفتگو کریں گے۔ اس وقت کے اس کے مقالات کے مجموعے پر مشتمل ایک کتاب (Why I am Not a Christian) ہمارے پیش نظر ہے۔ وہ بیسویں صدی کا عظیم دشمن مذہب (اور خدا) و اخلاقیات تھا۔ اس کتاب کا جامع (Editor) تعارفی نوٹ کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے:

"Bertrand Russal has been a prolific writer all his life" why I am not a (Page 5).

ترجمہ: برٹرینڈ رسل نے اپنی ساری زندگی کے دوران (مصنف کی حیثیت سے) بکثرت لکھا" اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

"it is a fair guess that Russell will be equally emembered in years to come as one of the great heretics in morals and religion" (Page 5).

ترجمہ: یہ ایک بہت واضح اندازہ ہے کہ رسل آنے والے سالوں میں اخلاقیات اور مذہب کے منکر کی حیثیت سے یکساں طور پر یاد کیا جائے گا۔

رسل کے ان مقالات میں جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر آیا ہے۔ اس نے وجود باری تعالیٰ کا انکار ہی کیا ہے۔ لیکن ایک پادری فادر ایف سی کو پلسٹن (F.C Coplestion) کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات پر جب اس کا مناظرہ ہوا اور جس کی روئیداد اس کتاب میں شامل کی گئی ہے۔ اس میں پادری موصوف رسل سے سوال کرتا ہے:

"Perhaps you would tell me if your position is that of agnosticism or of atheism. I mean, would you say that the non- existence of God can be proved?" (Page 133).

شاید تم مجھے یہ بتادو گے کہ تم لاادری کی حیثیت رکھتے ہو یا دہریے کی۔ میری مراد یہ ہے کہ کیا تم یہ کہو گے کہ خدا کے عدم وجود کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟

تو رسل جواب دیتا ہے:

"No, I should not say that, my position is agnostic". (Page 133).

نہیں! ایسا نہیں کہوں گا، میری حیثیت لاادریت کے حامی کی ہے۔

اس سے قبل ہم انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۱۰ صفحہ ۲۵۰ سے رسل کے متعلق حوالہ دے چکے ہیں کہ وہ متشکک دہریہ (Skeptical Atheist) تھا۔ اتنے وسیع مطالعہ اور علمی کاوشوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو انتہائی قسم کے بے سروپا شکوک سے نہ نکال سکا۔ مثلاً اسی کتاب میں وہ کہتا ہے:

Historically it is quite doubtful whether Christ (Father, ever existed at all..." Page 21)

ترجمہ: تاریخی طور پر یہ بالکل مشکوک ہے کہ (حضرت) مسیح کبھی معرض وجود میں رہے بھی ہیں۔"

مغرب کے یہ مادہ پرست دانشور عقل پرستی کی ڈگر پر چلتے ہوئے تشکیکی انداز فکر کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں، کہ چمکتے سورج کی موجودگی کا بھی انکار کر دیں۔

رسل صرف حضرت عیسیٰؑ کے سلسلے ہی میں اس شک کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اپنی کتاب ''مغربی فلسفے کی تاریخ'' کے صفحہ ۳۱ پر وہ کنفوشیس، بدھا اور زرتشت کے وجود کے متعلق بھی شک کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان تینوں حضرات کے وجود کے متعلق آج تک محکم روایات کی بنا پر لوگوں کا یقین اس قدر پختہ رہا ہے کہ جیسے وہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن علم و دانش کے جو دعویدار ان کے وجود کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق انبیاء و رسل کی خبر کی بنا پر کیسے یقین کر سکتے ہیں۔

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ دہریہ بھی تھا، لاادری بھی تھا اور متشکک بھی تھا۔ گویا وہ اپنا مسلک دوران گفتگو و تحریر موقعہ کے مطابق تبدیل کرتا رہتا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کہتا ہے:

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ(۶:۱۱۶)

ترجمہ: یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔

خدا کے وجود کے متعلق برٹرینڈ رسل اور مسلک مادہ پرستی کے پیرو نہایت الجھی ہوئی اور سطحی باتیں کرتے ہیں۔ متذکرہ صدر کتاب میں وہ اللہ تعالیٰ کے علت اول (First Cause) کے تصور کے متعلق لکھتا ہے:

".....at the age of eighteen I read John Stuart Mill's Autobiography, and I there found this sentence: 'My father taught me that the question, "who made me?" cannot be answered, since it immediately suggests the further question, "who made God?" That very simple sentence showed me, as I still think, the fallacy in the argument of the First Cause." (Page 15).

ترجمہ: اٹھارہ سال کی عمر میں، میں نے جان سٹوآرٹ مل کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی، اور اس میں میں نے یہ فقرہ پایا ''میرے باپ نے مجھے بتایا کہ اس سوال کا کہ ''مجھے کس نے بنایا؟'' جواب نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس سوال سے فوراً یہ مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''خدا کو کس نے بنایا؟'' اس سادے سے فقرے نے، جیسا کہ ابھی تک میری سوچ ہے، مجھ پر علت اول کی دلیل کے بر سر باطل ہونے (کی حقیقت) کو واضح کر دیا۔

گویا رسل نے اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق اٹھارہ سال کی عمر میں ایک بے معنی سی دلیل پڑھی اور زندگی کے بقیہ اسی سالوں کے دوران وجود باری تعالیٰ جیسے اہم مسئلے پر غور و تفکر معطل کر دیا، حالانکہ وہ خود کہتا ہے کہ

"....It is a large and serious question. (Page 14).

ترجمہ: یہ ایک عظیم اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان کی وجہ سے یہ لوگ گمراہی کی ایسی ایسی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں جس سے ان کے ختم قلوب کی شہادت ملتی ہے اور علم و فکر کے دائرے میں اپنے معاشرے اور تمدنی ماحول میں اونچا مقام رکھنے کے باوجود ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن سے ان کی کثافت ذہنی و قلبی اور ہر معاملے کو ٹیڑھے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس سے زیادہ حیا سوز اور ننگ انسانیت بات اور کیا ہو گی کہ اپنی ماؤں اور بہنوں کو زنان بازاری کے مشابہ قرار دیا جائے۔ رسل لکھتا ہے:

"At present, wives, just as much as prostitutes, live by the sale of their sexual charms; and even in temporary free relations the man is usually expected to bear all the joint expenses. The result is that there is a sordid entanglement of money with sex, and that women's motives not infrequently have a mercenary element." (Page 117).

اس وقت بیویاں بالکل زنان بازاری کی طرح اپنی صنفی کشش کو فروخت کر کے زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اور عارضی آزاد (جنسی) تعلق میں بھی عام طور پر مرد سے ہی مشترکہ اخراجات برداشت کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنسیات کے ساتھ دولت کی ذلت آمیز آمیزش ہو جاتی ہے۔ اور عورتوں کی نیت محرکہ عام طور پر (اپنی عصمت کا) کرایہ وصول کرنا ہوتی ہے۔

اس کے بعد بھی اس کی ہرزہ گوئی جاری رہی ہے۔ لیکن طوالت سے بچنے کے لیے ہم ان دو فقروں کو ہی بطور نمونہ از خروارے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ مغرب کے علمی حلقوں میں بطور عالم، فلسفی اور ناقد بہت اونچے مقام پر فائز شخص ایسی پست سطح پر گر کر اپنے نظریات کا اظہار کرے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بھی بعض مستغربین و مستغربات، ایسے منکرین اور مصنّفین سے متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کی باتوں کا مدار ابلیسانہ منطق پر ہے، اور یہ خیالات معاشرے اور خاندانی شیرازہ بندی کو درہم برہم کرنے کا موجب ہو رہے ہیں، جیسا کہ اس وقت مغربی تمدن شہادت فراہم کر رہا ہے۔ ایسے خیالات سے ازدواجی زندگی اور ماں باپ سے انسان کے تعلق کی تقدیس مکمل طور پر پامال ہو جاتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان

خواتین کو جو مغرب کی نقالی پر مصر ہیں یہ سوچنا چاہئے کہ مغربی مفکرین معاشرے میں ان کے مقام کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ خدا ناشناسی اور مادہ پرستی نے جن مفاسد کو جنم دیا ہے اس کا تذکرہ ناظرین کو موضوعات کی مناسبت سے مختلف ابواب میں ملے گا۔ ان خیالات کے اظہار میں رسل تنہا نہیں بلکہ کارل مارکس جیسے مفکرین بھی آپ کو اس حمام میں نظر آئیں گے۔

البتہ ہم ''اللہ کو کس نے بنایا؟'' کے سوال پر اختصار سے یہاں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

انسان کی جسمانی ساخت:

اس کے حواس کی صلاحیت کار اور اس کی عقل اور قوت ادراک کی محدودیت واضح ہے۔ اگر اس فضا کی حرارت و برودت ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو وہ اس میں زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح اس کی آنکھیں روشنی کی شدت کو ایک حد تک ہی برداشت کر سکتی ہیں اور اس سے زیادہ روشنی میں ان کا ضائع ہو جانا یقینی ہے۔ اگر آواز یا شور ایک حد سے متجاوز ہو جائے تو اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں، اس کی قوت شامہ شدت خوشبو اور بدبو کے ایک مرحلے کے بعد ناکارہ ہو جاتی ہے، اس کا دماغ، قلب، پھیپھڑے، جگر، گردے اور نظام ہضم سبھی اس قدر حساس ہیں کہ ماحول کے معمولی نشیب و فراز اور ان کے جسم انسانی میں معمول کا کام سرانجام دینے کی شرائط سے انحراف ان کی درماندگی اور شکستگی کا باعث بن جاتا ہے۔ ان میں سے کسی عضو کے ناکارہ ہونے کے ساتھ انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نیز زمان و مکان سے آزاد ہو کر وہ سوچ ہی نہیں سکتا، اور وہ ان کی حدود میں مقید ہے۔ اس کی بصارت، سماعت، گویائی اور قوت شامہ ایک نہایت قلیل فاصلے کی حدود تک ہی اپنا کام کر سکتے ہیں۔ اس کا حوصلہ اور برداشت اس قدر نحیف و ناتواں ہیں کہ حالات کی معمولی سی ناسازگاری اس کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ اس کی مدت عمر طبعی طور پر اس قدر کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کائنات کے جن مظاہر کا وہ مشاہدہ کر سکتا ہے ان کے مقابلے میں اس کی درازی اتنی بھی نہیں جس قدر وقت آنکھ جھپکنے میں صرف ہوتا ہے، اور اس مدت عمر میں بھی ضعف و ناتوانی اور دوسروں کے سہارے کی محتاجی کے دو ادوار آتے ہیں۔ ایک زمانہ طفلی کا اور دوسرا بڑھاپے کا۔ اور پھر اس موت کے سامنے اس کی بے بسی ہے جو ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ چپکی ہوئی ہے اور جس سے، جب وہ آجائے، کوئی راہ مفر نہیں۔

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے ہمیں انکار نہیں، لیکن اس کی ناتوانیوں کا یہ تذکرہ ہم نے ان لوگوں کے فکر کے پس منظر میں کیا ہے جو کہتے ہیں کہ ہم خدا کو ایسی صورت میں مانیں گے اگر ہم اس کو اپنے ادراک اور حواس کی گرفت میں لا سکیں اور کیونکہ ایسا نہیں ہو سکا لہٰذا ہم یا تو انکار کا راستہ اختیار کرتے ہیں یا

لاادریت (یعنی ہم نہیں جانتے) کا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان مذکورہ ناتوانیوں کے ساتھ اور اس ساخت کے ساتھ جو ہماری جسمانی اور باطنی خصوصیات کی حیثیت رکھتی ہے ہم اس خالق و قادر مطلق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جس نے وہ کائنات بنائی جس کی وسعت کے متعلق ہم اس سے قبل اشارات کر چکے ہیں؟ کیا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس اس کی توقع رکھ سکتا ہے؟ بے ہوش کر دینے والی دوائی کی تھوڑی سی خوراک انسان کے ہوش و حواس کو گم کر دیتی ہے تو کیا وہ ہوش و حواس کے اس سرمایے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا سامنا کر سکتا ہے؟ قرآن نے اس سلسلے میں یوں وضاحت کی ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ (۶:۱۰۳)

ترجمہ: اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی کہ انہیں اپنے دیدار کا موقع دے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ (اپنی بشری ساخت کی وجہ سے) اللہ کی تجلی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِىْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِىْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۷:۱۴۳)

ترجمہ: اور جب موسیٰؑ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ فرمایا تم مجھے ہر گز نہ دیکھ سکو گے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے بولے تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک پیغمبر بھی، جس کی روحانی عظمت دوسرے انسانوں کے مقابلے میں نہایت بلند درجہ پر ہوتی ہے، اتنی استعداد کا مالک نہیں ہوتا کہ بالواسطہ طور پر اللہ تعالیٰ کا نظارہ کر سکے۔ جیسا کہ ''وحی'' کے باب میں عرض کیا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوا، لیکن یہ کلام اس نے رویت کے بغیر کیا۔ شدت طلب کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے رویت باری تعالیٰ کی درخواست کی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کسی پیغمبر کو حدود شریعت سے نہیں نکالتا، لہٰذا حضرت موسیٰ اپنی بشری خصوصیات کی وجہ سے اس بالواسطہ جلوہ نمائی کی تاب بھی نہ لا سکے اور غش کھا کر گر پڑے۔ اس واقعہ سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ انسانی

حواس و قواء اپنی موجود ساخت کے ساتھ اللہ کے دیدار کے متحمل نہیں ہو سکتے جس طرح وہ مادی اشیا کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

جس ہستی کی قدرت کا یہ عالم ہو اور وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو، اس کے وجود میں آنے کے محرکات یا اس کو بنانے والے کے متعلق سوال اٹھانا کار عبث ہے۔ اس کا قدیم ہونا خلاف عقل نہیں ہو سکتا۔ برٹرینڈ رسل اس مادی اور بے جان کائنات کے لیے جس کے تمام اجزا بے اختیارانہ حیثیت سے ایک مربوط کل کے طور پر اپنا وظیفہ فرائض ادا کر رہے ہیں قدیم اور بغیر علت کے وجود میں آنے کی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے اور اسے خلاف عقل و دانش نہیں تصور کرتا، لیکن اس خدا کے وجود کو، جس کی خبر صادق و مصدق پیغمبروں نے دی اور جس کے وجود کے شواہد ہر سمت کائنات میں نظر آرہے ہیں، ابدی اور قدیم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ یہ سوال تو اٹھاتا ہے کہ اللہ کو کس نے بنایا، لیکن اس سوال کا سامنا کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ اس کائنات کو کس نے بنایا۔ متذکرہ صدر کتاب میں وہ لکھتا ہے۔

"There is no reason why the world could have not come into being without a cause, nor, on the other hand, is there any reason why it should not have always existed. There is no reason to suppose that the world had a beginning at all." (Page 15).

اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ کائنات بغیر علت کے وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ نہ ہی دوسری طرف اس بات کی کوئی وجہ ہے کہ یہ ہمیشہ وجود میں نہ رہی ہو۔ اس بات کے فرض کرنے کی (بھی) بالکل کوئی وجہ نہیں کہ اس کائنات کا کوئی آغاز بھی تھا۔

اس کے نزدیک کسی چیز کا ابدیت کی صفت سے متصف ہونا ممکن ہے۔ لیکن وہ اس صفت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کے لیے تیار نہیں۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا گیا، وہ بے اختیار مادی دنیا کو اس سے متصف کرنے پر آمادہ ہے۔ اس موقف کو عقل سلیم تسلیم نہیں کر سکتی لیکن مغربی تمدن میں یہ سوچ کار فرما ہے۔ اور اسی سوچ پر ان کے تمام اصناف علم و فکر اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ گزشتہ دو تین صدیوں سے وہ اپنے سیاسی، اقتصادی اور علمی تفوق کے ذریعے سے بقیہ دنیا کو، جس میں مسلمانان عالم بھی شامل ہیں، اپنے فکر کے زہر ہلاہل سے مسموم کر رہے ہیں۔ سوائے مسلمانوں کے کسی اور کے پاس اس سیل بلا انگیز کا مقابلہ کرنے کا فکری سرمایہ موجود نہیں۔ اور مسلمان بھی اسی صورت میں اس کو پامال کر سکیں اور اپنے آپ کو اس کے اثرات

بد سے محفوظ کر سکیں گے اگر وہ اس سرمائے کو مناسب طریقے سے استعمال کریں گے۔ اس موضوع پر سابقہ مباحث میں بھی نظریاتی مواد موجود ہے اور آئندہ بھی مناسب مقامات پر گفتگو کی جائے گی۔

نیز مغرب کے مفکرین خدا کے وجود اور اس کائنات اور خود انسان کی تخلیق کے متعلق عجیب قسم کے مخمصے اور کشمکش میں بھی مبتلا ہیں۔ اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا، سوچا اور تفکر کیا گیا ہے۔ اپنے اپنے رجحان فکر کے مطابق بے شمار اہل علم نے متضاد و متنازع خود ساختہ نظریات پر مشتمل تصانیف کے انبار لگا دیئے ہیں لیکن سوائے فکری الجھاؤ کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حقیقت کی روشنی کی ایک کرن بھی نمودار نہیں ہوئی۔ جیسا کہ ہم وحی کے باب میں اور اک حقیقت کے سلسلے میں فلسفے کی ناکامی پر بحث کر چکے ہیں، عقل و خرد کے ذریعے اس دائرے میں کامیابی حاصل کرنے کی تمام کوششیں ناکامی سے ہی ہمکنار ہوئی ہیں۔ ہم انسانی عقل و خرد کے مقام کو گرانا نہیں چاہتے بلکہ ہم صرف اس کی محدودیت اور دائرہ کار کی پہنچ کے متعلق مناسب رائے قائم کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ''ہمارا ذہن و فکر امکان و اضافت کی چار دیواری میں اس طرح مقید ہے کہ مطلق اور غیر محدود حقیقت کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ وہ جب تصور کرے گا تو ناگزیر ہے کہ مطلق کو مشخص بنا کر سامنے لائے اور جب تشخص آیا تو اطلاق باقی نہیں رہا۔''(ام الکتاب صفحہ ۱۹۶)

دور حاضر میں مادہ پرست جب اپنے اپنے رجحان فکر کے مطابق ادراک حقیقت اور وجود باری تعالیٰ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اپنی نوعی استعدادوں کی نارسائی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے وہ اس بات پر بھی غور نہیں کرتے کہ یہ حقیقت کیا رہنمائی فراہم کرتی ہے کہ توہم پرستی پر مبنی اشراک و تعدد الٰہ اور لاادریت و انکار خدا کی مختلف صورتوں کے متقدرات کے تضادات کے برعکس توحید کی آواز جب بھی اور جہاں بھی اٹھی ہے اس میں کامل یک رنگی پائی جاتی رہی ہے۔ اور یہ دعوت ہمیشہ شرک کی مختلف حالتوں میں آلودہ معاشروں میں کسی ہمہ صفت موصوف بشر نے اللہ کی طرف سے نزول وحی کے دعوے کے ساتھ دی ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت کا سامنا نہیں کرتے اور اس سے اغماض کرنا ہی قرین مصلحت تصور کرتے ہیں بلکہ ایسے دعاۃ کی پیش کردہ تعلیمات کو ان کی اپنی اختراع اور ان کی منزل من اللہ کتب اور صحیفوں کو ان کی اپنی تصنیف کردہ قرار دیتے ہیں، چاہے ان کا امی ہونا امر متحقق ہی ہو۔

در اصل مغرب کے مادہ پرست عقیدۂ وحی کے انکار پر پوری شدت سے اصرار کرتے ہیں۔ اگر اس معاملے پر وہ معمولی مصالحت بھی کر لیں تو اس کا لازمی نتیجہ خدا اور رسالت کا اقرار ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کے فکر کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ ان کی فکری کیفیت علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کی ہے

دانش حاضر حجاب اکبر است
بت پرست و بت فروش و بتگر است
پا بزندان مظاہر بستہ
از حدود حس بروں ناجستہ

(مثنوی اسرار و رموز ص ۷۷)

ادوار قدیم و جدید میں مختلف زمانوں اور ارضی خطوں میں پیغمبروں کے ذریعے سے اللہ کی طرف سے وحی شدہ تصور توحید کے علاوہ مافوق البشر ہستیوں کے متعلق بہت سی اقسام کے تصورات پائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن ہر تمدنی اکائی میں تھوڑے بہت فروعی اختلافات کے ساتھ بحیثیت مجموعی اس سلسلے میں ایک ہی بنیادی تصور کار فرما رہا ہے۔ اس کے برعکس مغربی تمدن میں اس دائرے میں متناقض و متبائن نظریات کی اس قدر فراوانی ہے کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ایسے مسئلے کے متعلق، جس کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے کے وسائل سے انسان بالکل محروم ہے، محض اٹکل اور تخرص کی بنیاد پر علمی حلقوں میں آراء پیش کی جا رہی ہیں اور یہ سب آراء عالمی سطح پر گردش کر رہی ہیں۔ اس صورتحال سے پیدا ہونے والا انتشار ذہنی الحاد کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتا ہے، کسی مثبت نظریے کو جنم نہیں دے سکتا۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ (۱۰:۳۶)

ترجمہ: اور ان میں سے اکثر محض گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور گمان حق کا بدل ذرا بھی نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک مغربی دنیا کا تعلق ہے خدا کی ہستی سے متعلق متضاد نظریات دو الگ الگ دائروں میں جنم لیتے رہے ہیں۔ ایک مذہب عیسائیت کا حلقہ اور دوسرے مادہ پرست اور محض عقلیت کا حامی حلقہ۔ ان دونوں کا انداز فکر و استدلال اور اخذ نتائج و عقائد کے خطوط بھی الگ الگ ہیں۔ مذہبی حلقے کے بحث و تفحص کا محور عقیدۂ تثلیث ہے۔ اس کی ماہیت کا تعین عیسائیت کی تاریخ میں مابہ النزاع رہا ہے۔ اسی سلسلے میں تاویلات کا ایک انبار لگ گیا ہے، اور تاریخ عیسائیت میں متعدد مجالس کلیسا (Sydons) منعقد ہو چکی ہیں، لیکن کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچا

جاسکا۔اس صورتحال کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بحث و تفکر کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحی اور حضرت عیسیٰؑ کے اقوال کی کوئی ثقہ بنیاد موجود نہیں، جیسا کہ ہم ''پس منظر'' کے باب میں ''عیسائیت'' کے بغلی عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت جیسے اہم ترین اور اساسی مسئلے میں پائی جانے والی پر اسراریت کو کلیسائی حلقے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مفصل بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں، البتہ ہم یہاں اجمالاً بیان کیے دیتے ہیں کہ تقریباً دو ہزار سال پر پھیلی ہوئی ان مباحث میں بنیادی طور پر تین نکتہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں، اگرچہ ان میں سے بھی پھر ہر ایک کے اندر متعدد زاویہ ہائے نگاہ شامل ہیں:

پہلا عقیدہ جو سب سے نمایاں اور مقبول ہے وہ یہ ہے کہ مسیحؑ جو اللہ کے بیٹے ہیں، مکمل طور پر صفات الوہیت سے متصف ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مکمل طور پر مجسم ہو کر ان کی شکل و صورت میں دنیا میں ظہور کیا۔

دوسرے یہ کہ وہ بشری تھے۔ لیکن یہ نظریہ نصاریٰ میں معمولی سی مقبولیت بھی حاصل نہیں کر سکا۔ ایم ایریس (Arius) کی تحریک کی ناکامی کا اس سے قبل تذکرہ کر چکے ہیں۔ مسیح کو انسان تسلیم کرنے سے کفارے کا عقیدہ ختم ہو جاتا تھا۔

تیسرا نظریہ جو پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مسیح کی ذات میں الوہیت اور بشریت کی فطری قوتیں اور صفات الگ الگ نہیں بلکہ ایک مربوط کل کی حیثیت سے پائی جاتی ہیں۔

بہر حال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ بحیثیت مجموعی عیسائی دنیا نے توحید سے رو گردانی کر کے مذہباً تثلیث کے عقیدے ہی کو اپنا رکھا ہے۔

دوسرے حلقے کا تعلق مغربی تمدن میں چھائے ہوئے ذہن و فکر اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی ساخت سے ہے۔ مذہب عملاً کلیساؤں کے اندر محبوس ہے، اور تمدنی زندگی کے تمام گوشوں سے اسے نکال دیا گیا ہے۔ لادینیت (Secularism) کو مکمل تفوق و غلبہ حاصل ہے، اور خدا شناسی اور مادہ پرستی کے عفریت پوری طرح مسلط ہیں۔ لیکن اس کے باوجود خدا کی ہستی کے وجود و عدم کا مسئلہ مغربی مفکرین کے اذہان پر سوار ہے۔ وہ اسے قوائے عقل و خرد کے ذریعے سے حل کرنا چاہتے ہیں لیکن حصول مقصد کے لیے یہ راستہ بالکل مسدود ہے اور اس معاملے میں ان کی درماندگی بالکل واضح ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مغرب کے مادہ پرست مفکرین برملا کہتے ہیں کہ انہیں حیات انسانی میں خدا کا کوئی کردار نہیں نظر آتا تو وہ اس کی ہستی کا کھوج لگانے کے لیے کیوں سرگرداں ہیں اور توضیع اوقات و توانائی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس کا یہی جواب ممکن ہے کہ دراصل اس سے خدا شناسی کے اس فطری

تقاضے(Urge)کی نشاندہی ہوتی ہے جس کا ہم اس سے قبل اسی باب میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ وہ چاہے زبان سے جتنا بھی کہیں کہ اس کائنات اور انسان کا کوئی خالق اور علت اول(First Cause)نہیں، لیکن جستجو اور طلب کی یہ خواہش بتاتی ہے کہ اس نظریے پر دل مطمئن نہیں۔ اسی لیے وہاں طرح طرح کے نظریات سر اٹھارہے ہیں۔

انکار وجود باری تعالیٰ(Atheism)کا نظریہ سر فہرست ہے اور ہم اس سلسلے میں برٹرینڈ رسل کے خیالات کا تذکرہ کر چکے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ایسے اہل فکر بھی پائے جاتے رہے ہیں جو خدا کے وجود کو مانتے ہیں لیکن کائنات سے اس کے تعلق کی مختلف توجیہیں کرتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس نے دنیا تو بنادی لیکن اس کے بعد اس سے لا تعلق ہو گیا اور اب وہ از خود چل رہی ہے، اس نظریے کو(Deism)سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل پر غور کرنے والے کچھ دعوے دار یہ کہتے ہیں کہ خدا تو ہے لیکن وہ برائی پر غلبہ حاصل نہیں کر سکا۔ لا ادریت(Agnosticism)کے نظریے کو بھی مغربی دانشوروں کے حلقے میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ نتیجے کے اعتبار سے اس نظریے کے ڈانڈے انکار خدا ہی کے تصور سے جا ملتے ہیں کیونکہ جس طرح دہریت کے حامی مسائل حیات انسانی کو اللہ تعالیٰ کے تصور اور اس کے احکامات سے بیگانہ رکھتے ہیں اس طرح لاادری بھی اس سے لا تعلق ہی رہتے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی ممالک میں گزشتہ تین صدیوں سے علم و تحقیق کے سلسلے کی سر گرمیوں کا دور دورہ ہے۔ یونیورسٹیاں اور تحقیقی مراکز وادارے ہر صنف علم میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ اہل علم کو جس طرح تجرباتی سائنسی (Pragmatic and Scientific) علوم کے متعلق تحقیقی آسانیاں حاصل ہیں اسی طرح وہ تصورات اور تجریدی(Abstract)علوم کے سلسلے میں خیالی جولانیاں دکھانے کے لیے وسیع میدان کی سہولتیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ خدا کے وجود اور اس کائنات کی ابتدا و انجام کے متعلق اٹکل کی بنیاد پر اتنے نظریات پیش کیے جا چکے ہیں جن کی تعداد اور بوقلمونی کو جنگل میں بے ترتیب خودرو پودوں اور درختوں کی کثرت سے بجا طور پر تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ حالانکہ حقیقت یکتا ہی ہو سکتی ہے، کثرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہیں وجہ ہے کہ اس موضوع پر مغرب میں وجود میں آنے والے علمی مواد میں جتنی غوطہ زنی بھی کی جائے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا، اور اس ساری

کاوش کا ثمر انتشارِ فکر کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ فقدان یقین کی اس کیفیت نے مادہ پرستی کی جس حالت کو جنم دیا ہے اس نے دنیا کو ظلم و تعدی سے بھر دیا ہے۔

خدا کی ہستی کا تصور بشر اول سے چلا آرہا ہے، فکری ارتقاء سے اس کا کوئی تعلق نہیں

ہم اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں کہ مغرب میں علم و تحقیق کی سرگرمیوں کی فراوانی کے باوجود انتہا پسندی کا رجحان فکر کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی کے ہیگل کی تصورات جدلیت (Dialectical Idealism)، ڈارون کی ارتقائی تھیوری (Theory of Evolution) اور مارکس کی جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کے سلسلے کے نظریات کے پھیلاؤ کی وجہ سے مغربی دنیا میں ہر صنف فکر و عمل میں عمل ارتقاء کا بے قید اثر دیکھا جانے لگا۔ اگرچہ ان میں سے ہر فکر کے یک رخے پن کی وجہ سے ان نظریات پر مخالفانہ تنقیدات کا سلسلہ بھی شروع ہوتا رہا ہے لیکن لاحقہ ارتقاء (Evolution Phobia) کا پلڑا بھاری ہی چلا آرہا ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں خدا کی ہستی کے تصور پر بھی نظریہ ارتقا کا اطلاق کیا جانے لگا۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ ابتدائی دور میں زندگی کے مسائل کے حل اور رفع مصائب کے لیے انسان نے احساس خوف کے تحت اور توہم پرستی کے جذبے کے زیر اثر ایسی زمینی اور آسمانی ہستیاں اختراع کیں جن میں سے بعض کا تو وجود ہی نہ تھا اور بعض ایسی تھیں جن کا وجود تو تھا لیکن ان کا تدبیر کائنات اور حیات انسانی کے مسائل کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس مرحلے پر نوع انسانی کا ذہنی افق اس قدر محدود تھا کہ وہ حیات انسانی اور کائنات کو ایک مربوط کل کی حیثیت سے اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا تھا۔ اس کے برعکس وہ جزئیات ہی کو مرکز توجہ بنائے رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نے انسانی زندگی اور کائنات کو شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ پر ایک ایک وہمی خدا کی حکمرانی تسلیم کر رکھی تھی۔ اشتراک اور تعدد الٰہ (Polytheism) کی یہ انتہائی شکل تھی۔ اگرچہ اس کے مظاہر ہر خطہ ارض میں مختلف ہوتے تھے۔ مثلاً یونانی تہذیب کے زمانہ عروج میں بھی وہاں یہ عقیدہ رائج تھا کہ اولمپس پہاڑ میں ان دیوتاؤں کا بسیرا ہے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے مخصوص شعبے میں قوت مدبرہ کا مالک ہے۔ چین میں آباپرستی کا رواج تھا۔ مصر میں آباپرستی کے علاوہ اجرام فلکی کی طرف مقام الوہیت منسوب کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں مٹی اور پتھر کے بت تراش کر ان میں سے ایک کے ذمے کسی نہ کسی شعبہ زندگی سے متعلق اختیارات سونپ دیئے جاتے تھے (اور آج بھی یہی صورت ہے)

اس کے بعد جب انسان کا ذہنی افق کچھ ارتقاء پذیر ہوا تو اس نے کائناتی مظاہر اور انسانی زندگی میں ربط کے آثار دیکھنے شروع کیے۔ اس کے نتیجے میں اشتراکیت کو یکسر ترک تو نہیں کیا گیا لیکن ایک بالاتر ہستی کا تصور جسے

رب الارباب نظریہ (Henotheism) کہا جاسکتا ہے ظہور میں آیا۔ اس کے بعد تصور توحید کا مرحلہ آتا ہے جس کے حاملین مغربی محققین کے نزدیک ---- تین عالمی مذاہب یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت ہیں جو (Monotheism) کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

مختصراً، خدا کی ہستی کے ذہن انسانی میں وجود پذیر ہونے اور ابھرنے کے متعلق یہ وہ نظریہ ہے جس کو پیش کرنے کے لیے مغرب میں کثرت سے لکھا گیا ہے لیکن تاریخ کی شہادت سراسر اس کے خلاف جاتی اور اس کا بطلان کرتی ہے۔ قیاسات کی بنیاد پر تھیوریوں اور نظریات کی تعمیر کی بات تو الگ ہے لیکن تاریخی حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ توہم پرستی کی بناپر خصوصیات الوہیت بعض حلقوں میں غیر اللہ کی طرف ہمیشہ ہی منسوب کی جاتی رہی ہیں اور آج بھی کی جاتی ہیں، لیکن اشراکی نظریے کی کسی صورت کو استقلال و دوام حاصل نہیں ہوا۔ نہ ہی اس میں یک رنگی پائی جاتی رہی ہے۔

اس کے برعکس ایک تو تاریخ، اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ تصور توحید کا وجود ہمیشہ سے انسانوں کے کسی نہ کسی حصے کے اذہان میں موجود رہا ہے اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی ذات سے جو صفات منسوب کی جاتی رہی ہیں وہ منزل من اللہ توحیدی تصور میں یکساں ہی رہی ہیں چاہے وہ جس زمانے اور جس ارضی خطے میں پیش کیا جاتا رہا ہو درآنحالیکہ اس کے دعاۃ و حاملین میں بعد زمانی و مکانی کی وجہ سے ربط کا مکمل فقدان رہا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تصور ارتقاء شدہ نہیں بلکہ تاریخ انسانی میں اپنا مستقل مقام رکھتا ہے۔ صورت یہ نہیں رہی ہے کہ انسانوں کی آبادیاں اپنے ذہن و فکر کی بنیاد پر کثرت و تعدد الٰہ سے وحدت کی طرف بڑھتی رہی ہیں بلکہ شرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں اللہ تعالیٰ کے فرستادگان یک و تنہا دعوت توحید دیتے رہے ہیں۔ قرآن نے جتنے انبیاء و رسل کے قصص بیان کیے ہیں ان میں سے ہر ایک نے اشراکی تاریکیوں میں توحید کی شمع ہی روشن کرنے سے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ اور اثری انکشافات نے بھی تصدیق کی ہے کہ قدیم ادوار میں بعض شخصیات نے مشرک معاشروں میں توحید کی دعوت دی اور یہ کہ دنیا کے ہر خطے میں اشراکی عقائد کے باوجود ایک بالاتر اور وراء الوراء ہستی کا دھندلا تصور پایا جاتا رہا ہے جو انبیاء و رسل کی توحیدی تعلیمات کی مسخ شدہ باقیات ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ موخر الذکر صورت کا تذکرہ ہم ''پس منظر'' کے باب میں مختلف ادیان کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ جہاں تک اول الذکر حقیقت کا تعلق ہے ہم مغربی مصنّفین کی کتب سے حوالے دے کر دو شخصیات، سقراط اور اخناتون، کی دعوت توحید پر روشنی ڈالیں گے، جس سے ثابت ہو جائے گا کہ تصور توحید کو فکری ارتقاء کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مغربی دنیا میں آرنلڈ جے ٹائن بی(Arnold J. Toynbee) کو دور حاضر میں فلسفہ تاریخ کا سب سے بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں اس نے چودہ جلدوں میں مطالعہ تاریخ (Study of History) کے نام سے اس موضوع پر کتاب لکھی ہے جس کو ڈی سی سومرویل (D.C Somerwel) نے مصنف کی اجازت سے دو جلدوں میں تلخیص کی ہے۔ پہلی جلد میں سقراط سے متعلق یہ جملہ لکھا ہے:

".....the golden chain of creative Greek philosophers... had begun with Socrates (Circa 470-399 B.C).." (Page 311).

یونان کے تخلیقی فلاسفہ کا سنہری سلسلہ سقراط سے شروع ہو چکا تھا (جس کا زمانہ تقریباً ۴۷۰ سے ۳۹۹ قبل مسیح تھا)

مغربی فلاسفہ اور ناقدین کی سقراط کے مقام کے متعلق آراء کا اس بات سے اندازہ کیجئے کہ برٹرینڈ رسل جس کے کٹر دہریہ اور اخلاقیات کا دشمن ہونے کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں، نے اپنی تصنیف مغربی فلسفے کی تاریخ (History of Western Philosophy) میں افلاطون کی اخلاقی آراء کے ماخذ کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا ہے:

From Socrates he probably learnt his preoccupation with ethical problems, and his tendency to seek theological rather than mechanical explanation of the world. "The God" dominated his thought more than that of the pre-Socreties, and it is difficult not to attribute this fact to the influence of Socrates. (Page 126).

اس نے غالباً اخلاقی مسائل اور کائنات کی حقیقت کے متعلق میکانکی نظریے کے بجائے غائتی نظریے سے وابستگی سقراط ہی سے اخذ کی۔ اس کے فکر پر "الحق" کا غلبہ سقراط کے پیش رو فلاسفہ سے زیادہ تھا۔ اور یہ مشکل ہے کہ اس بات کو سقراط کے اثر کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔

معلم اخلاقیات کی حیثیت سے سقراط کا نمایاں مقام بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے۔ درج بالا اقتباس سے عیاں ہے کہ افلاطون کا تصور اخلاقیات سقراط کے فیض محبت کا نتیجہ تھا اور سقراط سے قبل فلاسفہ یونان بہ معیار اخلاقیات ناپید تھا۔

سقراط کی طرف کوئی کتاب یا صحیفہ منسوب نہیں کیا جاتا۔ اس کے متعلق تمام معلومات افلاطون اور زینوفون (Xenophon) کی تصانیف کی وساطت سے حاصل کی گئی ہیں۔ چونکہ موخر الذکر کو ثقہ تصور نہیں کیا جاتا لہٰذا زیادہ تر انحصار افلاطون کی تحریروں پر کیا جاتا ہے۔ ہم سقراط کے متعلق جن جن مصنّفین کی تحریروں سے اقتباسات نقل کریں گے ان سب کی معلومات کا منبع افلاطون کی تحریریں ہیں۔

افلاطون کے مطابق سقراط خدا، معاد اور وحی کا قائل تھا۔ وہ یونان کے مروجہ سرکاری مذہب اشراک کا مخالف تھا جس کے تحت زندگی کے مختلف شعبوں کو کوہ اولمپس میں موجود دیوتاؤں کے زیر تسلط تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ مروجہ جمہوریت کو بھی دھوکہ دہی کی ایک صورت تصور کرتا تھا جس کے تحت تیس مستبد افراد حکمرانوں کی حیثیت سے ظلم و تعدی میں مصروف رہتے تھے۔ وہ عوام کو عام طور پر اور نوجوانوں کو خاص طور پر تربیت دینے اور ان میں نظریاتی انقلاب پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ وہ ایک متعین جگہ کے علاوہ گھوم پھر کر نوجوانوں کے گروہوں سے مختلف موضوعات پر سوال کرتا اور پھر خود ہی ان سوالات کے جوابات ذہن نشین کراتا تھا۔ اس کی زندگی نہایت سادہ بلکہ فقیرانہ تھی۔ وہ لوگوں کی رائے سے بے پرواہو کر ایک بوسیدہ اور شکن آلود چوغے میں برہنہ پا گھومتا پھرتا اور اپنی تعلیمی و مربیانہ سرگرمیوں میں مصروف رہتا تھا۔ اسے سردی کی پروا ہوتی تھی اور نہ گرمی کی۔ بھوک پیاس کی شدت بھی اس کے عزم و ارادے میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ انتہائی سخت جان واقعہ ہوا تھا۔ اس نے وقت کے نظام پر تنقید تو کی لیکن سیاست میں جو ایتھنز کے اس دور میں زندگی کا اہم ترین شعبہ تھا، کبھی حصہ نہیں لیا۔ وہ تطہیر و انقلاب فکر ہی کے لیے کوشاں رہا۔ اس کو اپنے ارادہ و عمل پر پورا اختیار حاصل تھا۔ اس کا دعوی تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے حکم الٰہی کے مطابق ہے۔ اس پر ایسی حالت بھی طاری ہو جاتی تھی کہ وہ بعض اوقات ساری ساری رات اور سارا سارا دن کیفیت بے خودی میں گزار دیتا تھا، اور اس حالت میں اگر کوئی اس سے مخاطب ہوتا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔

مروجہ مابعد الطبیعیاتی عقائد، سیاسی نظریات اور حکومتی ڈھانچے کی مخالفت کی بنیاد پر اسے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا جس کی کارروائی کے دوران اس نے اپنے کسی نظریے سے انحراف کیا اور نہ اس کی کوئی تاویل پیش کی۔ چنانچہ اسے سزائے موت دی گئی اور وہ علامہ اقبال کے درج ذیل شعر کے مصداق پوری آمادگی اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ زہر کا پیالہ پی گیا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چون مرگ آید تبسم بر لب اوست

ہم نے سطور بالا میں توحید اور اس کے مضمرات کے سلسلے میں سقراط کی طرف جن خیالات کی تنسیب کی ہے مناسب ہے کہ ،اگرچہ یہ بات طوالت کلام کا باعث تو ہوگی،ان کی تائید میں اسی تواتر سے مغربی علمی حلقوں کے خیالات بھی پیش کر دیئے جائیں:

1- ا۔ توحید، معاد اور وحی (والہام) کا اعتقاد

2- ڈبلیو این ویچ کی ترتیب کردہ تاریخ عالم (History of the World) میں تحریر ہے:

"Like all great teachers, Socrates brought home to men the sense of sin, of their own utter inadequacy compared with the absolute and perfect goodness of God. He felt always that his work was a divine mission, and the cause of truth and beauty and goodness was God's cause...."

تمام بڑے معلمین (اخلاق) کی طرح سقراط نے انسانوں کو گناہ کا شعور اور اللہ تعالیٰ کی مطلق اور کلی خیر کے مقابلے میں اپنے قطعی عجز کا احساس دلایا۔ وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا کام یزدانی ہدایت کے تحت مقصد کا حامل ہے اور سچائی، خوبی اور اچھائی کے اصول اللہ (کے دیئے ہوئے) اصول ہیں۔

" His last hours in his cell were passed in a discussion with his intimate friends on the survival of the human soul after death..." (Page 132).

جیل کی کوٹھڑی میں اس کے آخری لمحات اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ موت کے بعد انسانی روح کی بقا کی بحث میں گزرے۔

ڈاکٹر ول ڈیورانٹ (Dr.Will Durant) اپنی تصنیف (The Story of Philosophy) میں سقراط کے متعلق لکھتا ہے:

"He had his own religious faith: he believed in one God, and hoped in his modest way that death would not quite destroy him." (Page 7).

وہ اپنا (مخصوص) مذہبی اعتقاد رکھتا تھا۔ وہ ایک خدا کے عقیدے کا حامل تھا، اور اپنے منکسرانہ انداز میں یہ امید رکھتا تھا کہ موت اس کو بالکل ختم نہیں کر دے گی۔

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (History of Western Philosophy) میں سقراط کے متعلق یوں رقمطراز ہے:

"The Apology gives picture of a man of a certain type: a man very sure of himself, high minded, indifferent to worldly success, believing that he was guided by a divine voice, (Page 108).

(افلاطون کی تصنیف) اپالوجی خاص قسم کے ایک شخص کی واضح تصویر کشی کرتی ہے: ایک ایسا انسان جو اپنی سچائی پر یقین رکھتا تھا، بلندی خیال کا مالک تھا، دنیوی کامیابیوں سے بے نیاز تھا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایک یزدانی آواز اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۲۷ میں سقراط (Socrates) کے عنوان کے تحت مقالہ نویس لکھتا ہے:

"God's existence is shown, he held, not only by the providential order of nature and the universality of the belief in him but also by warnings and revelations given in dreams, signs and oracles. The soul of man partakes of the Divine,....." (Page 485).

اللہ تعالیٰ کے وجود کی شہادت صرف اس کائنات کے خدائی انتظام اور اس کی ہستی پر عالمی عقیدہ ہی سے نہیں ملتی بلکہ ان انتباہات اور الہامات سے بھی ملتی ہے جو خوابوں، نشانیوں اور وحی کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔ (نیز) انسانی روح پر یزدانی پرتو ہوتا ہے۔

آگے چل کر یہی مقالہ نویس لکھتا ہے:

"He believed himself charged with the mission from God to make his fellowmen aware of their ignorance and of the supreme importance of knowledge of what is for the soul's good. This is proved by his declaration that he was more than ready to face instant death rather than to neglect his commission" (Page 486).

اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر اس مقصد کے حصول کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کو ان کی جہالت اور اس بات کے علم سے آگاہ کرے جو تسویہ روح کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بات اس کے اس اعلان سے ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مفروضہ مقصد کو نظر انداز کرنے کی بجائے فوری موت کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

رسل لکھتا ہے:

"At last he describes the fate of souls after death: the good to heaven, the bad to hell, the intermediate to purgatory." (Page 163).

ترجمہ: آخر کار وہ موت کے بعد روح کے انجام پر روشنی ڈالتا ہے: نیک (لوگ) جنت میں، عاصی جہنم میں اور درمیانے درجے کے لوگ مطہر (اعراف) میں جائیں گے۔

۲-یونانی دیوتاؤں کے وجود کا انکار

اپنے دور عروج میں یونانی تمدن کے مذہبی واعتقادی افکار اور کائناتی نظام وانصرام کے سلسلے کے تصورات اولمپس کے پہاڑی سلسلے میں آباد دیوتاؤں کی قدرت و قوت کے محور پر گھومتے تھے۔ سقراط نے ایسے نظریات کی پرزور تردید کی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مذکورہ بالا مقالے میں تحریر ہے:

Socrates was clearly a man of deep piety with the temperament of a mystic. He regarded mythology, with its foolish or immoral tales about gods as a mere invention of the poets." (Page 485).

سقراط واضح طور پر ایک انتہائی پارسا انسان تھا، جس کا مزاج صوفیانہ تھا۔ وہ (یونانی) دیومالا کو، دیوتاؤں کے متعلق اس کی احمقانہ اور منافی اخلاق داستانوں کے ساتھ، محض شاعرانہ اختراع تصور کرتا تھا۔

ڈاکٹر ڈیورانٹ اپنی اس سے پہلے مذکورہ کتاب میں ایتھنز میں تعمیر اخلاق اور ریاست کے تحفظ کے سوالات کا تذکرہ کرتے ہوئے سقراط کے موقف کے متعلق لکھتا ہے:

"It was his reply to these questions that gave Socrates death and immortality. The older citizens would have honoured him had he tried to restore the ancient polytheistic faith; if he had led his band of emancipated souls to the temples and the sacred groves, and bade them sacrifice again to the gods of their fathers. But he felt that was a hopeless and suicidal policy,..."(Page 7).

یہ ان سوالات کا جواب تھا، جس نے سقراط کو موت اور حیات جاوداں عطا کی۔ بزرگ شہری اس کی عزت افزائی کرتے بشرطیکہ وہ قدیم تعدد الٰہ پر مبنی مذہب کو واپس لانے کی کوشش کرتا (اور) وہ اپنے (متبعین)

کے گروہ کی ان (توہمات سے) آزاد ہو چکی ہوئی روحوں کو (روایتی) عبادت گاہوں اور درختوں کی جھنڈوں پر مشتمل مقدس (سمجھی جانے والی) جگہوں پر لے جاتا، اور انہیں حکم دیتا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے دیوتاؤں کی خدمت میں قربانیاں پیش کریں۔ لیکن وہ (سقراط) محسوس کرتا تھا کہ یہ بے سود اور خودکشی کرنے کے مترادف طریقہ تھا۔

۳۔ مروجہ جمہوریت کی مخالفت

- ڈاکٹر ڈیورانٹ اس سلسلے میں سقراط کے نظریے کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"And as for the state, what could have been more ridiculous than this mob-led, passion-ridden democracy, this government by a debating society, this precipitate selection and dismissal and execution of generals, the unchosen choice of simple farmers and tradesmen, in alphabetical rotation, as members of the court of the land?" (Page 7).

اور جہاں تک ریاست کا تعلق ہے، یہ عوامی بھیڑ کی قیادت، جذبات سے مغلوب جمہوریت، یہ پر از نزاعات مجلس کی حکومت، یہ جرنیلوں کا عاجلانہ چناؤ، سبکدوشی اور قتل، یہ عدالتی ارکان کے طور پر سادہ ذہن کسانوں اور تجار کا حروف تہجی کے مطابق بے محابہ تقرر ـــــ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

سقراط کے متعلق برٹینکا کے مقالے میں بھی ایتھنز میں مروجہ جمہوریت کے متعلق اس کے مخالفانہ اظہار خیال پر یوں لکھا گیا ہے:

"Socrates was, in fact, suspected of using his great abilities and gifts to pervert his younger associates from loyalty to the principles of democracy... (Page 486)".

در حقیقت سقراط پر اپنی عظیم قابلیتوں اور صلاحیتوں کو نوجوان ساتھیوں کو جمہوریت کے اصولوں کے ساتھ وابستگی سے روکنے کے لیے استعمال کرنے کا گمان کیا گیا تھا۔

۴۔ نوجوانوں کی ذہنی تربیت کی کوشش

سقراط کو سزائے موت دینے کے لیے جن جرائم کی فہرست تیار کی گئی تھی اس میں نوجوانوں کو روایتی نظریات اور مروجہ نظام سے منحرف کرنے کا جرم نمایاں مقام رکھتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈیورانٹ لکھتا ہے:

"Across two thousand three hundred years we can yet see his ungainly figure, clad always in the same rumpled

tunic, walking leisurely through the agora, undisturbed by the bedlam of politics, button-holding his prey, gathering the young and the learned about him, luring them into some shady nook of the temple porticos and asking them to define their terms. (Page 5)

دو ہزار تین سو سال گزرنے پر ہم اب بھی اس کی بھدی شبیہہ کو ہمیشہ ایک ہی شکن آلود چوغے میں لپٹا ہوا (بھرے) بازار میں سجے سجے سیاست کے غل غپاڑے سے بے نیاز اپنے شکار کو قابو کیے ہوئے، نوجوانوں اور فضلاء کو اپنے ارد گرد جمع کر کے انہیں کسی عبادت گاہ کے سایہ دار برآمدے کے کونے میں جمع کرنے اور ان کے خیالات کی وضاحت چاہتے ہوئے (چشم تصور سے) دیکھ رہے ہیں۔

۵— فقر اور سخت جانی

اوپر کے اقتباس سے بھی لباس کے معاملے میں سقراط کی سادگی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (History of Western Philosophy) میں لکھتا ہے:

"He was always dressed in shabby old cloths and went barefoot everywhere. His indifference to heat and cold, hunger, and thirst, amazed everyone." (Page 110).

وہ ہمیشہ فرسودہ اور پرانے کپڑوں میں ملبوس ہوتا اور ہر جگہ برہنہ پا جاتا تھا۔ گرمی اور سردی، بھوک اور پیاس سے اس کی بے نیازی ہر ایک کو ورطہ حیرت میں ڈالتی تھی۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ اپنی فوجی ملازمت کے دوران وہ شدید سردی میں عام کپڑوں میں برف پر برہنہ پا چلتا پھرتا تھا، جبکہ دوسرے فوجی اپنے جسموں اور پاؤں کو گرم کپڑوں اور جوتوں سے محفوظ کرنے کا پورا اہتمام کرتے تھے۔

اسی سلسلے میں برٹینکا کے مقالے میں، جس سے اس سے قبل اقتباس دیئے جا چکے ہیں، تحریر ہے:

"The poverty in which his mission had involved him and the austerity of rule of life that it entailed were notorious. Summer and winter, Socrate's coat was the same, he had neither shoes nor shirt." (Page 486).

جس افلاس میں اس کے مقصد (زندگی) نے اس کو مبتلا کر دیا تھا اور زندگی میں جس سادگی کے انداز کا (یہ مقصد) مطالبہ کرتا تھا وہ ایک مشہور (و معروف) بات تھی۔ موسم گرما و سرما میں اس کا ایک ہی کوٹ ہوتا تھا۔ اس کے پاس جوتا تھا نہ قمیض۔

معلوم ہوتا ہے سقراط نے یہ کیفیت اپنے اوپر طاری کر رکھی تھی۔ یا حصول مقصد میں انہماک اسے اکتساب رزق کے لیے مناسب مہلت ہی نہیں دیتا تھا۔ ورنہ وہ اسراف کے بغیر اپنی جائز ضروریات زندگی سے استفادہ کرنے سے لوگوں کو نہیں روکتا تھا۔ چنانچہ رسل لکھتا ہے:

"…...his asceticism is of a moderate and gentlemanly sort. He does not say that the philosopher should wholly abstain from ordinary pleasures, but only that he should not be a slave to them." (Page 156).

اس کی ریاضت (یا تیاگ) میانہ روی اور شریفانہ قسم کی تھی۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ فلسفی (اہل علم) عام سہولتوں (سے استفادہ کرنے) سے مکمل طور پر گریز کرے۔ بلکہ (اس کا کہنا ہے کہ) صرف اسے ان کا قیدی نہیں بن جانا چاہئے۔

۶۔ اللہ کی طرف سے بعثت کا دعویٰ

برٹرینڈ رسل افلاطون کی کتاب اپالوجی (Apology) کے حوالے سے سقراط کے متعلق لکھتا ہے:

Socrates was clearly a man of deep piety with the temperament of a mystic. He regarded mythology, with its foolish or immoral tales about gods as a mere invention of the poets." (Page 485).

وہ فوج میں بھی (ملازم) رہا ہے۔ اور اپنے مقام تعیناتی پر فرض منصبی انجام دیتا تھا جیسا کہ اسے حکم دیا جاتا۔ اب (اس کے کہنے کے مطابق) "اللہ نے مجھے فلسفی (داعی) کا یہ فریضہ انجام دینے کا حکم دیا ہے کہ میں اپنے اور دوسرے انسانوں کے باطنوں کا احتساب کروں۔"

اور اب اپنے فرض سے روگردانی کرنا ایسے ہی شرمناک ہوگا جیسے جنگ کی حالت میں تھا۔۔۔۔ (سقراط نے کہا) ایتھنز کے لوگو! میں تمہاری عزت اور تم سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن میں تمہارا نہیں اللہ کے حکم کا اتباع کروں گا۔ اور جب تک میرے اندر زندگی اور قوت ہے میں خود اس پر عمل پیرا ہونے اور ہر اس شخص کو جس سے میری ملاقات ہوگی فلسفے (ہدایت) کا درس دینے کے عمل اور اس کی تلقین کرنے سے باز نہیں آؤں گا ۔۔۔۔ جان لو کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

جس عدالت نے سقراط کو سزائے موت دی اس کے سامنے بیان دیتے ہوئے اس نے کہا:

تم نے مجھے کئی بار اور متعدد جگہوں پر کہتے سنا ہے کہ ایک الہام یا (ہدایت کی) نشانی میرے پاس آتی ہے۔ اور یہ الوہیت (کی نشانی) ہے۔

۷۔ کیفیات بے خودی

سقراط پر ایسی کیفیات طاری ہو جاتی تھیں جن کی وجہ سے اپنے ماحول سے اس کے باطن کا رشتہ منقطع ہو جاتا تھا۔ چنانچہ رسل ''مغربی فلسفے کی تاریخ'' میں لکھتا ہے:

سقراط ادراکی حالت وجد (و بے خودی) میں بھی مبتلا ہو جایا کرتا تھا۔ کم از کم ایسا واقعہ جو ایک دفعہ اس وقت رونما ہوا جبکہ وہ فوجی ملازمت میں تھا اس کی وضاحت کرتا ہے:

ایک روز صبح کے وقت وہ کسی مسئلے پر سوچ رہا تھا، جس کو وہ حل نہ کر سکا۔ وہ اس (سعی تفکر) کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ علی الصبح سے دوپہر تک غور کرتا رہا۔ وہ ایک جگہ غیر متحرک انداز سے اپنی سوچ میں ڈوبا رہا۔ اور دوپہر کے وقت (لوگوں کی) توجہ اس کی طرف منعطف ہوئی۔ اور متحیر ہجوم کے ذریعے یہ افواہ پھیل گئی کہ سقراط طلوع صبح سے کھڑا کسی بات پر تفکر کر رہا ہے ۔۔۔۔۔ وہ وہاں آئندہ صبح تک کھڑا رہا، اور روشنی کے نمودار ہونے پر اس نے سورج کی عبادت کی اور اپنے راستے پر چل پڑا۔

اس اقتباس کے آخری حصے میں سورج کی عبادت کا جو ذکر ہے وہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ سقراط بالاتفاق موحد تھا۔ وہ ایک خدا کو خالق و مدبر کائنات مانتا تھا۔ ہم اس سلسلے میں مختلف مغربی مصنّفین سے حوالے دے چکے ہیں، اور آئندہ مسلمان اہل علم کی آراء بھی پیش کریں گے۔ کہیں ایک روایت بھی موجود نہیں کہ وہ سورج کی طرف مقام الوہیت منسوب کرتا ہو۔ بلکہ وہ خود، اس کا شاگرد افلاطون اور افلاطون کا شاگرد ارسطو یہ تینوں ہی جنہیں مغرب میں آسمان علم کے تین تابندہ ترین ستارے سمجھا جاتا ہے، موحد تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح کے وقت طلوع شمس کے بعد جب ارسطو نے اپنے مراقبے (یا جو کیفیت بھی وہ تھی) کی حالت سے خروج کیا اور عبادت کی، تو دیکھنے والوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ وہ سورج کی عبادت کر رہا ہے۔ مزید برآں سمپوزیم جس سے رسل نے یہ حوالہ لیا ہے زینو فون (Xenophon) کی تصنیف ہے اور یہ شخص ناقابل اعتماد تصور کیا جاتا ہے۔ سقراط کے متعلق اس کے اور افلاطون کے خیالات میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، اگرچہ دونوں کو ایک ہی دور میں اس کی مصاحبت کا موقعہ ملا۔

رسل نے اس کے متعلق یوں لکھا ہے:

زینوفون، جوایک فوجی تھاوافر عقل سے نہیں نوازا گیا تھا۔

پھر لکھا ہے:

ایک ہوشیار (یاذہین) آدمی کے الفاظ کے متعلق ایک احمق شخص کی روایت کبھی درست نہیں ہوسکتی۔

برٹینیکا میں ارسطو کے متعلق مقالہ نگار زینوفون کے متعلق لکھتا ہے:

قوت متخیلہ اور استعداد تفکر میں اس کی مسلمہ خامیاں اسے ایک عبقری فلسفی کی قابل اعتماد ترجمانی کرنے کا حق دار نہیں بناتی۔

سقراط کی بے خودی سرمستی، کیفیت استغراق ووجد اور مراقبے میں چلے جانے کی کیفیات کو تو بہت سے دوسرے مصنّفین نے بھی بیان کیا ہے لیکن سورج کی پرستش کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا۔ برٹینیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

اس بات کی کثرت سے شہادت موجود ہے کہ سقراط نمایاں طور پر صوفیانہ مزاج کا مالک تھا۔ افلاطون اس کی حیرت انگیز استغراقی کیفیات روایت کرتا ہے جن میں سے ایک میں وہ مسحور کن انداز سے خندق میں چوبیس گھنٹے تک کھڑا رہا۔ اس فلسفی کی ملکوتی نشانیوں کے حالات اسی صورتحال کی تصدیق کرتے ہیں۔ افلاطون کے مطابق یہ ایک ''آواز'' تھی جو سقراط بچپن سے اکثر سنا کرتا تھا۔

۸۔ مقدمہ اور سزائے موت

جیسا کہ اس سے قبل نقل کیے گئے تمام اقتباسات سے واضح ہوتا ہے سقراط ایتھنز میں زندگی کے تمام شعبوں میں مروجہ فکر و عمل سے اختلاف رکھتا تھا۔ وہ اس اختلاف کا برملا اعلان ہی نہیں کرتا تھا بلکہ جن لوگوں سے بھی۔۔۔۔۔ خصوصاً نوجوان طبقہ۔۔۔۔۔ اس کا رابطہ ہوتا تھا وہ ان سے تفصیلی گفتگو کر کے اپنے نظریات کا پرچار کرتا اور اپنے مادی اور دنیوی مفادات اور آسائشوں سے یکسر صرف نظر کر کے اپنے دعوتی کام میں رات دن ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ ذہین اور حصول علم کا شوق رکھنے والے افراد کو وہ اپنی توجہات کا مرکز بناتا۔ اس طرح وہ عوام کالانعام اور حکمرانوں کے قلوب میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ چنانچہ اس پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈبلیو این ویچ کی عالمی تاریخ کے مطابق:

"His deep religious faith brought him into conflict with the official state religion, he rejected everything in the traditional stories that was inconsistent with God's goodness. In 399 B.C. he was prosecuted for impiety, and for corrupting the minds of the young by upsetting their traditional morality, the Athenian people demoralised by a generation of bitter war, committed the greatest crime in its history by condemning him to death on these charges. (History of the World page. 132).

اس کا مضبوط مذہبی عقیدہ اس کے سرکاری ریاستی مذہب سے ٹکرانے کا باعث بنا۔ روایتی قصوں میں ہر وہ بات جو اللہ تعالیٰ کی صفت خیر سے متناقض تھی اسے اس نے مسترد کر دیا۔ ۳۹۹ ق م میں اس پر بد دینی (معصیت) اور نوجوانوں کے ذہنوں کو روایتی اخلاقیات سے منحرف کرنے کے الزامات کی بنیاد پر مقدمہ چلایا گیا۔ ایتھنز کے لوگوں نے ایک نسل پر پھیلی ہوئی تلخ جنگ سے پیدا شدہ مایوسی کے زیر اثر ان الزامات کی بنا پر اس کو سزائے موت دے کر اپنی تاریخ کا سب سے بڑا جرم کیا۔

سقراط نے اس مقدمہ کو کوئی اہمیت دی اور نہ اسے کوئی سنجیدہ معاملہ تصور کیا، بلکہ اس کی کارروائی میں حقارت آمیز ادائے بے نیازی سے حصہ لیا۔ انسائکلوپیڈیا برٹینیکا کا مقالہ نویس لکھتا ہے:

"Socrates himself treats the whole matter with contempt. His defence consists in narrating the facts of his past life, which had proved that he was equally ready to defy the populace and the thirty in the cause of right and low and in insisting on the reality of his mission from God and his determination to discharge it even at the cost of life. (Vol. 27, Page 486)''.

اس کے نزدیک حصول سعادت کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ رسل لکھتا ہے:

"In the final passage, where he considers what happens after death, it is impossible not to feel that he firmly believes in immortality, …. he has ... no doubt that his life in the next world will be a happy one." (History of Western Philosophy, Page 109).

اپنے (بیان کے) آخری ٹکڑے میں اُس نے موت کے بعد پیش آنے والے حالات پر جو گفتگو کی اس سے یہ محسوس نہ کرنا ناممکن ہے کہ وہ انسان کی حیات ابدی کا قائل تھا۔۔۔اس کو کوئی شک نہیں کہ وہ عالم آخرت میں خوشی سے ہمکنار ہوگا۔

برٹینکا میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"... as Plato argued in the Phaedo, Socrates believed in the soul's immortality." (Vol.27, Page 485).

جیسا کہ افلاطون (اپنی تصنیف) فیڈو میں بحث کرتا ہے سقراط روح کے لافانی ہونے کا عقیدہ رکھتا تھا۔

انعقاد معاد پر یہی وہ پختہ ایمان تھا جس کی بدولت سقراط نے پوری استقامت قلبی کے ساتھ سزائے موت کا سامنا کیا۔اس کے دوستوں نے سزا کے نفاذ سے قبل اس کے فرار ہو جانے کا انتظام کیا، لیکن اس نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ڈاکٹر ڈیورانٹ لکھتا ہے:

"His friends came to his prison and offered him an easy escape; they had bribed all the officials who stood between him and liberty. He refused.... "Be of good cheer," he told his sorrowing friends, "and say that you are burying my body only ("The Story of Philosophy" Pages 9-10).

اس کے دوست جیل میں اس کے پاس آئے اور اسے آسانی سے فرار ہونے کی پیش کش کی۔انہوں نے ان تمام افسران کو رشوت دے دی تھی جو اس (سقراط) کے اور آزادی کے مابین رکاوٹ تھے۔اس (سقراط) نے انکار کر دیا۔۔۔۔اس نے اپنے غمگیں دوستوں سے کہا "خوب خوش ہو جاؤ" اور سمجھو کہ تم صرف میرے جسد (خاکی) کی تدفین کر رہے ہو۔"

سقراط اس سارے معاملے (یعنی مقدمے کی کارروائی) کو بنظر حقارت دیکھتا تھا۔اس کا دفاع اپنی سابقہ زندگی کے واقعات بیان کرنے پر مشتمل تھا جو ثابت کرتے ہیں کہ وہ یکساں طور پر (ایتھنز کی) آبادی اور تیس (مستبد حکمرانوں) کی حق اور قانون کی خاطر، اور اللہ کی طرف سے دیئے گئے مقصد کی حقیقت پر اصرار اور اپنی جان کی قربانی دینے کی قیمت پر بھی اس پر عمل پیرا ہونے کے عزم کے تحت مخالفت کرنے کے لیے تیار رہا ہے۔

پھر اسی صفحے پر لکھا ہے:

"Socrates himself forced the issue by refusing at any stage to do anything involving the least shade of compromise."

سقراط نے کسی مرحلے پر بھی ایسی بات سے گریز کر کے جس سے (اصولوں پر) کم سے کم مصالحت کرنے کا معمولی سا شائبہ پایا جاتا ہو، متنازع فیہ مسئلے کو اس کے منطقی نتیجے پر پہنچانے کی خود کوشش کی۔

سقراط کو اپنے جذبات پر پورا اختیار حاصل تھا۔ اپنے نظریات کی خاطر نذرانہ زندگی پیش کرتے ہوئے اس کے ذہن و قلب کے کسی گوشے میں خوف وہراس کا معمولی سا شائبہ بھی نہ پایا جاتا تھا۔ اخروی زندگی پر اسے یقین کامل حاصل تھا، جیسا کہ ہم نے "اسلامی فکر" کے باب میں مسئلہ ارتقاء کے ضمنی عنوان کے تحت لکھا ہے کہ موجودہ مادہ پرست مغربی مفکرین کی رائے یہ ہے کہ انسانی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہی ہو جائے گا لیکن سقراط موت کے بعد آنے والی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتا تھا اور اس کے اندر حاصل ہونے والی ممکنہ کامرانیوں اور ارتقائی منازل کے تصور نے سزائے موت کو آسان بنا دیا تھا۔

پروفیسر ٹائن بی نے مطالعہ تاریخ (Study of History) کی جلد اول (تلخیص) کے صفحہ ۳۱۱ پر اس سزائے موت کو قانونی قتل (Judicial Murder) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

ہم نے سقراط کے نظریات کے سلسلے میں عمداً طول کلام سے کام لیا ہے۔

اس کی دو اہم وجوہ ہیں۔

ایک تو یہ کہ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تصور توحید انسان کے فکری ارتقاء کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کا مرہون منت ہے۔ سقراط ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوا جس کے اندر تعدد الٰہ کے عقیدے کی جڑیں اس قدر مضبوط تھیں کہ اسے عقیدہ توحید پیش کرنے کی پاداش میں سزائے موت دی گئی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مغرب کی تاریخ فلسفہ میں اس کا مقام فلاسفہ میں سرفہرست ہے۔ ہم نے مغربی مورخین و ناقدین کی تحریروں کے حوالہ جات ہی سے اس کے عقائد و توحید و معاد اور عمرانی نظریات کو تفصیلاً پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے نظریات اور موجودہ مادہ پرست مغرب کے مابعد الطبیعیاتی اور تمدنی نظریات میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہم نے جو حوالہ جات پیش کیے ہیں ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ہر

بات اللہ تعالیٰ کے حکم کے حوالے سے کرتا ہے، اور مغرب میں ہر بات اللہ کے وجود کو نظر انداز کر کے کی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے مغربی دہریت کا نمائندہ برٹرینڈ رسل سقراط پر بہت بگڑا ہے اور اس پر ایسے الفاظ میں مخالفانہ تنقید کی ہے جو بالکل نامناسب ہے۔ وہ کہتا ہے:

"Unlike some of his predecessors, he was not scientific in his thinking, but was determined to prove the universe agreeable to his ethical standards. This is treachery to truth, and the worst of philosophic sins. As a man he may believe him admitted to the communion of saints; but as a philosopher he needs a long residence in a scientific purgatory." (History of Western Philosophy, Page 164).

ترجمہ: اپنے پیش روؤں کے طریقے کے برعکس وہ اپنی سوچ میں سائنٹیفک طریقے کو ملحوظ نہیں رکھتا تھا، بلکہ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کائنات (کی حقیقت) کو اپنے اخلاقی معیارات کے مطابق ثابت کرے۔ یہ دیانت کے ساتھ غداری اور بدترین فلسفیانہ گناہ تھا۔ شخصی حیثیت سے ہم اس کے ولیوں کے گروہ میں شامل ہونے کا عقیدہ رکھ سکتے ہیں، لیکن ایک فلسفی کی حیثیت سے اس کو سائنٹیفک مظہر میں لمبی سکونت کی ضرورت ہے۔

اس اقتباس کے اندر جو اظہار نفرت اور تضاد بیانی ہے وہ محتاج وضاحت نہیں۔

سقراط نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ عین ممکن ہے اس نے اپنے نظریات کی اشاعت صرف گفتگوؤں اور خطبات کے ذریعے ہی کی ہو جن کی ترجمانی اس کے شاگرد اور معتقد افلاطون نے تفصیل سے کی ہے۔ اسی لیے سقراط کے متعلق جتنی تصانیف منصہ شہود پر آئی ہیں ان کا مواد افلاطون کی تصانیف سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ ایک یہ امکان بھی ہو سکتا ہے کہ اس دور میں پرنٹنگ پریس تو تھا نہیں، ہر تصنیف یا کتاب کا ہر نسخہ قلم ہی کے ذریعے تحریر کیا جاتا تھا۔ اگر سقراط کی کوئی کتاب ہو گی بھی تو عین ممکن ہے اسے اس کو سزائے موت دینے والی حکومت نے تلف کروا دیا ہو۔ اگر انجیل، تورات، اوستا کو سند کے لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ، موسیٰ اور زرتشت تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔

جیسا کہ ہم نے ''پس منظر'' کے باب میں بیان کیا ہے، اور صحف ابراہیمؑ جن کا قرآن میں تذکرہ ہے آج دنیا میں موجود نہیں تو سقراط کی کسی کتاب کا تلف ہو جانا خارج از امکان نہیں ہو سکتا۔ یونانی تہذیب کے عروج کے دوران استبدادیت کا یہ عالم تھا کہ سقراط کی سزائے موت کے بعد افلاطون اور اس کے بعض دوسرے ساتھی ایتھنز کو خیر باد کہہ گئے۔ اس کے بعد ۳۹۹ق م سے ۳۸۷ق م تک یعنی بارہ برس تک افلاطون مصر، سسلی، اٹلی اور بعض روایات کے مطابق شام اور ہندوستان کے علاقوں میں گھومتا پھرا۔ جس حکومت یا نظام کے تحت سقراط کے شاگردوں کو اپنی جانوں کا خطرہ ہو وہ اول الذکر کی کسی قلمی تحریر کو آسانی سے نابود کر سکتا تھا۔

نیز ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ سقراط کوئی نبی یا رسول تھا، کیونکہ ہم انہی حضرات کو تیقن کے ساتھ سلسلہ انبیاء سے منسلک کر سکتے ہیں جن کا قرآن میں تذکرہ ہے۔ البتہ قرآن میں یہ مذکور ہے کہ اللہ نے تمام اقوام کی طرف انبیاء و رسل مبعوث کیے۔ لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شرک سے بھرے ہوئے معاشرے میں آنکھ کھولنے والا کوئی اپنی عقل و خرد کے ذریعے توحید اور معاد کے سلسلے میں ان نظریات کا جنہیں سقراط نے یقین کامل کے ساتھ پیش کیا اور جن کی خاطر اس نے اپنی جان کی بنتے کھیلتے قربانی دی، اسی صورت میں شعور حاصل کر سکتا ہے جب یا تو اس کی طرف وحی آتی ہو یا وہ کسی صاحب وحی کی تعلیمات سے مستفید ہوتا ہو۔ قرآن میں پہلی صورت کی مثالیں انبیاء و رسل کی شکل میں ملتی ہیں اور دوسری شکل کی مثال حکیم لقمان کی شخصیت میں نظر آتی ہے۔

آخر میں ہم سقراط کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے چند فقرے نقل کرتے ہیں:

''وہ وقت کے اصنامی عقائد سے کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکا تھا۔ اس کا توحیدی تصور تجسم اور تشبہ کی تمام آلودگیوں سے پاک ہو کر ابھرا۔ اس کی بے لوث خدا پرستی کا تصور اس درجہ بلند تھا کہ وقت کے عام مذہبی تصورات اسے سر اونچا کر کے بھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔'' (ام الکتاب صفحہ ۲۱۲)

اس کے بعد موصوف نے لکھا ہے:-

''ایسی بے پردہ تعلیم وقت کے دار و گیر سے بچ نہیں سکتی تھی اور نہ بچی۔ لیکن سقراط کی اولوالعزم روح وقت کی کوتاہ اندیشیوں سے مغلوب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے ایک ایسے صبر و استقامت حق کے ساتھ جو

صرف نبیوں اور شہیدوں ہی کے اندر گھر بنا سکتا ہے۔ زہر کا جام اٹھایا اور بغیر کسی تلخ کلامی کے پی لیا۔''
(ایضاً صفحہ ۲۱۳)

اخناتون اور توحید

دوسری ایسی شخصیت جس کا ہم یہاں تذکرہ کرنا چاہتے ہیں اور جس کے آباؤاجداد اور ملک کی ساری آبادی شرک میں مبتلا تھی اور جس نے ان حالات میں وفعتاً پوری قوت سے توحید کا بے آمیز تصور پیش کر دیا، اخناتون کی ہے۔ اخناتون (Akhnaton) چودھویں صدی قبل مسیح میں مصر کا فرعون (اس دور کے مصری بادشاہ اسی نام سے پکارے جاتے تھے) تھا۔ وہ ۱۳۷۹، اور بعض کے مطابق ۱۳۷۵ ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ اس دور میں دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ سورج کو رب الارباب تصور کیا جاتا تھا اور اس کی عبادت کے لیے معابد کی فراوانی تھی۔ اس کے ساتھ کثیر التعداد پیشواؤں پر مشتمل مذہبی طبقہ وجود میں آچکا تھا جو عوام میں بہت اثر رکھتا تھا۔

آثاریات کے بعض شواہد کے مطابق اخناتون نے مسند حکومت پر بیٹھنے کے پانچویں سال کے دوران توحید کا عقیدہ اپنایا اور اس کی پوری یکسوئی کے ساتھ تبلیغ شروع کر دی۔ غیر اللہ کی پرستش کی ہر صورت کی حوصلہ شکنی کرنے میں منہمک ہو گیا۔ مذہبی اجارہ دار اور پیشہ ور طبقہ نے اس کی مخالفت میں کمر ہمت باندھ لی۔ توحید کو اپنانے کے سلسلے میں اس کا ذہن جن مراحل ارتقاء سے گزرا اس کے متعلق اختلافی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس دور کی تاریخ کی تدوین ماضی قریب میں آثاریات (Archaeology) کے انکشافات کے ذریعے سے ہوئی ہے، اور اس طریقہ تدوین تاریخ میں روایات اور سند پر نہیں بلکہ کھنڈرات سے برآمد ہونے والے آثار کی تعبیر (Interpretation) پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ ذریعہ نظریات کے باریک فرق کو متعین کرنے کے لیے یقینی ثابت نہیں ہو سکتا۔ البتہ کھنڈرات کی کھودائی سے معبدوں میں جس قسم کے بت ملتے ہیں ان سے طریقہ ہائے عبادت کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

اخناتون کے موحد ہونے کا یقینی علم ان کتبوں سے حاصل ہوا ہے جو مصری آثاریات سے ملے ہیں۔ ہم ذیل میں ایک کتبے کی عبارت نقل کرتے ہیں جسے اس دور کی زبان سے منتقل (Decipher) کر کے انگریزی کا جامہ پہنایا گیا ہے اور جسے اخناتون کا ترانہ حمد باری تعالیٰ قرار دیا گیا ہے:

"How manyfold are thy works!
They are hidden from before us,
O sole God, whose power no other possesseth.
Thou didst create the earth according
to thy heart
while thou wast alone:
Men, all cattle, large and small,
All that are upon the earth,
that go about upon their feet;
All that are on high,
that fly with their wings.
The foreign countries, Syria and Kush,
the land of Egypt;
thou settest every man into his place,
thou suppliest their necessities,
Everyone has his possessions,
And his days are reckoned.
("History of the World" Edited by M.N. Werch: Page 47).

تمہارے کام کثیر التعداد ہیں
وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں
اے بلاشرکت غیرے خدا! جس کی طاقت میں
اس کا کوئی ساجھی نہیں
تونے اپنی مشیت کے مطابق زمین کی تخلیق کی
جبکہ تو تنہا تھا
(تونے پیدا کیا) انسانوں، چھوٹے بڑے جانوروں کو
(اور) سب کچھ جو زمین پر ہے
جو چلتا پھرتا ہے اپنے اپنے پاؤں پر
(نیز) جو بھی فضا میں
اپنے پروں کے سہارے اڑتے پھرتے ہیں

شام اور کش کے بیرونی ممالک
اور سرزمین مصر (کو بھی تو نے یہ وجود بخشا)
تو ہی ہر انسان کو اس کا موزوں مقام بخشتا ہے
تو ان کی ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے۔
ہر کوئی اپنے املاک رکھتا ہے
حالانکہ اس کے ایام حیات گنے چنے ہیں

اخناتون نے شاہی محل میں آنکھ کھولی۔ وہ ہر جہت سے اشرا کی عقیدے سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ پوری طرح شرک میں ملوث تھے۔ مرنے، جینے، شادی، بیاہ اور عبادت کی تمام صورتوں کی غیر اللہ سے وابستگی تھی۔ ان حالات میں شاہی محل میں تعیش کی زندگی بسر کرنے والے ایک بادشاہ کی طرف سے اچانک اللہ تعالیٰ کا ایسا تنزیہی تصور پیش کیا جانا اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے سوا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس میں انسانی فکری ارتقاء کا بھی کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

اخناتون نے جہاں تصور توحید کو پھیلانے میں پورے جوش و قوت کا مظاہرہ کیا وہیں اس نے ایک تو داخلی انتظام میں ملکی اصلاح احوال کے لیے اقدامات کیے اور دوسرے بیرونی ممالک میں فتوحات کے لیے جو افواج تعینات تھیں، ان کو مزید کمک روانہ کرنے سے اجتناب کیا۔

اس کے یہ نظریاتی و عملی انقلابی رجحانات شاہی نظام اور اس سے وابستہ عناصر کی تائید حاصل نہ کر سکے ہوں گے، لہٰذا اس نے پرانے دارالحکومت کو خیر باد کہہ کر مصر کے وسط میں امرنا کے مقام پر نیا دارالحکومت بسا لیا۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ ملوکانہ نظام کے ساتھ جاگیرداروں، بڑے بڑے نوابوں، مذہبی پروہتوں کی فوج ظفر موج وجود میں آجاتی ہے، اور ان کا مقصد زندگی وسیاست کاری مفاد پرستی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے اخناتون نے ان لوگوں کے عدم تعاون کو دیکھ کر ہجرت کا فیصلہ کیا اور امرنا کے دارالحکومت کی شکل میں ایک نئی دنیا بسالی۔ آثاریات کا چونکہ سارا کام مغربی اثریوں ہی کے ذریعے انجام پایا ہے اور وہ توحید اور وحی و رسالت کے منکر ہوتے ہیں لہٰذا انہوں نے اور ان کے انکشافات سے استفادہ کرنے والے مورخین نے اس کی توحید کے ماخذ اور موحد کی حیثیت سے اخناتون کی کاوشوں پر خاص توجہ نہیں دی۔ البتہ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم

کی گئی ہے کہ اس نے تصور توحید کو پیش کیا در آنحالیکہ اس کے پیشروؤں اور جانشینوں نے اشرا کی عقائد ہی کو اپنایا۔ یہ بات فکری ارتقاء کی نہیں بلکہ اس کے بالواسطہ یابلاواسطہ وحی سے مستفید ہونے کی علامت ہے۔

مغربی مصنّفین نے اخناتون کی سیرت و کردار اور عزم کی پختگی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ویچ کی عالمی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے:

" Not content with trigging Aton's worship to the fore, the Pharaoh decreed that the worship of all other gods should cease, since Aton was the only God. The entire suppression of the country's gods had never before been attempted; feelings of the powerful priesthood can be imagined, and it says much for the young kings strength of personality that they were unable to set a rival on the throne" (Page 47).

آٹن کی پرستش کو (محض) نمایاں کرنے پر اکتفانہ کرتے ہوئے، فرعون (یعنی اخناتون) نے حکم دیا کہ دوسرے دیوتاؤں کی پرستش ختم کر دی جائے، کیونکہ آٹن ہی واحد خدا ہے۔ ملک کے تمام دیوتاؤں کو مقام الوہیت سے معزول کر دینے کی کوشش اس سے قبل کبھی نہیں کی گئی تھی۔ طاقتور مذہبی پیشواؤں کے احساسات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ نوجوان بادشاہ کی شخصیت کی عظمت کی نمایاں علامت ہے کہ وہ اس کے کسی حریف کو تخت پر بٹھانے میں کامیاب نہ ہوئے۔

اخناتون نے پندرہ برس حکومت کی، اور اس عرصے میں اسے تبلیغ توحید کے لیے دس برس ملے جس کے دوران اس نے دارالحکومت کی منتقلی اور نئے دارالحکومت کی تعمیر کا کام بھی کیا۔ اس قلیل عرصے میں اس کے نظریات عوام کے قلوب کی گہرائیوں میں پیوست نہ ہو سکے، اور اس کی وفات کے بعد اس کا جو داماد (اخناتون کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی) تخت نشین ہوا وہ اشرا کی مسلک کی طرف پلٹ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مخالفانہ طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ ہو گی۔ مذکورہ بالا تاریخ کی کتاب کے مطابق:

"The priesthood of Amon was powerful that in reality it controlled the kingdom" (Page 48).

امون (دیوتا) سے متعلقہ مذہبی پیشوائیت اس قدر طاقتور تھی کہ در حقیقت وہی سلطنت کے معاملات پر اختیار رکھتی تھی۔

مباحث بالا سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور تاریخی شواہد کے مطابق توحید اور شرک کی کشمکش ہمیشہ ہی برپا رہی ہے۔ قرآن یہ حقیقت غیر مبہم الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ انسان نے ارضی زندگی کا آغاز عقیدہ توحید کے ساتھ کیا۔ لیکن بعد میں مفاد پرستیوں کی وجہ سے اختلافات رونما ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل کے ذریعے سے بنی نوع انسان کے لیے پیغام توحید و رشد بھیجتا رہا، اور اس طرح تصور توحید کفر و شرک کی طاقتوں کے حملوں کے باوجود دنیا میں قائم و دائم ہے۔ یہ انسانی فکر کا ارتقاء یافتہ نظریہ نہیں ہے۔ یہ من جانب اللہ وحی کے ذریعے نازل شدہ ہے۔

اسلام کا تصور توحید

اسلامی فکر و نظر کے تمام شعبوں کا محور تصور توحید ہی ہے۔ دین کے متعلق ہر قسم کی گفتگو اور زندگی سے متعلق ہر علم اسی سے منسلک ہے۔ قرآن کی عبارت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا نہیں جس میں توحید کا کسی نہ کسی حیثیت سے بلا واسطہ یا بالواسطہ تذکرہ نہ ہو۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ دعوتی کام کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے اور حلقہ بگوش اسلام ہونے کے لیے فرد کے لیے بھی اسی حقیقت کا اعتراف اور اس پر ایمان کی شرط اولین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے دین اسلام کے متعلق جو بھی گفتگو ہو گی اس میں تصور توحید کا وہی مقام ہو گا جو انسانی جسم کے اندر روح کا ہوتا ہے جو اس کے روئیں روئیں میں جاری و ساری ہوتی ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ابھی تک جو معروضات پیش کی ہیں یا بقیہ حصہ کتاب میں کریں گے اس میں توحید کا تصور اجاگر ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے کہ دین اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، لہٰذا اس کی تمام تعلیمات پر اس کے بھیجنے والے کی صفات کی چھاپ کا نمایاں ہونا ہمارے شعور و دانش کی قوت اخذ کی سطح کے مطابق ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن تبیین موضوع کا تقاضا ہے کہ اس سلسلے میں بعض ایسے اہم نکات کو یکجا کر دیا جائے جس سے یہ تصور منقح ہو کر وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے۔

ا۔ انسان اللہ کی ذات کو اپنے تصور کی گرفت میں نہیں لا سکتا

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ہم اللہ کی ذات کا تصور کرنے سے یکسر عاجز ہیں۔ جب بھی اس کی کوشش کریں گے تو اپنی عقل و حسیات کی محدود تہوں کی وجہ سے اس کی طرف تجسیم و تشخص کا انتساب ہو جائے گا۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے مادی ماحول اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر اپنی دانش و شعور کے سہارے عالم غیب کی حقیقوں کا ادراک کر سکے۔ اللہ کی ذات اور اس کی صفات ذہن و شعور کی گرفت میں لانے کے عدم امکان کے متعلق قرآن نے واضح دلائل پیش کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ(۱۱۲:۴)

ترجمہ: اور اس کا (کسی لحاظ سے بھی اور کسی پہلو سے بھی) کوئی ہمسر (اور اس سے مشابہ) نہیں۔

یہ بھی فرمایا:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ (۴۲:۱۱)

ترجمہ: اس کے مانند کوئی شے بھی نہیں ہے۔

جب کسی نکتہ نظر سے بھی اور کسی قسم کے قوت و اختیار کے حوالے سے بھی اس کی برابری یا مشابہت کا کسی کو یارہ نہیں تو اس کی ذات کی حقیقت کا کون علم حاصل کر سکتا ہے۔ کائنات میں کوئی اور ایسی ہستی یا شے نہیں پائی جاتی جو اپنی خصوصیات یا ماہیت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی قدر مشترک رکھتی ہو۔ ہم نے ابھی جو دو آیات نقل کی ہیں ان میں سے پہلی سے قبل کہا گیا ہے کہ وہ یکتا ہے، بے نیاز ہے یعنی اس کو کسی قسم کی کوئی احتیاج نہیں اور اس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور دوسرا جملہ جو ایک آیت کا حصہ ہے اس سے قبل یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے انسانوں اور حیوانوں کے جوڑے پیدا کر کے نظام حیات کو وجود بخشا اور ان کی نسلوں کو آگے چلانے کا قانون مقرر کیا۔ سرسری تفکر سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ چند باتیں جو بیان کی گئی ہیں ان کے سلسلے میں اللہ کا کوئی سہیم نہیں، لیکن وجود کائنات و انس میں ان کی اہمیت مسلمہ ہے۔

پھر یہ بھی فرمادیا گیا کہ

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ(۶:۱۰۳)

ترجمہ: اس کو نگاہیں نہیں پاتیں۔

جہل انسان کو محسوسات کا اس قدر قیدی بنا دیتا ہے کہ وہ جبین عبودیت جھکانے کے لیے کسی محسوس اور نظر آنے والے پیکر کا متلاشی ہوتا ہے۔ اصنام پرستی کے محرکات میں سے یہ ایک نہایت اہم محرک رہا ہے۔

قرآن نظم کائنات کے متعدد شعبوں کو گنوا کر انہیں اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کے طور پر پیش کر کے اس کے وجود کے لیے استشہاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کی نگاہوں میں یہ استعداد ہی نہیں کہ وہ اس کی ذات پر ایمان لانے کے لیے اس کا مشاہدہ کر سکیں۔ اللہ کے نافذ کردہ بعض طبعی قوانین کا علم حاصل کر کے انسان خود اس قدر روشنی پیدا کر سکتا ہے کہ ایک خاص حد سے زیادہ شدت کی صورت میں اس کی اپنی آنکھیں اور ان سے متعلقہ قواء اس کا سامنا نہیں کر سکتے تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق نور افروزیوں کا کیسے سامنا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے یہ بھی ہدایت کر دی گئی کہ اپنی زندگی اور اس کے معاملات سے متعلقہ مظاہرات پر قیاسات کی بنیاد رکھ کر اللہ کی ذات کا تصور کرنے سے گریز کیا جائے۔

چنانچہ فرمایا:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ(۱۶:۷۴)

ترجمہ: تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔

مثال دینے کے لیے ممثل علیہ کا مثیل ہونا چاہئے اور اللہ اس کی ہستی مطلق ہے اور اس کا کسی لحاظ سے کوئی مثیل نہیں۔ اس لیے اس کی ذات اور قدرت کے بیان کے لیے دنیوی معاملات سے مثالیں دینا اسے اس کی مخلوق کے ہم پایہ قرار دینے اور اس کے غضب کو بھڑکانے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں پیشہ ور مدعیان ''ولایت'' سادہ لوح اور دین سے بے خبر پڑھے لکھے لوگوں تک کو یہ غچہ دیتے ہیں کہ جس طرح اس دنیا میں سربراہان حکومت و سلطنت تک ان کے مشیروں اور وزیروں کے واسطے اور وسیلے کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا اسی طرح ہمارے مزاروں میں مدفون آباؤ اجداد کے وسیلے کے بغیر اللہ تعالیٰ سے حاجات طلبی کار عبث ہے۔ یہ مشرکانہ نظریہ ہے اور ایسی مثالیں دینا مندرجہ بالا آیت کے بھی سراسر خلاف ہے۔ (شرک اور عبادت پر اپنے اپنے مقام پر گفتگو ہو گی۔) اس طرح یہ طبقہ لوگوں کو یہ تصور دینے کی کوشش کرتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ حکمرانوں اور عمال حکومت کی طرح کسی دفتر میں بیٹھا ہے اور سفارشیں سن کر اپنے احکامات صادر کر رہا ہے۔

۲۔ قرآن میں صفات باری تعالیٰ کے بیان کی نوعیت کے متعلق اصولی وضاحت

اس سے قبل ہم عرض کر چکے ہیں کہ قریب قریب ہر متمدن اور غیر متمدن ہئیت اجتماعیہ میں مادی دنیا اور انسانی فکری گرفت سے وراء الوراء کسی نہ کسی ہستی کا تصور پایا جاتا رہا، اور اس کی طرف کسی نہ کسی نوعیت کی

صفات و اختیارات الوہیت کا انتساب بھی کیا جاتا رہا ہے۔ چاہے وہ وحی شدہ ہوں یا توہم پرستی کی پیداوار ہوں لیکن ان تصورات میں ہر ضابطہ فکر کے اندر تحریف و تغیر کے رجحانات روبعمل رہے ہیں۔ کہیں بھی زمانے کے حالات کے نشیب و فراز اور فکری الٹ پھیر کے زیر اثر تصور الوہیت میں قرار اور جماؤ کی کیفیت نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام ہی کے حصے میں آئی ہے کہ قرآن میں کسی معمولی سے معمولی حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل نہ ہونے اور سنت متواترہ کے زیر اثر اللہ تعالیٰ کی صفات الوہیت کے سلسلے کے تصورات میں گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران مسلمانوں کے سواد اعظم میں مکمل اتفاق دیکھنے میں آتا ہے۔

قرآن میں وہ سبھی اساسی اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جو حیات انسانی کو فکری و عملی دائروں میں منشائے الٰہی کے مطابق استوار کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ زور عقیدہ توحید پر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کرتے آرہے ہیں توحید کا تصور ہی وہ بنیاد ہے جس پر دین اسلام کی ساری عمارت کھڑی ہے۔ اس لیے دین کا صحیح فہم اس امر کا مقتضی ہے کہ یہ تصور ہر قسم کی افراط و تفریط اور کج فہمیوں سے محفوظ رہے جن میں مذاہب و ادیان سابقہ کے پیروان گرفتار ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے اور اس کے سلسلے میں معمولی سے معمولی انحراف سے دین کے متعلق انسانی زاویہ نگاہ میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہماری عقل و خرد اور حسیات کی گرفت میں آنے والی تمام اشیا چاہے وہ مادی ہوں یا عرض کی حیثیت رکھتی ہوں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے کسی قسم کی کوئی مشابہت نہیں رکھتیں۔ لہٰذا قرآن نے اللہ کی صفات کو ایک طرف تشبیہ اور تمثیل سے اور دوسری طرف تعطیل سے مبرا رکھ کر تنزیہی انداز اختیار کیا ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف تشخص کی نسبت ہو جاتی ہے اور اگر دوسری صورت ہو تو اس کے متعلق فکر و تصور کے لیے کوئی اساس ہی باقی نہیں رہتی۔ ہم ''پس منظر'' کے باب میں ''ہندومت'' کے ضمنی عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ اس کی تاریخ میں بعض مفکرین نے تنزیہی تصور کو سلب و نفی کی اس انتہا تک پہنچا دیا کہ اثبات کا پہلو ناپید ہو گیا۔ چنانچہ وہ اس نام نہاد ''بلندی'' سے گر کر محسوسات کے پھندے میں اس قدر گرفتار ہو گئے کہ ذی حیات اور غیر ذی حیات مخلوق کی ہر نوع اور تصور میں آنے والی ہر غیر مرئی اور غیر حقیقی شے کو معبودیت کا مقام حاصل ہو گیا۔ اس انداز فکر کا دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مسند الوہیت کو خالی پا کر اس پر بانیان مذاہب کو بٹھا دیا گیا۔ بدھ مت میں اس کی نمایاں مثال ملتی ہے۔ گوتم بدھ کے تصور الوہیت کے متعلق آج تک محققین میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ منکر خدا تھا یا محض اللہ تعالیٰ کی صفات کے سلبی نظریے کا قائل تھا۔ لیکن جو بھی صورت تھی اس کی وفات کے چند برس کے اندر اندر الوہیت کی خالی نشست پر گوتم

بدھ کو بٹھا دیا گیا اور وسط ایشیا سے لے کر جاپان تک اللہ کی زمین اس کے بتوں سے معمور ہو گئی۔ اس کی وجہ تشخیص و تشبہ سے اللہ پاک کی مثبت تنزیہی تصور سے بدھ مت کی تہی دامنی تھی۔

اسلام نے ان تمام راستوں کو مسدود کر دیا جو تشخیص، تشبہ، تجسم، تمثیل یا نفی و سلب صفات الٰہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس نے اس کی قدرت اور صفات کا اس انداز سے تذکرہ کیا ہے جس میں خصوصیت تنزہ کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور تعطیل کے اندھیرے سے بھی انسان محفوظ رہے۔ ہم اس سلسلے میں اس سے قبل بھی ناظرین کے غور و تدبر کے لیے قرآنی آیات کی بنیاد پر مواد پیش کر چکے ہیں اور درج ذیل سطور میں بھی مزید نکات پیش کریں گے، قرآن و حدیث میں اللہ کی صفات کا جس کثرت سے تذکرہ کیا گیا ہے ہم ان کو دائرہ بیان میں نہیں لا سکیں گے۔ اس کے لیے ناظرین کو اپنی اپنی وسعت فہم کے مطابق ان دو ماخذ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ ویسے اس کی صفات کا احاطہ کرنا انسانی بس میں نہیں جیسا کہ ہم اس سے قبل آیت (۱۸:۱۰۹) کا حوالہ دے کر عرض کر چکے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور احدیت

اللہ کی ذات کے احد اور واحد ہونے کی صفت اس کی صفات میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو تصور الوہیت کے سلسلے میں ساری انسانی تاریخ میں سر فہرست رہی ہے۔ دعوت اسلامی کا آغاز چونکہ ہمیشہ تصور توحید سے ہوتا رہا لہٰذا یہی مسئلہ داعیان اسلام اور کفر و شرک کی قوتوں کے درمیان فوری عداوت کا باعث بنتا رہا ہے۔

''احد'' اور ''واحد'' دونوں الفاظ کے معنی ایک اکیلے اور تنہا ہی کے ہیں لیکن اہل لغت نے ان کے مفہوم میں تفریق کی ہے۔ صاحب ''تدبر قرآن'' لکھتے ہیں:

''اہل لغت نے واحد اور احد میں یہ فرق کیا ہے کہ احد وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور واحد وہ ہے جس کی صفات میں اس کا کوئی شریک نہ ہو۔''

(تدبر قرآن جلد ۹ صفحہ ۶۵۰)

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفت یکتائی کے لیے دونوں الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں مثلاً سورۂ اخلاص کا آغاز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے ہوتا ہے کہ وہ یہ اعلان فرما دیں کہ اللہ احد ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱:۱۱۲)

ترجمہ: اللہ کی ذات یگانہ ہے۔

قرآن میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کی صفات تخلیق والوہیت کا ذکر کر کے اس کے واحد ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کی قدرت میں اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ مثلاً سورۃ النحل میں یہ بیان کر کے کہ اس نے آسمان وزمین، انسان اور حیوانات جن سے تم مختلف ومتنوع فوائد حاصل کرتے ہو پیدا کیے۔ بارش برساتا ہے جس کے ذریعے نباتات کی پیدائش ہوتی ہے۔ نیز اس نے شمس وقمر اور نجوم خلق کیے۔ اور پھر اسی نے سمندر کو وجود بخشا جس سے تم غذا اور سامان آرائش حاصل کرنے کے علاوہ اس کے سینے پر جہاز رانی بھی کرتے ہو۔ پھر یہ ذکر کر کے کہ جن ماسوا اللہ کی تم پرستش کرتے ہو وہ تو زندگی ہی سے محروم ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ(۱۶:۲۲)

ترجمہ: تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی قدرت اور اس کی صفت ربوبیت کو ظاہر کرنے کے لیے ابھی جن چند باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کی تخلیق میں اللہ کے سوا کسی اور ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں، وجود باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے انفس، آفاق سے قرآن نے استشہاد کیا ہے۔ اسی طرح اس کے احد وواحد ہونے کی نشانیاں بھی مذکور ہوئی ہیں۔ لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ دلائل عقلی سے بھی توحید کے تصور کے مبنی بر حقیقت ہونے کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔

ایک جگہ قرآن میں فرمایا:

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ(۲۳:۹۱)

ترجمہ: خدا نے کسی کو اپنی اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود وشریک ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔

پھر فرمایا:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا(۲۱:۲۲)

ترجمہ: اگر ان دونوں زمین آسمان کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔

اتنا بڑا کارخانہ کائنات جس کو ہم دیکھ رہے ہیں اور اس کے علاوہ نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے کتنے اور مختلف اقسام کے جہاں پیدا کر رکھے ہوں گے ان سب کے نظم و ضبط ربط کو، جو نا معلوم کس قدر طویل عرصے سے چل رہا ہے، کے متعلق ایک غبی سے غبی انسان بھی محسوس کر سکتا ہے کہ اس کی تخلیق اور اس کے انتظام وانصرام کسی ایک ہستی کے قبضہ قدرت میں ہی ہو سکتے ہیں ورنہ اگر اس کے مختلف شعبے متعدد ہستیوں کے زیر اقتدار ہیں تو ان میں اختلال واختلاف اور ٹکراؤ لازمی امر ہے۔ اور اسکا برقرار رہنا اور چلنا ناممکن۔ اس بات کو مشرکین بھی تسلیم کریں گے کیونکہ اگر آپ یونانی اور ہندو دیومالا (Mythology) مطالعہ کریں گے تو انہیں مختلف دیوتاؤں کے ٹکراؤ اور باہمی جنگ و جدل کی داستانوں سے مملو پائیں گے۔ گویا انسان جب اپنی سمجھ کے مطابق اس عالم کی باگ ڈور کا مختلف دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہونے کا عقیدہ اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ذہن کو اس سوچ سے خالی نہیں رکھ سکتا کہ وہ اپنے اپنے اقتدار کے نشے میں لازماً اختلاف اور جنگ و جدل میں بھی منہمک ہو جائیں گے۔ لہٰذا درج بالا دونوں آیات میں دی گئی یہ دلیل کہ اگر اس کائنات میں مختلف الٰہ ہوں تو اس کا نظم قائم نہیں رہ سکتا، عین مطابق عقل و دانش ہے۔

۴۔ اللہ ہی الٰہ اور عبادت کا مستحق ہے

اس باب میں خاص طور پر اور پہلے ابواب میں عام طور پر ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی پر جو گفتگو کی ہے اس سے انسان ناگزیر طور پر اس عقیدے کو اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ صرف اسی کی ذات الٰہ مطلق تسلیم کیے جانے اور ہماری طرف سے آداب بندگی بجالانے کی مستحق ہے۔ اس فریضے کو ادا کرنے کے سلسلے میں مسلمان مجموعی حیثیت سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو رویہ اختیار کرتے ہیں اسے اسلام اصطلاح ''عبادت'' سے موسوم کرتا ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہوئے جو کام بھی سرانجام دیا جائے گا وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی کے زمرے میں شامل ہو گا۔ اس سے قبل ہم رسول کی حیثیت اور مقام و مرتبے کو واضح کر چکے ہیں۔ رسول چونکہ یہ استعداد رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے احکامات پر خود بھی پوری طرح عمل کرے اور اس کے دین کو بغیر کسی تغیر و تبدل کے انسانوں تک پہنچادے اس لیے اس کا اتباع فرض عین ہے۔ لیکن اللہ کی الوہیت میں اس کا ذرہ برابر بھی ساجھا نہیں ہوتا۔

حکم خداوندی ہے:

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۲:۱۷)

ترجمہ: اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر۔

حضرت یوسفؑ نے زنداں میں اپنے ساتھیوں کو تلقین کی:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ(۱۲:۴۰)

ترجمہ: اختیار واقتدار صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے (یعنی سیدھا راستہ ہے)۔

سورۂ اعراف میں مذکور ہے کہ حضرات نوحؑ، ھودؑ، صالحؑ اور شعیبؑ چاروں انبیاء نے ایک جیسے الفاظ میں اپنی اپنی قوم کو بلاشرکت غیرے اللہ کی الوہیت تسلیم کرنے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دی:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ(۷:۵۹،۶۵،۷۳،۸۵)

ترجمہ: اے میرے ہم قومو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں۔

تخلیق بشر کے روز اول سے لے کر آج تک داعیان اسلام نے چاہے وہ نبی ہوں یا غیر نبی، ایک ہی تصور توحید پیش کیا ہے۔ دراصل یہ تصور بغیر کسی تغیر و تبدل کے ازل سے چلا آرہا ہے اور ابد تک قائم ودائم رہے گا۔ اس کے برعکس اسلام کے دائرے سے باہر اس کائنات کی تخلیق، اس کے انتظام وانصرام سے متعلقہ قوتوں اور اس کے انجام کے متعلق تاریخ انسانی میں آج تک متضاد و متصادم نظریات جنم لیتے رہے ہیں لیکن کسی ایک نظریے کو بھی قرار وبقا نصیب نہیں ہوا۔

۵۔ اسلام میں خواص و عوام کے لیے توحید کا ایک ہی تصور

اسلام فکر و عمل دونوں شعبوں پر یکساں زور دیتا ہے۔ یہ اپنے پیروان سے ان کی ذہنی سطح سے قطع نظر بعض عقائد و نظریات پر لازماً ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور انہی کا عکس ان کی عملی زندگی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم اس سے قبل کسی مقام پر یہ بحث کر چکے ہیں کہ ایک ہی نظریے، ایک ہی عقیدے اور ایک ہی شعبہ علم میں فہم و تفکر کے درجات ہوتے ہیں۔ جو جتنی علمی و تحقیقی کاوش کرے گا اسی کے مطابق اور اس نسبت سے اس میں مقام بصیرت حاصل کرے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی معاشرے میں مبعوث ہوئے۔ لیکن آپ نے آغاز دعوت تصور توحید پیش کرنے سے کیا، جیسا کہ تمام سابقہ انبیاء کی سنت رہی ہے لیکن تمام ذہنی و معاشرتی سطح کے لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اصول توحید اور اس کے مضمرات کو سمجھ گئے۔ ناسمجھ سے ناسمجھ لوگوں

نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہم تو اس اصول کو نہیں سمجھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر درجۂ تدبر و تعقل کے لوگوں میں سے بعض نے اس کو قبول کر لیا اور بعض نے اس کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔

یہ دین شعور سے یکسر لا تعلق ہو کر محض بعض رسوم پوجا پاٹ ہی کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ ہر ذہنی سطح کے انسان کے سامنے توحید کا تصور پیش کرتا اور اس پر ایمان لانے کی علامات کے طور پر نماز، روزہ، زکوۃ ،اور حج کے چار فرائض کی پابندی لازم قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زندگی کے تمام شعبوں کو ان اساسی اصولوں کے مطابق مرتب کرنے کا حکم دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر قرآن کی شکل میں نازل کیے اور جن کی تبیین و نفاذ کی ذمہ داری آپ کو سونپی۔اب فکر اور عمل کے اس مجموعی نقشے کو آپ سامنے رکھیں اور سوچیں کہ کیا ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی اس سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص اپنے درجۂ تفکر و تدبر کے مطابق اس کے علم و شعور سے محروم رہ سکتا ہے۔

اسلام نے علم کی اہمیت کو بہت اجاگر کیا ہے، لیکن فہم و بصیرت کی روشنی میں صرف وہی لوگ اپنی زندگی کے معاملات کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلاتے جو کتابی علم رکھتے ہوں۔ ہم نے ایسے لوگوں کی کثیر تعداد دیکھی ہے جو کورے ان پڑھ ہوتے ہیں لیکن تجارتی دائرے میں بڑی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے کاروباری نشیب و فراز کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر دنیوی معاملات میں ایک غیر تعلیم یافتہ شخص اس استعداد کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو دین کے ان ابتدائی اور ضروری مسائل سے کیوں واقفیت حاصل نہیں کر سکتا جن کا جاننا ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔

لیکن اس کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور وہ یہ کہ معاشرے میں دین کے اصولوں کی تفہیم کے لیے اسی طرح کی موزوں فضا پیدا کی جائے جس طرح سطور بالا میں دی ہوئی تجارتی شعبے کی مثال کے سلسلے میں کاروباری اسرار و رموز کے سمجھنے کے لیے پیدا کی جاتی ہے۔ مؤخر الذکر فضا رزق اور زندگی کی سہولتوں کی طلب کے دباؤ کے تحت معاشرہ خود بخود پیدا کرتا ہے۔اسی طرح اگر زندگی کو اسلام کے اصولوں کے تحت استوار کرنے کا داعیہ موجود ہو تو ہر طبقے کے اندر ضرورت کے مطابق دین کے اصولوں کا فہم پیدا کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اس سلسلے میں واضح رہنمائی کر دی ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (۱۲۲:۹)

ترجمہ: پس کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرتی اور جب تعلیم و تربیت کے بعد اپنے گروہ میں واپس آ جاتی تو لوگوں کو جہل و غفلت کے نتائج سے ہوشیار کرتی تاکہ برائیوں سے بچیں۔

یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ساری ملت ہی حصول علم دین کی کاوش میں مصروف ہو جائے۔ مزاجوں اور رجحانات میں اختلاف ہوتا ہے۔ ملی بہبود کے لیے علم کے بہت سے دوسرے شعبوں کی طرف طلب علم و تحقیق کے لیے متوجہ ہونا ہوتا ہے۔ صنعت و حرفت اور زراعت اور دوسرے پیشوں کے تقاضے بھی شہریوں ہی کو پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ایک صالح معاشرے میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی اٹھ کھڑی ہوتی ہے جو اپنی رجحان طبیعت کے مطابق شاہراہ علم پر چل کھڑی ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں یہ ایسے لوگ نہ ہوں گے جو بے صلاحیت ہونے کی وجہ سے چونکہ کسی اور ذریعہ معاش میں اپنے آپ کو نہ کھپا سکیں یا آبائی طور پر انہوں نے دین فروشی کا پیشہ اپنا رکھا ہو اور جو ایسے دینی مدرسوں کا رخ کریں جہاں ایک طرف ان میں دین اور اس کے تقاضوں کا شعور ہی پیدا نہ ہو اور دوسری طرف ان کے اندر خودی کے جوہر کو پروان ہی نہ چڑھنے دیا جائے۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو صاحب صلاحیت، اشتیاق علم رکھنے والے اور خدمت دین اور حصول رضائے الٰہی کے متمنی ہوں گے۔ جس ملت سے ایسے افراد کی ایک معتد بہ تعداد نکل آئے گی اور مختلف وسائل کام میں لا کر (جن پر تفصیلی گفتگو علم کے باب میں کی جائے گی) اس انداز سے دین اسلام کے اصولوں کی نشر و اشاعت کرے گی کہ اس سے ملت کے لیے فکر و عمل کے دائروں میں رہنمائی مہیا ہو تو ظاہر ہے کہ ہر ذہنی سطح کے لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق توحید اور اس کے مضمرات کو سمجھ پائیں گے۔

ایسے معاشرے میں خواص و عوام کے لیے الگ الگ تصورات الوہیت اختراع کرنے کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ قرآن تمام مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے اور حضورؐ نے دین کو پیش کرتے ہوئے خواص و عوام میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی۔ آپؐ جب خطبات دیتے تھے تو سامعین میں ہر درجہ فہم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ اسی طرح قرآن بھی یکساں طور پر تمام مسلمانوں کو سنایا اور ان کے حوالے کیا گیا۔ اس پر کسی مخصوص طبقہ کی اجارہ داری قائم نہیں کی گئی۔ ہاں یہ بات قدرتی تھی کہ اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے استفادہ اسی نسبت سے کیا جا سکتا ہے جیسی کسی کے اندر استعداد فہم و بصیرت ہو گی۔ اور حضورؐ بھی انفرادی سطح پر ہر ایک کے لیے دین کے اصولوں کی وضاحت اپنے مخاطب کی ذہنی استطاعت کے مطابق کرتے تھے۔ لیکن دین کے کسی اصول کی پابندی سے کوئی مسلمان مستثنیٰ نہیں، الا یہ کہ کسی معاملے میں کوئی معذور ہو۔

ہم نے علم کے حوالے سے دین کے اصولوں پر تعمیر ہونے والی جس ہیئت اجتماعیہ کا اجمالی نقشہ پیش کیا ہے اس میں کسی شخص کو تصور توحید اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی۔

۶—خالق و مدبر کائنات اللہ تعالیٰ ہی ہے

یوں تو خلق و نظم کائنات کے متعلق تاریخ انسانی میں انسانوں کے اختراع کردہ بہت سے نظریات عالم وجود میں آئے ہیں، لیکن مجملاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک انداز فکر بہت نمایاں رہا ہے۔ وہ یہ کہ ایک وراءالوراء خالق کائنات ہستی تو موجود ہے، لیکن نظم کائنات کو چلانے اور انسانوں کی تقدیر کو بنانے کے مختلف شعبے ہیں اور ان میں سے ہر شعبے کے انتظام وانصرام پر کوئی نہ کوئی مبنی بر وہم وجود رکھنے والی ہستی قدرت رکھتی ہے، جسے اپنے شعبے میں حاجات روائی کا اختیار حاصل ہے۔

ہم اس طرز کے عقائد کا تذکرہ ''پس منظر'' کے باب میں اور موجودہ باب میں یونانی دیومالا کے حوالے سے بھی کر چکے ہیں۔ قرآن ایسے عقائد کے حاملین کے متعلق کہتا ہے:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ۝ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ(۳۶:۷۴–۷۵)

ترجمہ: اور انہوں نے اس توقع پر اللہ کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔

اس عقیدۂ اشراک کے برعکس قرآن یہ تلقین کرتا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ(۷:۵۴)

ترجمہ: بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ ڈھانکتا ہے رات کو دن پر جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کیے جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، عالم کا رب!

قرآن کے اسلوب فصاحت و بلاغت کے مطابق یہ آیت بھی نہایت جامع ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے خالق سماوات والارض کا بھی ذکر ہے، کائنات کو چھ ادوار اور مرحلوں میں تخلیق کرنے کا انکشاف کر کے اس کی تخلیق میں عمل ارتقاء کی نشاندہی بھی کر دی گئی۔ استویٰ علی العرش کے الفاظ کے ذریعے کل کائنات پر اللہ

تعالیٰ کی بلا شرکت غیرے حکمرانی کا اعلان بھی ہو گیا۔ سلسلۂ روز و شب اور شمس و قمر اور اجرام فلکی کے اس کے حکم کے تحت اپنے اپنے فرائض انجام دینے کی بھی توضیح ہو گئی۔ پھر پر زور انداز سے یہ بھی فرما دیا گیا کہ جب اس نے سب کچھ خلق کیا ہے تو حکم و تدبیر بھی اسی کی چلے گی۔ آخر میں اس کی صفت ربوبیت بھی مذکور ہو گئی۔ گویا اس آیت میں چند لفظوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی ''توحید الوہیت'' اور ''توحید ربوبیت'' کو سمیٹ دیا گیا۔

ہم نے آیت کا ترجمہ ''تدبر قرآن'' سے نقل کیا ہے۔ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ہم مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن سے اس آیت کی تشریح بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ زیر نظر موضوع کی مزید وضاحت کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہو جائے کہ اس آیت سے جو مطلب و معنی کیے گئے ان کے سلسلے میں ہمارے مفسرین متفق الرائے ہیں:

''توحید الوہیت کی تلقین اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ ''خلق'' اور ''امر'' اللہ ہی کی ذات سے ہیں۔ یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے، اور اسی کے حکم و قدرت سے اس کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تدبیر و انتظام کی دوسری قوتیں بھی موجود ہوں، جیسا کہ مشرکین کا خیال تھا۔''

''تخت پر متمکن ہو گیا'' یعنی خدا کی بادشاہت کائنات ہستی میں نافذ ہو گئی کیونکہ وہی خالق ہے اور وہی مدبر بھی ہے۔ تمام عالم ہستی اس کے تخت جلال کے آگے جھکی ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ فرمایا:

'' ثم استوی علی العرش یدبر الامر''

(ترجمان القرآن جلد دوئم صفحہ ۱۳)

مختلف مزید پہلوؤں سے کائناتی مظاہر کا تذکرہ کر کے اور بھی بہت سے مقامات پر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق و تدبیری صفات مذکور ہیں۔ لیکن ہم طوالت سے بچنے کے لیے مزید حوالہ جات نہیں دے رہے۔ اس سے قبل بھی ہم اسی باب میں توحید کے حق میں ''آفاقی استدلال'' کے ضمنی عنوان کے تحت اللہ کے مدبر کائنات ہونے کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کر چکے ہیں۔ لیکن اللہ کی اس صفت سے جبریہ کے عقیدے کو تقویت و تائید حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ ہم جبر و قدر کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے عرض کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اس ارضی زندگی کو استوار کرنے کے لیے جو اور جتنے اختیارات دیے گئے ہیں ان کی اس کے ''مدبر کائنات'' تسلیم کرنے سے نفی نہیں ہوتی۔

۷۔ الوہیت باری تعالیٰ کا تقاضا ہے کہ انسان اس کے نازل کردہ دین پر عمل پیرا ہو

اس موضوع پر ہم متعدد عنوانات کے تحت اصولی گفتگو کر چکے ہیں۔ اس نظریے کو اسلام کے نظام فکر میں بہت اہم مقام حاصل ہے کہ انسان اپنی انفرادی زندگی کے تنوع اور اجتماعی زندگی کی الجھنوں کے پیش نظر اپنی حیات ارضی کو احسن اور مبنی بر عدل طریق سے گزارنے کے لیے خالق و مدبر کائنات کی طرف سے واضح ہدایت کا محتاج ہے۔ اس انسانی احتیاج کی فطری پیاس بجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے اپنے پیغمبروں کو دین اسلام کے اصول دے کر مبعوث فرمایا اور اس کے نفاذ کے لیے انسان کو اپنی عقل و دانش کے استعمال کی ہدایت کی۔ اب یہ اس کے رجحان طبیعت کا اصلح ہونے یا نہ ہونے پر منحصر ہے کہ وہ اس رہنمائی سے استفادہ کرتا ہے یا نہیں۔

چنانچہ فرمایا:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا(۷۶:۳)

ترجمہ: ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا چاہے وہ حق مانے یا کفر کرنے والا ہے۔

اس معاملے میں اللہ کی طرف سے کوئی جبر نہیں۔ یہ انسان کے لیے اپنے نوعی مفاد میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ ہدایت کو قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہو۔ وہ اگر اس سے اعراض کرے گا تو اپنی فطرت کے تقاضوں سے گریز کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس کے باطن میں قبولیت حق کا رجحان رکھا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اندر کی کائنات میں خبث و فساد کو راہ دے گا تو خود ہی اپنے آپ کو خسارے اور ضلالت میں مبتلا کر لے گا۔ قرآن کہتا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا(۹۱:۸-۱۰)

ترجمہ: پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

اللہ نے اپنی کتاب میں مخاطبین ہدایت کو ہدایت و ضلالت کا راستہ اختیار کرنے کے لحاظ سے تین گروہوں کی نشاندہی کی ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ(۳۵:۳۲)

ترجمہ: پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے منتخب کیا۔ پس ان میں سے کچھ تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں، کچھ ان میں سے میانہ رو ہیں اور کچھ ان میں سے اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔

ان تینوں گروہوں میں سے ہر گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا مقام اللہ کے دین سے وابستگی کے درجے کے مطابق متعین ہو گا۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب وادیان کی طرح صرف رسمی پوجا پاٹ کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ آمادگیٔ قلب وذہن کے ساتھ اپنے دیے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کا مطالبہ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کو تسلیم کرنا اس امر کا مقتضی ہے کہ امور حیات میں اس کے ان احکامات کو جامۂ عمل پہنایا جائے جو الکتاب میں مذکور ہیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب توحید پر یقین کامل ہو۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا:

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا الا الہ الا اللہ
لُغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

(بال جبریل صفحہ ۶۸)

۸۔ تصور توحید کے اقرار وانکار کے نتائج کا تقابلی مطالعہ

یہ مضمرات انفرادی اور اجتماعی دونوں دائروں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جب انسان کا دل اس بات پر ٹھک جاتا ہے اور وہ نظریہ توحید پر حقیقی ایمان لے آتا اور سمجھتا ہے کہ خدا ہی اقتدار اعلیٰ رکھتا ہے اور وہی کارساز اور حاجت روا ہے تو اس کے دل میں ماسوا اللہ کا خوف یا اس سے کسی قسم کی امیدیں وابستہ کرنے کا امکان نہیں رہ سکتا۔ اس کے اندر ایک ایسی طاقت جنم لیتی ہے جس سے وہ شاہین صفت مومن کا کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا اور اس کا عکس زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہ ارضی زندگی اس کے ذاتی مفاد کے حوالے سے اسے ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی اصلاح کا تو وہ بیڑا اٹھاتا ہے اور ملت کی بہتری کے لیے کوشاں رہتا ہے، لیکن ذاتی انتفاع کے لیے اس سے محبت اور لگاؤ اس کے دل سے نکل جاتے ہیں۔ وہ اپنی اصلاحی اور تعمیری کاوشوں کو محض رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔ باطل سے ٹکرانا اس کے لیے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کا خوف اس کے دل میں راہ نہیں پا سکتا۔

یہ محض خیالی انداز کی باتیں نہیں ہیں۔ ہم نے توحید کے تصور پر دل کی گہرائیوں سے ایمان لانے والوں کی خصوصیات کے جس ایک پہلو پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے وہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ میں واضح طور پر نظر آتا ہے (تفصیلات ''اسلامی تاریخ میں'' کے باب میں عرض کی جائیں گی۔) زندگی سے متعلق اس رویے کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مادہ پرست بھی افراد کی طرف سے سیاسی و سماجی دائروں میں بے لوث خدمت کی تحسین کریں گے۔ لیکن اس میں عملاً دو قسم کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ایک یہ کہ قلب و ذہن جب مادہ پرستی کے اثرات سے زنگ آلود ہو جاتے ہیں تو محض حصول رضائے الٰہی کے لیے خدمت انسانیت ایک مجذوبانہ خیال معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسرے معاشرے کی تنظیم ہی ایسے خطوط پر ہو چکی ہوتی ہے کہ اس میں ہر اچھے کام کو کسی نہ کسی ذاتی مفاد کے حصول کے مقصد کے تحت ہی کیا جا سکتا ہے۔

اجتماعی زاویہ نگاہ سے بات کی جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی گری پڑی اقوام کے لیے عموماً اور دور حاضر کی درماندہ مسلمان ملت کے درد کا درماں اور اس کے امراض کا علاج اس کے عواقب و مضمرات کے ساتھ توحید پر ایمان لانا ہی ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ قوموں اور ملتوں کی ناتوانیوں اور بے بسیوں کا شافی علاج ثابت ہوتا ہے۔ لیکن محض زبانی کلامی توحید کے تصور کو قبول کرنے سے متوقع نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الا ھو

سطح بیں معترضین کہہ سکتے ہیں کہ ضعف قومی کا علاج مغربی مادہ پرستانہ فلسفے نے بھی تو کیا ہے، تو پھر توحید کے نظریے کا اس میں کیا کمال ہے۔ یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آخر رہزن، ڈاکو اور بڑے بڑے قاتل بھی تو اپنی انفرادی زندگی میں بہت باہمت، شجاع اور دلیر ہوتے ہیں تو کیا ان کے ان ''اوصاف'' کو مستحسن قرار دے دیا جائے گا؟ اس طرح تاریخ میں بہت سے قبائل و اقوام نے وسیع خطہ ہائے ارض پر غلبے اور تفوق کے جھنڈے لہرائے ہیں۔ ہنوں، گاتھر، ونڈلز اور تاتاریوں نے جمی ہوئی اور مضبوط سلطنتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اول الذکر تین وحشی قبائل نے یورپ کو لگ بھگ ایک ہزار سال کے عرصے کے لیے ازمنہ تاریک کی عمیق غار میں دھکیل دیا کیونکہ اس کے پاس کوئی مضبوط فکر اور نظریہ زندگی موجود نہیں تھا۔ آخر الذکر قبائل نے بھی خوفناک تباہیاں مچائیں، لیکن ان کا واسطہ ایک ایسے تمدن سے پڑا جس کے پاس ان کے حملوں کے وقت متعدد کمزوریوں کے باوجود ایک مضبوط فکر اور نظام اقدار موجود تھا لہذا وہ اسے تباہی سے ہمکنار نہ کر سکے جب کہ خود اس میں جذب ہو گئے۔

لیکن آج ان سب باہمت قوتوں کو وحشی اور غیر متمدن قرار دیا جاتا ہے کیوں؟

اس لیے کہ مؤرخ نے ان کے دور استیلاء کے گزرنے کے بعد ان کے تفوق سے برآمد ہونے والے عواقب و نتائج کا تعین کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بحیثیت مجموعی انسانیت کے لیے باعثِ ضرر و نقصان ثابت ہوئے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ کیا انسانیت کے لیے ضرر رسانی کی ایک ہی صورت ہوتی ہے؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر ایک کا رنگ وقت کے حالات اور انداز تخریب کے مطابق ہوتا ہے۔ موجودہ مادہ پرستانہ مغربی استعماری قوتوں کا دنیا میں تباہی پھیلانے اور بنی نوع انسان کے لیے ضرر رسانی کا ایک اپنا انداز ہے۔ لیکن اگر مجموعی حالات اور اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو مغربی استعماری و استحصالی طاقتوں نے مذکورہ وحشی قبائل کے مقابلے میں وسیع تر رقبوں اور آبادیوں کو زبوں حالی، ہلاکت اور فقر و فاقہ کے عمیق غار میں دھکیل رکھا ہے۔ اور ان لوگوں کی لاشوں پر اپنے قصر ہائے تعیش تعمیر کیے ہیں۔ تفصیلات تو اپنے مقام پر بیان ہوں گی، یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کسی نظریے اور اصول کی صداقت اور کسی تمدن کی افادیت کا اندازہ اور تعین اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اگر اس کو اپنایا جائے تو اس سے بنی نوع کے لیے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں یا مضر۔ اس کسوٹی پر پرکھ کر آپ تصور توحید اور مادہ پرستانہ فکر کا تقابلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

یہ گفتگو درمیان میں بر سبیل استطراد آگئی تھی، ہم یہاں عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب کسی اجتماعی نظم میں تصور توحید پوری طرح اثر انداز ہوتا ہے تو اللہ کی کبریائی کا احساس ماسوا اللہ کی عظمتوں کے احساس کو مٹا دیتا ہے، اور مساوات و اخوت انسانی کے جذبات خود بخود معاشرے میں جاری و ساری ہو جاتے اور اونچ نیچ کے مظاہرات ختم ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں انتظام ملکی ہوتا ہے اور جنہیں عام طور پر حکمران کہا جاتا ہے ان کے اور عوام کے درمیان غیر اسلامی نظاموں میں پائے جانے والے حاکم و رعیت کا تعلق نہیں ہوتا، بلکہ ہر کوئی دینی اور شرعی ہدایات کے تحت اپنے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں اس احساس کے تحت منہمک ہوتا ہے کہ اسے خدائے وحدہ لاشریک کے حضور جوابدہی کرنی ہے۔ اس سے معاشرے میں چھائی ہوئی معنوی فضا یکسر ایک ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے جو تصور توحید ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اللہ کی ہستی کو نظر انداز کر کے الوہیت کا کوئی فاسد تصور یا ملحدانہ عقیدہ انسانوں کے اندر انفرادی طور پر اور معاشرے کے اندر اجتماعی دائرے میں رضاکارانہ طور پر اور آمادگی قلب و ذہن کے ساتھ اپنا اپنا کردار دیانتداری اور ضمیر کی آواز کے مطابق کرنے کا داعیہ پیدا نہیں کر سکتا۔ محدود پیمانے پر یہ طرز عمل حکومتی قانون کے

ذریعے حاصل کیا جاتا ہے، بشرطیکہ اس کی امداد و تعاون کے لیے ایک بیدار رائے عامہ بھی موجود ہو، ورنہ نرا قانونی دباؤ بھی بے بس اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ لیکن جس نظم کے اندر تصور توحید جاری و ساری ہو وہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی علیم و خبیر اور بصیر و عزیز ہستی ان کے ظاہری اعمال اور پوشیدہ نسبتوں کا مشاہدہ کر رہی ہے تو ان سے قانون کے دباؤ کے تحت اعمال حسنہ سرزد نہیں ہوتے بلکہ ان کی سوچ اور عمل حصول رضائے الٰہی کی خواہش کے تحت وجود پذیر ہوتے ہیں۔

یہ انداز فکر اور طرز عمل انسانی خودی کی نشو و نما اور سیرت و کردار کی تعمیر میں اس قدر معاون ثابت ہوتا ہے کہ قوموں اور ملتوں کے زمین و آسمان بدل جاتے ہیں۔ ان کے تصور اخلاق اور معیارات اقدار میں حسن و خوبی کے بہترین مظاہر وجود میں آجاتے ہیں۔

اس وقت مادہ پرستانہ طرز فکر کے زیر اثر دنیا کی آبادی تشویشناک حد تک بے اطمینانی اور اضطراب و سراسیمگی کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہے۔ اس صورت حال نے ان گنت نوعیت کے مسائل اور پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ انفرادی سطح پر مختلف نوعیتوں کی اعصابی بیماریاں عالم وجود میں آگئی ہیں۔ ان کا طبّی یا تحلیل نفسی کے ذرائع علاج تو درکنار ان کی تشخیص کے سلسلے میں، جیسا کہ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں، متضاد و متناقص نظریات پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے جہاں افراد کا سکون برباد ہو رہا ہے وہیں ازدواجی دائرے میں جو کسی معاشرے کی بنیاد ہوتا ہے، کیفیت انتشار اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ بہت سے جرائم کو، جن کے مہیب سائے معاشروں میں وبال جان بن گئے ہیں، ان اعصابی امراض ہی کے ثمرات خبیثہ شمار کیے جاتے ہیں۔

لیکن خرابی کی اصل علت کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ یہ اصل علت اللہ تعالیٰ پر تصور توحید کے جملہ تضمنات کے ساتھ ایمان کا فقدان ہے۔ اس سے انسان زندگی کے مادی پہلو کا اس قدر قیدی بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن و قلب کو اپنی باطنی و روحانی ضروریات اور نمود سے یکسر بیگانہ اور لاتعلق کر لیتا ہے۔ اگرچہ مغربی مادہ پرستوں نے انسان کو مادہ ہی کی ایک ترقی یافتہ جنس قرار دیا ہے جو اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہے، لیکن فی الحقیقت صورت یہ تو نہیں ہے اور نہ ہی اس دعوے کو ثابت کیا جا سکا ہے، جیسا کہ ہم اس سے قبل بحث کر چکے ہیں۔ مغرب کے اس تصور نے انہیں انسان کی اخلاقی و روحانی ضروریات سے یک قلم بے اعتنائی کا رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اس سے انسان کی باطنی دنیا میں ایک ایسا غیر فطری رجحان پیدا ہو گیا ہے جس سے اس کے فکر و کردار اور دنیوی زندگی کے متعلق اس کے نظریات عدم توازن کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ اگرچہ تکنیکی ترقی کی بدولت مغرب بقیہ دنیا پر تفوق حاصل کیے ہوئے ہے لیکن اس کا تمدن

داخلی طور پر انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر کھوکھلا ہوتا جارہا ہے، اور خارج میں اس نے صفحۂ ارض کے مختلف حصوں میں ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جو مستقبل میں ایک عظیم دھماکے کا باعث بن سکتے ہیں۔ آثار بتارہے ہیں کہ جس طرح روس کا کمیونسٹ نظام پختہ بنیاد کی عدم موجودگی کی وجہ سے جو اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہے از خود ہی زمین بوس ہو گیا ہے اسی طرح خدا ناشناس مغربی استحصالی نظام کے بھی اس حشر سے دوچار ہونے کے آثار قوموں اور تمدنی نظریاتی اکائیوں کے عروج وزوال کے فلسفے سے آشنائی رکھنے والے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے مغرب کے قائم کردہ نظام کے درہم برہم ہونے کے سلسلے کے التواء کے متعلق فرمایا:

دبا رکھا ہے اس کو زخم ور کی تیرِ ہ دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

(بال جبریل ص۳۹)

مغرب کے مفکرین اس بنیادی اصول کے فہم سے قاصر رہے ہیں کہ انسانی زندگی کے سیاسی، معاشی، اور معاشرتی مسائل کسی عمارت کے بالائی حصے کے مشابہ ہیں، لیکن اس بالائی حصے کی مضبوطی واستحکام اور اس کے نقشے کا دارومدار متعلقہ عمارت کی بنیاد کی ساخت و تقویت پر ہوتا ہے، اور یہ بنیاد انسانی زندگی کے حوالے سے ان نظریات پر مشتمل ہوتی ہے جو ایک طرف اس کائنات اور انسان کی ابتداء، تخلیق اور انجام سے اور دوسری طرف انسان کے اعلیٰ تر مقاصد حیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ حیات انسانی کی عمارت کی مضبوطی کا انحصار اسلام کے نزدیک تصور توحید اور اس کے مضمرات سے پختہ وابستگی پر ہے کیونکہ باقی سبھی عوامل توحید ہی کی فروغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تصور توحید شرک کی ہر شکل کی جڑ کاٹ دیتا ہے

اس سے قبل مختلف مباحث کے سلسلے میں ہم موقع و محل کے لحاظ سے شرک کی متعدد صورتوں کا تذکرہ کر چکے ہیں جو غیر اسلامی مذاہب اور تمدنوں میں مروج رہی ہیں۔ انسان کے طرز عمل میں یہ عجیب و غریب خصوصیت دیکھنے میں آئی ہے کہ جب وہ یکسوئی کے ساتھ بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے روگردانی کرتا ہے، اور صرف اسی کو معبود حقیقی تصور نہیں کرتا تو وہ اس قدر گر جاتا ہے کہ اپنے سے فروتر مخلوق، بے جان اشیاء اور وہمی ہستیوں تک کو معبودیت کا مقام دیدیتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے مٹی اور پتھر کے بتوں کے حضور اور اباؤاجداد کی قبروں پر جا کر اپنی حاجات طلبی کے لیے فریادیں کرتا اور ان کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کرتا ہے۔ اس طرز فکر و عمل کی کئی صورتیں مشرک معاشروں میں پائی جاتی

ہیں۔ قرآن نے سب کی تردید کی ہے۔ انکے مبنی بر کذب اور خلاف حقیقت ہونے کے متعلق دلائل بھی دیے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کو دعوت دینے کے مترادف قرار دے کر انذار سے بھی کام لیا ہے۔ ہم اس بات کو چند آیات قرآنی کا حوالہ دے کر واضح کریں گے۔ لیکن ہم پہلے یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہاں ان لوگوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کو تو مانتے تھے، اس کے وجود سے انکار نہ تھا، لیکن جو صفات اللہ اور صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہیں، اور ان میں کسی غیر اللہ کا ساجھا نہیں، ان میں وہ دوسروں کو، جن میں سے بعض کا ابھی سطور بالا میں مجملاً تذکرہ ہوا ہے، شریک کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹:۶۱)

ترجمہ: اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور کس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو، تو وہ جواب دیں گے اللہ نے۔

پھر فرمایا:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹:۶۳)

ترجمہ: اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے پانی کس نے اتارا، پس اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد تو وہ جواب دیں گے اللہ نے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو خالق کائنات اور ربوبیت کے مقام پر فائز مانتے ہیں تو انہیں مشرک کیوں قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بعض مرئی اور غیر مرئی ہستیوں کو تدبیر کائنات اور انسانوں کی حاجات روائی میں دخیل قرار دیتے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے تھے، حالانکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میں ہی تمہارا رب ہوں، میں ہی حاجت روا ہوں اور میں تمہارے قریب ہوں مجھ سے براہ راست دعا کے ذریعے سے مانگو۔ فرمایا:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲:۱۸۶)

ترجمہ: اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔

یہ حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ آپؐ میرے پیغمبر ہیں آپ کے ذریعے مجھ سے مانگیں یا میرے حضور دعا کریں بلکہ یہ فرمایا کہ میں قریب ہوں مجھے (براہ راست) پکاریں۔ اس کے بعد کس کا حق بنتا ہے کہ وہ یہود کے اخبار و رہبان اور نصاریٰ قسیسین کی طرح مذہبی دکان آراستہ کر کے بیٹھ جائے اور سادہ لوح اور دین کی تعلیمات سے بے خبر لوگوں سے زر معاوضہ حاصل کر کے انہیں یہ مبنی بر کذب تاثر دے کہ میں اللہ کے حضور تمہاری سفارش کروں گا۔ یا یہ کہ یہ میرے آباؤ اجداد دفن ہیں ان کی قبروں پر چادریں بچھاؤ، روپیہ پیسا ان کے مزاروں پر نچھاور کرو، یہ اللہ سے تمہاری حاجات پوری کرادیں گے۔ ایسے ہی لوگ پہلے انبیاء و رسل کی شریعتوں میں مشرکانہ عقائد و اعمال کے دخول کا ذریعہ بنتے رہے ہیں۔ ظواہر میں چاہے اختلاف رہا ہو لیکن اشراکی روح ایک جیسی ہی رہی ہے، یعنی غیر اللہ کی طرف وہ قدرت و اختیار منسوب کرنا اور ان سے حاجات روائی کی توقعات وابستہ کرنا جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ حجتہ اللہ البالغہ جلد اول میں لکھتے ہیں:

ومنها انهم كانوا يستعينون بغير الله في حوائجهم من شفاء المريض وغناء الفقير وينذرون لهم يتوقعون انجاح مقا هم بتلك النذور، ويتلون اسماء هم وجاء بركتها فاو جب الله تعالى عليهم ان يقولوا فى صلاتهم اياک نعبد و اياک نستعين قال تعالى فلا تدعوا مع الله احدا بل اياه تدعون فيكشف ما تدعون:

ترجمہ: شرک کی یہ بھی صورت تھی کہ وہ غیر اللہ کو اپنی حاجات کے لیے جیسے مریضوں کی شفاء، افلاس سے نجات اور اس قسم کی دوسری مرادوں کے لیے منتیں مانگتے تھے اور ایسی منتوں کو حصول مقاصد کا ذریعہ بناتے تھے اور برکت کی امید میں ان کے ناموں کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ اس قسم کے طرز عمل کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز میں یہ پڑھنا واجب قرار دے دیا۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے (ہر حاجت کے سلسلے میں) مدد مانگتے ہیں۔ بلکہ اسی کو پکارو گے تو وہ دور کرتا ہے اس مصیبت کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو۔ تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

یہاں دعا کے معنی عبادت کے نہیں ہیں جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے بلکہ اس سے مراد اپنی حاجات طلبی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

یہ بات اعمال شرکیہ میں شامل ہے کہ حرم مکہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ کسی اور جگہ حصول ثواب، بغرض عبادت و حاجت طلبی یا قرب الٰہی سفر کر کے جایا جائے۔ اس میں کوئی استثنیٰ نہیں، نہ کسی بڑے

سے بڑے مسلمہ حیثیت کے متبع دین کی قبر کا اور نہ ان مزارات کا جو پیشہ ور لوگوں نے تعمیر کر کے رکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ اقسام شرک کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

ومنها الحج لغير الله تعالى وذلك ان يقصد مواضع متبركته مختصنه بشركائهم يكون الحلول بها تقربا من هؤلا فنهى الشرع عن ذلك وقال النبي صلى الله عليه وسلم : " لا تشد الرحال الى ثلاثته مساجد"

اور یہ بات بھی شرک کی تعریف میں شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام اور مقام کا حج (یعنی بغرض عبادت و زیارت) کیا جائے، اور ارادہ نیت یہ ہو کہ یہ جگہیں ان کے شرکاء کے لیے متبرک اور مختص ہیں، اور ان کی طرف جانا قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھا جائے۔ شریعت نے اس سے منع کیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین مساجد کے سوا اور کسی جگہ کے لیے (بغرض عبادت) سواری تیار نہ کی جائے یعنی سفر نہ کیا جائے۔

غور فرمایئے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں سطور بالا میں بیان کردہ منہیات میں سے کونسی ہیں جن کے مسلمانوں کے ہاں بعض گروہ اور فرقے مرتکب نہیں ہو رہے۔ کیا مزعومہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر حاجات طلبی نہیں کی جا رہی؟ کیا مریضوں کے لیے حصول شفاء کے لیے وہاں نہیں جایا جاتا؟ کیا اکتساب رزق سے متعلقہ اغراض کے لیے ان کی زیارت نہیں کی جاتی؟ کیا وہاں چڑھاوے نہیں چڑھائے جاتے؟ کیا حصول ثواب و برکت کے لیے وہاں جا کر وہاں مدفون بزرگ کی یاد یا اس کے تصور کو قلب میں جاگزیں کر کے چلا کشی نہیں کی جاتی؟ کیا اسی طرح لوگ مختلف بزرگوں کے عرسوں پر سفر کر کے نہیں جاتے جیسے حج بیت اللہ کے لیے جانے کا حکم ہے؟ اور کیا وہاں ان سب خرافات کو جیسے ناچ، گانے، منشیات کے استعمال وغیرہ قسم کی حرکات بر سر عام نہیں کی جاتیں جنہیں زندہ ہونے کی حالت میں وہ بزرگ خلاف شریعت قرار دیتے؟

قرب خداوندی حاصل کرنے کے لیے غیر اللہ کی عبادت کی ان الفاظ میں مذمت کی گئی ہے:

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (۳۹:۳)

ترجمہ: یاد رکھو کہ اطاعت خالص کا کارساز اللہ ہی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں۔ اللہ

ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو بامراد نہیں کرے گا جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔

شرک کی کئی صورتیں رائج تھیں اور ہیں۔ جو جس دور اور جن لوگوں کے درمیان بھی رائج ہوں ان کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ مذمت کرتے ہیں اور ناقابل معافی قرار دیتے ہیں ان میں سے بعض کا یہاں اجمالاً تذکرہ کرتے ہیں۔ مزید مطالعہ کے لیے قرآن و حدیث سے رجوع کیا جائے:

ا۔ بتوں کی پرستش

شرک کی یہ صورت قدیم دور سے چلی آ رہی ہے، اور ابھی تک ہندوؤں میں بڑے پیمانے پر مروج ہے۔ قرآن میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں بیان ہوا ہے کہ آپؑ نے اپنے باپ سے فرمایا:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۶:۷۴)

ترجمہ: اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر سے کہا، کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو، میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کے سامنے اصنام پرستی کے خلاف ایک سادہ سی لیکن محکم دلیل پیش کرتے ہیں:

قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا (۱۹:۴۲)

ترجمہ: یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔

اس کے جواب میں اپنی روش پر اصرار کرتے ہوئے آپؑ کا باپ کہتا ہے:

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (۱۹:۴۶)

ترجمہ: اے ابراہیمؑ! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور اور دفع ہو!

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے۔ ان میں تین سب سے نمایاں بتوں کا تذکرہ قرآن میں مشرکین کے اس تصور کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ وہ ان کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ خدا سے ان کی دنیوی ضروریات کو پورا کروا سکتی ہیں:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۙ۱۹ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۲۰ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۲۱ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۲۲ اِنْ هِىَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (۵۳:۱۹–۲۳)

ترجمہ: بھلا، کبھی غور کیا ہے لات اور عزیٰ اور منات پر جو تیسری اور درجہ کے اعتبار سے دوسری ہے۔ تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اس کے لیے بیٹیاں! یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ محض گمان اور نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں بت پرستی کی مروجہ صورت، مشرکین کی ناسمجھی اور گمراہی اور اس رویے کے خلاف دلائل بیان ہو گئے ہیں۔ کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ کسی کا اللہ سے تناسلی تعلق قرار دینا

شرک کی یہ صورت بھی انسانی تاریخ میں کثرت سے پائی جاتی ہے مثلاً ہم ''پس منظر'' کے باب میں عرض کر چکے ہیں کہ قدیم ادوار میں چین کے بادشاہ کو ایک آسمانی صاحب قدرت ہستی کی اولاد سمجھا جاتا تھا جس سے اس کا براہ راست تعلق ہوتا تھا، جب کہ رعایا میں سے کوئی بھی اس کا استحقاق نہیں رکھتا تھا۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ (۹:۳۰)

ترجمہ: اور یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور نصاریٰ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔

یہ فہم عام (Common Sense) کی ایک بات ہے کہ نوعی تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے اولاد پیدا کرنے کا قانون اور قاعدہ قدرت کی طرف سے رائج کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک کی ارضی زندگی عارضی ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳:۱۸۵) کے مطابق ہر ایک نے موت کی آغوش میں جانا ہے۔ اس کے نتیجے میں ترکے اور وراثت کے معاملات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جھگڑے اور اختلافات رونما ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی پھر وہ احد اور واحد ہے۔ اور پھر یہ کہ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ

لَّهٗ صَاحِبَةٌ(۶:۱۰۱) کے مطابق جب اس کی کوئی بیوی نہیں تو اس کے لیے اولاد کا کیسے تصور قائم کیا جا سکتا ہے نیز ایک غبی سے غبی انسان بھی سوچ سکتا ہے کہ اللہ کی اولاد کا سلسلہ چل نکلے اور اس کائنات میں متعدد الٰہ وجود میں آجائیں تو کیا صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا(۲۱:۲۲)

ترجمہ: اور آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتا تو وہ یقیناً بگڑ کے برباد ہو جاتے۔

پھر فرمایا:

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ(۲۳:۹۱)

ترجمہ: خدا نے کسی کو اپنی اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔

اللہ کی طرف اولاد منسوب کرنے کے خیال میں جو واضح حمق پایا جاتا ہے وہ کسی صاحب ہوش انسان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اور مندرجہ بالا آیت میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو وہ آپس میں برسرپیکار ہو جاتے تو اس کے انسانی سوچ کے حوالے سے بھی قرین عقل ہونے میں کوئی اشتباہ نہیں ہو سکتا۔ آپ یونانی دیومالا (Mythology) کی مثال لے لیجئے جو اگرچہ توہم پرستی ہی کی پیداوار ہے اور جسے سقراط نے جذبہ استخفاف واستحقار سے ٹھکرا دیا تھا، لیکن یہ دور حاضر کے عقل پرست تمدن سے منسلک تمام اقوام عالم کے ادب کا جزو بنا ہوا ہے۔ سقراط کے توحیدی تصور کے تذکرے کے دوران ہم بیان کر چکے ہیں کہ یونانی اپنے دور عروج میں بھی بہت سے خداؤں (Gods) کے قائل تھے۔ ان کی دیومالا مضحکہ خیز اور خرافاتی واقعات سے بھری پڑی ہے جو ان خداؤں کی طرف منسوب ہیں۔ اولمپس (Olympus) نام کے پہاڑی سلسلے میں جو ان خداؤں کا مسکن تصور کیا جاتا تھا ان کے درمیان جنگ و پیکار کی طویل داستانیں وضع کی گئی ہیں جن کے نتیجے میں زیس (Zeus) اپنی قوت کے بل پر دوسرے خداؤں پر چھا جاتا ہے۔ ان داستانوں میں دیویوں (Goddesses) اور بشری خواتین سے اس کے معاشقوں کے قصے بھی شامل ہیں جن کے نتیجے میں چھوٹے دیوتا اور فوق البشر اولاد پیدا ہوتی رہی۔ اس زیس کا باپ کرونس (Cronus) تھا جس نے اپنے باپ کو قتل کیا اور اس کے بعد اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اسی طرح ان خداؤں کی عشق و محبت کے سلسلے کی رقابتوں اور ازدواجی زندگی کی ناخوشگواریوں کی کہانیاں بھی زبان زد خلائق تھیں۔

بہر حال قرآن اللہ وحدہ لاشریک کے متعلق صاف اور واضح الفاظ میں کہتا ہے:

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ (۱۱۲:۳)

ترجمہ: نہ وہ کسی کا باپ اور نہ کسی کا بیٹا۔

۳۔ جنات پرستی:

عربوں کے فکر و نظر پر جو قرآن کے مخاطبین اول تھے جنات کی قوت و طاقت اور انسانی زندگی پر نفع و نقصان کے حوالے سے ان کے اثر کا بہت غلبہ تھا۔ ان کے ہاں کاہنوں کا ایک طبقہ پایا جاتا تھا جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ جنات کی مدد سے لوگوں کے دلوں کے مخفی خیالات معلوم کر سکتے اور ان کے مستقبل کے متعلق پیشین گویاں کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جنات کی طرف بعض صفات الوہیت منسوب کر رکھی تھیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۱۰۰:۶)

ترجمہ: اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں۔

جنوں کے متعلق وہ اس خیال خام میں مبتلا تھے کہ وہ انسانوں کو ضرر اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آیت ۱۰۰ میں مشرکین عرب کے مشرکانہ عقاید کا رد کیا ہے۔ یہ لوگ جنوں کی نسبت طرح طرح کے توہم پرستانہ خیالات رکھتے تھے، اور سمجھتے تھے وہ جس انسان کو چاہیں مافوق الفطرت طریقہ پر نقصان پہنچا دیں۔ جسے چاہیں عجیب عجیب طاقتیں دے دیں۔ نیز ان کا خیال تھا کہ پاک روحیں یعنی فرشتے خدا کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں، اور وہ کارخانہ ہر عالم میں طرح طرح کے تصرفات کر سکتے ہیں۔'' (ترجمان القرآن جلد اول ص ۱—۶۴۰)

ملائیکہ کی پرستش:

اللہ تعالیٰ نے تو تخلیق آدم کے وقت اس کے لیے فرشتوں سے سجدۂ تعظیم کروایا (۲:۳۴) لیکن بعض انسان ہیں کہ وہ فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ بعثت اسلام کے وقت عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ملائیکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان جس کو بھی اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے گا اسے لازماً اس کی الوہیت میں بھی حصہ دار بنائے گا اور اس طرح واضح طور پر شرک کا مرتکب ہو گا۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی اور قرآن اس

بات کی توثیق کرتا ہے کہ دائرہ اسلام سے باہر کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد مرئی وغیر وہمی اور وہمی ہستیوں اور اشیاء کو کارسازی وحاجت روائی کا ذریعہ تصور کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے ساجھی ہونے کا عقیدہ رکھتی رہی ہے۔ جو لوگ اپنے ہاتھوں سے گھڑے ہوئے بتوں کو الوہیت کا مقام دے دیں، ان کا خطاء و معصیت کے ارتکاب سے مبرا ملائیکہ کو کارخانہ عالم کو چلانے میں حصہ دار بنالینا باعث حیرت نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن نے جیسا کہ ہم واضح کرتے چلے آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں کسی نوعیت اور کسی قسم کی شرکت کو گوارا نہیں کیا۔ اس طرح ملائیکہ کے متعلق بھی قرآن میں جہاں جہاں تذکرہ کیا گیا، ان کے اللہ کے امر کے تابع ہونے کی حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ(۹۷:۴)

ترجمہ: اس (یعنی شب قدر) میں فرشتے اور روح اترتے ہیں، ہر امر میں، اپنے رب کی اجازت کے ساتھ

مفسرین کے نزدیک الروح سے مراد یہاں حضرت جبریلؑ ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۲ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ(۱۶:۲-۳)

ترجمہ: وہ فرشتوں کو اپنے حکم سے الروح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے کہ لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو مجھی سے ڈرو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک گردانتے ہیں۔

الروح سے مراد یہاں وحی الٰہی ہے۔

اس طرح قرآن میں جہاں بھی ملائیکہ کا تذکرہ ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ہر کام اللہ کے حکم کے تحت کرتے ہیں، وہ از خود کوئی فعل سرانجام نہیں دیتے اور نہ دے سکتے ہیں۔ اور پھر انہیں حکم ہوتا ہے کہ بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کا پیغام اس کے منتخب بندوں (یعنی انبیاء ورسل) تک پہنچائیں۔ ان حالات میں انہیں پرستش کا سزاوار کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔

۵۔ اجرام فلکی کی پرستش:

اجرام فلکی کی طرف انتساب الوہیت بھی دنیا کے مختلف حصوں میں مشرکین کا ایک نمایاں مشغلہ رہا ہے۔ اس رویے سے عرب بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔ آسمانی کواکب کا ان کی دسترس سے ماوراء ہونا، ان کی چمک

دمک، سلسلۂ روز و شب سے ان کا تعلق، موسموں کے ردوبدل سے ان کا رابطہ اور فصلوں کے پکنے اور اگنے کے عمل پر ان کے اثرات ان کے احساسات واہمہ کو ان کی الوہیت کا مقام تسلیم کرنے کے لیے بنیاد فراہم کر دیتے تھے۔ مثلاً مصر میں دریائے نیل اور سورج کی پرستش کا یہ جواز تھا کہ نیل فصلوں کے لیے پانی اور طغیانی کے ذریعے زمین کی سطح پر مٹی کی نئی تہہ جما کر کھاد مہیا کرتا ہے اور سورج فصلوں کو اگانے اور پکانے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اہل مصر ان مظاہر کو اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت کا جزو تصور کرتے وہ ان کے کردار کو دریائے نیل اور سورج کی صفات الوہیت کی طرف منسوب کرتے تھے۔ سورج کی پرستش تو ویسے بھی مصر میں قدیم دور سے کی جاتی تھی۔ اسی طرح عرب شعریٰ ستارہ کی بارش کے برسانے پر قدرت رکھنے کی وجہ سے پرستش کرتے تھے۔

قرآن نے اعلان کیا:

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ (۴۱:۳۷)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو، بلکہ سجدہ کرو اس اللہ کو جس نے ان ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

اگرچہ آیت بالا میں بات کواکب پرستی کی نفی کے حوالے سے کی گئی ہے لیکن اس میں شرک کے خلاف دلیل بھی موجود ہے اور اصول بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ اصول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی خالق کل ہے تو اس کے سوا کوئی اور شے یا ہستی عبادت اور الوہیت کی سزاوار نہیں ہو سکتی۔ اور دلیل یہ ہے کہ جب کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ روش پر چل رہی ہے اور اس طرح خود مجبور و مسخر ہے تو اسے مسند الوہیت پر بٹھانے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

۶۔ غیر اللہ کو حق تشریعی دینا بھی شرک ہے:

منزل من اللہ ادیان سابقہ کے مسخ ہونے اور ان کی اصل تعلیمات میں حذف و اضافہ کی ایک نمایاں وجہ یہ رہی ہے کہ ان میں ایسے گروہ اور طبقات پیدا ہوتے رہے جو دین کے معاملات میں اپنی اجارہ داری تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ صحف آسمانی کو عوام کی دسترس سے بالا رکھتے اور انہیں بازیچۂ اطفال بنا کر ان میں ردوبدل کرتے رہتے۔ اس طرح وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کا استحقاق بھی منوا لیتے تھے۔ قرآن

نے ان کی اس حرکت کی صراحت کے ساتھ وضاحت کر کے دین اسلام میں کسی تغیر و تبدل کا دروازہ بند کر دیا۔ چنانچہ قرآن یہود و نصاریٰ کے متعلق کہتا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ(۹:۳۱)

ترجمہ: انہوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ انہیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔

احبار کی اصطلاح یہود کے اور رھبان کی نصاریٰ کے مذہبی رہنماؤں کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ قرآن نے انہیں رب بنائے جانے کی تشبیہ اس لیے دی ہے کہ وہ خود ساختہ تشریعی احکامات کا اجراء کرتے تھے۔ اور ان کے یہ احکامات درست تسلیم کیے جاتے، اور اس طرح شریعت کا حصہ بن جاتے تھے۔ مفسرین نے اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے عدی کی وہ گفتگو نقل کی ہے جو اس نے حضورؐ کے ساتھ اس آیت کے سلسلے میں کی تھی۔ اس نے آنحضرت سے کہا کہ کیا جب یہود و نصاریٰ اپنے پیشواؤں کی عبادت نہیں کرتے تو انہیں رب کا مقام کیسے دیا جا سکتا ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ وہ ان کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور حرام کیسے ہوئے کو حرام تسلیم کر لیتے ہیں اور یہی بات انہیں رب قرار دینے کے مترادف ہے۔ ویسے بھی اس آیت میں صرف اللہ ہی کی عبادت کرنے اور اسے ہی الٰہ ماننے کا ذکر کر کے اور اپنی ذات و صفات میں کسی کی شرکت سے پاک قرار دینے کے تذکرے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر اللہ کو حق تشریعی دینا شرک کے ارتکاب ہی کے ہم معنی ہے۔

آگے چل کر احبار و رھبان کی حرکات شنیعہ کے محرکات کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ(۹:۳۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! ان فقیہوں اور راہبوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقوں سے ہڑپ کرتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ میں ان کے مذہبی رہنماؤں اور شیوخ کے دین فروشی کے کاروبار کی مذمت کی ہے۔ خصوصیت سے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر یہ بات کہنے سے یہ غایت واضح ہوتی ہے کہ انہیں اس روش سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ دین اسلام کے اصولوں اور اساسات میں کسی مفاد پرست گروہ یا طبقے کی فتنہ سامانیاں کوئی تغیر و تبدل یا تحریف نہیں کر سکیں البتہ عوام کی سادہ لوحی اور بے خبری سے فائدہ اٹھا کر بعض لوگوں نے وراثتی رنگ میں مشیخت کے اڈے قائم کر لیے ہیں جو دین کا غلط تصور پھیلانے کے مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں اور 'اموال الناس' بٹورنے کا ذریعہ ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی توضیح کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''یعنی روپیہ لے کر احکام شرعیہ اور اخبار الہیہ کو بدل ڈالتے ہیں۔ ادھر عوام الناس نے انہیں جیسے پہلے گزرا خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہ ہی ان کے نزدیک حجت ہے۔ اس طرح یہ علماء مشائخ نذرانے وصول کرنے، ٹکے بٹورنے اور اپنی سیادت اور ریاست قائم رکھنے کے لیے مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہ حق سے روکتے رہتے ہیں۔ کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دین حق اختیار کر لیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے۔ یہ حال مسلمانوں کو سنایا تاکہ متنبہ ہو جائیں۔''

باب نمبر ۹

عالم آخرت

بعثت اسلامی کے وقت جوابدہی کے تصور کی تکذیب

حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نبوت سن ہجری کے حساب سے تئیس سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ان میں تیرہ برس مکی دور پر مشتمل ہیں۔ اس دور کی قرآنی سورتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں اسلامی نظام فکر و عقائد کے سلسلے میں دو مضامین سب سے نمایاں ہیں۔ ایک توحید اور دوسرے عالم آخرت جس کے لیے ''معاد'' کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے۔ مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے تو قائل تھے لیکن توحید سے منحرف

اور شرک کا ارتکاب کرتے۔ کہتے تھے کہ عبادت کے مستحق ہمارے بت ہیں کیونکہ وہی ہمارے لئے اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں (۳۹:۳) لیکن دور حاضر کے مغربی مادہ پرستوں کی طرح وہ معاد کے انعقاد کے منکر تھے۔ چنانچہ قرآن ان کے متعلق کہتا ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ(۳۸:۱۶)

ترجمہ: اور یہ پکی پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا۔

اور یہ کہ:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ(۳۴:۳)

ترجمہ: اور جنہوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔

وہ تمسخر کے انداز میں حضورؐ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ موت کے بعد ریزہ ریزہ ہو چکنے کے باوجود تمہیں ایک زندگی بخشی جائے گی:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ(۳۴:۷)

ترجمہ اور جنہوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی دکھائیں جو تم کو یہ خبر دے رہا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو از سر نو ایک نئی خلقت میں اٹھائے جاؤ گے۔

انبیاء ورسل کی تعلیمات میں تو وحی کی روشنی میں عقیدۂ آخرت واضح اور مبنی بر حقیقت صورت میں پایا جاتا ہے اور ان کے متبعین بھی اس پر کامل یقین رکھتے تھے۔ لیکن جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے اکثر غیر اسلامی اجتماعی اکائیوں اور تمدن میں بھی کسی نہ کسی قسم کی مابعد الموت زندگی کا غیر واضح اور مسخ شدہ تصور پایا جاتا رہا ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو اخروی زندگی کے یکسر منکر تھے اور اسی لحاظ سے دور رواں میں مغرب نے یہ کہہ کر کہ انسانی زندگی صفحہ ارض پر ہی اس کے وجود تک محدود ہے، کوئی بڑا فکری کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ایسے عقیدے کی کوئی محکم بنیاد نہ پہلوں نے پیش کی اور نہ آج پیش کی جا رہی ہے۔ یہ محض اپنے اعمال کے نتائج اور جزاء وسزا کے نظریے سے فرار کی ایک صورت اور اپنی ذمہ دارانہ حیثیت اور جوابدہی کے تصور سے گریز کرنے کی ایک راہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ دو تین صدیوں سے مسلمان ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں انہیں دوسرے اسلامی افکار کے علاوہ تصورات توحید و معاد کے سلسلے میں ایک بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہے۔ اور نفاذ دین

کے لیے ان دونوں تصورات کا فروغ اور احیاء چونکہ ضروری ہے لہٰذا مکی دور نبویؐ سے رہنمائی اور فیضان حاصل کرنا لازمی شرائط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اخروی زندگی کے متعلق، جو اس وقت زیر گفتگو ہے، انسانی قوت فہم کے مطابق واضح تصور پیش کیا گیا ہے جس سے فکر و عمل کے دائروں میں انسان کے اپنے خالق کے سامنے جوابدہ ہونے کی حقیقت اجاگر ہو جاتی ہے۔

اسلام میں انسان کے جوابدہ ہونے کا تصور

ہستی باری تعالیٰ اور معاد کے تصور کی حقیقت کی طرف رہنمائی کے لیے جہاں اور بہت سے انسانی زندگی اور کائناتی وجود کے مظاہر رہنمائی کرتے ہیں وہیں یہ منطقی دلیل بہت وزنی دکھائی دیتی ہے کہ اس عالم کو جس کی ہر بات کو ہم علت و اسباب کے تابع قرار دیتے ہیں کلی طور پر اسباب و مسببیات کے مطابق نہیں چل رہا۔ چاہے اسے ہماری سمجھ کی نارسائی قرار دیجئے، لیکن بہت سے عوامل ایسے مشاہدے میں آتے ہیں جن کی توجیہہ کرنے سے انسانی عقل قاصر ہوتی ہے اور انسانی اختیار و ارادہ بہت سے معاملات میں بالکل بے بس دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً جبر و قدر کا مسئلہ بسیار سعی و جہد کے باوجود لاینحل رہا۔ اگر انفرادی زندگی کی بوقلمونیوں پر غور کیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ اگرچہ ظاہراً تمام انسانوں کی ساخت ایک جیسی ہے لیکن شکلوں، صورتوں، صلاحیتوں اور مزاجوں میں واضح تفاوت ہے۔ ایک ہی قسم کے حالات، آب و ہوا، معاشرتی فضا اور سیاسی و اقتصادی ماحول میں مختلف انسانوں کے اندر مختلف قسم کی توانائیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں متصادم رجحانات فکر و سیرت روزمرہ کے مشاہدے میں آتے ہیں۔

ا۔ انسانی بے بسی کا ایک نمایاں پہلو

سب سے پہلے تو آپ ان حالات پر غور کریں جن میں انسان اپنے آپ کو بوقت پیدائش گھرا ہوا پاتا ہے۔ وہ اس معاملے میں بالکل بے بس ہے۔ ایک فرد مفلوک الحال گھرانے میں پیدا ہو جاتا ہے تو دوسرا شاہی محل یا دنیوی نعمتوں اور سہولتوں سے وافر حصہ پانے والے گھرانے میں جنم لیتا ہے۔ کسی انسان کو ایسے والدین ملتے ہیں جو جہالت کے اندھیرے میں گھرے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی دوسرے کے لئے علم و فضل کی روشنی اول روز سے ارزانی ہوتی ہے۔ کوئی ایسے خاندانی یا قومی ماحول میں پیدا ہوتا ہے کہ اس کو قدرت کی طرف سے عطا شدہ صلاحیتوں کے کام میں لانے کا موقع ہی نہیں ملتا اور کسی دوسرے کو کم درجے کی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرنے کے مواقع میسر آجاتے ہیں۔ اسی طرح کوئی مختلف قسم کی جسمانی و ذہنی کمزوریوں کے ساتھ اس دنیا میں آتا ہے اور کسی کو قدرت کی طرف سے بہت سی خوبیوں اور توانائیوں سے نوازا جاتا ہے۔ اگرچہ مغرب میں فروغ پانے والی علم

النفسیات کی متصادم و متناقص تھیوریوں سے ہمیں اتفاق نہیں، کیونکہ وہ انسانی فطرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ وہاں کے فاسد نظام معاشرت کی روشنی میں وضع کی گئی ہیں لیکن ہم مغربی فکر کے دلدادگان کو ذہن میں رکھ کر عرض کرتے ہیں کہ ان کے مطابق ماں کے پیٹ ہی میں انسانی نفسیات کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے اور اس معاملے میں فرد متعلقہ بے بس ہوتا ہے۔ یہ صنف علم عقیدۂ جبر اور تقدیر جامد کی توثیق کرتا ہے۔

جب انسان احتیاج کے مرحلے سے نکل کر بتدریج اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جاتا ہے تو زندگی میں اس کو جہاں ایسی حالتیں نظر آتی ہیں جن سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ دنیا اسباب و مسببیات کے نظام کے تحت چل رہی ہے وہیں وہ بہت سے معاملات میں یہ محسوس کرتا ہے فراہمئ اسباب کے باوجود اس کی سعی و جہد سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جن کی اسے توقع تھی اور جو بعض دوسرے لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں برآمد ہو رہے ہیں۔ اس کی یہ جدوجہد مادی مقاصد کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور اعلیٰ اقدار کے نفاذ کے لیے بھی۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ مظلومیت اور بے کسی کی زندگی گزارتے ہیں اور بعض دوسرے ظالموں اور جبارین و قاہرین کی، لیکن مکافات عمل کا قانون اس دنیا میں مؤخر الذکر کو اپنی گرفت میں نہیں لیتا۔ اب اگر یہ کائنات عدل کی بنیاد پر قائم ہے، جس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا ہی ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ دونوں گروہ اسی طرح چھوٹ جائیں اور اعمال حسنہ و سیئہ کے نتائج یکساں ہی رہیں۔ پھر ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں کہ نیکی اور خیر کے بدلے میں تکالیف اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بدی اور معصیت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اور اس ڈرامے کے سبھی کردار اس دنیا سے اسی حالت میں رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر انسانی زندگی کی داستان کو اسی طرح ختم ہو جانا ہے تو ایسی حالت اندھیر نگری اور چوپٹ راجہ کے مصداق ہو گی، اور اس کائنات میں جو حیرت انگیز نظم اور عظمت نظر آتی ہے اس کے پیش نظر یہ بات ممکن دکھائی نہیں دیتی۔

چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ اچھائی اور برائی اللہ تعالیٰ کے نزیک یکساں نہیں ہیں:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ(۶۸:۳۵-۳۶)

ترجمہ: کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے! تمہیں کیا ہوا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو!

ارضی زندگی کے دوران عطائے اختیار و ارادہ کے ساتھ آزادی عمل کا تلازم ایک منطقی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے مجرموں کے متعلق فرمادیا:

اِنَّا بَلَوۡنٰہُمۡ(۶۸:۱۷)

ترجمہ: ہم نے ان کو امتحان میں ڈالا ہے۔

اور یہ کہ:

وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ(۶۸:۴۵)

ترجمہ: اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں۔ بیشک میری تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔

آزادی عمل ہی آزمائش وارتقاء کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو انسان کے لیے امتحان گاہ بنایا ہے۔ صورت یہ نہیں ہے کہ یہاں برائی اس لئے پائی جاتی ہے کہ (معاذ اللہ) معاملات دنیا کو صحیح خطوط پر چلانے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ بے بس ہے، جیسا کہ بعض مغربی مادہ پرستوں اور دہریوں نے اظہار رائے کیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی "تدبیر محکم" کے تحت انسان کو راہ راست پر چلنے کی ہدایت دے کر اس پر چلنے یا نہ چلنے کی آزادی دے رکھی ہے۔ اس کے بعد عدل کے تقاضے کے تحت ایک اور جہان وجود میں آئے گا جہاں انسان اپنے اعمال کی جزا و سزا سے دوچار ہو گا۔ اگر جزا و سزا کا یہیں اہتمام کر دیا جاتا تو امتحان و آزمائش کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اور ملائیکہ کی طرح انسان ایک ہی روش پر چلتے ہیں۔

۲۔ اس دنیا میں مکافات عمل کا قانون کلیتاً نافذ نہیں ہو سکتا

یوں تو ہر نظام اجتماعی میں اپنے اپنے فکر کے مطابق احتساب اور جوابدہی کا کسی نہ کسی درجے میں اہتمام کیا جاتا ہے لیکن اسلام اسی ارضی زندگی کے دوران ایسا نظام وجود میں لاتا ہے جس کی ہیئت کے اندر کلیت پسندانہ رجحانات کے بغیر معاملات ریاست کو چلانے والوں اور عام شہریوں کے احتساب کا انتظام ہوتا ہے۔ یہ بحث تو اپنے مقام پر آئے گی، یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بات انسانی بس سے باہر ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن اور ہر فعل کے پیچھے کام کرنے والی نیت اور غایات کو بے کم و کاست متعین کر کے اس سے جواب طلبی کر سکے اور اس کی سیرت و کردار کے درجے کے مطابق عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق اسے جزاء و سزا سے ہمکنار کرے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ہی ظاہری شکل کے فعل اور اس کے سلسلے کے دعاوی کے باوجود انسانوں کے باطنی مقاصد میں تضاد ہوتا ہے۔ دنیوی قانون بعض اوقات شہادتوں کی اساس پر ان مقاصد کے حسن و قبح کا تعین کر سکتا ہے اور بعض اوقات نہیں کر سکتا۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات انسانی افعال قانون کی گرفت میں آتے ہی نہیں اور ان کا تعلق اخلاقی اقدار سے ہوتا ہے جو انسان کی اصل سیرت اور خودی کی تعمیر و نمود اور تخریب و تنزل کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ یہی بات انسان کے صحیح مرتبہ و مقام اور اس کے اندر پائے جانے والے شرف و مجد یا کم قدری و فرسودگی کا تعین کرتی ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ مفاد پرستی کے جذبے کے تحت اپنے

خبث باطن کو چھپا کر بعض لوگ دوسروں کو اپنے فرشتہ سیرت ہونے کا تاثر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یوں تو اس سلسلے میں بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن ہم چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

فساد زدہ معاشروں میں اکتساب رزق کی سرگرمیوں کے دوران جو لوگ ناجائز ذرائع سے کثیر دولت جمع کر لیتے ہیں، وہ بغرض نمائش بعض حلقوں کو جن میں مذہبی ''بزرگ'' نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اپنی سخاوتی داد و دہش سے نواز کر اپنے اعمال بد کی پردہ پوشی کرنے اور نیک ناموں کے زمرے میں شامل ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح شریعت کے تقاضوں کو درپردہ پامال کرنے والے بہت سے پیشہ ور مذہبی لوگ قطب اور اولیاء اللہ کہلوانے لگتے ہیں۔ قومی معاملات میں سیاستدان ان مذہبی لوگوں کی ہمسری کا بجا طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ایک کثیر تعداد کا رات دن کا مشغلہ منافقانہ حرکات پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن وہ ہر قسم کی اصول شکنی اور قومی ترقی کے کسی منصوبے سے ناشناسی کے باوجود محب وطن اور قومی ہیرو اور عوامی امنگوں کے ترجمان قرار دیئے جاتے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے کسی ایک زمرے میں شامل ہونے کے اہل نہیں ہوتے، اور حب اقتدار کے جذبے کے تحت ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں جو درحقیقت تخریب کا باعث ثابت ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال ابلیس کی ''عرضداشت'' کے عنوان کے تحت جو اس نے خدا تعالیٰ کے حضور گزاری، کہتے ہیں:

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

(بال جبریل صفحہ ۲۱۵)

آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مختلف ممالک کے اندر بعض اوقات کھلے بندوں اور بعض صورتوں میں غیر محسوس طور پر ایک طبقہ جملہ اخلاقی قدروں کو روند کر اور تجارتی و سیاسی اصولوں کو پامال کر کے ساری قوم کا استحصال کرنے کے راستے پر گامزن ہوتا ہے اور ان کے لیے کئی قسم کی اذیتوں کا باعث بنتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ستم رسیدہ طبقات کے دکھوں کو تقدیر کا کیا دھرا قرار دیا جاتا ہے۔ پھر عدل وانصاف کی پامالی کا سب سے عظیم مظہر بین الاقوامی دائرے میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قاعدے کے نفاذ کی شکل میں عیاں ہے۔ اگرچہ صفحہ ارض پر ماضی میں بھی یہ کھیل کھیلا جاتا رہا ہے، لیکن خصوصیت سے زمانہ حال میں سائنس کے انسان کش اور مادہ پرستانہ فلسفے کے اخلاق سوز کردار کے ذریعے سے اس کی مہیب ترین صورتیں سامنے آرہی ہیں۔ طاقت کے نشے سے سرمست ہو کر مغربی تمدن نے ارضی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو نکبت، فلاکت، فاقہ کشی، جہالت

اور اخلاقی و جسمانی بیماریوں کی اندھیری غار میں دھکیل دیا ہے اور ان کی لاشوں پر اپنے محلات تعیش تعمیر کر رکھے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس صورت حال کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

(بال جبریل صفحہ ۱۴۶)

اس شعر میں علامہ نے موجودہ نظام عالم کے ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مندرجہ بالا اجمالاً بیان کردہ ناانصافیوں اور عدل سوزیوں پر گرفت کا عمل ظہور میں نہیں آئے گا؟ کیا یہ سب افراد، حلقے، طبقات اور اقوام جو متذکرہ صدر جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں، یوں ہی چھوڑ دیئے جائیں گے؟ کیا مظلوموں کی کبھی دادرسی نہ ہو گی اور نہ بے اختیاری میں پیچھے رہ جانے والے تلافی سے ہمکنار ہوں گے؟ اسلام اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ مذہب کے محدود تصور کی وجہ سے بہت سے معاملات کو خدائی بازپرس کے دائرے سے باہر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دین اسلام ہمیں ایک کائناتی فلسفہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ارضی زندگی محل آزمائش ہے، اگر یہاں مکافات عمل کا کلی اہتمام کر دیا جاتا تو اس کے وجود کی موجودہ صورت اور غایت ختم ہو جاتی۔ لہٰذا اسے کھیت میں اچھا یا برا بیج ڈالنے کے مشابہ تصور کیا جائے۔ اسی کے مطابق فصل کاٹنے کے لیے اس جہان کے تسلسل میں ایک اور قسم کا جہان جزاء و سزا وجود میں لایا جائے گا۔ اسی طرح جیسے یہ جہاں وجود میں لایا گیا۔ پھر وہی ہستی جو انسان کی خالق ہے اور جس سے اس کے ظاہر و باطن کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے اور جس کے لیے اس کی نفسیات کی کوئی پیچیدگی لاینحل نہیں، اس کے اعمال کے حسن و قبح پر اپنا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی صفات کی وجہ سے جو درج ذیل قرآنی آیات میں بیان ہوئی ہیں، اس بات پر قدرت رکھتا اور اس کا اہل ہے کہ تمام انسانوں، جماعتوں، گروہوں اور قوموں کے اعمال کا ان سارے ظاہری اور چھپے ہوئے عوامل کو پیش نظر رکھ کر جو ان سے متعلق ہیں، تعیین کر کے جزا و سزا کا فیصلہ کرے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی علمی ہمہ گیری

قرآن کہتا ہے وہ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا(۱۷:۳۰)

ترجمہ: بے شک وہی اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا(۱۷:۱۷)

ترجمہ: اور تمہارا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے کافی ہے۔

انسان جو کچھ کہے یا کرے وہ اسے سنتا اور جانتا ہے:

اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ(۷:۲۰۰)

ترجمہ: بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

وہ دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے:

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ(۱۱:۵)

ترجمہ: وہ ازل سے ابد تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کو روز قیامت جمع کرے گا اور اپنے علم کی بنیاد پر ان کے اعمال کے مطابق حکمت کے ساتھ جزاء و سزا دے گا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ(۱۵:۲۵)

ترجمہ: اور بے شک تمہارا خداوند وہی ہے جو ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کائنات ایک مقصد کے تحت پیدا کی ہے لہٰذا جزاء و سزا کے دن کا اعتقاد ہونا ایک منطقی بات ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۸۵ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ(۱۵:۸۵-۸۶)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے غایت کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور بلاشبہ قیامت شدنی ہے۔ تو ان کے ساتھ خوبصورتی سے درگزر کرو۔ تمہارا رب بڑا ہی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔

وہ اس احتساب اور جواب طلبی کی قدرت و طاقت اور اپنے فیصلوں کے نفاذ کی قوت رکھتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (۱۶:۷۰)

ترجمہ: بے شک اللہ ہی علم والا اور قوت والا ہے۔

اور

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ(۸:۵۲)

ترجمہ: بے شک اللہ قوی سخت پاداش والا ہے۔

جس کی ہستی کی صفات میں یہ خصوصیات شامل ہوں، اس سے کسی قسم کے ظلم و زیادتی کا صدور نہیں ہو سکتا:

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا(۳۶:۵۴)

ترجمہ: پس آج کے دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔

۴۔ عمل کے مطابق اخروی جزاء و سزا

اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت اس کی طرف سے قبولیت توبہ اور انسانوں کی دعاؤں اور مناجاتیں برحق ہیں، لیکن اصولی طور پر قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ ہر متنفس اپنے اعمال کے چٹھے کے ساتھ اس ہستی کی عدالت میں روز قیامت حاضر ہو گا جسکے علیم و بصیر اور خبیر و قدیر ہونے کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے، اور اپنے اعمال کے مطابق جزاء اور سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۱۳ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ ۱۴ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى(۱۷:۱۳-۱۵)

ترجمہ: اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور قیامت کے روز اس کے لئے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ لو، پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو جو ہدایت کی راہ پر چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لئے ہدایت کی راہ پاتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی اوپر وبال لاتا ہے اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں ہے۔

ان آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر ایک کو خود قیامت کے روز اپنے اعمال کی بنیاد پر جوابدہی کرنا ہو گی اور یہ کہ کوئی دوسرا کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس سے ان لوگوں کی حرکات کی قلعی کھل جاتی ہے جو خود ساختہ مراکز پر بیٹھ کر زر و سیم کے بدلے لوگوں میں بخشش اخروی کے پروانے بانٹتے ہیں اور انہیں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ ان کے گناہوں کا بوجھ خود اٹھالیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ۳۹ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۴۰ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ

الْاَوْفٰی(۵۳:۳۹-۴۱)

ترجمہ: اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمائی کی ہو گی اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی۔ پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

پھر فرمایا:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ(۹۹:۷-۸)

ترجمہ: پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہو گی وہ بھی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرا برابر بدی کی ہو گی وہ بھی اسے دیکھے گا۔

ظاہر ہے کہ یہاں دیکھنے سے مراد محض مشاہدہ کرنا نہیں بلکہ خیر کی جزاء اور برائی کی سزا پانا ہے۔

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ(۵۲:۲۱)

ترجمہ: ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گروی ہو گا جو اس نے کی ہو گی۔

ان آیات سے یہ واضح نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہر ایک انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور روز قیامت اسے خود جوابدہی کرنا ہو گی۔ اور فرمایا:

وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(۳۶:۵۴)

ترجمہ: اور تم کو بس وہی بدلے میں ملے گا جو تم کرتے رہے ہو۔

جہاں تک عالم آخرت میں اس دنیا کے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دینے کا تعلق ہے، یہ بات بالکل عقل عام کے عین مطابق ہے۔ کیا انسان کی ہر درجے کی تمدنی زندگی میں، انسان کے کلی طور پر عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی عدم قدرت کے باوجود، وہ اپنے اعمال کے سلسلے میں وقت کے نظام کے سامنے جواب دہ نہیں؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو کیا اس خدا ہی، جو اس کائنات میں اور انسان کا خالق ہے اور اس کے ساتھ عدل و انصاف کے مقتضیات کو پورا کرنے کی کلی استطاعت رکھتا ہے، یہ حق حاصل نہیں کہ اس نے جو ہدایت دی ہے اور جو احکامات بر واثم کے متعلق جاری کئے ہیں ان کے سلسلے میں باز پرس کر سکے یا کرے؟ اس دنیا میں کوئی نظم حکومت و معاشرت نہیں چل سکتا اگر لوگوں کو یہ آزادی دے دی جائے کہ جس کے جی میں جو آئے وہ کر گزرے، اس سے کوئی باز پرس نہ ہو گی۔ اس لئے ہر حکومت وسیع پیمانے پر قانون سازی کرتی ہے۔ سنگین جرائم اور بغاوت کی سزا عمر قید اور پھانسی کی شکل میں دے دی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف درجات کے جرائم کی پاداش

میں ملزم جرم کے درجے کے مطابق سزا پاتے ہیں حالانکہ یہ امر یقینی نہیں ہوتا کہ سزا دہندہ عدالت عمداً یا شہادتوں کے مبنی بر اعتماد و صداقت نہ ہونے کی وجہ سے عدل کے تقاضوں کو پورا کرے گی۔

یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے جس تمدن کے حاملین ایک ایک جنگ میں دشمن کو جائز ناجائز طور پر بر سر باطل قرار دے کر، دو دو کروڑ افراد کو قتل اور اس سے زیادہ آبادیوں کو بے گھر اور مختلف اقسام کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جن کے نامہ اعمال میں ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے شہروں کی غیر فوجی آبادیوں کو ایٹم بم گرا کر بھون دینے کی حرکتیں شامل ہوں اور جو عراق پر فوجی اور غیر فوجی آبادیوں پر بلا امتیاز و تفریق یکساں طور پر بمباری (Carpet Bombing) کرنے کے جرائم کے مرتکب ہوئے ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت کے انعقاد پر، جس سے ناانصافی کے سرزد ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں، اعتراض کریں یا اسے ایک ان ہونی بات تصور کریں۔

کیا ایسے اور دوسرے انسان کش جرائم چاہے وہ سیاسی سطح پر کئے گئے ہوں یا اقتصادی و حربی سطح پر، کے سلسلے میں متعلقہ افراد اور اقوام سے جواب طلبی کرنا اس ہستی کا حق نہیں جس نے یہ سارا کارخانہ کائنات تخلیق کیا؟

روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک معمولی سے معمولی درجے کا ادارہ چاہے وہ جس قسم کا بھی ہو، نظم اور عدل کے تقاضے پورے کئے بغیر نہیں چل سکتا تو کیا یہ اتنی بڑی کائنات جس کی وسعت کا اندازہ تو کیا تصور کرنا بھی انسانی بس سے باہر ہے، نظم و عدل سے لاتعلق ہی ہے؟

قرآن نے یہ بات تو واضح طور پر بیان کر دی ہے کہ ہر شخص کے اچھے برے اعمال چاہے وہ جس درجے اور وزن کے ہوں، اس کے سامنے آجائیں گے، لیکن اس کتاب ہدایت نے یہ بھی جگہ جگہ بیان کیا کہ اگر اساسات دین پر ایمان لایا جائے، شرک اور دوسرے کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی غفور الرحیمی کی وجہ سے انسان کی بہت سے لغزشوں سے درگزر فرمائے گا۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا(۴:۳۱)

ترجمہ: تم جن باتوں سے روکے جا رہے ہو اگر ان کے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہے تو تم سے تمہاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے اور تمہیں ایک عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

اگر دین سے وابستگی اختیار کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان لا تقنطو من رحمۃ اللہ (اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ) کے مطابق امید کامیابی و کامرانی دلاتا ہے نہ کہ یاس و ناامیدی۔ اس مقصد کے تحت اس نے انسانوں کی اخروی فلاح و بخشش کے لیے بہت سے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ مثلاً

- کفر کی حالت میں بڑے سے بڑے گناہ حتی کہ شرک تک بھی پر خلوص ایمان لانے پر معاف کر دیئے جائیں گے۔ فرمایا:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ(۸:۳۸)

ترجمہ: ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر یہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے وہ معاف کر دیا جائے گا۔

- ہر معصیت سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کی جائے گی بشرطیکہ وہ صدق دل سے ہو اور آئندہ اس میں ملوث ہونے سے اجتناب کرنے کا عزم کیا جائے۔(۴:۱۷-۱۸)

پیغمبر اسلام کی شفاعت کا تذکرہ اسی باب میں آگے آرہا ہے۔

پھر یہ ایک عظیم نوید جانفزا سنائی کہ:

وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا(۴:۴۰)

ترجمہ: اگر ایک نیکی ہو گی تو اس کو کئی گناہ بڑھائے گا اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

بشری کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ رعایت بھی دے دی کہ اگر کوئی شخص بنیادی طور پر راہ حق پر چل رہا ہے اور کوئی غلط حرکت کر بیٹھا ہے، لیکن اس پر اصرار نہیں کرتا تو اسے بھی معافی دے دی جائے گی، فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ(۵۳:۳۲)

ترجمہ: وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائی سے بچتے رہے مگر یہ کہ کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے سو تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔

لیکن رحمت خداوندی کے ان تمام مظاہر کو بے عملی کا بہانہ یا وجہ جواز نہیں بنانا چاہیے۔ صحابہ ان سب باتوں سے باخبر تھے لیکن انہیں اس امر کا پورا احساس تھا کہ ایک مسلمان پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسے انفرادی سطح پر بھی خدا اور رسول کے احکامات کی روشنی میں تزکیہ نفس کرنا ہے اور ملت اسلامیہ سے تعلق رکھنے کے حوالے سے دنیا کی اصلاح کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ اگر وہ وسیلے اور شفاعت کے ایسے چکروں میں پڑ جاتے جن کا بعض حلقے آج چکمہ دے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمی کو ترک عمل کا ذریعہ بنا لیتے تو انہیں ساری قربانیوں اور جانفشانیوں کے مراحل سے گزرنے کی کیا ضرورت تھی جن سے وہ حضورؐ کی سربراہی میں گزرے؟ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں گزارش کرتے کہ حضورؐ ہمیں تسبیح کے دانے چلانے اور تصور رسولؐ میں منہمک رہنے تک ہی اپنی عبادت کو محدود رکھنے دیجئے اور قرآنی احکامات سے جن میں دین کو ایک پورے کے پورے تمدن کو برپا کرنے کا فریضہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے، مستثنیٰ قرار دے کر اللہ کے ہاں ہماری سفارش فرما

دیجئے۔ البتہ ہم آپؐ کے اس قسم کے کسی حکم کے صادر نہ کرنے کے باوجود آپؐ کے حوالے سے میلادیں بھی کرواتے رہیں گے، مسجدوں میں گانوں کے انداز میں حضورؐ پر درود سلام کا اہتمام بھی کرتے رہیں گے۔ بلکہ اس میں غلو کی تمام حدود بھی پھاند جایا کریں گے، جس کی آپ نے اجازت تو نہیں دی لیکن ہم ٹھہرے آپؐ کے عاشق اور عشق کا دین و شریعت کی حدود سے کیا تعلق!

غور فرمایئے اگر یہ راستہ اختیار کیا جاتا تو کیا وہ نظام تمدن وجود میں آتا جس کی تاریخ عالم میں نظیر نہیں ملتی اور جو بنی نوع انسان کے لیے ابد تک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ایسی صورت میں نوع انسانی کی زندگی میں دور قدیم کو ختم کر کے مسلمان نئے دور کو جنم دینے کا کردار ادا کر سکتے ہیں جس کی علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں تصور کشی کی ہے۔

اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل

(بال جبریل صفحہ ۱۳۱)

وسیلہ اور شفاعت کے متعلق غلط فہمیاں اور قرآن و حدیث کا موقف

جب کوئی قوم، ملت یا تمدن و تہذیب انحطاط پذیر ہو جاتی ہے تو اس کے اساسی اصولوں کے معانی اور مفہومات کی غلط تعبیرات رواج پا جاتی ہیں اگرچہ دوسرے مذاہب وادیان کے برعکس اسلام کے اصولوں کا صحیح تصور موجود ہے اور اس میں علمی سطح پر کوئی تحریف نہیں ہوئی، لیکن مفاد پرست حلقوں نے عوام کی سادہ لوحی اور بعض پڑھے لکھے لوگوں کی اسلامی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے عقائد سے متعلق بعض اصطلاحات کو ایسے معانی پہنا دیئے ہیں جن سے مسلمانوں میں مشرکانہ رجحانات نے فروغ حاصل کر لیا ہے۔ انہی میں عالم آخرت میں جزا و سزا کے حوالے سے ''وسیلہ'' اور ''شفاعت'' کی اصطلاحات بھی شامل ہیں۔ قرآن میں ان کا استعمال موقع و محل کے مطابق بہت سے مقامات پر ہوا ہے اور ہر جگہ ان کا مفہوم واضح ہے، لیکن یہود و نصاریٰ کے اخبار و رھبان کی روش پر چلتے ہوئے ہمارے ہاں کے خود ساختہ مشائخ اور سجادہ نشینوں نے اسلام کا محرف تصور دے کر جن لوگوں کو اپنے اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا ہے، انہیں وہ وسیلہ و شفاعت کا ایسا تصور دیتے ہیں جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو ان کی دنیوی کامیابیوں اور اخروی نجات کا ذریعہ قرار دے دیتے ہیں اور اس کے عوض وہ نذر و نیاز کے نام پر رقوم وصول کرتے ہیں جنہیں ذاتی مصرف میں لا کر وہ تعیش کی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ اس رویے کی مثال نہ صحابہؓ میں ملتی ہے اور نہ تابعین، تبع تابعین اور حضرات امام ابو حنیفہ اور عبد القادر جیلانی سمیت آٹھ سلف و

خلف اور علماء حقہ ہیں۔ان میں سے کسی نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ وہ ان کے لیے اخروی نجات کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور نہ وراثتی بنیادوں پر مراکز مشیخت قائم کر کے لوگوں سے نذرانے وصول کئے نہ ہی انہوں نے قرآن و سنت سے ہٹ کر کوئی مسخ شدہ تصور دین پیش کیا۔قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان کر رکھا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ، ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ، يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ(۸۲:۱۷-۱۹)

ترجمہ: اور تم کیا سمجھے جزا کے دن کو! بولو، کیا سمجھے جزا کے دن کو، اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی۔ معاملہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہو گا۔

ان حضرات نے ہمیشہ قرآن و سنت کو اپنا مرکز توجہات بنایا، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے حفاظت دین کا جو خود ذمہ لیا ہے اس کے تقاضوں کو اس عالم اسباب میں پورا کرنے کے لیے اس نے انہی بزرگوں سے کام لیا، لیکن پیشہ ور لوگوں کے قائم کردہ مراکز میں قرآن و سنت کو ماخذ دین بنا کر اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر تعمیر سیرت کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا۔ایک طرف تو یہ صورت ہے اور دوسری طرف وسیلہ اور شفاعت کے غلط تصورات کے ذریعے توحید اور معاد کے اسلامی مفہوم کو بھی مجروح کیا جاتا ہے اور لوگوں میں اسلامی فکر و عمل کے اصولوں سے بیگانگی بھی پیدا کی جاتی ہے۔انہیں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اپنے دنیوی معاملات کو سرانجام دینے کے لیے تم جو کچھ بھی کرنا چاہو کرتے رہو، ہم آخرت کے معاملے کو سنبھال لیں گے۔

اگرچہ احوال و ظروف کے تغیر سے شرک کی شکل و صورت بدل سکتی ہے لیکن روح کے اعتبار سے یہی بات تھی جس کے خلاف حضور ﷺ نے تیرہ سال تک مکی دور میں جدوجہد کی۔جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے مشرکین مکہ اللہ کی ہستی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بزرگوں کے نام پر انہوں نے جو بت بنا رکھے تھے انہیں اور بعض دوسری ہستیوں کو وسیلہ نجات اور شفاء تصور کرتے تھے۔اسلام اسی نظریے کو شرک قرار دیتا اور اسے ختم کرنا چاہتا تھا اور یہی مسئلہ ان کے اور اسلام کے درمیان باعث تصادم و نزاع بنا ہوا تھا، جس پر حضور ﷺ نے مشرکین کی ہر تجویز مصالحت کو مسترد کر دیا اور انتہائی قسم کی تکالیف اور اذیتیں برداشت کرتے رہے۔اب بھی جب تک شرک کی ہر شکل کو ختم نہیں کیا جائے گا، اسلام کے حوالے سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی، چاہے اسلام کے نفاذ کے لیے اس مسئلے کی طرف توجہ دیئے بغیر جتنے بلند و بانگ دعاوی سے کام لیا جائے۔

قرآن وسیلہ اور شفاعت کے معاملے میں واضح نظریہ پیش کرتا ہے۔چنانچہ وسیلہ کے متعلق کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ(۵:۳۵)

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے تقرب کے طالب بنو۔

صاحب "تدبر قرآن" مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"وابتغو الیه الوسیلة کے معنی قربت کے ہیں اور الیہ کے تقدیم سے حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی خدا ہی کا قرب اور اسی کا تقرب ڈھونڈو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پوری پوری پابندی کرو، اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہو۔ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ ... کتاب اللہ اور شریعت ہی ہے۔"

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وسیلہ" کی تفسیر ابن عباسؓ "مجاہدؒ، ابو وائلؒ حسنؒ وغیرہم اکابر سلف نے قربت سے کی ہے۔ تو وسیلہ ڈھونڈھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا قرب و وصول تلاش کرو۔ قتادہ نے کہا "ای تقربو الیه بطاعة والعمل بما یرضیه خدا کی نزدیکی حاصل کرو اس کی فرمانبرداری اور پسندیدہ عمل کے ذریعے"۔

تفسیر جلالین میں وسیلہ کا مطلب لکھا ہے:

"ما یقربکم الیه من طاعة" یعنی جو اطاعت کے ذریعے تمہیں اللہ کے قریب کر دے۔ اسی طرح جامع القرآن فی تفسیر القرآن میں لکھا ہے "ای القربة بطاعة" حافظ ابن کثیر نے بھی وسیلہ کا مطلب اللہ کا قرب اور اطاعت ہی لیا ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ(۱۷:۵۶-۵۷)

ترجمہ: کہہ دو کہ ان کو پکار دیکھو جن کو تم نے ان کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے، نہ وہ تم سے کسی مصیبت کو دفع ہی کر سکیں گے نہ اس کو ٹال ہی سکیں گے جن کو یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

یہ آیات قرب الٰہی حاصل کرنے کے تمام مزعومہ ذرائع جو مشرکین اختیار کرتے ہیں، کی تکذیب کرتی ہیں۔ چاہے یہ ذرائع موہوم ہستیوں پر مشتمل ہوں یا برگزیدہ پر۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کی حاجت روائی نہیں کر سکتا۔ وسیلہ کے متعلق صاحب ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' مجاہدؒ اور ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھتے ہیں،

ای هؤلاء الذین تعبد ونهم یطلبون القریة الی الله کالملائکة و عیسی وامه و عزیز والشمس والقمر

ترجمہ: یہ ہستیاں جیسا کہ فرشتے، حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ اور عزیز اور شمس و قمر جن کی تم عبادت کرتے ہو خود اللہ کے قرب کے طالب ہیں۔

ان قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اول تو ''وسیلہ'' کا وہ مطلب ہے ہی نہیں جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے اور ثانیاً جو مطلب اس سے لیا جاتا ہے وہ مشرکانہ ہے جسے مشرکین مکہ اپنائے ہوئے تھے اور جسے مٹانا حضورؐ کا اولین مقصد تھا۔

ب - شفاعت

اسی طرح شفاعت کے متعلق بھی غلط تصور پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ قرآن میں جا بجا وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر عالم آخرت میں کسی کو کسی دوسرے کی سفارش کرنے کی جرات نہیں ہوگی۔ اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی حکمت و مشیت کے تحت ہی کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے گا۔ گویا کسی کو بالذات حق شفاعت حاصل نہیں ہو گا بلکہ شافع کو اذن الٰہی کی ضرورت ہوگی چنانچہ فرمایا:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ (۲:۲۵۵)

ترجمہ: کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کرسکے۔

مندرجہ ذیل آیت پر انحصار کر کے تقویٰ اختیار کرنے اور اللہ کی جواب طلبی سے بے خوف ہو جانے کے رویے پر نہایت لطیف انداز کی حیثیت رکھتی ہے:

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ(۶:۵۱)

ترجمہ: اور تم اس کے ذریعے سے خبردار کر دو ان لوگوں کو جو ڈر رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کئے جائیں گے اس حال میں اس کے سامنے ان کا کوئی حامی ہوگا نہ شفیع تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

یہ بات توجہ کی مستحق ہے کہ روز قیامت کوئی حمایت یا شفاعت کرنے والا نہ ہو گا۔ کن لوگوں کو مخاطب کرکے کہنے کا حضورؐ کو حکم ہوا ہے؟ ان لوگوں کو جو اخروی زندگی میں جواب دہی اور احتساب سے اپنے قلوب کے اندر ڈر اور خوف رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلام کے اصولوں اور عقائد کو خلوص کے ساتھ قبول کر چکے ہیں انہیں تاکید مزید کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور کسی کی حمایت و شفاعت پر انحصار کر کے احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے معاملے میں تساہل اور غفلت سے کام نہ لو۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ(۱۰:۱۸)

ترجمہ: اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچا سکیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دو کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کا اس کو خود پتہ نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں وہ پاک اور ارفع ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب جامع البیان فی تفسیر القرآن امام رازی اور امام شوکانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قال الامام الرازي ----- قالو في الاصنام انها شفعاؤنا عند الله ----- انهم وضعوا هذا الاصنام والاد ثان على صور انبيائهم واكابرهم وزعموا انهم متى اشتغلوا بعبادة هذا التماثيل فان اولئک الاكابر تكون شفعاء لهم عند الله ونظيره في هذا الزمان اشتغال كثير فى الخلق بتعظيم قبور الاكابر على اعتقاد انهم

اذ اعظمو اقبورهم فانهم يكونون شفاء لهم عند الله انتهى ما في التفسير الكبير بلفظه وقال الشوكاني في نيل الأوطار-----

اعتقاد الجهلة لها اى للقبور كاعتقاد الكفار للاصنام واعظم من ذلك وظنوا انها قادرة على جلب النفع ودفع الضر فجعلوها مقصد الطلب قضاء الحوائج و ملجاء الانجاح المطالب وسالو منها ما يسأله العباد من ربهم وشد وا اليها الرحال وتمسحوبها واستغاثوا بالجملة انهم لم يدعوا شيئا مما كانت الجاهلية تفعله بالاصنام الا فعلوه-

ترجمہ: امام رازی ہی نے لکھا ہے کہ(مشرکین)کہتے تھے کہ یہ بت اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے۔ انہوں نے ان اصنام اور بتوں کو اپنے انبیاء واکابر کی شکلوں کے مطابق بنا رکھا تھا اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب وہ ان مورتیوں کی عبادت میں منہمک ہوں گے تو یہ اکابر اللہ پاک سے ہماری سفارش کریں گے اور موجودہ زمانے میں اس کے مشابہ صورت یہ ہے کہ لوگوں کی کثیر تعداد بزرگوں کی قبروں کی عظمت کے عقیدے میں مبتلا ہے اور سمجھتے ہیں کہ جب وہ ان کی قبروں کی تعظیم کریں گے تو وہ اللہ کے حضور ان کی شفاعت کریں گے(تفسیر کبیر کے الفاظ ختم ہوئے) اور شوکانی نے (اپنی تصنیف) نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ قبروں کے بارے میں جہلاء کا اعتقاد بتوں کے متعلق کفار کے اعتقاد کے مطابق ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور وہ گمان کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اور وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ دنیوی مفاد فراہم کرنے اور نقصان سے محفوظ رکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ پس وہ ان کے حضور التجائیں کرتے ہیں، اپنی حاجات کو پورا کرنے اور ضرورتوں کو مہیا کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور ان سے وہ کچھ مانگتے ہیں جو بندے اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ اور ان قبروں پر سوار ہو کر جاتے ہیں اور عقیدت سے ان پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور استدعائیں کرتے ہیں اور قصہ مختصر یہ کہ وہ ایسی سب حرکات کرتے جو دور جاہلیت میں بتوں کے حوالے سے کی جاتی تھیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام بے آمیز توحید کی تعلیم دیتا ہے تو بعض مسلمان مشرکانہ حرکات کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں خصوصاً جب کہ کوئی ایک مسلمان عقیدہ توحید

سے انحراف کا گمان بھی نہ کر سکتا ہو۔ اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ پیغمبر اسلام کی مربیانہ صلاحیت کی وجہ سے قرن اولی میں تو ان لوگوں کے اذہان و قلوب سے جو شرک میں از سرتاپا ملوث تھے، اس ناپاکی کو پوری طرح محو کر دیا گیا لیکن جب عرب سے نکل کر اسلام دوسرے ممالک میں پہنچا تو ہر جگہ شرک کی مختلف صورتوں سے واسطہ پڑا، کہیں اجرام فلکی کی پرستش ہو رہی تھی، کہیں آگ کی، کہیں آباؤ اجداد کی، کہیں ان دیکھی موہوم ہستیوں کی وغیرہ وغیرہ۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا، ان میں جہاں بلند قامت علماء پیدا ہوئے جنہوں نے توحید کی شمع کو روشن رکھا اور مسلمانوں کی اکثریت اس سے فیضیاب ہوتی رہی وہیں ایک تعداد ایسی بھی رہی جو اپنی جہالت اور محسوسات کی کشش کی وجہ سے جو ان کے اندر نسل ہا نسل سے چلی آ رہی تھی، ایسے پیشہ ور لوگوں کے پھندے میں گرفتار ہوتی رہی جو انہیں نجات اخروی کے سلسلے میں توقعات دلا کر اپنی اور بزرگوں کی قبروں کی عقیدت میں مبتلا کرتے اور وسیلہ اور شفاعت کے غلط تصورات کو ان کے اذہان میں پیوست کرتے رہے۔

ہم کہتے چلے آ رہے ہیں کہ کسی نہ کسی قسم کی اخروی زندگی کی ہر قوم ہمیشہ ہی قائل رہی ہے، اور اس میں فلاح کی خواہش کا بھی کسی نہ کسی درجے میں ان کے دلوں کے اندر موجود ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اسلام نے وحی کی بنیاد ہر ایک مبنی برحقیقت و صداقت تصور معاد پیش کیا لیکن داعیان ضلالت نے مسلمانوں کے محدود حلقوں میں اس طرح اپنا حق شفاعت منوا کر جس طرح نصاریٰ میں پادریوں نے منوایا تھا، اسلام کے تصورات توحیدوآخرت کو مجروح کیا۔ فرق یہ تھا کہ اول الذکر علمی اعتبار سے اسلام کی تعلیمات میں تحریف نہ کر سکے لیکن مؤخر الذکر ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قیامت کے روز جوابدہی کا تصور اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور نصاریٰ میں حضرت مسیحؑ کی قربانی کو ان کے گناہوں کا مستقل کفارہ قرار دیا جارہا ہے۔

مسلمانوں میں آج بھی ہر قاری قرآن کی کانوں میں یہ صدا گونج رہی ہے:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ(۳۹:۷۰)

ترجمہ: اور ہر جان کو جو اس نے کیا ہوگا پورا دیا جائے گا اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

اور پھر روز قیامت کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۝ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ(۴۰:۱۸-۲۰)

ترجمہ: اس دن ظالموں کا نہ کوئی ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کی بات سنی جائے۔ وہ نگاہوں کی چوری بھی جانتا ہے اور ان بھیدوں کو بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ اور اللہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرے گا، اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اللہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔

حتیٰ کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے خود اپنے متعلق کہلوایا:

قُلْ اِنِّىْ لَنْ يُّجِيْرَنِىْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا(۷۲:۲۲)

ترجمہ: کہہ دو کہ مجھے اللہ سے کوئی پناہ دینے والا نہیں بنے گا اور نہ میں اس کے سوا کوئی ملجا پاسکوں گا۔

جب خاتم النبیین اور دین کامل لانے والے رسول کے متعلق یہ کہ دیا گیا تو اور کس کی ایسی حیثیت ہے کہ وہ قیامت کے روز اللہ کے حضور کسی کی سفارش کرنے کے دعاوی کرتا پھرے۔ اور پھر حضورؐ سے یہ اعتراف بھی کروایا:

وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ ۭ (۴۶:۹)

ترجمہ: اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔

قیامت کے روز انسانوں کو ان کے اعمال کی جزاء و سزا کا اللہ تعالیٰ جن اصولوں کی روشنی میں فیصلہ کرے گا ان کے موقع و محل کے مطابق قرآن میں بہت سے مقامات پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہمارے لئے اختصار کے سوا چارہ نہیں لہٰذا ہم ان چند آیات کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ قرآن و سنت اور آثار صحابہؓ سے رجوع کرنے پر مزید تفصیلات مل سکتی ہیں۔ یہاں ہم ناظرین کی توجہ زیر نظر مسئلے کے سلسلے میں اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر قرآن کے مجموعی رجحان کو ذہن میں رکھ کر تفکر اور تدبیر کریں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے بار بار اخروی کامیابی کو عمل صالحہ اور نامرادی کو معصیت سے کیوں مشروط کیا ہے؟ کیا نعوذ باللہ یہ محض ایک ڈراوا اور کھوکھلی دھمکی ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے بھی حوالہ دے چکے ہیں کہ:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ(۶۸:۳۵-۳۶)

ترجمہ: کیاہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کردیں گے! تمہیں کیاہوا ہے
تم کیسا فیصلہ کرتے ہو!

عمل کی بنیاد پر قرآن میں جزاء و سزا کے مرتب ہونے کے سلسلے میں بار بار جس زور سے کام لیا گیا ہے کیا اس سے کوئی ایسا ہلکا سا تاثر بھی ملتا ہے کہ دینی احکامات مہمہ سے رو گردانی کرنے والے کسی کی سفارش کے ذریعے سے بخشش کے حقدار قرار دیئے جائیں گے؟ بلکہ اس کے برعکس قرآن میں متعدد پیغمبروں کی شفاعت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسترد کیے جانے کا تذکرہ ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کے لیے شدید جذبہ ترحم رکھتے تھے، لہٰذا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ حضور منافقین کی اصلاح و نجات کے لیے بھی دعائیں فرمایا کرتے تھے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ (۸۰:۹)

ترجمہ: ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ان کے لیے ستر بار بھی مغفرت چاہو گے تو بھی اللہ ان کو بخشنے والا نہیں۔

حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کی سفارش کی تو اس کا جو جواب ملا وہ مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہو جاتا ہے:

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ۝ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۱۱:۴۵-۴۶)

ترجمہ: اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے خداوند میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو تمام فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا، اے نوحؑ وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے، وہ نہایت نابکار ہے۔ مجھ سے اس چیز کے لیے درخواست نہ کرو جس کے باب میں تمہیں کچھ علم نہیں اور میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔

حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب خدا کے فرستادہ فرشتے انسانوں کی شکل میں بیٹے کی بشارت لے کر آئے تو آپؑ انہیں پہچان نہ سکے اور ان کے کھانے پینے سے اجتناب پر کچھ ڈر سے گئے۔ اس کے بعد فرشتوں نے اپنے

تشخص کو ظاہر کر دیا اور ایک طرف بیٹے کی بشارت دی تو دوسری طرف قوم لوط کو تباہ کرنے کی خبر سنائی۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے قوم لوط کی سفارش کی۔ اس کے متعلق قرآن کہتا ہے---- اللہ نے فرمایا:

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ(۱۱:۷۶)

ترجمہ: اے ابراہیمؑ یہ بحث چھوڑ دو، اب تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹالے نہ ٹالا جا سکے گا۔

انبیاء و رسل سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کسی کی شنوائی ہو سکتی ہے؟ لیکن ان میں سے بھی اگر کوئی رسول اپنی انسانی رحمدلی اور دردمندی کے جذبے کے تحت کسی عاصی فرد یا قوم کی اس دنیا میں سفارش کرتا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حکمت کلیہ کے مطابق تصور نہ کرے تو اسے شرف قبولیت نہیں بخشتا۔ اسی طرح قیامت کے روز بھی شفاعت کے لیے اس کے اذن کی ضرورت ہو گی۔ کوئی اپنی مرضی سے کسی کی سفارش نہ کر سکے گا۔ ہم اس سے قبل اس اذن کے متعلق آیت (۲:۲۵۵) کا حوالہ دے چکے ہیں اس کے علاوہ ایک اور مقام پر قرآن میں فرمایا:

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ (۱۰:۳)

ترجمہ: اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں۔

یہ ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے جس میں کوئی استثنیٰ نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی پیغمبر بھی، جن کا گروہ بنی نوع انسان میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی پیشگی اجازت کے بغیر کسی کی شفاعت نہ کر سکے گا۔ جب شفاعت کے معاملے میں صورت یہ ہے تو جماعت انبیاء سے باہر کون ہو سکتا ہے جو اسی دنیا میں دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنے وابستگان کی اللہ کے پاس سفارش کر کے انہیں نجات اخروی سے ہم کنار کر دے گا؟ اور پیغمبر بھی اس صورت میں ایسا کہے گا اگر اللہ نے اسی دنیا میں اس بات کی اس کو اطلاع دے دی ہو۔ پیغمبروں کے پاس تو وحی آتی ہے اور اللہ انہیں غیب کی جو بات بتانا چاہے بتا سکتا ہے لیکن ایک غیر نبی کے پاس جہان آخرت، جو غیب میں ہے، کے حالات معلوم کرنے کا کونسا ذریعہ ہے۔ اس کے پاس تو وحی نہیں آتی۔ اور وحی عبارت ہے فرشتے کے ذریعے انبیاء و رسل کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطے سے، اور اس میں بھی صورت یہ ہوتی ہے کہ وحی کا آنا منحصر ہے اللہ کی مشیت پر، پیغمبر کی مرضی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر اس کو ایسا

دخل حاصل ہوتا تو زمانہ فترۃ وحی میں حضورؐ بیتاب و مضطرب نہ ہوتے۔ اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ روز قیامت کسی کا سفارشی بنے گا تو گویا وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اس کو اس بات کی خبر دے دی ہے جو وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی اللہ سے رابطے کا دعویدار ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلعم کی ختم المرسلین کا منکر ہے اور کافر ہے۔

جن لوگوں نے زر و سیم کی طمع اور حصول شہرت کے جذبے کے تحت دین میں نئی نئی باتیں داخل کی ہیں اور اس روش کو پیشے کے طور پر اپنا رکھا ہے ان کو تو قرآن و سنت کی کوئی نص عام طور پر ان کی روش سے نہیں ہٹا سکتی۔ لیکن ایسے افراد کے غور و فکر کے لیے جو ان کے جال میں غلط فہمیوں کے تحت پھنسے ہوئے ہیں، ہم اس سلسلے کی احادیث کے کثیر سرمایہ سے درج ذیل حدیث نقل کرتے ہیں:

وعن سهل ابن سعد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اني فرطكم على الحوض من مر على شرب ومن شرب لم يظما ابدا ليردن على اقوام اعرفهم ويعرفونني ثم بحال بيني وبينهم ناقول انهم مني فقال انك لا تدرى ما احد ثوا بعدك فاقول سحقا سحقا لم غير بعدى (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت سھلؓ بن سعد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حوض (کوثر) پر تم سب سے پہلے پہنچوں گا۔ جو شخص میرے پاس سے گزرے گا وہ پانی پیئے گا اور جو پیئے گا اس کو کبھی پیاس محسوس نہ ہو گی۔ میرے پاس ایسے گروہ بھی آئیں گے جنہیں میں اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، پھر مجھ میں اور ان میں جدائی کرا دی جائے گی۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے دین پر ہیں۔ لیکن کہا جائے گا آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے (دین میں) کیا کیا نئی باتیں پیدا کیں۔ تو میں کہوں گا جنہوں نے میرے بعد (دین میں) تغیر کیا وہ دور ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ اس دن جسے حضور نے دھتکار دیا وہ اللہ کی رحمت سے محروم اور اس کے غضب کا نشانہ بن جائے گا نیز وہ حضورؐ کی شفاعت کا کیسے مستحق ہو سکتا ہے۔ درج بالا حدیث سے دین میں کسی نئی اور مخترع بات کا قابل ملامت اور مردود ہونا بالکل واضح ہے۔

ج۔ آخرت میں حضورؐ کی شفاعت کی نوعیت

ہم اس سے قبل آنحضرتؐ کے مقام علیا کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے مقام کو بار بار واضح کیا ہے۔ اگر ان تمام وضاحتوں کو ذہن میں مستحضر رکھا جائے تو ادوار از بعثت اسلام میں انبیاء کے مرتبے

میں جس افراط و تفریط سے کام لیا جاتا رہا ہے حضورؐ کی ذات کے حوالے سے اس کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اگرچہ بعض پیشہ ور اور خود ساختہ مذہبی رہنماؤں نے آپؐ کے مقام کے متعلق اللہ تعالیٰ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ملحوظ نہیں رکھا لیکن الحمدللہ علمی طور پر ان ارشادات میں کوئی ردوبدل نہیں کیا جاسکا۔ اس سلسلے کا ہر فتنہ اپنی موت مرتا رہا ہے اور اصل تصور نبوت ہر قسم کی آلائیشوں سے منزہ حیثیت میں برقرار ہے اور رہے گا۔

جس طرح دعوت دین کے کام کے حوالے سے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اور خود حضورؐ نے اپنے مقام کو متعین کیا ہے اسی طرح عالم آخرت میں شفاعت امت کے معاملے میں حضورؐ کے کردار کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر مسئلے میں بھی اس تمام افراط و تفریط اور ان بے سروپا اختراعات کے دروازے مسدود کر دیئے گئے ہیں جن کو ازمنہ ماضی میں استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن جس طرح بعض حلقوں نے اول الذکر مسئلے میں قرآن وسنت کی ہدایات سے بے اعتنائی برتی ہے اسی طرح مؤخر الذکر مسئلے میں بھی بہت غلو سے کام لیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی جسارت ہے جس کے ڈانڈے شرک سے جا ملتے ہیں اور جو لوگ بھی دعوت دینے کے کام کے مدعی ہیں انہیں اس فتنے کو کچلنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیے۔

قرآن نے شفاعت کے متعلق بغیر کسی استثنیٰ کے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر عالم آخرت میں کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکے گا جیسا ہم اس سے قبل آیات (۲:۲۵۵) اور (۱۰:۳) نقل کر چکے ہیں۔ حضورؐ چونکہ بلاشرکت غیرے مبین قرآن ہیں لہٰذا اس سلسلے میں بھی حضورؐ نے بات کو واضح اور منقح کر دیا ہے۔

احادیث سے یہ بات بغیر کسی اشتباہ اور ابہام کے ثابت ہوتی ہے کہ آخرت میں حضور بھی حصول اذن کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حدود کے تحت شفاعت کریں گے۔ اگر شفاعت کے سلسلے میں حضورؐ پر یہ پابندیاں عائد ہوں گی تو اور کسی کا یہ استحقاق تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسی دنیا میں بیٹھے شفاعت کی دستاویزات اور پروانے تقسیم کرتا پھرے، اور خلق خدا میں دین اسلام کے عطا کردہ وہ فکر و عمل کے اصولوں کے فہم اور پابندی سے بے نیازی کا رجحان پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی کرے۔

ہم یہاں ایک طویل متفق علیہ حدیث کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز مومنوں کو ایک جگہ پر روک دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ وہ اس پر تشویش میں پڑ جائیں گے، اور کہیں گے کاش ہم کسی کی اللہ کے ہاں شفاعت حاصل کرتے اور وہ ہمیں اس مقام سے نجات دلاتا چنانچہ وہ آدمؑ کے پاس آئیں گے۔ اور انہیں کہیں گے کہ آپ سب

انسانوں کے باپ آدم ہیں، اللہ نے آپ کو ہاتھ سے تخلیق کیا اور اپنی جنت میں رکھا اور اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کروایا اور ہر چیز کا علم سکھایا، اپنے رب کے پاس ہماری شفاعت کیجئے تاکہ وہ ہمیں اس مقام سے نجات دے۔ (آدم) کہیں گے میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور بیان کریں گے اپنی اس خطا کے متعلق جو ان سے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کے متعلق سرزد ہوئی۔ تم نوحؑ کے پاس جاؤ جنہیں اللہ نے اہل زمین کی طرف پہلا نبی بنا کر بھیجا پس وہ نوحؑ کے پاس آئیں گے۔ وہ بھی یہ کہیں گے میں کچھ نہیں کر سکتا اور وہ اپنی اس غلطی کا ذکر کریں گے جو عدم علم کی وجہ سے اپنے رب سے سوال کرنے کے سلسلے میں سرزد ہوئی اور کہیں گے کہ ابراہیمؑ خلیل اللہ کے پاس جاؤ۔ حضور نے فرمایا وہ ابراہیمؑ کے پاس آئیں گے وہ کہیں گے میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا وہ اپنے تین جھوٹوں کا ذکر کریں گے اور کہیں گے کہ موسیٰؑ کے پاس جاؤ جو اللہ کے ایسے بندے ہیں کہ اس نے انہیں توراۃ عطا کی اور ان سے کلام کیا اور اپنا محرم راز بنایا۔ حضور نے فرمایا وہ موسیٰ کے پاس آئیں گے اور وہ بھی یہی کہیں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے اور اپنی اس خطا کا تذکرہ کریں گے جس کے ایک قتل کر کے وہ مرتکب ہوئے۔ وہ کہیں گے عیسیٰؑ کے پاس جاؤ جو اللہ کے بندے، رسول، روح اور کلمہ ہیں فرمایا وہ عیسیٰ کے پاس آئیں گے اور وہ بھی معذوری کا اظہار کریں گے اور فرمائیں گے کہ محمد کے پاس جاؤ جو اللہ کے ایسے بندے ہیں اور اس نے ان کے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ وہ میرے پاس آئیں گے میں اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت چاہوں گا جو مجھے عطا ہو جائے گی جب میں اللہ کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ اپنی مشیت کے مطابق مجھے سجدے میں پڑا رہنے دے گا پھر فرمائے گا اے محمد اپنا سر اٹھاؤ، کہو تمہاری بات سنی جائے گی، شفاعت کرو، قبول ہو گی، سوال کرو، جو مانگو گے دیا جائے گا۔ حضور نے فرمایا میں اپنا سر سجدے سے اٹھاؤں گا اپنے رب کی تعریف کروں گا اور حمد بیان کروں گا جیسا کہ اللہ مجھے سکھائے گا۔ پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لئے اس کی حد مقرر کی جائے گی میں اللہ کے دربار سے رخصت ہوں گا اور اجازت کے مطابق لوگوں کو جہنم سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا پھر مرحلہ ثانی میں رب کے حضور حاضر ہو کر اجازت باریابی طلب کروں گا۔ مجھے اجازت دی جائے گی۔ رویت باری تعالیٰ حاصل ہونے پر میں سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ جب تک چاہے گا اسی حالت میں رہوں گا پھر اللہ کہے گا اے محمد سجدے سے سر اٹھاؤ، کہو سنا جائے گا، شفاعت کرو، قبول کی جائے گی اور سوال کرو پورا کیا جائے گا۔ (حضور نے) فرمایا میں اپنا سر اٹھاؤں گا، اللہ کی تعریف و تحمید کروں گا جیسے مجھے سکھائے گا پھر میں شفاعت کروں گا اور قبولیت کے ساتھ اس کا تعین کر دیا جائے گا۔ پھر میں باہر آ کر ان لوگوں کو جن کی اجازت ملی ہو گی جہنم سے

نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا اس کے بعد میں تیسری بار دربار خداوندی میں حاضر ہونے کے لیے اجازت طلب کروں گا تو وہ مرحمت ہو گی اور خدا کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا جب تک اللہ کو منظور ہو گا اسی حالت میں رہوں گا۔ پھر اللہ کہیں گے اے محمد سر اٹھاؤ اور کہو تمہاری بات سنی جائے گی شفاعت قبول کی جائے گی سوال کرو پورا کیا جائے گا۔ میں سجدے سے سر اٹھاؤں گا اور اللہ کی اس طرح تعریف و تحمید کروں گا جس طرح وہ مجھے سکھائے گا پھر میں شفاعت کروں گا اور وہ ایک حد مقررہ تک قبول کی جائے گی۔ میں بارگاہ خداوندی سے رخصت ہو کر لوگوں کو جہنم سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا حتیٰ کہ جہنم میں ان لوگوں کے سوا جنہیں قرآن نے روکا ہے یعنی اس کے ذریعے ان کے لیے خلود کا حکم دیا گیا ہے کوئی جہنم میں نہیں رہے گا۔ پھر حضور نے یہ آیت پڑھی عسی ان یبعثك مقاما محمود! (امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر فائز کرے گا) پھر فرمایا یہ وہ مقام محمود ہے جس کا اللہ نے تمہارے نبی کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے۔ (مشکوتہ۔ باب الخوص الشفاعۃ)

شفاعت کے متعلق اس حدیث سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان پر گفتگو کرنے سے قبل ہم بعض وضاحتیں کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن میں بہت سے مقامات پر یہ وضاحت موجود ہے کہ غیب کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے تو حضور کو اس حدیث میں اپنی امت کے بعض افراد کی عالم آخرت میں شفاعت کرنے اور اس سے متعلقہ واقعات کا کیسے علم ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ (۵۹:۶)

ترجمہ: اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔

اور رسول اللہ صلعم کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا گیا:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ (۶۵:۲۷)

ترجمہ: کہہ دو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے۔

اور حضور سے بھی کہلوایا گیا کہ میں غیب کا علم نہیں رکھتا:

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۳۱:۱۱)

ترجمہ: اور میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔

ان آیات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آنحضرت سمیت کسی کو علم غیب رکھنے کا دعویٰ کرنے کا استحقاق نہیں۔ لیکن اگر کسی بات یا حقیقت کو جاننے والا کسی دوسرے کو اس بات یا حقیقت سے آگاہ کر دے تو وہ آخر الذکر کے لئے غیب کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن ہی میں فرمادیا ہے کہ وہ خود ہی غیب کا علم رکھتا ہے البتہ اپنے رسولوں میں سے جس کو جس غیب سے آگاہ کرنا چاہتا ہے آگاہ کر دیتا ہے۔ اس زمرے میں اپنے رسولوں کے علاوہ اللہ نے کسی اور کو شامل نہیں کیا:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (۷۲:۲۶-۲۷)

ترجمہ: غیب کا جاننے والا وہی ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر رسولوں میں سے جس کو جتنا دینا پسند کرتا ہے، اطلاع دیتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ وحی خفی کے ذریعے حضور کو غیب کی جن باتوں سے آگاہ کر دیتا رہا ہے انہی امور میں اس اور اس جیسی بہت سی معاد کے حالات سے متعلق دوسری احادیث کے مضامین شامل ہیں۔ قرآن میں کثرت کے ساتھ ایسے احکامات اجمالاً دیئے گئے ہیں جن کی تفصیلات حضور نے وحی خفی کے ذریعے حاصل کر کے یا نبوی اجتہاد کے ذریعے واضح کیں۔ یہاں کسی قسم کے ممکنہ التباس کو دور کر دینے کے لیے یہ بیان کر دینا مناسب ہو گا کہ حضور پر قرآنی مضامین پر مشتمل جو وحی نازل ہوتی تھی اس کے لیے ''وحی جلی'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اس کے علاوہ بھی حضرت جبریلؑ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہی حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور بعض معلومات فراہم کرتے تھے جو قرآن میں جگہ نہیں پاتی تھیں، ان کے لئے ''وحی خفی'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

یہ بات بنیادی حیثیت کی مالک ہے کہ اسلامی اصولوں اور نظریات کے فہم کے لیے قرآن اور حدیث و سنت کی ہدایات اور تعلیمات کو بیک وقت ذہن میں رکھنا چاہیے۔ انسان کی عقل و خرد کی استعداد تحمل کے مطابق عالم آخرت کے متعلق اسلام نے جو کچھ تمثیلاً بتایا ہے اس کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے دونوں ماخذ دین میں متمم (Complementary) انداز سے معلومات موجود ہیں۔ شفاعت کے متعلق بھی یہی صورت ہے۔ ہم سطور بالا میں قرآن سے حوالے دے چکے ہیں کہ اذن خداوندی کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس سے قبل ہم نے حضرت انسؓ سے مروی جو حدیث نقل کی ہے وہ اسی بات کی وضاحت کرتی ہے۔ اس سے پہلی قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ جو مومنین شفاعت کے طلب گار ہوں گے وہ جن جن انبیاء ورسل کے پاس جائیں گے ان میں سے کوئی بھی حضور حق میں اس سلسلے میں درخواست کرنے کی جرات نہیں

کرے گا۔ حتیٰ کہ وہ ختم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے،اور حضور اس کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ دوسری بات جس کو خصوصی طور پر اذہان میں بٹھالینا چاہیے وہ، وہ انداز ہے جو شفاعت کے لیے حضور اختیار کریں گے۔ سب سے پہلے حضور حق میں باریابی کی درخواست پیش کریں گے۔ اس کے بعد آنحضرت سجدے میں گر جائیں گے۔ نہ معلوم اس سجدے کی طوالت کتنی ہو گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے سجدے سے سر اٹھائیں گے۔ ازاں بعد انہی الفاظ میں اللہ کی ثناو تحمید میں مصروف ہو جائیں گے جو اللہ ہی سکھائے گا۔ شفاعت بھی اللہ ہی کے اس ارشاد کے بعد کی جائے گی کہ آپ کی استدعا کو شرف قبولیت بخشا جائے گا۔ تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے شفاعت کی حد مقرر کر دی جائے گی یعنی ایسے ایسے لوگوں کی آپ اس مرحلے پر شفاعت کر سکتے ہیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جن کی شفاعت حضور کریں گے اور وہ جہنم میں ہوں گے اور بعض معصیتوں کے ارتکاب کے سلسلے میں ان کا تزکیہ ہو چکا ہو گا اور بعض گناہوں کی حضور کی شفاعت کے ذریعے سے معافی کے بعد ان میں جنت کی زندگی گزارنے کی اہلیت پیدا ہو گئی ہو گی۔ یہ نکتہ حدیث کے ان الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ میں ان کو جہنم سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا۔

اس کے بعد حضور بار بار دربار خداوندی میں شفاعت مومنین کے لئے حاضر ہوتے رہیں گے اور ہر بار سب مراحل سے گزر کر جن کا تذکرہ ہو چکا ہے ان لوگوں کی شفاعت کی استدعا کریں گے جن کے متعلق اللہ اجازت دے گا۔ اس حدیث میں تین مراحل کا ذکر ہے۔ حضرت انسؓ کی ایک اور متفق علیہ حدیث میں حضور کے چار مراحل میں شفاعت کے لیے اللہ کے دربار میں حاضر ہونے کا تذکرہ ہے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے، لیکن ہو سکتا ہے کہ جہنم، جسے جائے اصلاح اور تادیب خانہ (Reformatory) سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، میں جو مومنین پڑے ہوں ان میں جس جس گروہ کی جوں جوں ایک خاص درجے کی اصلاح ہوتی جائے توں توں حضور اللہ کی خدمت میں ان کی شفاعت کے لیے حاضر ہوتے جائیں گے۔ (واللہ اعلم) تین یا چار دفعہ کی حاضری بھی مراد لی جا سکتی ہے جیسا ستر بار یا سو بار کہہ دینے سے بعینہ ستر یا سو مراد نہیں ہوتے بلکہ کثرت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ حضور ہی شفاعت کی ابتداء کریں گے اور جس انداز میں اللہ جل جلالہ کے دربار میں اپنی عرضداشت پیش فرمائیں گے اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ہر کسی کا کام نہیں ہو گا۔ اس دنیا میں کسی کو کیا معلوم کہ قیامت کے روز اسے کن حالات کا خود سامنا پڑے گا چہ جائیکہ کوئی یہ

کہتا پھرے کہ میں اپنے معتقدین اور مریدوں کو پل صراط کے پار پہنچادوں گا، یا کوئی یہ توقع رکھے کہ کسی کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کر کے اس کی شفاعت سے بہرہ یاب ہوا جاسکے گا۔

قرآن میں ایسی آیات اور کتب حدیث میں ایسی احادیث کثیر تعداد میں موجود ہیں جن سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ہر ایک فرد کو اس کے اعمال حسنہ وسیہ کے مطابق جنت اور جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ جہنم میں گناہوں اور معصیتوں کے دھل جانے کے کس مرحلے پر کوئی شخص شفاعت کا حقدار ہو گا۔ البتہ تیسرا مقام اعراف کا ہے اور اس سلسلے میں اس باب میں آگے چل کر وہیں گفتگو ہو گی جہاں جنت و جہنم کے حالات بیان کئے جائیں گے۔

معاد اور انسانی قوت ادراک

ہماری حسیات اور عقل کی پرواز کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور پیغمبر اسلام نے اپنے فرمودات کے ذریعے معاد کا تصور بڑی تفصیل سے دیا ہے۔ اگرچہ ہم وہاں کے ماحول اور کیفیت کو کلی طور پر ذہن کی گرفت میں لانے سے تو اپنی توانائیوں کی محدودیت کی وجہ سے قاصر ہیں، لیکن اس دنیا میں جاری و ساری معیارات تعقل و ادراک کے مطابق اس زندگی کے حالات اور وہاں انسانی اعمال سے مرتب ہونے والے نتائج کا تصور قائم کر سکتے ہیں۔ وہاں روح اور جان کے اعتبار سے اور راحت و تکلیف کے احساس کے لحاظ سے انسانی شخصیت ویسی ہی ہو گی جیسی اس دنیا میں ہے، لیکن آخرت کی زندگی میں کیفیت و اہمیت کے حوالے سے انسان کا سابقہ مختلف احوال و ظروف سے پڑے گا۔ مکان و زمان کے بندھن ختم ہو جائیں گے۔ مثلاً فرمایا:

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ (۱۶:۷۷)

ترجمہ: اور قیامت کا معاملہ بس آنکھ جھپکنے کی طرح یا اس سے بھی جلد تر ہو گا۔

یعنی بشر اول سے لے کر قیامت کے روز تک وجود میں آنے والی ساری مخلوق جمع ہو گی اور ان کے ساتھ بغیر کوئی وقت صرف کئے جزاء و سزا کا معاملہ کر لیا جائے گا۔ مکان و زمان کی موجودہ صورت کی موجودگی میں تو ایسا نہ ہو سکے گا۔

اس طرح انسانی حسیات اور قویٰ میں انسان کے معنوی مرتبہ و مقام کے مطابق تغیرات رونما ہو جائیں گے۔ بہت سی باتیں جو اس وقت پردۂ غیب میں ہیں انسان پر آشکارا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اللہ جن جن غیبی

معاملات کو جس جس پر جس درجے میں واضح کرنا چاہے گا ان کا علم اس کو دے گا، حتیٰ کہ اہل ترا فراد کو رویت باری نصیب ہو گی اور ان کو اللہ کے دیدار کا متحمل ہونے کی استعداد بخش دی جائے گی۔ ادراک حقیقت ہر فرد کو اس کی اہلیت کے مطابق حاصل ہو جائے گا یہاں تک کہ منکرین وجود باری تعالیٰ تک کو اپنی بے راہ رویوں اور کج فہمیوں کی حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ نیک و بد اعمال مجسم حالت میں متمثل ہو کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ مولانا روم انسان کے اندر پائی جانے والی ادراک حقیقت کی اس عدم صلاحیت کی وجہ کو حجاب جسمانی سے منسوب کرتے ہیں۔ مثنوی کے دفتر سوئم میں فرماتے ہیں:

غفلت از تن بود چوں تن روح شد

بیند او اسرار را بے ہیچ بد

اور پھر کہتے ہیں:

بر گرانی و کسل خود از تن ست

جاں ز حفت جملہ در پرید ن است

تخلیق آدم کے موقع پر اللہ تعالیٰ اور ملائیکہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائیکہ موجودہ جہان بنی نوع انسانی کے احوال و ظروف اور اس کی کیفیت سے ناآشنا تھے۔ اس وقت جس فضا اور ماحول میں بات ہو رہی تھی اس کی کچھ اور ہی کیفیت تھی اور سوچ کے پیمانے بھی مختلف تھے۔ اسی طرح موجودہ جہان انس سے جہان آخرت مختلف ہو گا۔ البتہ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو روز قیامت اس جہان میں کئے گئے اعمال یاد ہوں گے لیکن موجودہ جہان میں بیٹھے ہوئے ہمارے حواس اور قوائے ادراک جہان آخرت کی کیفیات اور مابیتوں کا شعور حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ بات ہماری قوت تعقل و تخیل سے ماوراء ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی قدرت لامتناہی ہے اور وجود باری تعالیٰ کو تسلیم کرنے کا یہ منطقی نتیجہ ہے کہ وہ جس نوعیت کا کوئی جہان پیدا کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ مکافات عمل کے لیے جہان آخرت بھی پیدا کرے گا۔ مادہ پرست اس جہان کے وجود میں آنے کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ اس کے رد میں فرمایا:

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِىْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ (۵۱:۱۷)

ترجمہ: پھر وہ کہیں گے ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔

اللہ کی تخلیقی قوتوں کو انسانی قوت ادراک و تعقل کے دائرے میں محدود کر دینا قطعی طور پر خلاف عقل و دانش ہے۔ اگر انسان صرف اس کائنات ہی کا تصور کرے جو اس کے سامنے ہے اور اس حصہ کائنات کو بھی

شامل کر کے جس کی وسعت کو وہ تجسّس ومشاہدے کے ذریعے سے دریافت کر کے حیران وششدر ہو رہا ہے اور اس امکان کو نظر انداز بھی کر دے کہ نامعلوم ایسی کتنی کائناتیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کر رکھی ہوں گی اور مستقبل میں یزید فی الخلق ما یشاء (۳۵:۱) (وہ خلق میں جو چاہے اضافہ کر دیتا ہے) کے مطابق تخلیق کرے گا تو اسے اپنی ناتوانی اور عقل و خرد اور حسیات کی محدودیتوں کا احساس ہو جانا چاہیے۔ لہٰذا اگر ہم ایک جہان آخرت کے وجود میں آنے کی حقیقت اپنے حسیات اور ادراک کی گرفت میں نہ لا سکیں تو ہماری یہ عدم صلاحیت اس کے برپا نہ ہونے کے عقیدے کے لیے معقول بنیاد فراہم نہیں کر سکتی جب کہ عقل مکافات عمل کے لیے اس کا تقاضا کرتی اور پیغمبروں کی امانت و دیانت کی انتہائی بلندیوں پر فائز جماعت اس کے تصور اور اس کی تفصیلات کو وحی کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر پیش کرتی ہے۔

موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی پر عالمی اتفاق

انفرادی واجتماعی سطحوں پر اس دنیا میں انسان کی زندگی کے عدم تکمیل اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے پورا نہ ہونے کا تصور ہر مذہب اور قوم میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، اور ہم اس سے قبل دو باتیں عرض کر چکے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کے ہر گوشے و خطے میں اللہ کی طرف سے دین اسلام رسولوں کے ذریعے آتا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل کسی قوم یا اجتماعی وحدت نے انبیاء کی زندگیوں، ان کی تعلیمات اور خود اپنی تاریخ کو محفوظ رکھنے کی استعداد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لہٰذا ان تعلیمات میں حذف واضافہ اور تغیر و تبدل کا عمل جاری رہا۔ اس لئے معاد کا تصور بھی دوسرے عقائد و نظریات کی طرح سب مذاہب میں یکسانیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ کوئی مذہب بھی انسان کی ہستی کو موجودہ زندگی ہی تک محدود قرار نہیں دیتا، بلکہ سبھی کسی نہ کسی شکل میں اس زندگی میں انجام دیئے گئے اعمال کے نتائج کسی آئندہ کی زندگی میں برآمد ہونے کا عقیدہ رکھتے اور اس طرح اس زندگی کے تسلسل کے قائل ہیں۔ اس تصور نے انسانوں کے اپنے اپنے اندر درجہ تیقن کے مطابق قوت عمل اور اپنے اصولوں کے لیے قربانیاں دینے کی آمادگی پیدا کی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثالیں ہمیں انبیاء کرام اور ان کے متبعین میں بھی ملتی ہیں اور تاریخ میں اہمیت رکھنے والی سقراط جیسی شخصیتوں کی زندگیوں میں بھی پائی جاتی ہیں جس کا تذکرہ ہم گزشتہ باب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ زہر کا پیالہ نہایت خندہ پیشانی سے پینے سے قبل کے لمحات کے دوران وہ متواتر خدا اور معاد کا ذکر کرتا رہا اور کہتا رہا کہ یہاں سے ایک بہتر زندگی اس دنیا میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے عدالت کے سامنے بیان

دیتے ہوئے جس اخلاقی جرات کا مظاہرہ کیا اور جس طرح صاف گوئی سے اپنے خلاف عائد شدہ الزامات کا اعتراف واقرار کیا اس سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ یہ قوت اظہار اس کے اندر عقلی اور قلبی لحاظ سے پائے جانے والے اس تیقن کا نتیجہ تھی جو اسے اخروی زندگی کی ارتقاء یافتہ حیثیت کے سلسلے میں حاصل تھا۔

قدیم مصر کے جو حالات علم الآثار کے ذریعے روشنی میں آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ادوار میں اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کا اعتقاد پوری شدت سے پایا جاتا تھا۔ اگرچہ اس نے توہم پرستی کی شکل اختیار کر رکھی تھی، لیکن انسانوں کے ذہنوں میں اس کا موجود ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے تو صحیح تعلیم دی ہو گی، بعد میں اصل تعلیمات کو بگاڑ کر لوگ توہمات کا شکار ہو گئے۔ اخروی زندگی پر یقین اس قدر محکم تھا کہ احرام مصر کی تعمیر کے وقت ان میں بادشاہوں کو دفن کرنے کے ساتھ زر وجواہر اور اشیاء ضرورت کی وافر مقدار اور زندہ خدمت گار بھی ان عظیم عمارتوں کے کشادہ دالانوں میں بند کر دیئے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی خیال سے کیا جاتا تھا کہ بادشاہ کو اخروی زندگی میں ان سہولتوں کی ضرورت ہو گی۔ زندہ خدمت گار بھی ان عمارتوں میں بند کئے جانے پر معترض نہ ہوتے تھے۔

اسی طرح ہندوستان اور چین، جن کے تمدن کی قدامت کا بہت شہرہ ہے، میں بھی اخروی زندگی کا تصور ان کے مذاہب کا جزولاینفک رہا ہے۔ زرتشی مذہب میں بھی عالم آخرت کا تصور پایا جاتا ہے۔ عیسائیت اور یہودیت کا تو خیر قرآن سے منزل من اللہ ہونا ثابت ہے، لہٰذا ان کے صحائف میں آخرت کا ہونا لازمی ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم ''پس منظر'' کے باب میں قابل اعتماد حوالہ جات دے کر ثابت کر چکے ہیں اسلام کے سوا کسی مذہب یا دین کی تعلیمات سند کے اعتبار سے اس کے بانی تک نہیں پہنچتیں، اور مرور زمانہ سے ان میں ردو بدل ہوتا رہا ہے۔ بہت سے مذاہب کے صحیفے معدوم ہوتے رہے ہیں اور زمانہ دراز گزرنے کے بعد انہیں زبانی روایات اور یادداشتوں کے ذریعے مرتب کیا جاتا رہا ہے۔ انسانی روایات کی کمزوریاں ہمارے روز مرہ کے تجربات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ بعد زمانی و مکانی سے نظریات و حقائق کے تصور میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد صلعم کے لائے ہوئے دین کے سوا تمام دوسرے مذاہب چاہے وہ من جانب اللہ یا کسی عالی دماغ حکیم و فلسفی کے اختراع یافتہ تھے، اپنی ابتدائی تعلیمات کو مسخ ہونے سے نہ بچا سکے۔ اسی بنا پر وحی کی بنیاد پر نازل ہونے والے ان مذاہب کا عالم آخرت سے متعلق تصور بھی اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہ سکا، ورنہ ان میں کامل یکسانی پائی جاتی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ حضور سے کہلاتا ہے:

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ (۲۱:۲۴)

ترجمہ: یہ تعلیم ہے ان لوگوں کی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے۔

دین اسلام کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر خود لے لیا کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ(۹:۱۵)

ترجمہ: بلاشبہ خود ہی ہم نے الذکر (یعنی قرآن کہ سرتاپا نصیحت ہے) اتارا ہے اور بلاشبہ ہم خود ہی اس کے نگہبان ہیں۔

اس دین کی تعلیمات کی سند بلا کسی معمولی سے معمولی شک وریب اور اشتباہ کے حضور تک پہنچتی ہے، اور آپ نے اس کی جو تبیین و تشریح فرمائی وہ سنت متواتر کے ذریعے بغیر کسی انقطاع لفظی و عملی کے ہم تک پہنچتی ہے۔ اس سلسلے کی تفصیلات ''قرآن'' اور ''حدیث وسنت'' کے ابواب میں بیان ہو چکی ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے لا محالہ یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگرچہ عالم آخرت کا تصور کسی نہ کسی رنگ میں ہر مذہب کی تعلیمات میں شامل ہے لیکن یہ بات صرف اس عالم کے وجود کے نظریے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بات ساری تاریخ انسانی میں اور ہر خطہ ارض میں ایک محکم عقیدے کی حیثیت سے موجود رہی ہو وہ یکسر غلط قرار نہیں دی جاسکتی۔ البتہ ہم اسلام کے سوا مختلف مذاہب میں اس سے متعلقہ نظریات وتفصیلات کے مسخ ہونے کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا عالم آخرت کا وہی تصور قابل قبول اور معتبر ہو سکتا ہے جو قرآن و حدیث میں پیش کیا گیا ہے، اور جو اس باب میں زیر نظر ہے۔

معاد اور انسان کا روحانی بقاء وارتقاء

اس زندگی میں تبدیلی، تغیر اور انقلاب کی کیفیات مادی اور معنوی اعتبار سے جاری وساری ہیں۔ نباتات کو دیکھو، حیوانات وانسان کا مشاہدہ کرو۔ زندگی کی ابتداء کس طرح ہوتی ہے۔ نشوونما کی کیا صورت ہے۔ کوئی مرئی ہاتھ کام کرتا ہوا اس میں بظاہر نظر نہیں آتا، لیکن ایک عمل ارتقاء وترقی اور تبدل ہے جو معناً اور طبعاً ہر جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ہر چیز کا ایک تخم ہے، چاہے نباتات ہوں یا حیوانات، اس میں ایک کامل شے بننے کی بالقوہ استعداد موجود ہے، اور ترقی وارتقاء کا عمل بظاہر خود بخود ظہور میں آتا رہتا ہے بشرطیکہ ان قوانین کی پابندی کی جائے جو قدرتی سطح پر اس کے لیے مقرر ہیں۔ پھر نباتات وحیوانات کی ترقی اور انسان کی ترقی کی نوعیت میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ اول الذکر دونوں کا تعلق ایک ایسی جسمانی ترقی سے ہے جس کا انہیں شعور نہیں لیکن انسان جسمانی ترقی کے ساتھ بے شمار استعدادوں کے حوالے سے ترقی کرتا ہے۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جو

اس کی جسمانی نشو ونما کے ساتھ وجود میں آتی ہیں مثلاً سمجھ، سوچ اور شعور وادراک کی ایک حد تک بالیدگی ونمود جس میں تنوع بھی پایا جاتا ہے، لیکن اس میں ایسی قوتیں بھی ودیعت کی گئی ہیں جو علمی و روحانی اور اخلاقی جلا حاصل کر کے انسان کو خوبیوں کے مراحل طے کرواتی جاتی ہیں، اسلام کہتا ہے کہ نمود و ترقی کا یہ سارا عمل ان قوانین کے تحت وجود پذیر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بلا شرکت غیرے نافذ کر رکھے ہیں۔

کسی کو آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ خوبی کی یہ مؤخر الذکر خصوصیت اخذ کرنے کی صلاحیت کیا چیز ہے اور انسان میں جوہر یا عرض کی حیثیت سے (جیسا بھی کسی کا عقیدہ ہو) کیسے پیدا ہو گئی جس کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں لیکن یہ اس دنیا میں بھی اس کے شرف و مجد کا ذریعہ ہے اور اسلامی اصولوں کے مطابق آخرت میں بھی یہی انسان کا مرتبہ اور مقام متعین کرے گی۔ مقام غور و فکر ہے کہ جب اس دنیائے دوں میں انسان چند روزہ زندگی کے دوران ترقی کے منازل طے کر سکتا ہے تو کیا آخرت میں جو اعلیٰ تر سطح کی حامل ہے، حیات جمود کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے گی؟

مغرب کے مادہ پرست مفکرین نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ انسان کے اندر انسانیت کا جو جوہر یا ان کے نظریے کے مطابق عرض موجود ہے اس کا منبع بھی مادہ ہی ہے لیکن نہ وہ اس دعوے کو ثابت کر سکے ہیں اور نہ اسے عقل تسلیم کرتی ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے کہ انسان کے اندر کا اصل جوہر ہے جو اس کے شرف کا باعث ہے اور جسے ''روح'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۲۹:۱۵)

ترجمہ: تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔

در حقیقت بات بالکل صاف ہے جسے تعصب سے پاک عقل سلیم سے کام لے کر سمجھنے میں کوتاہی کی جا رہی ہے۔ انسانی جسم سے متعلق علم تجزیہ و تحلیل کے انکشافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک اس کے جسم کے خلیات میں تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ پہلے خلیات ختم ہوتے اور نئے بنتے رہتے ہیں گویا ایک مرحلہ زندگی والا جسم دوسرے کسی مرحلے میں ختم ہو چکا ہے اور نیا جسم وجود میں آ چکا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کی شخصیت وہی رہتی ہے جو چیز تواتر کے ساتھ جسم میں رہتی اور جس کی بدولت انسانی زندگی برقرار رہتی ہے وہ ''روح'' کی جامع اصطلاح سے موسوم کی جاتی ہے۔ ہم علم

الجنین (Embrology) پر توحید کے باب میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اس علم کے ماہرین جنین کے جسمانی اعتبار سے مختلف مراحل کا تجزیہ تو کرتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے کے کیا اسباب ہیں۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ فلاں مرحلے پر اس میں یہ آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح موت کی حقیقت کے متعلق بھی انسانی عقل و ذہن بالکل بے خبر ہے۔ لیکن یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ انسانی جسم میں سے وہ چیز نکل جاتی ہے جو اس کی شخصیت کی اصل بنیاد ہے اور مٹی کے اجزاء پر مشتمل ایک لاشہ باقی رہ جاتا ہے جو بالآخر مٹی ہی میں رل مل جاتا ہے۔ دراصل جو چیز جسم انسانی سے نکل کر اسے موت سے ہم آغوش کر دیتی ہے وہی عمل ارتقاء کا اصل ذریعہ اور محمول ہے۔ اس کی اصلاح اور اسی کا تنزل انسانی شرف و تذلیل کا موجب ہیں۔ وہ فنا سے ہم کنار نہیں ہوتا اور اسی نے عالم آخرت میں منازل ارتقاء سے گزرنا ہے۔ لیکن جس طرح اس زندگی میں ہم صرف اس مظہر کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن اس کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، اسی طرح اس ارضی زندگی کے دوران عالم آخرت میں اس کے ارتقاء کے منازل کی کہنہ سے بے خبر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سربستہ راز ہم پر اخروی زندگی میں جس قدر اللہ چاہے گا منکشف ہو۔ ہم اس زندگی میں محسوسات کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے تو روح کی حقیقت کو کیا سمجھیں گے جو ہماری ذہنی و عقلی گرفت سے ماورا ہے۔

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

ارشاد ربانی ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۸۵:۱۷)

ترجمہ: اور وہ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے اور تمہیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے۔

جیسا کہ قرآن کے باب میں مذکور ہوا "روح" کا لفظ قرآن کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اس سے بعض مقامات پر وحی اور حضرت جبرئیلؑ بھی مراد ہیں۔ کلام کے سیاق و سباق سے اس کا محل استعمال واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں ہمارے پیش نظر انسانی روح ہے۔ یہ مسئلہ کہ روح انسانی کی حقیقت کیا ہے، یہودیوں نے حضور سے ایک سوال کے ذریعے اٹھایا، اور ان کی انگیخت پر قریش مکہ نے بھی اٹھایا۔ ہم بیان کرتے چلے آرہے ہیں کہ جو باتیں انسانی ذہن و حسیات کی گرفت میں نہیں آسکتیں ان کے متعلق قرآن یا تو تمثیلاً یا تشبیہاً رہنمائی کر دیتا ہے یا ایسی

اصولی وضاحت کر دیتا ہے جس سے انسان کی متجسسانہ لگن اور اضطراب کی تسکین ہو جائے اور فکر و عمل کے سلسلے کی الجھنیں دور ہو جائیں۔ جو لوگ غیب کی باتیں اور اس کائنات کی تخلیق و تدبیر کے تمام اسرار معلوم کرنا چاہتے ہیں یا ایسی باتوں میں خوض کرتے ہیں جنہیں ان اسرار کے منصوبے کے مکمل فہم و ادراک کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ایضاع وقت و توانائی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہی اسرار میں سے حقیقت روح انسانی بھی ہے۔ بہت سے دوسرے معاملات اور مظاہر قدرت کی طرح اس کے وجود میں آنے کی کہنہ تک بھی انسان نہیں پہنچ سکتا، اس لئے مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا کہ تمہیں تھوڑا سا علم عطا ہوا ہے۔ اسی طرح آیت الکرسی میں انسان کے متعلق کہا گیا:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ (۲:۲۵۵)

ترجمہ: اور وہ اس معلومات میں سے کسی کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے۔

یہ نہیں کہا گیا کہ انسان کو کسی درجے کا علم دیا ہی نہیں گیا اور ڈھور ڈنگر کی طرح ایک مخلوق ہے بلکہ یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حقیقت کے ادراک کے حوالے سے انسان کا علم بہت محدود ہے اور اس کے ذہن میں اس کا اتنا ہی تصور سما سکتا ہے جس قدر اس کا خالق چاہے۔ چنانچہ روح کے متعلق صرف اتنا ہی بتا دیا گیا کہ یہ اللہ کے امر (حکم) کے تحت انسان کے جسمانی ڈھانچے میں، جس کے وجود کے ترکیبی عناصر کا منبع مٹی ہے، ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اگر روح کی اصل مٹی یا مادے سے ہوتی تو پھر الگ سے اس کے جسم میں پھونکے جانے یا امر خداوندی کے تحت اس کے وجود میں آنے کا علیحدہ تذکرہ نہ کیا جاتا۔ نہ ہی آیت (۲۹:۱۵) میں اللہ تعالیٰ نفخت فیه من روحی جیسے الفاظ فرماتا۔ اس طرح اس کی حقیقت کا تو ہم احاطہ نہیں کر سکتے البتہ اس کی استعدادی اور ممکنہ عظمت کا احساس حاصل کر سکتے ہیں، جس کا انحصار تعلیمات اسلام کی رو سے فکری طہارت اور تزکیہ نفس پر ہے۔

اسلام کا مؤقف تو خیر واضح ہے لیکن اس سے قطع نظر بھی روح کو جو اس نوعیت کی تکریم کی حامل ہے۔ جسد مادی کے ساتھ ختم تصور کر لینا اور اس کے ارتقائی سفر کو اس قلیل المیعاد ارضی زندگی تک محدود کر دینا فہم عام اور تعقل و استدلال کے تمام تقاضوں کو خیر باد کہہ دینے کے مترادف ہے۔ اور انسان کے باطن کے سلسلے میں قدرت کے تعمیری عمل کو بے مقصد قرار دینے کے ہم معنی ہے گویا یہ جہان انس جو کسی نتیجہ و مراد تک پہنچے بغیر ختم ہو جائے گا۔ کیا عقل سلیم اس بات کو تسلیم کرتی ہے یا قرآن کے اس مؤقف کو کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱:۱۶)

ترجمہ: اور ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے کھیل تماشا کے طور پر نہیں بنایا ہے۔

اور یہ کہ اس کی ایک غایت ہے فرمایا:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ (۳:۱۶)

ترجمہ: اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا۔

اوپر والا ترجمہ صاحب تدبر قرآن کا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''اس نے آسمان وزمین کا یہ تمام کارخانہ تدبیر و مصلحت سے پیدا کیا ہے (بیکار نہیں بنایا)''

مولانا ثناءاللہ امرتسری نے یہ ترجمہ کیا ہے:

''اسی نے آسمان اور زمین سچے نتیجے سے پیدا کئے''

صاحب جامع البیان فی تفسیر القرآن نے ''بالحق'' کا مفہوم یوں بیان کیا ہے۔

''لتجزی کل نفس بما کسبت'' تاکہ ہر فرد کو اس کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کمایا۔

عبداللہ یوسف علی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

ترجمہ: اس نے آسمانوں اور زمین کو عادلانہ مقاصد کے تحت پیدا کیا۔

ان حوالہ جات سے عیاں ہو جاتا ہے کہ مختلف مترجم حضرات ''حق'' سے کائنات کی تخلیق کے اندر مقصدیت کے پنہاں ہونے پر متفق ہیں۔ یوں بھی اور مقصدیت میں مال و نتیجے کا مضمر ہونا ضروری ہے۔ اس نتیجے کے برآمد ہونے کے لیے انعقاد معاد برائے احتساب ایک منطقی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک اور آیت میں فرمایا:

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ (۸۵:۱۵)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے غایت کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور بلاشبہ قیامت شدنی ہے۔

اس آیت میں کائنات اور اس میں جو کچھ ہے اس کا بحیثیت مجموعی ذکر فرما کر کہہ دیا گیا کہ اس کو ایک مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا اور ''الحق'' کے ساتھ معاً بعد قیامت کا تذکرہ کر کے واضح کر دیا کہ جزاء و سزا اور احتساب کا جہان آ کے رہے گا۔ ظاہر ہے کہ جو فرد اس چھلنی سے گزرے گا وہ گویا درجات ارتقاء ہی کی رفعتوں سے ہم آغوش ہو رہا ہو گا۔ اور یہ سارا معاملہ انسان کی باطنی کائنات اور اس کی روح ہی سے ہو سکتا ہے جو خوشی و انبساط اور تکلیف و اذیت کا محل اور رفعت و تنزل سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

روح کے مقام کا جو انسان کے مرتبہ عالی کی بنیاد ہے، تصور اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر شئے کو پیدا کرنے کے لیے حتیٰ کہ انسان کے جسد خاکی کے لیے بھی خلق یا اس کے مشتقات سے حاصل شدہ الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن ''روح'' کے لیے ہمیشہ امر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

روح انسانی مراد ہو، قرآن مراد ہو یا وحی مراد ہو۔ درج ذیل چند آیات پر غور فرمایئے۔ بات واضح ہو جائے گی:

ہم اس سے قبل آیت (۱۷:۸۵) نقل کر چکے ہیں جس میں ابن عباسؓ کے ایک اثر کے مطابق لفظ روح سے مراد روح انسانی ہی ہے۔ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اثر کا حوالہ دے کر اس آیت کی وضاحت کی ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا (۴۲:۵۲)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے لیکن اس کو ہم نے نور بنایا۔

اسی طرح وحی کا نزول بھی امر الٰہی کے تحت ہوتا ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (۱۶:۲)

ترجمہ: وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس غرض سے چن لیتا ہے، کہ اپنے حکم سے فرشتے الروح کے ساتھ اس پر بھیجے۔ (یعنی وحی کے ساتھ بھیجے)

صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں: ''من امرہ'' اور ''من امرنا'' کے الفاظ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ یہ چیز امور الٰہیہ میں سے ہے جس کی اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے ہر شخص اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ (''تدبر قرآن'' جلد ۴ صفحہ (۵۴۰)

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں: فرمایا ''من امر ربی'' اس معاملہ کے لیے جو کچھ بھی تمہیں بتلایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا حکم کام کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ تم پا نہیں سکتے۔ اور اس سے زیادہ پانے کی تم کاوش کیوں کرو؟ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔ تمہارا دائرہ علم نہایت محدود ہے۔ تم اپنے علم و ادراک میں ایک خاص حد سے آگے بڑھ نہیں سکتے۔ تم علم میں سے جو کچھ پا سکتے ہو وہ اصل حقیقت کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑا ہے۔ وہ اس سمندر میں چند قطروں سے زیادہ نہیں اور تمہیں اس پر قناعت کرنا ہے''

''انسان کے علم و ادراک کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ اسے حواس دیئے گئے ہیں۔ انہی کے ذریعے وہ محسوسات کا ادراک حاصل کرتا ہے لیکن خود محسوسات کے دائرہ کا کیا حال ہے یہ کہ کائنات ہستی کے سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں پھر اگر انسان تمام عالم محسوسات کا علم حاصل بھی کر لے تو اس کی مقدار حقیقت کے مقابلے میں کیا ہو گی؟ ایک قطرے کا علم اس سے زیادہ نہیں اور حالت یہ ہے کہ انسان محسوسات کے بھی کامل علم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ اسی ایک قطرے کے لیے پیاسا رہا اور آج تک پیاسا ہے۔'' (ترجمان القرآن جلد دوئم صفحات ۳۷۰-۳۷۱)

اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ قرآن یا اس کی تفسیر کرتے ہوئے مسلمان علماء انسانی علم و خرد کے مقام کو گراتے ہیں یا تحقیق و مطالعہ کی کاوشوں کو سعی لاحاصل تصور کرتے ہیں۔ ہم نے باب ۲ میں ارتقاء کے مغربی تصور پر بحث کرتے ہوئے اور باب ۳ میں وحی کے زیر عنوان فلسفہ و سائنس کی محدودیتوں پر جو بحث کی ہے اس میں مغربی مفکرین اور اہل علم حضرات کی آراء دی ہیں جن میں انہوں نے انسانی علم کی فروما ئیگی کو تسلیم کیا ہے۔ اس موقع پر ان حوالہ جات کو دوبارہ دیکھ لینا مناسب ہو گا۔ مادہ پرست مغربی مفکرین میں سے بھی کسی کو ادراک حقیقت کا دعویٰ نہیں۔

البتہ متذکرہ بالا آیات سے عیاں ہوتا ہے کہ انسان کی باطنی کائنات کے لیے بھی، وحی کے لیے بھی، جو نوع انسانی کے جوہر کی بالیدگی کا ذریعہ ہے اور قرآن کے لیے بھی، جو انسان کو نور ہدایت فراہم کر کے اس کے لیے شاہراہ نشوو ارتقا کو منور کر دیتا ہے ''روح'' ہی کی مشترک اصطلاح استعمال کر کے ان کے باہمی ربط و تعلق کی گویا نشاندہی کر دی گئی ہے۔ حیاتیاتی موت کا اس سارے معنوی نظم کو ختم کر دینا عقلاً بھی محال نظر آتا ہے اور قرآن کی رو سے اس کا یقینیات کی حد تک کوئی امکان نہیں۔

ہم نے نظریہ ارتقاء اور اثبات وجود باری تعالیٰ کے عنوان کے تحت پیش کی گئی معروضات کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کی Reconstruction of Religious thought in Islam سے دور حاضر کے مادہ پرستانہ تصور ارتقاء کی اساسی کمزوری کی نشاندہی کرتے ہوئے جو اقتباس دیا ہے اس کے ایک حصے کو یہاں اعادے پر ناظرین سے معذرت خواہی کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

"The theory of evolution however has brought despair and anxiety instead of hope and enthusiasm for life to the modern world. The reason is to be found in the unwarranted modern assumption that man's present structure, mental as

well as physiological, is the last word in biological evolution, and that death, regarded as a biological event has no constructive meaming."

ارتقاء کے (مغربی) نظریے نے دور حاضر کو زندگی کے معاملے میں امید اور حوصلہ دینے کے بجائے نا امیدی اور پریشانی میں مبتلا کیا ہے۔ اس کا سبب زمانہ رواں کا وہ بے سند (و تصدیق) مفروضہ ہے کہ انسان کا موجودہ ذہنی اور حیوانی ڈھانچہ حیاتیاتی ارتقاء کا آخری مرحلہ ہے اور یہ کہ موت حیاتیاتی واقعہ کے اعتبار سے کوئی تعمیری وجود نہیں رکھتی۔

قدیم یونانی مفکر جس کے ساتھ مادہ پرست مغرب بے جا طور پر تہذیبی و علمی رشتہ منسلک کرتا ہے، اور اس دعوے کی حقیقت پر ہم ''مغربی تمدن'' کے باب میں روشنی ڈالیں گے بھی، روح کے بقابعد الموت اور معاد کے تصور سے ناآشنا نہیں تھا۔ اس حقیقت کا تذکرہ ہم سقراط کے حالات کے ضمن میں بھی کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ تصور جہاں بھی پایا جاتا رہا ہے وہ کسی نبی کی تعلیمات ہی کے زیر اثر یا اس کی تعلیمات کی باقیات میں سے شمار کیا جا سکتا ہے مثلاً انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں Spiritualism (روحانیت) کے عنوان کے تحت مقالہ نگار لکھا ہے:

"In ancient Greece pindar (flourished 5th century B.C.) expounded in his odes. The substance of a spiritualistic orphic mysticism by attributing a divine origin to the soul, which resides temporarily as a guest in the home of the body and then returns to its source for reward or punishment after death. Plato's view of the soul also marks him as a spiritualist and Aristotle was a spiritualist for distinguishing the active from the passive intellect and for conceiving of God as pure actuality." (Vol. 11 Page 104)

قدیم یونانی میں پنڈور جس نے پانچویں صدی ق م کا زمانہ پایا، اپنے نغموں میں آرفیس کے روحانی تصوف کا نچوڑ، روح کو خدائی ماخذ تخلیق سے منسوب کر کے بیان کیا ہے جو عارضی طور پر جسم انسانی کے گھر میں مہمان کی طرح رہتا ہے اور موت کے بعد اپنے ابتدائی منبع کی طرف جزا و سزا کے لیے لوٹ جاتا ہے۔ افلاطون بھی روح کو قائم بالذات ماننے کے سلسلے میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور ارسطو اس حوالے سے روحانیت کا قائل تھا کہ وہ موثر و منفصل تعقل میں تمیز کرتا اور خدا کو بے آمیز حقیقت تصور کرتا تھا۔

مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں سے روشنی حاصل کر کے جب یورپ ایک ہزار سالہ ازمنہ تاریک سے نکلا تو وہاں بھی فلسفیانہ رجحانات رکھنے والے مفکرین نے روح کی حقیقت پر اظہار خیال کرنا شروع کیا چنانچہ ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء) نے قطعیت کے ساتھ روح و جسم کے الگ الگ وجود کا نظریہ پیش کیا اور انسان کو ان دونوں کے اتحاد کا مظہر قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جسم جو مادی شے ہے، وجود کے متعلق شک کیا جا سکتا ہے کیونکہ مادی اشیاء جب خواب میں نظر آتی ہیں تو در حقیقت انکا وجود تو نہیں ہوتا۔ لیکن انسانی روح (mind) کا وجود یقینی ہے۔ اس سلسلے میں اس کا یہ اصول اس کے فلسفے میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے:

میں سوچتا ہوں اس لئے میرا وجود یقینی ہے۔ (I Think therefore I am) سپینوزا (۱۶۲۲-۱۶۷۷) کے مطابق روح اور جسم انسان کی حقیقت کے دو رخ ہیں۔

کانٹ (۱۷۲۴-۱۸۰۴) کہتا ہے کہ روح کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے انسان میں اخلاقیات کا تصور اور مذہب سے وابستگی پیدا کی جا سکتی ہے لیکن روح کی حقیقت اور کنہ عقلی استدلال کے ذریعے معلوم نہیں کی سکتی۔

یہ بات بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ یہ تینوں فلاسفہ مذہبی پس منظر رکھتے تھے اور مغربی فلسفہ کی تاریخ میں بلند مقام کے مالک ہیں۔ خصوصیت سے ڈیکارٹ مغربی فلسفہ کا باپ سمجھا جاتا ہے لیکن جوں جوں تمدن ارتقاپذیر ہوتا گیا اور مغربی حیات اجتماعی کا انحصار استعمار و استحصال پر موقوف ہوتا گیا مادہ ہی کو اس کائنات کی بنیاد قرار دینے کا رجحان فروغ پاتا رہا حتیٰ کہ برٹرانڈ رسل جیسے فلسفی اور فلسفے کے نقاد پیدا ہو گئے جن کے فکر کے اوڑھنے بچھونے کی حیثیت مادہ اور مادہ پرستی ہی ہے۔ مشہور امریکی فلسفی ولیم جیمس (۱۸۴۲-۱۹۱۰) نے بھی یہ نظریہ پیش کیا کہ روح انسانی کا کوئی وجود نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا مظہر ہے۔

روح کا مسئلہ مہمہ مسائل میں سے ہے اس کا ماورا مادہ اور اس کو اسی مفہوم میں من امر ربی تسلیم کرنے ہی سے جس مفہوم میں اسے قرآن میں بیان کیا گیا ہے انسان کی ارضی زندگی کے اختتام پر اس کے فنا نہ ہونے، اور جہان آخرت میں اپنے اعمال حسنہ و سیہ کے سلسلے میں جزا و سزا سے ہمکنار ہونے کے عقیدے کو اپنایا جا سکتا ہے۔ گویا اسلام میں تصور روح اور تصور آخرت کا چولی دامن کا ساتھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مادہ پرست چونکہ روح کے غیر مادی تصور کے قائل نہیں اس لئے معاد کے انعقاد کے منکر ہیں اور اسی طرح چونکہ معاد کے قائل نہیں لہٰذا روح کو مادہ ہی سے منسلک کر کے اس کے جسم انسانی کے ساتھ ہی موت سے ہمکنار ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس صورت حال کو تسلیم کرنے سے انسانی و کائناتی ارتقاء حرکت کی نفی اور ان کے جمود کا اقرار کرنا لازم آتا

ہے۔ اسلام کا اس نظریے سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن مغربی مادہ پرست فلسفی ایک طرف ارتقا Evolution کی رٹ لگا کر اور دوسری طرف انسان کی جوہری حیثیت کو اسی زندگی میں نابود کر کے ایک بہت بڑے تضاد فکر کا شکار ہو رہے ہیں۔ دور حاضر کے ترجمان اسلام علامہ محمد اقبالؒ مدراس میں دیئے گئے اپنے چھٹے خطاب کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

"As a cultural movement Islam rejects the old static view of the universe and reaches a dynamic view. As an emotional system of unification it recognises the worth of the individual as such, and rejects blood relationship as a basis of human unity. Blood relationship is earth rootedness. The search for a purely psychological foundation of human unity becomes possible only with the perception that all human life is spiritual in its origin."

ایک تمدنی تحریک کی حیثیت سے اسلام کائنات کے قدیم جامد تصور کو مسترد کرتا ہے اور اس کا متحرک تصور پیش کرتا ہے۔ ایک جذباتی نظام وحدت کے طور پر یہ فرد کی حیثیت کی افادیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن خونی (وجدی) رشتے کو وحدت انسانیت کی بنیاد کے طور پر رد کرتا ہے۔ خونی تعلقات مادی جڑیں رکھتے ہیں۔ انسانی وحدت کی خالصتاً نفسیاتی تلاش صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ذہن و قلب میں یہ بات جاگزیں ہو جائے کہ انسانی زندگی کا منبع روحانی نوعیت کا رکھا ہے۔

علامہ موصوف کے نظریات کا منبع قرآن و سنت ہی ہے۔ اوپر کے اقتباس پر ہم قرآن کی بہت سی آیات میں سے دو کو نقل کرتے ہیں کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (۴۹:۱۳)

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہم دگر تعارف حاصل کرو اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ اشرف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۶:۹۴)

ترجمہ: اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا۔

کنبوں، برادریوں اور قبیلوں کا وجود صرف شناخت اور پہچان کے لئے ہے۔ اسلام انہیں اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اسی لئے علامہ موصوف نے فرمایا کہ ان کی ترکیب کا تعلق دنیوی ضرورت سے ہے اور ان کی افادیت تک محدود ہے۔ خاندانی، نسلی یا جدی رشتے بھی روحانی ارتقاء و نمو پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال قرآن میں اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے کے درمیان کفر کی دیوار حائل ہونے پر حضرت نوحؑ کو ان کے بیٹے کے متعلق یہ کہہ کر کہ ینوح انه لیس من اہلک یعنی اے نوحؑ وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے (۴۶:۱۱) فراہم کر دی ہیں۔ اسلام کا یہ اٹل اصول ہے جس پر عمل پیرا ہونے کا بھرپور مظاہرہ حضورؐ کی دعوتی جدوجہد کے سلسلے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کیا۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ تم اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے ہمارے پاس اسی طرح اکیلے آؤ گے جس طرح ہم نے تم کو انفرادی حیثیت سے پیدا کیا تھا۔ اور آیت ما قبل کی رو سے تمہارا مقام درجہ تقویٰ کے مطابق جس پر تمہاری تکریم یعنی روحانی حیثیت کا دارومدار ہے، متعین کیا جائے گا۔ اس روز نہ خاندانی وجاہت کام آئے گی اور نہ کوئی نسبت جو دائرہ اسلام سے باہر ہو۔

اس سے قبل ہم ارتقاء اور معاد کے سلسلے میں مختلف مباحث کے دوران متعدد آیات پیش کر چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عالمی فکر و فلسفہ کی تاریخ کو اگر مجموعی حیثیت سے پیش نظر رکھا جائے تو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکماء اور فلاسفہ کی عظیم اکثریت کا جھکاؤ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی درجے اور شکل میں روح کی ابدیت اور اس کے نتیجے میں انعقاد معاد کی طرف رہا ہے۔ ایک قلیل عرصے سے مغرب نے مادہ پرستی کے پیدا کردہ جوش و ولولے کے زیر اثر جسے زخرفات دنیا ہی کی زندگی کا اول آخر تصور کرنے کے نظریے نے جنم دیا تھا روح انسانی اور معاد دونوں کا انکار کر رکھا ہے کیونکہ اس ایک کے انکار کے بعد دوسرے کے انکار سے گریز نہیں کیا جا سکتا لیکن اب اس انتہا کا ردعمل ظاہر ہونا شروع ہو چکا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اپنے چوتھے لکچر میں فرمایا ہے:

"No age has produced so much literature on the question of immortality as our Quran, and this literature is continually increasing inspite of the victories of modern materialism"

ابدیت (زندگی بعد الموت) کے موضوع پر جس قدر مطبوعات دور جدید میں تخلیق کی گئی ہیں اتنی کسی اور زمانے میں منظر عام پر نہیں آئیں۔ اور زندگی کے مادہ پرستانہ فکر کی کامیابیوں کے باوجود یہ علمی مواد بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

لیکن ہم ابدیت اور معاد کی حقیقت کو نہیں پا سکتے۔ اس معاملے میں عقل و خرد اور فلسفہ و منطق اپنی ناکامی و نامرادی کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ہم ایسی باتوں کے متعلق اسی حد تک جان سکتے ہیں جتنا ہمیں وحی کے ذریعے

معلوم ہوااور وہ ہماری سمت فکر کو راست روی پر قائم رکھنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔ علامہ موصوف اسی خطاب میں کہتے ہیں:

"Nor do we gain any further insight into the nature of the second creation by associating it with some kind of body, however subtle it may be. The analogies of the quran only suggest it as a fact; they are not meant to reveal its nature and character. Philosophically speaking, therefore, we cannot go further than this------ that in view of the past history of man it is highly improbable that his career should come to an end with the dissolution of his body."

نہ ہی ہم اس کا کسی نوعیت کے جسم، چاہے جس قدر لطیف بھی ہو، سے اشتراک کر کے دوسری تخلیق (انسان) کی ماہیت کے متعلق مزید ادراک حاصل کر سکتے ہیں۔ قرآنی تمثیلات اس کو صرف حقیقت کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ ان سے اس کی ماہیت اور خاصیت بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اس لیے فلسفیاتی سطح پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اس مقام سے آگے نہیں جا سکتے، اور وہ یہ کہ انسان کی سابقہ تاریخ کے پیش نظر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اس کی جسمانی تحلیل کے ساتھ اس کی نشوونما کا عمل ختم ہو جائے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان حکماء نے بھی ایسے مسائل پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن بعض نے قرآن کے بیانات سے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے اور ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض نے تصور قرآنی کے اندر رہتے ہوئے استدلالی انداز سے بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں:

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی تصنیف ''علم الکلام'' میں روح انسانی کے غیر جسمانی ہونے پر علامہ احمد بن مسکویہ المتوفی ۴۲۱ھ کے ایک عقلی استدلال کی ترجمانی درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

> ''یہ امر واضح طور پر نظر آتا ہے کہ انسان کے جسم کے مختلف اجزا ہیں اور ان تمام اجزا کے افعال مختلف ہیں۔ زبان بولتی ہے کان سنتے ہیں، ناک سونگھتی ہے۔ یہ حالت ظاہری آثار کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ انسان میں جو مختلف احساسات اور جذبات ہیں مثلاً غصہ، رحم، جوش، حافظہ، تخیل ان کے مقامات بھی جدا جدا ہیں اور وہ دماغ کے مختلف حصوں میں ہیں''۔

''یہ بات بھی علانیہ نظر آتی ہے کہ یہ تمام اجزاء بطور آلات کے ہیں، اور اپنے لئے نہیں بلکہ دوسرے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان سب پر کوئی اور چیز حاکم ہے اور سب سے کام لیتی ہے۔ ہاتھ جو کچھ چھوتا ہے، آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں، کان جو کچھ سنتے ہیں، یہ احساسات خود ہاتھ، آنکھ اور کان کے کام نہیں آتے بلکہ ایک اور قوت ہے جو ان کے نتائج سے متمتع ہوتی ہے۔ حواس ہر قسم کی شہادت مہیا کرتے ہیں لیکن ان شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کرنا ایک دوسری قوت کا کام ہے''۔

''یہ امر اس موقع پر زیادہ واضح ہو جاتا ہے جہاں خود حواس غلطی کرتے ہیں مثلاً ایک چیز دور ہونے کی وجہ سے چھوٹی نظر آتی ہے۔ آنکھ نے اس شے کو چھوٹا ہی سمجھا ہے۔ لیکن انسان فیصلہ کرتا ہے کہ آنکھ نے غلطی کی ہے اور اس کی شہادت اس موقع پر اعتبار کے قابل نہیں''۔

''اب سوال یہ ہے کہ ان تمام اُجزاء، اعضا، حاسہ، ظاہری اور باطنی سے کام لینے والی کیا چیز ہے۔ مادین کہتے ہیں کہ دماغ ہے لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دماغ کے مختلف اور متعدد حصے ہیں اور ہر حصہ قوت کا منبع ہے۔ دماغ میں اس عام قوت کا کوئی مقام ثابت نہیں ہوتا جو تمام خاص خاص قوتوں پر حکمران ہو اور جس کے لیے یہ تمام قوتیں آلہ کے طور پر کام دے رہی ہوں۔ تجربے نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو چیز جسمانی ہے اور جسم کا حصہ ہے اس کی حیثیت آلہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس لئے وہ چیز جو ان تمام اعضا حواس اور قویٰ سے کام لیتی ہے ضرور ہے کہ ان سب سے بالاتر ہو اور جسمانی نہ ہو کیونکہ اگر جسمانی ہو تو وہ بھی آلہ ہو گی اور اس کا ایک خاص اور محدود کام ہو گا۔ یہی عام قوت اور سب سے کام لینے والی قوت روح اور نفس ناطقہ ہے۔''

''اب صرف یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ یہ چیز ممکن ہے کہ جوہر نہ ہو بلکہ عرض ہو یعنی جسم کی ساخت اور ترکیب کی ایک کیفیت ہو جیسا کہ آج کل کے مادین قائل ہیں۔ علامہ موصوف نے اس احتمال کو اس طرح سے باطل کیا ہے'':

''(۱) جو چیز مختلف صورتوں اور کیفیتوں کو قبول کرتی ہے وہ خود ان صورتوں اور کیفیتوں کا کوئی فرد نہیں ہوتی۔ مثلاً جسم جو مختلف رنگوں کو قبول کرتا ہے اور سپید، سیاہ سرخ ہو سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ مرتبہ ذات میں بالکل سادہ ہو اور کوئی رنگ نہ رکھتا ہو، ورنہ دوسرے مختلف رنگوں کو قبول نہ کر سکے گا''۔

''اور چونکہ روح تمام اشیاء کا تصور کر سکتی ہے اور اس میں ہر صورت کے ادراک اور قبول کی قابلیت ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ عرض نہ ہو ورنہ عرض کی نہ گانہ اقسام یعنی کم و کیف وغیرہ میں سے کسی قسم کے تحت میں داخل ہو گی''۔

''(۲) عرض ایک ایسی چیز ہے جو جسم کے پیدا ہونے کے بعد طاری ہوتی ہے، اور اس کا مرتبہ کم ہے۔ اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ چیز جو تمام اعضاء، اجزاء، قویٰ حواس ظاہری اور باطنی پر حکومت کرتی ہو، خود ایک عارضی، ناپائیدار اور غیر مستقل چیز ہو''۔

''اس استدلال کو ہم زیادہ وضاحت اور قوت کے ساتھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کا جسم اور جسم کی کیفیات سب متغیر ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ آج کل کے مادین کا بیان ہے کہ تیس برس کے بعد انسان کے پہلے جسم کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا۔ پہلے اجزاء تمام بدل جاتے ہیں اور بالکل نیا جسم پہلے جسم کے مشابہ پیدا ہو جاتا ہے کہ زید وہی زید ہے جو تیس برس پہلے تھا۔ یہی چیز ہے کہ جس کو ہم روح اور نفس ناطقہ کہتے ہیں۔''

''ظاہر ہے کہ یہ چیز عرض نہیں ہو سکتی کیونکہ عرض ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو تمام تغیرات کے ساتھ بھی قائم رہتی ہے۔''

''جب یہ ثابت ہو چکا کہ روح جوہر ہے اور جسمانی نہیں ہے تو خود ثابت ہو گیا کہ وہ فانی نہیں کیونکہ فانی ہونا اجسام کا خاصا ہے جو چیز جسمانیت سے بالکل بری ہو وہ کیونکر فنا ہو سکتی ہے۔''

''یہ دعویٰ موجودہ تحقیقات کے موافق نہایت آسانی سے ثابت ہو سکتا ہے۔ تحقیقات جدیدہ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ کوئی شئے فنا نہیں ہوتی بلکہ صرف اس کی ہیئت ترکیبی بدل جاتی ہے اور اس کے اجزاء الگ الگ ہو کر کوئی اور صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تمام دنیا اگر مل کر چاہے تو ایک ذرہ کو اس طرح فنا نہیں کر سکتی کہ وہ بالکل معدوم محض ہو جائے۔''

''اور چونکہ یہ ثابت ہو چکا کہ روح مرکب بلکہ بسیط ہے تو نہ اس کی تحلیل ہو سکتی ہے نہ اس کے اجزاء بدل سکتے ہیں، اس لئے اس کا فنا ہونا غیر ممکن ہے۔'' (صفحات ۱۰۵-۱۰۷)

قیام قیامت

قرآن غیر مبہم الفاظ میں قیامت یا یوم الجزاء کی خبر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ دنیا کا یہ نقشہ زیر و زبر ہو جائے گا اور ایک ایسا عالم وجود میں آئے گا جس کے زمین و آسمان بالکل مختلف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس روز اپنے تمام بندوں کو جمع کرے گا۔ اسی نے پہلے انہیں تخلیق کیا اور اس دنیا میں موت سے ہمکنار ہونے کے بعد وہ دوبارہ انہیں زندگی دینے پر قادر ہے چنانچہ قرآن میں بیان ہوا:

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ (۶:۱۲)

ترجمہ: وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔

اس آیت میں فرمایا کہ انعقاد قیامت یقینیات میں سے ہے۔ اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر اس حقیقت کا اعادہ سادہ اور دل کو لگنے والے محکم دلائل کے ساتھ کیا:

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ (۱۰:۴-۵)

ترجمہ: اسی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کو عدل کے ساتھ بدلہ دے اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے ان کے کفر کی پاداش میں کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے۔ وہی ہے جس نے سورج کو تاباں اور چاند کو نور بنایا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم سالوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو۔ اللہ نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا ہے۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ کی چند تخلیقی قدرتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلی یہ کہ جب وہ نیست سے سب موجودات کو ہست میں لایا ہے تو کیا اس کے لیے یہ مشکل ہے کہ اپنے تخلیق کردہ انسان کو وہ اس زندگی سے کسی دوسری نوعیت کی زندگی کی طرف منتقل کر دے جہاں حیات ارضی کے دوران کئے گئے "اعمال حسنہ" کا انعام اور اعمال سیئہ کی سزا دی جائے جب کہ یہ بات مقتضائے انصاف ہے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ سورج کو ایسی روشنی کا منبع بنایا جو صفحہ ارض پر ہر قسم کی زندگی کی بقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور چاند کو تاریک راتوں میں چاندنی مہیا کرنے کا ذریعہ بنایا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ ان دونوں کو نظام ہائے تقویم کو وجود میں لانے کا واسطہ بھی بنایا۔ چاند میں خصوصیت پیدا کر دی کہ وہ چونکہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس کا مشاہدہ ہر کوئی با آسانی کر سکتا

ہے لہٰذا اس کے تقویمی نظم اور اس سے وقت کے گزرنے کا حساب آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں ایک محیر العقول کائنات کا حصہ ہیں جسے بے مقصد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا اس کا کسی انجام تک پہنچنا لازمی ہے۔ پھر انسان کو مخاطب کر کے کہا کہ مقصد تخلیق بھی پورا ہو سکتا ہے کہ تم اپنے خالق کی طرف لوٹائے جاؤ اور اپنے اعمال کی جوابدہی کرو۔

قرآن میں جا بجا انعقاد قیامت کے لیے عقلی دلائل دیئے گئے ہیں، جیسا کہ ہر معاملے میں اس کتاب ہدایت کا اسلوب ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

وَاللّٰهُ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَسُقۡنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحۡیَیۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ کَذٰلِكَ النُّشُوۡرُ(۹:۳۵)

ترجمہ: اور اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ ابھارتی ہیں بادلوں کو۔ پھر ہم ان کو ہانکتے ہیں خشک زمین کی طرف۔ پس ہم اس سے اس زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد از سر نو زندگی بخش دیتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا از سر نو زندہ ہو کر اٹھنا ہے۔

زمین خشک حالت میں سبزہ نہیں اگاتی لیکن پانی کے ذریعے سیرابی کے بعد سبزہ پوش ہو جاتی ہے۔ اس کی پہلی حالت کو بجا طور پر موت سے اور دوسری حالت کو دوبارہ زندہ ہو جانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ یہ معمول کی بات ہے اس لئے ایک مادہ پرست انسان اسے اہمیت دیتا ہے اور نہ غور و تدبر کر کے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت اور اس کی قدرت کاملہ کا مظہر قرار دینے کا رجحان اپناتا ہے۔ لیکن قرآن جہاں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مردہ زمین کے اس احیاء کی طرف انسان کی توجہ مبذول کراتا ہے وہیں وہ ہواؤں کے دوش پر پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو طول طویل سفر طے کروا کر زمین کو سیراب کرنے کے وسیع و عریض نظم کی نشاندہی کرتا ہے اور اس مثال کے ذریعے اپنے تکوینی امر کے تحت بعد الموت کے سلسلے کی الٰہی قدرت پر دلیل قائم کرتا ہے۔

ایسی مثالیں اور دلائل دے کر اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان سے موثر سوالات کرتا ہے:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ(۲۳:۱۱۵)

ترجمہ: تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے ہم نے تم کو یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟

اور یہ کہ

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَكَ سُدًی(۷۵:۳۶)

ترجمہ: کیاانسان گمان رکھتاہے وہ بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟

یہ دونوں آیات ایک بدیہی معاملے پر سوالات اور دلائل کا مجموعہ ہیں اور کوئی صاحب فکر و نظر ان کا نفی میں جواب نہیں دے سکتا۔ قرآن نے متعدد مقامات پر استفہامی انداز کے ذریعے سے بات کو واضح کرنے کا اسلوب اختیار کیاہے۔ یہ طریقہ تفہیم انسانی ذہن کو تفکر کی طرف راغب کرتاہے۔

ظہور قیامت کے قرآنی اشارات اور دور جدید کے فلکیاتی مشاہدات

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ قرآن انسان کو یہ ارضی زندگی گزارنے کے لیے فکر و عمل کی صحیح اور مطابق فطرت نہج کی طرف رہبری فراہم کرتاہے۔ یہ کسی ایسے صنف علم کی تکنیکی بحث پر مشتمل کتاب نہیں جس کے مرتب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہی مختلف صلاحیتیں اور توانائیاں عطا کر رکھی ہیں بلکہ یہ کتاب ہدایت انسان کے اپنے مرتب کردہ علوم سے استفادہ کرنے کے لیے بھی رہنمائی دیتی ہے اور اسے ایک ایسا عالمی نظریہ دیتی ہے جسے علمی تخلیقات کے لیے رہنما اصول کے طور پر استعمال کیا جا سکتاہے ورنہ انسان علمی میدان میں بھی ٹھوکریں کھاتا پھرتاہے اور اپنی تحقیقی کاوشوں کی بنیاد پر جو علوم مرتب کرتاہے ان کی روشنی میں غلط نظریات قائم کر کے دنیا کو فساد سے بھر دیتاہے جیسا کہ دور حاضر کے مادہ پرستانہ فکر کے کردار سے ظاہر ہے جس نے نازی ازم، فسطائیت، کیمونزم اور سرمایہ دارانہ جمہوریت جیسے نظاموں کو جنم دیا، جنہوں نے انسانوں کو اتنے بڑے پیمانے پر ظلم و جور کا نشانہ بنایا جس کی مثال ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہاں ہم چونکہ معاد سے بحث کر رہے ہیں اس لئے اس باب میں ہمیں گفتگو کو موجودہ انسانی زندگی اور کائنات کے انجام تک ہی محدود رکھنا ہے۔ گزشتہ گذارشات کے تسلسل میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ کائنات طبعی سطح پر کسی قسم کے اختتام سے دوچار ہونے والی ہے۔ ہم اس سلسلے میں پہلے بعض آیات قرآنی پیش کریں گے جن کا مبنی بر حقیقت و صداقت ہونا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کیونکہ یہ معلومات اس ہستی کی فراہم کردہ ہیں جو اس دنیا کے آغاز و انجام کے معاملات پر کلی قدرت رکھتی ہے اور ان کے پردۂ غیب میں پنہاں ہونے کی وجہ سے وہی ان سے آگاہ ہے۔ اس کے بعد ہم دور حاضر کے ماہرین فلکیات کے تحقیقی رجحانات کی جھلکیاں پیش کریں گے جن کی بنیاد ان کے مشاہدات پر ہے۔ اگرچہ ان کے نتائج مشاہدہ و تحقیق آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ ہم مؤخر الذکر مواد قرآنی آیات کی تائید توثیق کی خاطر پیش نہیں کر رہے کیونکہ قرآن کی صداقت اور اس کے نظریات کو بر سر حق ثابت کرنے کے لیے ہمیں کسی کی تائید کی ضرورت نہیں۔ ہم اس سے ان

لوگوں پر جو مغرب سے درآمد شدہ ہر نظریے کو مبنی بر حقیقت تصور کرتے ہیں یہ حجت تمام کرنا چاہتے ہیں کہ جو مادہ پرست اس دنیا کی ابدیت کے قائل تھے ان کی ایک تعداد (اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ) طبعی قوانین کے علم ہی کو تحقیقی کاوشوں کا ذریعہ بنا کر بعض ایسے نتائج پر پہنچ رہی ہے جو اس دنیا کی ابدیت کی نفی کرتی ہے۔

ا۔ قرآنی موقف

اس زندگی کے اختتام اور ظہور قیامت کے وقت اس کائنات کے نظم میں تغیرات برپا ہوں گے اور جس نوعیت کی ہلچل نمودار ہوگی اس کے متعلق قرآن میں اشارات دیئے گئے ہیں تاکہ انسان موجودہ صورت حال کو ابدی نہ سمجھے، اور اس کائناتی انقلاب حال کے بعد جہاں جزاء وسزا وجود میں آنے والا ہے اس کے لیے تیاری کرے۔ درج ذیل آیات کی روشنی میں جو نقشہ ابھرتا ہے اس کا تصور کیجئے:

اَلْقَارِعَةُ ۙ مَا الْقَارِعَةُ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱:۱-۵)

ترجمہ: کھٹکھٹانے والی! کیا ہے کھٹکھٹانے والی! اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی! اس دن لوگ منتشر پتنگوں کی مانند ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹:۱)

ترجمہ: جب کہ زمین ہلا دی جائے گی جس طرح اس کو ہلانا ہے۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (۸۹:۲۱)

ترجمہ: ہر گز نہیں اس وقت کو یاد رکھیں جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ، وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (۱۸:۷-۸)

ترجم: روئے زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اس کو زمین کے لیے سنگار بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کا امتحان کریں کہ ان میں اچھے عمل کرنے والا کون بنتا ہے اور ہم بالآخر اس پر جو کچھ ہے سب کو چٹیل میدان کر کے رہیں گے۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (۱۸:۴۷)

ترجمہ: اس دن کا خیال کرو جب ہم پہاڑوں کو چلادیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ بالکل عریاں ہو گئی ہے اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا(۷۳:۱۳)

ترجمہ: اس دن جس دن زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑ بھربھرے ٹیلے بن جائیں گے۔

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِۨالْمُسْتَقَرُّ ۝ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ ۢبِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ(۷۵:۶-۱۳)

ترجمہ: (انسان) پوچھتا ہے کہ قیامت کب ہو گی؟ پس جب نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی، اور چاند گہنا جائے گا، اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ تو اس وقت انسان کہے گا کہاں بھاگوں! اب ہر گز نہیں، کہیں پناہ نہیں! اس دن تیرے رب ہی کی طرف سے ٹھکانا ہو گا۔ اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ فَيَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ(۶۹:۱۳-۱۶)

ترجمہ: پس یاد رکھو جب صور میں ایک ہی بار پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا تو اس دن واقعہ ہونے والی واقعہ ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن وہ نہایت پھس پھسا ہو گا۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ(۸۴:۱-۶)

ترجمہ: جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے یہی زیبا ہے۔ اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر ڈال کر فارغ ہو جائے گی اور وہ اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کو یہی چاہیے۔ اے انسان تو کشاں کشاں اپنے خداوند ہی کی طرف جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ۪ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ۪ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ۪ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ۪ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ(۸۲:۱-۵)

ترجمہ: جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور جب کہ ستارے بکھر جائیں گئے اور جب کہ سمندر پھٹ پڑیں گے اور جب کہ قبریں اگلوائی جائیں گی تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۪ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ۪ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ۪ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۪ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ۪ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ(۸۱:۱-۶)

ترجمہ: جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ستارے بے نور ہو جائیں گے، پہاڑ چلا دیئے جائیں گے اور دس ماہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی، وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر ابل پڑیں گے۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ(۳۳:۶۳)

ترجمہ: لوگ تم سے قیامت کے وقت کو پوچھتے ہیں کہہ دو اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا(۵۶:۱-۶)

ترجمہ یاد رکھو، جب کہ واقعہ ہو پڑے گی واقعہ ہونے والی۔ اس کے واقعہ ہونے میں کسی جھوٹ کا شائبہ نہیں وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہو گی جب کہ زمین بالکل جھنجھوڑ دی جائے گی۔ اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر غبار بن جائیں گے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ(۳۹:۵)

ترجمہ: اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور دن کو رات پر اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک وقت مقررہ کی پابندی کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ(۴۶:۳)

ترجمہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر ایک غایت اور معین مدت کے لیے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ(۵۵:۳۷)

ترجمہ: پس یادرکھو! اس وقت کو جب آسمان پھٹ کر کھال کی مانند سرخ ہو جائے گا۔

قرآن میں زیر نظر موضوع سے متعلق اور بھی متعدد آیات ہیں، لیکن ہم انہی پر قناعت کرتے ہیں۔ انکے مطالعہ سے بیک نظر انسان کے ذہن میں کائنات کی موجودہ شکل کے انجام واختتام کا یہ حتمی تصور ابھرتا ہے:

۱۔ کائنات کی موجودہ صورت کو یقینی طور پر ختم ہونا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک مدت عمر مقرر کر رکھی ہے جس کا علم صرف اسی کو حاصل ہے۔

اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ یعنی اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔(۷:۱۸۷)

۲۔ انعقاد قیامت کے موقع پر صرف یہ کرہ ارض ہی تہہ و بالا نہیں ہو گا بلکہ یہ ایک کائناتی سطح کا تغیر ہو گا۔

۳۔ موجودہ کائنات کے نظم کے اختتام کے متعلق انسان کو کوئی پیشگی اطلاع نہیں دی جائے گی، بلکہ یہ واقعہ ایک پھونک مارنے کے نتیجے میں جیسا کہ کسی بگل میں ماری جاتی ہے ظہور میں آئے گا۔ یہ تمثیلی صورت بیان ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کن فیکون کے زمرے میں آتی ہے۔

۴۔ یہ کرۂ ارض جو انسان کا مسکن ہے ایک شدید قسم کے زلزلے سے دوچار ہو گا جو غیر معمولی نوعیت کا ہو گا۔ اس دھماکا خیز کیفیت کا اثر یہ ہو گا کہ لوگ پتنگوں کی طرح اڑیں گے اور پہاڑوں جیسی چٹانی پختگی رکھنے والی چیز بھی دھنکی ہوئی اون اور بھربھری حیثیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں پہاڑ شدت حرارت سے پگل جائیں گے۔ اس دھماکا خیز واقعے سے ان کے اجزاء منتشر ہو جائیں گے۔ ان میں کوئی صلاحیت نہ رہے گی وہ غبار کی شکل میں ان گیسوں وغیرہ میں تبدیل ہو جائیں گے جس سے وہ ابتداً بنے تھے۔

۵۔ زمین کے نشیب و فراز ختم ہو جائیں گے۔ اور جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہے، چونکہ یہ کائناتی سطح کا انقلاب ہو گا اس قسم کے تغیرات دوسرے اجرام فلکی میں بھی رونما ہوں گے۔ جن کا تذکرہ متعدد آیات میں کیا گیا ہے۔

۶۔ ارضی سطح پر جو کچھ ہے اور جو اس کی زینت کا باعث ہے نابود ہو جائے گا۔

۷۔ اس واقعہ سے جو حرارت تپش اور روشنی پیدا ہو گی انسانی بصارت تو کیا چاند اور سورج تک اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

۸۔ اگرچہ شمس و قمر کے انسانی زندگی اور مشاہدے میں نمایاں ہونے کی وجہ سے درج بالا آیت نمبر ۷۷ میں ان کا تخصیص کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لیکن دوسری بہت سی آیات میں بحیثیت مجموعی بار بار آسمان کا ذکر کیا

گیا ہے کہ وہ پھٹ جائے گا، یعنی اس کی وہ کیفیت نہ رہے گی جو اب ہے۔ آسمان انسانی زبان میں اس کائنات کی علامت کے طور پر بولا جاتا ہے اور اس کا پھٹنا اس کائنات کے زیر و زبر ہونے اور اس میں ایک عظیم ہلچل برپا ہونے ہی کے ہم معنی ہو سکتا ہے۔ فضائے آسمانی سرخ رنگ اختیار کرے گی۔

۹۔ ستاروں اور تمام اجرام فلکی کے بے نور اور سورج کی موجودہ حیثیت کے اختتام کا واضح الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ سمندروں کے پانی شدت حرارت سے ابل پڑیں گے۔

۱۱۔ لیکن اس ہمہ گیر تغیر و انقلاب سے خدا کی خدائی ختم نہ ہو گی، بلکہ وہ جوں کی توں قائم رہے گی۔ اس کائنات میں کوئی بڑی سے بڑی تبدیلی، جو بہر حال اس کی مشیت کے تحت ہو گی، اس کی قدرت اور کبریائی میں ذرا برابر تغیر یا کمی نہیں کر سکتی۔ انعقاد قیامت صرف کائناتی شکل و صورت اور احوال و ظروف کی تبدیلی ہو گی۔ کائنات کی حالیہ شکل کی ابتدا و اختتام کے دوران تمام موجودات جنہیں ''آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے'' سے تعبیر کیا گیا ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ (۲۱:۳۵) ہر جان کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے، کے مطابق ایک معین مدت تک کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ آسمانوں کا لفظ قابل توجہ ہے۔ نزول قرآن کے وقت اس سے پہلے اور کئی صدیاں بعد تک انسان اسی آسمان سے واقف تھا جسے سورۂ ملک میں السَّمَآءَ الدُّنْيَا یعنی دنیا کا آسمان (۶۷:۵) کہا گیا ہے اور اس سے قبل اسی سورہ کی تیسری آیت میں سات آسمانوں کا ذکر ہے۔ قرآن تخلیق کائنات کا جہاں بھی تذکرہ ہے وہاں آسمانوں کا حوالہ دینے کی صورت میں ان کی تعداد سات ہی بتاتا ہے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں تحریر ہے:

"For centuries the Milky way Galaxy of which the earth is a part, was the only galactic system thought to exist".

صدیوں تک صرف ملکی وے کہکشاں، جس میں کرۂ ارض شامل ہے، ہی کے وجود کو کہکشانی نظام کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

لیکن قرآن نے آج سے چودہ صدیاں قبل آسمان دنیا کے علاوہ چھ اور آسمانوں کا بھی تذکرہ کیا جن سے ابھی تک ماہرین فلکیات اپنی تمام تحقیقی کاوشوں کے باوجود آگاہی پیدا نہیں کر سکے۔ اگرچہ کہکشاؤں (Galaxies) کے ناموں سے اٹکل اور اندازوں سے، جیسا کہ ہم حوالے دے کر بتائیں گئے، مزید آسمانی نظاموں کا تذکرہ کیا۔

۱۲۔ موجودہ کائنات ایک مثبت غایت اور مقصد کے پیش نظر پیدا کی گئی ہے چنانچہ فرمایا کہ موجودہ کائنات کے اختتام کے بعد انسان نے اللہ کی عدالت میں حاضر ہونا ہے اور عالم آخرت میں اس کے اعمال کے مطابق اس کی زندگی کی سطح اور اس کا مقام متعین کیا جائے گا۔

فلکیات کا علم مختلف مقاصد کے تحت زمانہ قدیم سے انسانی دلچسپی کا موضوع بنا رہا ہے لیکن یہاں ہم اپنی گفتگو کو اس کے طبعی پہلو اور انجام کے دائرے تک محدود رکھیں گے۔ جب لوگ اجرام فلکی، اور خصوصیت سے سب سے روشن ستارے یعنی سورج کے معاملے میں مختلف اقسام کی توہم پرستیوں میں مبتلا تھے اور ان کی پرستش صفحہ ارض کے کئی خطوں میں مروج تھی تو قرآن نے اعلان کیا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ (۱۳:۲)

ترجمہ: اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا، اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین کے لیے گردش کرتا ہے۔

پھر فرمایا:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ(۲۱:۳۳)

ترجمہ اور (دیکھو) وہی ہے جس نے رات اور دن کا اختلاف پیدا کیا، اور سورج اور چاند بنائے۔ یہ تمام (ستارے) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

پہلی آیت کا ترجمہ ہم نے "تدبر قرآن" سے لیا ہے اور دوسری کا "ترجمان القرآن" سے نقل کیا ہے گویا مولانا ابوالکلام آزاد کل سے تمام اجرام فلکی مراد لیتے ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی دوسری آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یعنی سورج چاند بلکہ ہر سیارہ اپنے مدار پر پڑا چکر کھا رہا ہے یسبحون کے لفظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیارات اللہ کے حکم سے خود چلتے ہیں۔

۲۔ کائنات کے متعلق سائنس کا موقف اور اس میں پائے جانے والے تضادات

اس میں شک نہیں کہ بہت سے دوسرے اصناف علم کی طرح مغرب نے دور حاضر میں طبعی سطح پر کائنات میں جاری و ساری قواعد دریافت کرنے کے سلسلے میں بہت کاوش کی ہے۔ بہت سی ایسی کوششیں ثمر آور بھی ہوئی ہیں یہاں تک کہ انسان خلاء میں پہنچ گیا ہے اور اس کائنات کے طریق عمل (Functioning) کے اسرار معلوم کرنے کے لیے جد وجہد کر رہا ہے۔ علمی ذوق کے علاوہ اس شعبہ علم میں غیر معمولی سر گرمی کی سب سے بڑی وجوہ محرکہ حربی استعداد بڑھا کر دنیا پر اپنے استعماری اور استحصالی غلبے کو برقرار رکھنے پر مشتمل ہیں۔ جوہری توانائی (Atomic Energy) کے ذریعے سے بڑے پیمانے پر انسان کشی کے لیے ہتھیار بنانے اور خلا میں پہنچ کر اس حصہ کائنات کو بھی اپنی جنگی مقصد کے لیے استعمال کرنے کے عزائم نے علم کائنات (Cosmology) حاصل کرنے کے لیے مہمیز کا کام دیا ہے اور گزشتہ چند عشروں کے دوران مشاہدات اور ان سے مادی سطح پر اخذ نتائج کے سلسلے کے مواد کے انبار لگ گئے ہیں۔ محققین کا ایک جم غفیر ہے جو اس کام پر لگا ہوا ہے۔ اگرچہ مہلک ہتھیاروں میں تو اضافہ ہو رہا ہے لیکن اسرار کائنات اور اس کی ابتدا و انتہا معلوم کرنے کی کوشش کے دوران انتہائی قسم کے اختلافات رونما ہو گئے ہیں اور مباحث نے ایسی تکنیکی شکل اختیار کر لی ہے کہ ان کا احاطہ کرنے کے لیے کسی شخص کو اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ وقف کرنا پڑے گا۔

اگر یہ کوششیں حصول علم تک محدود رہتیں تو اسی لحاظ سے قابل تحسین قرار پاتیں جس طرح دوسرے شعبوں میں حصول علم کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ انسانی شرف استعداد علم ہی سے عبارت ہے لیکن جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا بد قسمتی سے ان کا رخ انسانیت کی فلاح کے بجائے اس کی ہلاکت کے لیے زیادہ قوت حاصل کرنے کے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ یہ کیفیت شعبہ ہائے علم پر مادہ پرستانہ ذہنیت اور فکر کو مسلط کر دینے کی پیداوار ہے۔ یہاں اس افسوس ناک صورت حال پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ ہم ان کاوشوں کے نتائج پر گفتگو کریں گے جن کا تعلق انجام کائنات معلوم کرنے کی جد وجہد سے ہے کیونکہ علم کائنات کے اس جز کا انعقاد معاد سے گہرا تعلق ہے۔

اس موضوع پر بہت سا لٹریچر وجود میں آ گیا ہے لیکن اخذ نتائج کے سلسلے میں بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئیں ہیں جن کے حل ہونے کی کم از کم سر دست کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جو طبعی قوانین مشاہدے اور تجربے کے مراحل سے گزر چکے ہیں اور ان کی بنیاد پر بہت سی اختراعات اور مشینی اشیاء وجود میں آ چکی ہیں ان کے مبنی بر حقیقت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کی بنیاد پر جب محض ذہنی کدو کاوش اور فلسفیانہ

موشگافیوں سے امکانات، اندازوں اور اٹکل کے ذریعے سے کائنات کے مستقبل کے متعلق آرا قائم کی جاتی ہیں تو ان میں نمایاں تفاوت ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سائنسی دنیا ہی کے عقیدے کے مطابق یہ طریقہ تفکر اور قوانین و قواعد قدرت معلوم کرنے کا انداز غیر سائنسی ہے۔ یہاں تو جو بات تجربے کی کٹھالی سے گزرے گی اس پر اعتماد کیا جا سکے گا۔

طبعی، کائناتی اور فلکیاتی علوم میں اگرچہ بہت پیش رفت ہوئی ہے لیکن جو معلومات اب تک دستیاب ہوئی ہیں وہ نسبتی اور اضافی اعتبار سے اس قدر قلیل ہیں کہ ان کی بنیاد پر اس کائنات اور عالم کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی جدوجہد کرنا سعی لاحاصل کے مترادف ہے۔ اس معاملے میں سائنس نے اپنے دائرہ کار سے تجاوز کر کے فلسفے کی عمل داری میں بے جا مداخلت کی ہے لیکن یہ حرکت بھی ثمر آور نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ فلسفہ اور سائنس دونوں ہی اس کاوش میں ناکام ہو چکے ہیں حالانکہ سائنس کی حیثیت تو واضح ہے اور اس صنف علم کی تعریف و تحدید پر کوئی اختلاف نہیں۔ چمبرز ڈکشنری میں ''سائنس'' کا یہ مفہوم بیان ہوا ہے:

ایسا علم جو مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر یقینیات کا مقام رکھتا ہو۔

ایسے عام اصول جو تنقیدی طور پر جانچنے، پرکھنے اور باقاعدہ منطقی نظم دینے کے بعد مرتب کئے گئے ہوں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں سائنس کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

"Any of various intellectual activities concerned with the physical world and its phenomena and entailing unbiased observations and systematic experimentation. In general, a science involves a pursuit of knowledge covering general truths or the operations of fundamental laws". (Vol.10, P.552).

طبعی و مادی دنیا اور اس کے مظاہر کے متعلق مختلف علمی سرگرمیاں جو بے تعصب مشاہدات اور باقاعدہ تجربہ سے مشروط ہوں۔ عموماً ایک سائنسی علم ایسے علم میں مشغول ہونے کے مترادف ہے جو عمومی حقیقتوں اور بنیادی قوانین کے نفاذ سے متعلق ہو۔

اپنے موجودہ درجہ تحقیق کی رو سے علم فلکیات (Astronomy) کے ماہرین کی اس کائنات کے آغاز و انجام کے متعلق آراء کو سائنسی یقینیات کا مقام نہیں دیا جا سکتا اور شاید کبھی بھی نہ دیا جا سکے۔ کیونکہ اس دائرے میں یقینیات کے مقام تک پہنچنے کے لیے ''حقیقت'' کا ادراک حاصل کرنا بہت ضروری ہے جس کا اس زندگی میں موجودہ انسانی قوائے فکر و شعور، عقل و خرد اور حسیات کے ذریعے سے ممکن نہیں۔ ہاں، اللہ تعالیٰ

نے جو معنوی و طبعی قوانین و قواعد اس دنیا میں رائج کر رکھے ہیں ان کے متعلق انسان کے لیے علم الادم الاسماء وکلھا(۲-۳۱) کی قرآنی تصریح کے مطابق انسان کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔ لیکن ہر معاملے میں اسے ایک مرحلے پر پہنچ کر رکنا پڑا ہے اور اس سے مفر نہیں۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اٹکل کے گھوڑے دوڑانا ذوق علمی اور سائنٹفک طرز فکر کے منافی ہے۔ قرآن نے تو یہ واضح طور پر کہہ رکھا ہے کہ

وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ (۲:۲۵۵)

ترجمہ: اور وہ اس کی معلومات سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔

دور حاضر میں کائناتی اسرار کے متعلق سائنسی علوم کے متعلق بہت مبالغہ آمیز خیالات رائج ہو گئے ہیں لیکن اس حلقے کے اصحاب فکر، اس شعبہ علم کی سرگرمیوں کی محدودیتوں کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ پروفیسر ڈبیلو ایم سمارٹ(W.M.Smart) انجام و آغاز کائنات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"There may be -- and I think that there is a point in the remote past where an 'iron curtain, shuts us out from scientific contemplation ....." The origin of the earth Page 9).

''ہو سکتا ہے اور میرے خیال میں ایسا ہے کہ ماضی بعید میں تخلیق کائنات کے سلسلے میں ایسا مقام آجاتا ہے جہاں ایک آہنی پردہ ہمیں سائنٹیفک انداز تفکر سے روک دیتا ہے۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے مستقبل کے متعلق تمام اندازے اور تھیوریاں اس کے ماضی کے متعلق وضع شدہ نظریات کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہیں، جیسا کہ آئندہ سطور میں واضح ہو جائے گا لیکن یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ کائناتی ماضی و مستقبل کے متعلق سائنسی تھیوریاں زیادہ تر اٹکل اندازوں اور قیاسات پر مبنی ہیں۔ یہ رویہ علم کے تقدس کو مجروح کرنے کے مترادف ہے قرآن میں اس کی ممانعت آئی ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ (۱۷:۳۶)

ترجمہ: اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں اس کے درپے نہ ہوا کرو۔

گمان اور علم میں بہت فرق ہے۔ اور گمان کی بنیاد پر کوئی ایسا نظریہ تعمیر کر کے اپنا لینا جو انسانی فکر و عمل کو متاثر کرے، ایک نہایت ہی غیر مناسب حرکت ہے۔ اگرچہ واقعیت کی تلاش پر اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن گمان کو حقیقت سمجھ کر اس سے فکری و علمی اصول مرتب کرنا گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

ہم نے سطور بالا میں اس عالم کے ماضی مستقبل کے متعلق ماہرین فلکیات و طبیعیات کے جس طرز عمل پر اظہار خیال کیا ہے اس کی تائید میں ہم بعض مغربی سائنسدانوں اور ناقدین کی آراء پیش کریں گے جن سے معلوم

ہو گا کہ اس قیاسی (Conjectural)انداز فکر نے اس معاملے میں کس قدر الجھاؤ اور انتشار(Confusion)پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں نظریات اور قیاسی آراء کی تعداد اس قدر کثیر اور متصادم ہے کہ کسی کتاب کے ایک باب کا جزو تو کیا ایک ضخیم کتاب بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہم نے اس موضوع پر گفتگو کے آغاز ہی میں عرض کر دیا تھا کہ ہم دور حاضر کے ماہرین فلکیات کے تحقیقی رجحانات کی جھلکیاں پیش کریں گے۔

۳۔ علم فلکیات کے سلسلے میں مسلمانوں کی سرگرمیاں:

تاریخ میں علم کائنات کی سرگزشت کا آغاز یونانیات سے کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ذریعہ علم مشاہدات ہی ہوتے تھے جو محسوسات کی وساطت سے حاصل کیے جاتے تھے اور اس کے بعد عقلی استدلال سے وہ اجرام فلکی کی حرکات کے اصول وضع کرتے۔ مثلاً ارسطو کا نظریہ تھا کہ انسان اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی زمین پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہر حال فلکیات پر یونانیوں کے مختلف خیالات وجود میں آئے لیکن وہ ان کے بعد صدیوں تک دوسرے یونانی علوم کی طرح عدم توجہی کا شکار ہو گئے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے ان کے مسودات حاصل کیے اور عباسی خلفاء نے انہیں عربی زبان میں منتقل کروایا۔ بعثت اسلام کے بعد ایک ہزار سال کا جو عرصہ گزرا ہے اس کے دوران دنیا علم پر مسلمانوں ہی کی اجارہ داری رہی اور یونانی علوم کو بھی مسلمانوں نے اپنی بحثوں اور تنقیدات کا موضوع بنا کر ان پر اضافہ بھی کیا اور بہت سے پہلوؤں سے اختلاف بھی کیا۔ جیسا کہ ہم باب ۳ میں ابن خلدون کی شہرہ آفاق تصنیف سے اقتباس دے کر واضح کر چکے ہیں۔ اب سے چند صدیاں پہلے جب مغرب میں ایک ہزار سالہ تاریک دور ختم ہو رہا تھا اور مسلمانوں کے زیر اثر علم سے شغف پیدا ہونا شروع ہوا تو دوسرے اصناف علوم کے ساتھ مغرب نے مسلمانوں ہی سے علم فلکیات کے سلسلے میں بھی استفادہ کیا چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں(Cosmos)کائنات کے عنوان کے تحت لکھنے والے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"The Renaissance brought a fresh spirit of inquiry to the arts and sciences. Explorers and travellers brought home the vestiges of classical knowledge that had been preserved in the Muslim world and the East,...." (Vol.16, Page 818).

نشاۃ ثانیہ فنون وعلوم میں تحقیقی جذبہ کا ذریعہ بنی۔ علمی کھوج لگانے والے اور سیاح یونانی علوم کے نشانات اور کم درجے کے باقیات مسلم دنیا اور مشرق میں محفوظ رکھا گیا تھا اپنے ہاں لائے۔

اصل ترتیب گفتگو سے تھوڑا سا انحراف کر کے ہم ناظرین کی توجہ بیشتر مغربی مصنّفین کی مسلمانوں کے معاملے میں اس علمی بد دیانتی کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ ہر صنف علم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ یا تو یونانیوں کے علمی عروج کے دور سے جو زمانہ قبل مسیح ہی میں اختتام پذیر ہو گیا تھا، پھلانگ کر اس علم کے ارتقاء کا قصہ پندرھویں صدی عیسوی میں مبینہ طور پر ظہور پذیر ہونے والے دور نشاۃ ثانیہ سے دوبارہ شروع کر دیتے ہیں اور یا کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے اس پر جو تنقید اور اضافے کا کام کیا اس کی قدر قیمت انتہائی طور پر گرا کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے مغرب کی طرف منتقل ہو گیا۔ اوپر ہم نے جس مقالہ نویس کا حوالہ دیا ہے اس نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ وہ کہتا ہے کہ یونانیوں نے فلکیات کے علم کا جو اثاثہ چھوڑا تھا اس کے کچھ نشانات (Vestiges) ہی باقی رہ گئے تھے جو ہمارے لوگ تلاش بسیار کے بعد مسلمان دنیا سے لائے۔ یہ سوقیانہ انداز کلام کسی اہل علم کو زیب نہیں دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ماہرین فلکیات نے اس شعبہ علم میں یونانی ترکے کا مطالعہ کرنے کے علاوہ خود بھی نئے نئے اور خلقی (Original) انکشافات کیے۔ بات کو واضح کرنے اور برٹینکا سے نقل کردہ اقتباس کی اصلیت کو واضح کرنے کے لیے ہم بعض حقائق پیش کریں گے جو فلکیات کے موضوع ہی سے متعلق ہوں گے۔

" The interest roused in astronomy by the school of Al-Mamun was carried on to later courts usurping the power of the Abbasid Khalifas. The Buwah Sultan Sharaf-ul-Dawlah built an observatory in his palace at Baghdad in 982 AD, where Abdul Rehman Al-Sufi, Ahmad Al-Saghani and the celebrated Abn Al-Wafa were engaged in active observational work. Abdul Rehman Al-Sufi was one of the three greatest practical astronomers of Islam (the two others being Ibni-Yunas and Ulugh Beg, who will be referred to later). Al-Sufi's illustrated treatise, "Kitab-al-Kawakib Al-Thabit Al-Musawwar" (available in Arabic, as well as in a French translation by Schjellerup) contains a catalogue of stars based on his own observations, giving their magnitudes and co-ordinates. It is the first star Allas to take cognizance of the nebula in Andromeda and is of great importance even at present, as it has revealed the changes undergone by a number of prominent stars in their magnitudes in the course

of ten centuries and may throw some light on their proper motions also."

''علم فلکیات میں المامون کے حلقہ علم میں جو دلچسپی پیدا ہوئی تھی وہ ان (حکومتی) درباروں میں بھی پہنچ گئی جو عباسی خلفاء کے اقتدار کے چھیننے سے وجود میں آئے۔

بغداد میں (دولت بنی) بویہ کے سلطان شرف الدولہ نے ۹۸۲ھ میں اپنے محل میں ایک رصد گاہ بنوائی جس میں عبد الرحمٰن الصوفی احمد الصغانی اور نامور ابوالوفا کو (علم فلکیات کے سلسلے میں) سرگرمی سے مشاہداتی کام کرنے پر مامور کیا گیا۔ عبدالرحمٰن الصوفی اسلام کے تین سب سے بڑے باعمل ماہر فلکیات میں سے تھا۔ (دوسرے دو ابن یونس اور الوغ بیگ تھے جن کا بعد میں تذکرہ کیا جائے گا) الصوفی کا بلند پایہ رسالہ ''الکتاب الکواکب الثابت المنور'' (جو ابتداً عربی میں لکھی گئی شکل میں اور نجلیر پ کے فرانسیسی ترجمہ کی صورت میں بھی دستیاب ہے) اس کے اپنے مشاہدات کی بنیاد پر مرتب شدہ فہرست پر جس میں ہم جسامت اور ہم پلہ ستارے دکھائے گئے ہیں مشتمل ہے۔ یہ ستاروں کی پہلی اٹلس (نقشہ) ہے جس نے انڈرومیڈا کہکشاں میں سویم کی شناخت کی اور یہ آج بھی بہت اہمیت کی مالک ہے کیونکہ اس نے بہت سے نمایاں ستاروں کی جسمانیت میں دس صدیوں کے اندر جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کو ظاہر کیا ہے اور ان کی صحیح حرکات پر بھی روشنی ڈال سکتی ہے۔''

''احمد الصغانی نے غالباً'' اسطرلاب اور دوسرے آلات بنائے جنہیں اس نے خود اور دوسرے ماہرین فلکیات نے شرف الدولہ کی رصد گاہوں میں استعمال کیا۔ ابوالوفا محمد ابن یحییٰ ابن اسمٰعیل ابن العباس البزجانی (۹۴۰تا۹۹۸) نے بغداد میں قابل قدر فلکیاتی علم کے سلسلے میں کام کیا لیکن یہ اس کے خالص ریاضیاتی کام کے نیچے دب گیا۔'' الصوفی کو علم فلکیات کے شعبے میں حاصل ہونے والے جس مقام کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کی تائید بریٹینکا کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

"Ahmad Al-Saghani probably made the astrolabes and other instruments used by himself and other astronomers working in Sharaf-Al-Dawala's observatory. Abul-Wafa Muhammad Ibni Muhammmad Ibni Yahya Ibni Ismail Ibni Al-Abbas Al-Bazjani (940-998 AD) did valuable astronomical work in Baghdad but this is eclipsed by his researches in pure mathematics". (Journal named "Renaissance " published from Lahore dated Nov. 1991. Article "Muslim Contribution to Science & Culture" by M.A.R.Khan).

"The Andromeda Galaxy in one of the few visible to the unaided eye appearing as a milky blur. It is located about 2,000,000 light years from the Earth; its diameter is approximately 200,000 light years; and it shares various characteristics with the Milky Way System. It was mentioned as early as AD 964, in the 'Book of the Fixed Stars', by the Arab astronomer and Sufi, and rediscovered in 1612, shortly after the invention of the telescope, by the German astronomer Simon Marins,...." (Vol.1 Page 394).

انڈرومیڈا کہکشاں ان چند کہکشاؤں میں سے ہے جو آلات کے بغیر انسانی آنکھ کو ایک دودھیے دھندلکے کی حیثیت سے نظر آتی ہیں۔ یہ زمین سے بیس لاکھ نوری سالوں کے فاصلے پر ہے۔ اس کا قطر تقریباً دو لاکھ نوری سالوں کی مسافت کے برابر ہے اور یہ ملکی وے کے نظم کی بہت سی خصوصیات رکھتی ہے۔ اس کا تذکرہ ۹۶۴ء کے پرانے دور میں ''کتاب الکواکب الثابت'' میں عرب ماہر فلکیات الصوفی نے کیا تھا اور دوبارہ اس کا انکشاف سائمن میریس نے دوربین کی ایجاد کے جلد بعد کیا''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان فلکی اور کہکشائی نظم کے مطالعہ کے سلسلے میں دسویں صدی میں اس مقام پر تھے جس پر یورپ کے ماہرین فلکیات تقریباً سات صدیاں بعد پہنچے اور یہی حال آلات کی ایجاد کا تھا۔ اور اس بات کو اس علم کی تاریخ کے حقائق کی روشنی میں تسلیم کرنے سے مفر نہیں کہ جس مقام پر نشاۃ ثانیہ اور اس کے بعد مغربی محققین پہنچے وہ مسلمانوں کے علمی ترکے کی بدولت تھا جس کو انہوں نے بطور وراثت حاصل کیا۔ یورپ میں فلکیاتی علم کی داستان کا آغاز کوپولیکس سے ہوتا ہے اور اس کا اصل کارنامہ اس کائنات کے شمسی المرکز ہونے کی تھیوری کو پیش کرنا تھا۔ آئندہ صفحات میں ہم ایسی معلومات پیش کریں گے جس سے ثابت ہوگا کہ اگر مسلمان ماہرین فلکیات نے اس شعبے میں بہت سا تحقیقی کام کر کے بنیادی مواد فراہم نہ کیا ہوتا تو اس شعبہ علم میں وہ پیش رفت نہ کر سکتا جس نے اس کو اونچا مقام دلایا۔

فلکیات پر تحقیقی و مشاہداتی کام صرف ایک آدھ مسلمان حکمران یا محدود زمانے میں نہیں ہوا بلکہ مختلف ادوار میں ہوتا رہا۔

"When the Saljuks began to dominate over the Abbasid Khilafat (on the downfall of Buwahids) a fresh impetus was given to the pursuit of astronomical studies. Jalal ud din Malik Shah summoned at his new observatory at Rayy,

Abdul Fath Omer Ibni Ibrahim Al-Khayyami (1038-1123/24 AD) to reform the Persian Calendar". ("Renaissance" Feb. 1992 issue).

(دولت بنوبویہ کے زوال کے بعد)جب سلجوقیوں نے عباسی خلیفہ پر غلبہ حاصل کرنا شروع کیا تو فلکیاتی مطالعاتی سرگرمیوں کو نئی حوصلہ افزائی ملی۔ جلال الدین ملک شاہ نے ابو الفتح عمر ابن ابراہیم الخیامی (۱۰۳۸ء/۲۴-۱۱۲۳ء) کو ایرانی نظام تقویم کی اصلاح کے لیے نئی رصد گاہ میں بلایا، اصلونی کو علم فلکیات کے شعبے میں حاصل ہونے والے جس مقام کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کی تائید بریٹینکا کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔

تاریخی دستاویزات اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ایک طرف مسلمان ماہرین فلکیات نے مشہور یونانی، ماہر فلکیات ٹالیمی (Ptolemy)، جو زمین کو مرکز کائنات تصور کرتا تھا، کی تھیوریوں کو غلط ثابت کیا تو دوسری طرف مغرب کو اس علم کی ابتدا اور اس میں ترقی کرنے کے لیے مواد فراہم کیا۔ مسلمان اس علم سے یورپ کے روشناس ہونے سے پہلے اس سلسلے میں رصد گاہیں قائم کر کے سائنٹیفک بنیادوں پر کام کرنے لگے تھے، اور یہی سرمایہ علم یورپ میں منتقل ہوا جس نے ان کے لیے تحقیق کا راستہ ہموار کیا۔

"The Arabs and the Muslim intelligentsia in general were aware of the sphericity of the earth from as early a time as that of Al- Mamun; Abn Ubaydah Muslim Al-Balinsi has clearly expressed this notion in his writings in the first half of the tenth century, and it is from accounts of such travels and such statements that Columbous drew his inspiration to discover America. The prevailing belief all over Christian Europe in those days was that the earth was flat."

''عرب اور مسلمان اہل علم ورائے کا حلقہ عام طور پر اتنے ابتدائی زمانے سے جو المامون کا تھا، زمین کی کرویت سے آشنا تھے۔ ابو عبیدہ مسلم البلنسی نے دسویں صدی کے نصف اول میں اپنی تحریروں میں اس نظریے کا اظہار کر دیا تھا اور ایسی سیاحتوں اور بیانات کی روشنی سے کولمبس نے امریکہ کی دریافت کے لیے تحریک حاصل کی۔ عیسائی یورپ میں ان دنوں زمین کے چپٹا ہونے کا عقیدہ رواج پذیر تھا۔

"Spain has produced a number of eminent Arab astronomers, among whom we may mention Abul Qasim Maslama Al-Majriti (1007 AD) of Cordova who revised and edited Al-Khawarizmi's "Zij", Abu Ishaq Ibrahim Ibni Yahya Al-Zardali (1028-1987 AD) of Toledo, known to the

Latin World as Arrzachel, whose astronomical "Tablas of Toledo" were widely known and used, and whose determination of the obliquity of the Ecliptic is correct to within one minute of an arc, and the length of the Mediterranean Sea (42 degrees), much nearer the truth than Ptolemy's exaggerated 62 degrees; Jabir Ibni Aflah (d: 1140 AD) of Ishbiliah (Seville) Latin name Geber, who made important advances in spherical trigonometry, was the inventor of armillary sphere for measuring the positions of the heavenly bodies and author of a book on astronomy in which the defects of the Ptolemaic System was pointed out and improvements on it attempted. Abu Ishaq Nuruddin Al-Bitruji (born in Morocco died in Seville in 1204 AD), Latin name Alpetraguis, was a pupil of the philosopher Ibni Tufyl and attempted in his book, "The Physical Theory of the Planets", to remove the errors of the Ptolemaic System by putting up a better explanation of Planetary motion, but without appreciable success, owing to the tyranny of Aristotelian ideas that heavenly bodies must move only in circles!

''ہسپانیہ میں متعدد نمایاں عرب ماہرین فلکیات پیدا ہوئے جن میں سے ہم چند کا ذکر کرتے ہیں: قرطبہ کے ابوالقاسم مسلمہ المجریتی ۱۰۰۷ء جس نے الخوارزمی کی ''زیج'' پر نظر ثانی کی اور اسے مرتب کیا۔ ٹولیڈو کے ابو اسحاق ابراہیم ابن یحییٰ الزردالی (۱۰۲۸ء-۱۰۸۷ء) جو لاطینی زبان میں ارزاقل کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کے فلکیاتی ''جداول ٹولیڈو'' وسیع پیمانے پر جانے اور استعمال کیے جاتے اور جس کا سورج کے دور کا تعین کردہ ترچھاپن ایک منٹ کی حد تک اس کی گولائی کے کسی حصے میں بھی صحیح تھا اور اسکا بحیرۂ روم کی لمبائی کا تعین (۴۲ درجے) ٹالیمی کی مبالغہ آمیز ۶۲ درجے کے مقابلے میں صحت سے بہت زیادہ قریب تھا۔ اشبیلہ (سیوائل) کا جابر ابن افلاح (م: ۱۱۴۰ء) جس کو لاطینی زبان میں جبر کہا گیا، جس نے کروی علم مثلث کو بہت بڑھایا ،آرملری (ایک چوڑی دار گول آلہ) جو اجرام فلکی کی حرکات کو ظاہر کرتا ہے کا موجد تھا نیز اس نے فلکیات پر ایک کتاب لکھی جس میں ٹالمیائی نظم فلکیات کے نقائص کی نشاندہی کی اور ان میں اصلاح کی کوشش کی۔ ابو اسحاق نور الدین البطروجی (مراکش میں پیدا ہوا اور اشبیلیہ ۱۲۰۴ء میں فوت ہوا) لاطینی نام الپٹراجیس تھا۔ وہ

فلسفی ابن طفیل کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنی کتاب (جس کا انگریزی ترجمہ The Physcical theory of planets) کے نام سے شائع ہوا، میں اس نے سیاراتی حرکات کی بہتر تشریح کر کے ٹالیمیائی نظم (اجرام) کی اغلاط کو دور کیا۔ لیکن اس کو ارسطو کے اس نظریئے کی (لوگوں کے ذہنوں پر) مضبوط گرفت کی وجہ سے افلا کی اجرام دائروں ہی میں حرکت کر سکتے ہیں، نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔"

"It may be further pointed out that it was due mainly to the destructive criticism of Al-Zarqali, Al-Bitruji, Nasir-uddin Tusi and others that Ptolemaic system of astronomy broke down eventually and Copernicus came out boldly with his helio-centric theory. He refers to his indebtedness to Al-Zarqali and Al- Battani" in his book "De Revolutionibus Arbium Celestinum". (Ibid. September, 1992 issue).

"نیز یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ ٹالیمیائی نظام فلکیات زیادہ تر الزر قالی، البطروجی، نصیر الدین طوسی وغیرہ کی شدید تنقید کی وجہ سے بالآخر منہدم ہو گیا اور کوپر لیکس نے پورے اعتماد کے ساتھ شمسی المرکز کائناتی نظریہ پیش کر دیا۔ اس نے اپنی کتاب (جس کا انگریزی ترجمہ Revolution of the Celestial Spheres) کے نام سے شائع ہو چکا ہے) میں الرز قانی اور البطانی کا مرہون منت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔"

ان اقتباسات میں جن مسلمان ماہرین فلکیات کا تذکرہ ہوا ہے ہم بریٹینکا ہی سے ان میں سے صرف دو کے اس نظریئے کے مقام و مرتبے اور جس طرح ان کے ذریعے سے یورپ اس علم سے آشنا ہوا، شہادت پیش کرتے ہیں: البطلانی کے متعلق لکھا ہے:

"in full Abu Abd Allah Muhammad Ibni Tahir Ibu Sinam Al-Battani Al-Hurrani As-Sabi, Latin as Albatineus, Alba-tegnus or Albategni (b.c. 858 in or near Haran, near Ufa, Syria -- d.929 Samarra, Mesopotamia), Arab astronomer and mathematician who refined existing values for the length of the year and of the seasons, for the annual precession of the equinoxes and for the inclination of the ecliptic. He showed that the position of the Sun's apogee, or farthest point from the Earth, is variable and that annular (central but incomplete) eclipses of the sun are possible. He improved Ptolemy's astronomical calculations by replacing

geometrical methods with trigonometry. From 877 he carried out many years of remarkably accurate observations at ar-Raqqah in Syria."

''پورا نام ابو عبد اللہ محمد ابن جابر ابن سنان البطانی الحرانی السابی۔ لاطینی زبان میں البنینس یا البانگنس (پیدائش تقریباً ۸۵۸) برن، عرفا میں یا ان کے قریب شام میں۔ وفات ۹۲۹ء سامرا، میسو پوٹیمیا) وہ عرب ماہر فلکیات و ریاضیات تھا جس نے سال اور موسموں کی موجود الوقت اضافی مدت، سالانہ استقبال اعتدال اور سورج کے دور کے جھکاؤ کو بہتر طور پر متعین کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ سورج کا زمین سے دور ترین مقام اور فاصلہ تغیر پذیر رہتا ہے، اور یہ کہ سورج کا حلقہ نما (مرکزی لیکن نامکمل) گہن ممکن ہے۔ ٹالیمی نے فلکی شعبے میں جو حسابات علم مثلث کی روشنی میں لگائے تھے ان میں اس نے ہندسی علم کے ذریعے سے اصلاح کی۔ ۸۷۷ء سے اس نے الرقہ میں غیر معمولی طور پر صحیح مشاہدات (فلکی) کا کام کئی سال تک کیا۔''

"Al-Battani was the best known of Arab astronomers in Europe during the Middle Ages. His principal written work, a compendium of astronomical tables, was translated into Latin C.1116 and into Spanish in the 13th century. A printed edition under the title De Motu Stellarum ("on Stellar Motion" was published in 1537." (Vol.1 Page 962).

''البطانی ازمنہ وسطی میں یورپ کے اندر بہترین عرب ماہر فلکیات کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اس کی اہم ترین تصنیف کا جو اس کے فلکیاتی جدولوں کا ملخص تقریباً ۱۱۱۶ء میں لاطینی زبان ہیں اور تیرھویں صدی میں ہسپانوی زبان میں تراجم کیے گئے۔ ۱۵۳۷ء میں ایک طبع شدہ اشاعت De motu stellarmn (on stellar motion) یعنی ستاروں کی حرکت کے متعلق کے نام سے وجود میں آئی۔''

الخوارزمی کے متعلق بریٹینکا میں تحریر ہے:

“in full Muhammad Ibn Musa Al-Khwarizmi (b.c. 780 Baghdad- d.c.850) Muslim Mathematician and astronomer whose major works introduced Hindu-Arabic numerals and the concepts of Algebra into European mathematics. He lived in Baghdad under the caliphate of Al-Mamun and Al-Mu’tasim in the first golden age of Islamic science. His work on elementary mathematics Kitabaljabar and al-muqabalah (“The Book of Integration and Equation”), was

translated into Latin in the 12th century and originated the term Algebra.".

".....Al-Khwarizmi also compiled a set of astronomical tables, based largely on the sindbind, an Arabia version of the Sanskrit work Bralma Sidhana (7th century AD) but also showing Greek influence.". (Vol.6. page 848).

اس کا پورا نام محمد ابن موسیٰ الخوارزمی تھا پیدائش تقریباً ۷۸۰ء وفات تقریباً ۸۵۰ء مسلمان ماہر فلکیات، ریاضیات جس کے بڑے علمی کارناموں نے یورپ کے ریاضیاتی علم کو ہندو عربی اعداد اور الجبرے کے تصورات کو متعارف کروایا۔ وہ المامون اور المعتصم کی خلافت کے زمانے میں بغداد میں اسلامی سائنس کے پہلے سنہری دور میں رہا۔ ریاضی کے اولین اصولوں پر مشتمل اس کی تصنیف کتاب الجبر والمقابلہ (The book of Integration and equation) کا بارہویں صدی میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور الجبرے کی اصطلاح کا آغاز ہوا"۔

"۔۔۔۔۔الخوارزمی نے جدول فلکیات کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا جو زیادہ تر "سندھ ہند" پر مبنی تھا جو سنسکرت کی کتاب برہماسدھنا (ساتویں صدی عیسوی) کا عکس تھی، لیکن اس میں یونانی اثر بھی تھا۔

اس مختصر سی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جیسا کہ بریٹینکا کی جلد ۱۴ صفحہ ۸۱۸ کے اقتباس میں بیان کیا گیا ہے۔ صورت یہ بنی تھی کہ یورپ سے بعض لوگ مسلم دنیا میں گئے اور تلاش بسیار کے بعد فلکیات پر مرور زمانہ سے بچا کھچا یونانی علمی مواد لے آئے، بلکہ اصل صورت یہ تھی کہ یورپ جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں محو خواب تھا لیکن اس کے مغربی اور مشرقی دونوں انتہاؤں میں مسلمان علم کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ خصوصیت سے اندلس (ہسپانیہ) میں بے شمار تعلیم گاہیں قائم تھیں اور ہر اس شعبہ علم کے سلسلے میں جس کا تصور کیا جا سکتا ہے، علماء و حکماء علمی تخلیقات میں مصروف تھے۔ چونکہ مسلمان حکومتوں اور معاشروں میں ہر مذہب کے پیرؤں تک کے لیے مکمل آزادی ہوتی تھی لہٰذا ہر وہ فرد جس کے دل میں حصول علم کا شوق ہوتا تھا، مسلمانوں کے مراکز علم کا رخ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی تصنیفات کے مختلف یورپی زبانوں میں ترجمے ہو رہے تھے اور ان کتب کے مصنّفین کا بھی علمی دنیا میں شہرہ ہوتا تھا جیسا کہ فلکیاتی علم کے سلسلے میں اجمالی گفتگو ہی سے ظاہر ہے۔ سو یہ تھے حالات جن کے تحت مسلمانوں سے یورپ نے مختلف اصناف علم حاصل کیے۔

بریٹینکا کے مذکورہ اقتباس کے بعد ہم نے جو گفتگو اور وضاحت کی وہ اس لیے ضروری تھی کہ اس حوالے میں بالکل غلط تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ہم چونکہ ایک طرف اسلام اور مسلمان اور دوسری طرف مغربی تمدن کے باہمی مؤثرات پر بھی گفتگو کر رہے ہیں اس لیے اس مقام سے اس بحث کے بغیر گزر جانا مناسب نہ تھا نیز اس سے مشتے از خروارے کے طور پر یہ بات بھی روشنی میں آگئی کہ مغربی اہل علم کا مسلمانوں کے علمی کارناموں کو ان کے مقام سے گرانے کا انداز کیا ہے۔ یورپ کے بہت سے مصنّفین دوسرے اصناف علم میں بھی یہی رویہ اختیار کرتے ہیں، اور مسلمانوں کو ان کی علمی تاریخ کے معاملے میں احساس کمتری میں مبتلا اور یورپ کی علمی اجارہ داری سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے علمی حلقے تحقیق و مطالعہ سے کام لے کر اصل صورت حال واضح کریں اور ایسے ادارے قائم کریں جن کی وساطت سے یہ کام مطلوبہ پیمانے پر کیا جا سکے۔ ہر قوم و ملت کے حوصلے میں اس کی تاریخی روایات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے ہمارے ہاں مستغربین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو علمی دائرے میں مغرب سے مبالغہ آمیز حد تک مرعوب ہے۔

۴۔ علم کائنات کے متعلق مغرب کی سرگرمیاں

اب ہم کائنات سے متعلق مغربی ماہرین فلکیات کی تحقیق و مشاہدات اور اس عالم کے آغاز و انجام کے متعلق ان کے اخذ کردہ نتائج کے متعلق وہیں سے گفتگو کا سلسلہ شروع کریں گے جہاں سے سطور بالا میں مذکور وضاحتی بیان کا آغاز کیا تھا۔ دراصل اس سلسلے میں دقت یہ ہے کہ اس موضوع پر بہت سی آراء، قیاسات اور تھیوریاں پیش کی گئی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک نظریے پر متعدد اعتراضات کیے گئے ہیں لہٰذا کائنات کے آغاز، اس کی موجودہ کیفیت اور اس کے انجام کے متعلق اگرچہ کثیر مقدار میں لٹریچر فراہم ہو چکا ہے لیکن کسی ایک پہلو سے بھی کوئی فیصلہ کن بات نہیں کی جا سکی جس پر ماہرین فلکیات متفق ہوں۔ اتفاق ہے تو صرف اس بات پر کہ یہ کائنات اتنی وسعت رکھتی ہے کہ اس کا، باوجود نہایت حساس آلات کی ایجاد کے، احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس شعبہ علم میں سب سے نمایاں اور مشہور تھیوری Big Bang بڑے دھماکے سے موسوم ہے جو اس کائنات کی ابتداء سے متعلق بیان کی جاتی ہے۔ یہ اسی صدی کے ربع اول میں پیش کی گئی اور تبھی سے اس پر اور کائنات کی موجودہ صورت اور اس کے مستقبل پر اس کے حوالے سے مشاہدات کا کام ہو رہا ہے۔ اس دھماکے

سے قبل عالمی حوالے سے کیا حالات تھے، اس کے متعلق کسی مسلم حیثیت کے مالک ماہر فلکیات نے کوئی دعویٰ نہیں کیا اور نہ کوئی قیاس آرائی کی ہے۔ مختلف قیاسات کے ذریعے سے جن کی بنیاد مختلف مشاہدات کو قرار دیا جاتا ہے موجودہ کائنات کی عمر دس ارب سے پندرہ ارب بیان کی جاتی ہے یعنی یہ کہ بڑا دھماکا اب سے اتنے سال قبل معرض وجود میں آیا اور اس نے بتدریج مختلف کہکشائیں اور اجرام فلکی کو جنم دیا۔ اس سلسلے میں ایلین برامز (Allan broums) لکھتا ہے:

"The Big Bang occurred perhaps twelve billion years ago.." ("Our Emerging Universe" Page 242).

بڑا دھماکا غالباً بارہ ارب سال قبل رونما ہوا۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں "بگ بینگ ماڈل" کے عنوان کے تحت تحریر ہے:

"Big Bang model, widely held theory of the evolution of the universe. Its essential feature is the emergence of the universe from a state of extremely high temperature and density – the so called Big Bang that occurred at least 10,000,000,000 yeas ago". (Vol.2 Page 205).

بگ بینگ ماڈل کائناتی ارتقاء کے سلسلے میں وسیع حلقے میں مانا جاتا ہے۔ اس کی لازمی خصوصیت یہ ہے کہ کائنات انتہائی طور پر شدید حرارت اور کثافت کے حالات سے گزر کر وجود میں آئی۔ نام نہاد بگ بینگ کا یہ واقعہ دس ارب سال قبل وقوع پذیر ہوا۔

اس کے بعد آئن سٹائن کے دو "مفروضات" کا ذکر کر کے لکھا ہے:

"These two assumptions make it possible to calculate the history of the cosmos after a certain epoch called the Plank time. Scientists have yet to determine what prevailed before Planck time" (Ibid).

"یہ دو مفروضات زمانہ پلینک کہلانے والے کسی دور کے بعد کائنات کی تاریخ کا حساب لگانا ممکن بنا دیتے ہیں۔ سائنسدانوں نے ابھی اس بات کو متعین کرنا ہے کہ زمانہ پلینک سے قبل کیا حالت طاری تھی۔

نہایت طاقت ور دوربینوں (Telescopes) کی وساطت سے جو کروڑہا نوری سالوں (Light Years) کے فاصلوں تک مشاہدات کروا سکتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ انکشاف ہوا ہے کہ یہ کائنات کلی طور پر، دوسرے لفظوں میں اس کی کہکشائیں (Galaxies) جن کی تعداد ایک معروف ماہر فلکیات

ایڈنگٹن(Eddington)کے مطابق ایک کھرب ہے، جو خلاء میں موجود ہیں اور ہر کہکشاں اوسطاً ایک کھرب ستاروں پر مشتمل ہے، ہم سے ہر سمت میں پندرہ ہزار میل فی سیکنڈ سے دور چلی جارہی ہے۔اسی مظہر قدرت سے دراصل یہ نتیجہ اخذ کیا جارہاہے کہ کائنات کے ہر طرف پھیلنے سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ایک عظیم دھماکے نے اس کے تمام اجزاء کے اندر یہ حرکتی قوت(Momentum)پیدا کر دی ہے اور اس خیال کا اظہار بھی کیا جارہاہے کہ وہ دھماکا یا اس کا اثر اختتام پذیر نہیں ہوا بلکہ کائنات اسی کے زیر اثر حرکت میں ہے اور اسی سے کشش ثقل کے کئی (Theory of Relativity) مسائل زیر بحث ہیں اور آئن سٹائن کی نظریہ اضافت جیسی تھیوریاں وجود میں آئی ہیں جن پر گفتگو ہمارے دائرہ مبحث میں شامل نہیں۔چنانچہ ایلین برومز لکھتاہے:

"....this means that (as a whole) the galaxies are rushing rapidly away from each other and that our Greater Universe is literally expanding". Considering the speeds involved - upto tens of thousands of miles per second "expanding" seems to be gross understatement, and the proper understatement and the proper word should be "exploding". At any rate that is what was meant earlier when it was stated that we still see a great explosion going on which is, of course, the "fair evidence" that the Big Bang did actually occur". ("Our Emerging Universe" Page 21).

''اس کا مطلب ہے کہ (بحیثیت مجموعی) کہکشائیں تیز رفتاری سے ایک دوسرے سے دور جارہی ہیں اور ہماری کائنات ''حقیقی معنوں میں'' پھیل رہی ہے۔متعلقہ رفتاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو دسیوں ہزار میل فی سیکنڈ تک ہیں، ''پھیلنا'' اصل سے گھٹا کر بیان کرنا معلوم ہوتا ہے۔اور موزوں لفظ حالت دھماکا ہونا چاہیے۔ بہر حال جب پہلے بیان کیا گیا تھا کہ ہم ایک بڑے دھماکے کے جاری رہنے کی حالت کو ابھی تک دیکھ رہے ہیں تو اس سے یہی مراد تھی، جو اس بات کی ''معقول شہادت'' ہے کہ بڑا دھماکا حقیقتاً واقعہ ہوا تھا۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ایک بڑا دھماکا نہیں ہوا بلکہ کائنات کا مختلف گوشوں میں نسبتاً چھوٹے چھوٹے دھماکوں کا سلسلہ ابتدائے کائنات سے اب تک جاری ہے لیکن اس نے زیادہ توجہ حاصل نہیں کی اگرچہ اس کے مطابق بھی کائنات کی وسعت اور مزید پھیلاؤ کا نظریہ مجروح نہیں ہوا۔اس وسعت کا احساس اس قدر باعث حیرت ہے کہ جے ڈبلیو این سلی ورن لکھتاہے:

"So far as size goes, the universe, it would appear can have no surprises left for us. The figures we have given cannot impress us more even if they come to be multiplied by a hundred or a million, for they are already unimaginable." (Limitation of Science" Page 22).

جہاں تک جسامت کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ ہمارے لیے اس کائنات کے متعلق کوئی وجوہ حیرت نہیں ہو سکتیں۔ جو اعداد ہم نے دیئے ہیں وہ ہمیں زیادہ مرعوب نہیں کر سکتے، چاہے انہیں سو سے یا دس لاکھ سے ضرب دے دی جائے، کیونکر وہ پہلے ہی ناقابل تصور ہیں۔

کائنات کی ان پہنائیوں کے متعلق مشاہداتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ، جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارۃً عرض کیا جا چکا ہے اس معاملے پر بھی غور اور رائے قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اس سارے کارخانہ قدرت کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے متعلق بہت سی قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں۔ تقریباً سبھی محققین کا مؤقف یہی ہے کہ یہ کائنات ہمیشہ کے لیے اپنی موجودہ شکل قائم نہیں رکھ سکتی۔ صرف ایک نمایاں ماہر ریاضیات و فلکیات سر فریڈ ہائل (Sir Fred Hyle) (پیدائش ۱۹۱۵ء) یہ رائے رکھتا ہے کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ وہ کائنات کی وسعت پذیری (Expansion) کے نظریے کو تو قبول کرتا ہے لیکن کہتا ہے کہ یہ بڑے دھماکے کا نتیجہ نہیں۔ اس کی تھیوری (Steady State Universe) کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ کائنات کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ مادہ خصوصاً ہائی ڈروجن کی شکل میں خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے اور پھیلتی ہوئی کائنات کو اس کی کثافت برقرار رکھنے کے لیے غذا مہیا کرتا رہتا ہے۔ مادے اور کائنات کی جسامت کے تعلق کی اس صورت کی بنیاد آئن سٹائن کے اس نظریے نے فراہم کی ہے:

"Einstein finite universe is such that its radius is dependent upon the amount of matter in it. Were more matter to be created the volume of the universe would increase. Were matter to be annihilated, the volume of space would decrease. Without matter space would not exist" ("The Basis of Modern Science" by T.W.N. Sullivan". Page 190).

آئن سٹائن کی محدود کائنات ایسی ہے کہ اس کا نصف قطر اس میں مادے کی مقدار پر منحصر ہے۔ اگر زیادہ مادے کو پیدا کیا گیا تو کائنات کا حجم بڑھ جائے گا۔ اگر مادے کو نابود کر دیا گیا تو خلاء کا حجم کم ہو جائے گا۔ مادے کے بغیر مکان کا وجود قائم نہیں رہے گا۔

ہائل یہ واضح نہیں کر سکا کہ نیا مادہ کیسے پیدا ہوتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ اس بات کو فی الحال اعتماد و اعتقاد (Faith) کی بنیاد پر تسلیم کر لیا جائے۔ اگر اس کے خلاف شہادت فراہم ہو گئی تو اس خیال کو واپس لے لیا جائے گا۔ جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ نیا مادہ پرانے مادے کی کس طرح جگہ لے کر کائناتی پھیلاؤ کو مواد مہیا کرے گا تو وہ کہتا ہے کہ اس کو بھی سر دست اعتماد (Faith) کے طور پر قبول کر لو۔ بلا دلیل و تجربہ اس کی ان باتوں کو محض اندھے عقیدے کے طور پر قبول کرنے کے اس مطالبے کو جب غیر سائنسی حرکت قرار دیا گیا تو اس نے یہ الزامی جوابات دیئے جو علم فلکیات و کائنات کے غیر سائنسی مسلمات کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ اس نے کہا کہ آخر تم یہ بات کسی سائنسی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر تسلیم کرتے ہو تو ابتداءً مادہ اچانک اتنی کثیر مقدار میں وجود میں آ گیا۔ پھر اس نے کہا کہ آخر بڑے دھماکے کو جس کو بغیر مشاہدے اور سائنسی تجربے اور شہادت کے قبول کر کے اس کی بنیاد پر علم فلکیات و کائنات کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، یہ بھی تو عقیدے کے طور پر ہی قبول کیا گیا ہے۔ اس کا کوئی مثبت سائنسی ثبوت تو موجود نہیں بہر حال ہائل کی تھیوری علم کائنات کے حلقوں میں قابل ذکر پیمانے پر درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکی۔

۵۔ کائنات اور انسان کے انجام کے متعلق سائنسی تصورات:

بڑے دھماکے اور اس سے پیدا شدہ متواتر پھیلتی اور وسعت پذیر ہوتی ہوئی کائنات کا نظریہ رکھنے والوں میں موجودہ کائنات کے زیر و زبر ہونے اور انسانی زندگی کے نابود ہونے کے امکانات پر بہت سی آراء پیش کی گئی ہیں۔ لیکن اس گفتگو کے دو حصے یا پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ مختلف اجرام فلکی میں، جن میں انسانی زندگی کے حوالے سے سورج بظاہر سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مادے کے توانائی میں تبدیل ہونے کا عمل جاری ہے۔ اس لحاظ سے ان کی آئندہ زندگی کے متعلق کیا اندازے لگائے جا رہے ہیں۔ دوسرے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اجرام فلکی کی زندگی کی طوالت اور بنی نوع انسان کی زندگی کی طوالت میں یکسانی نہیں پائی جاتی۔ انفرادی حیثیت سے تو انسان کی ارضی زندگی اول الذکر کے مقابلے میں طوالت کے اعتبار سے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی لیکن مجموعی اور نوعی سطح پر بھی اپنی بقا کے لیے انسان ایک خاص نوعیت و کیفیت کے کائناتی حالات کا محتاج ہے۔ یہ خود اور اس کی ضروریات زندگی اس قدر حساس واقعہ ہوئے ہیں کہ کائناتی حالات میں معمولی سا ردوبدل ان کے خاتمے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس کی حالات کے تغیرات کے ساتھ سازگاری کی استعداد بھی بہت خفیف اور کمزور ہے مثلاً کائناتی حوالے سے ماہرین فلکیات برودت و حرارت کے جن اونچے درجوں کا ذکر کرتے ہیں، ان کی

انسانی برداشت سے سرے سے کوئی نسبت ہی نہیں۔اسی طرح آکسیجن کی مثال لے لیجئے کہ اس کے معاملے میں انسان کس قدر حساس ہے۔ ایسے سب معاملات میں اجرام فلکی میں تغیرات کے پیمانے سے انسانی نوع کی برداشت اور زندگی کی طوالت کی پیائش کرنا قطعاً مناسب نہیں جیسا کہ ہم علم فلکیات کے ماہرین و ناقدین کی کائنات اور انسان کے مستقبل کے متعلق اپنے تجربات اور مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج کا انہی کے الفاظ میں ملخص پیش کر کے واضح کریں گے۔ یہ لوگ ایسے کائناتی تغیرات کی پیشنگوئیاں کر رہے ہیں اگرچہ ان میں تذبذب، شک اور غیر یقینی حالت کا عنصر غالب ہے کہ ان تغیرات کے ابتدائی مراحل ہی میں نباتاتی و حیوانی زندگی صفحہ ارض سے محو ہو جائے گی۔

یہاں ہم صرف یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے سطور بالا میں علم فلکیات اور کائناتی اسرار کے متعلق سائنسی تحقیق کے متعلق جس قدر وسیع پیمانے پر کی گئی بالا جمال گفتگو کی ہے اس سے سائنسدان بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ اس سطح ارض پر انسانی زندگی کو بالآخر ختم ہونا ہے۔ وہ اس کو خالصتاً مادی رنگ میں لیتے ہیں یعنی یہ کہ اس کرۂ ارض پر اتفاقاً ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن کے تحت حیوانی زندگی حادثاتی طور پر وجود میں آ گئی۔ ایک مرحلے پر انسان کی باطنی خصوصیات بھی عمل ارتقاء کے ذریعے سے، جس کی عقلی توجیہ نہیں کی جا سکی، پیدا ہو گئیں اور بالآخر اسی طرح اپنی تمام خصوصیات کے باوجود انسان کائناتی حادثے ہی کے تحت نابود ہو جائے گا، لیکن ہم یہ عرض کر دیں کہ انہی حلقوں میں جہاں اس انداز فکر کے متعلق غیر یقینی کی حالت طاری ہے وہیں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ساری چابکدستیوں کے باوجود انسان کی عقل و خرد اسی قدر محدود ہے کہ یہ اتنی عظیم کائنات کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی بھی انہی مادہ پرست سائنسی حلقوں میں کمی نہیں جو کائناتی وجود کے متعلق مختلف و متضاد نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ تحقیقی سرگرمیاں قابل قدر سہی لیکن حقیقت کے ادراک کے حوالے سے الجھن، حیرت اور تذبذب میں ان کے باعث اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس ساری گفتگو اور قیل و قال میں وہ نوع انسانی کے حشر کو جو ہمارے مشاہدے میں آنے والی کائنات میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے، کوئی اہمیت دیئے بغیر ایسے ہی نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے وہ کوئی قابل توجہ شے ہے ہی نہیں۔ اور وہ اپنے مادہ پرستانہ فکر کے حوالے سے ایسا ہی سوچ سکتے ہیں جو چیز ان کے نزدیک حادثتاً اور بغیر کسی غایت اور اعلیٰ وارفع مقصد کے وجود میں آئے وہ اگر حادثتاً ہی نیست و نابود ہو جائے تو اس سے حیرانگی کا کونسا پہلو نکلتا ہے لیکن اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ پرستانہ فکر نے انسان کے تقدس کو کس طرح پامال کیا ہے۔

ایلن برومز (Allan Broms) مختلف کائناتی تھیوریوں کو بیان کرنے اور ان کا جائزہ لینے کے بعد کائنات انسان کے مستقبل کے متعلق جن متعدد امکانات کا تذکرہ کرتا ہے ہم انہیں اسی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"How long the Earth will remain fit for Man's survival is the greater question. It surely depends largely on long term astronomic events which are probably far beyond his midget powers of control. It may of course be subject to unpredictable accidents, such as collision of the Sun with another star (extremely unlikely), or the crashing fall of some great meteorite or asteroid upon the Earth (possible, but not too likely). But without accident at all, there are certain astronomic trends which seem ultimately to so doom the sun and Earth that Man must become extinct if meanwhile he has not found himself another planetary home elsewhere in the Universe".

"In Chapter 7 on the Career of the Moon we discussed such a long term probability when the Moon, after some terms of billions of years would approach the Earth so closely that the ocean tides, high and swift would sweep from the Earth all vestiges of life. But it was also remarked that long before this could happen, the sun would have changed in its energy output that the Earth would no longer be habitable. So the story of sun itself therefore takes precedence in deciding how long our human future can possibly last".

بڑا سوال یہ ہے کہ زمین انسان کی بقا کے لیے کتنے عرصے تک موزوں رہے گی۔ یہ یقیناً زیادہ تر دور رس کائناتی واقعات پر منحصر ہے جو غالباً انسان کی نہایت پست قوتوں کے قابو سے بہت وراء ہے۔ یہ لا محالہ ایسے حوادث پر بھی مبنی ہو سکتا ہے کہ جس کے متعلق کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی جیسا کہ سورج کا کسی دوسرے ستارے سے ٹکرا جانا (انتہائی غیر اغلب) یا زمین پر کسی بڑے شہاب یا سیارچے کا دھماکے سے گرنا (ممکن ہے لیکن اغلب نہیں) لیکن کسی حادثے کے بغیر بعض ایسے فلکیاتی رجحانات موجود ہیں جو آخر کار سورج اور زمین کو اس طرح تباہ کرتے دکھائی دیتے ہیں جس سے انسان لازماً نابود ہو جائے گا اگر اس نے اس کائنات میں کہیں اور

کوئی ایسا سیارہ رہائش کے لیے نہ پالیا۔ چاند کی زندگی سے متعلق باب ے میں ہم نے ایسے دور رس امکان پر بحث کی تھی۔ جب چاند کوئی دسیوں ارب سال کے بعد زمین کے اتنا قریب آ جائے گا کہ سمندر کی اونچی اور تیز لہریں زمین سے زندگی کے تمام نشانات مٹا دیں گی۔ لیکن یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس کے ظہور میں آنے سے بہت پہلے سورج کی توانائی کی پیدائش میں تبدیلی آ جائے گی یہاں تک کہ زمین حیاتیاتی رہائش کے قابل ہی نہیں رہے گی۔ لہٰذا اس طرح سورج کی زندگی کی داستان خود ہمارے انسانی مستقبل کا فیصلہ کرنے میں پیش پیش ہو گی۔

"Our own sun is a star and derives the energy it pours out so profusely from the slow conversion of mass into energy as its supply of hydrogen transmutes into helium. As it thus ages, the percentage of hydrogen is reduced and that of helium increased, and that in due course will make a lot of difference……."

".... For the increase in the percentage of helium in a sun causes two basic things to happen in order to pressure internal stability. The sun must both expand in size and increase luminosity, which means it will pour out more energy and the Earth must become slowly warmer....."

"But finally.... the aging sun will expand to thirty times its present diameter, fiercely burning its hydrogen fuel at an extravagant rate, with the Earth temperature rising by 900°F evaporating the oceans and of course burning up all living things.....throughout the Universe of Stars, the lights may be expected to go out one by one." ("Our Emerging Universe" Pages 249-252).

"ہمارا اپنا سورج ایک ستارہ ہی ہے اور یہ اس قدر زیادہ مقدار میں اپنی جو توانائی بکھیرتا ہے اور جیسے اس کی ہائی ڈروجن کی دستیاب مقدار ہیلیم میں تبدیل ہوتی جاتی ہے ویسے ہی اس کا مادہ توانائی کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس طرح جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جائے گی ہائیڈروجن کی مقدار کم اور ہیلیم کی زیادہ ہوتی جائے گی اور اس دوران بڑا فرق واقعہ ہو جائے گا۔۔۔۔ داخلی استحکام کو قائم رکھنے کے لیے کسی سورج میں ہیلیم کی مقدار کے اضافے سے دو بنیادی باتیں وجود میں آتی ہیں۔ سورج جسامت میں بھی ضرور بڑھے گا اور اس کی روشنی میں بھی اضافہ ہو گا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زیادہ توانائی بکھیرے گا اور زمین آہستہ آہستہ زیادہ گرم ہوتی جائے گی۔۔۔"

''لیکن آخر کار ----- عمر رسیدہ سورج کا قطر اس کے موجودہ قطر سے تیس گنا ہو جائے گا، اور تیزی سے اپنی ہائیڈروجن کے ایندھن کو مسرفانہ رفتار سے جلائے گا یہاں تک کہ زمین کا درجہ حرارت ۹۰۰ درجے فارن ہائیٹ تک بڑھ جائے گا جس سے سمندروں کے پانی بھاپ بن کر اڑ جائیں گے اور لامحالہ تمام حیاتیاتی اشیاء (اس مرحلے سے بہت پہلے) جل چکی ہوں گی ----- ستاروں کی ساری کائنات میں روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ جائیں گی۔''

ایسا لکھنے اور جگہ جگہ پر کائناتی مظاہر کے سلسلے میں اربوں سال کے عرصوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"However, it also gives us a feeling of uncertainty in our reliance on these scientific speculations and forecasts" (Ibid Page 252).

تاہم یہ سائنسی قیاسات اور پیشگوئیاں ہمیں ان پر بھروسہ کرنے کے سلسلے میں بے یقینی کے احساس میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں کائنات (Cosmos) کے عنوان کے تحت مفصل مقالہ لکھنے والے پروفیسر فرینک ایچ شو (prof. Frank h. shu) نے اگرچہ اس شعبہ علم میں مسلمانوں کی کارکردگی کو نظرانداز کر دیا ہے، اور ہم اس مسئلے پر تبصرہ کر چکے ہیں، لیکن اس نے مغربی ماہرین فلکیات کی تقریباً سبھی تھیوریوں کا جائزہ لیا ہے۔ اور بالآخر (the ultimate fate of universe) یعنی ''کائنات کا آخری انجام'' کے ذیلی عنوان کے تحت یہی لکھا ہے کہ کائنات اپنی موجودہ حالت کو برقرار نہ رکھ سکے گی۔ وہ کہتا ہے کہ:

"In the absence of definite observational conclusions one can only speculate on the possible fate of the actual universe. If the universe is unbound, the cosmological expansion will not halt and eventually the galaxies and stars will all die, leaving the cosmos a cold, dark and virtually empty place. If the universe is bound, the mass-energy content in the distant finite future will come together again; the cosmic background radiation will be blueshifted raising the temperature of matter and radiation to incredible levels, perhaps to reforge everything in the fiery crucible of big squeeze..." (Vol.16. Page 845).

''مشاہدات کی بنیاد پر یقینی نتائج تک پہنچے بغیر انسان اگر متداول کائنات کے ممکنہ انجام کے متعلق قیاس آرائی ہی کر سکتا ہے۔ اگر کائنات لا محدود ہے تو اس کی وسعت پذیری کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا اور کہکشائیں اور ستارے موت سے ہم آغوش ہو جائیں گے اور اس کائنات کو ایک سرد، تاریک اور فی الواقع ایک سونی اور خالی جگہ کی حیثیت سے چھوڑ جائیں گے۔ اگر کائنات محدود ہے تو مادہ اور توانائی کی مقدار طویل لیکن محدود مستقبل میں دوبارہ اکٹھی ہو جائے گی۔ کائنات کے پس منظر کی تابانی ظاہر ہو کر مادے اور درخشانی کا درجہ حرارت ناقابل تصور حد تک بڑھا دے گی اور غالباً آتشیں کٹھالی میں ڈال کر ہر چیز کو ایک نئی صورت میں بھینچے گی۔''

ابھی پچھلے دنوں ڈان اخبار کراچی کی ۲۰ جنوری ۱۹۹۳ کی اشاعت میں Big Crunch ahead for the universe یعنی ''مستقبل میں کائنات ایک بڑے دھماکے کے روبرو'' کے عنوان سے رابن میکی(Robin Mckie) کا لکھا ہوا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں تحریر ہے:

"The universe may end with a bang, not a whimper, after all. Scientists have discovered that, huddled among the stars and galaxies there is a mysterious type of 'dark matter', which might one day halt the expansion of the cosmos."

"If they are right, the universe could end in a big crunch as researchers term this cataclysmic finals. It means that in the final phase, all the objects in the heavens would rush together in a mighty catastrophic implosion."

بالآخر کائنات ایک بڑے دھماکے کے ساتھ ختم ہو سکتی ہے نہ کہ ایک بھینی سی آواز کے ساتھ۔ سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ستاروں اور کہکشاؤں کے درمیان ایک پراسرار قسم کا تاریک مادہ بے ترتیب حالت میں انبار لگائے ہوئے ہے جو کسی روز کائنات کے پھیلاؤ کو روک سکتا ہے۔''

اگر ان کی بات درست ہے تو کائنات ایک بہت بڑی جڑ مراہٹ (یا حالت روندگی) کے ساتھ ختم ہو سکتی ہے جس سے محققین اس کے حادثاتی انجام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے آخری مرحلے میں آسمانوں یا گردوں کی تمام اشیاء ایک اندر کی طرف رخ کیے ہوئے بہت طاقتور دھماکے کے ساتھ تیز رفتاری سے دوڑیں گی۔''

ناظرین نے لازماً محسوس کیا ہو گا کہ کائنات میں جاری و ساری قوانین و قواعد اور اس کے آغاز و انجام کا ذکر کرتے ہوئے فلکیاتی اور کائناتی سائنس کے حلقے سے تعلق رکھنے والے محققین و ناقدین نے کوئی بات اعتماد و

یقین کے ساتھ نہیں کہی، بلکہ ہر معاملے میں تذبذب، اندازوں اور اٹکل کا عمل دخل نمایاں ہے۔ اس صورت حال کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم اس علم سے متعلق مغربی حلقوں ہی کی چند آراء پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

پروفیسر ڈبلیو ایم سمارٹ لکھتا ہے:

"....no single theory can give an adequate explanation of more than one or two of the many observed characteristics of the Solar System. The scientific search for an answer to our final question has thus failed,....." ("The Origin of the Earth" Page 211).

کوئی ایک تھیوری شمسی نظام کی مشاہدہ کی ہوئی بہت سی خصوصیات میں سے ایک یا دو سے متعلق مناسب توضیح پیش نہیں کر سکتی۔ اس طرح ہمارے آخری سوال کے متعلق سائنسی (یعنی تجربے اور مشاہدے سے تصدیق شدہ) تلاش کا جواب نہیں مل سکا۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے:

"As we have seen, many of the principal theories of the formation of the solar system are of the catastrophic type and the first thing that strikes us about such theories is the 'messiness' associated with them, the contradiction involved in the birth of an orderly planetary system from parent chaotic matter or from the debris of a cataelysonic event" (Ibid).

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شمسی نظام کی تشکیل کے متعلق بہت سی تھیوریاں پر آشوبی (اور حادثاتی) نوعیت کی ہیں۔ اور پہلی بات جو ایسی تھیوریوں کے متعلق کھٹکتی ہے وہ ابتری ہے جو ان سے وابستہ ہے (اور) وہ تضاد ہے جو درہم برہم شدہ مادے یا کسی طوفانی واقع کے ملبے سے ایک منظّم سیاری نظام کے وجود میں آنے سے متعلق ہے۔

آپ اس کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے جاری و ساری رہنے کے متعلق تمام سائنسی تھیوریوں کا مطالعہ کر لیجئے۔ سب میں یہی کہا جائے گا کہ ابتداً مادے اور دوسری کئی قسم کی گیسوں اور معدنیات کا ایک گڈمڈ ہوا، بے ربط ساذخیرہ تھا جس سے طوفانی دھماکے یا دھماکوں سے یہ کائنات وجود میں آگئی اور اب اسی کے نتیجے میں پھیل رہی ہے اور اس کے اجزاء ہر طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میں پروفیسر سمارٹ لکھتا ہے اور ہر شخص کہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مادہ کی ایک بے ربط کیفیت کی حالت میں دھماکا خیز طوفان آئے اور

اس کے نتیجے میں ایک منظّم و مربوط حالت وقوع پذیر ہو جائے جو ہمیں نظر آنے والی اس کائنات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر ہم قرآنی وضاحتوں کی روشنی میں بات کریں گے تو یہ کہیں گے کہ کسی خالق معظم اور مدبر کے بغیر اتنے وسیع پیمانے پر تعمیر ہونے والی کائنات جس کی وسعت سے سائنس بھی انکار نہیں کر سکتی اور جس کے اجزاء کا شمار ناممکنات میں ہے اور یہ سب اجزاء صفت ربط، تنظیم سے متصف ہیں، کیسے از خود وجود میں آسکتی ہے اور چل سکتی ہے اور جب یہ خود منظّم حالت میں ہے تو اس کا کسی غیر منظّم حالت سے ماخوذ ہونا کس طرح قرین قیاس ہو سکتا ہے:

آگے چل کر اس نے اعتراف کیا ہے کہ:

".....all the theories proposed upto date as to the mechanism by which the Solar System has come into being fail to carry conviction (Ibid Page 212).

شمسی نظام کے عالم وجود میں آنے کی تعمیری ترکیب کے متعلق آج تک کی تمام مجوزہ تھیوریاں انسانی ذہن کے لیے قابل قبول نہیں"۔

ستاروں کے متعلق تحقیقی کاوشوں کا تذکرہ کرنے کے ضمن میں ایلن برومز لکھتا ہے:

"Frankly, we are doing much guessing about these last stages and final endings of the star careers". ("Our Emerging Universe" Page 92).

اگر صاف گوئی سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا اور ہم ستاروں کی زندگی کے آخری مراحل اور کل اختتام کے متعلق بہت قیاس آرائی سے کام لے رہے ہیں"۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ کائنات میں جو تغیرات واقعہ ہو رہے ہیں ان کے متعلق مختلف نظریات کا ذکر کرنے کے بعد یہی مصنف کہتا ہے:

"So far, much of all this is obviously speculative with only a small basis of factual evidence. (Ibid Page 83).

اب تک اس میں سے بہت کچھ واضح طور پر قیاسی ہے جس کی واقعاتی و حقیقتی شہادت بہت قلیل ہے"۔

جے ڈبلیو این سلی وان لکھتا ہے:

"The scientific ideal of giving a mathematical description of all natural phenomena in terms of a few simple entities and principles seems further from realisation than it has been at any period since Newton. Our greater

knowledge has given us a sight of deeper difficulties and more irreconceivable facts." ("The Basis of Modern Science" Page 198).

نیوٹن کے بعد کسی دور میں قدرتی مظاہر کا چند سادہ حقائق اور اصولوں کی شکل میں ریاضیاتی انداز بیان کے ذریعے سے سائنسی نصب العین کا حصول اتنا مشکل نہیں تھا (جتنا اب ہے) ہماری علمی زیادتی نے ہمیں زیادہ گہری تکالیف اور متبائن حقائق سے دوچار کر دیا ہے۔

یہی مصنف اس رائے کا اظہار کرتا ہے:

".....Science tells us much less about the universe than we used to suppose. It is limited not only because as an historical fact, mathematical laws have been formulated for only a limited class of phenomena, but because science, by its very nature, can tell us nothing about phenomena but their structure". (Ibid Page 211)

جتنا ہم نے فرض کر رکھا تھا سائنس ہمیں اس سے بہت کم بتاتی ہے۔ اس کا دائرہ عمل صرف اس لیے محدود نہیں کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ریاضیاتی قوانین مظاہر قدرت کے ایک محدود حلقے کے لیے ہی وضع کیے گئے ہیں بلکہ اس لیے کہ سائنس اپنی نوعیت علمی کے لحاظ سے مظاہر قدرت کی حقیقت کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتا سکتی بلکہ صرف اس کی ساخت کے متعلق بتا سکتی ہے۔

یہی مصنف اپنی ایک اور تصنیف میں ماہرین فلکیات کے اس خیال پر اظہار حیرانگی کرتا ہے کہ انسان ختم ہو جائے گا اور کسی باشعور مخلوق کے بغیر یہ سلسلہ کائنات مزید ایک عرصے تک جاری رہے گا۔ اسی طرح وہ اس تصور کو بھی ناقابل فہم قرار دیتا ہے کہ یہ کارخانہ قدرت اچانک وجود میں آگیا اور ایک بے مقصد زندگی گزار کر ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

"This revelation is startling. It is still more startling, almost incredible, when we reflect that this amazing panorama sprang suddenly into existence a finite time ago. It emerged full armed, as it were, out of nothing, apparently for the sole purpose of blazing its way to an eternal death. This is the scientific account. It seems to be true as far as it goes, but we cannot believe that it is the whole truth. We prefer to believe that the present scientific method has its limitations". ("Limitations of Science". Pages 25-26).

یہ انکشاف حیران کن اور چونکا دینے والا ہے۔ یہ اور بھی زیادہ چونکا دینے والا اور نا قابل یقین (تصور) ہے۔ جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ تحیر انگیز منظر کائنات ایک متعین عرصہ قبل اچانک معرض وجود میں آگیا۔ گویا یہ پوری مقتضیات کے ساتھ ظاہراً محض اس مقصد کے تحت نیست سے نمودار ہو گیا کہ یہ اپنا سفر طے کر کے ابدی موت سے ہمکنار ہو جائے۔ عین یہی سائنس کا نقطہ نظر ہے۔ ایک حد تک یہ درست معلوم ہوتا ہے، لیکن ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ یہی حقیقت کلی ہے۔ ہم یہ نظریہ اپنانے کو ترجیح دیں گے کہ سائنس کا حصول علم کا طریقہ اپنی محدودیتیں رکھتا ہے۔

ہر مسئلے پر سائنس کے آئے دن بدلتے ہوئے نظریات پر تبصرہ کرنے اور اس رائے کا اظہار کرنے کے بعد یہ مصنف لکھتا ہے کہ ہم حقیقت شناسی کے متقاضی تصورات ابھی تک شاید نہیں اپنا سکے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے ہمیں شاید ایک نیا عالمی نظریہ اپنانا پڑے، کیونکہ سائنس خلاف توقع طور پر زندگی اور انسانی باطن کے اسرار معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا خیال ہے کہ :

"It is very probable that some of the questions we are putting to nature are just meaningless. It is this fact that makes the present stage of science so peculiarly interesting. We are living, not merely in an epoch of fresh discoveries, but at the birth of a new world outlook". (Ibid. Page 51).

یہ اغلب ہے کہ قدرت سے ہم جو سوالات کرتے ہیں ان میں سے بعض بے معنی ہوں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس نے سائنس کے موجودہ مرحلے کو خاص طور پر دلچسپ بنا دیا ہے ہم صرف نئے انکشافات کے ہی نہیں بلکہ ایک نئے عالمی نظریے کے وجود میں آنے کے عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

آگے چل کر کہتا ہے کہ :

"At the present day the scientific universe is more mysterious than it has ever been before in the history of thought. Although our knowledge of natural processes is greater than it has ever been, this knowledge is, in a way, less satisfactory, for in every direction we are faced with ambiguities and contradictions. "(Ibid Page 69).

سائنس (کے تصور) کی کائنات فکر و نظر کی تاریخ میں کبھی اس قدر پر اسرار نہ تھی جس قدر آج کے دور میں ہے، اگرچہ قدرت کے عملی ضابطوں کا علم اب اتنا زیادہ ہے جتنا کبھی نہ تھا، لیکن ایک حیثیت سے یہ علم کم تسلی بخش ہے، کیونکہ ہر طرف ہمارا ابہامات اور تضادات سے سامنا ہے۔

ماہرین فلکیات نے کائنات کے وجود میں آنے، اس کے مختلف مراحل سے گزرنے اور بالآخر اس کے زیروزبر ہونے کی مختلف و متضاد صورتوں کے متعلق جن زمانی طوالتوں اور عرصوں کا ذکر کیا ہے اس پر اس لحاظ سے تو اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان کا اتنا طویل ہونا ناممکنات میں سے ہے لیکن ان کی صحت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں اس علم کے ناقدین متردد ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مفروضہ بڑے دھماکے ہی سے موجودات کی داستان کا آغاز کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں علم نہیں کہ یہ دھماکا جب ہوا ہے تو اس سے قبل کیا صورت حال تھی اور جن حالات اور مادی اشیاء اور ان کی خصوصیات نے اس دھماکے کو ممکن بنایا ان کے پیدا ہونے کی کیا صورت تھی اور وہ کس طرح وجود میں آئے۔ دھماکے سے قبل کے دور کو پلینک دور (Plank Period) کا نام دیا جاتا ہے۔ اور زیادہ تر اسی رائے کا اظہار کیا جارہا ہے کہ اسی دور کے بعد کائنات تخلیق ہوئی اور زمان و مکان بھی وجود میں آئے۔ اس سے قبل نہ وقت تھا نہ مکان۔ بریٹینکا میں Time (زمان یا وقت) کے عنوان کے تحت لکھنے والا مقالہ نگار کہتا ہے:

".....the universe as it is known originated as a primeval explosion at a date of the order of 15×10^{10} years ago. Though this date is often loosely called "the creation of the universe", there is no reason to deny that the universe (in the philosophical sense of "every thing that there is") existed at an earlier time, even though it may be impossible to know anything of what happened then." (Vol.28, Page 657).

کائنات، جیسا کہ یہ جانی جاتی ہے، کا آغاز پندرہ ارب سال قبل کے دور میں ایک ابتدائی یا قدیم دھماکے سے ہوا۔ اگرچہ اس وقت کو عام طور پر بے پروائی سے "تخلیق کائنات" کا موقع کہا جاتا ہے لیکن اس بات سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ کائنات (فلسفیانہ معنوں میں "ہر چیز جو موجود ہے") اس سے پہلے کے وقت میں موجود تھی۔ اگرچہ جو کچھ اس وقت ہوا اس کا جاننا ناممکن ہو۔

اس کی چند سطور کے بعد یہی مقالہ نگار اس صفحے پر لکھتا ہے:

"A British cosmologist E.A. Milne, however, proposed a theory according to which time in a sense could not extend backward beyond the creation time".

تاہم ایک برطانوی ماہر کائنات ای اے ملنے (E.A. Milne) نے ایک تھیوری پیش کی جس کے مطابق ایک معنی میں وقت (زمان) تخلیقی وقت سے پیچھے کی طرف وسعت نہیں پاسکتا اور پھر اس تخلیقی وقت کا اندازہ اور تصور بھی بلاواسطہ معلوم نہیں کیا گیا بلکہ اس کے وقوع پذیر ہونے کو اس بنا پر قرین قیاس قرار دیا گیا ہے کہ چونکہ یہ کائنات اس وقت پھیل رہی ہے لہٰذا کسی دھماکے کے دھکا دینے اور دھکیلنے ہی کی وجہ سے ایسا ہو سکتا ہے اور پھر وسعت کائنات کی اربوں اور کھربوں کو اربوں اور کھربوں ہی سے ضرب دے کر جو عدد حاصل ہوتا ہے، اتنے میلوں کے حساب سے پیمائش کر کے اس کے پھیلنے کی مزعومہ رفتار سے تقسیم کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بڑا دھماکا جب سب کائناتی تھیوریوں کی بنیاد ہے دس سے پندرہ ارب سال قبل وقوع پذیر ہوا ہو گا۔ یہ باتیں جیسا کہ ہم اقتباسات دے کر واضح کر چکے ہیں۔ اس علم سے گہرا شغف رکھنے والوں کو بھی ورطہ حیرت اور بے یقینی میں مبتلا کر رہی ہے غور فرمایئے کائناتی عمر متعین کرنے کا یہ کس قدر بے ڈھنگا طریقہ ہے۔

ہم اس قسم کے مباحث میں الجھنا نہیں چاہتے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ قرآن اور شارع علیہ السلام نے وہ کچھ بتا دیا ہے جو انسان کو مطابق فطرت زندگی گزارنے کے لیے کفایت کرتا ہے اور اپنی استعدادوں کے لحاظ سے اس کی عقل و شعور کی گرفت میں آسکتا تھا۔ باقی جو کچھ علم غیب سے یا دوسرے لفظوں میں ادراک حقیقت سے متعلق ہے، اس کے سلسلے میں بے نتیجہ فلسفیانہ بحثوں اور اندازوں میں تو الجھا جا سکتا ہے لیکن اس کی تہ اور حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اوپر کے دونوں اقتباسات میں اس الجھاؤ کی واضح مثال موجود ہے۔ البتہ کائناتی مظاہر کے سلسلے میں نوع انسانی کے جائز مفاد کے تقاضوں کے مطابق تحقیق و مطالعہ کرنے میں کوئی روک نہیں۔

۶-علامہ اقبال کی رائے:

علامہ اقبال نے (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں اپنے پہلے خطاب کے دوران چند لفظوں میں خدا اور کائنات کے حوالے سے قرآن کی تعلیمات کے مقصد کی نشاندہی کی ہے۔

"The main purpose of the Quran is to awaken in man the higher consciousness of his manifold relations with God and the universe. It is in view of this essential aspect of the Quranic teachings that Goethe, while making a general review of Islam as an educational force, said to Eckermann. "You see this teaching never fails; with all our systems, we cannot go, and generally speaking no one can go, further then that".

قرآن کا سب سے مقدم مقصد انسان کے اندر اللہ اور کائنات کے ساتھ اس کے گوناگوں تعلقات کا اونچی سطح کا احساس بیدار کرنا ہے۔ قرآن کی تعلیمات کے اس ضروری پہلو کو پیش نظر رکھ کر ہی گوئٹے نے اسلام کی تعلیمی قوت پر عام تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمین سے کہا "تم سمجھتے ہو کہ یہ تعلیم کبھی ناکامیاب نہیں ہوتی۔ ہمارے تمام نظاموں کے باوجود ہم، اور عمومی رنگ میں بات کرتے ہوئے کوئی اور اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

علامہ موصوف کی تصریح اور جرمن فلسفی گوئٹے کے جان آکسفورڈ کی تالیف کردہ کتاب (Conversation of Goethe with Eckerman and Sorret) سے لیے گئے الفاظ سے انسانی ضرورت کے لیے اسلامی تعلیمات کے کفایت کرنے پر جو مختصر لیکن معنوی اعتبار سے جامع اظہار خیال ہوتا ہے وہ بیان حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے اور خصوصی توجہ کے قابل ہے۔ مطلب یہ ہے قرآن جو کچھ کہتا ہے کہ وہ یقینیات کی اساس پر کہتا ہے۔ اس میں تذبذب اور تشکیک کا کوئی دخل نہیں اور دوسرے یہ کہ خدا اور کائنات کے متعلق اسلامی تصورات مربوط حیثیت کے مالک ہیں اور ان میں تضاد، ٹکراؤ اور انتشار نہیں۔ اس کے مقابلے میں سائنسی علوم میں یہ سب مؤخر الذکر خامیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ صورت حال انفرادی طور پر ہر صنف سائنس میں بھی پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے علم کائنات و فلکیات کے سلسلے میں اس علم سے تعلق رکھنے والے محققین و ناقدین کے خیالات کے حوالے دے کر ثابت کیا ہے اور مجموعی طور پر علم سائنس کی تمام اصناف میں بھی یہی کیفیت ہے۔ اپنے دوسرے خطاب میں علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

"There is no doubt that the theories of science constitute trustworthy knowledge, because they are verifiable and enable us to predict and control the events of Nature. But we must not forget that what is called science is not a single systematic view of Reality. It is a mass of sectional views of Reality fragments of a total experience which do not seem to fit together. Natural Science deals with matter, with life, and

with mind; but the moment you ask the question how matter, life, and mind are mutually related, you begin to see the sectional character of the various sciences that deal with them and the inability of these sciences, taken singly, to furnish a complete answer to your question. In fact, the various natural sciences are like so many vultures falling on the dead body of Nature, and each running away with a piece of its flesh."

اس میں شک نہیں کہ سائنس کی تھیوریاں پر اعتماد علم پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ وہ قابل تصدیق ہوتی ہیں اور ہمیں قدرتی واقعات کی پیشگوئی اور ان پر قابو پانے کا اہل بناتی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ ہر گز نہ بھولنا چاہیے کہ ہم جس علم کو سائنس کہتے ہیں وہ حقیقت کا کوئی باقاعدہ ایک تصور اور نظریہ نہیں۔ یہ حقیقت کے جزوی تصور کا ایک ڈھیر ہے۔ یعنی مجموعی تجربے کے ٹکڑے جو ایک دوسرے کے ساتھ موافقت رکھتے دکھائی نہیں دیتے۔ طبعی سائنس مادہ، زندگی اور انسانی باطن سے بحث کرتی ہے، لیکن جس لمحے تم یہ سوال کرو کہ مادہ زندگی اور انسانی باطن کا باہمی تعلق کیا ہے تو تم ان مختلف شعبہ ہائے سائنس کی اجزائی خصوصیت کا مشاہدہ کرنے لگو گے جو ان سے متعلق ہیں، اور اپنے سوال کے مکمل جواب کے سلسلے میں ہر ایک کی عدم صلاحیت بھی دیکھو گے۔ در حقیقت مختلف طبعی سائنسی علوم ان بہت سے کرگسوں کے مشابہ ہیں جو قدرت کی لاش پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ہر ایک اس کے گوشت کے ایک ٹکڑے کو لے کر بھاگ جاتا ہے۔

سائنسی علوم پر علامہ موصوف کا یہ عمومی تبصرہ مغرب میں مرتب شدہ علم فلکیات و کائنات پر بھی صادق آتا ہے جیسا کہ مغربی محققین و مصنّفین پر اظہار رائے کر رہے ہیں۔ توقعات کے خلاف سائنس نے لوگوں کے ذہنوں کو الجھنوں اور متضاد خیالات سے دوچار کر دینے کی وجہ سے مغرب میں بھی غور و فکر کرنے والے بعض اذہان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس عظیم، منظّم اور انسانی تصور کی گرفت میں نہ آنے والی وسعت کی مالک کائنات محض حادثات کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور نہ کسی ایسی ہستی کے بغیر چل سکتی ہے جو اس سارے کارخانہ قدرت پر چھائی ہوئی ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم کائناتی مسائل کے ماہر اور اس سے متعلقہ علم کے دو ایسے ناقدین کی آراء نقل کرتے ہیں جن کی تصانیف سے ہم نے اس سے قبل اقتباسات بھی دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ پادری ہیں، نہ کسی مذہب سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان کی ساری علمی عمریں کائناتی علم کے مطالعہ اور اس

کے سلسلے میں نقد و تبصرے پر مشتمل کتابیں تصنیف کرنے میں گزری ہیں۔اور یہ زندگی کے مغربی فکر ہی کے حامی ہیں۔

ڈبلیو ایم سمارٹ لکھتا ہے:

"When we study the Universe and appreciate its grandeur and orderliness, it seems to me that we are led to the recognition of a Creative Power and Cosmic Purpose that transcends all that our limited minds can comprehend. In one of his essays Francis Bacon expressed this belief picturesquely as follows: 'I had rather believe all the Fables in the Legend and the Talmud and the Alcoran than that this Universal Frame is without a Minha'. Today we have learned very much more about the 'Universal Frame' than was known in Bacon's time; nevertheless to many of us, scientific and non-scientific alike, the belief in a Divine Creator is as necessary now as even it was. To one astronomer at least 'The Heavens are telling the Glory of God and the 'Wonder of His Works'. ("The Origin of the Earth" P.220).

جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی عظمت اور حسن ترتیب و باضابطگی کی خوبی کا تصور کرتے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایسی تخلیقی قوت اور کائناتی غایت کو تسلیم کرنے کی طرف کھنچے جارہے ہیں جو ان سب باتوں سے جن کا ہمارے محدود قلب و دماغ احاطہ کر سکتے ہیں، ماوراء ہے۔اپنے ایک مقالے میں فرانسس بیکن نے اس عقیدے کا دلکش انداز میں اس طرح اظہار کیا ہے میں انجیل، تلمود اور القرآن کے اساطیر کو ماننے کو اس بات پر ترجیح دوں گا کہ یہ کائناتی ڈھانچہ یا نظم کسی روحانی جوہر سے محروم ہے۔آج ہم اس کائناتی ڈھانچے کے متعلق اس سے جو بیکن کے وقت معلوم تھا، بہت زیادہ جان چکے ہیں تاہم ہم بہت سے لوگوں کے نزدیک چاہے وہ سائنسی ذہن رکھتے ہوں یا غیر سائنسی ایک ربانی خالق کا ہونا اسی طرح ضروری ہے جیسے پہلے تھا۔کم از کم ایک ماہر فلکیات کے نزدیک آسمان اللہ کی عظمت اور اس کی حیران کن مخلوق (کائنات) کی شہادت دیتے ہیں۔"

اسی طرح جے ڈبلیو این سلی وان نے اظہار خیال کیا ہے:

".....Science, by its very nature, can tell us nothing about phenomena but their structure. Also, those elements of our experience that are ignored by science are not thereby shown

to have no bearing upon the nature of reality. Our aesthetic and religious experiences need not lose the significance they appear to have merely because they are not taken into account in the scientific scheme. It is even possible that they will not always remain excluded from the scientific scheme". ("The Basis of Modern Science" Page 211).

سائنس اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہمیں مظاہر قدرت کے متعلق ان کے ڈھانچے کے علاوہ کچھ نہیں بتا سکتی۔ مزید برآں ہمارے تجربات کے ان عناصر کے متعلق جنہیں سائنس نظرانداز کرتی ہے یہ نہیں ثابت کیا گیا کہ وہ حقیقت کی ماہیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہمارے جمالیاتی اور مذہبی (یا روحانی) وجدانات محض اسی وجہ سے اپنی اہمیت نہیں کھو سکتے کہ ان کو سائنسی خاکے میں جگہ نہیں دی گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ سائنسی خاکے سے خارج نہیں رہیں گے۔

۷۔ کائناتی سائنس اور قرآن:

ہم واضح کر چکے ہیں کہ اسلام کے اصولوں کو برسر حق ثابت کرنے کے لیے ہمیں کسی دوسرے نظام فکر کی حمایت و توثیق حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر اسلام کے اصولوں سے کلی اختلاف کرنے والے اپنے تحقیق و مطالعہ کی بنیاد پر کسی بنیادی اسلامی اصول کی خود ہی تصدیق کر دیں تو تفہیم اور اتمام حجت کے لیے اگر انہی کے نتائج فکر و تحقیق کے رجحانات کا حوالہ دے کر یہ بیان کر دیا جائے کہ اسلام نے یہ بات چودہ صدیاں قبل واضح طور پر کہہ دی تھی تو یہ بات مخالفین اسلام اور ان کی فکر سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کے لیے اس دین حق کے اصولوں کو سمجھنے میں ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ مغربی تمدن میں جس علم سائنس کو بہت اہم مقام حاصل ہے اسی علم نے کائنات کے آغاز و انجام کے متعلق تحقیقی سطح پر بظاہر جتنی بھی پیش رفت کر لی ہو لیکن اس کی مہیا کردہ معلومات اور انکشافات میں تشکیک و تذبذب کا عنصر غالب ہے۔ البتہ اس علم کی پیش کردہ تھیوریوں میں پائی جانے والی ساری کمزوریوں کے باوجود، اس کے سلسلے میں کی جانے والی تحقیقی اور مشاہداتی کاوشوں کی وسعت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض باتیں تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر درست بھی ثابت کی جا چکی ہیں۔ لیکن ہم یہاں ناظرین کی توجہ جس بات کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فلکیاتی سائنس نے مشاہدات و تحقیق کے ذرائع سے، چاہے وہ جس قدر بھی کمزور ہوں، اس رجحان کو تقویت پہنچائی ہے کہ یہ عالم کسی نہ کسی مرحلے پر کسی نہ کسی وجہ سے خاتمے سے ہمکنار ہو جائے گا۔ یہ نہ ازلی ہے نہ ابدی۔

یہ اور بات ہے کہ مغربی تمدن خداناشناسی اور مادہ پرستی پر اصرار کی وجہ سے اپنی تمام اضطرابی اور تشکیکی کیفیات کے باوجود یقین محکم کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ کے وجود کے خالق و مدبر کائنات کی حیثیت سے اور وحی کے اصول کو ذریعہ ہدایت کے طور پر دانشوری اور عقل پرستی کے لیے اپنے مخصوص تصور کے پیش نظر تسلیم کرنے کے لیے ابھی تیار نہیں۔

ہم نے اس عالم کے خاتمے کے متعلق قرآن سے بھی آیات نقل کر دی ہیں اور سائنس کا نقطہ نظر بھی پیش کر دیا ہے۔ ناظرین موازنہ کر کے رائے قائم کر سکتے ہیں کہ جو بات قرآن نے چودہ صدیاں قبل کہہ دی تھی کیا کائنات کے انجام کے متعلق رواں صدی میں ظاہر ہونے والے سائنسی رجحانات (جن میں ممکنہ تبدیلیوں اور ان سے متعلق) عرصوں پر انکاموں پر اٹکل کا عنصر غالب ہے، اس سے مطابقت اختیار نہیں کر رہے؟ البتہ قرآن کا مقصد، تکنیکی، سائنسی مسائل پر روشنی ڈالنا نہیں ہے۔ وہ وہ تو اس عالم کے اختتام کی کیفیت کو اس نقطہ نظر سے بیان کرتا ہے کہ بالآخر اس میں کیے گئے اعمال کی باشعور واختیار انسان کو جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس کے لیے اس عالم کی موجودہ صورت کو ختم کیا جائے گا اور ایک دوسری ہی طرز کے احوال و ظروف رکھنے والے عالم کو وجود میں لایا جائے گا جس میں اسے جزاء وسزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں اس دنیا کے زیر وزبر ہونے کی کیفیت پر قرآن نے اتنی روشنی ڈالی ہے جس سے اس وقت رونما ہونے والی صورت حالات کا نقشہ انسانی ذہن میں آجائے۔ اس دور میں اس کیفیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ سورج، چاند، ستاروں، زمین اور سمندروں کی حالت کا جس انداز سے اس سے قبل نقل کردہ آیات قرآنی میں تذکرہ ہے وہ الفاظ اصطلاحات اور تعلیمی روح کے اختلاف کے ساتھ آج کے علم فلکیات وکائنات سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں موضوع بحث وگفتگو بنے ہوئے ہیں۔ قرآن ایسی تکنیکی بحثیں کرتا ہے نہ ان سے منع کرتا ہے۔ مسلمان بھی اپنے دور عروج میں علم فلکیات میں دلچسپی لیتے اور تجربات اور مشاہدات میں مصروف رہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے مسلمانوں کو مہیا کردہ علمی مواد سے فائدہ اٹھا کر مغرب میں اس شعبہ علم میں خاصی ترقی کی گئی ہے لیکن کبھی کوئی بات اسلام کے کسی بیان کے خلاف ثابت نہیں ہوئی۔

انعقاد قیامت وعالم آخرت کا موضوع چونکہ اسلام میں اساسی اہمیت رکھتا ہے اور انہی پر صرف زبانی نہیں بلکہ محکم ایمان لانے پر اس دنیا میں انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی روش کو اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھال سکتا ہے اور جوابدہی کے احساس کے تحت ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے لہٰذا اس نے کائناتی مسئلے پر کسی قدر تفصیل سے اجمالی نقاط کی شکل میں گفتگو کی ہے۔ تاکہ سائنسدانوں نے اس کائنات کے انجام کے متعلق

انتہائی محنت سے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں جو مختلف اور متضاد آراء پیش کی ہیں وہ ناظرین کے سامنے آجائیں۔ ہم نے ان کے خیالات کی ترجمانی نہیں کی بلکہ ہر بات کے سلسلے میں ان کی تصانیف سے حوالے نقل کیے ہیں۔

کائنات کے متعلق سائنسی نظریات کا لب لباب یہ ہے:

ا۔ کائنات کا آغاز ایک بڑے دھماکے سے ہوا جسے بڑے دھماکے (Big Bang) کا نام دیا جاتا ہے۔

۲۔ قطعی طور پر معلوم نہیں یہ دھماکا کب اور کیسے ہوا۔ بعض اندازے لگائے گئے ہیں جو قابل اعتماد نہیں سمجھے جاتے۔

۳۔ اس سے قبل زمان و مکان کا وجود نہیں تھا لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔

۴۔ مبینہ طور پر جن متفرق اجزاء پر مشتمل مادے یا بعض سائنس دانوں کے نزدیک خلاء محض میں یہ بڑا دھماکا رونما ہوا ہے شدید حرارت اور انجماد سے بے شمار اجرام وجود میں آئے وہ اتنی بڑی مقدار میں کیسے پیدا ہوا اور کس نے کن حالات نے اسے پیدا کیا۔ اس کے متعلق نہ صرف یہ کہ کچھ بھی معلوم نہیں بلکہ اس کے لیے کوئی اندازہ تک بھی نہیں لگایا جاسکا۔

۵۔ اس وقت تو خلاء اور مکان کا بھی وجود نہ تھا تو وہ مادہ کہاں سمایا ہوا تھا۔

۶۔ بڑے دھماکے سے قبل کا دور پلینک پیریڈ (Plank Period) کہلاتا ہے اس کی نوعیت کا علم صفر کے برابر ہے اور یہ خود بھی ایک مفروضہ ہی ہے۔

۷۔ پلینک پیریڈ کتنا عرصہ رہا؟ سائنس دانوں کے مطابق وقت کا تو بڑے دھماکے سے قبل وجود نہیں تھا۔ اس نوعیت کا حساب کس طرح لگایا جاسکتا ہے؟

۸۔ جس بارے میں بڑا دھماکا ہوا تو وہ غیر منظّم تھا اور اس کے مختلف اجزاء گڈمڈ ہوئے تھے۔ دھماکے سے جو کائنات برآمد ہوئی اس میں یہ نظم جو ہمیں نظر آرہا ہے یہ کیسے پیدا ہو گیا؟ اس کا سائنس کوئی جواب نہیں دیتی۔

۹۔ نہ سائنس اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ بڑے دھماکے کے نتیجے میں پیدائش کائنات جو مادے ہی کی شکل میں تبدیلی کی ایک صورت تھی، زمان و مکان کیسے وجود میں آگئے۔ جب کہ اس سے قبل وہ عنقا تھے۔ اور زمان و مکان مادی اشیاء نہیں ہیں۔

۱۰۔ اس کائنات کے وجود میں آنے اور بہت سے طبعی قوانین و قواعد بھی بن گئے ہیں جن کا علم حاصل کرنا جملہ اصناف علم کا اصل مقصد ہے۔ اور اسی علم پر تمام اختراعات و ایجادات اور انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ضروریات فراہم کرنے کا انحصار ہے۔ یہ قوانین و قواعد کس نے بنائے اور کیسے بن گئے۔ سائنس اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

۱۱۔ باشعور انسانی زندگی، جس کا باطن ایک اتھاہ سمندر کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی فطرت کے پہلوؤں اور ذہنی و قلبی اور ممکنہ روحانی توانائیوں اور صلاحیتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا، صرف اور صرف مادے پر مشتمل کائنات میں کیسے پیدا ہو گئی۔ سائنس اس بات کی وضاحت نہیں کر سکی۔

۱۲۔ اگرچہ اس معاملے پر اکثر ماہرین فلکیات و کائنات کا اتفاق ہے کہ یہ کائنات بالآخر ختم ہو جائے گی لیکن وہ اس سے قبل کن مراحل سے گزرے گی اور اس کا خاتمہ کب ظہور پذیر ہو گا اس کے متعلق سارے ریاضیاتی حسابات لگانے کے باوجود کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکا، اور اس میں حادثاتی عنصر کے امکان کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے یہ کائنات اور زندگی کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔

سینکڑوں ایسے سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں، اور اٹھائے جا رہے ہیں، سائنسدان ان کا ایک ہی جواب دیتے ہیں اور مادہ پرست فلسفی بھی ان کی ہمنوائی کرتے ہیں کہ سب کچھ اتفاقات اور حادثات ہی کا مرہون منت ہے۔ کائنات جس راستے پر جا رہی ہے از خود ہی کسی غایت کے بغیر جا رہی ہے۔ لیکن ایسے اصحاب فکر کی بھی کمی نہیں جو اس معاملے میں سخت اضطراب محسوس کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جہاں ایک طرف یہ اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ قدرت کسی کارساز ہستی کے بغیر خود کیسے چل سکتا ہے تو دوسری طرف وہ مادہ پرستی کی جکڑ بندیوں میں اس حد تک گرفتار ہیں کہ اس خول سے نکل کر وہ اس معمے کو حل کرنے کے لیے کبھی متبادل ذریعہ ہدایت سے رجوع کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتے۔

قرآن نے ان انسانی کمزوریوں پر بہت روشنی ڈالی ہے اور اس کے لیے تاریخی حوالے اور جماعت انبیاء کو اپنی دعوت کے سلسلے میں پیش آنے والی ان مشکلات اور رکاوٹوں کے تذکرے کیے ہیں جو اس کی آباء پرستی اور لکیر کا فقیر بننے سے متعلق ہیں۔ مغرب اس کمزوری سے مستثنیٰ نہیں۔ لہٰذا اپنی روشن خیالی اور آزادی فکر کے تمام دعاوی کے علی الرغم مادہ پرستانہ فکر کی حدود سے باہر جھانکنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اسی دائرے میں محدود رہ کر ان مسائل کا حل تلاش کرنا چاہتا ہے جن پر فکر کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اساس ہی موجود نہیں۔ ہم اس سلسلے میں وحی سے متعلق باب میں گفتگو کر چکے ہیں۔

سب سے بڑااور نمایاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنی اس قدر عظیم صلاحیتوں کے باوجود اس کائنات کے متعلق جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا تو وہ عالم غیب یا حقیقت (Reality) کے متعلق جس کا اس کی دسترس سے باہر ہونا امر بدیہی ہے، اپنی ذہنی کاوشوں سے کس طرح معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

اس سوال کا حقیقت پسندی کے ساتھ سامنانہ کرنے کی وجہ سے کائنات اور دوسرے بہت سے معاملات میں انسانی کاوشوں کا ایضاع ہو رہا ہے جو دوسرے مفید مقاصد کے حصول کے لیے صرف کی جاسکتی ہیں۔ ہماری سابقہ مباحث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں جاری ساری بعض قواعد و ضوابط ایسے ہیں جن کو انسان اپنے مشاہدات اور تجربات کے ذریعے سے دریافت کر سکتا ہے لیکن ان کا تعلق بقول جے ڈبلیو این سلی وان اس کائنات کے ڈھانچے سے ہے نہ کہ اس کی حقیقت سے۔ کائنات کا آغاز و انجام کا تعلق ادراک حقیقت سے ہے اور ہم یہ عرض کرتے چلے آرہے ہیں کہ ادراک حقیقت ہماری توانائیوں کی پہنچ سے ماوراہے۔ اس لیے مغرب کے مادہ پرستوں نے مادہ سے بالا کسی حقیقت کے وجود سے انکار کرنے اور مسلک لا ادریت (Agnosticism) کی اوٹ میں پناہ لینے ہی میں عافیت محسوس کی۔ لیکن ایسے مؤقف اختیار کرنے کی وجہ سے انہی سائنسی علوم کی وساطت سے مظاہر قدرت کی حقیقت معلوم کرنے کے سلسلے میں تحقیق کے دوران بار بار اندازوں، اٹکل، قیاس اور خیالی گھوڑے دوڑانے سے کام لیناپڑتا ہے اور ایسے وسائل وذرائع کی ان کی اپنی تعریف کے مطابق علم سائنس میں کوئی جگہ نہیں۔ اور اسی کی وجہ سے کائنات کے آغاز وانجام اور زمان و مکان کے حوالے سے اس کی روانی کے متعلق اگر کوئی ایک تھیوری پیش کی جاتی ہے تو اسے بیسیوں گوشوں سے اعتراضات کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور بقول پروفیسر ڈبلیو۔ ایم سمارٹ، سائنسی فکر میں گڈمڈ اور ابتری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ پروفیسر موصوف کی ایک تصنیف سے ہم ایک ایسا اقتباس بھی دے چکے ہیں جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اس کائنات کا لازماً کوئی مقصد وجود ہے۔

انسانی فکر و نظر کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ حکماء و مفکرین ہمیشہ ہی تلاش ''حقیقت'' کے لیے سر گرداں رہے ہیں۔ البتہ دور حاضر کے مغرب میں بعض ایسے کوتاہ بیں مدعان علم نظر آتے ہیں جو محسوسات سے آگے کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ اگرچہ وہ محسوسات کی ماہیت کا بھی کھوج نہیں لگا سکے۔ عملیت (Pragmatisim) اور تجربیت (Empiricism) کے نظریات کی بہت دھوم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادراک حقیقت کے معاملے میں ان کی افادیت صفر کے برابر ہے اور مغربی فکر کے تمام شعبے

لاادریانہ اور تشکیک کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں جو بے یقینی کی زد سے بچا ہوا ہو Skepticism کے عنوان کے تحت مغربی فلسفے کے حوالے سے بریٹینکا میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"...the philosophical attitude of doubting the knowledge claims set forth various areas and asking what they are based upon, what they actually establish, and whether they are indubitable or necessarily true. Skeptics have thus challenged alleged grounds of accepted assumptions in metaphysics, in science, in morals and manners, and specifically in religion."

ایسا فلسفیانہ انداز فکر جو مختلف حلقوں میں پیش کیے گئے علمی دعاوی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو اور یہ سوالات اٹھاتا ہو کہ ان کی بنیادیں کیا ہیں؟ یہ کیا ثابت کرتے ہیں اور آیا وہ یقینی اور لازماً صحیح ہیں، اس طرح مشکیکین نے ان مسلمہ مفروضات کی مبینہ بنیادوں کو چیلنج کیا ہے جن کا تعلق مابعد الطبیعیاتی مسائل، سائنس، اخلاق، آداب اور خصوصاً مذہب سے ہے۔۔۔۔۔

".....Skeptical philosophical attitudes are prominent throughout the course of Western philosophy; ..." (Vol.10 Page 862).

متشکک فلسفیوں کے انداز ہائے فکر مغربی فلسفے کی تاریخ میں متواتر نمایاں رہے ہیں۔

ظن و تخمین کی بنیاد پر فکر و نظر کی عمارتیں کھڑی کرنے والوں کے متعلق قرآن کہتا ہے:

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا(۵۳:۲۸)

ترجمہ: وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ نوع انسانی سمیت تخلیق و انجام سے لے کر اخلاقی اور ہر قسم کی دوسری قدروں تک ہر معاملہ بے وقعت ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ انسانی شرف و مجد کا تصور تو پامال ہو چکا اور اس کے مقابلے میں زخرفات دنیا تمام تر توجہات کی مرکز بنی ہوئی ہیں۔ اس صورتحال نے جس انداز فکر و عمل کو جنم دیا اس نے ذلک الایام ند واولھا بین الناس کے قرآنی اصول کے مطابق دوسروں کے مقابلے میں تکنیکی ترقی کے ذریعے سے غلبہ حاصل کر کے مغرب نے دنیا کو ظلم و تعدی اور فساد سے بھر دیا ہے۔

جب کائنات کے متعلق یہ نظریہ اپنا لیا جائے کہ یہ از خود چل رہی ہے اور اس میں سرانجام دیئے جانے والے بر و اثم کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں ہے اور ہر نظریے اور قدر کی صداقت مشکوک ہے تو ذمہ دارانہ

اور مبنی بر عدل طرز عمل اپنا جواز کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے قرآن نے نوع انسانی کے حوالے سے اس کائنات کے آغاز کے متعلق محکم دلائل کے ساتھ ایسی ہم پہلو وضاحتیں کر دی ہیں اور ان میں ایسا ربط موجود ہے کہ یقین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

کائناتی حقیقتوں کے متعلق ہزاروں سالوں پر پھیلے غور و تفکر اور تحقیق و مشاہدات کے باوجود انسان جو معلومات حاصل کر سکا ہے اور خصوصاً دور حاضر کی سائنس اپنی نمایاں اور آلات کے ذریعے سے بلکہ خلا میں پہنچ کر وسیع پیمانے پر کیے جانے والے مشاہدات کی بنا پر جو انکشافات کر سکی ہے ان کے متعلق ہم نے سائنس کے حلقے سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی تحریروں سے حوالے دے کر گفتگو کی ہے۔ ان مباحث سے اور ہم نے نقاط کی شکل میں ان کا جو ملخص پیش کیا ہے اس سے یہ بات عیاں ہو گئی ہے کہ سائنس کائنات کے آغاز و انجام اور حقیقت کے متعلق نہ صرف یہ کہ کوئی قابل اعتماد معلومات حاصل نہیں کر سکی بلکہ اس نے ذہنوں میں الجھاؤ پیدا کر دیئے ہیں۔ مزید برآں بہت سے محققین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ باتیں انسانی ذہن کی رسائی سے ماوراء ہیں اور رہیں گی۔ ان میں سے بعض کے آراء اور دلائل بھی نقل کر دیئے گئے ہیں۔

ان شواہد کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات کا آغاز و انجام اور اس کی حقیقت معاملات غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان زمان و مکان اور دوسری حسیات قسم کی محدودیتوں میں مفید ہے لہٰذا اس کے لیے عالم غیب سے تعلق رکھنے والے معاملات کا علم حاصل کرنا ممکنات میں سے نہیں ہے۔ سائنس دان خود کہتے ہیں کہ بڑے دھماکے سے قبل جس کا تصور بھی انہوں نے براہ راست اور بلا واسطہ تحقیق سے نہیں بلکہ نا قابل اعتماد اندازوں سے کیا ہے، زمان و مکان نہیں تھے لہٰذا جو کچھ بھی اس سے قبل موجود تھا وہ انسان کی ذہنی گرفت میں نہیں آ سکتا۔

قرآن غیب کے متعلق کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کسی کو علم نہیں:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ (۵۹:۶)

ترجمہ: اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔

اس سے پہلے کی آیات میں آخرت ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ کفار و مشرکین حضورؐ سے کہتے تھے کہ اگر جزا و سزا کے لیے ایک عالم آخرت کا انعقاد ہونا ہی ہے تو اس میں دیر کس بات کی ہے تو اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو جو جواب دینے کا حکم دیا اس میں اوپر نقل کیے گئے الفاظ شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ قیامت اور عالم آخرت کا ظہور موجودہ کائنات کے اختتام کے بعد ہی ہو گا۔ اسی باب میں اس سے قبل قرآنی مؤقف کے ذیلی عنوان کے

تحت جو آیات نقل کی گئی ہیں ان میں اس کائنات کے زیر وزبر ہونے اور ظہور قیامت کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے جس سے وہ لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا ان الفاظ کا یہ مطلب بھی ہے کہ اس کائنات کے خاتمے کے وقت کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضورؐ سے بھی، جو ختم المرسلین تھے، فرمایا گیا کہ آپؐ بھی برملا یہ اعلان کیجئے کہ آپؐ کو بھی اس بات کا علم نہیں دیا گیا اور آپؐ یہ بھی نہیں جانتے کہ قیامت قریب کے زمانے میں آئے گی یا عرصہ دراز کے بعد:

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا(۷۲:۲۵)

ترجمہ: کہہ دو کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ جس چیز سے تمہیں آگاہ کیا جارہا ہے وہ قریب ہی ہے یا میرا رب ابھی اس کو کچھ مدت اور ٹالنے والا ہے۔

عرصے کی طوالت کے اعتبار سے قرب وبعد اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک اور جگہ قرآن میں حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ قیامت لازماً آئے گی، لیکن ہم نے اس کے وقت وقوع کو راز میں رکھا ہوا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ دین کی جو اصولی اور اساسی بات چاہے جس پیغمبر سے بھی اللہ تعالیٰ کہتا ہے، وہ گویا تمام پیغمبروں اور ان کی امتوں سے کہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس اصولی بات کا قرآن میں ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہوتی:

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰی(۲۰:۱۵)

ترجمہ: بے شک قیامت شدنی ہے۔ میں اس کو چھپائے ہی رکھوں گا تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔

پھر دوٹوک الفاظ میں فرمادیا کہ (اس کائنات کے خاتمے) اور قیام قیامت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے:

یَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ(۳۳:۶۳)

ترجمہ: لوگ تم سے قیامت کے وقت کو پوچھتے ہیں، کہہ دو اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ موجودہ کائنات زیر وزبر ہو جائے گی اور نئی کائنات وجود میں آئے گی:

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ(۱۴:۴۸)

ترجمہ: اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تبدیلی ایک زوردار دھماکے کے نتیجے میں واقعہ ہوگی۔ چونکہ اس کی کیفیت کا تصور کرنا ہمارے بس سے باہر ہے اس لیے اس پہلو سے ہم اس پر تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے۔ قرآن میں اس واقعے کے ظہور میں آنے کے ذریعے کے لیے صیحتہ کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ معنوی اختلاف کے بغیر مختلف مفسرین نے اس لفظ کا ترجمہ اپنی صوابدید کے مطابق کیا ہے۔ صاحب ''تدبر قرآن'' نے اس کا ترجمہ ''ڈانٹ'' کیا ہے۔ مولانا محمود الحسن نے ''چنگھاڑ'' مارماڈیوک پکتھال نے Shout یعنی چیخ یوسف علی نے Blast یعنی زور کے جھونکے کے الفاظ سے کیا ہے۔ مطلب ایک ہی ہے یعنی یہ کہ کائنات ایک ہیجان انگیز کیفیت کے ظہور کے ساتھ ختم ہوگی۔ چنانچہ فرمایا:

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۴۸ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً (۳۶:۴۸-۴۹)

ترجمہ: اور جو پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم لوگ سچے ہو! یہ لوگ بس ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں۔

انسانی عقل و شعور کے مطابق سمجھانے کے لیے قرآن میں اس موضوع پر بہت سی آیات میں متعدد پیرایوں سے بات کی گئی ہے۔ ایسی بعض آیات ''قرآنی موقف'' کے ضمنی عنوان کے تحت اس باب میں ہم نقل کر چکے ہیں۔ اصل کیفیت اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔ اس لیے وضاحت کر دی کہ:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۶۵ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۶۶ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ (۲۷:۶۵-۶۷)

ترجمہ: کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ لوگ ان کے بارے میں مبتلائے شک ہیں۔ اور یہ کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی تو کیا ہم دوبارہ نکالے جائیں گے۔

غور فرمایئے ان تین آیات میں کونسا فقرہ، جملہ یا ان میں بیان کردہ عقیدہ ہے جو مغربی فکر کے پیدا کردہ مادہ پرستوں، لادینیت، اور تشکک کے مریضوں، موت کے ساتھ انسان کے ہمیشہ کے لیے فنا ہو جانے کا نظریہ رکھنے والوں اور کائنات کے وجود کے سلسلے میں الجھاؤ میں گرفتار سائنس دانوں پر چسپاں نہیں ہوتا۔ قرآن یہ

حتمی نظریہ پیش کرتا ہے کہ موجود الوقت کائناتی نظام کا خاتمہ، بعث بعد الموت اور انعقاد قیامت و آخرت باہم منسلک ہیں۔ ان آیات میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کے سلسلے کی کیفیاتی اور زمانی معلومات سوائے اللہ تعالیٰ کے زمین اور آسمانوں کی مخلوق میں سے کوئی نہیں جانتا۔

یہ بھی فرما دیا گیا کہ اس کائنات کا نظام ایسا بنا دیا گیا ہے کہ یہ اپنی موجودہ شکل کے خاتمے کی طرف پیش رفت کر رہی ہے۔ لیکن کسی کو قبل از وقت اس کی اطلاع نہیں دی جائے گی بلکہ یہ اچانک ہی زیر و زبر ہو جائے گی۔ اگر پیشگی اس کی خبر دے دی جائے تو اوپر جو آیات نقل کی گئی ہیں ان کی خلاف ورزی ہو جائے گی۔ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا اس کے وقت انعقاد کو کوئی نہیں جانتا، لیکن پیشگی اطلاع کا تو یہ مطلب ہے کہ ایک دور ایسا آئے گا جب یہ آیت غیر موثر ہو جائے گی اور اللہ کے کلام کا کوئی حصہ اس صورت سے دوچار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فرمایا:

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ (۷:۱۸۷)

ترجمہ: آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آدھمکے گی۔

جیسا کہ مختلف الفاظ میں اوپر بیان کیا گیا، آسمانوں اور زمین کا قیامت سے بوجھل ہونے سے یہ مراد ہے کہ کائنات کی بناوٹ اور تشکیل و ترکیب میں اس کے خاتمے کی اللہ تعالیٰ نے بالقوہ خصوصیت رکھ دی ہے۔

کائناتی سائنس دان اپنے پیش کردہ نظریات میں نظم پیدا کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ کائنات کے آغاز و انجام میں واقعاتی تسلسل اور ربط پیدا کریں، چاہے اس سلسلے میں انہیں کئی باتیں اٹکل اور بے بنیاد اندازوں سے اختراع کرنی پڑیں جیسے ارتقاء کی تھیوری کے معاملے میں کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا طرز عمل علمی ذوق کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

لیکن موجودات کے نیست سے ہست میں آنے کے متعلق وہ کامل لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور نہ کسی معاملے میں ''کیوں'' اور ''کیسے'' کا جواب دے سکتے ہیں۔ گفتگو کو بڑے دھماکے سے شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس سے قبل کیا تھا ہمیں معلوم نہیں اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ دراصل انہیں اس ابتدائی دھماکے کے متعلق بھی براہ راست کچھ معلوم نہیں۔

کائنات کے اس کی موجودہ شکل میں ختم ہونے کے متعلق بھی سائنس متضاد تھیوریاں پیش کرتی ہے جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سائنس دان ان سب تھیوریوں کے سلسلے میں تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ پھر ان میں سے بعض نے یہ کہا کہ کوئی ناگہانی واقعہ پیش آ سکتا ہے جس سے ایک

کائناتی دھماکا واقع ہو جائے۔ یہ بھی حساب لگایا جاتا ہے کہ سورج چھ ارب سال تک اپنی توانائی خرچ کر چکا ہو گا اور ہماری یہ کہکشاں اور زندگی اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکے گی۔ ان سب باتوں میں ابہام ہے۔ سورج جو ایک ستارہ ہی ہے، کے متعلق حساب لگایا گیا ہے کہ وہ جسامت کے لحاظ سے زمین سے تین لاکھ گنا بڑا ہے لیکن اس سے بھی کئی بڑے اور زیادہ چمکدار ستاروں کا پتہ لگایا گیا ہے جن کی روشنی دوری کی وجہ سے مدھم ہے یا وہ ہمیں نظر ہی نہیں آتے۔ ستارہ ایس ڈوریڈو (S Dorado) سورج سے پچاس گنا بڑا اور دس لاکھ گنا زیادہ چمکدار ہے۔ سیریس (Sirius) سورج سے تقریباً اڑھائی ہزار گنا بڑا اور چھبیس گنا زیادہ روشن ہے۔ اسی طرح ریڈ جائنٹ انٹیرز کا قطر سورج سے دو سو تیس گنا اور جسامت میں تقریباً ایک کروڑ گنا بڑا ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ جیسا کہ ہم ایک جگہ ذکر کر چکے ہیں ایک تخمینے کے مطابق تعداد میں ایک ارب ضرب ایک ارب یعنی (10^{10}) ستارے اس کائنات میں موجود ہیں اور ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کے مقابلے میں ہمارا سورج ایک چھوٹے سے ستارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سائنس دان ایسے حسابات اور اندازے لگاتے رہتے ہیں لیکن ہم بعض مغربی محققین کی تحریروں سے ایسے حوالے دے چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حلقے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کائنات کی وسعت کے باوجود اس میں حیرت انگیز نظم (Orderliness) کی وجہ سے اپنے آپ کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور پاتے ہیں کہ کوئی بالاتر قوت اس کا انتظام کر رہی ہے ورنہ (10^{10}) اجرام فلکی اور ان گنت شہابی قسم کی لاتعداد اشیاء جو خلا میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہیں آخر کس طرح ایک ترتیب کے ساتھ اور نظم کے تحت اپنے اپنے راستے پر رواں دواں رہ سکتی ہیں۔ ہر سوچنے والے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا عظیم نظم ایک بے قابو دھماکے کے نتیجے میں وجود پذیر ہو جائے۔ ذرا ایک عمارت یا کسی جگہ ایک چھوٹا سا بارودی دھماکا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کیا اس سے متاثر ہونے والی ہر چیز ایک نظم کے تحت اور ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر بکھرتی ہے یا سب کچھ بد نظمی اور تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ از خود ایک بڑے دھماکے کے رونما ہونے سے اس نظم کائنات کے وجود میں آنے کا نظریہ پیش کرنے والوں کو عقل و ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ اگر ان کے کہنے کے مطابق بڑے دھماکے کے واقعے کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو انسانی عقل و خرد اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ دھماکا بھی کسی بالاتر اور باتدبیر ہستی کی مشیت اور حکم کے تحت ہوا اور اس ہستی نے اس کو اس طرح قابو میں رکھا کہ اس سے ایک منظّم کائنات وجود میں آ سکی۔ اب وہی ہستی اس کو چلا رہی ہے اور اس کے حکم کے تحت ہی اس کو انجام سے بھی دوچار ہونا ہے۔

قرآن سائنس دانوں کے تمام فکری الجھاؤ حل کر دیتا ہے بشرطیکہ اس قادر مطلق کی ہستی کو تسلیم کیا جائے۔ ہم نے وحی رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، حدیث و سنت اور توحید کے ابواب میں اپنی جو معروضات پیش کی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔ کائنات کے متعلق سب سے پہلا جو سوال اٹھایا جاتا ہے وہ اس کے آغاز سے متعلق ہے، اور وہ بھی عدم سے وجود میں لانے کے مفہوم معنی میں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ(۲:۱۱۷)

ترجمہ: وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

ایک وقت تھا جبکہ اس کائنات کا وجود نہیں تھا۔ یہ بات سائنس بھی تسلیم کرتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ از خود وجود میں آ گئی۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عدم سے وجود میں لایا۔ وہ اللہ جو اس بات پر قادر ہے کہ جب وہ کسی چیز کو بنانا چاہے تو اس کے ارادے کی تکمیل کے لیے اس کا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ''ہو جا'' وہ وجود میں آ جاتی ہے۔ کائنات کے وجود میں آنے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ کن (یعنی ہو جا) کا لفظ ہمارے سمجھانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، ورنہ اس کی کیفیت و ماہیت ہماری سمجھ سے ماوراء ہے۔

کائنات کی ابتداء کے لیے خلق کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن خلق یعنی کائنات کے پیدا کرنے کے بعد اس کے انتظام و انصرام کی بھی ضرورت ہے۔ اتنا بڑا کارخانہ قدرت کسی نگران و مدبر کے بغیر صحیح خطوط پر نہیں چل سکتا۔ قرآن میں جگہ جگہ اللہ کی طرف سے ان کے پیدا کئے جانے اور پھر اس کا انتظام کرنے کا ذکر یکجا آیا ہے۔ فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۙ(۶۵:۱۳)

ترجمہ: اللہ ہی ہے جس نے بنائے سات آسمان اور انہی کے مانند زمین بھی۔ ان میں اس کے احکام نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے جانو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مفسرین نے نزول احکام کو متفقہ طور پر کائنات کے انتظام و انصرام کے معنی میں ہی لیا ہے۔ پھر فرمایا:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ(۲:۲۵۵)

ترجمہ: اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں۔

قرآن و حدیث میں اللہ کی جس صفت اور جس عمل کا بھی تذکرہ ہے اسے اللہ تعالیٰ کی تنزیہی خصوصیت ہی کے طور پر لینا چاہیے۔ اس کائنات پر اس کے تکوینی اختیارات اور ان اختیارات کی نوعیت انسانی اختیارات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ لہٰذا ان اختیارات کے استعمال کے ذریعے سے جب وہ اس کائنات کا انتظام و انصرام کرتا ہے تو اس کو اس سے کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا اور نہ تھکاوٹ، ہم اپنی لسانی و فکری محدودیتوں کے پیش نظر یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ارادہ اور مشیت ہر قسم کی تخلیق اور تمام تخلیق شدہ اشیا کے بارے میں اپنی قوت مدبرہ کے مکمل نفاذ کے لیے کافی ہیں۔ اس کو کوئی تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔

ظاہر ہے کہ جب کائنات کی ابتداء و تخلیق بھی اسی نے کی اور اس کی تدبیر کے تحت یہ رواں دواں ہے تو کسی انجام سے دوچار کرنا بھی اسی کے اختیار میں ہوگا۔ کوئی کودن ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ بنایا تو سب کچھ اسی نے اور تدبیر بھی وہی کر رہا ہے لیکن اس کو کسی انجام تک پہنچانے کے معاملے میں وہ لاتعلق ہے۔ اور پھر اتنے عظیم عالم موجودات کو پیدا بھی کیا اور اس کو ایک نظم کے تحت چلا بھی رہا ہے لیکن اس کی کوئی غایت یا اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ چنانچہ واضح کر دیا کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱:۱۶)

ترجمہ: اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔

بلکہ اس کا ایک نتیجہ برآمد ہونے والا ہے۔ قرآن میں اس کا جابجا ذکر کیا گیا ہے اور ہم مختلف عنوانات کے تحت اس باب میں اس موضوع پر اپنی معروضات قرآنی حوالوں کے ساتھ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تخلیق آدم اور اسے اس دنیا میں بسانے کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے جس ہدایت کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، تاکہ وہ اس کی تعلیمات کے مطابق اس ارضی زندگی کو منظّم کرے، وہ انبیاء رسل کے ذریعے سے پورا کیا جاتا رہا ہے حتیٰ کہ اس نے اپنے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا مکمل دین نازل کیا جو انسانی فکر و عمل کے تمام گوشوں کو محیط ہے، اور جس کی تعلیمات کے تاابد حفاظت کا اس نے خود ذمہ لیا ہے۔ (۱۵:۹)

اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ چودہ صدیوں کے دوران بے شمار انداز کے نشیب و فراز اور قسم قسم کے متنوع افکار سے سابقہ پڑنے کے باوجود یہ دین اپنی تعلیمات اور نظریات کے لحاظ سے اپنی اصلی حالت میں موجود ہے:

یہی دین فطرت ہے۔ صرف یہی انسانی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس پر عمل پیرا نہ ہونے کی صورت میں عالم انسانیت فساد سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کے اصولوں کو اپنانے یا نہ اپنانے کو اخروی زندگی میں کامیابی کے لیے معیار بنایا جائے گا۔

چنانچہ فرمایا:

كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۲۸ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۲۹ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ۳۰ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ۳۱ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ۳۲ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۳۳ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۴۵:۲۸-۳۴)

ترجمہ: ہر گروہ کو پکارا جائے گا اس کے دفتر اعمال کی طرف۔ ان کو بتایا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو آج تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہمارا دفتر ہے جو تمہارے اوپر بالکل ٹھیک ٹھیک گواہی دے گا۔ ہم لکھواتے رہے ہیں جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ پس جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یہی دراصل کھلی ہوئی کامیابی ہے۔ رہے وہ جنہوں نے کفر کیا تو ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی رہی ہیں تو تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے! اور جب تم سے کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے باب میں کوئی شک نہیں ہے تو تم جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے پس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ اور ان پر ان کے ان کاموں کی برائیاں واضح ہو جائیں گی جو وہ کرتے رہے اور وہ چیز ان کو گھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور ان سے کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو نظر انداز کریں گے جس طرح تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں بننے والا ہے۔

ان چند الفاظ میں نہایت بلیغ انداز میں اس صورت حالات کی تصویر کشی کر دی گئی ہے جو افراد و اقوام کو اس دنیا میں ان کی فکری و عملی روش کے مال کے طور پر عالم آخرت میں پیش آنے والی ہے۔ رحمت خداوندی میں داخلے سے مراد اس کی خوشنودی اور رضا کا حصول ہے۔ اس کی رحمت کی لامتناہی وسعت کا نہ ہم اندازہ کر سکتے اور نہ تصور کر سکتے ہیں، کیونکہ عالم غیب کے علم کے حوالے سے ہمارا فہم بھی عاجز اور قوت بیانیہ بھی محدود۔ لیکن قرآن اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا جو تصور دیتا ہے اس کے پیش نظر اس کی رحمت کے سائے تلے جگہ پانا روحانیت اور تشریف ارتقاء کے بلند ترین مقامات پر فائز ہونے کے مترادف ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا مستحق قرار پانا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس دنیا میں بخت و اتفاقات یا وراثتاً اور سازشی ذرائع سے ناپائیدار سیاسی اقتدار حاصل کرنے والوں کی خوشنودی کے سزاوار قرار پانے والے اگر معاشرے میں مادی سطح پر بلندی درجات سے ہمکنار ہو سکتے ہیں تو اس خالق و مدبر کائنات، ہمہ مقتدر اور لامتناہی قوت کی ابدی طور پر مالک ہستی کی رحمت کے سزاوار قرار پانے والے روحانی اعتبار سے کس مقام پر مستقلاً فائز کئے جائیں گے۔ اسی طرح اللہ کے دین کو مسترد کر دینے والے اور اس کے نظام عدل سے روگردانی کرنے والے اسی پیمانے کی پستی میں گرائے جائیں گے جس پیمانے سے فیروزمندیاں اول الذکر لوگوں کے حصے میں آئیں گی۔

اس دنیا میں انسانی زندگی کے معاملات کی بہت سے پہلوؤں سے عدم تکمیل اور نظام عدل کی مختلف صورتوں سے بہت سے انسانوں کا انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر انحراف، جس کا ہم اس سے قبل تذکرہ کر چکے ہیں، اس بات کا متقاضی ہے کہ عقل و خرد سے مزین باشعور و بااختیار مخلوق سے اس کے فکر و عمل کے بارے میں بازپرس کا بھی ایک مرحلہ آئے۔ اطاعت گزار کو جزاء حسنہ دی جائے اور طاغی کی سرزنش کی جائے۔ ظالم کو سزا دی جائے اور مظلوم کی دادرسی کی جائے۔ ایسا نہ ہونا واضح ناانصافی ہو گی جس کی اس سارے کارخانہ قدرت کی عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس انداز تفکر نے مادہ پرست حلقے کے بہت سے مفکرین کو اس نہج پر سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم اس بارے میں متعدد حوالہ جات دے چکے ہیں۔

یہ تو عقلی اور استدلالی موقف ہے جس میں تذبذب و تشکک کی گہری رنگ آمیزی ہوتی ہے، نہ ہی محض یہ سوچ مثبت طور پر انسانی فکر و عمل کے صحیح اصولوں کو اپنانے کے لیے رہنمائی مہیا کر سکتی ہے۔ لیکن اس تصور کو یقینیات کا درجہ دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کثیر تعداد میں اپنے ایسے برگزیدہ بندے رسالت و نبوت کے مناصب پر فائز کر کے بنی نوع انسان کی طرف اپنی ہدایت کے ساتھ بھیجے جن کی دیانت و امانت اور صداقت و

حسن سیرت کا انکار کرنا چمکتے سورج کی روشنی کی موجودگی کا انکار کرنے کے مترادف ہے اور ان میں سے ہر ایک کو بعد زمانی و مکانی کے باوجود ایک ہی طرح کے اساسی اصولوں کی دعوت دینے کی تلقین کی۔

اللہ کی طرف سے غور و تفکر کی عطا کردہ صلاحیتوں کو کام میں لا کر سوچنا چاہیے کہ کیا وحی کے ذریعے سے حاصل کردہ تصور آخرت، جس کے حق میں عقلی دلائل کی تائید بھی موجود ہے، دل کو لگتا ہے یا وہ عقیدہ کہ یہ سب کچھ جو نظر آرہا ہے وہ محض اتفاقاً اور حادثتاً وجود میں آگیا ہے اور اسی طرح محو و نابود ہو جائے گا اور یا حق و باطل کے فیصلے کے کسی مرحلے کے ظہور میں آنے کے بغیر یونہی ہمیشہ کے لیے چلتا رہے گا۔ ظالم و طاغی سے باز پرس ہو گی اور نہ مظلوم اور راست رو دادرسی اور جزاء سے ہمکنار ہو گا۔ انسان کے مراحل ارتقاء صرف چند روزہ زندگی تک محدود ہیں۔ اس کی حیرت انگیز اور متنوع خصوصیات بھی اس کے جسم خاکی کی طرح مٹی میں رل مل جائیں گی اور اس طرح حیات انسانی بھی اس کائنات کی طرح بے نتیجہ ہی رہے گی۔

قیامت کے روز انسانی اعمال کی جزاء و سزا کے فیصلے کا طریق

اللہ تعالی علیم و خبیر ہے۔ اس کو کائنات میں پائی جانے والی ہر بات کا علم ہے۔ ہمارے سمجھانے کے لیے کہہ دیا کہ وہ عالم الغیب والشھادۃ ہے۔ لیکن اس کے علم کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اسی لئے فرمایا کہ:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ(۱۶:۷۴)

ترجمہ: تو تم اللہ کی مثالیں نہ بیان کرو بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تمثیل کے لیے مشابہت کا ہونا ضروری ہے اور اللہ ہر قسم کے تشبہ سے پاک اور بالا ہے۔ اس لیے اس کے علیم و خبیر ہونے کے بارے میں ہم کوئی مثال نہیں دے سکتے۔ وہ ایک چیونٹی اور اس سے بھی کم تر مخلوق چاہے وہ مرئی ہو یا غیر مرئی سے لے کر بحیثیت مجموعی ساری کائنات کے معاملات و حالات سے بیک وقت باخبر ہے وہ بندوں کے اعمال خیر و شر اور ان کے پیچھے کام کرنے والی سینوں اور قلوب میں چھپی ہوئی نیتوں کا براہ راست علم رکھتا ہے۔ حصول علم کے لیے اسے کسی واسطے اور ذریعے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے وہ اگر عالم آخرت میں لوگوں کے نامہ ہائے اعمال تیار کئے اور شہادتوں کا اہتمام کئے بغیر فیصلے کر کے اخیار و اشرار کے ان کے موزوں اور حسب مراتب ٹھکانوں پر پہنچا دے تو اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں، اور نہ اس سے اس معاملے میں کسی

غلطی یا خلاف عدل حرکت کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی مشیت کے تحت یہ فیصلہ کر رکھا ہے جیسا کہ ہماری سمجھ کی استعداد کے مطابق بذریعہ قرآن ہمیں مطلع بھی کر دیا ہے کہ روز قیامت اس طرح ایک ضابطے کے تحت لوگوں کے اعمال کے حسن و قبح کا فیصلہ ہو گا جس طرح اس نے اس زندگی میں لوگوں کو ایک ضابطے کو اپنانے کا حکم دیا ہے۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ موجودات کو نیست سے ہست میں لایا، اور اس کائنات کی نوع انسانی سمیت تخلیق کی۔ اس کائنات میں رائج تمام تکوینی نوامیس و قوانین، قواعد وضوابط، زمان و مکان، احوال و ظروف، غرض یہ کہ سب کچھ اسی کا پیدا کردہ ہے۔ جب اس کی مشیت کے تحت یہ کائنات اختتام پذیر ہو گی تو وہ قرآن کے مندرجات کے مطابق ایک جہان تو وجود میں لائے گا جس کے اپنے ہی قواعد وضوابط ہوں گے۔ ان کی ماہیت ہمارے لئے غیب کے پردے کی اوٹ میں ہے۔ البتہ ہمارے عقل و حواس کی قوت گرفت کے مطابق ہمیں ان کے متعلق دوسری بعض معلومات کے علاوہ ایسی معلومات جن کا تعلق قیامت کے روز ہمیں ان اعمال کے بارے میں فیصلہ کرنے کے انداز سے ہے، اس لئے فراہم کر دی گئی ہیں تاکہ اس سلسلے میں ہماری متجسسانہ لگن کی تسکین اور اپنے اعمال کے بارے میں ہماری جوابدہی کی ذمہ داری اجاگر ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۖ (۳:۲۹-۳۰)

ترجمہ: کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس سب کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر جان اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور جو برائی کی ہو گی اس کو بھی موجود پائے گی۔

گویا اس ارضی زندگی میں جو کچھ کسی نے کیا ہو گا اور جس فکر نے اپنایا ہو گا وہ بغیر کسی ابہام کے اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا جیسا کہ اوپر نقل کی گئی آیات (۴۵:۲۸۔۳۴) میں بھی مذکور ہے۔ قرآن میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ آنکھ جھپکتے ہی یا اس سے بھی کم عرصے میں تمام فیصلے کر دیئے جائیں گے (۱۶:۷۷) اور قرآنی آیات سے ایسا تاثر بھی ملتا ہے کہ بیک وقت ہر فرد پر اس کے اعمال کی نوعیت پیش کرنے کے کئی طریقے عمل میں لائے

جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سب باتوں اور طریقوں کو زیر عمل لانے پر قادر ہے۔ مثلاً یہ کہ اس دنیا میں جس طرح مادی اشیاء کا وزن کیا جاتا ہے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اعمال کو وزن کی صفت سے متصف کر دے گا۔ فرمایا:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ(۷:۸-۹)

ترجمہ: اس دن وزن صرف حق دار کا ہو گا تو جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوئے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار اور اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔

وزن کرنے کا مطلب چاہے ہم اہمیت کا درجہ سمجھیں یا دنیوی تصور کا وزن، فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز ہر متنفس اور قوم کے اپنے اپنے اعمال و کردار کا تعین ان کی موجودگی میں ہو جائے گا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا ہے:

"بعض علماء کا خیال ہے کہ اعمال جو اس وقت اعراض ہیں، وہاں اعیان کی صورت میں مجسد کر دیئے جائیں گے اور خود انہی اعمال کو تولا جائے گا۔"

یہ کوئی حیرت والی اور انہونی بات نہیں۔ اس دنیا میں بھی جواہر و اعراض کی خصوصیات اللہ تعالیٰ نے بلا شرکت غیرے اپنی مشیت کے تحت پیدا کیں اور عالم آخرت میں بھی وہ مختلف امور اشیائے مجردہ و غیر مجردہ اور اعیان و اعراض کو جن جن خصوصیات سے متصف کرنا چاہے گا، کر دے گا اور ہو سکتا ہے کہ جہان آخرت کی اس جہاں سے کسی پہلو سے بھی جزوی مماثلت تک نہ ہو۔ اس کے علاوہ احتساب کی ایک یہ صورت بھی ہو گی:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۳۶:۶۵)

ترجمہ: آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم کو بتائیں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کے جس حصے کو قوت گویائی دی ہے وہ بھی گوشت ہی پر مشتمل ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے جس حصہ جسم انسانی نے جو کام اس دنیا میں کیا ہو گا اس کا اظہار اسی یا کسی اور جسم سے کروائے۔ قرآن میں اس حقیقت کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۱۹ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ

سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۲۰ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ(۴۱:۱۹-۲۱)

ترجمہ: اور اس دن کا دھیان کرو جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے پس ان کی درجہ بندی ہو گی۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس حاضر ہو جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کے رونگٹے ان پر ان باتوں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے رہے۔ اور وہ اپنے جسموں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اسی اللہ نے گویا کر دیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا۔

روز قیامت اعمال سیئہ وحسنہ کے مرتکب ہونے والوں کے چہروں پر ان کے اعمال منعکس ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس روز اپنی مشیت سے اللہ تعالیٰ اس کا اہتمام فرمائیں گے انسانوں کی صورتیں ہی ان کی باطنی حسن وقبح کی علامت بن جائیں جیسے ان کے اعضاء بذریعہ کلام ان کے کاموں کی گواہی دیں گے۔ اس میں بھی مادہ پرستوں اور نام نہاد دانشوروں کے لیے کوئی بات باعث حیرت واستعجاب یا طعن وعیب گیری نہیں ہو سکتی۔ اگر اس دنیا میں مادی اشیاء کے اندر آوازیں ضبط کی جاسکتی ہیں اور ان کے ذریعے سے ان کا اعادہ کیا جا سکتا ہے، اگر کمپیوٹر میں معلومات اور یادداشتیں جمع کر کے ان کو حسب ضرورت استعمال میں لایا جا سکتا ہے، اگر دھاتوں کے مجسّمے بنا کر روبوٹ (مشینی انسان) کی شکل میں ان سے افرادی قوت کے طور پر کام لیا جا سکتا ہے تو وہ خالق کل انسانی اعضاء کو قوت گویائی نہیں دے سکتا؟ اور پھر یہ بات پیش نظر ہے کہ سائنس کی بے شمار اختراعات میں سے ہم نے صرف تین کا حوالہ دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سبھی اختراعات ان طبعی قوانین، جنہیں انسان نے نہیں بلکہ اللہ نے بنایا اور نافذ کیا، کی دریافت کے مرہون منت ہیں۔ انسان آج تک کوئی طبعی قانون خود نہیں بنا سکا تو کیا بوقت احتساب اللہ تعالیٰ وہ کچھ نہیں کر سکتا جس کا ابھی تذکرہ ہوا۔ اس کے علاوہ انسانی چہروں پر ان کی باطنی کیفیات کے کسی نہ کسی درجے میں منعکس ہونا اس دنیا میں بھی روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

احساس خوشی و غم، انبساط و کرب، فرحت و درد، ہیجان و سکون اور بہت سی نفسیاتی واردات کے آثار انسانوں کے چہروں پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس سے لطیف تر مثال فن قیافہ کی ہے۔ ایک دور میں مسلمانوں کے اندر اس کو ایک صنف علم کے طور پر حاصل کیا جاتا تھا۔ اس علم کے ماہرین انسان کے باطن میں پائی جانے والی اخلاقی اقدار کا اس کے چہرے سے اندازہ کر لیتے تھے کہ آیا وہ شریف النفس ہے یا شریر، سخی ہے یا بخیل، مہمان نواز ہے، دنی، وسیع الظرف ہے، تنگ دل، باغیرت ہے یا بودا، بہادر ہے یا بزدل، وغیرہ وغیرہ۔ یوم قیامت کے متعلق احتساب کے ضمن میں فرمایا:

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۚ ۴۰ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۴۰ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (۵۵:۳۹-۴۱)

ترجمہ: پس اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کی بابت سوال کی ضرورت نہ ہو گی۔ مجرم پہچان لئے جائیں گے اور اپنی علامتوں (پیشانیوں) سے، پس پکڑے جائیں گے چٹیا اور پاؤں سے۔

جہاں خدا کے باغیوں کی پیشانیوں پر ان کی بداعمالیوں کی نحوست نمایاں ہو گی وہیں فرمانبرداروں کے چہرے خنداں، روشن ہوں گے چنانچہ ابرار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۸۳:۲۴)

ترجمہ: ان کے چہروں پر آسائش کی بشاشت جھلک رہی ہو گی۔

ہم نے جس انسانی علم قیافہ کا ذکر کیا ہے اس میں غلطی کا احتمال ہے، لیکن ان آیات کے مطابق قیامت کے روز انسانی اعمال اور دین کے ساتھ وابستگی اور عدم وابستگی کا پرتو اس طرح چہروں پر پڑے گا کہ اس میں اشتباہ کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔

اس کے علاوہ ہر انسان کے حوالے اس کا اعمالنامہ بھی کر دیا جائے گا اور قرآن کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال نامے کا مطالعہ کر سکے گا اور بغیر کسی تاخیر کے اس پر اپنی حیثیت اور آخرت میں اپنا مقام واضح ہو جائے گا (ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس عالم کے احوال و ظروف اس عالم سے مختلف ہوں گے۔) لہٰذا ہمیں ان کی کیفیات و ماہیت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ ایسی باتوں سے اپنی فکری تعمیر و تربیت کے لیے وہ مواد حاصل کرنا چاہیے جو ہمیں تمثیلی انداز میں دیا گیا ہے۔

عالم آخرت میں تین مقامات

قرآن میں بنی نوع انسان کے لیے عالم آخرت میں تین ٹھکانوں کا تذکرہ ہے۔ جنت، جہنم اور اعراف۔ اول الذکر دونوں کا قرآن میں اس قدر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جتنا اللہ نے چاہا، لیکن آخر الذکر کے متعلق سورہ الاعراف میں مختصر سا اشارہ ملتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل مختلف موضوعات کے پس منظر میں ہم بیان کرتے چلے آرہے ہیں، انسان کی ہر سوچ اور اس کے فکر کے ہر گوشے کو خود اپنی ذات، اس کائنات کے آغاز اس کی روانی، اس کے انجام، غرض یہ کہ تمام مظاہر قدرت پر تفکر کرتے ہوئے ایک مقام پر جا کر رکنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر بات اور مظہر قدرت کا تعلق حقیقت سے ہے۔ اور انسان اس سامان تفکر و تعقل سے لیس نہیں جس

کے استعمال کرنے سے وہ حقیقت کا ادراک کر سکے۔ وہ مجبور ہے کہ بہت سے لاینحل سوالات کے احساس کے باوجود یہ زندگی گزارے۔ لیکن اس صورت حال کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے ایک محدود دائرے کے اندر سوچ بچار، تحقیق و مطالعہ اور اختراع و ایجاد کی وافر صلاحتیں دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کو ان تمام صلاحیتوں کے استعمال سے برآمد ہونے والے نتائج کو اپنی زندگی پر موزوں اور درست طریق پر چسپاں کرنے کے لیے خالق کائنات نے اصولی ہدایت بھی دے رکھی ہے۔ لہٰذا انسان پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ہدایت خداوندی پر جو دین اسلام کی شکل میں اس کے پاس موجود ہے عمل پیرا ہوتے ہوئے یہ تعین بھی کرے کہ اس کے قوائے عقلیہ و فکریہ کی اڑان کہاں تک ہے۔ قرآن جگہ جگہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وافر صلاحیتیں عطا کی ہیں اور ان کے نقطہ نظر سے ضروری ہے کہ انہیں تعمیری اور نتیجہ خیز انداز سے کام میں لایا جائے۔ اسے یہ احساس ہونا چاہیے کہ یہ صلاحیتیں اتنی لامتناہی نہیں ہیں کہ ادراک حقیقت کر سکیں۔ بہت سے لوگوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کی طرف تو توجہ نہیں دیتے جن کا ان کے انفرادی اور قومی و ملی مفادات تقاضا کرتے ہیں اور جن کے بارے میں دین اسلام نے مکمل اصولی رہنمائی مہیا کی ہے بلکہ ایسے سوالات اٹھا کر اپنے ذہنوں کو مختلف الجھنوں میں مبتلا کرتے رہتے ہیں جو ان کے تفکر کے دسترس سے ماوراء ہیں۔ اس رجحان کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، مثلاً ادوار ماضی میں عام طور پر اور دور حاضر میں خاص طور پر مغربی تمدن بہت سے ایسے سوالات کے جوابات نہ پا کر مادہ پرستی، دہریت، لاادریت اور تشکک کے منفی افکار اور نظری امراض میں مبتلا ہو گیا۔ اس طرح وہ حقیقت کی ایک رمق کو بھی نہ پا سکے۔ اس بارے میں ایک مسلمان کا طرز عمل یہ ہونا چاہیے اور شارع علیہ السلام نے اس کو فروغ دیا، کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خدائی کا احاطہ نہیں کر سکتا اور چونکہ بہت سے، بلکہ سبھی مسائل دنیا و آخرت بالآخر حقیقت ہی پر منتہی ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں اپنے تدبر و تفکر کی جولانیوں کو ان حدود کے اندر ہی محدود رکھنا چاہیے جن تک ہماری رسائی ہے اور جو ہماری اس ارضی زندگی کی فلاح اور راہ عدل پر برقرار رکھنے سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن اور شارع علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت شدہ بصیرت نبوی کی روشنی میں تمہیں غائب کے متعلق جو کچھ بتا دیا ہے اس پر اپنی زندگی کو راہ راست پر استوار رکھنے کے لیے ایمان لانا چاہیے۔ انہیں مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ عالم آخرت سے متعلق ہے اس کے بارے میں جو کچھ بتا دیا گیا ہے وہ ہمارے اندر جوابدہی کا تصور پیدا کرنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔ جہاں تک تفصیلات اور اس زندگی کی کیفیات کا تعلق ہے وہ ہماری سمجھ کی گرفت میں نہیں آ سکتیں۔ وہ وہیں پہنچ کر معلوم ہوں گی۔ چنانچہ فرمایا:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ(۳:۱۷۹)

ترجمہ: اور اللہ نہ یہ کر سکتا ہے کہ وہ تمہیں سارے غیب سے باخبر کر دے بلکہ اللہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے۔ تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

یعنی اللہ کی کتاب اور رسول کے ذریعے سے (احکام شریعت کے علاوہ) غیب کے متعلق بھی جو کچھ اور جتنا کچھ تمہیں ملتا ہے اس کو برسر حق تسلیم کرو۔

یہی طرز عمل جنت، جہنم اور اعراف کے متعلق اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن میں اول الذکر دونوں کے حالات اور چھائی ہوئی فضا کے تذکرے سے یہ مقصود ہے کہ انسان جن باتوں کا تصور کر سکتا ہے وہاں پائی جانے والی ایسی باتوں کا ذکر کر کے یہ بتا دیا جائے کہ اس دنیا میں جب لوگ اللہ کی طرف سے فراہم کردہ ہدایت پر عمل پیرا ہوں گے، آخرت میں انہیں راحت و سکون اور آرام و اطمینان کی زندگی میسر ہو گی اور اللہ کے باغیوں کو سزا کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ وہاں انسانی زندگی کا جو ڈھب ہو گا اور انسان ارتقاء کی جو منازل جس انداز سے طے کرے گا وہ ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ یہاں کی چند روزہ زندگی اس قدر پیچیدہ ہے تو وہاں کی طویل زندگی جس کے لیے خلود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ معلوم کس نوعیت کی ہو گی۔

عالم آخرت کے تو خیر اس دنیا سے زمین و آسمان ہی مختلف ہوں گے۔ اگر اسی عالم کی تاریخ کے یکے بعد دیگرے آنے والے ادوار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگر آج سے چند صدیاں قبل کے لوگوں کو کوئی دور رواں کی تکنیکی ایجادات اور ان کے زیر اثر انسانی زندگی نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس کے متعلق کوئی بتانے والا ہوتا تو وہ لوگ اس کا تصور کر سکتے اور نہ اپنے اذہان سے اس کی تصویر کشی پر قادر ہو سکتے تھے۔ کیا کوئی تصور کر سکتا تھا کہ رابطے اور نقل و حمل کے ذرائع سے اس کرۂ ارض کو ایک جغرافیائی اکائی میں تبدیل کر دیا جائے گا اس کی فضاؤں میں اس قدر تیز رفتاری سے جہاز اڑتے پھریں گے۔ خلاء میں راکٹ ان میں سوار انسانوں سمیت یا از خود چکر لگائیں گے۔ ٹیلیفون، ٹی وی، ریڈیو اور اس قسم کی دوسری مشینی اختراعات کے ذریعے دنیا کے ہر حصے سے استوار ہو جائے گا۔ اس طرح کی بے شمار ایجادات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو ان لوگوں کے اذہان کی گرفت میں نہیں آ سکتی تھیں۔ غور کیجئے یہ سب تغیرات اسی ارضی دنیا میں اس کی پشت پر بسنے والے انسان کی لائی ہوئی ہیں جو اس عالم کی خصوصیات اور اسی میں جاری و ساری طبعی قوانین و قواعد میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کر سکتا تو کیا

انسان اس عالم آخر کے حالات کی کیفیات کو اپنے قوائے ادراک کی گرفت میں لا سکتا ہے جو ایک عظیم کائناتی انقلاب و تغیر کے بعد وجود میں آئے گا اور جسے موجودات کا خالق و مدبر اپنے امر تکوینی کے تحت خلق کرے گا؟

البتہ انسانی استعداد تفکر و تعقل کے مطابق یہ بتادیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اعمال کے حسن و قبح کے لحاظ سے اخروی زندگی میں تعین مراتب ہوگی۔ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ احوال و ظروف کے تغیر کے باوجود اسی زندگی کا انعقاد اس ارضی زندگی کے تسلسل میں ہوگا۔ صرف اس دروازے یا مرحلے سے گزرنا پڑے گا جسے ہم ''موت'' سے موسوم کرتے ہیں۔ انسان روحانی اور باطنی اعتبار سے یہی ہوں گے اگرچہ حقیقت کے نامعلوم نت نئے پہلوؤں سے روشناس ہو جانے کی وجہ سے وہ بہت سے مراحل ارتقاء طے کر جائیں گے۔ انہیں وہاں موجودہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات تک یاد ہوں گے۔ مثلاً سورہ الاعراف میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل دوزخ میں سے دنیا میں پیدا ہونے والی بعد کی نسلیں پہلی نسلوں کے متعلق (جن کے نقوش قدم پر وہ چلے) اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ انہیں دہرا عذاب دیا جائے (۷:۳۸) اسی سورہ میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ اہل اعراف جنتیوں اور دوزخیوں کو پہچان کر ان سے باتیں کریں گے (۷:۴۶-۴۸) ایک اور جگہ تذکرہ ہے کہ اس دنیا میں جو اپنے کبر کا ڈنکا بجاتے تھے، انہیں کمزور اور ناتواں لوگ پہچان کر کہیں گے ہم دنیا میں تمہاری پیروی کرتے تھے کیا تم ہمیں اس عذاب سے بچا سکتے ہو۔ (۱۴:۲۱) اسی طرح جو لوگ اللہ کی الوہیت میں بعض لوگوں کو شریک کرتے تھے (جیسے پیروں کے اڈوں اور خانقاہوں پر ہو رہا ہے) وہ ان شرکا کو بھی پہچان لیں گے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اعتراف کریں گے کہ تجھے چھوڑ کر ہم انہیں پکارتے رہے (۱۶:۸۶)

یہ چند مثالیں دینے سے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ آخرت میں انسانوں کی حیثیت انسانوں کی ہی ہوگی۔ دنیا کے واقعات ان کی یادداشت سے محو نہیں ہوئے ہوں گے۔ وہاں بھی ان کے اندر احساس راحت واذیت موجود ہوگا، اور انسانوں میں چونکہ مرد و زن کی دونوں اصناف شامل ہیں اس لئے ان کا وہاں اکٹھا ہونا بھی لازمی ہے۔ اپنے اپنے اعمال کے نتائج سے دوچار ہونا بھی قدرتی امر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں ہر چیز اور حالت کا معیار بلند تر ہوگا۔

بعض لوگ آخرت کے عالم جزاء و سزا ہونے کی حیثیت کے بارے میں اس الجھن کا اظہار کرتے ہیں کہ آخر اللہ تعالیٰ کو ایسی مخلوق پیدا کرنے کی کیا حاجت تھی جسے عذاب دینے کی ضرورت لاحق ہوتی یہ انہی لاینحل سوالات میں سے ایک ہے، جن کا جواب نہ آج تک پایا جا سکا اور نہ آئندہ پایا جا سکے گا۔ آپ ایک طرف یہ دیکھتے ہیں کہ انسان میں بھلائی اور برائی کرنے کی استعداد اور دوسری طرف یہ بات بھی آپ کے مشاہدے میں آتی

ہے کہ وہ اس معاملہ میں انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے بھی بااختیار ہے لہٰذا اس اختیار کی موجودگی میں جواب دہی کے تصور میں خلاف عقل ہونے کا پہلو نہیں پایا جاتا۔

ذہن میں مستحضر کرنے کی سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کبھی کوئی ایسا معاشرہ، چاہے وہ جس قدر بھی غیر ترقی یافتہ ہو، کبھی پایا ہی نہیں گیا ہے جس میں کسی نہ کسی درجے میں احتساب کا عمل اور اس کے نتیجے میں جزا و سزا کا قاعدہ رائج نہ ہو، اور نہ ایسے قوانین و قواعد کے بغیر کوئی ہیئت اجتماعیہ اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ انسان کا زندگی گزارنے کا ڈھنگ اور انداز ایسا ہے کہ اس سے بر و اثم کے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں ان میں بے شمار مرئی و غیر مرئی، مادی و روحانی اور ظاہری و باطنی عوامل کا بیک وقت عمل دخل ہوتا ہے۔ آپ اس بات پر تو اپنی عقلی و فکری توانائیوں کو نتیجہ خیز طور پر صرف نہیں کر سکتے کہ انسان کو ایسا کیوں بنایا کیونکہ یہ سوال تو اللہ تعالیٰ کی مجموعی مخلوق جس کا آپ تصور نہیں کر سکتے کے متعلق بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور اس کائنات کے مختلف شعبوں کے متعلق بھی، اور کسی ایک ایسے سوال کا جواب بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان سمیت جو کچھ تخلیق کیا ہے اپنی مشیت کے تحت تخلیق کیا ہے۔ اس کا قائم کردہ نظم اس کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک ہے، نہ نظر آتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ساری موجودات میں انسان یا کوئی اور ہستی ایسی کسی بات میں تغیر نہیں کر سکتی جو اس کے امر تکوینی کے تحت وجود میں آئی ہے۔ جب کائناتی و عالمی صورت حالات یہ ہے تو ایسی الجھنوں کو اپنے دماغوں پر مسلط کرنا کار لاحاصل ہے۔ انسان جو کچھ ہے اس کی خصوصیات کو ذہن میں رکھ کر ہی آپ کو زیر نظر موضوع پر تفکر کرنا چاہیے۔ اپنی مہمل خواہشات اور ایسی خواہشات کی بنا پر جن کا ادراک حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، کارخانہ قدرت میں تبدیلی و ترمیم کی آرزو کرنا اللہ کی بنائی ہوئی کائنات اور اس کے انجام جیسے عظیم معاملات میں مداخلت کرنے کی کوشش کے مترادف ہے جو ممکن ہی نہیں۔

پھر سوچئے تو سہی کہ اس ہستی کے مقابلے میں جس نے یہ محیر العقول کائنات تخلیق کی، جس میں انسان کی حیثیت نہایت معمولی سی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں جو اعتراض کا رنگ لئے ہوئے ہوں؟ چنانچہ انسان کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا(۷۹:۲۷)

ترجمہ: کیا تمہارا بنانا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟

یہ اور اس کے بعد کی آیات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات انسانی تخلیق کے مقابلے میں بہت بڑا کام ہے۔ اتنا عظیم کام انجام دینے والی ہستی کا کوئی کام خیر سے ہٹا ہوا قرار نہیں دیا جا سکتا اگرچہ ہم اس کے منصوبے کے مختلف شعبوں اور اس کی خلق کی ہوئی موجدات کا صحیح تصور بھی نہ کر سکیں۔ اور اس کی حکمتوں کی اصلی کنہ سے یکسر ناواقف ہوں۔ اس کی کبریائی اس کے برسر حق ہونے کی دلیل ہے۔

جب ایک ایسا شخص جو رات دن معصیت میں مبتلا رہتا ہو، ضمیر کی گہرائی سے برائی کی حمایت نہیں کر سکتا تو اتنی بڑی ہستی جس نے یہ ساری کائنات بنائی، بھلائی اور خیر سے کس طرح انحراف کر سکتی ہے۔ لہٰذا انسان کو کسی پہلو سے بھی اس شک یا خیال میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ کا کوئی کام، خیر حکمت اور عدل کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) ناسمجھ نہیں، ظالم نہیں، ناانصاف نہیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے درست کرتا ہے۔ جو لوگ ایسے سوالات اٹھاتے ہیں وہ یا تو ذہنی طور پر اس قدر پست ہیں کہ انہیں انسانی بساط کی حد تک اس کائنات کی عظمت اور اس کے بنانے والے کی کبریائی کا معمولی سا شعور بھی نہیں، اور یا وہ وجود باری تعالیٰ ہی کے سرے سے منکر ہیں اور دوسروں کے ذہنوں اور قلوب میں شک وریب کے کانٹے چبھونا ان کا اصل مشغلہ ہے۔

آخرت کی جزاء وسزا کے عمل کے وجود میں آنے کے متعلق اس نقطہ نگاہ سے بھی غور کرنا چاہیے کہ انسانی معاشروں میں تو عدل کے مقتضیات کو پورا کرنے کے لیے انسانوں کے اعمال خیر وشر کے بارے میں، باوجود حقیقت حال تک اپنی کلی اور یقینی نارسائیوں کے، انسانوں ہی کو حق دے دیا جاتا ہے درآں حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ کام نہایت محدود طور پر انجام دیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے مستکبرین انفرادی اور اجتماعی وقومی سطح پر دوسروں پر مہیب مظالم ڈھانے والے اگرچہ ہر ایک کی نظروں کے سامنے سے ایسے کام کرتے ہیں لیکن ان پر کوئی گرفت نہیں کر سکتا۔ کیا عقل وخرد کا یہ واضح مطالبہ نہیں کہ ایسے جرائم کے فیصلوں کی تکمیل وہی ہستی کرے جو اپنے علم وقدرت کے لحاظ سے مکمل طور پر عدل کے تقاضے پورے کرنے کا اختیار رکھتی ہے؟ کیا خدا کی خدائی کا عدل پر قائم ہونا اس بات کا متقاضی نہیں کہ اس کام کے لیے ایک ایسا عالم آخرت وجود میں آئے جس کا اسلام نے تصور دیا ہے؟

ا۔ جنت:

جنت کا لفظ باغ، خوشنما مقام اور ایسی جگہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جہاں دل خوش کن نظارے دل و دماغ اور آنکھوں کو فرحت اور ٹھنڈک پہنچانے کا باعث ہوں۔ سبزہ اور بہتا پانی بھی اس کے لوازمات میں شامل کئے جاتے ہیں جیسا کہ دنیا کے مشہور باغات اور سیر گاہوں کی خصوصیت ہے۔ صاحب ثروت ممالک اپنے شہریوں کو مسرت اور شادمانی کے مواقع فراہم کرنے کے لیے ایسی جگہوں کی تیاری پر وافر دولت خرچ کرتے ہیں۔ ادوار ماضی میں بھی وقت کے معیارات کے مطابق ترقی یافتہ قوموں کی بنائی ہوئی ایسی پر فضا جگہوں کو قرآن نے جنت سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً قوم سبا نے پانی پر جو عظیم بند (Dams) تعمیر کئے تھے وہ موجودہ دور کے تعمیر شدہ بندوں سے اس قدر زیادہ اونچے تھے کہ میدانی علاقوں کی آبپاشی کے علاوہ ان کے پانی سے پہاڑوں کے اوپر باغات اگانے اور انہیں سبزہ زاروں کی شکل دینے کا کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۭ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ (۳۴:۱۵)

ترجمہ: اور اہل سبا کے لیے بھی ان کے مسکن میں بہت بڑی نشانی موجود ہے۔ داہنے بائیں دونوں جانب باغوں کی دو قطاریں۔ اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہو اور اس کے شکر گزار رہو۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کی گمراہی و طغیانی پر اصرار کرنے اور اسلام کی دعوت قبول نہ کرنے پر ان کو مزید سمجھایا تو ساتھ ہی انہیں اللہ کی نعمتوں کی ان الفاظ میں یاد دہانی کروائی:

يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (۷۱:۱۱-۱۲)

ترجمہ: اور تم پر اپنے ابر رحمت کے ڈونگڑے برسائے گا اور مال و اولاد سے تمہیں فروغ بخشے گا اور تمہارے واسطے باغ پیدا کرے گا اور نہریں جاری کرے گا۔

تو جنت کا لفظ ایسا نہیں جس سے نزول قرآن کے وقت لوگ ناآشنا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جہان آخرت میں فلاح یافتہ انسانوں کو جو مقامات ان کے حسن عمل کی جزاء کے طور پر عنایت کرنے ہیں ان کے لیے اس دنیوی اصطلاح کو باقی رکھا۔ جس طرح اس دنیا میں رواج پذیر آخرت کا معیار تکریم یہاں بعض لوگوں کو دنیوی جنتوں سے شادکام ہونے کا موقع ملتا ہے اسی طرح جہان آخرت کا معیار تکریم وہاں بعض لوگوں کو وہاں کی جنتوں سے مستفید ہونے کا موقع دے گا لیکن جیسا کہ قرآن کی وضاحتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ وہاں کی جنت اس دنیا میں حصول رضائے الٰہی کے لیے گرم و سرد چشیدہ انسانوں کی محنت کا ثمرہ ہوگی اور خوش گواری اور لطافت و نظافت

میں دنیوی باغات کو ان سے ان کی برتری کے بارے میں نہ کسی موازنے کی گنجائش ہو گی اور نہ کسی قسم کی نسبت مماثلت کا سوال پیدا ہو گا۔

قرآن میں مناسبت کے اعتبار سے عالم آخرت کی جنت کا تذکرہ بہت سے مقامات پر آیا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ یہ اس جہان میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا مسکن ہو گا، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی اور اس کے انبیاء و رسل کے اتباع و اطاعت میں اپنی زندگیاں بسر کیں ان اوامر و نہی اور رسولوں کی زندگیوں کے حالات کا تو، جو قرآن میں مذکور ہیں، ہم یہاں احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس بات کا وسیع تر تصور قائم کرنے کے لیے تو قرآن حدیث ہی سے رجوع کرنا ہو گا البتہ ہم یہاں چند آیات قرآن اور احادیث نقل کر کے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہاں سہولتوں کی فراوانی، فضا کی طہارت، ماحول کی پاکیزگی اور خوش رنگی، زندگی کی خوبی (quality of life) کے علاوہ رضائے الٰہی کے حصول کے ذریعے سے ہمارے تصور سے ماورا منازل ارتقا طے ہوں گی۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ، وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ(۹:۷۱-۷۲)

ترجمہ: اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کو اپنی رحمت سے نوازے گا۔ اللہ عزیز و حکیم ہے، مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ایسے باغوں کے لیے ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے لیے پاکیزہ مکان ہوں گے۔ ابد کے باغوں میں اور اللہ کی خوشنودی بھی جو سب سے بڑھ کر ہے۔ بڑی کامیابی یہ ہے۔

یہ بلاغت قرآنی ہی کا اعجاز ہے کہ چند الفاظ میں مستحقین جنت کی خصوصیات اور ساکنان جنت کی خوشگوار زندگی کی تصویر کشی کر دی گئی ہے۔ ہر لفظ کے مضمرات اور اس کے دور رس فکری و عملی نتائج تفکر و تدبر کے مستحق ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے ساتھ یکساں سلوک کو نمایاں کیا گیا ہے۔ آخر میں رضائے الٰہی کی

اہمیت پر زور دے کر انسانی فکر سلیم کو ایسے نہ ختم ہونے والے راستے پر ڈال دیا گیا ہے جس پر چل کر وہ اپنی استعداد فکری و روحانی کے مطابق ان بلندیوں اور سرفرازیوں پر سوچتا چلا جائے جو اللہ کی خوشنودی کے حصول کے بعد جنتی انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس میں اس حیات اخروی کے ارتقاء کا اصل راز مضمر ہے۔ اس کی کامرانیاں بے اندازہ ہوں گی اور فتح مندیاں انسانی تصور سے ماوراء۔

یہ جو عام تاثر پایا جاتا ہے کہ جنت کی زندگی خوش خوری اور حوران بہشتی کے ساتھ ملاعبت و حسن و رفاقت اور وہاں کے سبزہ زاروں اور بہتی ہوئی نہروں کے نظاروں سے شاد کام تک ہی محدود ہے، محض تصویر کا ایک رخ دیکھنے کے مترادف ہے۔ آخر ان میں کونسی بات اخلاقی پابندیوں کے ساتھ اس دنیا میں غیر پسندیدہ ہے اور مروج نہیں۔ لیکن ایک دیدہ ور کی توجہ زیادہ تر "رضوان من اللہ اکبر" کی طرف جانی چاہیے۔ اس نعمت کے اندر انسان کی تعمیر مزید کے بالقوہ امکانات پائے جاتے ہیں وہ ہمارے تصور کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔ لیکن انسان پر ان کے قوی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توجہ اور التفات انسان کو جمود کی حالت میں رہنے دے؟

جنت کا ماحول اور اس میں چھائی ہوئی فضا ایسی ہو گی کہ اس میں ناشائستگی کا گزر نہیں ہو گا۔ جنتی وہاں کے مروجہ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی سلامتی کی تمنا کا اظہار کریں گے۔ خوش اخلاقی ان کا شیوہ ہو گا۔ فرمایا:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا(۱۹:۶۲)

ترجمہ: یہ اس میں کوئی لغویات نہیں سنیں گے، بس تحیت ہی تحیت ہو گی۔ اس میں صبح و شام ان کا رزق مہیا ہو گا۔

یہاں رزق سے مراد محض اشیاء خورد و نوش ہی نہیں بلکہ ہمارے مفسرین نے یہاں رزق کو روحانی غذا بھی قرار دیا ہے اور یہ معنی انہوں نے احادیث نبوی سے اخذ کئے ہیں۔ صبح و شام کے الفاظ اس روحانی فیض رسانی کے تسلسل پر دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ تربیت بے مقصد و غایت نہیں ہو گی۔ یہاں کی چند روزہ زندگی میں اللہ اصول دین بنا کر منزل کی نشاندہی کرتا ہے تو وہاں کی ابدی زندگی بے مقصد کیسے ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ساکنان خوش و خرم ہوں گے اور ہشاش بشاش زندگی بسر کریں گے۔ اس عیش دوام میں مرد اور خواتین دونوں حصہ لیں گے۔ ان کی زندگی بے لطف اور غیر دلچسپ نہیں ہو گی:

اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِىۡ شُغُلٍ فٰكِهُوۡنَ ۚ هُمۡ وَاَزۡوَاجُهُمۡ فِىۡ ظِلٰلٍ عَلَى الۡاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوۡنَ ۚ لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ ۚ سَلٰمٌ ۖ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِيۡمٍ(۳۶:۵۵-۵۸)

ترجمہ: پس اہل جنت آج اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے وہ اور ان کی بیویاں، سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھیں گے۔ اور اس میں ان کے لیے میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ مانگیں گے۔ ان کو سلام کہلایا جائے گا۔ پروردگار کی طرف سے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ جنت میں فراہم کردہ تمام سہولتوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا جنتیوں پر اکرام، التفات، اور نظر رحمت کا تذکرہ بھی چلتا رہتا ہے، اور دراصل یہی بات اس زندگی کے قالب کی روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے اس زندگی میں مقصدیت اور اس کی بلندی سطح کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور ہمارے سلف صالحین اس بات کی تمنا کرتے رہے کہ اگر اللہ کی رضا حاصل ہو جائے تو سب کچھ پالیا۔

لہٰذا دین پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں مومن کے ذہن میں جو اصل جذبہ محرکہ کام کرتا ہے وہ ہے اللہ تعالیٰ سے محبت، اس کی رضا کے حصول کی خواہش اور اس سے تعلق پیدا کرنے کی طلب۔ جوں جوں ایمان میں مضبوطی آتی جاتی اور استحکام پیدا ہوتا جاتا ہے، جنت کی متذکرہ مادی نعمتوں کی خواہش ترجیحات کے اعتبار سے مومن صادق کے نزدیک نچلے درجوں میں نزول کرتی ہے۔ قرآن میں نعماء جنت کا تذکرہ اخروی ماحول کی تمثیلی صراحت کے طور پر اس انداز سے کیا گیا ہے جن کا انسان اپنے محسوسات کے ذریعے سے ادراک کر سکے۔ اصل حقیقت متشابہات میں سے ہے اور متشابہات بھی اصلیت اور واقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ صرف انسان ان کو اپنے عقل و شعور کی گرفت میں نہیں لا سکتا ان سے اسی کے متجسسانہ رجحان کے لیے ثقہ اور غیر مشتبہ ذرائع سے تسکین کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا:

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِىَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ(۳۲:۱۷)

ترجمہ: تو کسی کو پتہ نہیں کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک پوشیدہ ہے۔

ایمان میں پختگی پیدا کرنے کے لیے زیادہ زور قلب کے اندر اللہ سے لگاؤ اور اس کی محبت پیدا کرنے پر دیا گیا ہے۔ درج ذیل چند آیات پر غور فرمایئے:

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (۲:۱۶۵)

ترجمہ: جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ (۲:۲۷۲)

ترجمہ: اور جو مال بھی خرچ کرو گے اس کا نفع تمہیں کو حاصل ہوتا ہے اور نہ خرچ کیجیو مگر اللہ کی رضا جوئی ہی کے لیے۔

خرچ کرنے سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

پھر فرمایا:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳:۲۲)

ترجمہ: اور جو اپنے رب کی رضا جوئی میں ثابت قدم رہے اور جنہوں نے نماز کا اہتمام رکھا اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا اس میں سے سراً اور اعلانیۃً خرچ کیا اور جو بدی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، انجام کار کی کامیابی انہی کے لیے ہے۔

اور پھر اللہ سے محبت کی کسوٹی اتباع رسول کو قرار دے دیا، اور حضور کو حکم دیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ (۳:۳۱)

ترجمہ: کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

قرآن کی تعلیمات کی روح اور ان پر عمل پیرا ہونے کے صلے میں جنت کی جس زندگی کا نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے ان پر چھایا ہوا تصور یہ ہے کہ اصل چیز اللہ کی رضا کے حصول کی خواہش اور اطاعت واتباع رسول ہے اور یہی بات انسان کو اس حیات طیبہ کا مستحق بناتی ہے جس کا تذکرہ آیت (۱۶:۹۷) میں کیا گیا ہے۔

وہاں نظافت وطہارت اور معقولیت ومتانت کا یہ عالم ہوگا کہ شراب مہیا کی جائے گی لیکن اس کے استعمال کے نتیجے میں کسی قسم کی سرمستی اور غل غپاڑہ ظہور میں نہیں آئے گا:

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ۴۵ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۴۶ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ (۳۷:۴۵–۴۷)

ترجمہ: ان کے لیے شراب معین کے جام گردش میں ہوں گے بالکل صاف شفاف، پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت! نہ اس میں کوئی ضرر ہوگا اور نہ وہ اس سے نڈھال ہوں گے۔

جنتیوں کے حسن و جمال کے متعلق ہم ایک متفق علیہ حدیث کا ٹکڑا نقل کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ ان کے روحانی مقام کے مطابق انہیں قالب عطا کیے جائیں گے جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، اصل چیز انسان کی شخصیت اور اس کے روح و باطن ہیں جسم انسانی تو اس ارضی زندگی میں بھی خلیوں کے اتلاف و نمود کے ذریعے سے اپنی ساخت بدلتا اور عمر کے مختلف مرحلوں میں شکل و صورت کے اعتبار سے روبہ تغیر رہتا ہے۔ ایک فرد چاہے مرد ہو یا عورت اس دنیا میں بوقت وفات ٹی۔بی سرطان عارضہ قلب، ضعیفی یا کسی اور مرض میں مبتلا ہو کر نہایت کمزوری اور نحافت کی حالت میں تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اگر اس کے اعمال حسنہ کی وجہ سے اسے جنت میں داخل کیا جائے گا تو اس کی جسمانی وہی حالت بحال رکھی جائے گی جو بوقت وفات تھی۔ حضور نے فرمایا:

وعن أبي بريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان اول زمرة يدخلون الجنت على صورة القمر ليلته البدر ثم الذين يلونهم كا شد كوكب دري في السماء اضاءة قلوبهم على قلب رجل واحد لا اختلاف بينهم ولا تبا غض(متفق علیہ)

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں داخل ہونے والا پہلا گروہ چودھویں کے چاند کی طرح منور ہو گا پھر جو ان کے بعد میں داخل ہوں گے وہ آسمان کے چمکدار ستارے کے مانند ہوں گے۔ ان کے قلب ایک جیسے ہوں گے ان کے درمیان اختلاف ہو گا اور نہ بغض۔

حضور نے اصولی طور پر ایک حدیث میں یہ بات واضح کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندوں کے لیے جو کچھ (جنت میں) تیار کر رکھا ہے۔ (اور وہ وہاں جس قسم کی زندگی گزاریں گے) اس کا انسان اپنے موجودہ حواس کی وساطت سے تصور نہیں کر سکتا۔

عن أبي بريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الله تعالى اعددت العبادي الصالحين مالا عين رأت ولاذن سمعت ولا خطر على قلب بشر واقرء وا ان شئتم فلا تعلم نفس ما اخفى لهم من قرة اعين(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا اور نہ جس کا

خیال اس کے قلب پر گزرا۔ اگر تم چاہو تو (اس کے بعد حضور نے وہ آیت (۳۲:۱۷) پڑھنے کو کہا جو اوپر گزر چکی ہے)۔

۲۔ جہنم:

اس دنیا میں استعداد و صلاحیت خیر کی جزا کا حق، چاہے اس کا مظاہرہ زندگی کے جس شعبے میں بھی کیا جائے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بات مادی سطح پر ظہور پذیر ہوتی ہے، اور اخلاقی سطح پر بھی۔ ایک شخص ہے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو معاشرے میں اسی کے مطابق مقام حاصل کرنے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص اجڈ اور گنوار ہی رہتا ہے تو اسے سماجی ڈھانچے میں اس کے مطابق جگہ ملتی ہے۔ اخلاقی اقدار اور سیرت و کردار کی بلندی اور پستی بھی انسان کے قابل احترام یا ارذل ہونے کے بواعث میں شمار ہوتے ہیں۔ تاریخ عالم میں جن جن لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں یا حق کا بول بالا کرنے ظلم کی باد مخالف کے جھونکے سہنے اور جبارین وقت کے سامنے کلمہ حق کہنے کی سعادت حاصل کی ان کے نام جریدۂ عالم پر سنہری حروف سے تحریر ہیں۔ اس کے مقابلے میں جن لوگوں نے ظلم و جور اور اخلاقی بوداپن کا مظاہرہ کیا ان کے حصے میں عوام و خواص کی نفرت و حقارت کے سوا کچھ بھی نہیں آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض جہتوں سے اس دنیا میں بھی انسانی اعمال کے فیصلے ہوتے ہیں چاہے وہ رائے کی سطح پر ہوں یا تائید و مخالفت کے رنگ میں لیکن ہم اسی باب کے آغاز میں عرض کر چکے ہیں کہ انسان اپنی بے بسی کی وجہ سے کلی عدل و انصاف پر قادر نہیں۔ یہاں بہت سے ایسے عوامل کام کرتے نظر آتے ہیں جو ان اقدار کے نفاذ کے راستے میں حائل ہیں، اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ قرآن نے اس دنیا کو جہاں آزمائش و امتحان قرار دیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی راست روی کی وجہ سے اپنے جائز حقوق سے محروم ہی نہیں رہتے بلکہ بعض اوقات اس رویے کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر معاشرہ فساد زدہ ہو تو بد کردار لوگ بچ نکلتے، اور اپنے اعمال کی سزا پانے سے محفوظ رہتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر نظم میں چاہے وہ جس قدر بھی کمزور ہو، برائی میں ملوث لوگوں یعنی قاتلوں، ڈاکوؤں، چوروں اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سزائیں تجویز کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ معصیت اور جرائم کا ارتکاب دنیا میں انفرادی سطح پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ ساری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے جاتے ہیں جن کا مداوا کرنے کے لیے بین الاقوامی دائرے میں سرے سے کوئی قانون موجود

ہے نہ اس کے نفاذ کی کوئی شکل دکھائی دیتی ہے۔ بین الاقوامی دائرے میں استعمار اور استحصال پرست اقوام پس ماندہ اقوام پر منظّم طریق سے اپنی اقتصادی اور فوجی برتری کے سہارے ہر قسم کا ظلم ڈھا رہی ہیں۔ ان اقوام کے تمام حلقے اور طبقات اس کام میں عمداً اشتراک کرتے ہیں۔ سیاست دان بھی چاہے وہ حزب اقتدار سے تعلق رکھتے ہوں یا حزب اختلاف سے سرمایہ دار اور صنعت کار طبقہ بھی، فوجی بھی اور عوام بھی مظالم کی سبھی صورتوں کا علم رکھتے اور ان کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اپنے اپنے قومی تفوق اور معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ سارے حربے استعمال کئے جا رہے ہیں جن کے ذریعے سے دولت نادار ممالک سے ان ترقی یافتہ ممالک کی طرف منتقل ہوتی رہے اور اول الذکر افلاس، بیماریوں، قحط اور سیاسی ابتری کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ یہ اجتماعی معصیت ہے جس کا ارتکاب یہ طاقتور اقوام کر رہی ہیں۔ اس دنیا میں ایسی کوئی قوت موجود نہیں جو انہیں اس تعدی سے روک سکے، جب تک ان کی اجل نہیں آتی۔ جس کا سامنا ابھی ابھی کمیونسٹ روس نے ساری دنیا کی توقعات کے خلاف کیا ہے، تب تک یہ اپنی اس روش پر قائم رہیں گے۔ حالات و اسباب کے اعتبار سے تو ان کے مستقبل کا جائزہ موزوں مقام پر لیا جائے گا لیکن یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر دنیا کی اس مختصر اور عارضی زندگی میں انسانوں کے قائم کردہ نظاموں میں ان کی کمزوریوں کے باوجود افراد کا احتساب کیا جا سکتا ہے تو کیا وہ خالق و مدبر کائنات جو موجودات کے سارے نظم کو چلا رہا ہے، اور جو علیم و خبیر اور صاحب قدرت و طاقت ہونے کی وجہ سے عدل و انصاف پر پوری طرح قادر ہے بالآخر ان سب انفرادی اور اجتماعی جرائم کی سزا نہیں دے گا جن کا ارتکاب کرنے والوں کو اس دنیا میں ان کی سزا نہیں ملی؟ اگر ایسا نہ ہو تو کیا یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ کیا یہ اتنی بڑی کائنات عدل سے لاتعلق ہے اور کیا اس کائنات میں زمین کے اس چھوٹے سے کرے پر آباد باشعور و اختیار نوع اپنی ساری خوبیوں اور طغیانیوں کے باوجود احتساب سے مبرا ہے؟ عقل و دانش اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتی۔

کیا اگر کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ناجائز سیاسی و اقتصادی مفادات کی حفاظت کے لیے دوسری جنگ عظیم میں دو کروڑ افراد کی جانوں کا ضیاع کر کے بغیر استحقاق کے نیو روم برگ کے مقدمات (Nuremberg Trials) کا ڈھونگ رچانے کا اصول تسلیم کیا جا سکتا ہے تو اس خالق کائنات کی طرف سے جس کا ہر کام عدل پر مبنی ہے، اگر یہ حق منسوب کیا جائے کہ وہ ایک روز خیر کی جزاء اور معصیت کی سزا دے گا تو اس عقیدے کو کسی منطق کے تحت غلط قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ الزامی دلیل ہم نے ان لوگوں کے لیے دی ہے جو اپنے لئے تو یہ ناجائز حق تسلیم کرواتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کے اعمال کے جائز و ناجائز ہونے کا

فیصلہ کریں، لیکن اس خالق کائنات کا یہ حق تسلیم نہیں کرتے جو اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے اور ایسے جذبات سے پاک ہے جو ظلم و تعدی کا ذریعہ بن سکتے ہیں، اور جس نے ایسی حکمت کے تحت دنیا و آخرت کا نظام قائم کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے جس کی حقیقت کا ادراک ہمارے بس میں نہیں۔

ارضی زندگی کو نظم کے تحت بسر کرنے کے لیے سب سے اہم بات قائم شدہ ہیئت حاکمہ کے وجود کو تسلیم کرنا اور اس کے قوانین پر بصمیم قلب عمل پیرا ہونا ہے۔ دنیوی ریاستیں اور حکومتیں جو انسانوں ہی پر مشتمل ہوتی ہیں، ملک میں بسنے والے شہریوں سے اپنے وجود کو تسلیم اور اپنے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط پر عمل کروانے پر سب سے زیادہ زور دیتی ہیں بلکہ ان کے وجود کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کو قانون میں سب سے بڑا جرم قرار دیا جائے۔ یہ بات حکمران کے غیظ و غضب کو بڑھکانے کا بھی باعث بنتی ہے جب کہ دوسری خلاف قانون حرکات عدالتی کارروائی تک ہی محدود رہتی ہیں۔ کسی قسم کی مماثلت معنوی کے بغیر اسی پر یہ قیاس کر لیجئے کہ اس کائنات کا خالق و حاکم بھی چاہتا ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کیا اور اس کے رسول کے ذریعے بھیجے ہوئے اس کے دین کے اصولوں کے سامنے سر اطاعت خم کر کے انہیں زیر عمل لایا جائے۔ لیکن اس کی حاکمیت کو قبول کرنے اور بندوں کو الٰہ مطلق کی حیثیت سے اس پر ایمان لانے اور دنیوی ریاستوں اور حکومتوں کے اقتدار کو تسلیم کرنے اور ان کے قوانین پر عمل پیرا ہونے کی نوعیت میں سرے سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کا امر تکوینی ساری کائنات اور تمام موجودات کو اپنے احاطہ اقتدار میں لئے ہوئے ہے۔ اس کو ذاتی منفعت یا نفع کے لیے کسی کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ فرمایا:

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۚ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ (۳۹:۷)

ترجمہ: اگر تم منکر ہو گئے تو اللہ پروا نہیں رکھتا تمہاری اور پسند نہیں کرتا اپنے بندوں کا منکر ہونا۔

اس نے اس دنیا میں انسان کو جو عارضی اور محدود اختیار دے رکھا ہے موت اس کی بے ثباتی کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ بڑے بڑے فراعنہ اور جبارین کلی بے بسی کی حالت میں چشم زدن کے اندر ابدی نیند سلا دیئے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا جو نظام قائم کر رکھا ہے اس میں اس مخلوق کے اندر روح اور خودی کا ایسا مرکزی عنصر رکھ دیا ہے جس میں فکر و عمل کی نوعیت کے زیر اثر نمود و تنزل کی بالقوہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

اگر وہ صالح فکر اپنائے گا اور اس پر عمل پیرا ہو گا تو اس کی خودی نشوونما کی منازل طے کرے گی، اگر وہ اس سے مخالف سمت میں چلے گا تو اس میں باطنی تنزل ہو گا۔ فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ (۴۱:۴۶)

ترجمہ: جو نیک عمل کرے گا تو اپنے ہی لئے کرے گا اور جو برائی کرے گا تو اس کا وبال اس پر آئے گا۔

گویا انسان کا ہر عمل اپنی اچھائی اور برائی کے مطابق انسانی سیرت و کردار کو متاثر کرتا ہے، اور عالم آخرت میں اسی بات پر نتائج کے مرتب ہونے کا انحصار ہے۔ اگر کوئی اس کائناتی سلطنت کے خالق و مدبر کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور اسی کے دیئے ہوئے اختیار اور ڈھیل کے تحت اس کا باغی ہے تو بادشاہ کائنات کو دنیوی حکمرانوں کے برعکس کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ متعلقہ فرد عالم آخرت میں قانون و مشیت خداوندی کے تحت بلا تکلف اپنے آپ کو اسی مقام پر رہنے کے قابل پائے گا جس کا تذکرہ قرآن و حدیث میں جہنم کے نام سے کیا گیا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ اگر کسی شخص کے اخلاق کی تہذیب ہی نہیں ہوئی تو اس سے معمولاً گنواروں جیسی حرکات سرزد ہوں گی۔ لیکن اگر اس کی تہذیب نفس ہو چکی ہے تو قدرتی طور پر حسن اخلاق کا مظاہرہ کرے گا، اور دونوں میں سے کسی کو بھی تکلف سے کام نہیں لینا پڑے گا۔

پھر اس شخص کے متعلق سوچئے جو بغیر سامان حفاظت کے بلندیوں کا رخ کرتا ہے۔ ابھی وہ زیادہ بلندی تک نہ جا سکے گا کہ آکسیجن کے بغیر اس کے لیے وہ ماحول ہی ناسازگار ہو جائے گا اور اس کی زندگی برقرار نہ رہ سکے گی۔ لیکن ایک دوسرا شخص جو حفاظتی سامان سے لیس ہو گا درجات بلندی طے کرتا جائے گا۔ اول الذکر کی حالت اس شخص کی ہو گی جو ایمان باللہ اور اس کے مقتضیات سے لیس نہ ہونے کی وجہ سے جنت جیسے مقام اعلیٰ وارفع میں رہنے کی اہلیت ہی سے محروم ہو گا، اور جہنم اسے اپنی طرف کھینچ لے گی۔ اس کو آپ ایک قدرتی عمل سمجھئے۔ جو جس قابل ہو گا آخرت میں اسی کے مطابق مقام پائے گا۔ اس نے راہ ہدایت سے محروم رہنے والوں کے متعلق فرمایا:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷:۷۲)

ترجمہ اور جو اس دنیا میں اندھا بنا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا اور گمراہ تر ہو گا۔

اس آیت سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ عالم آخرت میں غیر ہدایت یافتہ انسان کا ایک ایسی زندگی سے واسطہ پڑے گا جس میں اس زندگی کے فکر و اعمال کے نتیجے میں ہدایت و ضلالت ہی اس کا مقدر ہو گی اور تلافی گناہ کے اختیار سے وہ محروم ہو گا، اور احساس نامرادی کی آگ میں جلتا رہے گا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حجتہ البالغہ میں جزاء و سزا کے سلسلے میں انسان کے مکلف ہونے کے بارے میں مختلف صورتیں بیان کرتے ہیں۔ درج ذیل صورت بھی تحریر کرتے ہیں:

ترجمہ: مجازات کی پہلی قسم انسان کے نوعی تقاضے سے متعلق ہے جیسا کہ جب چوپایہ گھاس کھائے اور درندہ گوشت تو ان دونوں کا مزاج درست رہتا ہے لیکن جب چوپایہ گوشت اور درندہ گھاس کھانے لگے تو ان دونوں کے مزاج میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ میں حال انسان کا ہے۔ جب وہ ایسے اعمال بجالائے جن کی روح اللہ کے سامنے عاجزی، پاکیزگی، اطاعت اور عدل سے عبارت ہو تو اس کا مزاج ملکیہ اصلاح پذیر ہوتا ہے، اور جب وہ ان کے برعکس اعمال کا مرتکب ہو تو اس کا مزاج ملکیہ فساد زدہ ہو جاتا ہے۔ جب (عالم آخرت میں) انسان جسم (خاکی) کے بوجھ سے آزاد ہو گا تو وہ احساس ملامت و منافرت میں ایسے گرفتار ہو گا جیسے ہم میں سے کوئی آگ میں جلنے کی دردناک حالت میں مبتلا ہو جائے۔ (باب اقتضاء التکلیف المجازۃ)

قرآن نے ہماری سمجھ کے مطابق منکرین ہدایت خداوندی کے آگ میں جلنے کی مختلف کیفیات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ سورہ النساء میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ (۵۶:۴)

ترجمہ: جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم ان کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزہ خوب چکھیں۔

ایک اور جگہ پر بیان کیا:

فَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ ۚ یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ؕ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ ؕ کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا ۫ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۲۲:۱۹-۲۲)

ترجمہ: تو جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے جامے تراشے جائیں گے۔ ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی بہایا جائے گا۔ اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے سب پگھل جائے گا اور ان کی کھالیں بھی۔ اور ان کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے جب جب وہ اس کے کسی عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے اس میں دھکیلے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کا عذاب۔

کتاب اللہ میں متعدد مقامات پر ساتھ ساتھ آخرت میں ان لوگوں کے حصے میں آنے والے انعام واکرام کا بھی تذکرہ ہے جو اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور ان لوگوں کی سرزنش کا بھی بیان ہے جو اس کے منکر ہو کر اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے قرآن سے رجوع کیا جائے۔

بعض لوگ مغربی مادہ پرستوں کی انگیخت پر آگ کا ذریعہ ہونے پر معترض ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ایک ایسی ہستی کے فیصلوں اور قواعد پر جو عدم محض سے بشمول نوع انسانی اس ساری کائنات کو وجود میں لائی اسی کو دی ہوئی چند روزہ زندگی کے مالک پر اعتراض کرنے کا حق کیسے دیا جاسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳:۳۱)

ترجمہ: اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمینوں میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنہوں نے برے کام کئے ہیں اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنہوں نے اچھے کام کئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس ہستی سے عدل وانصاف اور اس کے ساتھ رحیمی و کریمی کی صفات کے ظہور کے تقاضوں کے خلاف کسی بات کا تصور کیا ہی نہیں جاسکتا۔ دیکھئے آیت (۳۶:۵۴) جو پہلے بھی نقل کی جاچکی ہے۔

تیسرے یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ اعتراض ان عدل وانصاف ناشناس حلقوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے جو رات دن انسانوں پر آگ برسانے والے ہتھیاروں کے اختراع و تیاری میں منہمک رہتے ہیں اور جنہوں نے اسی صدی میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر شہری آبادیوں کو جو براہ راست جنگ میں حصہ بھی نہیں لے رہی تھی، بھون ڈالا۔ پھر حال ہی میں فوجی اور غیر فوجی حلقوں کا امتیاز کیے بغیر انہوں نے عراق میں بم باری کی جس کے لیے (Carpet Bombing) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ سب مظالم محض معاشی استحصال کی خاطر دنیا پر اپنا تفوق قائم رکھنے کے لیے توڑے جاتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس طرز عمل کی پشت پر جو عزائم کام کر رہے ہیں ان میں مغرب کے مادہ پرستانہ تمدن سے تعلق رکھنے والے علمی، حکومتی، فوجی اور عوامی سبھی حلقے برابر کے شریک ہیں۔

ایسے لوگ خود تو ظلم کی بنیاد پر رات دن آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے ہیں اور کھیلتے رہے ہیں لیکن خداوند کی طرف سے قیام یوم الحساب کے نتیجے میں معصیت کے بدلے میں دی جانے والی سزا پر معترض ہیں۔

انہی کے متعلق قرآن کہتا ہے:

يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ (۷:۵۳)

ترجمہ: جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی وہ لوگ جنہوں نے اس کو پہلے نظر انداز کئے رکھا بول اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے، تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے تھے۔

قرآن کا موقف ہے کہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی یوم الحساب اور اعمال کی بنیاد پر جزاء و سزا کا تصور لے کر مبعوث نہیں ہوئے بلکہ تمام رسولوں نے یہ تصور پیش کیا۔ اور جب حقیقت منکشف ہو جائے گی تو اس عقیدے کے منکرین کف پشیمانی ملیں گے۔

۳۔ اعراف:

قرآن میں اس مقام کا تذکرہ صرف سورہ الاعراف میں کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت جنت اور جہنم کے درمیان تشبیہاً ایک دیوار کی بیان کی گئی ہے۔ قرآن کے بیان اور احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس دیوار پر بھی جگہ ملے گی۔ اصحاب جنت اور اصحاب نار کا ذکر کر کے قرآن کہتا ہے:

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۴۶ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۴۷ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ (۷:۴۶-۴۸)

ترجمہ: اور ان کے درمیان پردے کی دیوار ہو گی اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہل جنت کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو۔ وہ اس میں ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن متوقع ہوں گے اور جب ان کو اہل دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی، وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان ظالموں کا ساتھی نہ بناؤ! اور برجیوں والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے آواز دیں گے، کہیں گے کیا کام آئی تمہارے، تمہاری جمعیت اور تمہارا وہ سارا گھمنڈ جو تم کرتے تھے۔

اہل اعراف کی طرف اہل جنت اور اہل جہنم سے مخاطب ہو کر جو گفتگو منسوب کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان میں سے ہوں گے۔ احادیث و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں درجات ایمان کے لحاظ سے کئی زمروں کے افراد شامل ہوں گے۔ اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ جنت اور جہنم کی طرح اعراف بھی متعدد مرتبوں میں منقسم ہو۔ مفسرین نے اس بارے میں بہت سی احادیث اور صحابہؓ کے آثار کے حوالے دیئے ہیں۔ بعض نے اہل اعراف کو ایک ہی زمرے سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے جس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ابن کثیر نے متعدد احادیث و آثار کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مذکور تمام اقسام کے لوگ اصحاب اعراف ہی ہوں گے الا یہ کہ کسی روایت میں سند یا درایت کے اعتبار سے سقم ہو۔ غالب رجحان یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے۔ اس وجہ سے وہ کچھ عرصہ تک جنت میں جانے سے روک دیئے جائیں گے اور انہیں جہنم میں بھی نہیں ڈالا جائے گا لیکن جیسا کہ درج بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنت میں جانے کے لیے دعائیں مانگتے رہیں گے۔ اور آخر کار اللہ کی رحمت ان کے لیے جنت کے دورازے وا کر دے گی۔ ابن کثیر نے مجاہد کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ لوگ علماء اور فقہاء پر مشتمل ہوں گے۔ صاحب تدبر قرآن نے بھی مجاہد کے ابن جریر کے نقل کردہ قول کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ یہ علماء و صلحاء ہوں گے اور اس کی یوں وضاحت کی ہے:

''مجاہد نے علماء اور صلحاء سے مراد ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو لیا ہے جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں حق کے علمبردار، خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے رہے ہیں، جنہوں نے حق کی حمایت میں اہل باطل کے چرکے سہے ہیں اور جو مظلوموں کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے۔ ایسے علماء و فقہاء یا بالفاظ دیگر رجال امت بلاشبہ قیامت کے دن اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا آخری انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اپنی زبانوں سے رفقاء حق کو مبارک باد دیں اور دشمنان حق کو سرزنش کریں۔''

جنت میں خواتین

قرآن میں ایمان و عمل اسلام و کفر اور اخروی جزاء و سزا کے حوالوں سے مردوں اور عورتوں کا برابری اور یکسانی سطح پر ذکر کیا گیا ہے۔ جس جگہ تذکیر و تانیث کے اختصاص کے بغیر مومنوں، کافروں یا منافقوں کا ذکر ہوا ہے وہاں دونوں جنسیں ہی مراد ہیں جیسے لفظ انسان میں بھی دونوں ہی سے مراد ہوتی ہیں لیکن بہت سی ایسی

آیات قرآنی بھی ہیں جہاں تعین کے ساتھ مردوں اور عورتوں کا الگ الگ نام لے کر تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (۳:۱۹۵)

ترجمہ: تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

درج ذیل آیت میں تخصیص کے ساتھ اعمال کے حوالے سے مردوں اور عورتوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآىِٕمِیْنَ وَالصّٰٓىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا (۳۳:۳۵-۳۶)

ترجمہ: اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد، فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں۔۔۔ ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ کسی مومن یا مومنہ کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

غور کیجئے ایمان و عمل کے معاملے میں مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں کسی قدر یکساں ہیں۔ اور انہیں کسی قدر صراحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، تاکہ کسی قسم کے التباس کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ قرآن میں اس نوعیت کی اور بھی متعدد آیات ہیں۔ اسی طرح اجر کے معاملے میں بھی یکسانی ہے۔ اگر ناظرین ان دونوں آیات میں مذکور اعمال کے بارے میں ان کے مضمرات کو بھی پیش نظر رکھ کر غور وتدبر سے کام لیں گے تو دونوں اصناف میں برابری کے بہت سے پہلو کھل کر سامنے آجائیں گے۔

چونکہ اخروی زندگی میں اجر و سزا میں بھی برابری ہو گی لہٰذا جنت و جہنم میں دونوں انسانی صفتوں کا وجود بھی ہو گا۔ ہم اس سے قبل جنت کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اس بارے میں ایک متفق علیہ حدیث بھی نقل کی گئی ہے کہ جنتیوں کے چہرے چاند اور چمکتے ستاروں کی مانند ہوں گے۔ یہ بات مردوں اور خواتین دونوں پر چسپاں ہوتی ہے۔ حضور نے اس معاملے میں کسی ایک صنف کی تخصیص نہیں کی اور ظاہر ہے کہ جس طرح یہ دونوں اس دنیا میں جوڑوں کی حیثیت سے رہتے ہیں اسی طرح جنت میں بھی رہیں گے اور مردوں کی طرح عورتیں بھی اخلاق وحصانت اور حسن وجمال کے اعتبار سے ہر طرح کی خوبیوں سے مزین ہوں گی۔ یہ بات بالکل قرین عقل ہے اور اس کا تذکرہ ہر لحاظ سے مناسب۔

جس طرح جنت میں دونوں صنفیں جائیں گی اس طرح جہنم میں بھی جائیں گی:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ(۹:۶۸)

ترجمہ: منافق مردوں، منافق عورتوں اور کفار سے اللہ نے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے۔

لیکن جہنمیوں کی زندگی میں معاشرتی پہلو عنقا ہو گا۔ اس کے برعکس جنتی بھرپور معاشرتی زندگی گزاریں گے جس کی کیفیت وماہیت کی پوری تفصیلات نہ ہمیں معلوم ہیں اور نہ ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں۔ البتہ قرآن و حدیث میں ایسے اشارات موجود ہیں جن سے اس زندگی کے وجود اور ساکنان جنت کی پرازراحت وسکون ذہنی و قلبی کیفیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ قبل ازیں اس زندگی کے متعلق ہم چند قرآنی آیات دے چکے ہیں۔ یہاں ہم کچھ ایسی آیات دینا چاہتے ہیں جن سے جنتی خواتین کی بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان آیات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں بھی ان میں وہی معیار حیاء حصانت اور طہارت پائی جائے گی جن کا مطالبہ اسلام اس دنیا میں بھی کرتا ہے:

لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ(۴:۵۷)

ترجمہ: اس میں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۙ۝ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ(۳۷:۴۸-۴۹)

ترجمہ:اوران کے پاس عورتیں ہیں نیچی نگاہ رکھنے والیاں، بڑی آنکھوں والیاں، گویاوہ انڈے ہیں چھپے دھرے۔

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ(۵۵:۵۶)

ترجمہ: ان میں عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں، نہیں قربت کی ان سے کسی آدمی نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے۔

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ(۴۴:۵۴)

ترجمہ:اور ہم ان سے بیاہ دیں گے غزال چشم حوریں۔

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ(۵۵:۷۰)

ترجمہ:ان(باغوں میں)اچھی عورتیں ہیں خوبصورت۔

(لغت)الفرائد الدریہ میں حورالعین کا مطلبFair black eyed Womenدیاہوا ہے۔ گویا یہ لفظ سیاہ آنکھوں والی خوبصورت عورت کے لیے استعمال کیا گیا ہے یہ کوئی صنف نازک سے مختلف مخلوق نہیں ہوگی۔اور یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ جنت میں مرد اور عورتیں دونوں اصناف ہی خوبصورتی کی حامل ہوں گی۔ اس سے قبل آیت(۹:۷۲) نقل کی جاچکی ہے جس میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کے دخول جنت کا ذکر ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن عورتوں کے حسن وجمال اور طہارت وحصانت اور باحیاہونے کا درج بالا آیات میں تذکرہ ہے وہ یہی دنیوی عورتیں ہوں گی،اور اس سے توانکار نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ جب چاہے اور جس پیمانے پر چاہے مزید تخلیق پر قادر ہے جس طرح قرآن اس ارضی زندگی کے حوالے سے ازدواجی معاملات پر گفتگو کرتا ہے اسی طرح عالم آخرت میں بھی جس طرز پر اسے مرتب کیا جائے گا اس کے بارے میں اشارات کئے گئے ہیں۔ مندرجہ بالا اور اس نوعیت کی دوسری آیات پر اسی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالنی چاہیے۔ باقی رہا جنت میں عورتوں کے حسن وجمال کا معاملہ تو اس کا تذکرہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کو غیر معمولی حسن وجمال سے نوازا ہے البتہ جنت میں سبھی کو اس سے نوازا جائے گا۔

سورہ الرعد میں ایک جگہ مومنین کے اعمال حسنہ کا ذکر کرکے فرمایا:

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ(۱۳:۲۳)

ترجمہ: ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں گے ان کے آباؤاجداد، ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن جنتی عورتوں کا قرآن میں ذکر ہے وہ اس دنیا کی عورتوں سے مختلف نہ ہوں گی، اور نیک خاندان پورے کے پورے جنت میں چلے جائیں گے۔

اسلام کے مطابق اس دنیا میں دونوں صنفوں کا ایک نظم اور حصانت و پاکبازی کی شرائط کے ساتھ ازدواجی تعلق مطلوب شئے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دین اسلام کے برعکس تمام عالمی مذاہب میں اس تعلق کو ان کے تصور کے بروخیر کے خلاف قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ان سے تعلق رکھنے والے لوگ احساس معصیت کے ساتھ اس تعلق کو قائم کرتے ہیں۔ مغربی تمدن نے تو اس کے تقدس ہی کو پوری طرح پامال کر ڈالا۔ جنسی اختلاط کی صورت انتہائی بد نظمی کا شکار شرم و حیا کے تقاضوں سے بیگانہ اور سکون واطمینان سے یکسر نا آشنا ہو چکی ہے۔ تفصیلات تو متعلقہ باب میں دی جائیں گی، یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مستشرقین اسلام کے خلاف صدیوں سے جو تحریری مہم چلا رہے ہیں اس کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ وہ غیر مسلموں میں تو اسلام کے ازدواجی زندگی کو منظّم کرنے کے تصور کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں، اور آخرت میں اس شعبہ حیات کے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان پر پھبتیاں کستے ہیں اور اس طرح اسلام سے بے خبر اور مغربی فکر سے مرعوب لیکن حقیقتاً اس سے بھی نا آشنا مسلمانوں کے دلوں میں بھی شک و ریب کے کانٹے چبھوتے ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔ پروفیسر الفرڈ گلام (Prof. Alferd Guillaume) اپنی تصنیف ''اسلام'' میں لکھتا ہے:

"In the Quran despite its pre-occupation with battles, spoils and women and the heavenly orchards with large eyed houris and handsome boys, there is a strong note of other-worldliness and, to a lesser degree, of mysticism." (Page 143).

جنگوں، لوٹ مار، عورتوں اور بڑی آنکھوں والی حوروں اور خوش شکل لڑکوں کی طرف بیشتر توجہ کے باوجود قرآن میں اخروی دنیا سے وابستگی کا شدید اور تصوف سے کم تر درجے کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

اہل علم کی طرف سے ایسی صریح غلط بیانی اور گھٹیا اور سستے انداز تحریر کی قطعاً توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن مغرب میں چونکہ ہر شعبہ زندگی میں اخلاق سوز طرز عمل کو سند جواز حاصل ہے لہٰذا مستشرقین اسلام کے

متعلق غلط بیانیوں اور اس دنیا کی طرف بے سروپا باتیں منسوب کرنے کے مشغلے میں منہمک رہتے ہیں۔ قرآن تک ہر ایک کو وسائل حاصل ہے۔ پروفیسر مذکور نے جن چند موضوعات پر قرآن کے مضامین کا زیادہ تر مشتمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس کا برسر باطل ہونا اس کتاب پر ایک سرسری سی نظر ڈالنے سے واقعتاً غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں مابعد الطبیعیاتی مسائل اور اس ارضی زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں اصولی رہنمائی مہیا کی گئی ہے قرآن کا اپنا دعویٰ ہے کہ اس میں تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی ہر چیز کی تفصیل (۱۲:۱۱۱) پائی جاتی ہے۔ جن معاملات کے متعلق مغنا غلط الفاظ اور لہجہ اختیار کر کے مصنف نے یہ کہا ہے کہ ان کو قرآن نے بیشتر مباحث کا موضوع اور مرکز توجہ بنایا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں اتنی چھوٹی ضخامت کی کتاب ہونے کے باوجود اس میں سارے دنیوی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کی طرف توجہ دینے کی گنجائش کیسے نکل آئی۔ باقی رہے وہ مسائل جن کا اس مصنف نے تذکرہ کیا ہے تو جنگ کے متعلق، جو ہمیشہ ہی بنی نوع انسان کا پریشان کن مشغلہ رہا ہے، قرآن نے اخلاقی نقطہ نظر سے نہایت جامع لیکن مختصر گفتگو کی ہے اور ازدواجی زندگی کو ایک نظم کے تحت لانے کی مناسب الفاظ میں تلقین کر کے مغربی تمدن کے اس مروجہ حیاء سوز اور اخلاق ناشناس صنفی مزاج (Sexual Anarchy) کے خلاف مواد فراہم کیا جس سے مصنف مذکور تعلق رکھتا ہے اور جس میں موجودہ مغرب سے کم تر درجے میں ہی سہی، نزول قرآن کے دور کا عربی معاشرہ گرفتار تھا۔ حوروں کے متعلق ہم ابھی وضاحت کر چکے ہیں؟ یہ لفظ عورت کی خوبصورتی کے ایک پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مستشرقین یہ بے بنیاد پروپیگنڈا بھی کرتے ہیں اور اس مصنف نے بھی بالواسطہ اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ لوگوں کو عالم آخرت میں باغوں اور حوروں کا لالچ دے کر اسلام کی طرف راغب کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ بھی سراسر غلط بات ہے اگر قرن اولیٰ کے مسلمانوں نے اس لالچ کے تحت اسلام قبول کیا تھا تو ان میں سیرت و کردار کی وہ بلندی اور تقویٰ کی وہ قابل رشک صفات کیسے پیدا ہو گئیں جن کی نظیر عالمی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جنسی ہوس میں گرفتار لوگ کبھی اونچے کردار اور زہد کا مظاہرہ نہیں کر سکتے، اور نہ وہ مالی، جانی اور اپنے ہر قسم کے مفاد کی قربانی دے سکتے ہیں جس کا مظاہرہ قرن اول کے مسلمانوں نے کیا اور بعد کے ادوار میں بھی اس کی مثالیں تاریخ کے صفحات پر نقش ہیں۔ لیکن مغرب کے علمی حلقے معروضی انداز میں سوچنے سے عاری ہیں اور ہر بات کو وہ اپنے مادہ پرستانہ اور خدا ناشناس اقدار کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ ایک شخص کے متعلق بھی یہ شہادت فراہم نہیں کر سکتی کہ وہ عالم آخرت کے باغوں اور حوروں کی کشش کی وجہ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوا ہو، اسلام قبول کرنا آگ کے انگاروں کو مٹھی میں لینے کے مترادف تھا۔ اور آج بھی دین کے نفاذ کی سیاسی اور حصول اقتدار کی اغراض کے لیے نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کوشش کرنے والوں کو اس صورتحال کا سابقہ کرنا پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآن میں عالم غیب سے تعلق رکھنے والی دوسری بہت سی باتوں کے متعلق انسانی قوت فہم کے مطابق معلومات فراہم کی گئی ہیں اسی طرح جنت و جہنم کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ انسان کو یہ باور کرایا جائے کہ وہ نوعی حیثیت سے ذمہ داری کے مقام پر فائز ہے اور اس دنیا میں اس سے جو اعمال سرزد ہوں گے عالم آخرت میں ان کے نتائج برآمد ہونے والے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی واضح کر دیا کہ اس دنیا میں انسان کی موت اس کے نوعی اختتام کے ہم معنی نہیں بلکہ بقول علامہ اقبالؒ:

پستی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

حرف آخر

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کتاب کی نو ابواب پر مشتمل پہلی جلد اختتام پذیر ہوئی۔ اس میں اسلامی فکر کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس فکر کی بنیاد پر ہی انفرادی اور اجتماعی دائروں میں اسلامی تمدن کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو اس کے بعد دوسری جلد پر کام کا آغاز کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے لیے ہم تحقیقی مرحلے سے گزر چکے ہیں اور مختلف موضوعات کا ابتدائی خاکہ اور مواد تیار ہے۔ لیکن خیال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اس کی ترتیب و تسوید میں دو سال کا عرصہ صرف ہوگا۔ اس دوسرے حصہ کتاب کی تکمیل پر ہی اسلام کے اصولوں، ان کے عملی نفاذ اور عالمی حالات کے جائزے اور ان کے پس منظر میں

مسلمانوں کی حیثیت، نیز نفاذ اسلام کے طریق کار اور امکانات کے سلسلے کے تصورات کی داستان مکمل ہو گی جنہیں پیش کرنے کا مقصد اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہے۔

دوسری جلد میں ہم اپنی معروضات انشاءاللہ درج ذیل عنوانات کے تحت پیش کریں گے، اگرچہ دوران تحریر معمولی ردوبدل یا حذف واضافہ کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

باب:۱۰

عبادات

(ا)صلواۃ

(ب)صوم

(ج)حج

باب۱۱:

اسلام کا نظام اجتماعی

باب۱۲:

اسلام کا نظام سیاسی

باب۱۳:

اسلام کا معاشی نظام

باب۱۴:

اسلام کا معاشرتی نظام

باب۱۵:

اسلامی عدلیہ

باب۱۶:

بین الاقومی تعلقات کے اسلامی اصول

باب۱۷:

اسلام کا قانون جنگ و صلح اور تصور جہاد

باب۱۸:

اسلام میں مقام علم و سائنس اور اجتہاد

باب۱۹:

اسلام تلوار سے نہیں تبلیغ سے پھیلا

باب۲۰:

اسلام تاریخ میں

باب۲۱:

مسلمان تاریخ میں

باب۲۲:

امت مسلمہ میں اختلافات کی نوعیت

باب۲۳:

مستشرقین اور اسلام

باب۲۴:

مغربی تمدن کے خدوخال

باب۲۵:

مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت

باب۲۶:

کمیونزم اور اس کا انجام

باب۲۷:

مسلمان اور دور حاضر

باب۲۸:

باب۲۹:

نفاذ اسلام